مکمل اور طویل ترین حیرت انگیز داستان

رولوکا

دوسرا حصہ

PDFBOOKSFREE.PK

تحریر: اے وحید

جملہ حقوق بحق ڈر پبلی کیشنز محفوظ ہیں

نام کتاب	رولوکا نمبر②
تحریر	اے وحید
ناشر	ڈر پبلی کیشنز
پرنٹر	خالد پرنٹرز
قیمت	150/-

اسٹاکسٹ

رشید نیوز ایجنسی اخبار مارکیٹ فریئر روڈ کراچی	زرباغ نیوز ایجنسی چوک یادگار پشاور (سرحد)
گلزار نیوز ایجنسی اخبار مارکیٹ لاہور	اشرف بک ایجنسی کمیٹی چوک راولپنڈی
مہران نیوز ایجنسی اخبار مارکیٹ حیدر آباد	الفتح نیوز ایجنسی مہران مرکز سکھر
ویلکم بک پورٹ اردو بازار کراچی	کامیاب بک ڈپو اردو بازار کراچی
روبی پبلی کیشنز الحمد مارکیٹ لاہور	انصاری بک اسٹال ریگل روڈ فیصل آباد
ریلوے بک اسٹال فیصل آباد	ریلوے بک اسٹال روہڑی

رولوکا

ھندوستان کا ایک علاقہ ایسا ہے جس کو ڈاکوؤں کی جنت کہا جاتا ہے۔ یہاں پر ہر دور میں ڈاکو پیدا ہوتے رہے ہیں اور کسی بھی علاقے کے ڈاکو کو یہاں پر پناہ مل جاتی ہے۔ ہر دور کی سرکار جانتی ہے مگر پھر بھی یہ لوگ یہیں پر رہتے ہیں اور پولیس ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی...... ان کے علاقے پر انگریزوں نے بمباری بھی کر دی تھی۔ مگر پھر بھی یہی جگہ ان کا ٹھکانہ بنی ہوئی ہے۔ بہت مشہور ڈاکو یہاں گزرے ہیں۔ کہتے ہیں یہ لوگ غریبوں کی مدد کیا کرتے تھے۔

اور غریب ان کو پناہ دیا کرتے تھے۔ شاید یہ سچ ہو۔ یہ علاقہ چمبل وادی کا علاقہ ہے۔ یہاں پر ایک دریا بھی ہے اس کا نام بھی دریائے چمبل ہے۔ آبادی دور دور ہے اور ریت کے ٹیلوں سے ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ پہاڑ بھی بہت ہیں اور ان پہاڑوں میں ہزاروں غار پانی نے بنا دیئے ہیں۔ دریائے چمبل جب چڑھتا ہے تو پہاڑوں تک آجاتا ہے اور ان غاروں کے راستے پانی کہیں دوسری طرف نکل جاتا ہے۔ پہاڑوں کے اندر اتنی کشادہ جگہیں موجود ہیں کہ ہزاروں لوگ رہ سکتے ہیں۔ پہاڑ کے چاروں طرف پانی نظر آتا ہے مگر ڈاکو جانتے ہیں کہ ان کا ٹھکانا کہاں ہے اور وہ گھوڑے سمیت اپنی جگہ چلا جاتا ہے۔ تلاش کرنے والا سوچ بھی نہیں سکتا کہ پانی کے اندر بھی راستے ہیں۔ اندر والا باہر والے کو بڑی آسانی سے نشانہ بنا لیتا ہے۔

ہمارا یہ سفر ایک بلاوے پر تھا اور یہ پہلی دفعہ تھا کہ ہم کسی کے بلانے پر گئے تھے۔ ہوا یہ تھا کہ ایک لڑکی دلی سے بیاہ کر چمبل کے ایک گاؤں اناؤ میں گئی تھی۔ لڑکی بہت حسین تھی۔ دولہا اس کو وداع کرا کے اپنے گاؤں جا رہا تھا کہ عین گاؤں کے قریب ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کر دیا۔ کئی آدمی جو بارات کے ساتھ تھے مارے گئے۔ دولہا بھی سخت زخمی ہوا ڈاکو سب جہیز اور دلہن لے کر چمبل گھاٹی میں روپوش ہو گئے۔ پولیس کو رپورٹ ہوئی ضرور مگر پولیس نہ سامان برآمد کر سکی اور نہ ہی دلہن کو واپس لا سکی دلی میں اس حادثے کی اطلاع جب پہنچی تو لڑکی کے ماں باپ سخت پریشان ہوئے باپ کو تو اتنا صدمہ ہوا کہ اس پر دل کا دورہ پڑ گیا۔ اس کو میرے پاس لایا گیا تو مجھے سب ماجرا پتہ چلا میں نے رولوکا سے اس کا ذکر کیا تو اس نے ان کی مدد کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی، اور اس طرح ہم دلہن کے باپ کے ساتھ چمبل کو روانہ ہو گئے۔

اناؤ زیادہ بڑا گاؤں نہیں تھا۔ ساری آبادی کسانوں پر مشتمل تھی۔ دلہن کے باپ کا نام خیراتی تھا۔ وہ ہم کو لے کر سیدھا اپنے سمدھیانے پہنچا۔ میں نے اندازہ لگا لیا وہ لوگ زیادہ خوش حال نہیں تھے۔ دولہا کا نام بشیرہ تھا اور دلہن شدو یعنی شاہدہ تھی۔ ہمارے لئے ان لوگوں نے کھپریل میں چار پائیاں ڈال دیں اور ان پر صاف بستر بھی بچھا دیئے۔ اس گاؤں سے چار پانچ کوس پر چمبل گھاٹی کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ علاقہ اتنا خطرناک ہے کہ لوگ سوائے اپنے کام کے ٹھکانے کے کہیں اور نہیں جاتے۔ ایک تو ڈاکوؤں کا ڈر اور دوسرا ڈر پولیس کا رہتا ہے۔ وہ ڈاکوؤں کا ساتھی سمجھ کر پکڑ لیتی ہے اور غریب لوگوں کو بلاوجہ پریشان بھی کرتی ہے۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

دوسرے روز رولو کا نے مجھے اشارہ کیا اور چلا گیا۔ وہ گھر سے نکلا یہ سب نے دیکھا مگر دروازے کے باہر کوئی نہ دیکھ سکا۔ میں نے خیراتی کو بتا دیا کہ کام شروع ہو گیا ہے۔ میرا دوست گیا ہے کچھ خیر خبر لے کر آئے گا۔

خیراتی یہ سن کر حیرت سے بولا۔ "ارے بھیا خالی ہاتھ ڈاکوؤں کی کچھار میں کیا چلے گی۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو..... اس کے پاس بہت ہتھیار ہیں۔" میں نے کہا۔ خیراتی نے گردن ہلائی اور خاموش ہو گیا۔

❁.....❁.....❁

"یہ علاقہ اتنا ڈراؤنا اور خوف میں ڈوبا ہوا تھا کہ گاؤں والوں کو ہر اجنبی آدمی ڈاکو نظر آتا تھا۔ آبادی بھی دور دور تھی اور کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا تھا کیونکہ ڈاکو پھر اس کے دشمن ہو جاتے تھے۔ میں آگے بڑھتا گیا اور دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ دریا کے دوسری طرف پہاڑی سلسلہ تھا اور دریا چڑھا ہوا اس پہاڑی سلسلے کو ٹکریں مار رہا تھا۔ دور دور تک کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ پانی کی وجہ سے کوئی غار یا راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور دریا پر نظریں رکھیں۔ کچھ ہی دیر بعد میں نے دیکھا کہ ایک گھوڑا سوار پہاڑ کی جڑ سے نکلا اور دریا پار کرنے لگا۔ وہ مجھے چونکہ نہیں دیکھ سکا تھا اس لئے میں اطمینان سے بیٹھا رہا۔ وہ میری طرف ہی آ رہا تھا۔ وہ بڑی مہارت سے گھوڑے کو کنٹرول کر رہا تھا اور گھوڑا بھی اس کا عادی لگتا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے دریا کے باہر آ گیا اس کے باہر آتے ہی اس کا گھوڑا اس کے قابو سے باہر ہو گیا۔ کیونکہ اب وہ میرے کنٹرول میں تھا۔ اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر اس کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی مگر گھوڑے نے اس کو زمین پر گرا دیا۔ وہ پھر اٹھا اور سوار ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ سوار اتنا غصہ میں آ گیا کہ پیٹی سے پستول نکال کر فائر کرنا چاہتا تھا کہ گھوڑے نے دونوں اگلی ٹانگیں اس کے سینے پر اتنی زور سے ماریں کہ وہ الٹ کر زمین پر اتنی زور سے گرا کہ چند منٹ تو یہ لگا کہ شاید مر ہی گیا ہو۔ مگر وہ بڑا ڈھیٹ تھا مرا نہیں تھا چوٹ تو اس کو کراری آئی تھی۔ کچھ دیر وہ پڑا

گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔ گھوڑا چوکیدار کی طرح اس کے قریب ہی کھڑا رہا وہ بڑی مشکل سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ جہاں جا رہا تھا اب وہاں جانے کے قابل نہیں تھا۔ اس کی بندوق زین میں لٹک رہی تھی اور گھوڑا دور تھا اور پستول گھوڑے کی لات نے پانی میں گم کر دیا تھا۔ وہ بڑی مشکلوں کے بعد کھڑا ہوا اور گھوڑے کی لگام پکڑ لی گھوڑا خاموش کھڑا رہا پھر وہ اس پر سوار بھی ہو گیا اور گھوڑا پھر پانی میں اتر گیا۔ یہ سب گھوڑے نے میری ہدایت پر کیا گھوڑا تیرتا ہوا پہاڑوں کی طرف چلا میں ان کے ساتھ تھا۔ عین پہاڑ کی جڑ پر پہنچ کر وہ پانی کے اندر اترا اور پھر باہر آیا اب وہ غار کے منہ پر تھا۔ اس غار کے اندر بھی پانی تھا مگر جوں جوں اندر گئے پانی کم ہوتے ہوئے ختم ہو گیا اور سوکھی زمین آ گئی۔ سوار بڑی مشکلوں سے گھوڑے سے اترا۔ اس کے اترتے ہی ایک طرف سے ایک آدمی نمودار ہوا اور گرجتی آواز میں بولا۔

"تم گئے نہیں دھرمو.....؟"

"میری حالت دیکھ رہے ہو اس حالت میں جاتا تو پکڑا ہی جاتا۔" دھرمو نے کہا۔

"ارے بول تو کیا ہوا تو اتنا کمزور تو نہیں تھا کہ پٹ کے چلا آیا۔" وہ بولا۔

"ارے کاکا بھیا پٹ کے نہیں آیا ہوں یہ حرامی نے میری یہ حالت کر دی ہے گولی مار دے اس کو۔" دھرمو بولا۔

"ارے یہ تو تیرا من پسند گھوڑا ہے بے قابو ہو گیا کیا۔" کاکا نے پوچھا۔

"ارے کا پوچھو ہو۔ ایسا ویسا بے قابو پھر ایک دم سیدھا بھی ہو گیا اور واپس لے آیا۔" دھرمو نے کہا۔

"ارے کیا بات کرے ہو ایکا ایکی بگڑ گیا اور پھر واپس بھی لے آیا سچ بتا کوئی چلتر مت کریو۔ سردار کو پتہ چل گیا تو ایک منٹ میں تم دونوں کو گولی مار دے گا۔" کاکا بھیا بولا۔

"میں کا چلتر کروں گا۔ تو یقین کر میں نے جو کہا ہے وہی ہوا ہے۔" دھرمو نے کہا۔

"اچھا چل..... سردار کے پاس چل..... وہی فیصلہ کرے گا۔"

اور وہ دونوں اندر کی طرف چلے۔ ان کو پتہ نہیں تھا کہ ان کے ساتھ میں بھی تھا دو تین ٹیڑھی میڑھی سرنگوں سے گزرنے کے بعد وہ ایک کشادہ سرنگ میں داخل ہو گئے۔ اندر کافی کشادہ جگہ موجود تھی یہاں پر نمی کا نام و نشان نہیں تھا۔ ایک بہت بڑا تخت پڑا تھا۔ اس کے سامنے کے رخ پر لکڑی کی کرسیاں پڑی تھیں ان کرسیوں پر دو تین آدمی بیٹھے تھے اور تخت پر ایک نہایت رعب دار شخص پیر لٹکا کر بیٹھا تھا۔ اس شخص کے چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک نڈر اور بہادر شخص ہے۔ ان دونوں کو دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا اور کڑک کر بولا۔

"دھرمو تو ابھی تک گیا نہیں.....؟"

دھرمو نے اپنی حالت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"گیا تھا سردار۔ میرا گھوڑا پانی سے پار اترتے ہی بگڑ گیا۔ میں نے لاکھ جتن کر لئے پر وہ سیدھا نہ ہوا اور دونوں لاتیں میرے سینے پر دے ماریں۔ سردار میری حالت اس نے بہت خراب کر دی اب بتاؤ میں اس حالت میں کیسے جاتا۔ میرا تو واپس آنا بھی مشکل تھا۔ پھر وہی گھوڑا مجھے واپس لے آیا۔"

"تیری باتیں سمجھ نہیں آ رہی ہیں دھرمو..... سچ بتا ہوا کیا ہے؟" سردار نے کہا۔

"میری بات کا یقین کرو سردار۔ میں تمہارے حکم پر اپنی جان بھی دے سکتا ہوں میں جھوٹ نہیں بول رہا۔" دھرمو نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"تو اگر سچا ہے تو بھی کچھ نہ کچھ پھیر ضرور ہے۔ ارے تیرا گھوڑا تیری دھنائی کر دے ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ تو بتا بھوندو تجھے کیا لگتا ہے۔" سردار نے کرسی پر بیٹھے ایک شخص سے پوچھا۔

"سردار بات گلے سے اتر نہیں رہی..... پر دھرمو پرانا ساتھی ہے آزمایا ہوا جوان ہے اس پر شک کس طرح کروں۔ میں نے اس میں کھوٹ نہیں پایا ہے۔" بھوندو نے رائے دی۔

"تیری وجہ سے سارا پروگرام خراب ہو گیا۔ اب نہ جانے کب موقعہ ملے گا۔ مگر خیر تو جا، دوا دارو کر اور سن اس گھوڑے کو گولی مار دے۔"

یہ سنتے ہی کاکا بھیا اور دھرمو واپس پلٹ گئے۔ ان کے واپس ہوتے ہی میں نمودار ہو گیا۔ میں ایک بوڑھے کسان کے روپ میں سردار کے سامنے کھڑا تھا۔ سردار نے اور اس کے ساتھیوں نے حیرت سے مجھے دیکھا اور گرجتی ہوئی آواز میں بولا۔ "تو کون ہے رے اور یہاں تک کیسے آ گیا۔"

میں نے بہت کمزور آواز میں کہا۔ "میں ان دونوں کے ساتھ آیا تھا۔"

"ارے میں پوچھتا ہوں تو اڈے کے اندر کس طرح آ گیا؟" سردار بولا۔

"جس طرح دھرمو آیا اسی طرح میں بھی آ گیا۔" میں نے کہا۔

"تجھے دھرمو ساتھ لگا کر لایا ہے۔" سردار نے غصے سے کہا۔

"نہیں دھرمو کو پتہ نہیں ہے وہ بے قصور ہے۔" میں نے کہا۔

"کیوں آیا ہے بڈھے۔ تجھے پتہ نہیں ہے تو موت کی وادی میں آ گیا ہے۔ یہ میرا ٹھکانہ ہے۔ ڈاکو شادو لال کا اڈا ہے۔ دور دور پہرے لگے ہیں اور تو منہ اٹھا کر چلا آیا۔" وہ غصے سے بولا۔

"ہاں تم نے ٹھیک کہا ہے۔ مگر میرا آنا ضروری تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"زندگی بہت ضروری چیز ہے۔ مانا کہ تو اپنی عمر گزار چکا ہے مگر پھر بھی موت سے کون دل لگی کرتا ہے مجھے تو کوئی پاگل لگتا ہے۔" سردار نے کہا۔

"طاقت کا نشہ بہت برا ہے۔ دنیا کے سارے نشوں سے یہ بدتر ہے۔ میں تیرے اڈے پر موجود ہوں ہر طرف تیری راج دھانی ہے تیرے ایک اشارے پر میرے بدن میں سوراخ ہو سکتے ہیں۔ مگر تو بھول رہا ہے کہ میں تیرے پہرے داروں کے سامنے سے گزر کر تیرے آدمیوں کے ساتھ آیا ہوں۔ اگر تو بھول گیا ہے تو میں یاد کرا دوں کہ دنیا

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

میں ہزاروں شادو لال گزرے ہیں مگر اب کوئی ان کو جانتا بھی نہیں۔ تیری طاقت اور جوانی بھی ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ جو ذات رہنے والی ہے وہی مجھے یہاں تک لائی ہے میں جس کام سے آیا ہوں وہ کر کے جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

چند منٹ سردار شادو لال خاموش گردن جھکائے سوچتا رہا پھر بولا۔ "تیری کچھ باتیں میری سمجھ میں آ رہی ہیں۔ اپنا کام بتا۔"

"اناؤ گاؤں میں ایک آدمی رہتا ہے۔ اس نے اپنی لڑکی شدو عرف شاہدہ کی شادی کر دی۔ اس کے دولہا کا نام بشیرہ ہے۔ وہ دلہن تیرے علاقے میں آ گئی مگر آتے ہی تیرے آدمی اس کو اٹھا کر لے گئے۔ سب کا خیال ہے وہ چمبل گھاٹی کے ڈاکو تھے اور تو ان کا سردار ہے تو بتا میں اس غریب کسان خیراتی کی فریاد کہاں لے کر جاتا کیا پولیس اس کی مدد کر سکتی تھی تو میں تیرے پاس چلا آیا۔" میں نے کہا۔

سردار یہ سن کر غصے میں اٹھ کھڑا ہوا اور چیخ کر بولا۔

"بھوندو دوڑ کر جا اور پتہ کر یہ حرکت کس نے کی ہے اور اس چھوری کو بھی میرے پاس لے کر آنا۔"

بھوندو تیزی سے اٹھ کر چلا گیا۔ سردار نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اگر یہ حرکت میرے کسی آدمی نے کی ہے تو تمہاری نظروں کے سامنے اس کی دونوں ٹانگیں چیر دوں گا۔"

دس منٹ کے بعد بھوندو واپس آ گیا اور بولا۔

"سردار اڈے پر تو کوئی عورت نہیں ہے اور نہ ہی اس واردات کا کسی کو پتہ ہے۔"

"اچھا۔ مگر میں خود پتہ کرتا ہوں۔" میری طرف اشارہ کر کے وہ بولا۔ "آؤ بڑے میاں میرے ساتھ تم بھی اپنا اطمینان کر لو۔" اور ہم سب سردار کے ساتھ چل پڑے سردار ہر سرنگ میں گیا۔ ہر طرف اس کے آدمی موجود تھے۔ کھانے پک رہے تھے ہتھیار صاف کیے جا رہے تھے پورے اڈے پر کسی عورت کا وجود نہیں تھا۔ اور پھر ہم واپس اسی جگہ آ گئے جہاں سے ہم گئے تھے۔

"تم نے دیکھ لیا بڑے میاں اب بھی الزام دو گے۔" سردار نے کہا۔

"تمہاری راج دھانی میں یہ ظلم کی واردات ہوئی اور تم بے خبر رہے تم اندازہ کرو کتنے دن یہ راج پاٹ تم چلا سکو گے۔ یہ ظلم کسی نے کیا ہو پڑے گا تمہارے کھاتے ہیں تم یہ جانتے ہو؟" میں نے کہا۔

"ڈال دو میرے کھاتے میں ایک ہزار قتل ڈال دو۔ دو ہزار ڈاکے ڈال دو مگر میں کسی ناری کو اٹھاؤں اس کو بے عزت کروں یہ میرے کھاتے سے نکال دو۔ میں دھرتی کے اندر سے بھی اس کو پکڑ کر تمہارے سامنے کھڑا کر دوں گا۔ میں سب کچھ کر سکتا ہوں مگر کسی عورت ذات کی بے عزتی نہیں کر سکتا۔ میں ڈاکو ہوں۔ سونا چاندی لوٹتا ہوں کسی کی عزت نہیں لوٹتی۔" سردار نے غصے سے کہا۔

"تم کیچڑ کے اندر کھڑے ہو کر صفائی مت دکھاؤ۔ میں اس پر یقین نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔

"دیکھو بڑے میاں جو خود اسی تیر کا گھائل ہو وہ اس دکھ کو جانتا ہے۔ مجھ پر بھی ایسا ہی ظلم ہوا تھا اور اسی کے کارن میں یہاں پر ہوں۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر یقین کرو میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہ لڑکی جہاں پر جس کے پاس بھی ہوئی میں برآمد کروں گا اور ظالم کو سخت سزا دوں گا۔" سردار نے کہا۔

"تم جیسے کڑیل چھ فٹے جوان پر یہ ظلم ہوا سمجھ میں نہیں آ رہا۔" میں نے کہا۔

"میری داستان بھی وہی ہے جو اس گھاٹی میں ہر آنے والے ڈاکو کی ہے۔ کوئی خوشی سے اس جگہ نہیں آتا۔ کون نفرتوں کا کاروبار کرتا ہے کیونکہ ڈاکو نام ہی نفرت ہے ہر ڈاکو ظالم بے حس اور سماج کا باغی کہا جاتا ہے مگر وہ اس منزل پر کیوں آتا ہے جو لوگ اس کو اس آگ میں ڈالنے والے ہوتے ہیں ان سے کسی نے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں بھی ایک مظلوم ذات کا فرد ہوں ہم لوگ پشت ہا پشت سے ظلم برداشت کرتے آئے ہیں۔ ہماری ہر اچھی چیز دوسرے ہتھیا لیتے ہیں۔ اپنی طاقت سے چھین لیتے ہیں۔ ہم اپنی زبان سے شکوہ نہیں کر سکتے۔ کرتے ہیں تو زبان کاٹ دی جاتی ہے۔ میں بھی ٹھاکروں کی جوتیوں میں جوان ہوا اور ان کی جوتیاں بنانے لگا۔ میرا باپ بھی یہی کرتا تھا۔ اس کا باپ

بھی یہی کرتا تھا ہماری گردن تو کبھی اٹھی ہی نہیں آسمان تو ہم نے دیکھا ہی نہیں ہمیشہ زمین کو دیکھا پھر اسی زمین پر میں نے باپ کی لاش کو پڑے دیکھا اسی زمین پر میں نے اپنی بہنوں کو بے عزت ہوتے دیکھا اور پھر میں نے اٹھ کر پہلی بار آسمان کو دیکھا اور پھر نکل کر اس گھاٹی تک آ گیا جہاں پر نہ کوئی ذات ہے نہ برادری سب برابر ہیں سب کا ایک نام ہے وہ ہے ڈاکو۔" سردار خاموش ہو گیا۔

"تم پر جس نے ظلم کیا تھا اس سے بدلہ لیتے سب نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"میں بھی سب کو اپنا نشانہ نہیں بناتا میں صرف ٹھاکروں کا دشمن ہوں۔" سردار نے کہا۔

"تم اس لڑکی کو اب کہاں تلاش کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

"ٹھاکروں کے نئی نسل کے لڑکے اپنے پرکھوں سے بھی آگے چلے گئے ہیں یہ کام صرف ان ہی کا ہے۔" سردار نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم تلاش کرو۔ میں پھر آ کر پتہ کروں گا۔" میں نے کہا۔

"بات ادھوری چھوڑ کر تم نہیں جاؤ گے تم یہ بتاؤ مجھ تک کس طرح آئے ہو۔" سردار نے کہا۔

"میں جس طرح واپس جاؤں گا اسی طرح آیا تھا۔" میں نے کہا۔

"دیکھو بڑے میاں میں نے تم سے وعدہ کیا ہے میں تمہارا کام جان لڑا کے کروں گا مگر مجھے اپنی کمزوری کا بھی تو پتہ چلنا چاہیے تاکہ میں آئندہ کو ہوشیار ہو جاؤں۔" سردار نے کہا۔

"تم بہت ہوشیار آدمی ہو۔ مگر جو راز کی باتیں ہیں ان کو جاننے کی کرید مت کرو تم مجھے نہ جانے سے روک سکتے ہو اور نہ دوبارہ آنے سے روکو گے۔" میں نے یہ کہا اور دروازے سے نکل کر روپوش ہو گیا۔ پورے غار میں ہلچل مچ گئی اور ایمر جنسی نافذ ہو گئی مگر میں چلا آیا۔"

رولوکا نے رات کو واپس آ کر مجھے اپنی روداد سنائی تو میں نے کہا۔ "لڑکی کا پتہ نہیں چلا۔"

"ڈاکو شادو لال کا شبہ ٹھاکروں پر ہے۔ وہ ان کو چیک کرے گا اور میں اس کو چیک کروں گا۔" رولوکا نے کہا۔

"کیا تم کو شادو لال پر بھروسہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"بات بھروسے کی نہیں ہے۔ مجھے اس نے جو کہا ہے میں نے اس پر پوری طرح یقین نہیں کیا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے وہ کسی اپنے پیارے کو بچانے کو مجھے گول مول کر رہا ہو۔" رولوکا نے کہا۔

"کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"سب کچھ ہو سکتا ہے وہ ایک ڈاکو ہے وہ ہر طرف دیکھ رہا ہو گا۔ اس کو اپنے گروہ کو قائم اور اپنے وفاداروں کا خیال بھی رکھنا ہو گا اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو گروہ کی مالا ٹوٹ جائے گی اور ہر دانہ بکھر جائے گا۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"تم اس کی سچائی کو پرکھ رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"تلاش کرنا تو زیادہ مشکل نہیں ہے۔ پر چور اپنی کچھ نہ کچھ نشانیاں ضرور چھوڑ جاتا ہے ضرورت صرف ان کو دیکھنے کی ہوتی ہے۔ اگر ٹھاکروں کی یہ واردات ہے تو وہ بھی زیادہ دور نہیں ہیں۔ مگر میں ایک ڈاکو کے کردار کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ اس کی شرافت کو جانچنا چاہتا ہوں۔ وہ کل سے تلاش شروع کرے گا اور میں اس کے ساتھ رہ کر بھی اس سے الگ رہوں گا......"

❁......❁......❁

"شادو لال نے ایک کسان کا بھیس بھرا اور گھوڑے پر اکیلا نکل کھڑا ہوا۔ دریائے چمبل پار کرنے کے بعد اس نے گھوڑا چھوڑ دیا۔ گھوڑا دوڑتا ہوا واپس چلا گیا اور شادو لال پیدل جنوب کی طرف چلتا گیا۔ پھر ایک بیل گاڑی روک کر اس پر سوار ہو گیا۔ اس کا رخ ایک بڑے گاؤں کی طرف تھا وہ بیل گاڑی اسی گاؤں کو جا رہی تھی۔ شادو نے گاڑی بان سے پوچھ لیا تھا۔ گاؤں آ گیا تو گاڑی بان سے پوچھا۔

"اب کہو بھیا آگے کس سے بھینٹ کرتا ہے۔"

شادو گاڑی سے کود پڑا اور بولا۔ "تم اب جاؤ میں خود

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

ہی پتہ کرلوں گا۔" اور گاڑی والا چلا گیا۔

شادو نے ٹھاکر پرتاب سنگھ کی حویلی کا رخ کیا ہی تھا کہ میں ایک درخت کی اوٹ سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا اس نے مجھے حیرت سے دیکھا اور بولا۔ "ارے تم مجھ سے پہلے ہی پہنچ گئے۔ کون گاڑی سے آئے۔"

"میں بھی اسی طرح آیا ہوں جس طرح تم آئے ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھاکر پرتاب سنگھ کو تم جانتے ہو۔" شادو نے پوچھا۔

"نہیں میں نہیں جانتا۔" میں نے جواب دیا۔

"مگر میں جانتا ہوں۔ وہ بظاہر تو بڑا نیک نام ہے غریب کسانوں کا خیال بھی کرتا ہے۔ اس سے مجھے کوئی شکایت بھی نہیں ہے مگر اندر سے یہ کیا ہے اس کا پتہ نہیں ہے۔" شادو نے کہا۔

"ابھی پتہ کر لیتے ہیں......" میں نے کہا۔

اب ہم حویلی کے سامنے آ چکے تھے۔ شادو نے دروازے پر کھڑے ایک لٹھ بند سے کہا۔ "بات سن لالہ ہمیں ٹھاکر سے ملنا ہے۔ ذرا اندر خبر کردے۔"

اس لٹھ بند جوان نے سر سے پیر تک مجھے اور شادو کو دیکھا اور بولا۔ "کون گام سے آئے ہو اور کا کام ہے۔ یہ بتلاؤ۔" میں جلدی سے اس کے قریب چلا گیا اور بولا۔

"ٹھاکر سے بول اناؤ سے آئے ہیں۔"

اس نے گردن ہلائی اور دروازے کے اندر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی دوسرا لٹھ بند دروازے پر آ گیا۔ دس منٹ کے بعد وہ واپس آیا اور بولا۔ "آؤ میرے ساتھ۔" اور ہم حویلی کے اندر داخل ہو گئے۔ دروازے کے بعد ایک بہت لمبا برآمدہ تھا۔ اس کے ختم ہوتے ہی کمروں کے دروازے نظر آنے لگے وہ لٹھ بند ایک دروازے کے باہر کھڑا ہو گیا اور اس نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی......

"آ جا......"

لٹھ بند نے دروازہ پورا کھول دیا اور ہمیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں چلے گئے۔ یہ ایک بہت بڑا کمرہ تھا۔ قدیم زمانے کی آرام دہ کرسیاں دیوار کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی تھیں اور ان کی پالش چمک رہی تھی فرش پر قالین پڑا تھا ایک بہت بڑا تخت پڑا تھا اس کے پائے گول تھے اور کسی ماہر کاریگر کی ہنرمندی کا زندہ ثبوت ہے۔ تخت پر بھی ایک سرخ رنگ کا دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ بڑے بڑے گاؤ تکیے اس کے کنارے لگے ہوئے تھے اور ان ہی کے سہارے ایک شخص جس کی مونچھیں بڑی بڑی چہرے پر رعب و دبدبہ تھا بیٹھا تھا۔ کمرے میں وہ اکیلا تھا یہ بات میرے لئے اور شادو کے لئے ضرور حیرت کی تھی۔

اس نے ایک نظر شادو کی طرف ڈالی پھر مجھے دیکھا اور رعب دار آواز میں بولا۔ "آؤ شادو میرے پاس بیٹھو۔" شادو نے چونک کر اس کو دیکھا تو وہ مسکرا کر پھر بولا۔

"پریشان مت ہو شادو۔ تم میرے پاس آئے ہو میرے مہمان ہو تمہاری عزت مجھ پر فرض ہے۔"

اب شادو پہلے جھٹکے سے سنبھل چکا تھا۔ بولا۔ "تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں وہی ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔"

"تمہارے سوال کے کئی جوابات میرے پاس ہیں مگر میں صرف یہ کہوں گا کہ شادو ڈاکو اتنا گمنام آدمی نہیں ہے کہ اس کو میں نہ پہچان سکوں۔ تم نے بے شک اچھا بہروپ بھرا ہے مگر میری نظریں اندر تک دیکھتی ہیں تم مان لو کہ تم شادو ہی ہو۔" ٹھاکر پرتاب سنگھ اطمینان سے بولا۔

"چلو میں مانے لیتا ہوں تم نے مجھے خوب پہچانا مگر میں اس وقت تمہارے پاس ڈاکو بن کر نہیں آیا ہوں۔" شادو نے جواب دیا۔

"ڈاکو بن کر میرے پاس کبھی آنا بھی نہیں...... میں تمہاری ہر ضرورت ویسے ہی پوری کرنے کو تیار ہوں اور اگر ڈاکو بن کر آؤ گے تو مجھے کمزور نہیں پاؤ گے۔" اور پھر ہنس کر بولا۔ "تم نے اپنے ساتھی کا پریچے نہیں کرایا۔"

"یہ میرے ایک بہت قریبی متر ہیں اناؤ سے آئے ہیں۔ ان کے کارن ہی مجھے یہ بہروپ بھرنا پڑا ہے۔ ان کی ہی ایک ضرورت سے تمہارے پاس آیا ہوں۔" شادو نے کہا۔

"اگر ضرورت میں پوری کر سکا؟ تو ضرور کروں گا۔ کسی ڈر خوف سے نہیں بلکہ اس لئے کہ تم لوگ چل کر میرے پاس آئے ہو۔ میں خاندانی ٹھاکر ہوں۔ اپنے مہمانوں کے لئے سب کچھ کروں گا بولو۔" ٹھاکر نے کہا۔

"ایک کنیا اناؤ کی بیاہ کر چمپل کے علاقے میں آئی اور کسی نے اس کو وہیں سے اٹھا لیا اور الزام میرے سر آ گیا۔ تم پتہ نہیں جانتے ہو کہ نہیں میں ڈاکے ضرور مارتا ہوں مگر کسی عورت کی بے عزتی نہیں کرتا۔ کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ مگر الزام مجھ پر ہی آ گیا ہے میں اس داغ کو دھونا چاہتا ہوں وہ کنیا جب تک نہیں ملے گی میں سکون سے نہیں رہوں گا۔" شادو نے کہا۔

"اور تم میرے پاس چلے آئے...... میں اتنا گرا ہوا ہوں کہ لڑکیاں اٹھواؤں گا۔ میرے سات گاؤں ہیں ان میں ہزاروں نہیں تو سینکڑوں لڑکیاں رہتی ہیں میں نے کسی پر آج تک میلی نظر نہیں ڈالی اور تم میرے پاس چلے آئے۔ شادو تم میرے مہمان ہو تم نے بہت بڑی گالی مجھے دے دی ہے۔"

ٹھاکر غصے سے سرخ ہو گیا۔

میں نے پہلی بار زبان کھولی اور کہا۔ "ٹھاکر صاحب آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ پتہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ نے یہ کام کیا ہوگا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو اس کے بارے میں کچھ پتہ ہو...... کسی سے کچھ سنا ہو ڈھونڈنے کا یہی طریقہ ہوتا ہے کہ کڑی سے کڑی ملاتے چلے جائیں...... اگر آپ کچھ جانتے ہیں یا آپ کچھ اندازے لگا سکتے ہیں تو بتائیں ہم آپ پر شک نہیں کر رہے ہیں۔"

ٹھاکر نے سکون سے میری بات سنی تو اس کے چہرے کی رنگت معمول پر آئی اور اس نے کہا۔ "ہاں یہ بات آپ نے قاعدے کی کی ہے آپ کا کیا نام ہے؟"

"میرا نام حکیم کامل خان ہے دلی میں مطب کرتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ یہ کام کس نے کیا ہوگا میرا اندازہ ٹھیک ہی ہوگا ایسا کام صرف ایک شخص کرتا ہے وہ ہے تو میرا رشتہ دار مگر میں اس سے نہیں ملتا اور نہ ملنے کی وجہ اس کا گندہ کردار ہے مجھے اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتا ہے۔ میں اس کا نام کسی دشمنی کی وجہ سے نہیں لے رہا، بلکہ اس کے گھناؤنے کردار کی وجہ سے لے رہا ہوں۔ یہاں سے بیس کوس دور ایک علاقہ ہے چتر والی...... یہ ایک بہت بڑا گاؤں ہے۔ اس کا زمین دار ٹھاکر دھرم داس ہے۔ نام تو اس کا دھرم داس ہے مگر دھرم سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اس نے ٹھاکروں کے نام کو بٹہ لگا دیا ہے۔ مجھے شبہ ہے اس کے کارندوں کی نظر میں کنیا آ گئی ہوگی اور وہ دھرم داس کو خوش کرنے اور انعام حاصل کرنے کو اٹھا لے گئے ہوں گے۔"

ٹھاکر نے بتایا۔ تو میں نے کہا۔ "آپ صرف یہ کام کردیں کہ ہمیں اس کا پتہ بتا دیں۔"

"نہیں صرف اتنا کافی نہیں ہوگا۔ میں آپ کو وہاں پہنچاؤں گا اور جس قسم کی مدد کی ضرورت ہو پوری کردوں گا۔ یہ کر کے میں آپ پر یا شادو پر احسان نہیں کروں گا میرا ابھی تو کچھ فرض ہے۔" ٹھاکر نے جواب دیا۔

"نہیں ٹھاکر صاحب آپ ایسا نہیں کریں گے۔ میں آپ کی دشمنی کو اور بڑھانا نہیں چاہتا ہم خود جائیں گے اپنے طریقہ پر جائیں گے آپ صرف پتہ بتا دیں۔" شادو نے کہا۔

"میں آپ کا کام آسان کرنا چاہتا تھا کیونکہ تم جس کے پاس جا رہے ہو وہ ایک مشکل آدمی ہے۔ اس کو تم نہیں جانتے۔ وہ تمہاری مشکلات بڑھا سکتا ہے۔ علاقہ بھی اس کا ہوگا ہر طرف اس کے آدمی ہوں گے اس کے علاوہ بھی ایک مدد اور اس کو حاصل ہے اور وہ ہے اس کا گرو۔ وہ ہر اچھے برے کام میں اس کی مدد کرتا ہے۔ کچھ ٹونے ٹوٹکے کرنے کا ماہر ہے۔ اسی پر دھرم داس پھولتا ہے۔ آپ دونوں کے لئے گھوڑوں کا تو بندوبست میں کر سکتا ہوں۔" ٹھاکر نے کہا۔

"شادو کے لئے بندوبست کردیں اگر یہ پسند کریں تو میں تو گھوڑا سواری نہیں کرتا۔ آپ دیکھ رہے ہیں بوڑھا آدمی ہوں میں اپنے طریقہ پر چتر والی گاؤں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"میں بھی گھوڑے پر نہیں جاؤں گا آپ کو پتہ ہے

READING CORNER
http://readingcorner.blogspot.com/

میں ایک بدنام آدمی ہوں چھپتا چھپاتا ہی جانا ہوگا۔" شادو نے کہا تو ٹھاکر نے کہا۔

"مطلب یہ ہوا کہ آپ لوگ میری کسی قسم کی مدد لینا نہیں چاہتے۔"

"ٹھاکر صاحب آپ ناراض نہ ہوں جب بھی آپ کی ضرورت پڑی ہم آپ کو ضرور یاد کریں گے۔ آپ کے اخلاق اور صاف گوئی کے تو ہم قائل ہو گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

چتر والی گاؤں کہنے کو بیس کوس تھا مگر راستہ بہت خراب تھا مٹی اور پتھر کے ٹیلے جابجا پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ٹیڑھا میڑھا کچا راستہ بنا ہوا تھا جس میں کہیں کہیں پانی اور کیچڑ بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف جنگلی جھاڑیاں اور گھاس اگی ہوئی تھی۔ ان جھاڑیوں میں مختلف قسم کے حشرات الارض چھپے ہوئے تھے۔

شادو نے ایک بیل گاڑی حاصل کر لی تھی اس نے اپنا حلیہ مکمل طور پر دیہاتی بنایا ہوا تھا۔ وہی گاڑی چلا رہا تھا۔ چتر والی گاؤں ابھی دور تھا کہ اچانک ایک طرف سے دو بھیڑیئے نمودار ہوئے اور بیلوں کے سامنے آ گئے بیل ڈر کے کھڑے ہو گئے اور گاڑی سے آزادی کی خاطر زور کرنے لگے۔ جھٹکا مجھے بھی لگا میں نے سامنے نظر ڈالی تو دونوں بھیڑیئے نظر آ گئے۔ میں گاڑی پر کھڑا ہو گیا۔ میرے ہاتھ اٹھاتے ہی دونوں بھیڑیئے ایک طرف چل دیئے۔ شادو نے حیرت سے ان کو دیکھا اور پھر بولا۔

"آئے تو بڑے غصے میں تھے مگر چلے کیوں گئے شاید پھر آئیں گے زیادہ تعداد میں۔"

میں نے کہا۔ "تم اپنا سفر جاری رکھو وہ اب نہیں آئیں گے۔"

"حیرت کی بات ہے میں نے اب غور کیا آپ کے کھڑے ہوتے ہی وہ خاموشی سے چلے گئے۔" شادو نے کہا۔

"شریف بھیڑیئے تھے اس لئے شرافت سے چلے گئے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"حکیم صاحب آپ نہ بتائیں آپ کی مرضی مگر میرے حلق سے یہ بات اتر نہیں رہی کہ وہ آپ کو دیکھتے ہی کیوں چلے گئے۔ آپ کے لئے یہ بات معمولی ہوگی میرے لئے اس لئے حیرت انگیز ہے کہ میرا واسطہ ان سے پڑتا رہتا ہے۔ یہ اتنی آسانی سے ٹلنے والے نہیں ہوتے۔" شادو نے کہا۔

"تم نے زندگی کی جو کتاب پڑھی ہے اس میں یہ سبق نہیں تھا اور بھی بہت سے سبق تم کو نئے لگیں گے جوں جوں عمر کی رسی دراز ہوگی نئی باتیں نئے لوگ۔ نئے تجربات آتے جائیں گے۔ دنیا کی کسی درس گاہ میں جو نہیں پڑھایا جاتا وہ زندگی خود پڑھاتی ہے اور آدمی مرتے دم تک پڑھتا رہتا ہے۔ موت بھی ایک سبق پڑھاتی ہے۔ اس لئے تعجب کا اظہار نہ کرو۔ تم نے ایک قدم نیکی کی طرف اٹھایا ہے تمہاری مدد ہوگی اس پر تعجب مت کرو شکر کرو رب کائنات کا......" میں نے کہا۔

"میں زیادہ سمجھ دار پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں آپ کی رمز بھری باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں جو سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں ان کو سمجھنا چاہتا ہوں۔" شادو نے کہا۔

"قصور تیرا بھی نہیں ہے۔ جہاں انسان کے اندر بہت سے جذبے ہیں وہیں پر ایک جذبہ تجسس کا بھی ہے۔ وہی جذبہ کرید کراتا ہے اور آدمی ہر بات فوراً سمجھ لینا چاہتا ہے۔ مگر یاد رکھو بلاوجہ کی کھوج نقصان بھی کر دیتی ہے ہر کام کا وقت ہوتا ہے۔ صبح آپ ناشتہ کرتے ہیں رات کا نہیں کھاتے اس لئے کہ رات آئی ہی نہیں۔ جو سامنے ہے بے شک اسی پر غور کرنا چاہئے جب بتانے کا وقت آئے گا تو تمہارے دل میں خود بات اتر جائے گی۔" میں نے جواب دیا۔

"میں معافی چاہتا ہوں میں اب تک آپ کو نہیں سمجھ سکا۔" شادو نے کہا۔

"میں صرف تم سے یہ کہوں گا کہ تم اپنی سوچ کو غلط رخ پر مت موڑو اس سے بہت سے سوال پیدا ہوں گے۔ بہت سی غلط فہمیاں گندگی کے پہاڑ کھڑے کر دیں گی۔ انسان کوئی ہو ہر ایک کی حقیقتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ تم

صرف ایک بات ذہن میں بٹھا لو کہ میں تمہارا دوست ہوں۔" میں نے کہا۔

"میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آپ میرے دوست ہو۔" شادو نے کہا۔

"چتر والی کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک گاؤں نظر آ رہا ہے وہی شاید چتر والی ہے۔" شادو نے جواب دیا۔

"میں تم سے ایک درخواست کروں مانو گے۔" میں نے پوچھا۔

"آپ حکم کریں درخواست کر کے شرمندہ نہ کریں۔" شادو نے جواب دیا۔

"حالات کچھ بھی ہوں تم ہتھیار استعمال نہیں کرو گے اور اگر تم کو کوئی پہچان بھی لے تب بھی خود کو ظاہر نہیں کرو گے۔ تمہارے اندر جو ڈاکو شادو ہے وہ بے شک بہت نڈر ہے بہادر ہے مگر میں اس کو استعمال کرنا نہیں چاہتا۔ میرے ساتھ جو سادہ سا دیہاتی جوان ہے وہ میرے لئے بہت ہے۔" میں نے کہا۔

شادو چند منٹ خاموش رہا۔ پھر بولا۔ "حالانکہ آپ کی بات میں نہیں سمجھ سکا ہوں مگر میرا وعدہ ہے کہ ڈاکو شادو اندر ہی رہے گا اور گاؤں کا یہ سیدھا شریف شادو آپ کے ساتھ رہے گا...... اگر جان بھی جاتی ہوگی تو بھی ڈاکو اندر ہی رہے گا۔" شادو نے کہا۔

"تو پھر تم یقین کرو کہ تمہارا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔

"شام ہو گئی تھی چتر والی گاؤں بھی قریب آ گیا تھا۔ ہم جس طرف سے گاؤں آئے تھے وہاں پر جو سب سے پہلا گھر ہمیں ملا وہ بہت بڑا تھا۔ کچا مکان تھا باہر ہی ایک پھونس کا چھپر پڑا ہوا تھا اور کچھ جانور اس کے اندر کھڑے تھے اور ایک لالٹین درمیان میں لٹک رہی تھی مگر اس کی روشنی بہت کم تھی اور ایک دھوتی پوش آدمی باہر کھڑا تھا۔ شادو نے اس کے قریب گاڑی روک دی اور پوچھا۔ "یہ کون گام ہے بھا۔"

دھوتی پوش گاڑی کے قریب آ گیا اور بولا۔ "چتر والی ہے۔ کہاں سے آئے ہو بھا۔"

"بڑی دور سے آئے ہیں بھا۔ جل پانی ملے گا۔" شادو نے پوچھا۔

"کاہے نہ ملے گا۔ آ جاؤ گاڑی دھورے کھڑی کر دو جوڑی کھول دو ان کا بھی دانہ پانی کر لو۔"

شادو گاڑی سے اتر گیا اور بولا۔ "آ جاؤ حکیم صاحب۔"

میں بھی گاڑی سے اتر پڑا۔ شادو نے بیلوں کو گاڑی سے الگ کر دیا۔ گاڑی دیوار کے سامنے کھڑی کر دی۔ دھوتی پوش نے بیلوں کو ایک ناند کے پاس کھڑا کر دیا اور اس میں چارہ ڈال دیا۔ بیل دن بھر کے بھوکے تھے کھانے لگے۔ اس سے فارغ ہو کر دھوتی پوش ہمارے پاس آ گیا اور بولا۔ "آؤ اندر آ جاؤ۔" چھپر بہت بڑا تھا ہم چھپر کے دوسرے کنارے کی طرف چلے۔ اسی چھپر کے نیچے دو چار پائیاں پڑی تھیں ان کے پاس پہنچ کر وہ بولا۔ بیٹھو بھا اور میدان کی طرف چلا گیا۔ اس میدان کے پار ایک اور چھپر پڑا تھا وہاں پر بھی ایک لالٹین جل رہی تھی۔ درمیانی میدان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ واپس آ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پانی کا ڈول اور ایک ہاتھ میں حقہ پکڑا ہوا تھا۔

"لو بھا پہلے منہ ہاتھ دھو لو جب تک میں حقہ تازہ کر لوں جورو گرم گرم روٹی ڈال رہی ہے۔"

شادو نے کہا۔ "حقہ تو تم تازہ نہ ہی کرو بھا۔ ہم دونوں یہ شوق نہیں کرتے تم نے اپنا نام بتایا نہ تم نے ہمارا پوچھا۔"

"میرا نام مادھے ہے۔ اب تم بتلائے دیو۔" وہ بولا۔

"میں شادو لال ہوں یہ حکیم کامل ہیں۔" شادو نے کہا۔

"حکیم کا دوا دارو کرے ہیں یہ۔" وہ بولا۔

"ہاں وہ بھی کرتا ہوں کیا کوئی بیمار ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ارے بھا بیمار ایسا بیمار۔ بہت وید کے دکھایا پر ٹھیک نہ ہوا اب تو ہم امید ہی چھوڑ چکے ہیں مرنا تو اس کو ہے۔" وہ اداسی سے بولا۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com

"وہ کون ہے بھائی اور کیا بیماری ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کا پتہ بیماری کا۔ بس کھاٹ پر پڑا ہے۔ وہ ہمارا باپا ہے نہ بولے ہے نہ کھڑا ہو سکے ہے تین مہینہ ہو گئے۔ دور اور دھورے کے سب وید دیکھ چکے دوا بھی دے چکے۔ پر وہ نہ اٹھا۔" رادھے نے رونے والے انداز میں کہا۔

میں نے کہا۔ "تم ایسا کرو پہلے مجھے مریض دکھا دو۔"

"روٹی پانی کر لو پھر دکھا دیں گے۔" رادھے بولا۔

"نہیں ہم اگر ذرا دیر میں روٹی کھالیں گے تو کیا فرق پڑے گا مریض پہلے دکھاؤ۔" میں نے کہا۔

رادھے نے ممنونیت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "آؤ پھر....." اور اٹھ کھڑا ہوا۔

میدان کے اس پار چھپر میں وہ چلا گیا یہ چھپر بھی بہت جگہ گھیرے ہوئے تھا۔ اس کے ایک طرف ایک عورت روٹیاں پکا رہی تھی اور دوسرے کنارے کے ساتھ ایک چارپائی پر ایک بوڑھا آدمی لیٹا تھا۔ یہاں پر اندھیرا تھا۔ میں نے اشارہ کیا تو رادھے لالٹین اتار کر لے آیا۔ بوڑھا بہت کمزور تھا۔ بلکہ ہڈیوں کا ڈھانچہ اس کو کہا جائے تو بھی غلط نہیں ہوگا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اس کی آنکھوں میں اس کا مرض نظر آ گیا۔ میں نے رادھے کو کہا پانی لاؤ۔ رادھے ایک گلاس پانی لے آیا۔ میں نے وہ پانی کا گلاس بوڑھے کے منہ سے لگا دیا۔

بوڑھا پانی پینے لگا اور پورا گلاس اس کے پیٹ میں چلا گیا۔ میں اس کے سرہانے کھڑا رہا بوڑھے نے آنکھیں کھول دیں اور بولا۔ "للو رادھے بھوک لگی ہے۔"

رادھے نے اپنے باپ کی آواز سنی تو حیرت سے اچھل پڑا۔ "ابھی لایا باپو۔" اور دوڑ کر ایک باجرے کی روٹی پر ساگ رکھ کر لے آیا اور بولا۔ "لے باپو کھا۔"

میں نے بوڑھے کو سہارا دیا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور ایک ہاتھ میں روٹی پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے نوالے توڑ کر کھانے لگا اور کچھ ہی دیر میں پوری روٹی کھا گیا۔

رادھے نے خوشی سے کہا۔ "یہ ٹھیک ہو گیا یقین نہیں آ رہا۔"

"تیرے سامنے پانی پیا روٹی کھائی اور اٹھ کر بیٹھا ہے۔ اب یہ ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

"تم نے کوئی دوا دارو دی نہ کچھ کیا۔ ٹھیک کیسے ہوا ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" رادھے بولا۔

"تم زیادہ نہ سوچو۔ یہ اب ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ وہ دوڑ کر اپنی جورو کے پاس گیا اور اس کو یہ خوش خبری سنا آیا اور باپ سے پوچھا۔

"باپو تم اب ٹھیک ہو، کوئی تکلیف تو نہیں.....؟"

بوڑھے نے کہا۔ "میں ٹھیک ہوں..... تو فکر نہ کر یہ دونوں کون ہیں۔"

"ارے باپو یہ بھگوان نے ہمارے گھر اتارے ہیں۔ آتے ہی تم ٹھیک ہو گئے۔ میرے تو اب دن پھر جائیں گے آتے ہی چمتکار ہو گیا۔ سویرے گاؤں والے سنیں گے تو اترج کریں گے۔"

"تم دو چار دن کسی کو بتاؤ کہ تمہارا باپو ٹھیک ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ بات خوشی کی ہے، کا ہے نہ بتاؤں۔ سب سے پہلے تو چھورا چھوری آوت ہوں گے۔ دوا کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔" رادھے نے کہا۔

"یہ چھورا چھوری تمہارے ہیں۔" شادو نے پوچھا۔

"ہاں جی چھورا بڑا ہے اور چھوری ابھی چھوٹی ہے۔ دادا کی بڑی لاڈلی ہے دونوں کھیت پر ہیں بس آتے ہی ہوں گے۔ دادا کو بھلا چنگا دیکھ کے نہال ہو جاویں گے۔" رادھے خوشی سے بولا۔

"اور ایک بات اور یہ کسی کو نہ بتانا کہ باپو ٹھیک کیسے ہو گیا اگر بتاؤ گے تو پھر بیمار پڑ جائے گا۔" میں نے آخری بات صرف اس کو ڈرانے کو کہی تھی۔

"جو پوچھیں گے کا دوائی دی کون وید کی دوائی دی تو سب کو تو ٹال دوں گا۔ اگر زمیندار نے پوچھا تو پھر

بتانا ہی پڑے گا بڑے چکر میں پڑ جاؤں گا۔" رادھے فکر مندی سے بولا۔

"تم فکر نہ کرو رادھے۔ ہم دونوں تمہارے پاس ہیں زمیندار پوچھے تو ہم دونوں کو پیش کر دینا۔" میں نے کہا۔

وہ یہ سن کر بولا۔ "ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔ بات یہ ہے کہ زمیندار آدمی ذرا ٹیڑھا ہے بال کی کھال نکالے ہے تم سامنے ہو گے تو میری بھی ڈھارس ہوگی۔" رادھے نے کہا۔

"اب تم روٹی کھالو۔" اور رادھے گاؤں کا جو بہترین کھانا تھا لے آیا میں نے اور شادو نے ڈٹ کر کھایا اور سو گئے۔ مگر میں کچھ دیر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ بیماری گئی نہیں صرف بدن سے نکلی ہے رات میں ضرور آئے گی اور اپنی جگہ جانے کی کوشش کرے گی۔ لونا چماری اور اس کی ساری قوم صرف اتنا ہی کر سکتی ہے کہ لڑائیاں کرا دے۔ بیماریاں پھیلا دے، ناچاقی پیدا کر دے۔ بھائیوں کو دشمن بنا دے اور دوستوں کو قاتل بنا دے۔ لونا چماری سفلی کا ایک خطرناک بیر ہے مگر خطرناک ان کے لئے جو اس کی اصلیت کو نہیں سمجھتے۔ میرا واسطہ کئی دفعہ اس سے پڑ چکا تھا میں بوڑھے کی عجیب بیماری کا سن کر ہی سمجھ چکا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ میں نے اس کے قریب جانے سے پہلے ہی پوری تیاری کر لی تھی۔ لونا چماری یا اس کی کوئی نسل یہ کوشش کرتی ہے کہ مریض کے جسم میں پانی نہ جانے دیا جائے۔ اس طرح وہ مریض کو کمزور سے کمزور تر کرتی ہے اور مریض پانی کی کمی سے مر جاتا ہے وہ چونکہ خود اس کو ہلاک نہیں کر سکتی اس لئے حالات اس قسم کے پیدا کر دیتی ہے کہ آدمی خود بخود مر جاتا ہے۔ میں مریض کے قریب ہی تھا۔ مگر چارپائی پر لیٹا ہوا سب نظارہ کر رہا تھا۔

گاؤں میں رات جلدی ہو جاتی ہے۔ ابھی صرف دس بجے تھے مگر ہر طرف اندھیرا تھا۔ جھینگروں کے بولنے کی آواز کبھی کبھی آ جاتی تھی۔ چارپائی کے چاروں طرف ایک ہیولے کی شکل میں وہ چکر لگا رہی تھی۔ اس کو بڈھے کے بدن میں جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ میں نے سارے راستوں پر پہرہ لگا دیا تھا۔

آخر وہ تھک کر چلی گئی۔ میں جانتا تھا وہ اب بھی نہیں گئی تھی وہ صرف بھلاوہ دے رہی تھی کچھ ہی دیر میں وہ پھر آ گئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور مریض کی چارپائی کے قریب جانے کو کھڑا ہو گیا۔ وہ ہیولا میری طرف مڑ گیا۔ اس کی کوئی شکل نہیں تھی۔ میرے قریب آ کر اس نے منمناتی آواز میں کہا۔ "کا ہے اپنی موت کو بلاوے ہے مجھے کام کرنے دے نہیں تو مارا جائے گا۔"

"تیرا کام ختم ہو گیا اب تو جا اور پھر اس گھر میں مت آنا۔" میں نے جواب دیا۔

"تیرا کہا مانوں گی۔ میری ماتا جی جیوت ہیں ان کا کہا پتھر پہ لکیر ہے۔ یہ بڈھا مرے گا تو جاؤں گی اور تو سن پلے باندھ لے۔ تو نے جو کچھ کیا ہے اس کا بھی بڈھے کے بعد حساب لوں گی۔ بچے گا تو بھی نہیں۔" وہ غصے سے بولی۔

"تو کون ہے بڑی تیز بول رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"میں کون ہوں سنے گا تو موت نکل جاوے گا۔ میں لونا چماری کی سوویں اولاد ہوں۔ بڑی لاڈلی ہوں مہتاری کی۔ وہ اگر سن پائی تو تیرا ستیاناس کر دے گی۔" وہ بولی۔

"بہت دن سے ملاقات نہیں ہوئی اپنی مہتاری کو ذرا بلا تو۔" میں نے کہا۔

"میں ہی بہت ہوں ابھی تیری ہڈی جوڑ ہلا دوں گی۔" وہ نفرت بھری آواز میں بولی۔

"تو ذرا اوپر دیکھ۔" میں نے کہا اس نے چونک کر اوپر دیکھا اور بس اتنی دیر میں میرے کارندے نے اس کو قابو کر لیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ہوا کیا۔

میں نے کہا۔ "دیکھ کیا اب بھی تیری مہتاری آئے گی.....؟"

"اس کو مت بلانا میں چلی جاؤں گی....." وہ جلدی سے بولی۔

"جانا تو تجھے ہے۔ یہ بتا کیوں آئی اور کس کے حکم پر آئی تھی۔" میں نے پوچھا۔

"میں گردسونا چمار کے حکم پر آئی تھی۔"

"اب تو جائے گی نہیں میں تجھے ایسی جگہ پہنچائے دیتا

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

ہوں جہاں تو اپنے کرموں کا پھل پائے گی۔" میں نے کہا۔

"مجھے چھوڑ دے میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔" وہ گڑگڑا کر بولی۔

"تو پھر کسی کو پیار کرے گی پھر کوئی رگڑ رگڑ کر مرے گا تو پھر کہے گی میں نے کیا کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"تو میں کب مرضی سے کرتی ہوں گرو کہتا ہے میں تو اس کے بس میں ہوں۔" وہ بولی۔

"ٹھیک ہے تو تو جا....." اور میرے اشارے پر کارندے نے اس کی گردن ناپ لی اور ہوا ہو گیا۔ یہ سارا ڈرامہ ہوا اور ختم بھی ہو گیا اور سب سوتے رہے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔

صبح سب سے پہلے بڑے میاں بیدار ہوئے اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ گاؤں میں لوگ جلدی اگر سوتے ہیں تو صبح جلدی اٹھ بھی جاتے ہیں سورج کے نکلنے سے پہلے ان کے بہت سے کام ہو جاتے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں رادھے اور اس کی گھر والی بھی بیدار ہو گئے اور دونوں بچے بھی اٹھ گئے۔

ناشتے کے بعد میں نے رادھے سے کہا۔ "اب تم ہم دونوں کو لے کر زمیندار کے پاس چلو۔ ہمیں اس سے کچھ کام ہے۔" میں نے کہا۔

"میرا جانا ضروری ہے کا بڑا ٹیڑھا آدمی ہے کوئی ذرا سا بھی ٹنٹا ہو گیا تو میرا دشمن ہو جائے گا۔" وہ بولا۔

"تو پھر تم مت جاؤ۔" شادو نے کہا۔ "تم اس کا گھر بتا دو۔"

"جو سب سے اونچی اور بڑھیا حویلی نظر آئے وہی گھر ہے۔" رادھے نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تم اپنا کام کرو اور فکر نہ کرو ہم پھر آئیں گے۔" میں نے کہا۔

چترو والی گاؤں اچھا بڑا گاؤں تھا۔ ہم دونوں نکل پڑے۔ ایک آدمی سے زمیندار کی حویلی کا پتہ کیا۔ تو اس نے پہلے حیرت سے ہمیں دیکھا اور پھر جلدی سے بتا کر آگے بڑھ گیا۔ اب ہم حویلی کے سامنے تھے۔ یہ واقعی اس گاؤں کا بہترین مکان تھا۔ بڑا اونچا دروازہ تھا دروازے کے دونوں طرف دو بڑی بڑی مورتیاں دیوار میں بنی ہوئی تھیں حویلی بہت پرانی تھی مگر بڑی مضبوط دکھائی دیتی تھی۔ بڑے دروازے میں ایک چھوٹا دروازہ بھی لگا ہوا تھا اور اس کے سامنے ایک آدمی کان سے اونچا لٹھ لئے کھڑا تھا۔ سر پر پیلا صافہ اور کان میں بالی ڈالی ہوئی تھی۔ ہاتھ پیر کا مضبوط اور چاک و چوبند نظر آتا تھا۔

شادو اور میں اس کے قریب چلے گئے۔ شادو نے کہا۔ "ٹھاکر دھرم داس زمیندار سے ملنا ہے۔ کہاں ہیں وہ....."

اس نے سر سے پیر تک ہم دونوں کو دیکھا اور بولا۔ "کا کام ہے اور کہاں سے آئے ہو پہلے یہ بتلاؤ۔"

"اناؤ سے آئے ہیں۔ بہت ضروری کام ہے ان کو خبر کر دو۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا کرتے ہیں ان کو خبر۔" اور وہ چھوٹا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

دس منٹ کے بعد آ کر بولا۔ "آ جاؤ میرے ساتھ۔" ہم لوگ بھی اسی چھوٹے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ اس دروازے کے اندر کی طرف بھی ایک آدمی کھڑا تھا۔ مگر اس نے ہم سے کچھ نہیں کہا۔

دروازے کے سامنے کھلا میدان تھا۔ دائیں بائیں حویلی کی اونچی دیوار نظر آتی تھی۔ یہ حویلی قلعہ کی طرز پر بنائی گئی تھی۔ رہائشی کمرے میدان کے سامنے تھے مگر ان کے سامنے ایک باڑ لگی ہوئی تھی اور وہ باڑ کروندے کی تھی۔ کروندے کی جھاڑی میں بڑے بڑے کانٹے ہوتے ہیں اور اس میں ایک چھوٹا سا پھل بھی لگتا ہے جو کچا ہونے پر ہرا اور پکنے پر پیلا اور سرخ رنگ کا ہو جاتا ہے یہ پھل ترش ہوتا ہے اس کو اچار میں بھی ڈالا جاتا ہے۔ باڑ اتنی چوڑی تھی کہ انسان تو انسان بلی بھی پار نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے پوری باڑ پار کر کے ہم رہائشی حصہ کی طرف آئے۔ ایک دروازے کے سامنے وہ کھڑا ہو گیا اور دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ آواز آئی "اندر آ جا۔"

اس نے ہم کو اشارہ کیا اور ہم اندر چلے گئے۔ حویلی کا یہ کمرہ بہت بڑا تھا۔ دیواروں پر جانوروں کے سر لگے ہوئے

تھے۔ فرش پر قالین پڑا تھا اور ایک بہت بڑا چھپر کھٹ پڑا تھا اس کی جھالریں سنہری رنگ کی تھیں۔ بڑے بڑے گاؤ تکیے پڑے تھے ان کے سہارے ایک شخص بیٹھا تھا اس کے دونوں طرف کرسیوں پر دو آدمی اور بیٹھے تھے۔ جو شخص چھپر کھٹ پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا تھا وہی دھرم داس تھا۔ اس کی مونچھیں بڑی بڑی اور رنگ کالا تھا۔ میں نے ایک نظر میں اندازہ کر لیا کہ آدمی نہایت خطرناک ہے۔ کمینگی اس کے چہرے سے عیاں تھی اور آنکھیں عیاری اور مکاری کا پتہ دے رہی تھیں۔ اس کے اطراف جو دونوں تھے وہ بھی اسی ہتھیلی کے چٹے بٹے تھے۔

میں نے پوچھا۔ "کیا تم ہی زمیندار ہو.....؟"

"آنکھیں کھول کر دیکھ تیری آنکھوں میں کیا موتیا اتر آیا ہے کہ پوچھ رہا ہے۔" وہ غصے سے بولا۔

"پوچھ لینا بھی تو اچھا ہے میں نے کیا برائی کر دی کہ تم خفا ہو۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"ہاں ہم ہی دھرم داس ہیں پتہ چل گیا اب چرنوں میں ڈنڈوت کر لے۔" وہ غرور سے بولا۔

"ہم ڈنڈوت کرنے نہیں آئے ایک کام سے آئے ہیں۔"

"جو ڈنڈوت نہ کرے ہم اس کا کام نہیں کرتے اگر ڈنڈوت راضی سے نہیں کرو گے تو غیر راضی کرنا پڑے گا۔ یہ ہمارا دستور ہے ہم ٹھاکر ہیں۔"

"اور ہم کسی دستور کے پابند نہیں ہیں ہم جو پوچھنے پتہ کرنے آئے ہیں تم بولو پوچھیں۔" میں نے کہا۔

"ہم جانتے ہیں تم کیا پوچھنے آئے ہو مگر جواب اسی وقت ملے گا جب تم ہمارے سامنے ڈنڈوت کرو گے۔ تم منہ اٹھا کر چلے آئے ہو اور اس ڈاکو کو بھی اپنی مدد کو لے آئے ہو مگر کان کھول کر سن لو نہ تم کچھ کر سکو گے اور نہ یہ ڈاکو کچھ کر سکے گا تم سمجھتے تھے ہم نرے زمیندار ہی ہیں۔" وہ غرور سے بولا۔

"اچھا ہوا تم پہچان گئے پر پیچے نہیں کرانا پڑے گا۔" شادو نے کہا۔

"اور ہمارا پر پیچے بھی تم کو مل گیا تم اب خود کو آزاد مت سمجھنا تم دونوں ہماری قید میں ہو۔ زیادہ اچھل کود کرو گے تو مارے جاؤ گے۔" وہ غصے سے بولا۔

"زیادہ مغروریت کی بات مت کر ٹھاکر۔ ایسا نہ ہو کہ تو دھوکے میں مارا جائے۔ تیرا گرو سونا کہاں ہے۔ اس کو بلا تو اسی پر اکڑتا ہے نا۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"تو میرے گرو کی بابت کیسے جانتا ہے۔" وہ بولا۔

"تو نے شادو کے بارے میں کہا۔ ہم کیوں آئے ہیں۔ یہ تجھے پتہ ہے میں تو حیران نہیں ہوا تو پھر تو کیوں حیران ہو رہا ہے۔ تیرے جس کان میں یہ سب باتیں آ رہی ہیں اب وہ کان بند ہوا۔ تو مجھے قید کر رہا تھا مگر تو خود اپنے گھر میں قید ہو گیا۔ یہ تیرے گرد بیٹھے آدمی بڑے جیالے ہیں تجھ پر جان نچھاور کرنے والے ہیں، مگر بیچارے تیری وجہ سے مارے گئے اب یہ تیرے نہیں ہیں۔"

وہ گھبرا کر بولا۔ "گرو کچھ بتاؤ یہ کیا بکواس کر رہا ہے۔"

میں اور شادو خاموش کھڑے رہے وہ گرو کو پکارتا رہا مگر کان بند ہو گئے۔ آخر چیخ کر مجھ سے بولا۔ "تو کون ہے؟"

"تیری بہت سنی ہے اب تو میری سن اور جواب دے اس کمرے میں تیری مدد کو کوئی نہیں آئے گا۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لے۔" میں نے کہا۔

اس نے صرف بے بسی سے میری طرف دیکھا مگر بولا کچھ نہیں تو میں نے پھر کہا۔ "تیرا گرو اندر آ سکتا ہے نہ کوئی اور۔ میرے ہر سوال کا جواب ٹھیک ٹھیک دیتا جا نہیں دے گا تو الٹا لٹکا دوں گا کیونکہ تیرا کردار تجھ پر رحم نہیں کرنے دے گا۔"

وہ خاموش رہا۔ تو میں نے کہا۔ "ایک لڑکی دلی سے بیاہ کر چمیل اناؤ آئی تھی اس کو کسی نے اغوا کر لیا۔ کئی آدمی مارے گئے اور کچھ بری طرح گھائل ہوئے سب نے کہا چمیل کے ڈاکوؤں کا کام ہے۔ چمیل کی گھاٹیوں میں شادو لال کا راج ہے۔ تیرے سامنے شادو لال کھڑا ہے اس کے حکم کے بغیر وہاں کچھ نہیں ہوتا۔ اس

READING CORNER
http://readingcornerurdu.blogspot.com

کے پورے اڈے پر عورت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اس علاقے میں صرف تو ہی ایسا ہے جو یہ ذلیل کام کر سکتا ہے۔ کسی قسم کا جھوٹ فریب مت کرنا بتا وہ لڑکی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا ناک کے نتھنے پھول پچک رہے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کتنے غصے میں ہے۔ کچھ دیر شوں شوں کرتا رہا مگر بولا کچھ نہیں تو میں نے پھر کہا۔ "یہ بیل کی طرح شوں شوں مت کر میری بات کا جواب دے۔ بھول جا اس بات کو کہ تو کہاں کا زمیندار ہے۔ تو اس کمرے کا قیدی ہے تیری آواز اس کمرے سے باہر نہیں جا رہی اور سن تیرا گورو کمرے کے دروازے پر موجود ہے وہ اندر آنے کی شکتی نہیں رکھتا اور تو باہر جانے سے مجبور ہے اور تو زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکتا تو فر فر بولے گا۔ مجھے اس کام پر مجبور نہ کر جو میرا پسندیدہ نہیں ہے۔ جلدی بول۔"

میں نے بات ختم کی تو وہ ذرا کسمسایا۔ زبان ہونٹوں پر پھیرتا رہا پھر بولا۔ "وہ لڑکی حویلی میں موجود ہے میرے آدمی اٹھا کر لائے تھے۔" وہ رک رک کر بولا۔

"اور تو نے ان کو انعام و اکرام سے نوازا ہوگا۔" شادو نے نفرت سے کہا۔

ٹھاکر نے قہر آلود نگاہوں سے شادو کو دیکھا اور بولا۔ "تو تو چپ ہی رہ بگلا بھگت میں سب جانوں تجھے۔"

"ٹھاکر تم شادو کی جوتیوں کی دھول کے برابر بھی نہیں ہو۔ تم ٹھاکر ہو بڑی ذات پر اتراتے ہو اپنے اوچھے کردار کو نہیں دیکھتے۔ تم جو گری ہوئی انسانیت سوز شرمناک حرکتیں کرتے ہو شادو وہ نہیں کرتا۔ شادو تم جیسے کم ظرف دولت مندوں کو لوٹتا ہے کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ ہر عورت کی عزت کرتا ہے اس کو میلی نظر سے نہیں دیکھتا۔ تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تمہاری ذلالت عروج پر ہے تو اس کی شرافت ایک مقام رکھتی ہے۔ اس لڑکی کو بلاؤ۔ آواز دو تمہارے اس مٹی کے مادھو کو۔ یہ لے کر آئے گا۔" میں نے کرسی پر بیٹھے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

ٹھاکر نے کہا۔ "شنکر چھوری کو لے آ....."

شنکر جیسے نیند سے جاگا اچھل کر کھڑا ہو گیا اور دوڑتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گیا اور پانچ منٹ کے بعد ہی وہ ایک لڑکی کو ساتھ لے کر آ گیا۔ لڑکی کی عمر زیادہ سے زیادہ پندرہ سال ہوگی وہ دلہن کے لباس میں ہی تھی مگر وہ لباس شکنوں سے بھرا ہوا تھا میلا کچیلا تھا اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار تھے اور چال میں لڑکھڑاہٹ صاف نظر آتی تھی۔ وہ چاروں طرف حیران حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہوگا وہ صاف نظر آ رہا تھا۔ شادو نے اس کو ایک نظر دیکھا اور اس کا خود پر قابو نہ رہا وہ غصہ اور نفرت بھری آواز میں بولا۔ "حکیم صاحب میری بندش کھول دیں میں اس ذلیل ٹھاکر کی اولاد سے حساب کرنا چاہتا ہوں۔ میری برداشت کی حد ختم ہونے والی ہے۔ میرا دماغ کہتا ہے یہ انسان نہیں بھیڑیا ہے۔ بھیڑیا۔ اس کے ساتھ کیا کرنا چاہئے وہ میں جانتا ہوں۔"

"سکون سے رہو شادو۔ یہ ذلیل اس لائق نہیں ہے کہ تم اس پر ہاتھ اٹھاؤ اس کا حشر کیا ہونے والا ہے تم خود دیکھ لینا۔ ٹھاکر اب یہ بتا تیرے اس ذلیل کام میں کون کون شامل ہے۔ لڑکی کو اٹھا کر کون لایا تھا۔ سب کو بلا لے تا کہ سب کا حساب کتاب ایک جیسا ہونا انصافی کسی کے ساتھ نہ ہو۔"

ٹھاکر خاموش کھڑا رہا۔

میں نے چھت کی طرف دیکھا میرے ساتھ ٹھاکر نے بھی نظریں اٹھائیں اور چیخ کر بولا۔ "بلاتا ہوں سب کو بلاتا ہوں۔" اور ایک ایک کر کے چھ کڑیل جوان جن کے جسموں پر چربی کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں کمرے میں آ گئے۔

میں نے الو کو اشارہ کیا۔ وہ منٹ کے ہزارویں حصے میں ہوا میں تیرتا ہوا آیا اور ایک جوان کی آنکھیں نکال کر کھا گیا۔ اس کا چہرہ خون آلود ہو گیا تکلیف کے مارے وہ زمین پر گر پڑا۔ یہ کام اتنی جلدی ہوا کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ہوا کیا۔ الو پھر آیا اور دوسرا زمین پر گر گیا اسی طرح الو سب کو اندھا کر گیا سب فرش پر پڑے بلبلا رہے تھے۔ ٹھاکر کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا

کہ اتنی جلدی اور اتنا بھیانک انتقام ان سب سے لیا جائے گا۔

وہ بے بسی کی تصویر بنا ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے سے باہر والوں کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ میں نے ٹھاکر کو دیکھا اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا مگر آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس کو اپنا انجام سامنے نظر آ رہا تھا۔ سب کو اذیتیں دینے والا جو زمین پر خود کو خدا سمجھتا تھا آج اس کو پتہ چلا کہ اس کی کیا حیثیت ہے وہ کتنا طاقتور ہے جس طاقت پر وہ غرور کرتا تھا وہ اندھی ہو گئی تھی اور زمین پر پڑی تڑپ رہی تھی۔

میں اس کے قریب گیا اور اس کو گردن سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا۔ "ان کے علاوہ اور کتنے ظالم ہیں وہ بھی بتا دے نہیں بتائے گا تو بھی میں تلاش کر لوں گا۔"

"بتاتا ہوں۔ بتاتا ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔

اور دس آدمی اور آئے۔ وہ بھی اس کے ساتھی تھے۔ ان سب کو بھی وہی سزا دی گئی۔ شادو اس پر خوش نہیں تھا وہ ان سب کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کو کہا۔ "موت تو کوئی سزا نہیں ہے یہ تو زندگی کی تکلیف دہ حالات سے چھٹکارے کا نام ہے۔ سزا یہ ہے کہ وہ زندہ رہے اور ساری زندگی ندامت کے آنسو بہاتا رہے جو دکھ لوگوں کو اس نے دیئے ہیں اٹھاتا رہے۔"

شادو میری بات سے مطمئن ہو گیا۔ کمرے میں خون بکھرا پڑا ہوا تھا۔ ہر طرف ٹھاکر کے جیالے پڑے تھے۔ وہ سب اندھے تھے۔ ٹھاکر ابھی ٹھیک تھا۔ اس کی ساری اکڑفوں ختم ہو گئی تھی وہ ہاتھ باندھ کر میرے اور شادو کے سامنے کھڑا تھا۔ "اب تو بھی اپنی سزا بتا دے۔" میں نے کہا۔

"میں توبہ کرتا ہوں۔ مجھے معاف کر دے میری سب زمین گھر روپیہ پیسہ مجھ سے لے لے مجھے معاف کر دے۔ میں بھگوان کے نام پر تجھ سے پرارتھنا کرتا ہوں۔" وہ پیروں میں گر پڑا۔

شادو نے پکڑ کر اس کو پھر کھڑا کر دیا اور کہا۔ "تو آدمی نہیں ہے..... تو سانپ ہے جس کی فطرت ہے کاٹنا۔ تو اپنی فطرت سے باز نہیں آئے گا۔"

"میرا سب کچھ تم لے لو تم زمینداری کرو میں تمہاری غلامی کرنے کو تیار ہوں۔" وہ بولا۔

"مجھے تیری زمینداری نہیں چاہئے۔" شادو نے گرج کر کہا۔

"اب تو اپنے گرو کو آواز دے وہ کمرے کے باہر کھڑا ہے....."

اس نے آواز دی۔ "گرو جی اندر آ جاؤ۔"

ایک موٹا تازہ آدمی جو دھوتی اور بنڈی میں ملبوس تھا اندر آ گیا اندر آ کر اس نے وہ نظارہ دیکھا کہ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ٹھاکر کے علاوہ سب پڑے تھے اور کمرہ خون سے بھرا ہوا تھا۔ "ارے ٹھاکر یہ سب کیا ہے۔ کا ہوا ان سب کو۔" وہ حیرت سے بولا۔

"اس سے کیا پوچھتا ہے بدبخت۔" میں نے کہا۔

گرو نے میری طرف دیکھا اس کو ایک کمزور سا بوڑھا سامنے نظر آیا۔

"تو تو ہے آفت کی پڑیا..... تو نے ان سب کو کشٹ دیا ہے۔"

"ہاں میں نے ان کو ان کے انجام تک پہنچایا ہے اور اب تیرا نمبر ہے۔" میں نے کہا۔

"میرا راستہ نہ روک لیتا تو..... تو ایسا کبھی نہ کر پاتا پاپی۔" وہ غصے سے بولا۔

"تو ایسا کر اپنی حسرت پوری کر لے..... میں تیرے سامنے کھڑا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں تو تیرا وہ کروں گا کہ تو یاد کرے گا۔" وہ بولا۔

اب ٹھاکر کے چہرے پر کچھ رونق آ گئی تھی۔

"ٹھاکر کو غلط راستہ دکھانے والا تو ہی تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میرے دھرم میں جو ٹھیک تھا..... میں نے وہی کیا ہے۔" وہ بولا۔

"تیرا دھرم کیا ہے پاپی۔" شادو نے پوچھا۔

"تو کس منہ سے بات کرتا ہے۔ شرم کر ڈاکو دنیا کو لوٹتا ہے ان کے مال پر عیش کرتا ہے اور مجھے پاپی کہتا ہے۔"

READING CORNER
http://readingcornerblogspot.com/

گرو نے جواب دیا۔

"تیرا دھرم وہی ہے جو شیطان کا دھرم ہے مگر یاد رکھ تو چاہے جو کر لے پھر بھی انسانوں کو ختم نہیں کر سکتا نیکی کی ہمیشہ جیت ہوتی رہے گی۔" میں نے کہا۔

"میں تیرے کس بل سب نکال دوں گا۔" وہ بولا۔

"تو اپنے چیلے کو بچا کیونکہ اس کی سزا کا وقت قریب آ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ منہ ہی منہ میں بدبدایا اور ہاتھ اوپر کر دیئے۔ ایک بہت بھاری تلوار اس کے ہاتھ میں آ گئی مگر وہ تلوار اتنی بھاری ہو گئی کہ وہ اس کو پکڑتے ہی گر پڑا۔ مگر گرتے ہی اس نے لوٹ لگائی اور ایک چیل کی شکل اختیار کر کے باہر کی طرف پرواز کر گیا۔ میں اگر اشارہ کرتا تو الو اس کے پیچھے ضرور جاتا مگر میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ کتنی دور جا سکتا ہے اس کے جانے کے بعد ٹھاکر بھی اندھوں میں شامل ہو گیا۔

"تیری زندگی کی یہ ضمانت ہے کہ تو آئندہ کسی انسان کو نہیں ستائے گا۔ ہر عورت کو اپنی ماں بہن سمجھے گا۔ اس کے خلاف تو نے کچھ کیا تو یاد رکھ مجھے پتہ چل جائے گا۔"

میں نے شادو کو اشارہ کیا اور ہم دونوں حویلی سے باہر آ گئے۔ دروازے پر کھڑے آدمی سے کہا۔ "ایک گھوڑا لا جلدی سے۔" وہ آدمی فوراً ہی ایک طرف چلا گیا اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کے جانے کے بعد شادو نے کہا۔

"آپ کس طرح جائیں گے۔"

"میں گھوڑا سواری نہیں کرتا تم اڈے پر چلے جاؤ۔" میں نے کہا۔

"نہیں میں اب وہ کام نہیں کروں گا جو اب تک کرتا تھا۔ میں اپنا آبائی کام کرالوں گا مزدوری کر لوں گا۔ میں نے آپ کے ساتھ جو دیکھا ہے وہ میری زندگی کا حاصل ہے۔"

شادو لال کی اندرونی کیفیت کو میں سمجھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "اس وقت تم اڈے پر جاؤ مگر صرف ایک بات یاد رکھو کہ تم شادو لال کسان ہو تمہارے اندر جو ڈاکو تھا وہ مر گیا ہے میں تم سے اڈے پر ملوں گا اور پھر تم اپنی آئندہ زندگی کا پروگرام بناؤ گے۔"

شادو لال روانہ ہو گیا اور میں دبلی اس لڑکی کو لے کر آ گیا۔ اب وہ اپنے باپ کے پاس ہے۔" رولو کا نے پوری روداد سنا ڈالی تو میں نے پوچھا۔

"شادو لال کے بارے میں کیا سوچا ہے۔"

"حکیم صاحب زندگی میں ہر طرح کے کرداروں سے واسطہ پڑتا ہے مگر کوئی ایسا ضرور ملتا ہے جو متاثر کرتا ہے کوئی اپنے ہنر سے کوئی علم سے کوئی گفتار سے کوئی کردار سے، شادو لال نے کردار سے متاثر کیا ہے۔ ڈاکے مارنا اس کی مجبوری تھی۔ اس کے اندر ایک جذبہ تھا۔ اس کو انتقام کہتے ہیں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا کہ یہ اس کے اور اس کے خاندانوں کے ساتھ کس نے کیا ہے اس لئے وہ ان لوگوں کا دشمن ہو گیا۔ وہ شعوری طور پر نہ ظالم انسان ہے نہ دولت کا لالچی ہے۔ اگر اس کو چمبل کی گھاٹی میں رہنے دیا جائے گا تو وہ اپنی ضرورت کے بجائے دوسروں کی ضرورت کی خاطر ڈاکے ڈالے گا۔ اس طرح ایک اچھا انسان برائی میں کب تک اچھا رہے گا۔ گندے نالے میں کوئی کب تک پاک رہ سکتا ہے۔" رولو کا نے سنجیدگی سے کہا۔

"مگر اس پر جو ڈاکے کے الزامات ہیں ہو سکتا ہے قتل کے ہوں اس کے لئے کیا کرو گے۔" میں نے پوچھا۔

"جو کام کرنے ہیں وہ تو کرنے ہیں رہ کے کانٹوں کا حساب نہیں کرنا ہے۔" رولو کا نے جواب دیا۔

"قانونی پیچیدگیاں اور وہ لوگ جو شادو لال کے دشمن ہیں وہ کب اس کو معاف کریں گے۔" میں نے پوچھا۔

"آپ جس لائن پر سوچ رہے ہیں وہ اپنی جگہ درست ہے مگر میں اپنی سی کوشش ضرور کروں گا۔" رولو کا نے کہا۔

"اور مجھے امید ہے تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ کیونکہ تمہاری نیت نیک ہے۔" میں نے جواب دیا۔ دوسرے دن رولو کا پھر چمبل روانہ ہو گیا۔ بھیس اس نے بوڑھے آدمی کا

ہی بنایا ہوا تھا۔

"اس دفعہ مجھے شادو لال کے پاس جانے میں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی۔ شادو لال مجھے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا بڑے ادب و احترام سے اس نے مجھے بٹھایا اور بولا۔ "میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

"مجھے پتہ تھا۔ تمہارے اندر جو تبدیلی آئی ہے میں اس کے بارے میں جانتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے اب پتہ چلا ہے کہ دنیا میں صرف ٹھاکر ہی نہیں رہتے، صرف ظالم ہی نہیں رہتے، یہاں پر مظلوم کی فریاد سننے والے اور ان کا دکھ دور کرنے والے بھی رہتے ہیں۔ میں صرف ایک ٹریک پر چل رہا تھا دوسرا ٹریک مجھے آپ نے دکھایا ہے میں آپ کا شکریہ ادا کس طرح کروں آپ کی کیا خدمت کروں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔" شادو لال نے کہا۔

"یہ تم نہیں کہہ رہے ہو تمہارے اندر کا اچھا انسان کہہ رہا ہے تم بنیادی طور پر ڈاکو نہیں ہو، تم نے ڈاکے مارے ضرور ہوں گے مگر اپنی زندگی کو عیش و عشرت میں بسر کرنے کو نہیں مارے ہوں گے اپنی ضروری ضروریات کی خاطر اپنے ساتھیوں کی خاطر ڈاکے مارے ہوں گے مجھے اس کا اندازہ ہے کیونکہ میں نے تمہارے اندر ایک اچھے انسان کو تلاش کر لیا ہے اور میں دوبارہ صرف اس لئے آیا ہوں کہ اس اچھے انسان کو باہر لے آؤں بولو تم اپنے اندر کے انسان کو باہر نکالنا چاہتے ہو۔" میں نے اس پر اور اس کے پاس بیٹھے دو آدمیوں پر گہری نظر ڈالی اور بات ختم کی۔

کچھ دیر گمبھیر خاموشی رہی اس کے بعد شادو لال نے کہا۔ "میرے اندر کا وہ انسان جس کا آپ نے ذکر کیا ہے اب تک ویسا ہی ہے جیسا اس اڈے پر آنے سے پہلے تھا۔ میں اپنی خوشی سے یہاں پر نہیں آیا تھا اور میرے ساتھ جو لوگ ہیں وہ سب بھی حالات کے ستائے ہوئے ہیں۔ کہیں نا کہیں پر وہ کسی کے ظلم کا شکار ہوئے ہیں اور حکیم صاحب کوئی خوشی سے مجرم نہیں بنتا، میرے ساتھ ایسے بھی ہیں جن کے بیوی بچے ہیں وہ ان سے ملنے بھی جاتے ہیں ان کا خرچ بھی پورا کرتے ہیں کیونکہ وہ ان کو کرنا ہے مگر خود کو چھپا کر رکھتے ہیں ان کو اگر شرافت کی زندگی مل جاتی ہے، سماج ان کو قبول کرتا ہے تو ان کے لئے اس سے بہتر اور کیا بات ہو گی مگر میں جانتا ہوں کہ ایسا ہونا آسان نہیں ہو گا اس لئے میں نے صرف اپنے بارے میں فیصلہ کیا ہے، سب کے بارے میں نہیں، میرے سب ساتھی میری طرف سے آزاد ہیں۔" شادو لال نے کہا۔

"اور تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"میں اب ڈاکے نہیں ماروں گا کسی دور دراز شہر جا کر محنت مزدوری کروں گا۔" شادو لال نے کہا۔

"اور اگر وہاں پر بھی پہچانے گئے تو جیل میں بند ہو جاؤ گے۔" میں نے کہا۔

"جیل اور پھانسی تو میرا مقدر ہے میں نے یہاں آنے سے پہلے ہی خود کو اس کے لئے تیار کر لیا تھا۔" شادو نے کہا۔

"مگر میں نے دوسرا طریقہ سوچا ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ کا طریقہ ضرور مجھ سے اچھا ہو گا بتایئے۔" شادو نے پوچھا۔

"تم قانونی طور پر خود کو قانون کے سامنے پیش کر دو آئندہ کے لئے لکھ کر دو۔" میں نے کہا۔

"یہ اچھی راہ ہے مگر اس میں جگہ جگہ کانٹے بکھرے پڑے ہیں۔" شادو لال نے اداسی سے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں تمہاری سچائی تمہارے ساتھ ہے۔ وہ کانٹے خود بخود ہٹ جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"میں نے آپ کو بہت کم دیکھا ہے۔ مگر جتنا دیکھا ہے وہ بہت ہے آپ جو کہیں گے میں کروں گا۔" شادو لال نے کہا۔

"تمہارے ساتھیوں پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔" میں نے پوچھا۔

"وہ سب اپنی اپنی جگہ آزاد ہیں جو یہاں رہنا چاہتے ہیں وہ رہیں جو میرے ساتھ جانا چاہیں وہ چلیں میرے ساتھ، جو کچھ دکھ میں اٹھاؤں گا وہ بھی اٹھائیں گے معاشرے

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

میں جگہ بنانے کو کچھ تو کرنا ہوگا۔" شادو لال نے کہا۔

"تمہارے کل کتنے ساتھی ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"ہم سب ملا کر بائیس آدمی ہیں۔ ان کے علاوہ گاؤں گاؤں ہمارے مخبر کام کرتے ہیں، ان کو میں شامل نہیں کر رہا کیوں کہ وہ بظاہر ہمارے نہیں ہیں۔" شادو نے جواب دیا۔

"تم ایسا کرو ان سب کو بلاؤ ان کے ساتھ بات چیت کرتے ہیں۔ ان کی رائے لیتے ہیں۔ ہر آدمی کے سوچنے کا انداز الگ الگ ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں سب کو بلاتا ہوں۔" شادو نے بھوندو کو اشارہ کیا اور وہ سب کو بلانے چلا گیا۔

کچھ ہی دیر میں تمام لوگ آ گئے دو آدمی پہرے پر تھے۔ وہ نہیں آئے۔ سب کے آنے کے بعد شادو نے ان سب کو مخاطب کر کے کہا۔

"میرے دوستو! میں جب یہاں آیا تھا اس وقت میں کورا کاغذ تھا یہاں کا سردار چرن سنگھ تھا۔ چرن سنگھ ایک بہادر آدمی تھا، میں نے اس کے ساتھ رہ کر بہت کچھ سیکھا اور اس نے مجھے اپنے بعد دوسرا نمبر قرار دیا وہ پولیس مقابلے میں مارا گیا تو تم سب نے مجھے اپنا سردار بنانا چاہا تو میں نے انکار کر دیا کیونکہ یہاں پر مجھ سے بھی پرانے ساتھی موجود تھے پھر سب کی رائے معلوم کی گئی اور سب نے فیصلہ میرے حق میں دیا اور میں سردار بنا دیا گیا، تم سب نے میرے حکم پر جان کی بازیاں لگا دیں۔ میں جانتا ہوں تم سب میرے وفادار ہو مگر میں اب اس مقام پر آ گیا ہوں کہ میں اس لائن پر نہیں چل سکتا۔ میرا دل اب ڈاکے مارنے کو نہیں کرتا اس لئے میں تم سب سے بنتی کرتا ہوں کہ مجھے جانے کی اجازت دے دو، میں تم سے غداری نہیں کروں گا خاموشی سے چلا جاؤں گا اور خود کو قانون کے حوالے کر دوں گا تم اپنا نیا سردار بنا سکتے ہو۔ میری لائن اب بدل گئی ہے میں تم کو اپنی روش بدلنے کو نہیں کہتا ہاں اگر کوئی اپنی مرضی سے میرے ساتھ چلنا چاہتا ہے تو ضرور چلے۔ مگر وہ اچھی طرح سوچ لے، میں نے خود کو ہر قسم کے حالات سے گزرنے پر تیار کر لیا ہے۔ مجھ پر مقدمے چلیں گے جیل ہو گی اور شاید پھانسی بھی ہو جائے مگر میں سب کے لئے تیار ہوں اور جو میرا ساتھی واپس اپنے گھر جانا چاہتا ہے وہ اپنی مرضی سے جا سکتا ہے جو یہاں رہ کر یہی کام کرنا چاہتا ہے وہ بھی اپنی مرضی کا مالک ہے۔ دوستو! تم سب سے بچھڑنے کا مجھے بہت ملال ہے مگر جب دل ہی اچاٹ ہو چکا ہو تو رہنا بیکار ہے میں دو دن تمہارے ساتھ ہوں تم سب جو فیصلہ کرو گے میں اس میں دخل اندازی نہیں کروں گا۔"

اور جب شادو لال خاموش ہو گیا تو بھوندو نے کھڑے ہو کر کہا۔ "سردار اپنے فیصلے پر ذرا نظر ثانی تو کرو۔ کتنے لوگ ہیں جو تم کو چاہتے ہیں۔ پیار کرتے ہیں، اپنی جان تم پر نچھاور کرتے ہیں۔" بھوندو کے بعد سب نے یہی کہا تو پھر شادو نے کھڑے ہو کر کہا۔

"میں جانتا ہوں تم سب یہی کہو گے کیونکہ تم سب جانتے ہو کہ میں کیسا ہوں۔ میں نے کسی کا حق نہیں مارا اور خود کو سردار نہیں سمجھا خود ساتھی بنا کر رکھا۔ مگر میرے دوستو! مجھے معاف کر دو میں اب تم لوگوں کے قابل نہیں ہوں میں بندوق نہیں اٹھا سکتا کسی کا مال نہیں لوٹ سکتا تو پھر بتاؤ میں یہاں کیا کروں گا، میرے نصیب میں آگے کیا ہے مجھے پتہ نہیں ہے تم آرام کر دسوچو غور کرو پھر کل اسی جگہ آ کر بتاؤ۔"

اور سب لوگ خاموشی سے چلے گئے، میں نے حیرت سے ان کے جانے کے بعد کہا۔ "حیرت ہے ایسا نظم و ضبط اور یہاں پر۔"

شادو لال مسکرایا اور بولا۔ "اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب میری عزت کرتے ہیں عزت اس لئے کرتے ہیں کہ میں نے ان کی عزت کی ہے۔"

"واقعی تمہاری زندگی کا یہ پہلو قابل تحسین ہے۔" میں نے کہا۔

دوسرے دن سب پھر جمع ہو گئے۔ بھوندو نے کہا۔

"سردار شادو لال نے ہم سب کا جتنا خیال رکھا ہے اتنا شاید ہمارے ماں باپ نہیں رکھتے۔ اب سردار کی جگہ پر جو آدمی آئے گا وہ سردار شادو لال ہی بتائیں گے، وہ جس پر

انگلی رکھ دیں گے وہی سردار ہو گا، ہم سردار شادو لال پر پورا بھروسہ کرتے ہیں۔ بولو دوستو! کیا میں نے ٹھیک کہا ہے۔"

سب نے ہاتھ اٹھا کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

تو شادو لال اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کالے خان کو اپنے پاس بلایا اور سب کو مخاطب کر کے کہا۔

"یہ تمہارا پرانا ساتھی ہے آزمایا ہوا بہادر نڈر ساتھی ہے مجھے یہ بہت پسند ہے اس کا حق بنتا ہے سرداری کا، بولو تم سب کو منظور ہے، کسی کو اعتراض ہو تو بے دھڑک بتائے۔" شادو نے کہا۔

سب نے ہاتھ اٹھا کر اور با آواز بلند اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ اس کے بعد بھوندو کھڑا ہوا اور بولا۔ "سردار شادو لال کی جگہ اب گروہ کا سردار کالے خان ہے، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں سردار شادو لال کے ساتھ جاؤں گا جو گزرے گی برداشت کروں گا شادو لال کو نہیں چھوڑوں گا۔"

اس کے بعد تین اور ڈاکو شادو لال کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گئے۔ یوں یہ پانچ آدمی خود کو قانون کے حوالے کرنے پر اپنی خوشی سے راضی ہو گئے۔ اس کے بعد میں نے کھڑے ہو کر کہا۔

"دوستو! تم شاید یہ خیال کر رہے ہو گے کہ میرے کہنے پر تمہارا سردار تم سے جدا ہو رہا ہے تو بھائیو! ایسا نہیں ہے، یہ سردار کی اپنی اندر کی آواز ہے جس پر وہ عمل کر رہا ہے اور دوسرے تین ساتھی جو اس کے ساتھ جا رہے ہیں وہ بھی اپنی مرضی سے جا رہے ہیں، میں کوئی بڑا لیڈر یا آفیسر نہیں ہوں مگر میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ شادو لال اور اس کے دوست معاشرے میں عزت کی زندگی گزاریں گے۔ میں قانونی طور پر سرکار سے لڑوں گا بڑے سے بڑا وکیل کروں گا کچھ وقت کی پریشانی ضرور ہو گی مگر شادو لال جیسا انسان ہے میں اس کے مطابق اس کو مقام دلواؤں گا۔ آپ سب بھی ان کے لئے دعا کرنا۔"

اس کے بعد میں شادو لال کو وہیں چھوڑ کر دلی آیا ہوں تا کہ آپ سے مشورہ کروں کہ کیا کرنا ہے۔"

"جگن ناتھ وکیل دلی کے نامی گرامی وکیل ہیں ان سے بات کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

دوسرے ہی دن میں اور رولو کا جگن ناتھ وکیل سے ملے۔ ساری روداد سننے کے بعد اس نے کہا۔ "معاملہ حل تو ہو سکتا ہے مگر یہ بھی ہو سکتا ہے پولیس اس کو طول دے اور شادو لال اور اس کے ساتھیوں کو جیل میں رہنا پڑے۔ اخبارات ذرا سی بات کو افسانہ بنا کر پیش کر دیتے ہیں یہ تو ایک مشہور ڈاکو کا کیس ہے، اخبار والوں کو ایک نئی کہانی مل جائے گی ہر روز بے پر کی اڑائیں گے۔" "آپ معافی کی درخواست تو کمشنر کو پیش کریں اس کے بعد بات آگے بڑھے گی۔" رولو کا نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں تیاری کرتا ہوں۔ کمشنر ہڈسن سے میری اچھی ملاقات ہے، زبانی بھی قائل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

میں نے پانچ ہزار روپے اس کی ٹیبل پر رکھے اور کہا۔ "یہ آپ کی ابتدائی فیس ہے۔"

"حکیم صاحب، میں آپ کو جانتا ہوں، اس کی ضرورت نہیں تھی میں نے جب ہاں کر لی ہے تو کام بھی ضرور کروں گا۔" وکیل نے کہا۔

اور شادو لال بمعہ تین ساتھیوں جن کے نام یہ ہیں، بھوندو، پنا لال، رشید بھیل کو کمشنر کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ کمشنر نے درخواست قبول کر لی مگر پولیس نے کئی مقدمات کھڑے کر کے ان سب کو گرفتار کرنے کے احکامات کورٹ سے حاصل کر لئے اور چاروں کو جیل بھیج دیا۔ اب کیس عدالت میں پہنچ گیا۔

وکیل نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں قانونی طور پر پولیس چالان پیش کرے تو ہم اپنا موقف بیان کریں گے۔"

درگا داس تھانہ انچارج چمبل گھاٹی بھی بلایا گیا اور پیشیوں کا سلسلہ چلنے لگا۔ جیل میں رولو کا نے ایسا انتظام کر دیا کہ شادو لال اور اس کے ساتھیوں کو کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ وکیل کیس لڑتا رہا۔ سب سے زیادہ خلاف گواہ درگا داس تھانیدار تھا۔ وہ اچانک بدل گیا اور اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ آہستہ آہستہ حالات شادو لال کے حق میں

READING CORNER http://readingcornerpk.blogspot.com/

ہوتے گئے۔

وکیل خود حیران تھا کہ اتنی جلدی وہ کامیابی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کشنر اور حکومتی لوگ بھی شادو لال کے خلاف نہیں تھے۔ یہ کس طرح، یہ صرف میں جانتا تھا رولو کا جو کام کرتا ہے اس میں وہ خود سامنے نہیں آتا اور کام ہو جاتا ہے اور آخر ایک دن شادو لال اور اس کے ساتھی باعزت طریقہ پر رہا ہو کر میرے پاس آ گئے۔ رولو کا موجود تھا مگر اس کا حلیہ وہی بوڑھے آدمی کا تھا۔

میں نے شادو لال اور اس کے ساتھیوں کو مبارکباد دی تو شادو نے کہا۔

"حکیم صاحب میرا دماغ اب تک یہ بات قبول نہیں کر رہا کہ میں رہا ہو گیا ہوں۔ جیل میں، میں اس طرح رہا کہ شاید کوئی اپنی سسرال میں بھی نہیں رہا ہو گا۔ جیلر اور پولیس اتنی خاطر کرتی تھی کہ کیا بتاؤں یہ سب کس طرح ہوا پتہ نہیں مگر ہے تو حیرت کی بات۔"

"اب تم کیا کرو گے۔" میں نے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

"محنت مزدوری ہی کر سکتا ہوں اور کیا کروں گا۔"

شادو نے جواب دیا۔

"دو چار دن دلی میں گھومو پھرو، آزادی کا مزا لو، تفریح کرو پھر میں تم کو کام بتاؤں گا۔" رولو کا نے کہا۔

ایک ہفتہ کے بعد رولو کا نے ایک لفافہ شادو کو دیا۔ چار ٹکٹ فرسٹ کلاس کے بمبئی کے دیئے اور کہا۔ "یہ تم چاروں کے ٹکٹ ہیں، اس لفافے پر پتہ لکھا ہے تم اس پتے پر جاؤ گے اور جو منیجر ہے وہاں کا اس کو یہ لفافہ دو گے بس تمہارا کام ختم وہ سب انتظام کر دے گا۔" اور شادو لال بمبئی روانہ ہو گیا۔

"شادو لال بمبئی میں کہاں گیا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"اس کو میں نے اپنے پروڈکشن آفس کا پتہ دیا ہے وہاں پر یہ سب کھپ جائیں گے۔" رولو کا نے جواب دیا۔

❄.....❄.....❄

کائنات کی حقیقت جاننا آسان نہیں ہے جن لوگوں نے کچھ حقیقت جان لی ہے اور یہ حقیقت جاننے کے لئے انہوں نے بڑی سخت محنت کی ہے اس حقیقت کو دو طریقوں سے جانا جاتا ہے۔ ایک طریقہ مادی کہلاتا ہے۔ اس طریقے سے کسی بھی شے کے بارے میں مادی وسائل سے غور و فکر کیا جاتا ہے۔

دوسرا طریقہ مذہبی ہے ہر مذہب میں اس کا طریقہ ہے لوگ اپنے اپنے مذہب کے اعتبار سے جسمانی اور مذہبی کوششیں کر کے کائنات کو سمجھنے کی جستجو کرتے ہیں۔

پھر میں نے پوچھا۔ "اور درمیان میں یہ جادو ٹونے کی طاقت کہاں سے آ گئی۔" اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں ہمیشہ رب کائنات کی طاقت ہی فتح یاب ہوتی ہے۔ ایک طاقت شیطان کی بھی مصروف عمل رہتی ہے یہ طاقت مختلف شکلوں میں انسانوں کو نقصان پہنچاتی ہے، رب کائنات نے شیطان کو اجازت دی ہوئی ہے کہ وہ انسانوں کو بہکائے ان کو نیک راہ سے ہٹائے مگر جو نیک بندے ہیں وہ شیطان کے بہکانے میں نہیں آتے۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ شیطان کے علوم تو عالم وجود میں ہیں اور جو اس کے پیروکار ہیں وہ بہر حال اپنی خبیث قوتوں کے ساتھ مصروف عمل رہتے ہیں ہم ان کو ہی جادوگر کہتے ہیں۔" رولو کا نے بات ختم کی تو میں نے پوچھا۔

"دنیا سے جادو کے وجود کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔"

"اس سے انسانوں کی آزمائش بھی ہوتی ہے۔ رب کائنات نے جو چیز بھی دنیا میں رکھی ہے وہ بے وجہ نہیں ہے تم کسی بھی چیز پر غور کرو اس کی افادیت سامنے آ جائے گی۔" رولو کا نے جواب دیا۔

"یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اب کدھر کا ارادہ ہے۔" میں نے پوچھا۔

"میں تو آپ کے ارادے کا پابند ہوں آپ جہاں کہیں گے چل پڑوں گا۔" رولو کا نے جواب دیا۔

"بانس بریلی کا نام سنا ہے تم نے۔" میں نے پوچھا۔

"بانس کا سنا ہے آپ نے اس میں بریلی کا اضافہ

کر دیا ہے۔" رولو کا نے مسکرا کر کہا۔

"ہمارے قریب ہی ہے، آؤ اس طرف چلتے ہیں۔ وہاں پر آج کل بڑے زور دار مقابلے ہو رہے ہیں۔ میں نے کہا۔

"کس قسم کے مقابلے۔" رولو کا نے پوچھا۔

"کشتی کے مقابلے۔ پورے ہندوستان کے بڑے نامی گرامی پہلوان وہاں موجود ہیں۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے چلتے ہیں۔" رولو کا نے کہا۔

اور ہم بریلی کی طرف چل پڑے۔ بریلی میں بھی پوربی زبان بولی جاتی ہے مگر شہر میں اردو کا رواج ہے مگر پوربی زبان کی چاشنی اس میں شامل رہتی ہے۔ اچھا بڑا شہر ہے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد یہاں رہتی ہے اور لوگ بزرگان دین کی تعلیمات کی بدولت دین دار ہیں۔

ہم نے اسٹیشن کے قریب ہی ایک سرائے میں رہنے کا بندوبست کر لیا۔ کشتی کے دنگل کی وجہ سے شہر میں بڑی رونق تھی۔ ہندوستان بھر سے کشتی کے شوقین لوگ جمع تھے۔ پنجاب کے دور کے علاقوں سے بھی لوگ آئے ہوئے تھے۔ ہم نے شام کے مقابلوں کے دو ٹکٹ خرید لئے تھے۔ یہ مقابلے ایک میدان میں ہو رہے تھے انتظامات بہت اچھے تھے اور تمام پہلوانوں کو میدان کے قریب ہی ٹھہرایا گیا تھا۔

چار بجے سے ہی لوگ آنے لگے تھے۔ کشتی کا آغاز شام چھ بجے ہوتا تھا۔ ہم جب اپنی نشست پر پہنچے تو اس وقت میدان بھر چکا تھا ڈھول والے تان اڑا رہے تھے پنجاب سے آئے ہوئے لوگ بھنگڑا ڈال رہے تھے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آج سب سے بڑی کشتی پنجاب کے جو گندر پال سنگھ کی تھی جو کہ پورے پنجاب کا چیمپئن تھا۔ اس کے مقابلے پر دھول پور ریاست کے راجہ کا پہلوان گوپی ناتھ تھا اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ صرف چند منٹ میں ہاتھی کو بھی گرا دیتا تھا۔

ان دونوں میں فاتح پہلوان کا مقابلہ چندومل سے کل ہونے والا تھا۔

مقابلے شروع ہو گئے پہلوان آتے گئے اور رات گیارہ بجے جو گندر پال میدان میں اترا۔ نہایت خوبصورت جسم لمبا قد اس نے ڈھول کی تال پر اکھاڑے کا چکر ایک ٹانگ سے لگایا۔

اس کے بعد گوپی ناتھ جھومتا ہوا اکھاڑے کے درمیان آ گیا۔ جو گندر پال کا جسم بہت خوب صورت تھا۔ سرخ و سفید تھا مگر گوپی سیاہ کالا تھا اور جسم ہاتھی کی مانند تھا وہ ایک گوشت کا پہاڑ لگتا تھا قد تو اس کا جو گندر پال سے کم تھا۔ مگر وزن زیادہ تھا۔

دونوں نے اکھاڑے کے درمیان آ کر ہاتھ ملایا درمیان میں ریفری نے کشتی کے قاعدے قانون بتائے۔ ڈھول کی آواز بند ہو گئی۔ ریفری ایک کنارے کھڑا ہو گیا اور کشتی شروع ہو گئی۔ گوپی ناتھ بہت تیزی سے حرکت کر رہا تھا وہ گول مٹول تھا وزن بھی زیادہ تھا مگر اس کی پھرتی حیرت ناک تھی وہ ایک جگہ نہیں ٹک رہا تھا جو گندر پال بڑے سکون سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا طریقہ کار وہی تھا جو شیر کا بھینسے پر وار کرنے کا ہوتا ہے اس کو جلدی نہیں تھی۔ وہ یہ بات جانتا تھا کہ گوپی ناتھ بھاری پہلوان ہے اس کا داؤ بھی بھاری ہو گا وہ اس کے داؤ سے بچ کر اپنا داؤ لگانا چاہتا تھا۔ گوپی ناتھ کا یہ داؤ تھا کہ وہ کسی ایک جگہ ٹک نہیں رہا تھا اس کو اندازہ تھا کہ جو گندر بدن میں ہلکا ہے اس کی حرکت بھی تیز ہو گی اور پھرتی بھی زیادہ ہو گی وہ جو گندر کا تو ڑ اپنی پھرتی سے کر رہا تھا۔

مگر جو گندر کا داؤ چل ہی گیا۔ اس نے ایک زبردست چال چلی۔ دائیں طرف جاتے جاتے وہ اچانک بائیں طرف آ گیا۔ دراصل اس کا حملہ تو بائیں طرف سے ہی کرنا تھا مگر وہ دائیں صرف دھوکا دینے کو گیا تھا۔ اب گوپی ناتھ کی دونوں ٹانگیں جو گندر پکڑے کھڑا تھا اور گوپی زمین پر چت پڑا کروٹ بدل رہا تھا لیکن صرف ایک منٹ ہی وہ زمین پر آ رہا کیونکہ اس نے اتنی طاقت سے اپنی ٹانگوں کو اپنی طرف کھینچا کہ جو گندر پال اس کے اوپر گر پڑا مگر جو گندر اس کے اوپر نہیں گرسکا کیونکہ گوپی ناتھ اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا جو گندر اکھاڑے میں گرا اور ایک بھاری لاری کی طرح گوپی ناتھ اس کے اوپر چڑھ گیا اور صرف چند منٹ میں ہی کشتی کا

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

فیصلہ ہوگیا۔ ریفری نے گوپی ناتھ کو فاتح قرار دے دیا۔ کشتی ختم ہوگئی اور دوسرے دن گوپی ناتھ اور چندومل کے مقابلے کا اعلان کر دیا گیا۔

دوسرے دن چونکہ ان مقابلوں کا آخری دن تھا اور یہی دو پہلوان لڑتے لڑتے فائنل میں پہنچے تھے اس لئے پنڈال میں تل دھرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ چندو گجرات کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ پہلوانی میں بالکل نیا تھا مگر ان مقابلوں میں وہ بہت بڑے بڑے پہلوانوں کو ہرا کر اس مقام تک آیا تھا۔ سنا تھا اس کی جسامت اور بدن بھی پہلوانوں والا نہیں تھا مگر حیرت انگیز پھرتی اور داؤ کی کاٹ کرتا تھا۔

چھوٹی کشتیاں ایک ڈیڑھ گھنٹہ تک ہوتی رہیں اور رات ساڑھے نو بجے بڑی اور فائنل کشتی کا اعلان ہوا۔ پہلے گوپی ناتھ ہاتھی کی طرح جھومتا اکھاڑے میں داخل ہوا اس نے ہاتھ ہلا کر اور کئی دفعہ ہاتھ جوڑ کر عوام کو سلام کیا پھر ایک طرف ایک بوڑھے پہلوان کے چرنوں کو ہاتھ لگا کر اس کے پاس بیٹھ گیا بوڑھے نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہا اور پھر وہ واپس اٹھ کر اکھاڑے کے درمیان آ گیا۔

کچھ ہی دیر میں چندومل اکھاڑے میں داخل ہوا۔ مگر اس کا انداز پہلوانوں سے الگ تھا۔ اس نے آتے ہی اکھاڑے کی مٹی ایک مٹھی اٹھائی اور منہ میں ڈال لی۔ پھر اکھاڑے کے سات چکر لگائے اور درمیان میں چند منٹ آسن جما کر بیٹھا رہا۔ اس کا یہ انوکھا طریقہ دیکھ کر میں نے رولو کا سے پوچھا۔ ”یہ کیا کر رہا ہے۔“

”یہ اپنی جیت کا انتظام کر رہا ہے۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”یہ کون سا طریقہ ہے۔“ میں نے پھر پوچھا۔

”تم دیکھ رہے ہو کہ یہ پہلوان نظر نہیں آتا اور یہ پہلوان ہے بھی نہیں۔ کشتی یہ نہیں لڑے گا بظاہر یہی لڑتا نظر آئے گا۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”پھر کون لڑے گا۔“ میں نے پوچھا۔

”اس کی تفصیل میں بعد میں بتاؤں گا ابھی آپ کشتی کا مزا لیں۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

ریفری درمیان میں آ چکا تھا دونوں نے ہاتھ ملائے اور ریفری ایک طرف ہوگیا۔ کشتی شروع ہوگئی۔ گوپی ناتھ کے مقابلے میں چندومل بہت کمزور اور چھوٹا نظر آتا تھا۔ گوپی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اس کی طرف بڑھا چندومل اپنی جگہ کھڑا رہا مگر سب نے حیرت سے دیکھا کہ چندومل گوپی کی گرفت میں نہیں آیا اور گوپی کے مڑنے سے پہلے وہ اس کی گردن پر ایک زوردار ہاتھ کا رگڑا دے چکا تھا۔ گوپی یہ ہاتھ کھا کر پلٹا مگر وہاں پر چندو نہیں تھا وہ دور کھڑا دانت دکھا رہا تھا۔ اس کا چہرہ عجیب رنگت کا ہو رہا تھا یہ چہرہ وہ نہیں تھا جب وہ اکھاڑے میں اترا تھا۔ گوپی کے چہرے پر ذرا سا خوف ظاہر تو ہوا مگر وہ جلدی پھر وار کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ چندو اکھاڑے کے درمیان کھڑا تھا اور گوپی اس کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ لیکن وہ حملہ نہیں کر رہا تھا نہ معلوم کیا بات تھی دو تین دفعہ وہ آگے بڑھا بھی مگر پھر رک گیا۔ پھر چندو نے ایک چھلانگ لگائی اور پورے وزن سے گوپی پر آ پڑا۔ اس کا وزن اتنا تھا کہ گوپی آسانی سے اس کو پٹک سکتا تھا مگر وہ اس کو پٹخ نہ سکا اور اس کے وزن سے اکھاڑے میں چت گر گیا اور چندو اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔ گوپی نے بڑی کوشش کی مگر چندو کو اپنے اوپر سے نہیں اتار سکا اور چندو یہ مقابلہ جیت گیا۔

ایک ہاتھی کو بکری نے شکست دے دی تھی میں نے اور سارے پنڈال نے یہ حیرت انگیز کشتی دیکھی۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ گوپی ہار گیا ہے مگر یہ سب آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ میں اور رولو کا پنڈال سے باہر آ گئے۔ میرا دماغ گوپی کی ہار قبول نہیں کر رہا تھا۔ سرائے میں آنے کے بعد میں نے رولو کا سے پوچھا۔

”یہ کیا تماشہ ہوا میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔“

”اب میں بتاؤں گا تو آپ کی سمجھ میں آئے گا۔ یہ کشتی گوپی پہلوان اور چندو پہلوان کے درمیان نہیں تھی دراصل یہ کشتی گوپی پہلوان اور ایک سفلی کے بیر کے درمیان تھی۔ آپ کو یہ اندازہ ہے کہ سفلی علم رکھنے والے جو جنتر منتر

پڑھتے ہیں اور ان کو ایسی غلیظ غذائیں کھانا پڑتی ہیں جو عام آدمی کبھی نہیں کھائے گا اس کے بعد وہ درجے بدرجے اوپر چلتا ہے اور پھر شیطان اس کو ایک بڑا مقام عطا کر دیتا ہے اور ایک بڑا ابیر بھیروں اس کا غلام ہو جاتا ہے۔ جس جادوگر کے قبضے میں یہ ہوتا ہے وہ خود کو بہت کامیاب اور بڑا جادوگر سمجھتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں۔ جس کی تقدیر تاریکیوں میں ڈوبنے لگتی ہے عقل اس کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے اور وہ بڑا طرم خان بن جاتا ہے۔ کیونکہ شیطان اس کے کان میں یہی پھونکتا رہتا وہ بھیروں سے کام لیتا ہے اور بڑے سے بڑا کام بھیروں آسانی سے کر دیتا ہے مگر سب کام بدھوتے ہیں پلید ہوتے ہیں۔ اس سے کسی مریض کے لئے دوا نہیں منگائی جا سکتی کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دوا کھا کر مریض ٹھیک ہو جائے گا ہاں ایک شرط پر وہ دوا لادے گا کہ اس کے بعد اس کے کسی عزیز کو اذیت ناک موت مارنے کی اجازت دی جائے گوپی ناتھ کی زندگی کو خطرہ ہے کیونکہ بھیروں اپنی جیت صرف اتنی ہی نہیں سمجھتا وہ گوپی پر مکمل فتح اس کو مار کر ہی سمجھے گا۔“ رولو کا نے بات پوری کی۔

”یہ تو تم نے بہت خطرناک بات بتائی۔“ میں نے کہا۔

”ہاں یہ ایک جان کا معاملہ ہے آج کی رات گوپی پر بہت بھاری ہے۔“ رولو کا نے جواب دیا۔

”تو پھر تم کیا کرو گے۔“ میں نے پوچھا۔

”میں آج رات گوپی چند کے قریب رہوں گا صبح آ کر بتاؤں گا۔“ اور رولو کا فوراً چلا گیا۔

”گوپی چند بریلی کے محلے تاج والا میں ٹھہرا تھا۔ یہاں پر استاد کرم چند کا بہت بڑا اکھاڑا تھا۔ اکھاڑے کے اطراف میں تمام گھر کرم چند کی برادری کے تھے اور سب ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے اور جو نوجوان اس فن میں شوق رکھتا تھا اس کی مالی مدد یہ سب مل کر کرتے تھے۔ بہت نامی گرامی پہلوان استاد کرم چند کے اکھاڑے سے ابھرے تھے۔ گوپی چند بھی اسی اکھاڑے سے ابھرا تھا ایک کشتی کے سلسلے میں دھول پور گیا تھا اور راجہ کو وہ اس قدر پسند آیا کہ اپنی ریاست میں روک لیا اور وہ دھول پور کا پہلوان ہوگیا۔ اکھاڑے میں رات سوگ کا سماں تھا گوپی کی ہار کا سب کو غم تھا سب اداس تھے۔ استاد کرم چند نے پوچھا۔

”وہ مچھر سا چھورا تیری پکڑ میں نہیں آیا میں تو یہ سوچ سوچ کے باولا ہوا جا رہا ہوں تو ہی بتا۔“

”ارے استاد کیا بتاؤں۔ کھوپڑی کچھ کام نہیں کر رہی۔ تم مچھر سا کہہ رہے ہو مجھے تو وہ ہاتھی سا نظر آوے تھا اور چھلاوے کی طرح یوں چوکڑی بھر رہا تھا ایک جگہ تو رکتا ہی نہ تھا۔“ گوپی نے جواب دیا۔

”اے کیا بات کرے ہے وہ، مچھر ہاتھی کیسے نظر آوے تھا۔“

”میں بتلاؤں استاد۔“ ایک شاگرد نے کہا۔

”ہاں چل تو ہی بتا۔“ استاد کرم چند بولے۔

”یہ کوئی جادو ٹونے کا چکر لگتا ہے سو بات کی ایک بات یہ کہ ہم مچھر بیکھیں اور استاد گوپی کو وہ ہاتھی نظر آوے تھا۔“ شاگرد نے حیرت سے کہا۔

”تیری بات دل کو لاگے ہے۔“ استاد نے جواب دیا۔

”تم غم نہ کرو گوپی استاد یہ تو کھیل ہے اس میں جیت کے ساتھ ہار بھی ہوتی ہے پھر کبھی موقعہ ملے گا تو سب بدلے پورے کر لینا۔“ شاگرد نے دلاسا دیا۔

”تو ایک طرف جادو بتلائے ہے پھر بولے ہے سب بدلے پورے کر لینا۔ ارے عقل کے ناخن لے لڑائی تو برابر والے سے ہوتی ہے اگر جادو ٹونا کا چکر ہے تو پھر ہم کا کریں گے بھلے مانس بول جواب دے۔“ استاد نے پوچھا۔

مگر شاگرد نے کوئی جواب نہیں دیا۔

رات زیادہ ہونے لگی تھی سب اٹھ کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر جانے لگے گوپی چند بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا استاد کرم چند بھی گھر روانہ ہوگئے اکھاڑے میں سناٹا چھا گیا۔ ہر طرف اندھیرے کا راج تھا اور میں اکھاڑے کی دیوار کے سہارے کھڑا تھا۔

میں نے دیکھا اکھاڑے میں کچھ غیر مانوس سی آوازیں آ رہی تھیں میں اکھاڑے کے عین سامنے جا کھڑا

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

ہوا میں نے دیکھا ایک بڑا ہی لمبا چوڑا آدمی زمین کھود رہا ہے اور صرف ہاتھوں سے یہ کام کر رہا ہے اور اتنی تیزی سے یہ کام کر رہا ہے کہ چند منٹ میں ہی اس نے کافی گہرا گڑھا کر دیا۔ میں اس کے سر پر چلا گیا وہ گڑھے کے اندر تھا میں نے ایک اشارہ کیا مٹی گڑھے کے اندر بھرنے لگی وہ کھود کر مٹی باہر ڈال رہا تھا اور میں اسی مٹی کو اندر ڈال رہا تھا۔ وہ حیران تھا آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔ شاید وہ سانس لینے یا کچھ اندازہ کرنے، گڑھے سے باہر آ گیا اس کے باہر آتے ہی پورا گڑھا مٹی سے بھر گیا وہ ہوا میں کچھ سونگھتا رہا اور پھر گڑھے کی جانب پلٹا مگر زمین ہموار تھی اور کوئی گڑھا وہاں نہیں تھا وہ پھر اسی مقام پر کھڑا ہو گیا اور دوبارہ گڑھے کی جگہ کھودنے کی کوشش کرنے لگا مگر اب ذہن میں سے ایک مٹھی مٹی وہ نہیں نکال سکا اب اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ مگر اس کی کوشش کم نہ ہوئی۔ کچھ دیر وہ لگا رہا اور آسمان کی طرف دیکھا اور واپسی کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک رسی کا بنا ہوا جال اس پر گر گیا اس نے اس کو توڑنے کی اور اس سے باہر آنے کی جان توڑ کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔

میں اس کے سامنے کھڑا تھا مگر اس کو پتہ نہیں تھا۔ میں نے اور اس کے قریب جا کر کہا۔ ”بے کار ہے یہ جال تو نہیں توڑ سکے گا میں جو پوچھتا ہوں اس کا جواب دے۔“

اس نے حیرت سے میری آواز سنی جب کچھ نظر نہ آیا تو بولا۔ ”تو کون ہے سامنے آ کر بات کر۔“

”تو حکم چلانے کی پوزیشن میں نہیں ہے میں جو پوچھتا ہوں اس کا جواب دے۔“ میں نے کہا۔

وہ خاموش رہا تو میں نے کہا۔ ”تو کون ہے۔“

”میں شنو ہوں۔“ وہ بولا۔

”شنو کون پوری بات کر۔“

”میں بھیروں کا غلام۔“ اس نے جواب دیا۔

”یہ گڑھا کیوں کھود رہا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

”گوپی چند کو ڈالنا تھا مار کر۔“ شنو نے جواب دیا۔

”اچھا تو پھر جلدی سے گڑھا تیار کر۔“ میں نے کہا۔

اور وہ پھر گڑھا کھودنے لگا اور چند منٹ میں ہی ایک گہرا گڑھا تیار تھا۔ اس کے بعد میں نے کہا۔ ”اب تیرا کام ختم ہوا اور پھر وہ گڑھے میں دفن ہو گیا۔ گڑھا پھر بھر گیا۔ اکھاڑا پہلے کی طرح ہو گیا اور بھیروں کا ایک غلام اس میں دفن ہو گیا۔

ایسا ہوتا ہے کوئی کسی کے لئے گڑھا کھودتا ہے اور خود اس میں گر پڑتا ہے یہ ہماری نظروں کے سامنے ہوتا ہے اور ہم اس سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتے۔ اب میرا کوئی کام یہاں پر نہیں تھا۔ میں واپس آ گیا لیکن اب بھی گوپی چند کی زندگی محفوظ نہیں ہے۔ بھیروں ایک خطرناک بیر ہے اس کی مکڑیاں پھر حرکت میں آ سکتی ہیں۔“ رولو کا نے بات ختم کی۔

”مگر سوال یہ ہے کہ یہ سب کون کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”اس سوال کا جواب ابھی میں نہیں دے سکتا کیونکہ ابھی صورت حال واضح نہیں ہے میں گوپی کی طرف جا رہا ہوں کیونکہ بھیروں کو جب پتہ چلے گا کہ اس کا بیر دفن ہو گیا ہے تو وہ دوسرا انتظام کرے گا۔ اس لئے گوپی چند کے قریب میرا ہونا ضروری ہے۔“ اور رولو کا چلا گیا۔

❁.....❁.....❁

”میں سیدھا گوپی چند کے پاس اکھاڑے میں چلا گیا اور اس سے ملا..... میں نے اس کو بتایا کہ تم صرف ایک اچھے پہلوان ہو مگر تمہارا مقابلہ اس دفعہ کسی پہلوان سے نہیں ہے۔“

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ”میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں مگر آپ کون ہیں۔“

”میں ایک انسان ہوں اور اسی رشتے سے آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں کیونکہ ایک شیطان آپ کے پیچھے لگا ہوا ہے اور دوسرا بڑا شیطان اس کی مدد کر رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”مگر میرا دشمن شیطان کیوں ہو رہا ہے۔“ گوپی چند نے پوچھا۔

”اس کا مجھے پتہ نہیں ہے مگر جلد ہی پتہ چل جائے گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔“ گوپی چند نے پوچھا۔

”تم صرف اتنا کرو کہ جب تک میں نہ کہوں اس اکھاڑے سے باہر نہ جانا۔ باہر زیادہ خطرہ ہے۔“ میں نے کہا۔

میں جانتا تھا جو کچھ ہو گا رات کو ہو گا دن میں سورج کی روشنی جادو کے بہت سے اثرات کو کمزور کر دیتی ہے اور سمندر اس کو ختم کر دیتا ہے۔

رات کے وقت میں روپوش تھا اور پورے بندوبست کے ساتھ اکھاڑے میں موجود تھا۔ مجھے پوری امید تھی بھیروں ضرور آئے گا میں صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ کس کے لئے کام کر رہا ہے اور اس کی ڈور کس کے ہاتھ میں ہے صرف بھیروں کو پکڑنا میرا مقصد نہیں تھا۔ اگر میں بھیروں کو پکڑ بھی لوں گا تو پھر کوئی دوسرا بیر آ جائے گا اور یہ سلسلہ نہیں رکے گا اور گوپی چند کی زندگی کو خطرہ ہی رہے گا۔

اماوس کی راتیں بڑی اندھیری ہوتی ہیں کسی قسم کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی اکھاڑے میں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ میں ایک کونے میں اندھیرے کا ایک حصہ بنا کھڑا تھا۔ میں نے اچانک دیکھا اکھاڑے کے عین درمیان جہاں پر شنو دفن تھا ایک چراغ جل اٹھا اور اس کی روشنی سارے اکھاڑے میں پھیل گئی۔ اس چراغ کے سامنے ایک ہیولہ سا گردش کرتا نظر آیا اور پھر اس ہیولے نے انسانی شکل اختیار کر لی۔ وہ انسان صرف ایک لنگوٹی باندھے ہوئے تھا۔ سارے جسم پر مٹی سے لیپ کیا ہوا تھا اور مٹی چراغ کی روشنی میں فاسفورس کی طرح چمک رہی تھی اس کے سر پر دو چوٹیاں دو سینگوں کی طرح کھڑی تھیں۔ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ چہرہ چپٹا تھا اور عام آدمی کے چہرے سے بڑا تھا۔ ناک نہ ہونے کے برابر تھی صرف دو سوراخ نظر آتے تھے دہانہ بہت چھوٹا تھا مگر دانت پھر بھی نظر آتے تھے اگر کوئی رات کے بجائے دن میں بھی اس کو دیکھ لے تو ڈر جائے۔ اس کے چہرے کی ہیبت ناکی رات کے اس سناٹے میں اور بھی بڑھ گئی تھی۔

میں جانتا تھا کہ یہ سوائے بھیروں کے کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس کو پتہ چل گیا تھا کہ اس کا غلام کہاں ہے اس نے اسی جگہ چراغ جلایا تھا وہ چراغ کے سامنے بیٹھ گیا۔ چراغ کی لو اپنی جگہ ساکت تھی۔ چند منٹ کے بعد اس نے آواز دی۔

”شنو ارے او شنو.....“ مگر اس کو جواب نہیں آیا تین دفعہ آواز دینے کے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔ اب وہ واپس جانے کی تیاری کر رہا تھا میں نے فوراً آگے بڑھ کر وہ چراغ اٹھا لیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے اور پھیل گئیں وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا اس کو صرف یہ نظر آیا کہ چراغ ہوا میں معلق ہے اور میں نے پھونک مار کر چراغ کو بجھا دیا۔ چراغ کے بجھتے ہی اس کے منہ سے ایک کراہ نکل گئی اور اس نے اکھاڑے کے باہر چھلانگ لگائی مگر درمیان میں ایک شیشے کی دیوار کھڑی تھی وہ اس سے ٹکرایا اور پھر اکھاڑے کے درمیان آ گیا۔ ایک دفعہ پھر اس نے جانے کی کوشش کی اور ناکام ہوا۔

”تو کون ہے رے۔ کاہے کھوٹی کرے ہے کچھ بول تو۔“ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

میں نے جواب نہیں دیا چراغ کی روشنی نہیں تھی گھپ اندھیری رات تھی ہاتھ کو ہاتھ نظر نہیں آ رہا تھا وہ اکھاڑے کے درمیان بیٹھا تھا میں اس کو دیکھ سکتا تھا اس کی ایک ایک حرکت میری نظر میں تھی میں جانتا تھا جب وہ ہر طرف سے ناکام ہو جائے گا تو گرو کو پکارے گا اور اگر ہوشیار ہوا تو گرو نہیں آئے گا اور اگر طاقت کے غرور میں ہوا تو آ جائے گا۔ بھیروں جیسا بیر بے بس ہو جائے تو اس کو سمجھ لینا چاہئے کہ بات بڑی ہے بڑی بات کو بڑے سوجھ بوجھ اور بڑے علم و ہنر سے طے کرنا پڑتا ہے۔ جذبات میں یا اپنی طاقت کے زعم میں صرف نقصان ہوتا ہے۔

میں نے جو اندازے لگائے تھے کہ بھیروں صرف اپنے گرو کو پکارے گا وہی ہوا۔ وہ دیوار سے ٹکریں مارنے کے بعد گرو کو پکارنے لگا..... گرو ہوشیار تھا وہ خود نہیں آیا اس نے وہیں سے بھیروں سے پوچھا۔ یہ آواز بھیروں کے کان میں آئی مگر میں تو بھیروں کے کان میں تھا۔ گرو نے پوچھا۔

”کاہے رے۔ کاہے شور کرے ہے۔“

”میں گھٹنائی میں پڑ گیا ہوں گرو۔“ بھیرو نے کہا۔

”ارے واہ رے چھچھورے تیری شکتی تو اپرم پار ہے

READING CORNER
http://readingcornerblogspot.com/

آجاواپس۔" گرو نے کہا۔

"چاروں طرف دیوار کھڑی ہے کیسے آؤں۔" بھیروں نے کہا۔

"ارے تو دیوار گرادے کا مشکل ہے۔" گرو نے جواب دیا۔

"نہ گرت نہ نظر آوت ہے۔ میری شکتی بے کار ہوگئی ہے تم آؤ تو....." بھیروں نے کہا۔

'بھیروں کی شکتی منہ پھیر گئی تو یہ کوئی اور ہی شکتی لاگت ہے میں اس ننھے میں نہ آسکوں ہائے کروں گا اپنے استھان پر فکرمت کریں کچھ کرتا ہوں۔" اور آواز بند ہوگئی۔

بھیروں گرو کو پکارتا ہی رہا اور جواب نہیں آیا۔

اب میں نے اس کے کان میں کہا۔" گرو نہیں آئے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ آئے گا تو واپس نہیں جائے گا۔ اگر نہیں یقین تو پھر گرو کو آواز دے۔" میں نے کہا۔

"تو کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔" بھیروں نے کہا۔

"میں کون ہوں اس کا پتہ تو تیرے بہت سے گرو نہیں چلا سکے میں تیرے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں مگر تو میرے سوالات کا جواب دے اگر ٹھیک ٹھیک جواب دے گا تو شاید کوئی نرم گوشہ میرے دل میں تیرے لئے پیدا ہو جائے۔" میں نے کہا۔

"پوچھ کیا پوچھتا ہے۔" بھیروں نے کہا۔

"تیرا گرو کون ہے اور کہاں پر رہتا ہے۔"

"میرے گرو کا نام گوبر دھن گوجر ہے۔" بھیروں نے جواب دیا۔

"تو اس کے پاس کب سے ہے۔" میں نے پوچھا۔

"سات سال پہلے اس نے مجھے پایا تھا ہزاروں کام اس کے کر چکا ہوں۔" بھیروں نے جواب دیا۔

"گوبر دھن گوجر کہاں رہتا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"اس کا استھان کشمیر کے ایک مقام پر ہے۔" بھیروں نے کہا۔

"میرے سوال کا ادھورا جواب مت دے۔ جگہ کا نام بتا۔"

"کشمیر میں ایک مقام ہے گنگوتری، یہاں سے دریائے گنگا بن کر نکلتا ہے۔ اس مقام پر اس کا استھان ہے اس مقام پر ایک جگہ اس کا ٹھکانا نہیں ہے ڈھونڈنا پڑے گا۔"

"تو نے جوابات ٹھیک دیئے ہیں اب یہ بتا تو اس گرو کے لئے کام کرے گا جو تجھے برے وقت میں اکیلا چھوڑ گیا۔" میں نے کہا۔

"ہاں میں اسی کے لئے کام کروں گا کیونکہ میں مجبور ہوں اس نے مجھے بڑے گرو سے پایا ہے اس نے کٹھن تپسیا اور جاپ کئے ہیں میں اس کو نہیں چھوڑ سکتا اگر چھوڑوں گا تو خود بخود ختم ہو جاؤں گا۔" بھیروں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے میں تجھے آزادی دے سکتا ہوں ایک شرط پر۔" میں نے کہا۔

"شرط بتا....." بھیروں نے کہا۔

"تو بڑے گرو کے پاس جائے گا۔ گوبر دھن کے پاس نہیں جائے گا۔ بڑے گرو کو میرا یہ پیغام دے گا کہ تیرے جیسے اور شیطان دنیا میں بھیج دے مگر تو کبھی کامیاب نہیں ہوگا بول تو یہ کہہ سکتا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں میں کہہ دوں گا۔" بھیرو نے کہا۔

"ٹھیک ہے تو جا سکتا ہے پھر کبھی اس طرف مت آنا۔" میں نے کہا۔ اور بھیروں چلا گیا میں نے اس کی وہ شکتی جس پر وہ پھولتا تھا یعنی وہ چراغ جیب میں رکھ لیا اور اکھاڑے سے باہر آ گیا۔

"تو اب تم گوبر دھن کی تلاش میں کشمیر جاؤ گے۔" میں نے رولوکا کا احوال سننے کے بعد کہا۔

"جانا تو پڑے گا کام ادھورا تو نہیں چھوڑا جائے گا۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"کشمیر بڑی حسین جگہ ہے۔ میں نے اب تک کشمیر نہیں دیکھا ہے میں بھی ساتھ چلوں گا۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے ضرور چلیں۔" اور ہم دونوں دوسرے ہی دن جموں کی طرف روانہ ہو گئے۔

جموں سے آگے پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا ہے

سڑک پیچ در پیچ درروں سے گزرتی ہوئی اوپر کی جانب جاتی ہے سڑک کے دونوں طرف ہرے بھرے میدان اور پہاڑ نظر آتے ہیں پانی کے چشمے اور پہاڑ سے گرتے آبشار میں ٹھنڈا اور میٹھا پانی بہتا نظر آتا ہے۔ جہاں کہیں میدان نظر آتا ہے وہیں پر کسان بھی کام کرتے نظر آ جاتے ہیں یہاں پر صرف دن میں لاریاں اور بسیں چلتی ہیں راستہ خطرناک ہونے کی وجہ سے رات کو کوئی سفر نہیں کرتا۔ گاڑی سے ہی نظر آتا ہے کہ گاڑی جس پگڈنڈی پر چل رہی ہے اس کے دونوں طرف کتنی گہری کھائی موجود ہے۔ مگر پہاڑی علاقے کے ڈرائیور اس روڈ پر گاڑی چلانے کے ماہر ہیں۔

ہم چار بجے شام گنگوتری پہنچ گئے۔ مقامی لوگ گاڑی سے اتر کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تو میں نے رولوکا سے کہا۔" یہاں کا موسم کافی ٹھنڈا ہے اور ہوا میں پانی کا تناسب بھی زیادہ ہے۔"

آپ نے درست کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ چاروں طرف پانی کے آبشار ہیں۔ پہاڑوں سے پانی گر رہا ہے اور ہر طرف ہرے بھرے میدان ہیں۔" رولوکا نے جواب دیا۔

روڈ کے کنارے ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ دو تین دکانیں نظر آ رہی تھیں۔ رات ہونے سے پہلے کچھ سر چھپانے کا بندوبست بھی کرنا تھا۔ میں اس بازار کی طرف چل پڑا ایک دکاندار سے میں نے پوچھا۔" یہاں رات گزارنے کو جگہ مل سکتی ہے۔" بڑی مشکل سے دو چار دفعہ کہنے کے بعد وہ میری بات سمجھ سکا پھر اس نے بھی اتنی ہی مشکل سے ہم کو بتایا کہ" آپ میرے گھر رک جائیں۔ کھانا نہیں ملے گا چائے ملے گی اور کرایہ دو روپے ایک آدمی کا روز کا ہوگا اگر کھانا کھاؤ گے تو تین روپے دینا ہوں گے۔" اس نے اپنا نام بتایا تو پتہ چلا وہ مسلمان تھا۔ ہم اس کے گھر چلے آئے یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا دیواریں مٹی کی تھیں اور کمرہ بہت کشادہ تھا اس کی فیملی وہیں رہتی تھی مگر درمیان میں ایک دیوار تھی اس کے مکان کے اطراف میں صرف چند مکان اور نظر آتے تھے وہ بھی اسی انداز کے بنے ہوئے تھے۔ چھتیں بہت نیچی تھیں اور ان پر بھی ہریالی نظر آتی تھی۔ اخروٹ اور آلو بخارے کے درخت گھر کے آس پاس موجود تھے۔ ہر طرف ایک بھینی بھینی سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور سرد ہوائیں چلنا شروع ہو گئی تھیں شام ہوتے ہی شاکر نے ایک لالٹین جلا کر کمرے میں رکھ دی تھی مالک مکان کا نام شاکر تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔" کھانا کب کھاؤ گے۔" یہ مرحلہ اس نے بڑی مشکل سے پار کیا اور میں نے اس کو بتا دیا۔" رات نو بجے کھائیں گے۔" میرے لئے بھی اتنی بات اس کو بتانا بھاری پڑ گیا۔ رات نو بجے جو کھانا شاکر نے ہمیں کھلایا وہ اچھا تھا بکری کا دودھ اور بھیڑ کا گوشت بھی اس میں شامل تھا کھانے کے بعد ایک دور قہوہ کا چلا اور پھر شاکر سونے چلا گیا۔ میں نے شاکر کے علاوہ اس مکان میں کسی کو نہیں دیکھا شاید شاکر کے بچے نہیں تھے۔

شاکر نے صبح آکر مجھے آواز دی۔ میں اور رولوکا دونوں ہی جاگ چکے تھے۔ اس نے ایک بڑے پتھر کی طرف اشارہ کر کے بتایا یہاں پر پانی رکھا ہے اور ایک طرف رفع حاجت کا بندوبست ہے اس کے اشاروں اور کچھ کشمیری اردو سے سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

ناشتے کے بعد رولوکا نے کہا۔" آپ تفریح کریں، گنگا کا آخری سرا دیکھیں میں ڈیوٹی پر جاتا ہوں۔"

گنگوتری ہندوؤں کا تیرتھ استھان بھی ہے یہاں پر بے شمار مندر ہیں۔ پہاڑوں پر مندر، وادیوں میں مندر اور تو اور غاروں تک میں مندر بنے ہوئے ہیں اور سب ہی بہت قدیم ہیں دریائے گنگا ہندوؤں کا نہایت معتبر دریا سمجھا جاتا ہے ہزاروں لوگ اس کی شروعات دیکھنے آتے ہیں۔ یہاں سے پانی بھر کر لے جاتے ہیں۔ ان مندروں میں برہمن روزانہ خوب پیسے کماتے ہیں۔ اکثر لوگ صبح آتے ہیں اور شام کو واپس چلے جاتے ہیں پورے ہندوستان کے لوگ یہاں نظر آتے ہیں مقامی لوگ کم اور بیرونی زیادہ نظر آتے ہیں۔

میں جانتا تھا گوبر دھن گوجر کسی نہ کسی مندر میں ہوگا میں ایک تلک دھاری سادھو کے روپ میں تھا میرے جسم پر صرف ایک لنگوٹی تھی ہاتھ میں ایک ٹیڑھی میڑھی لکڑی تھی۔

READING CORNER
http://readingcornerblogspot.com/

چہرے پر بے تحاشہ بڑھی ہوئی داڑھی اور اس داڑھی میں تنکے پھنسے ہوئے تھے۔ میں ایک بے پرواسا دھو بنا ہوا تھا۔

یہ بھیس میں نے اس لئے بنایا تھا کہ مجھے کسی مندر میں جانے سے کوئی نہ روکے۔ جاتو میں روپوشی کی حالت میں بھی سکتا تھا مگر اس سے لوگوں کے تاثرات مجھے نہیں پتہ چلتے۔ آپ کو پتہ ہے کو بردھن کتنا چالاک آدمی ہے۔ وہ حالات اور موقعہ شناسی کا ماہر لگتا ہے وہ اپنے سب سے بڑے بیر بھیروں کے قریب نہیں آیا۔ وہ سمجھ گیا تھا جو بھیروں کو قابو کر سکتا ہے وہ کوئی معمولی چیز تو نہیں ہوگا۔ وہ دور بیٹھ کر حالات کا جائزہ لے رہا ہوگا۔ اپنی شکتی کا وزن کر رہا ہوگا۔ بھیروں سے آگے کی شکتی کا پلان کر رہا ہوگا۔ خاموش تو نہیں ہوگا اس کے قریب اس کے بیر اس کی حفاظت کر رہے ہوں گے وہ ضرور کنڈل بنا کر دیواریں اونچی بنا کر بیٹھا ہوگا ایسا وہ کھلے میدان میں تو نہیں کر سکتا چار دیواری اس کو مندر میں ہی میسر آسکتی ہے۔

پہاڑ کے دامن میں مجھے ایک مندر نظر آیا میں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتا گیا۔ کافی بڑا میدان عبور کرنے کے بعد میں اس کے دروازے پر کھڑا تھا یہ مندر وشنو بھگوان کا تھا۔ مندر کے دائیں بائیں دو تین مکانات بھی نظر آتے تھے اور ان مکانوں کے سامنے سبزی کاشت کی ہوئی تھی۔ اسی سبزی کے کھیت میں ایک پجاری کھڑا تھا اس نے مجھے دیکھا تو میرے قریب آ گیا اور بولا۔

"مندر تو بند ہے سادھو مہاراج۔ اب بار بار تو میں بند کرنے سے رہا اور بھی بہت کام ہیں کرنے کو۔"

"بھگوان کے درشن کرنے کو تم نے وقت مقرر کر دیا ہے ہمارے اور بھگوان کے بیچ تم دیوار بن گئے ہو۔" میں نے ناراضگی سے کہا۔

میرے غصہ کرنے سے وہ مرعوب ہو گیا۔ بولا۔

"نہیں سادھو مہاراج ہم تو سیوک ہیں۔ پر دنیا میں اور بھی تو کام ہیں نہ کریں تو بھوکے مر جائیں۔"

"تو پھر دوار کیوں بند ہیں۔ کھلے رکھ یہ بھگوان کا استھان ہے اس کے چاہنے والے تو کسی وقت بھی آسکتے ہیں۔" میں نے رعب سے کہا۔ تو وہ بولا۔

"دوار تو کھلے ہیں بس بھیڑ دیتے ہیں۔ کوئی کتا بلی اندر نہ جائے اس کارن۔" وہ بولا۔

"اچھا بچہ تیرا نام کیا ہے۔" میں نے سادھوؤں کے انداز میں پوچھا۔

"میرا نام گنگا پرشاد ہے جی۔" وہ بولا۔

"اچھا گنگا پرشاد۔ گنگوتری میں بڑا مندر کہاں اور کس کا ہے۔" میں نے پھر پوچھا۔

"سادھو جی مندر تو بہت ہیں اور سب ہی بڑے ہیں۔" وہ بولا۔

"ارے مورکھ ہماری بات تو نہیں سمجھا جہاں بڑے گیانی شکتی وان پرش ہوں وہ بڑا استھان ہوتا ہے کوئی زمین پہاڑ چھوٹا بڑا نہیں ہوتا منش کی شکتی اور اس کے کرم بڑا چھوٹا بناتے ہیں۔ اب بتا۔" میں نے کہا۔

"واہ سادھو مہاراج اتنی گہری باتیں صرف تم ہی کر سکتے ہو۔" گنگا پرشاد نے جھوم کر کہا۔

"بتاتا کیوں نہیں بڑا مندر کہاں ہے۔ اور اس کا بڑا پجاری کون ہے۔"

"اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک مندر بنا ہے۔ سرسوتی دیوی کا مندر ہے۔ وہاں کوئی نہیں جاتا کیونکہ اوپر چڑھنا پڑھتا ہے دوسرے وہاں کوئی نہیں رہتا۔ کیونکہ وہاں پر سردی بہت ہے اور ہمیشہ موسم ایک ہی رہتا ہے، کھانے پینے کا بھی انتظام کرنا مشکل ہے پر ایک دیوی کا پجاری وہاں پر رہتا ہے۔ وہ کون ہے کہاں سے آیا ہے اس کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں ہے۔ اس کے وہاں ہونے کا پتہ یوں چلتا ہے کہ رات میں مندر میں روشنی نظر آتی ہے اور کبھی دن میں دھواں بھی نظر آجاتا ہے۔ اس پجاری کو بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے، میں نے بھی اس کو نہیں دیکھا۔" گنگا پرشاد نے بتایا۔

میں نے کچھ نہیں کہا تو وہ پھر بولا۔

"کہو تو کواڑ کھول دوں سادھو مہاراج۔"

میں نے کہا۔ "نہیں اب ضرورت نہیں..... پھر کبھی آئیں گے۔" اور میں واپسی کو پلٹ گیا۔

پہاڑ پر اوپر جانے کا راستہ چکر دار تھا اور صرف ایک آدمی اس پر چل سکتا تھا کہیں کہیں درے کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ راستہ پانی نے بنایا تھا بارش کا پانی پہاڑ سے اسی راستے سے بہتا ہوگا ابھی بارش کے آثار نہیں تھے اگر بارش ہو جائے تو اس پر چلنا ناممکن ہو جائے گا کیونکہ پانی کے بہنے کی رفتار بہت زیادہ ہوگی چھوٹے بڑے پرندوں کے سوا یہاں کوئی نہیں تھا۔ جگہ جگہ جھاڑیاں تھیں اور ان میں گول گول اور سرخ رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھل لگے ہوئے تھے۔

میں جانتا تھا یہ پھل بڑا مقوی اور مزے دار پھل تھا۔ سرسبز پہاڑی علاقے میں یہ پیدا ہوتا ہے۔ راستہ ابھی آدھا بھی طے نہیں ہوا تھا کہ اندھیرا پھیلنے لگا۔ اس راستے پر رات میں سفر کرنا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا مگر میرا سفر عام آدمی کا سفر نہیں تھا۔ میں پگڈنڈی کے راستے پر چلتا نظر آتا تھا اگر چاہتا تو فوراً اوپر جا سکتا تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں جس بھیس میں تھا انداز بھی وہی رکھا تھا۔ میں جس کے پاس جا رہا تھا وہ ایک شاطر انسان تھا میرے قدم اس راستے پر پڑے ہوں اور اس کی نگاہیں دیکھ نہ رہی ہوں۔ اس لئے میں ایک دیوانہ سا سادھو تھا اور اسی دیوانگی میں اس کی طرف جا رہا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ میرے کارندے میرے ارد گرد موجود تھے ان کی موجودگی صرف میں محسوس کر سکتا تھا اور دیکھ بھی سکتا تھا۔

سامنے مندر کا کلس نظر آ رہا تھا مگر وہاں جانے کا راستہ نہیں تھا۔ کیونکہ وہ راستہ جس پر چل کر میں آ رہا تھا اچانک گہری کھائی میں چلا گیا تھا۔

میں نے سوچا یہ پہلی رکاوٹ آئی ہے وہ وزن کر رہا ہے پرکھ رہا ہے کہ آنے والا خالی ہے کہ اس کے تھیلے میں کچھ ہے کہ نہیں اگر ہوگا تو کھائی عبور کرے گا خالی ہوا تو واپس چلا جائے گا دونوں صورتیں مجھے منظور نہیں تھیں میں خود کو منکشف کرنا بھی نہیں چاہتا تھا اور واپس جانا بھی مشکل تھا۔ پھر کیا کروں۔ میں نے سوچا اور وہیں بیٹھ گیا۔

اور پھر بڑی بلند آواز سے سرسوتی دیوی کو پکارا۔

"واہ ری دیوی یہ خوب رہی ہم تو تیرے درشن کو اتنی دور سے آئے ہیں اور تو نے ہی ہماری راہ میں روڑے اٹکا دیئے۔ مگر یاد رکھ ہم جائیں گے پھر بھی نہیں، ارے ہم تو دیوانے ہیں دیوانے۔" میری آواز رات کے سناٹے میں گونج رہی تھی میں نے کئی بار سرسوتی کو پکارا اور پھر کہا۔

"ٹھیک ہے سرسوتی تو ضدی ہے تو ہم بھی تیرے دیوانے ہیں۔ نہیں جائیں گے۔ اسی جگہ پڑے ہیں مر جائیں گے بھوکے پیاسے۔" مگر کچھ نہ ہوا۔ میں خاموش ہو گیا۔

میرے کارندے نے کان میں بتایا۔ "مندر میں صرف دو آدمی ہیں دونوں نے آواز سن لی ہے۔ مگر گیان دھیان میں لگے ہیں۔"

میں اپنا روپ قائم رکھنا چاہتا تھا وہیں پر بیٹھ گیا۔ پوری رات گزر گئی۔ سورج کی کرنیں مندر کے کلس سے ٹکرانے لگیں پرندے بھی دانہ دنکا کھانے نکل کھڑے ہوئے مگر مندر کی طرف سے کوئی زندگی کے آثار نظر نہ آئے۔ میرا کارندہ پھر میرے پاس آیا اور اس نے بتایا ان دونوں کا گیان ختم ہو گیا ہے اور وہ اب مندر سے باہر آئیں گے میں اٹھ کھڑا ہوا اور پھر سرسوتی سے لڑائی کرنے لگا۔

مندر کے دروازے پر ایک دراز شخص نمودار ہوا اور للکار کر بولا۔ "ارے کا بکواس کئے جا رہے ہو، مورکھ دیوی کا غصہ بہت برا ہے شراپ سے ڈر۔"

میں نے اس دیو ہیکل آدمی کو دیکھا اور کہا۔ "ارے تو کس سے لڑوں۔ چرنوں تک آنے کی راہ نہیں دیتی۔ کتنی کٹھور ہو گئی ہے۔"

"کا پاگل پن کی بات کرے ہے دیوی کا کیا قصور ہے اس میں۔" وہ بولا۔

"تو پھر یہ راستہ کون کاٹا ہے تو نے یہ نہیں کیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"مہا گرو نے یہ کاٹا ہے اگر ایسا نہ کریں تو ہر کوئی منہ اٹھا کے چلا نہ آئے گا۔" وہ بولا۔

"تو پھر گرو سے کہہ جا کر راستہ ٹھیک کریں۔ ہم دیوی کے چرنوں کی دھول لینے آئے ہیں اور لے کر ہی جائیں گے۔" میں نے کہا۔

READING CORNER
https://readingcornerpk.blogspot.com/

"آ سکے تو آ جا یہ تو ایسا ہی رہے گا۔" وہ بولا۔

"اور پھر تو بھی سن رکھ ہم بھی ایک ضدی ہیں جائیں گے نہیں۔" میں نے کہا۔

"تو کوئی پاگل لگتا ہے ارے مر جائے گا بھوک اور سردی سے جا واپس چلا جا۔" وہ پھر بولا۔

"تو اپنا کام کر...... ہم مر جائیں یا جی جائیں تیری بلا سے۔" میں نے کہا۔

میری اداکاری بالکل ایک ضدی بچے جیسی تھی۔

"اچھا ٹھہر جا تو ایسے نہیں جائے گا۔" وہ مندر کے اندر چلا گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک اس جیسا آدمی اور تھا۔ پہلے والے نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

"بڑا ہی دھیٹ آدمی لگتا ہے گرو جی میں نے سب جتن کر لئے پر یہ جاتا ہی نہیں ہے۔" دوسرے آدمی نے میری طرف غور سے دیکھا اس کی آنکھیں لال لال تھیں جسم سے وہ بھی بہت تگڑا تھا ایک دو قدم آگے کھائی کے عین کنارے پر آ کر بولا۔

"اپنی زندگی سے تجھے پیار نہیں ہے کیا؟"

"زندگی تو سب کو پیاری ہوتی ہے......" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر پلٹ جا...... یہاں کسی دیوی کا استھان نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"ارے واہ سب کہتے ہیں یہاں پر سرسوتی دیوی کا استھان ہے ہم تو بڑی دور سے درشن کو آئے ہیں درشن کئے بنا کیسے لوٹ جائیں۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"تو پھر سن بیس سال پہلے یہاں پر سرسوتی دیوی کی مورتی ہوا کرتی تھی وہ مورتی چور لے گئے اور تیری دیوی کچھ نہ کر سکی اس کے بعد اس جگہ ہمارا استھان ہے یہاں کوئی نہیں آتا، تو تو پاگل لگتا ہے کہ ایک دھن میں چلا آیا ہے اب واپس چلا جا۔" اس نے کہا جو کہ یقیناً گوبردھن تھا۔

"یہ کیا نئی کہانی تم نے سنا ڈالی ہم نہیں مانیں گے جب تک اپنی آنکھ سے نہیں دیکھیں گے ہم کو بہکانے کی کوشش مت کر۔" میں نے کہا۔

"تو بڑا ناداں ہے نا سمجھ ہے اور تیری میری کوئی دشمنی بھی نہیں ہے اس لئے سمجھا رہے ہیں تیری جگہ کوئی اور ہوتا تو کب کا کھائی میں پڑا ہوتا۔" گوبردھن نے کہا۔

"اچھا یہ تو بتا تو کون ہے ذرا پتہ تو چلے کہ بیس سال سے سرسوتی کا استھان ہتھیائے بیٹھا ہے کسی کو آنے بھی نہیں دیتا۔" میں نے کہا۔

گوبردھن کے چہرے پر ذرا سا غصہ آیا اور وہ بولا۔ "تو سن ہم گرو گوبردھن گوجر ہیں اب آگے مت بولیو۔" وہ بولا۔

"مجھے تو تو گوبر دماغ لگتا ہے میں نے پوچھا کیا ہے اور جواب کیا دے رہا ہے۔" میں نے کہا۔

گوبردھن کا چہرہ سرخ ہو گیا وہ دھاڑ کر بولا۔ "اچھا تو پھر تیرا کریا کرم کرنا پڑے گا۔" اس نے ایک ہاتھ اوپر اٹھایا مگر وہ ہاتھ نیچے نہیں آیا کیونکہ میرے کارندے اس پر سوار ہو چکے تھے۔ اس نے منہ میں کچھ منتر پڑھنا چاہا تو منہ بند ہو گیا۔ وہ اپنی طاقت کے زعم پر اپنی کوئی احتیاطی تدبیر نہ کر سکا میری اداکاری نے اس کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے ایک جست لگائی اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں حیرت سے اس نے میری طرف دیکھا بول تو وہ سکتا ہی نہ تھا۔

"ہاں تو مہا گرو گوبردھن گوجر بیس سال پہلے تو نے سرسوتی کے استھان پر قبضہ کیا اور اس کو اپنے باپ دادا کی جائیداد سمجھ کر رہ رہا تھا۔ معصوم اور بے گناہ لوگوں کو پریشان کر رہا تھا۔ تو نے بھیروں کو ایک بے گناہ پہلوان گوپی چند پر سوار کر دیا۔ بتا تیرا بھیروں اب کہاں ہے بڑی شکتی والا بیر تھا گوپی چند آج بھی ٹھیک ہے اور تیرا بیر تجھے چھوڑ کر بھاگ گیا ہے اور اس کی شکتی میری جیب میں ہے۔" میں نے کہا۔

وہ اشارے کرنے لگا تو میں نے اس کی زبان کھول دی پھر اس نے کہا۔

"میں دھوکے میں مارا گیا۔ تو بہت چالاک ہے۔"

"ہر مقام پر شکتی کی نہیں چلتی انسان میں عقل بھی ہونا ضروری ہے اب تیری شکتی تیرے کام نہیں آئے گی اس

لئے کہ میں نے تیرے سارے بیر قابو کر لئے ہیں۔"

"مجھے معاف کر دے میں یہ استھان بھی چھوڑ دوں گا سرسوتی کی مورتی بھی رکھ دوں گا۔" وہ بولا۔

"مجھے پتہ تھا کہ تو ہی چور ہے مگر اب تو اس قابل نہیں رہے گا کہ کسی کے استھان پر قبضہ کر سکے۔" میں نے اشارہ کیا اور میرا کارندہ اس کے اندر ناک کے راستے چلا گیا اور چند منٹ میں ہی گوبردھن ویران ویران نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اب وہ ایک پاگل شخص تھا اس کے جو ساتھ تھا وہ میرے پیروں پر گر پڑا تو میں نے کہا۔

"شکتی حاصل کرنا جتنا مشکل ہے اس سے زیادہ مشکل اس کا استعمال ہے۔ تیرا میرا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔" اور میں اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے تلاش کرتا رہ گیا اور میں واپس آپ کے پاس آ گیا۔" رولوکا نے اپنی روداد ختم کی تو میں نے کہا۔

"تم نے ٹھیک کہا انسان کی دشمن اس کی طاقت بھی ہے جب انسان کے پاس طاقت آ جاتی ہے تو وہ اپنا وہ وقت بھول جاتا ہے اور آخر یہ طاقت ہی اس کو ختم بھی کر دیتی ہے۔ وہ ذرا نہیں سوچتا کہ جو طاقت اس کو ملی ہے وہ کہاں سے ملی ہے دینے والا لے بھی سکتا ہے یا کسی اور کو بھی اس سے زیادہ طاقت دے سکتا ہے۔"

"اگر انسان اتنی بات پر غور کرے تو وہ کسی پر ظلم نہ کرے۔" رولوکا نے جواب دیا۔

اب ہمارا کوئی کام گنگوتری میں نہیں تھا ہم وہاں سے جموں واپس آ گئے اور پھر دلی کی طرف روانہ ہو گئے دو چار دن دلی میں گزار کر جے پور کی طرف چل دیئے۔

جے پور ایک راج واڑہ ہے یہاں پر ایک راجپوت راجہ کی حکومت ہے۔ یہ ایک نہایت صاف ستھرا شہر ہے سڑک کے کنارے جو عمارتیں بنی ہوئی ہیں وہ سب سرخ پتھر کی ہیں اور طرز تعمیر ایک جیسا ہے سڑکیں صاف ستھری ہیں صفائی کا یہاں پر بہت خیال رکھا جاتا ہے راجہ خود سڑکوں پر سیر کو نکلتا ہے راجہ انصاف پسند ہے ہندو ریاست ہونے کے باوجود یہاں پر بڑی تعداد میں مسلمان اور دوسری قومیں آباد ہیں اور کبھی کسی کو راجہ سے شکایت نہیں ہوئی۔ سب راجہ صاحب کا احترام کرتے ہیں راجہ سورج مل ہر دل عزیز شخصیت ہے۔ ریلوے کا اسٹیشن بھی نہایت صاف ستھرا اور عمارت سرخ پتھر کی تعمیر کردہ ہے۔ اسٹیشن کے باہر مسافر خانے کھلے ہوئے ہیں ان میں ہندو مسافر خانے اور مسلمان مسافر خانے الگ الگ ہیں ہم نے بھی ایک مسلمان مسافر خانے میں قیام کر لیا۔

مسافر خانے کے مالک کا نام احمد دین تھا مگر سب ہی اس کو دینو پھوپھا کہتے ہیں۔ بہت سادہ اور سیدھا آدمی ہے مگر باتونی بہت ہے اس نے ہمارا پورا انٹرویو کر لیا پھر بولا۔

"کیوں بھیا کا دھورے سے آئے ہو یا دور سے۔"

میں نے کہا۔ "دلی سے آئے ہیں۔"

"ارے دلی کا دور ہے یہ ہی پڑوس میں گلی ہے۔" وہ بولا۔

ہم نے کوئی جواب نہیں دیا تو پھر بولا۔ "دلی میں کا کام کرے ہو بھائی۔"

ہم نے کہا۔ "ہم دونوں حکیم ہیں۔ دلی میں ہمارا مطب ہے۔"

حکیم کے نام پر وہ چونکا اور بولا۔ "ارے واہ یہ بھی خوب رہی آج ہی بھرت پور سے چٹھی آئی ہے۔" ہم پھر خاموش رہے تو وہ بولا۔ "ہم ہیں تو بھرت پور کے پر یہاں آ کر بس گئے تھے کا کرتے مجبور ہو گئے تھے ہماری کون سنتا۔" وہ ہاتھ مسل کر بولا۔

"آخر ہوا کیا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا جی بات یہ ہے کہ ہم بھرت پور کے قریب گاؤں تلسی پور کے ہیں راج دھانی تو راجہ بھرت پور کی لاگے ہے تو بھیا او کا ہی چلے گا اور ہم ٹھہرے مسلمان پورے گاؤں دو ہی گھر مسلمانوں کے تھے دادا پردادا سے رہتے آئے تھے بہت زمین اور بہت بڑی حویلی ہمارے پرکھوں نے ہمارے لئے چھوڑی تھی پر کا خبر تھی کہ وہی زمین اور حویلی دشمن ہو جائے گی اور ہمیں جنم بھومی چھوڑنا پڑے گی۔" وہ

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

خاموش ہوگیا جیسے پرانی یادوں کے دفینے میں کچھ تلاش کر رہا ہو۔ پھر خود ہی بولا۔ ”ہمارے دادا نے بڑے کروفر اور ٹھاٹ سے جاٹوں کے گاؤں میں زندگی گزاری بنے خان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا دور دور کے گاؤں والے فیصلہ کرانے آتے تھے سات گاؤں کی پنچایت کے وہ بڑے تھے ان کا فیصلہ کورٹ کچہری تک میں مانا جاتا تھا مگر وہ بات ہمارے باپ میں نہیں تھی جو قوت فیصلہ دادا میں تھی وہ ان میں نہیں تھی وہ موقعہ محل دیکھ کر بات کرتے تھے ان کی بات میں لچک تھی دوٹوک بات کرنا ان کو نہیں آتا تھا ان کی یہ کمزوری جب پتہ چل گئی تو ان سے لوگوں نے بہت سے فیصلے اپنے مطلب کے کرالئے اور پھر ان کا زوال شروع ہوگیا اور وہ اپنے باپ کے منصب سے ہٹا دیئے گئے۔ سارے گاؤں تو ہندوؤں کے تھے ان کی نظریں بھی بدل گئیں اور پھر ایک کے بعد ایک گاؤں ہماری عملداری سے نکلتا تھا اور جب میرے ہاتھ میں لگام آئی اس وقت صرف تلسی پور کی زمین اور حویلی تھی اور پورے بیس کیس زمینوں کے دیوان میں چل رہے تھے۔ ہر روز ہی کوئی نہ کوئی تاریخ پڑ جاتی تھی میں صرف کورٹ کچہری کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس بھاگ دوڑ میں زمینداری پر توجہ کیا دیتا کارندے اپنی من مانی کر رہے تھے۔ وہ سب ہی ہندو تھے۔ ان کی ہمدردیاں ہندوؤں کے ساتھ تھیں وہ میرے ملازم ہو کر مجھ سے وفادار نہیں تھے یہ وہ لوگ تھے جو پرکھوں سے ہمارے ملازم تھے جن پر ہمارے خاندان کے ہزاروں احسانات تھے ہم نے ان کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کیا تھا یہ لوگ سمجھ چکے تھے کہ بنے خان خاندان ختم ہو رہا ہے گرتی دیوار سے کون لپٹا رہتا ہے مجھے کوئی گواہ نہیں ملتا تھا ثبوت بھی میں پورے نہیں کر پا رہا تھا اور کیس میرے خلاف جا رہے تھے مجھے بھی اپنی گرتی ساکھ کا اندازہ تھا۔ مگر میں بے بس تھا۔ یہ حالات میرے ساتھ ہی نہیں تھے سب مسلمان زمینداروں کا یہی حال تھا راجہ کے درباری اور خود راجہ بھی ہندوؤں کا پارٹ لیتا تھا پولیس میں عدالت میں ان کی ہی چلتی تھی۔ یہ ریاستی نظام تھا صرف ایک آدمی کا فیصلہ سب کو ماننا ضروری ہوتا ہے جو اس کے خلاف ہوا، وہ ریاست سے گیا۔

ان حالات میں میرا وہاں پر رکنا، اپنی اور اپنے خاندان کی خرابی کرنا تھا لہٰذا میں عزت کے ساتھ یہاں آ گیا۔ اور کچھ تو کرنا تھا تو یہ سرائے بنا کر بیٹھ گیا ساری زمین بنیوں کی تجوری میں چلی گئی رہ گئی ایک حویلی تو اس میں میری بہن رہتی ہے مگر اس پر بھی بنیوں کی نیت خراب ہے۔ وہ اس کو بھی ہتھیانے کی فکر میں ہیں۔ میری بہن آئے دن کی بیمار۔ تھوڑی سی زمین ہے اس پر اس کا گزارہ ہے۔ مگر میں اس کی طرف سے بہت فکر مند ہوں علاج ہو رہا ہے ٹھیک ہو جاتی ہے اور پھر بیمار پڑ جاتی ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ روگ کیا ہے۔“

”تم ایسا کرو بہن کو اپنے پاس بلا لو دیکھ لیں گے۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے کل ہی بلوائے لیتا ہوں۔“ دینو نے جواب دیا۔

دوسرے روز شام کو اس کی بہن آ گئی۔ تو دینو نے مجھے اطلاع دی۔ میں اکیلا ہی اس کو دیکھنے چلا گیا۔ وہ چارپائی پر لیٹی تھی۔ عمر کا اندازہ میں نے چالیس سے اوپر لگایا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا۔ جسم ہڈیوں کی مالا تھا۔ میں نے معائنہ کیا تو پتہ چلا کہ اس کا نظام ہاضمہ بہت بگڑا ہوا ہے میں نے پوچھا۔ ”کیا کھاتی ہو کتنا کھاتی ہو۔“ تو پتہ چلا کہ وہ کئی کئی دن کچھ نہیں کھاتی ذرا سا دودھ یا اسی قسم کی غذا پر زندہ ہے۔ اندر زخم وغیرہ کا سراغ بھی نہیں ملا۔ میں اس کے پاس ہی تھا کہ رولوکا آ گیا۔ میں نے اشارے سے اس کو معائنہ کرنے کو کہا۔ رولوکا اس کے سرہانے کھڑا ہو گیا اور ایک ہاتھ اس نے مریضہ کے ماتھے پر رکھ دیا۔ چند منٹ وہ خاموشی سے کھڑا رہا اور پھر بولا۔

”دینو کچھ کھانے کو لاؤ نرم چیز ہو تو زیادہ بہتر ہے۔“

یہ سن کر دینو دوڑ کر گیا اور ایک پیالے میں دلیہ لے کر آ گیا دلیہ میٹھا تھا اور اس میں دودھ پڑا ہوا تھا۔ رولوکا نے کہا دینو اپنی بہن کو کھلاؤ تو دینو اس کے برابر ہی بیٹھ گیا اور چمچے سے کھلانے لگا مریضہ نے پورا دلیہ کھا لیا۔

دینو نے حیرت سے کہا۔ ”اس کے پیٹ میں تو ایک

چمچہ نہیں سماتا تھا کیسے کھا لیا۔“

رولوکا نے کہا۔ ”اب یہ سب کچھ کھائے گی فکر نہ کرو۔ انسان کا پیٹرول غذا ہوتی ہے اگر گاڑی میں یہ نہ ہو تو گاڑی ٹھپ ہو جاتی ہے۔“ دو تین روز مریضہ نے غذا کھائی تو وہ چلنے پھرنے لگی اور چہرے پر بھی رونق آ گئی۔ نہ میں نے کوئی دوائی دی اور نہ ہی رولوکا نے کچھ کہا۔ میں نے رولوکا سے پوچھا۔

”آخر یہ ٹھیک کس طرح ہو گئی۔ تم نے تو بظاہر کچھ نہیں کیا۔“

”یہ چکر کسی دشمن کا تھا اس نے ایک حرام غذا اس کے پیٹ میں اتار دی تھی اور وہ حرام چیز درمیان میں رکاوٹ بن رہی تھی اور چونکہ یہ گندے عمل سے اتاری گئی تھی اس لئے صاف اور پاک غذا اندر نہیں جا پاتی تھی۔ یہ بھوک اور پیاس سے مرنے کے قریب آ گئی تھی۔ میں نے صرف یہ کیا کہ اس گانٹھ کو پگھلا دیا اور وہ پانی بن گئی رکاوٹ ختم ہو گئی اور غذا معدے میں جانے لگی اور اس کا علاج ہو گیا۔“ رولوکا نے بتایا۔

”اس کا مطلب ہوا یہ کسی دشمنی کا شکار ہو گئی تھی۔“ میں نے کہا۔

”دینو کے حالات تم نے سنے ہیں یہ سارا خاندان ہی دشمنی کی نظر ہو رہا ہے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”انسان کی فطرت بھی عجیب و غریب ہے۔ وہ گرنے پر آتا ہے تو جانور سے بدتر ہو جاتا ہے۔ اپنی کوتاہیوں کو محسوس نہیں کرتا۔ وہ دولت اور اقتدار کی ہوس میں اتنا آگے چلا جاتا ہے کہ خاندان در خاندان نسل در نسل لڑتا رہتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”مگر اس کا نتیجہ پھر بھی وہ نہیں نکلتا جو وہ چاہتا ہے وہ لڑتے لڑتے مر جاتا ہے اور اپنی لڑائی کی میراث اپنے پیاروں کو سونپ جاتا ہے پھر وہ لڑتا ہے اور یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔ انسان کی سوچی ہوئی ہر بات روبہ عمل نہیں ہوتی وہ خود پھنس جاتا ہے اس لئے میں بھرت پور جاؤں گا اور یہ نسلوں سے چلتی لڑائی کو ختم کرانے کی کوشش کروں گا۔“ رولوکا نے کہا۔

”میں ساتھ چلوں۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں آپ دلی چلے جائیں کیونکہ میں کسی اور ہی روپ میں بھرت پور جاؤں گا۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

دوسرے ہی روز میں دلی اور رولوکا بھرت پور روانہ ہو گیا۔

❋......❋......❋

”بھرت پور اور جے پور کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یہاں پر سرکاری کارندے دندناتے پھرتے تھے عوام ڈری ڈری نظر آتی تھی۔ قانون تو انگریزی چلتا تھا مگر اس قانون کے اوپر راجہ کا حکم بھی چلتا تھا۔ نہ کسی کی عزت محفوظ تھی اور نہ کوئی راجہ کے کارندوں کے خلاف آواز اٹھا سکتا تھا راجہ کے جاسوس ہر جگہ موجود تھے گھر میں بھی کوئی بات نہیں کرتا تھا کہ کون راجہ تک بات پہنچا دے اور اس پر عذاب نازل ہو جائے کسی کو کسی پر اعتبار نہیں تھا۔ ہر چیز پر راجہ کا حق تھا۔ وہ مکان ہو دکان ہو جانور ہوں کھیت کھلیان ہوں راجہ جب چاہے جو چاہے لے سکتا تھا ایک گھٹی گھٹی سی فضا اور خوف میں ڈوبا ہوا ماحول تھا۔ اس ماحول میں مسلمانوں کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی۔ میں ایک بے روزگار اور بھوکے نوجوان کے روپ میں تھا۔ مجھے روزگار کی تلاش تھی۔ میں شہر میں مارا مارا پھر رہا تھا کسی نے رحم کھا کر مجھے ایک داروغہ کا پتہ بتا دیا میں اس کے روبرو جا کھڑا ہوا۔ داروغہ نے اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر تاؤ دے کر پوچھا۔

”کیا ہے کیوں آیا ہے؟“

میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”حضور پریشان ہوں آپ مائی باپ ہیں رحم کریں کوئی چاکری دلوا دیں تو روٹی پانی کا کچھ ہو جائے۔“

اس نے پیر آگے کر دیئے اور بولا۔ ”اچھا پہلے میرے بوٹ کھول اور ذرا پیر دبا۔“

میں نے جلدی سے اس نے جو کہا تھا کیا اور پیروں میں ہی بیٹھ گیا۔ وہ گردن کرسی پر ٹکا کر آنکھیں بند کر کے آرام سے بیٹھا رہا۔ میں نے بہت اچھی طرح اس کی تھکن اتاری۔ آدھے گھنٹے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور بولا۔ ”کام تو چوکھا کرے ہے۔“

میں گردن جھکا کر خاموش اس کے پیروں میں بیٹھا

READING CORNER
http://readingcorner-pk.blogspot.com/

رہا تو وہ پھر بولا۔ "ہاتھ پیر کا بھی ٹھیک لاگے ہے کیا کام کرے گا۔"

"جو آپ حکم کرو گے کرلوں گا۔" میں نے مسکین صورت بنا کر کہا۔

"اچھا تو کل آئیو میں کچھ کروں گا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "تو پھر میں جاؤں۔"

"ہاں تو جا کام کرنا ہوئے تو کل آ جائیو۔" وہ بولا۔

میں پھر دوسرے دن اس کے پاس چلا گیا وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "مالی کا کام کرے گا بول۔" میں نے جھٹ جواب دیا۔ "ضرور کروں گا۔"

"راجہ کے محل میں جگہ ہے پر ایک بات کا خیال رکھنا۔ وہ راجہ کا محل ہے وہاں پر زنانیاں بہت ہیں۔ راج کماریوں کے علاوہ لونڈی باندی بھی بہت ہیں۔ نظریں نیچی رکھنا ذرا سی بھول تیری گردن اڑا دے گی۔ بڑی ہوشیاری کی ضرورت ہے زندگی اور موت کا کھیل ہے یہ سن رکھیو لنگوٹ کا پکا ہے تو ہاں کر بول کیا کہتا ہے۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "میں تو بھوک کا ستایا ہوا ہوں۔ میں کا ہے نظریں اٹھاؤں گا کوئی آئے کوئی جائے میں دیکھوں گا بھی نہیں آپ چنتا نہ کریں۔"

"اچھا تیرا نام کیا ہے اور پتہ بھی لکھوا دے۔" وہ بولا۔

"نام تو میرا جگن ناتھ ہے پر پتہ کیا بتاؤں میرا تو کوئی گھر دوار ہے ہی نہیں میں تو جی رانڈ کا سانڈ ہوں اور اب تو وہ رانڈ بھی نہیں رہی۔" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"اچھا چل ٹھیک ہے۔" اور میں اس کے ساتھ راجہ کے محل تک گیا۔ وہ مجھے لے کر ایک بغلی دروازے سے اندر گیا اور ایک بہت موٹے اور بڑی بڑی آنکھوں والے سے ملوایا اور بولا۔

"یہ مالی لایا ہوں چوبے جی تم نے کہا تھا نا۔"

چوبے جی نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "ابے کام کرے گا۔ مالی کا کام آتا ہے تجھے۔"

"کرلوں گا جی جیسا حکم ہوگا کرتا جاؤں گا۔" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"تجھے پتہ ہے یہاں صرف کھانا ملتا ہے روپے پیسے کی بات مت کریو بول۔" وہ بولا۔

"روٹی ملے گی یہ بہت ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا چل، باغیچے میں تجھے پہنچا دوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اور میں راجہ کے محل میں داخل ہو گیا۔ میں اپنے کام کے علاوہ چوبے جی کا بھی کام کر دیا کرتا تھا۔ چوبے دن رات شراب پیتا تھا۔ سارے محل کا انتظام اس کے ہاتھ میں تھا وہ جس کو چاہتا بھرتی کر لیتا اور جس کو چاہتا باہر نکال دیتا۔

میں وہیں رہتا بھی تھا چوبے مجھ سے بہت خوش تھا۔ میں اس کا خاص آدمی بن گیا۔ اس کی کمزوری شراب اور شباب تھی رات کو باندیاں اس کے پاس آتی تھیں اور شراب محل سے لا کر اس کو میں دیتا تھا وہ رات بھر شراب پی کر عیاشی کرتا تھا میری خدمت سے وہ اس قدر خوش تھا کہ مجھے محل میں جانے کی اجازت اس نے دے رکھی تھی یہ محل کیا تھا عیاشی کا اڈہ تھا۔ سینکڑوں ملازم ان میں جوان لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی ان کے علاوہ راج کماریاں الگ اپنی اپنی دنیا میں مست تھیں۔ ان کی دنیا کیا تھی ان کو پتہ نہیں تھا کہ ریاست میں کیا ہو رہا ہے۔ ان کی عیاشی کا ہر سامان محل میں موجود تھا۔ راجہ کی دنیا الگ تھی تو رانی کی دنیا بھی الگ تھی۔ شاہی خاندان میں یوں تو بڑی محبت نظر آتی تھی مگر اندر اندر ہی وہ ایک دوسرے کی کاٹ کرتے تھے۔ رانی راجہ کے علاوہ ہر مرد کو پسند کرتی تھی تو راجہ رانی کا حصہ کسی اور کو دیتا تھا۔ یہی حال راج کماروں کا تھا وہ ایک دوسرے کے خلاف تھے کیونکہ معاملہ گدی کا تھا۔ وہ کب سے کوشش میں تھے کہ راجہ مرے اور وہ راجہ کی گدی پر بیٹھیں۔ چھوٹا راج کمار خود کو زیادہ ہوشیار اور گدی کا اہل سمجھتا تھا تو بڑا جلد از جلد باپ کی جگہ لینا چاہتا تھا۔

چوبے یہ سب کچھ جانتا تھا وہ بڑا کائیاں تھا۔ اس صورت حال کا وہ پورا پورا فائدہ اٹھا رہا تھا وہ راج کماروں سے خوب دولت کما رہا تھا مگر وہ کسی کا وفادار نہیں تھا جس طرح وہ دونوں اپنے باپ کے وفادار نہیں تھے۔ یہ کیسی دنیا

تھی جہاں پر نہ وفا تھی نہ محبت نہ کسی رشتے کا تقدس تھا سارے محل کے در و دیوار پر سیاہی کی چادر چڑھی ہوئی تھی۔ جو اس محل کے اندر جاتا تھا وہ سفید پوش صاف ستھرا کس طرح رہ سکتا تھا وہ بھی اس رنگ میں رنگ جاتا تھا میں خود پر حیران تھا میں کیوں یہاں آیا ہوں کس کو راہ پر لگاؤں کس کو سزا دوں یہ تو خود اپنی بخشی کی طرف تیزی سے رواں دواں ہیں ان کی سزا یہی ہے جو یہ کر رہے ہیں میں چوبے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میں نے کہا۔

"میں جا رہا ہوں۔ اس گندگی کے ڈھیر پر میں اور زیادہ نہیں رہ سکتا۔" اس نے حیران نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا..... "روٹیاں لگ گئی ہیں مفت کی جو تھیں۔"

"تم اس قدر گر چکے ہو کہ تم صرف ایک طرف ہی دیکھ سکتے ہو اس محل کے باہر بھی ایک دنیا ہے تم شراب اور عورت کے آگے کچھ اور نہیں سوچ سکتے۔ اس محل کے سب مکین اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اس لئے میں جا رہا ہوں۔"

"ساری ریاست میں ہمارا راج ہے جائے گا کہاں ذرا باہر جا کر تو دیکھ پتہ چل جائے گا۔" وہ بولا۔

"میں کیوں آیا تھا اور کیوں جا رہا ہوں یہ میں تم کو نہیں بتاؤں گا مگر یہ بتائے دیتا ہوں کہ تم مجھے روکنے کی کوشش مت کرنا میں نے جو دیکھنا تھا دیکھ لیا۔" اور میں گیٹ کی طرف چل دیا۔ پگڑی والے پہرے دار نے دروازہ کھول دیا میں باہر آ گیا اور تلسی پور کی طرف روانہ ہو گیا۔

راجہ کے محل کے حالات جو تھے وہی تلسی پور گاؤں کے تھے یہاں پر بھی جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون چل رہا تھا۔ بنے خان کی حویلی ویران تھی ہر طرف دھول مٹی اڑ رہی تھی دیواروں پر پودے اگ رہے تھے۔ چیل کوؤں نے گھونسلے بنائے ہوئے تھے دروازہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ دینو کے خاندان کا کوئی فرد یہاں نہیں رہتا تھا۔ ساری زمینیں ہندو بنیوں کے پاس تھیں اور وہ پھر بھی اور زیادہ کی تلاش میں تھے غریب بہت زیادہ غریب تھا اور دو وقت کی روٹی نہیں کھا سکتا تھا اور دوسری طرف عیش تھا شراب تھی شباب تھا اس پوری ریاست کا ماحول اتنا بگڑا ہوا تھا کہ اس کی موجودگی پر حیرت ہوتی تھی۔ میں نے تلسی پور میں بھی کسی سے کچھ نہیں کہا ہے جیسا گیا تھا واپس آ گیا ہوں شیطان بہت خوش ہوگا میں اس کا کچھ نہیں کر سکا میں خود بھی شرمندہ ہوں کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔" رولو کا نے اپنی روداد بڑے دردناک انداز میں ختم کی اور خاموش ہو گیا ماحول پر سوگواری کی کیفیت طاری تھی۔ میں نے اس کیفیت کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ "اس میں تمہارا کیا قصور ہے تم کیوں اداس ہوتے ہو جو کرے گا وہ بھرے گا تم ایک نیک نیت لے کر گئے تھے مگر اس کالک کے ڈھیر میں کس کس کو دھوتے کس کس کو اٹھاتے ان کے نصیب ان سے روٹھ گئے ہیں۔"

"یہ بات آپ کی درست ہے ہم کسی کی تقدیر کو تو نہیں بدل سکتے۔"

میں نے احمد دین عرف دینو سے کہا۔ "تم نے سارے حالات سن لئے تمہاری بہن ٹھیک ہو گئی۔ کیا تم اب بھی تلسی پور اور اپنی زمین سے کچھ دلچسپی رکھتے ہو۔"

احمد دین نے فوراً جواب دیا۔ "اس زمین پر میں قدم رکھنا بھی نہیں چاہتا وہ تو گناہ کی نگری ہے میں جس حال میں ہوں بہت خوش ہوں اور میری بہن کے جو بچے ہیں میں ان کو بھی بلوا لوں گا۔"

"تم نے اچھا فیصلہ کیا ہے دولت زمین محل حویلی یہ سب چند روزہ ہیں ساتھ تو کچھ نہیں جائے گا اور جو چیز چند روزہ ہو اس سے محبت بڑھانا کون سی عقل مندی ہے۔" رولو کا نے جواب دیا۔

"اب تم ہم کو اجازت دو۔" اور ہم جے پور سے روانہ ہو گئے۔

❄.....❄.....❄

"جو مر جاتا ہے اس کے لئے ہر شے مر جاتی ہے یہی دنیا ہے یہاں ہزاروں آئے نئی نئی تہذیبیں آئیں ایک سے ایک رستم آیا ایک سے بڑھ کر ایک بہادر آیا چنگیز خان اور اس جیسے نہ جانے کتنے ظالم فرمانروا آئے اور آخر کار سب فنا کی گود میں چلے گئے کیونکہ بقا کسی شے کو نہیں ہے۔ ہر دور کا انسان یہ دیکھتا آیا ہے اس حقیقت کو وہ مانتا

READING COPY
http://readingcopy.blogspot.com

بھی ہے مگر پھر بھی اپنی ضد پر اڑا ہوا ہے اس نے رستم و سہراب کی شہ زوری کو ختم ہوتے دیکھا ہے اس نے نینوا جیسے شہر ختم ہوتے بھی دیکھے ہیں بے حساب آبادیاں بنیں اور پھر ان کا نشان نہ رہا۔ مؤرخ نے جو لکھا وہ ایک فیصد بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی چیز نہیں مرتی تو وہ ہے امید یہ کسی حال میں فنا نہیں ہوتی۔

انسان مرتا ہے تہذیب مرتی ہے شہر مرتے ہیں۔ طاقت اور غرور مرتا ہے۔ تاریخ میں کچھ لوگ زندہ ہیں ان کے کارنامے زندہ ہیں یہ اپنی نیک نامی سے زندہ ہیں۔ ہزاروں سال کی دھندان کے نام کو دھندلا نہیں سکی تو زندگی تو یہ ہوئی۔" رولو کا نے کہا۔

"بے شک تمہاری بات کا کوئی جواب میرے پاس نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ہر طرف کچھ نہ کچھ مسائل ہیں شاید یہی زندگی کی رنگا رنگی ہے خوشی اور غم دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے کوئی ہمیشہ خوش نہیں ہوتا کبھی نہ کبھی غم کا مزا لینا پڑتا ہے کوئی انسان اس سے مبرا نہیں ہے۔ مگر انسان میں اس کو سمجھتا ہوں جو تجربات سے سیکھتا ہے۔" رولو کا نے کہا۔

"تجربات انسان کو سکھاتے ہیں اور وہ سیکھتا بھی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو بیس سال کا جوان چالیس سال کے بعد بھی بیس سال کا ہی رہے مگر وہ ایسا نہیں رہتا بدل جاتا ہے یہ وقت کے تجربات کی وجہ سے ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"سیکھنے کا عمل تو ساری عمر چلتا رہتا ہے۔" رولو کا نے جواب دیا۔

"تمہارا موڈ ٹھیک ہوا۔" میں نے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں آپ پروگرام بتائیں۔" رولو کا نے پوچھا۔

"میں چاہتا ہوں تم کچھ آرام کرو۔ دلی میں تم آرام کرو میں کام کروں گا۔" میں نے کہا۔

"آرام وہ لوگ کرتے ہیں جن کے پاس کام نہ ہو۔" رولو کا نے جواب دیا۔

"کام تو دلی میں بھی آ ہی جائے گا تم نے کبھی کام تلاش کیا ہے وہ تو خود چل کر تمہارے پاس آتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک پھر دلی چلتے ہیں۔"

میں مطب میں مصروف ہو گیا اور رولو کا بھی کبھی کبھی میرے ساتھ بیٹھ جاتا۔ وہ اکثر خاموش ہی بیٹھا رہتا کبھی میرے کام میں مداخلت نہیں کرتا مریض آتے میں دوائیں لکھتا وہ لیتے اور چلتے جاتے۔

ایک دن ایک مریضہ آئی وہ ایک جوان عورت تھی اس کے ساتھ بوڑھی عورت اور مرد تھا میں نے معائنہ کیا بوڑھی عورت نے مریضہ کی کیفیت بتائی دورے پڑتے ہیں۔" اس کی یہ حالت کب سے ہے۔" میں نے پوچھا۔

چھ سال پہلے تک ٹھیک تھی ہم نے اس کی شادی کر دی شادی کے چھ ماہ بعد اس کو پہلا دورہ پڑا ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے منہ سے کف جاری ہو گیا دانت ایک دوسرے پر چڑھ گئے اور آنکھیں ایک طرف لگ گئیں سب گھبرا گئے مگر تھوڑی دیر کے بعد دورہ ختم ہو گیا اور یہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ داماد نے ہمارے پاس لا کر چھوڑ دیا۔ داماد سخت ناراض تھا اس کا کہنا تھا کہ یہ بیمار تھی تو میرے سر کیوں منڈھ دیا۔ رکھو اس کو اپنے پاس جب ٹھیک ہو جائے تو بتا دینا لے جاؤں گا۔"

"یہ دورہ روز پڑتا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں دو تین ہفتہ کے بعد دورہ پڑتا ہے۔" جواب ملا۔

"یہ مریضہ آپ کی کون ہے۔" میں نے پوچھا۔

"مجھ بدنصیب کی بیٹی ہے اور یہ اس کے باپ ہیں۔" اس نے مرد کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔

"اس کا کیا نام ہے۔" میں نے پوچھا۔

"اس کا نام روشنی ہے۔"

"اور شوہر کا کیا نام ہے۔"

جواب ملا۔ "حیدر علی۔"

"اب بتائیں حیدر علی کہاں رہتا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"وہ آگرہ کے محلے شاہ گنج میں رہتا ہے یہ وہیں بیاہ کر گئی تھی۔" ماں نے جواب دیا۔

"شادی سے پہلے کبھی اس کو دورہ پڑا یا اس قسم کے کوئی آثار آپ نے کبھی محسوس کیے یاد کر کے بتائیں۔"

"نہیں حکیم صاحب بڑی تندرست پیدا ہوئی تھی اور شادی ہونے تک کبھی کسی بیماری میں بھی مبتلا نہیں ہوئی۔" میں نے پھر ایک بار معائنہ کیا جسم میں کوئی آثار کسی بیماری کے نظر نہیں آتے تھے صحت بھی ٹھیک تھی چہرے پر بھی رونق تھی۔ جسمانی ساخت کے اعتبار سے وہ ایک حسین عورت کہی جا سکتی تھی۔ کسی بیرونی اور بناوٹی چیز کے بغیر بھی وہ اچھی لگ رہی تھی۔

میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو رولو کا دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا میں اس سے بے خبر تھا۔ وہ اٹھ کر میرے قریب آ گیا اور بولا۔ "اس کا علاج مطب میں نہیں ہو سکتا۔" میں سمجھ گیا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔

میں نے عورت سے پوچھا۔ "آپ کا مکان کہاں ہے۔"

"کھاری باولی میں رہتے ہیں ان کی دکان وہیں پر ہے کپڑے کا کاروبار کرتے ہیں۔" وہ بولی۔

"بات یہ ہے بہن کہ آپ کی لڑکی کو جسمانی تو کوئی بیماری نظر نہیں آتی کیونکہ دورہ روز کا ہوتا تو ہم دورے کے دوران پتہ چلاتے کہ کس قسم کا دورہ ہے اس وقت ان کا جسم بالکل نارمل ہے اب روحانی طریقہ پر غور کرنا پڑے گا اور وہ علاج یہاں دواؤں سے نہیں ہوگا۔ کل شام کو آپ کسی کو میرے پاس بھیج دیں میں اور میرے یہ ساتھی آپ کے پاس آ جائیں گے اور پتہ چلانے کی کوشش کریں گے۔" میں نے کہا۔

"تو کیا کسی سائے وغیرہ کا چکر ہے حکیم صاحب۔" وہ بولی۔

اس تمام عرصہ میں بوڑھا خاموش رہا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا یہ بات نہیں کرتے۔"

"کرتے ہیں مگر سنتے نہیں ہیں ہم لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں ان کو کچھ پتہ نہیں ہے۔" عورت بولی۔

"شام سات بجے میں فارغ ہوتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں کسی کو بھیج دوں گی۔" اور وہ لوگ چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے رولو کا سے پوچھا۔ "کیا چکر نظر آتا ہے۔" رولو کا نے جواب دیا۔

"آپ نے دیکھا عورت صحت مند ہے کسی بیماری کے آثار نہیں ہیں۔ اس نے اپنی بیماری کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا ایسا لگتا تھا جیسے اسے اپنی بیماری کی کوئی پرواہ نہیں ہے اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ آپ نے کیا اندازہ لگایا ہے۔"

"تمہاری قوت مشاہدہ مجھ سے بہت زیادہ ہے میں تسلیم کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اس قسم کے کیسوں میں اکثر جو نظر آتا ہے وہ نہیں ہوتا۔ تم نے دیکھا ہوگا کنواری اور خوب صورت لڑکیوں میں بے ہوشی کی بیماری ہوتی ہے زیادہ تر تو ہسٹریائی دورے ہوتے ہیں جن کا علاج مریضہ کی شادی ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ کچھ مکر کے دورے بھی ہوتے ہیں یہ دورے نہیں صرف ڈرامہ ہوتا ہے اس سے ماں باپ کو اشارہ دینا ہوتا ہے کہ وہ اس کی شادی کر دیں یا کسی مخصوص مرد کو حاصل کرنا ہوتا ہے سمجھ دار ماں باپ مریضہ کی شادی کر دیتے ہیں اور نا سمجھ اس کا علاج کسی سیانے سے کرواتے ہیں اور دھوکا کھاتے ہیں۔ پھل جب پک جائے تو اس کو ٹہنی پر رہنا پسند نہیں ہوتا حالانکہ وہ اسی ٹہنی پر لگا تھا اس پر پرورش پا کر کسی کے استعمال کے قابل بنا وہ اسی ٹہنی کو چھوڑنا چاہتا ہے یہی قدرت ہے اگر اس کو اسی ٹہنی پر رکھو گے تو وہ زمین پر گر جائے گا بکھر جائے گا مگر تمہارا یہ کیس اس سے ذرا مختلف ہے اگر لڑکی کی شادی شدہ نہ ہوتی تو مندرجہ بالا انداز میں سوچا جا سکتا تھا یہ لڑکی نہیں ایک جوان اور خوب صورت عورت ہے اور مزے کی بات یہ بھی آپ کو بتا دوں کہ یہ عورتوں کی اس قسم سے ہے جو مرد کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔"

"پھر یہ چھ سال سے اپنے مرد سے دور کس طرح ہے۔" رولو کا خاموش ہوا تو میں نے کہا۔

"تم نے بڑے تجربے کی بات کہی ہے اور تجربات کی بھٹی میں ہی انسان کندن بنتا ہے میں خود کو کندن تو نہیں

READING CORNER http://readingcornerblogspot.com/

کہتا مگر دنیا کے تاریک ترین علاقوں اور ان میں بسنے والے انسانوں کو میں نے دیکھا ہے ان کو پڑھا ہے۔ یہاں یعنی ہندوستان میں ماورائی قوتوں کا غلط استعمال بہت ہے۔ اس کو یہاں پر انسانوں کے نقصان کے لئے ہی استعمال کیا جارہا ہے۔ یہاں پر ہر وہ آدمی جو ذرا بھی ماورائی طاقت رکھتا ہے وہ غلط راہوں پر گامزن ہے۔ وہ نہیں سمجھتا کہ غلط راہ پر انسان انسان نہیں رہتا وہ نفس کا غلام بن جاتا ہے اور یہی نفس پرستی اسے صراط مستقیم سے دور کردیتی ہے وہ ایک راہ گم کردہ کا سا مسافر بن جاتا ہے یہ گمراہی اس کو اندھیروں کی طرف دھکیل دیتی ہے وہ بھول جاتا ہے کہ اندھیرے زیادہ پائیدار نہیں ہوتے روشنی ضرور ہوتی اور جب روشنی کی کرنیں اپنا نور پھیلاتی ہیں تو ان اندھیروں کے مسافروں کو اپنی قوت کے چھن جانے کا خطرہ لاحق ہوجاتا ہے۔'' رولوکا نے بات ختم کی۔

رولوکا اور میں دوسرے روز ایک آدمی کے ساتھ کھاری باؤلی مریضہ کے دروازے پر تھے وہ آدمی اندر چلا تو رولوکا نے گہری نظروں سے مکان کا اور اطراف کا جائزہ لیا۔

پھر ہم مکان کے اندر چلے گئے۔ اندر زیادہ لوگ نہیں تھے ان دو عورتوں کے علاوہ دو مرد تھے۔ ایک تو وہی بہرے مریضہ کے باپ اور دوسرے ان کے چھوٹے بھائی انہوں نے ہم کو بیٹھک میں بٹھایا اس کے بعد چھوٹے بھائی نے اپنا تعارف کرایا۔

''میرا نام مرزا شوکت علی ہے میں برکت بھائی کا چھوٹا بھائی ہوں۔ بھابی نے بتایا تھا کہ آپ لوگ آنے والے ہیں تو میں بھی آ گیا آپ نے مریضہ کو دیکھا ہے اس کو کیا مرض ہے ذرا مجھے بھی بتایئے۔'' شوکت علی نے کہا۔

''میں نے ان کا معائنہ کیا تھا جسمانی طور پر میں نے ان میں کسی بیماری کے آثار نہیں پائے یہ میرے ساتھ میرے دوست حکیم کامل ہیں یہ روحانی علاج بھی کرتے ہیں اس لئے اس جگہ جہاں مریضہ رہتی ہے کو دیکھنا بہت ضروری ہوتا ہے کہ وہاں پر کیا اثرات ہیں اس لئے یہاں آئے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''معاف کیجئے گا۔ میں ان چیزوں کو نہیں مانتا اپنا دھندہ کرنے کو بہت لوگ یہ کرتے ہیں۔ میں آپ کو نہیں کہہ رہا میں ایک عام سی بات کررہا ہوں۔''

''میں نے کہا یہ دنیا ہے میرے عزیز لوگ ضرور ایسا کرتے ہیں مگر سب نہیں کرتے۔ ہم یہ کام کسی لالچ یا دولت کمانے کو نہیں کرتے۔ رہی یہ بات کہ آپ اس کو نہیں مانتے تو میرے عزیز آپ کے نہ ماننے سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی۔ یہ ہندوستان ہے۔ یہاں پر یہ ہوتا ہے یہاں پر طاقت ور چیز کو پوجا جاتا ہے یہاں شیطان بڑی آسانی سے اپنا کام کرتا ہے کہیں وہ کسی دیوی کے روپ میں سامنے آتا ہے کہیں جادوگر کے روپ میں ملتا ہے کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ ایک دیوی حسین اور رحم کی دیوی کہلاتی ہے۔ دوسری طرف وہی قہر کی دیوی بن جاتی ہے ظلم کرتی اور بدصورتی کا بہروپ بدل لیتی ہے اس پر سیانے کیوں غور نہیں کرتے وہ ہزاروں سال سے سن رہے ہیں دیکھ رہے ہیں مگر خاموش ہیں کون ہے جو ان کی عقل پر پردہ ڈالے ہوئے ان کو اسی قدیم راہ پر چلائے جارہا ہے۔'' میں نے بات ختم کی تو شوکت مرزا بولے۔

''آپ کی بات سمجھ میں تو آتی ہے۔''

''اگر اب بھی بات صاف نہیں ہوئی تو میں کچھ عرض کروں۔'' رولوکا نے کہا۔

''ضرور فرمائیں ایسی علمی باتیں میں پہلی بار سن رہا ہوں۔'' شوکت نے کہا۔

''ایک قوم نے دور جہالت میں کچھ ایسی رسوم کو اپنایا تھا کہ وہ اس وقت کی ضرورت تھی ہزاروں سال اس بات کو گزر گئے ہندوستان میں بیرونی لوگ بھی آ گئے وہ بڑے ہوشیار تھے۔ ان کے پاس ہتھیار اچھے تھے وہ ان کمزور ہندوستانیوں پر حاوی ہوگئے۔ انہوں نے یہاں کے کچے ذہن کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ ہر طاقتور چیز سے ڈرتے ہیں اور اس کی پوجا شروع کردیتے ہیں۔ آنے والے ہوشیار لوگوں نے ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور ان رسوم کو اور زیادہ پائیدار بنانے کو ان کو چار حصوں میں تقسیم کردیا۔ خود

کو چونکہ اس وقت طاقتور تھے سب سے اوپر رکھ لیا یعنی برہمن بن گئے ان کو کوئی کام نہیں دیا گیا۔ یہ صرف مندروں میں آرام کریں اور سب ان کی خدمت کریں ان کا کوئی گناہ نہیں مانا جائے گا۔ ان کو سب کے مال پر حق حاصل ہوگا ان کا مال کوئی نہیں کھائے گا یہ سب کا کھائیں گے۔

اس کے بعد دوسرا راجہ کھشتری (راجپوت) ان کو کہ گیا کہ تم حکومت کروگے۔

تیسرے نمبر پر ویش کو رکھ دیا یہ کاروبار کریں گے۔

اور آخر میں سب سے مظلوم شودر آتے ہیں۔ یہ لوگ سب کی خدمت کریں گے اور ہر قسم کا ظلم برداشت کریں گے ان کے کوئی حقوق نہیں ہیں ان کا کچھ نہیں ہے اس ذات پات کی تقسیم اس ظالمانہ انداز میں وہی کرسکتا ہے جس کو مقامی لوگوں سے لگاؤ نہ ہو اس نے اپنے عیش کا سامان کرلیا۔ ہزاروں سال سے یہی ہورہا ہے اس کے خلاف کسی نے آواز نہیں اٹھائی۔ اس قوم نے علم حاصل کرنے کے بعد بھی صحیح راستہ کا تعین نہیں کیا۔ کسی بھی قوم کے لئے اس سے بڑا المیہ کیا ہوگا کہ وہ اپنے دور جہالت کی اساسی باتوں کو اب تک قائم کئے ہوئے ہیں۔'' رولوکا نے بات ختم کی۔

''آپ نے بڑی دور کی اور کام کی باتیں کرکے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔'' شوکت مرزا نے کہا۔

''میں نے آتے ہی آپ کا مکان اور اس کے اطراف دیکھ لیا ہے یہاں پر کچھ نہیں ہے لیکن ہے ضرور وہ کیا اور کیوں آتا ہے اس کا پتہ چلانا لازمی ہے۔'' رولوکا نے کہا۔

''اگر یہ کسی مخصوص وقت کی بات ہوتی تو آپ کو اس وقت بلایا جاتا مگر دورہ کس دن اور کس وقت پڑتا ہے اس کا تو کسی کو پتہ نہیں ہوتا۔'' شوکت مرزا نے کہا۔

''اس کا ایک طریقہ ہے اگر آپ لوگ مان سکیں۔ یہ میرے دوست حکیم کامل کو ایک کمرہ دے دیں یہ اس میں رہیں۔ دو دن چار دن دورے کے دوران ان کا ہونا بہت ضروری ہے اور علاج بھی دورے کے دوران ہی ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''یہ تو کوئی مشکل کام نہیں ہے۔'' شوکت مرزا نے جواب دیا۔

''آپ جائیں میں قیام کرتا ہوں۔'' رولوکا نے کہا۔

❀.....❀.....❀

''وہ رات خیریت سے گزر گئی میں نے کوئی رکاوٹ کسی کے آنے میں کھڑی نہیں کی اور مریضہ کو بھی نہیں بتایا کہ اس کا علاج شروع ہوچکا ہے۔ مجھے مریضہ کی نقل و حمل کی خبر رکھنا تھی میں رات دس بجے روپوشی کی حالت میں کمرے سے نکل کر مریضہ کے کمرے کی طرف گیا۔ یہ مکان قدیم طرز کا بنا ہوا تھا زنانہ حصہ مردانے سے دور تھا۔ مریضہ کا کمرہ آخری سرے پر تھا۔ دروازہ بند تھا میں اندر چلا گیا کیونکہ بند دروازے سے نہیں جانا تھا میرے اندر جانے کے بعد بہت راستے تھے مریضہ جس کا نام روشنی تھا وہ ایک بڑے سے آئینہ کے سامنے بیٹھی تھی اور بالوں میں کنگھی کررہی تھی میں خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کنگھی کرنے کے بعد وہ صندوق کی طرف گئی اور کئی جوڑے نکال کر پلنگ پر ڈال دیئے پھر ہر ایک کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی اور مسکراتی رہی اور پھر اس نے اپنے پہنے ہوئے کپڑے اتارنا شروع کردیئے اور میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

کچھ دیر کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ وہ پھر آئینہ کے سامنے بیٹھی ہے اور چہرے پر تمازہ اور نہ جانے کیا کیا لگا رہی ہے نیا لباس اس کے جسم پر بہت جچ رہا تھا۔

اس کا رنگ گورا تھا اور بدن سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ ہر مقام پر جس قدر گوشت ہونا چاہئے وہ تھا، نہ کہیں کم نہ کہیں زیادہ اتنا اچھا تناسب بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ سیاہ بال گھٹاؤں جیسے تھے جن کا اس نے جوڑا بنالیا تھا جوڑے میں سفید موتیے کے پھول سجالئے تھے۔ اس کی تیاریاں زوروں پر تھیں وہ ہیجان انگیز قیامت بنتی جارہی تھی۔ وہ کسی کے بھی وجود کو تسخیر کرنے کی طاقت بنتی جارہی تھی میں خاموشی سے اس کی ایک ایک ادا دیکھ رہا تھا۔ کچھ مقام اس دوران ایسے بھی آئے کہ مجھے اپنی آنکھیں بند کرنا پڑیں۔

پھر اس نے پلنگ پر ایک نئی چادر بچھائی چادر کا رنگ سرخ تھا اور موتیے کے پھول اس پر بکھیر دیئے اور ایک

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

بڑے سے تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گئی اب وہ کسی کا انتظار کر رہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں دروازہ کھلا اور ایک طویل قامت شخص کمرے میں آ گیا اس کی سج دھج بھی خوب تھی مردانہ حسن کا وہ شاہکار تھا اس کا سینہ چوڑا تھا۔ دونوں کی خوب جوڑی تھی۔

میں نے سوچا میں ان کی خلوت میں رہوں کہ نہیں مگر فوراً ہی میں نے یہ خیال اپنے دماغ سے جھٹک دیا کیونکہ میں تو علاج کی غرض سے موجود تھا۔ روشنی نے آگے بڑھ کر آنے والے کا والہانہ استقبال کیا چہرے پر بڑی آسودہ مسکراہٹ تھی۔ آنے والا بھی مسکرا رہا تھا۔ دونوں پلنگ پر بیٹھ گئے۔ ”مجھے دیر تو نہیں ہوگئی۔“ آنے والے نے اپنی بھاری آواز میں پوچھا۔

”نہیں مکاشی تم ٹھیک اپنے وقت پر آئے ہو تم ہمیشہ مجھ سے یہی پوچھتے ہو۔“ روشنی نے کہا۔

”میں تمہاری ناراضگی سے ڈرتا ہوں۔“ مکاشی نے کہا۔

”میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہوتی۔“ روشنی نے کہا۔

”عورت کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کب اور کس بات پر ناراض ہو جائے۔“ مکاشی نے کہا۔

”محبوبیت جس کا مان ہو وہ اپنے محبوب سے کبھی ناراض نہیں ہوتی وہ تو محبوب کی محکوم رہ کر ہی خوش ہوتی ہے۔ میں تو تمہاری ناراضگی سے ڈرتی ہوں اور اس سے زیادہ مجھے تمہاری پریشانیوں کا احساس ہے تم کتنا لمبا سفر کر کے میرے پاس آتے ہو۔ یہ تمہاری محبت ہی تو ہے۔“ روشنی نے کہا۔

”میں نے کبھی یہ نہیں سوچا تم کیوں سوچتی ہو؟“ مکاشی نے کہا۔

”مجھے احساس ہے کبھی کبھی مجھے تم سے بچھڑنے کا ڈر لگنے لگتا ہے۔“ مکاشی نے کوئی جواب نہیں دیا ہونٹوں پر انگلی رکھ کر روشنی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا چند منٹ کے بعد روشنی نے پوچھا۔

”کیا دیکھ رہے ہو۔“ مکاشی نے جواب دیا۔ ”مجھے ایسا لگا جیسے اس کمرے میں ہمارے علاوہ بھی کوئی ہے آج تنہائی بول رہی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیوں نہیں دیکھ پا رہا۔“

”تمہارا وہم ہے میں نے شام سے دروازہ بند کر لیا تھا آئے گا کوئی کیسے۔“ روشنی نے جواب دیا۔

”کچھ آنے والوں کو دروازے کی ضرورت نہیں ہوتی کیا میں تمہارے پاس دروازے سے آتا رہا ہوں۔“

”ہاں میں ایک بات بتانا بھول گئی، اماں مجھے علاج کے لئے حکیم کے پاس لے کر گئی تھیں۔“ روشنی نے کہا۔

”علاج کس چیز کا علاج۔“ مکاشی نے پوچھا۔

”اسی ڈرامہ کا جو میں ایک دو تین ہفتہ میں کرتی ہوں۔“ روشنی نے جواب دیا۔

”اب نہ کرو، وہ نہیں لے کر جائیں گی۔“ مکاشی نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہوگئی تو آگرہ سے حیدر علی لینے آ جائے گا۔“ روشنی نے جواب دیا۔

”میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ حیدر علی کا کانٹا نکالے دیتا ہوں مگر تم نے منع کر دیا۔ اب حکم کرو ڈال آتا ہوں کسی پہاڑ کی چوٹی پر۔“ مکاشی نے پوچھا۔

”نہیں کسی کی جان لینا ٹھیک نہیں، میں تو تمہاری ہوں وہ ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے اور رہے حکیم صاحب تو بیماری ہوگی تو اس کا علاج کریں گے دورے تو پڑتے ہی رہیں گے اور حکیم صاحب مرض پکڑتے رہیں گے۔“ وہ مزور سے ہنس کر بولی۔

”تو پھر کرتی رہو ڈرامے۔“ مکاشی نے کہا۔

”تم کتنا تڑپانے کے بعد آتے ہو روز نہیں آ سکتے۔“ روشنی نے پوچھا۔

”تم میری مجبوریوں کو جانتی ہو پھر بھی یہ کہتی ہو۔“ مکاشی نے جواب دیا۔

”میں کیا کروں، میں ہر وقت تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ رات گزرے گی اور میرا انتظار شروع ہو جائے گا۔“ روشنی نے کہا۔

”یہی زندگی کی چاشنی ہے، یہ انتظار ہی تو محبت بڑھاتا ہے۔“ مکاشی نے کہا۔

اور دونوں پلنگ پر لیٹ گئے اب میرا وہاں رہنا مناسب نہیں تھا۔ میں آپ کے پاس چلا آیا۔“ رولوکا نے پوری روداد بیان کر دی۔

”اس کا مطلب ہے میرا خیال درست تھا۔“ میں نے کہا۔

”کون سا خیال۔“ رولوکا نے پوچھا۔

”یہی کہ روشنی کو کوئی دورہ پڑنے کی بیماری نہیں ہے وہ صرف دورے کا ڈرامہ کرتی ہے کیوں کرتی ہے اس کا کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔“ میں نے کہا۔

”اب مجھے آنے والے کے بارے میں پتہ چلانا ہے کہ کہاں سے آتا ہے۔ یہ کام بھی بڑی ہوشیاری سے کرنا ہوگا کیونکہ اس کے ایک جملے نے مجھے ہوشیار کر دیا ہے۔“ رولوکا نے کہا۔

”کون سا جملہ تم نے سن لیا کہ تم چوکنا ہو گئے۔“ میں نے کہا۔

اس نے روشنی سے کہا تھا۔ ”تنہائی بول رہی ہے۔ میری موجودگی کا اس کو کچھ نہ کچھ احساس ضرور ہوا تھا اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کچھ نہ کچھ علم رکھتا ضرور ہے۔“ رولوکا نے بتایا۔

”تو پھر کیا کرو گے۔“ میں نے پوچھا۔

”رہنا تو مجھے روپوشی میں ہی ہے مگر کچھ پردہ دیز کرنا ہوگا۔“ رولوکا نے کہا۔

”اب اس کے آنے کا کیا پروگرام ہے تم کو کچھ پتہ ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”میں پتہ چلا لوں گا۔ اچھا میں جا رہا ہوں پھر آؤں گا۔“ اور رولوکا چلا گیا۔

❁.....❁.....❁

”یہ تو مجھے پتہ تھا کہ مکاشی روز نہیں آتا۔ ناشتہ پر میں نے شوکت مرزا سے کہا۔ ”ایک مسئلہ تو حل ہو گیا۔“

”اچھا کون سا مسئلہ حل ہو گیا۔“ شوکت نے پوچھا۔

”دورے نقلی ہیں روشنی کو کوئی بیماری نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

شوکت نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور کہا۔

”کیا واقعی آپ درست فرما رہے ہیں۔“

”مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت کیا ہے۔“ اس نے کہا۔

”میری عقل تسلیم نہیں کر رہی۔ اگر روشنی کنواری ہوتی اور یہ حالات ہوتے تو ہم کوئی مطلب نکال سکتے تھے مگر روشنی تو ایک شادی شدہ عورت ہے اس کو دوروں کا مکر کرنے کی ضرورت کیا پڑ گئی۔“

”میں ابھی اس مقام پر نہیں ہوں کہ آپ کو اس کی تفصیل بتا سکوں۔ مگر بہت جلد آپ کو میں بتاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”کچھ تو فرمایئے میرے دماغ میں تو ایک ہلچل پیدا کر دی ہے آپ نے۔“ شوکت نے کہا۔

”ضد نہ کریں..... جب وقت آئے گا تو میں ضرور بتاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے میں ضد نہیں کرتا۔“ شوکت نے کہا۔

”اب ذرا روشنی کو بلایئے۔ مجھے کچھ بات کرنی ہے۔“

شوکت مرزا چلے گئے واپس آئے تو ان کے ساتھ نہایت سادہ لباس میں نظریں جھکا کر روشنی آ گئی۔ میں نے اس کے سراپے کا گہری نظر سے جائزہ لیا مجھے وہ رات والی روشنی کہیں سے نظر نہیں آئی پھر میں نے شوکت مرزا کو کہا۔

”آپ ذرا دور چلے جائیں میں کچھ باتیں تنہائی میں کرنا چاہتا ہوں۔“ شوکت اٹھ کر دالان میں چلا گیا تو میں نے روشنی کو کہا۔

”دنیا میں کم لوگ ہیں جو پورے پورے ایماندار اور سچے ہیں۔ کوئی کسی مصلحت کے تحت جھوٹ بولتا ہے کوئی اپنی عادت سے مجبور ہوتا ہے ہر جھوٹا انسان بے وقوف ہوتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں جھوٹ بول کر کامیاب ہوں مگر ایسا نہیں ہوتا اس کا جھوٹ کبھی نہ کبھی پکڑا ہی جاتا ہے۔ اس وقت بچاؤ کے راستے بند ہو چکے ہوتے ہیں اور وہ اپنے ہی جھوٹ کے جال میں پھنس چکا ہوتا ہے۔ اس لئے داناؤں کا

READING CORNER
http://readingcornerak.blogspot.com/

کہنا ہے کہ بنیاد سچ پر رکھی جائے جھوٹ پر رکھی گئی بنیاد کمزور ہوتی ہے کیونکہ ابتدائی جھوٹ کو ثابت کرنے کے لئے اور بھی جھوٹ بولنا پڑتے ہیں۔"

میں جب تک بولتا رہا روشنی کی نگاہیں زمین پر ہی رہیں۔ میں نے پھر کہا۔ "اتنی لمبی تمہید میں نے اپنی بات کہنے سے پہلے اس لئے باندھی ہے کہ میں تم سے امید کروں کہ تم میرے سوالات کے جواب اس تمہید کی روشنی میں دو۔"

اس نے گردن ہلا کر اقرار کر لیا تو میں نے کہا۔ "تم نے دوروں کا ڈرامہ کیوں کھیلا اور کب سے دورے تم پر پڑے۔"

چند لمحے خاموشی رہی پھر اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ میری لمبی تمہید سے وہ کچھ متاثر نظر آئی مگر زبان اس نے نہیں کھولی۔

"آنکھوں کی زبان کو سمجھنا بہت مشکل ہے تم اپنا ماضی الضمیر زبان سے ادا کرو۔" میں نے کہا۔

"آپ کا اندازہ درست ہے میرے دورے اصلی نہیں ہیں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"ان دوروں کی ضرورت کیوں پڑ گئی اور کب سے پڑی۔" میں نے پوچھا۔

"میں شادی کے بعد آگرہ حیدر کے پاس چلی گئی تھی۔ آگرہ میں میلے بہت لگتے ہیں میں بھی حیدر کے ساتھ ایک میلے میں چلی گئی۔ یہ میلا شہر سے دور سکندرہ کے مقام پر لگتا ہے اس مقام پر مغل بادشاہوں کے پرانے کھنڈرات بہت ہیں۔ سارا دن ہم میلا دیکھتے رہے رات ہو گئی ہم نے خیال نہیں کیا۔ شہر کے سارے تانگے چلے گئے۔ اس ویران جگہ جھولے والے اور کچھ دکاندار رہ گئے۔ وہ بھی اپنا اپنا سامان بیل گاڑیوں میں لادنے لگے۔ تو میرے شوہر نے ایک بیل گاڑی والے کو کہا کہ وہ ہمیں کسی آباد مقام پر پہنچا دے مگر ان کا سامان بہت تھا کوئی راضی نہیں ہوا۔ آخر سب چلے گئے اپنے ساتھ گیس بتیاں بھی لے گئے اب ہر طرف ہو کا عالم تھا اور گھپ اندھیرا تھا۔ ہم نے ایک آدھی گری ہوئی باؤلی کا انتخاب کیا اور اس میں آ کر بیٹھ گئے رات میں پیدل پندرہ میل سفر کرنا خطرناک تھا۔"

رات جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی ماحول کی خوفناکی بڑھتی گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے۔ میرا ڈر کے مارے برا حال تھا اور میرے شوہر کا حال بھی مجھ سے زیادہ خراب تھا۔ مگر نہ جانے حیدر کو نیند کیوں زیادہ آ رہی تھی۔ میری تو ڈر کے مارے نیند اڑی ہوئی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا کبھی کبھی جھینگروں کے بولنے کی آواز البتہ آ جاتی تھی مگر ماحول کی وحشت ناکی کو کم نہیں کرتی تھی۔ میں نے کئی دفعہ جھنجھوڑ کر حیدر کو اٹھایا۔ وہ ہر بار آہستہ سے کہتا، پتہ نہیں مجھے کیوں نیند آ رہی ہے اور پھر گردن ڈال دیتا۔

اور پھر وہ بے خبر سو گیا۔ میں ڈری سکڑی اس کے قریب بیٹھی رہی۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک سایہ آتا نظر آیا۔ میری حالت اور خراب ہونے لگی۔ وہ سایہ میرے قریب آ گیا وہ ایک حسین اور قد آور مرد تھا اس کے آنے سے ایک عجیب طرح کی خوشبو اس جگہ پھیل گئی اور اس خوشبو کی وجہ سے ایسا لگا کہ میرا ذہن میرے قابو میں نہیں۔

"ڈرو نہیں میں تم کو یا تمہارے آدمی کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

میں خاموش رہی تو پھر اس نے کہا۔ "تم ایک حسین عورت ہو۔ میں حسن کا دیوانہ ہوں تم جیسی عورت کے ساتھ یہ مرد اچھا نہیں لگتا۔ تم نے اس سے شادی کیوں کر لی؟" میں پھر بھی خاموش رہی تو وہ بولا۔

"کیا تم کو یہ مرد پسند ہے؟" میری زبان میرے ذہن کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی؟ میں نے جواب نہیں دیا۔

"میری بات کا جواب دو اگر جواب نہیں دو گی تو تمہارے اس بزدل مرد کو اٹھا کر میں کسی کنوئیں میں ڈال دوں گا۔" وہ ناراضگی سے بولا۔

اب میرا بولنا ضروری تھا میں نے کہا۔ "میری پسند، پسند کس نے پوچھی تھی۔ ماں باپ نے دیکھا تھا اور پسند کیا اور شادی کر دی تھی۔ ہمارے خاندان میں لڑکی کی نہیں چلتی۔

"تم کو یہ پسند آ گیا تھا۔" اس نے پوچھا۔

"بس وقت کی گاڑی کھینچنی ہے اور اس کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔" میں نے کہا۔

"اب کچھ فرق پتہ چلا۔" وہ بولا۔

"نہیں میں وفا کی شمع ہوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد پھر مجھے کچھ پتہ نہ چلا۔ میرا دل دماغ اور ذہن مفلوج ہو کر رہ گیا اور جب مجھے ہوش آیا تو دل و دماغ اس کا ہو چکا تھا لاکھ کوشش کے باوجود میرا ذہن میرے بس میں نہیں تھا۔ اب مجھے حیدر علی ایک پھیکا پکوان نظر آتا تھا جاتے جاتے وہ بول گیا میں رات کا شہزادہ ہوں صرف اور صرف رات میں ہی ہمارا ملن ممکن ہے۔

اور پھر مجھے سسرال میں پہلا دورہ پڑا۔ حیدر علی ڈر گیا اور مجھے میکے میں چھوڑ گیا۔ وہ ایک دو دفعہ مجھے کسی سیانے کے پاس بھی لے کر گیا تھا۔ اس کو بتایا گیا کہ اس پر بہت زبردست سایہ ہے تم زندگی چاہتے ہو تو اس سے دور رہو اور وہ ایک کمزور آدمی تھا مجھے فوراً آگرہ سے دلی چھوڑ گیا اور میں دلی میں اپنے ماں باپ کے پاس رہتی ہوں۔ وقفہ وقفہ سے دوروں کا ڈرامہ اس لئے کرتی ہوں کہ حیدر علی لینے نہ آئے کیونکہ مجھے اب فرق کا پتہ ہو گیا ہے۔ وہ ایک بھرپور مرد ہے اور مجھے وہ بہت پسند بھی ہے۔"

"تم کو پتہ ہے کہ وہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں پتہ ہے۔ مگر وہ مجھے چاہتا ہے۔ وہ میری خاطر آگرہ سے آتا ہے۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی وہ مجھے وہ خوشیاں دیتا ہے جو حیدر علی نے کبھی مجھے نہیں دیں۔"

"مگر تمہارا اور اس کا ساتھ نہیں ہو سکتا وہ انسان نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"میرے پاس تو وہ انسان بن کر ہی آتا ہے۔ مجھے اس کا انسانوں والا روپ اچھا لگتا ہے۔ آپ میری مدد کریں حکیم صاحب میری جان حیدر علی سے چھڑا دیں۔" روشنی نے کہا۔

محبت اندھی ہوتی ہے اس کا ثبوت یہ عورت تھی۔ میں اس کی جان ایک غیر انسان سے چھڑانا چاہتا تھا اور وہ اپنی جان ایک انسان سے چھڑانا چاہتی تھی۔ "تم نے مکاشی کا اصل روپ دیکھا ہے۔" میں نے پوچھا۔ تو وہ بولی۔

"میں نے آپ کو اس کا نام نہیں بتایا تھا آپ کو کس طرح پتہ چلا کہ اس کا نام مکاشی ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے اس سے بھی زیادہ بہت کچھ پتہ ہے۔ تم میرے سوال کا جواب دو۔"

"میں نے صرف ایک روپ دیکھا ہے اور وہ بہت حسین ہے۔" روشنی نے کہا۔

"تم نے زندگی کے بہت سے روپ نہیں دیکھے ہر حسین چیز حسین نہیں ہوتی انسانی نظر صرف ظاہری چیزوں کا مشاہدہ کرتی ہے۔ کچھ چیزیں ظاہری نظروں سے نظر نہیں آتیں ان کو دیکھنے کے لئے اندر کی آنکھ استعمال کرنی پڑتی ہے اور پھر کوئی اس آنکھ کا استعمال نہیں چاہتا۔ تم بھی ان ہی لوگوں میں سے ہو۔ میں تم کو اس وقت قائل نہیں کر سکوں گا کیونکہ تمہارے انگ انگ میں اس کی محبت بھری ہوئی ہے اور تمہارا خاکی بدن اس چاشنی کی لذت کا عادی ہو گیا ہے۔ یہ نشہ آسانی سے اترنے والا نہیں ہے۔ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں اس لئے میں اس کا اصلی روپ تم کو ضرور دکھاؤں گا اور پھر تم سے پوچھوں گا۔" میں نے بات ختم کی تو وہ بولی۔

"میں مکاشی سے محبت کرتی ہوں اس کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

"یہ فیصلہ ابھی مت کرو۔ وقت آنے پر میں خود تم سے پوچھوں گا۔"

میں آگرہ اس مقام پر جہاں میلہ لگتا تھا چلا گیا۔ یہ جگہ شہر سے باہر تھی۔ یہاں سے قریب ہی اکبر بادشاہ کا مزار ہے۔ اس کے مزار کی چار دیواری سے لگی ہوئی مشرق کی طرف ایک آبادی ہے۔ اس کا نام بائیں پور ہے۔ یہ شیر شاہ سوری روڈ پر واقع ہے اس آبادی یا گاؤں سے اور آگے چلیں تو کھیت ہیں اور جگہ جگہ پرانی باؤلیاں اور بارہ دریاں نظر آتی ہیں جو کہ کچھ گر چکی ہیں اور کچھ کھڑی ہیں۔ اب یہ سب کھیتوں کے درمیان ہیں۔ یہیں ہر سال میلہ لگتا ہے قریب اور دور کے گاؤں کے لوگ اس میں شرکت کرتے ہیں تین

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

دن کا یہ میلہ ہوتا ہے تین دن کے بعد یہاں کوئی نہیں ٹھہرتا۔

آگرہ شہر میں شاہی عمارتوں کے کھنڈرات آپ ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں۔ کچھ کو دیکھ کر تو حیرت ہوتی ہے کہ یہاں اس کی کیا ضرورت ہوگی۔ جگہ جگہ گرے ہوئے گنبد اور بارہ دریاں دلی تک نظر آتی ہیں۔ میں دن میں سکندرہ گیا تھا۔ وہاں تک شہر سے تانگے ملتے ہیں مگر اس سے آگے جنوب کی طرف پیدل چلنا پڑتا ہے۔ مین روڈ سے آدھے فرلانگ پر بائیں پور کی آبادی ہے مگر جہاں پر میلہ لگتا ہے وہ جگہ خاصی دور ہے۔ مجھے اس مقام کی تلاش تھی جہاں پر روشنی اور حیدر نے رات گزاری تھی۔ میں ہر کھنڈرات میں گیا مگر ان میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی۔ دور ایک باؤلی اور بارہ دری نظر آرہی تھی میں اس طرف چلا گیا۔ یہ بارہ دری کچھ اچھی حالت میں تھی میں اس کے اندر چلا گیا۔ یہ جگہ صاف ستھری تھی کسی قسم کی گندگی یہاں پر نہیں تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ رات اسی بارہ دری میں گزاروں گا۔ میں اب بھی روپوشی کی حالت میں تھا اور اس میں بھی سخت احتیاطی تدبیر کرلی تھی۔ اب رات ہونے کو تھی کسان اپنے اپنے کام ختم کر کے گھروں کی طرف چل دیئے تھے۔ پرندے بھی اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف پرواز کر رہے تھے اور میں بارہ دری میں بیٹھا کسی کا انتظار کر رہا تھا۔

شام ختم ہوئی۔ رات نے اپنے پر پھیلائے رات آتے ہی آسمان پر زور کی بجلی چمکی اور بادلوں کے گرجنے کی زوردار آواز آئی اور اچانک تیز بارش شروع ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی بارہ دری بھی روشن ہوگئی اور لوگ آنے لگے۔ پہلے تین مرد آئے۔ وہ اپنے ساتھ دریاں اور چاندنی لائے تھے۔ انہوں نے قاعدے سے ان کو فرش پر بچھا دیا اور چلے گئے ان کے جانے کے چند منٹ کے بعد جو آئے وہ کچھ اور سامان لے آئے اور اس کو بھی چاندنی پر سجا کر چلے گئے۔ ایک بڑا سا گاؤ تکیہ بھی رکھ دیا اب مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی۔ آدھے گھنٹے کے بعد پوری بارہ دری بھر گئی کوئی چالیس پچاس مہمان آگئے مگر گاؤ تکیے پر کوئی نہیں تھا۔ وہ سب آپس میں مقامی زبان میں بات کر رہے تھے۔ مگر آواز بہت دھیمی تھی جیسے پاس ادب ان کو تھا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک سفید ریش بزرگ آگئے تمام حاضرین مجلس ان کے ادب میں کھڑے ہوگئے اور جب وہ بیٹھ گئے تو سب لوگ اپنی اپنی جگہ ان کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے ہی ایک آتشدان جس میں آگ جل رہی تھی ان کے سامنے رکھ دیا گیا۔ اس سفید ریش نے اپنے دونوں ہاتھ اس آگ میں داخل کر دیئے۔ سب لوگ خاموشی سے یہ سب دیکھتے رہے کوئی پانچ منٹ کے بعد انہوں نے ہاتھ آگ سے باہر نکالے مگر ان کے ہاتھ کا کچھ نہ بگڑا ایک رواں تک نہیں جلا۔ سب نے باآواز بلند ان کو مبارکباد دی جب سب خاموش ہوگئے تو وہ بولے۔

"میرے عزیزو تم نے دیکھا میں ہر محفل میں آگ کی پوجا کرتا ہوں یہ آگ میرا کچھ نہیں بگاڑتی اس لئے کہ میں خود آگ سے پیدا ہوں اور تم سب بھی آتشی ہو تمہارا بھی آگ کچھ نہیں بگاڑے گی۔ مگر کچھ ہمارے ساتھی خاکی انسان سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوگئے ہیں۔ وہ اپنی اس حیثیت کو بھول گئے ہیں کہ وہ آتشی ہیں۔ ان لوگوں نے خاکی انسانوں سے اپنا میل ملاپ زیادہ کرلیا ہے۔ ہم عظمت اور جبروت والے ہیں۔ ہمارے پاس لامحدود طاقت ہے حضرت انسان ہمارے لئے کیا حیثیت رکھتا ہے ہم میں کیا کمی ہے ہم ہر جگہ ہر روپ میں جاتے ہیں انسان ایسا نہیں کرسکتا پھر بھلا وہ ہمارا کیا مقابلہ کرے گا۔ پھر ان سے متاثر ہونے کا کیا مطلب ہے۔ اگر مجھے کسی کے بارے میں یہ پتہ چلا کہ وہ انسانوں سے ملتا ہے یا ان سے کوئی تعلق رکھتا ہے تو میں اس کو سخت سزا دوں گا۔" اس کے بعد وہ اپنی کچھ مناجات پڑھتے رہے اور آخر میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔ میں ایک کونے میں اس کے سامنے کھڑا یہ سب دیکھتا رہا۔ ان تمام لوگوں میں مکاشی کون سا تھا مجھے پتہ نہیں تھا کیونکہ مکاشی کا جو روپ میں نے دیکھا تھا وہ تو اس کا اصلی روپ نہیں تھا۔

اب مجھے مکاشی کا ٹھکانہ ڈھونڈنا تھا۔ اگر بات انسانوں کی ہوتی تو کسی سے بھی اس کا پتہ کیا جاسکتا تھا مگر یہ سب تو رات کے راہی تھے میں ان سے پوچھتا تو دس سوال اور اٹھ کھڑے ہوتے مگر میں خوش تھا کیونکہ مجھے پہلی کامیابی

مل گئی تھی اور وہ یہ تھی کہ میں ان کے درمیان رہا اور ان میں سے کسی کو شبہ تک نہیں ہوا۔ مکاشی کے ایک جملے نے میرا بہت کام کر دیا تھا۔ مجھے دیکھے جانے کا ڈر صرف ان کے بڑے کی طرف سے تھا۔ اب میرا دوسرا قدم اور زیادہ منظم طریقہ پر اٹھے گا میرے اعتماد میں اضافہ ہوگیا تھا۔ مجھے یہ پتہ چل گیا تھا کہ جنات کا یہ قبیلہ کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے یہ آگ کی پوجا کرتے ہیں جنات آگ سے ہی پیدا کئے گئے ہیں مگر ایسا نہیں ہے کہ آگ ان کو جلاتی نہیں مگر کسی نہ کسی حد تک یہ آگ سے محفوظ ضرور رہتے ہوں گے۔ ان لوگوں میں بت پرست بھی ہیں اور مسلمان بھی، جو لوگ خدائے لاشریک کو مانتے ہیں ان پر کنٹرول حاصل کرنا قدرے مشکل ہوتا ہے۔ وہ مقدس آیات پڑھتے ہیں اور عبادت بھی کرتے ہیں وہ کسی کو بلاوجہ تنگ نہیں کرتے۔ جس طرح انسان میں اچھے برے ہر قسم کے لوگ ہیں اسی طرح ان میں بھی ہیں۔

میں دوسری رات پھر باؤلی میں موجود تھا۔ دس بجے رات دو صفائی والے آگئے۔ ان کے جانے کے بعد پانی کی مشک ایک بہشتی لے کر آگیا۔ اس نے ہر جگہ ہلکا ہلکا پانی چھڑک دیا اور جانے لگا وہ باؤلی سے نکل رہا تھا کہ میں نے اس کی مشک پکڑ لی اور ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ اور مشک میں منہ سے ہوا بھرتا گیا مشک آہستہ آہستہ پھولتی گئی۔ کچھ ہی دیر میں اسے احساس ہوگیا کہ مشک پھول رہی ہے اس نے حیرانی سے پھولتی مشک کو دیکھا اور بولا۔

"کون بدمعاش ہے۔ کیوں کیا مشک پھاڑے گا۔" مگر میں ہوا بھرتا گیا۔

وہ گھبراہٹ میں بولا۔ "کون ہے سامنے تو آ۔"

اس نے کاندھے پر سے مشک اتاری اور ایک طرف کو بھاگا۔ مگر مشک نے اس کی جان نہ چھوڑی وہ بھی ساتھ ساتھ اس کے کاندھے پر اٹکی رہی اور پھر مشک بھاری ہونا شروع ہوگئی اور اس کے دہانے سے پانی گرنے لگا اب تو بہشتی ہانپ کر کھڑا ہوگیا۔ اور خود سے بولا۔

"پانی کیسے بھر گیا، میں نے تو خالی کرلی تھی آج یہ کیا چکر چل پڑا ہے۔

اور میں نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا اور باؤلی میں آگیا۔ اب باؤلی میں دریاں بچھائی جارہی تھیں۔ چاندنیاں ایک طرف پڑی تھیں۔ دریوں کے بعد وہ چاندنی بچھانے لگے مگر یہ کیا سفید براق چاندنیوں کے درمیان بڑے بڑے بدنما داغ پڑے تھے اور ان میں سے سخت بدبو اٹھ رہی تھی۔ ایک بولا۔

"کشموق کیا تو اندھا ہوگیا ہے یہ اتنی گندی چاندیاں کہاں سے اٹھا لایا۔ ان کو بچھا کر کیا اپنی موت کو دعوت دے گا۔"

کشموق جو اس کا دوسرا ساتھی تھا اس نے حیرت سے داغوں کو دیکھا اور بولا۔ "میں دیکھ بھال کے لایا تھا سب صاف تھیں یہ داغ کیسے لگ گئے اور ان میں سے تو بدبو بھی آرہی ہے۔"

"بکواس نہ کر تیری شکایت کرنا ہی پڑے گی۔ تیرا دھیان کام میں لگتا نہیں ہے۔" دوسرا بولا۔

کشموق نے ڈر کر کہا۔ "تم یقین کرو کشموق میں دیکھ کر لایا تھا میری تو عقل کام نہیں کر رہی۔ دوڑ کر دوسری لے آتا ہوں۔"

"ہاں اور کیا کرے گا جلدی کر۔" کشموق نے کہا اور کشموق دوسری چاندنیاں لینے دوڑ گیا اور شموق ایک طرف بیٹھ گیا۔ چند منٹ کے بعد کشموق چاندنیاں لے کر آگیا مگر یہ کیا ساری دریاں جو وہ بچھا کر گیا تھا تہہ کی ہوئی ایک طرف رکھی تھیں اور شموق بیٹھا تھا وہ حیرت سے بولا۔

"دریاں کیوں اٹھا دیں پھر بچھانا پڑیں گی۔" شموق نے دیکھا اور حیرت سے بولا۔

"دریاں میں نے تو نہیں اٹھائیں میں کیوں اٹھاؤں گا؟"

کشموق نے کہا۔ "اب جلدی کر وقت کم رہ گیا ہے۔" دریاں پھر بچھا دی گئیں ان پر چاندنیاں بھی ڈال دی گئیں یہ چاندنیاں صاف تھیں۔ وہ دونوں اپنا کام ختم کر کے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد دوسرے کام والے آگئے مگر

READING CORNER
http://readingcornerblogspot.com/

میں نے ان کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ لوگوں کی آمد شروع ہوگئی۔ آج کی محفل ان کی خالص مذہبی محفل تھی۔ دو تین لمبی لمبی داڑھیوں والے آخر میں آئے اور سب سے آخر میں ان کا سردار آیا۔ میں نے پردہ اور دبیز کرلیا۔

ایک داڑھی والے نے فضا میں سونگھ کر کہا آج کچھ نئی خوشبو آرہی ہے کوئی غیر بھی آیا ہے کیا؟"

سردار نے یہ سن کر کہا۔ "یہ میرا علاقہ ہے یہاں ہر طرف میرے پہرے ہیں یہاں کون آئے گا۔"

"مجھے ایسا لگا تھا اس لئے پوچھا۔" وہ پھر بولا۔

"یہ علاقہ ہمارا ہے آگ کے پجاریوں کا کسی اور قوم کا جن تک یہاں آنے کی جرات نہیں کرتا۔" سردار نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے کام شروع کرو۔" سردار نے اشارہ کیا۔ ایک بڑا آتش دان درمیان میں آگیا اس میں بہت تیز آگ روشن تھی ایک داڑھی والے نے اپنے دونوں ہاتھ اس میں ڈال دیئے۔ مگر یہ کیا ہوا اس کے ہاتھ آتش دان میں جاتے ہی آگ ایک دم بجھ گئی۔ سردار اور سب حاضرین مجلس اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور ہائے ہائے کرنے لگے۔

سردار نے گلہ پھاڑ کر کہا۔ "یہ تو نے کیا کیا؟ بدشگنی کردی بوڑھے ہم سب کو عذاب میں ڈال دیا۔"

وہ داڑھی والا جس نے ہاتھ آگ میں ڈالے تھے بولا۔ "میں نے کچھ نہیں کیا ہے سردار۔ میری زندگی کا یہ پہلا واقعہ ہے مجھے خود یقین نہیں آرہا کہ آتشی رب کیوں ناراض ہوگیا ہے؟"

"تو نے کوئی ایسا کام ضرور کیا ہے۔" سردار نے کہا۔

"میں آتشی رب کی قسم کھا کر کہتا ہوں میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ ابھی کچھ فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ آتش دان پھر اسی تیزی سے جل اٹھا۔ سردار نے اور سب نے حیرت سے اس کو دیکھا اور سب کے چہروں پر خوشی کے آثار نظر آنے لگے۔ اب کے دوسرا داڑھی والا آگے بڑھا اس نے آتش دان میں ہاتھ ڈال دیئے۔ مگر یہ کیا اس نے فوراً ہاتھ باہر نکال لئے سب کی چیخیں نکل گئیں۔ سردار نے غصے سے کہا۔ "یہ تم آج کیا تماشہ کررہے ہو ایسی بدشگونی میں نے زندگی میں نہیں دیکھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ہم سب کے اوپر کوئی مصیبت آنے والی ہے۔"

اب میرے بولنے کی ضرورت تھی۔ میری آواز ان کے کانوں میں پہنچی۔ "تم لوگ خبردار ہوجاؤ۔ آج سب انہونی ہوگی۔ اس لئے کہ تم میں ایک ایسا ہے جو وہ کررہا ہے جس کو تم بھی پسند نہیں کرو گے مگر اس کے گناہ کے بدلے تم سب سزاوار ٹھہرائے جاؤ گے اور سب کو سزا ملے گی۔" میں خاموش ہوگیا یہ دیکھنے کو کہ ان پر کیا اثر ہوتا ہے۔

سردار نے اور ان داڑھی والوں نے چاروں طرف دیکھا کچھ پڑھا کچھ دیر سونگھا مگر ان کو کچھ پتہ نہیں چلا تو سردار نے کہا۔

"تم کون ہو مہربان۔ تم نے ہمیں آگاہی دی ہم تمہارے احسان مند ہیں۔"

"تم میں سے ایک ہے اس کا نام مکاشی ہے اس نے آدم زاد کی ایک عورت سے ناجائز تعلقات قائم کرلئے ہیں۔ وہ عورت دلی میں رہتی ہے اور مسلمان ہے۔" میں نے کہا۔

سردار یہ سن کر غصے سے کھڑا ہوگیا اور بولا۔ "مکاشی سامنے آؤ اور جواب دو۔"

اس محفل کی آخری قطار سے ایک اٹھا اور سردار کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ وہ نہایت بدہیبت اور عمر رسیدہ جن تھا۔

"سردار نے اس کو نفرت اور غصے سے دیکھا اور کہا۔ "تم نے وہ غیبی آواز سنی۔ بتاؤ کیا یہ سچ ہے؟"

وہ گردن جھکائے کھڑا رہا۔ سردار اور تمام محفل اس کے بولنے کا انتظار کررہی تھی۔ مگر مکاشی خاموش تھا۔ سردار پھر بولا۔ "تیری خاموشی تجھے گناہ گار ثابت کرتی ہے۔ تجھے پتہ ہے میں تجھے کتنی عبرت ناک سزا دینے والا ہوں۔"

مکاشی نے نظریں اٹھائیں اس کا چہرہ جو پہلے ہی بدنما تھا اور زیادہ بگڑ گیا۔ وہ بڑی مشکل سے بولا..... "رحم سردار۔ میں گناہ گار ہوں۔ میں کیا کرتا میری عمر کے میرے ساتھی درجنوں بچوں کے باپ ہیں مگر میری شادی صرف اس لئے نہیں ہوئی کہ مجھے کسی نے پسند نہیں کیا۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ صورت کے علاوہ تمام اوصاف تو مجھ میں ہیں

جن کی ضرورت ہوتی ہے۔ پورے قبیلے میں کوئی مادہ مجھ سے رغبت سے پیش نہیں آئی۔ میں نے دوسرے قبیلوں میں جانا شروع کردیا۔ مگر وہاں پر مجھ میں دو عیب نکل آئے۔ ایک میری صورت دوسرا غیر مذہب۔ کہیں پر میری دال نہیں گلی پھر میں کیا کرتا۔ بے شک جو کچھ غیبی آواز نے کہا درست ہے میں اس کی سزا سے بھی واقف ہوں مگر پھر بھی رحم کی درخواست تو کرسکتا ہوں۔"

مکاشی خاموش ہوگیا تو سردار نے کہا۔ "تو نے دیکھا تیری وجہ سے آج ہزاروں سال سے جلتا ہوا آتش دان بجھ گیا۔ کتنی بڑی بدشگونی ہوگئی۔ اس بدشگونی کی سزا پورے قبیلے کو جھیلنا پڑے گی۔ میں تجھے معافی نہیں دے سکتا۔"

"سردار میری مجبوری کو بھی تو دیکھو۔" مکاشی گڑگڑا کر بولا۔

"تیری مجبوری کی وجہ سے میں پورے قبیلے کو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔" سردار نے کہا۔

مکاشی زور زور سے رونے لگا۔ داڑھی والوں اور دوسرے سب نے اس کو کڑی سزا دینے کا اصرار کیا۔ تو میں نے پھر کہا۔

"اس کی کڑی سزا یہ ہے کہ اس کو تم قبیلے سے نکال دو۔ پھر دوبارہ یہ تمہارے قبیلے میں نہ آئے نہ کسی سے تعلق رکھے یاد رکھو سب کہ اگر یہ کسی سے ملا تو اس پر بھی وہی گناہ لاگو ہوجائے گا۔ اس کو نکال باہر کرنے کے بعد ہی تم سب اس عذاب سے بچ سکو گے جو تم پر آنے والا ہے اس کام کو جتنی جلدی کرو گے اتنا ہی تمہارے قبیلے کے لئے اچھا ہوگا۔" میں خاموش ہوگیا۔ سردار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے آواز دی۔ "میری مہر لاؤ۔"

ایک جن دوڑ کر گیا اور ایک تانبے کی مہر لے آیا۔ سردار نے اس کو آتش دان میں رکھ دیا سارے ماخرین عقل دم بخود خاموش بیٹھے تھے۔ کچھ ہی دیر میں مہر آگ میں سرخ ہوگئی۔ سردار نے اس کی ڈنڈی پکڑ کر باہر نکالا دیکھا اور پھر آگ میں رکھ دیا۔ اب سردار نے اشارے سے مکاشی کو اپنے قریب بلایا۔ اس کی پیٹھ اپنی طرف کی اور پھر مہر کو پھر نکالا اور اب مہر نہ صرف سرخ تھی بلکہ اس پر چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ سردار نے ایک داڑھی والے کو اشارہ کیا وہ فوراً سردار کے قریب آگیا۔ سردار نے کہا تم سب گواہ رہنا کہ میں نے اس کے گناہ کی سزا دی ہے اور وہ چنگاریاں اڑاتی مہر مکاشی کی پیٹھ پر چپکا دی کچھ دھواں سا اٹھا۔ مکاشی کے چہرے پر تکلیف کے آثار بھی نظر آئے مگر وہ کھڑا رہا میں نے سوچا اگر یہ کسی انسان کو لگائی جاتی تو وہ مارے تکلیف کے ضرور بے ہوش ہوجاتا۔ مگر مکاشی بے ہوش نہیں ہوا۔ سردار نے آسمان کی طرف منہ کرکے کہا۔

"میں نے اپنا فرض پورا کردیا۔ میرے قبیلے کو معاف کردے اے دنیا کو روشنی اور حرارت دینے والے۔ ہم تیرے غلام ہیں تو جب چاہے آزمالے ہم تیرے ہیں۔ آج سے مکاشی سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔" اور پھر اس نے اشارہ کیا کہ مکاشی کو باہر نکال دو۔

میری آواز پھر ابھری۔ "تم سب کو معافی مل گئی۔" اور میں اس ہاؤلی سے باہر آگیا۔

مکاشی کے اردگرد دو پہرے دار تھے اور وہ سکندرہ کی طرف جارہے تھے۔ سکندرہ کی حدود آنے پر دونوں واپس چلے گئے اور مکاشی اکیلا کھڑا رہ گیا تو میں اس کے قریب چلا گیا اور کہا۔ "اب تم دلی روشنی کے پاس جاؤ گے۔"

اس نے چونک کر چاروں طرف دیکھا مگر جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو بولا۔ "تم کون ہو سامنے تو آؤ۔"

میں نے جواب دیا۔ "میں کون ہوں تم یہ سوال مت کرو۔ میں جو کہہ رہا ہوں وہ کرو، نہیں تو مجھے اور طریقے بھی آتے ہیں۔"

"میں روشنی کے پاس اب نہیں جاسکتا۔" وہ بولا۔

"کیوں نہیں جاسکتے؟" میں نے پوچھا۔

"میں جس روپ میں ہوں یہ میرا اصلی روپ ہے۔ میری پیٹھ پر سردار نے مہر لگادی ہے اب میں اپنا روپ بدل نہیں سکتا میری ساری طاقت ختم ہوچکی ہے اب صرف جنگلات اور پہاڑوں پر آوارہ گردی میرا نصیب ہے۔" مکاشی نے بے بسی سے کہا۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

"مگر تم کو ایک دفعہ روشنی کے پاس اسی حالت میں جانا ہے۔" میں نے کہا۔

"اس نے مجھے ایک حسین مرد کے روپ میں دیکھا ہے اب وہ مجھے اس روپ میں برداشت نہیں کرے گی۔ مجھے معاف کردو مجھے اس کے پاس جانے پر مجبور نہ کرو۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

"تمہاری سزا موت بھی ہوسکتی تھی سردار تم کو ضرور موت کی سزا دیتا۔ مگر میں نے تم کو مارنا نہیں چاہا اب تم کو روشنی کے پاس نہ صرف جانا بلکہ اس کو یہ بھی بتانا ہے کہ تم مکاشی ہو اور یہی تمہارا اصل روپ ہے۔ تم جس مکاشی سے ملتی رہی ہو وہ نقلی اور بناوٹی مکاشی تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ سزا موت سے بڑھ کر ہے میں نہیں جاؤں گا۔" وہ بولا۔

"تم بے وقوف ہو تم نے موت کو دیکھا نہیں ہے۔ ابھی تم زندگی کو موت پر ترجیح دو گے۔ یاد رکھو زندگی پھر زندگی ہے۔ ایک آس تو ہے امید تو ہے شاید کوئی ایسا طریقہ مستقبل میں نکل آئے کہ تم پھر سے اپنی دنیا میں واپس جاسکو یا اس سے بھی زیادہ بہتر دنیا تم کو مل جائے ذرا سوچو مرنے کے بعد تم کو کیا ملے گا صرف تمہارے گناہوں کی سزا۔ ایک مہلت تم کو مل رہی ہے اپنے گناہوں کے بوجھ کو کم کرسکتے ہو تو کرلو۔" مکاشی گردن جھکائے میری بات سنتا رہا پھر بولا۔

"تمہاری بات میری سمجھ میں آگئی ہے۔" زندگی پھر زندگی ہے۔"

"تو پھر جاؤ دلی اور اپنی حقیقت روشنی کو بتادو۔" اور مکاشی چلا گیا۔ مجھے پتہ تھا اب وہ وہی کرے گا جو اس سے کہا گیا تھا۔ میں اس کے ساتھ نہیں گیا آپ کے پاس آ گیا ہوں۔ کل روشنی کے گھر چلیں گے۔" رولوکا نے روداد ختم کی۔

اور دوسرے دن میں اور رولوکا کھاری باؤلی شوکت مرزا کے سامنے بیٹھے تھے۔ میں نے کہا۔ "ذرا روشنی کو بلوائیں۔"

شوکت مرزا نے کہا۔ "اس کی طبیعت خراب ہے وہ شاید نہ آسکے۔"

میں نے پوچھا۔ "ہوا کیا ہے بتائیں تو۔"

"رات کو اس نے کوئی بہت بھیانک خواب دیکھ لیا ہے۔ بہت خوف زدہ ہے شوکت نے بتایا۔"

"اس کو بلائیں میں اس کو اس کے خواب کی حقیقت بتانے آیا ہوں۔" رولوکا نے کہا۔

کچھ ہی دیر میں روشنی ہمارے سامنے تھی رولوکا نے کہا۔ "تم نے اس کی حقیقت دیکھ لی۔"

روشنی نے گردن جھکا کر کہا۔ "خوب دیکھ لی۔"

"اب بتاؤ دوبارہ اس کو دیکھنا چاہو گی۔" رولوکا نے پوچھا۔

روشنی نے کانوں پر ہاتھ لگا کر کہا۔ "ہرگز نہیں۔"

"تو پھر آگرہ حیدر علی کے پاس جانے کی تیاری کرو اور ہاں اب بتاؤ حیدر بہتر ہے کہ مکاشی۔"

روشنی کے چہرے پر ایک شرمندہ سی مسکراہٹ آ گئی اور صرف ایک لفظ اس کے ہونٹوں سے نکلا۔ "حیدر علی۔"

❀.....❀.....❀

"ہم جس دور میں ہیں اس سے آگے جو دور آنے والا ہے یعنی تم اس کا اندازہ پچاس سے سو سال لگا سکتے ہو اس دور میں ہر بات عملی ہوگی اور مادہ پرستی اس قدر بڑھ جائے گی کہ موجودہ دور کے تصورات کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ مگر اس کے باوجود اس دور میں بھی وہ لوگ ہوں گے جو کسی کے لئے بھی مصائب کو گلے سے لگائیں گے اور دوسروں کے لئے مٹ جانے کا جذبہ ان کے اندر ہوگا۔ یہ لوگ ہر دور میں رہے ہیں اور رہیں گے کیونکہ رب کائنات کا پیمانہ اور توازن بگڑتا نہیں۔ جہاں انسان بے لگام ہوتا ہے وہیں پر کوئی نہ کوئی آسمانی آفت آجاتی ہے۔ یہ ایک سبق بھی ہوتی ہے وارننگ بھی ہوتی ہے اگر امکانات پر غور کیا جائے اور اپنے اعمال پر نظر رکھی جائے اور ان حدود کے اندر رہا جائے جو کہ بنادی گئی ہیں تو انسان ترقی کرتا ہے۔ کوئی ہنر کوئی تعلیم حاصل کرنے پر پابندی نہیں ہے مگر رہنا دائرے کے اندر ہے اس سے باہر جانے والی قومیں ختم ہوگئیں ان کا نام و نشان تک مٹ گیا۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"تمہاری باتیں اور فلسفہ ایسا ہے کہ اس کو عام کیا جانا چاہئے۔" میں نے جواب دیا۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ خاموش خدمت گار جو ہوتے ہیں وہ کبھی منظر پر نہیں آتے۔ کبھی خود کو منکشف نہیں کرتے اور میں تو خود کو کسی شمار قطار میں شامل ہی نہیں سمجھتا آپ سے جو باتیں ہوتی ہیں وہ ہماری ذاتی باتیں ہیں۔" رولوکا نے کہا۔

"میں بھی تم کو آشکار کرنا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔

"دیکھئے میں بھی آخر انسان ہوں اور کمزوریاں انسانی فطرت کا جزو لازم ہیں۔ کوئی انسان خامیوں سے مبرا نہیں۔ میں ان کی بات نہیں کرتا جن کو رب کائنات خامیوں سے مبرا رکھتا ہے۔ انسان پر لازم ہے کہ وہ مجموعی طور پر انسان رہے صرف انسان۔ انسان ہونا ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہوں گی....." رولوکا نے کہا۔

"تم جس انداز میں سوچتے ہو وہ بہت اعلیٰ سوچ ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک مریض گورکھ پور سے آیا ہے۔ پتہ نہیں میری شہرت گورکھ پور تک کیسے پہنچ گئی۔ میں تو خود کو گمنام سا آدمی سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اچھائی اور برائی دونوں کے پر ہوتے ہیں وہ اڑتی ہیں۔" رولوکا نے کہا۔ "اس مریض کی کیفیت کیا ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"وہ ایک تندرست آدمی ہے۔" میں نے کہا۔

"تو پھر کسی اور اپنے عزیز کے لئے آیا ہوگا۔" رولوکا نے کہا۔

"وہ رات کو مطب کے بعد آئے گا میں نے اس کو وقت دیا ہے۔ پھر آرام سے اس کی بات سنیں گے۔" میں نے کہا۔

آنے والا ایک گورکھا تھا۔ عام طور پر ان کے قد کم ہوتے ہیں۔ مگر یہ لوگ بہت جفاکش اور محنتی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ پہاڑوں پر رہتے ہیں اور بہت سخت زندگی گزارتے ہیں اس لئے جسمانی طور پر یہ بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ مگر کہا جاتا ہے ذہنی طور پر یہ اتنے ہوشیار نہیں جتنے کہ جسمانی طور پر مضبوط ہوتے ہیں ان کا طرز زندگی بھی شہروں سے تو بالکل الگ ہے ہی مگر ہندوستان کے دیہاتوں سے بھی نہیں ملتا۔ اس لئے کہ یہ لوگ ہندوستان کے ہیں ہی نہیں۔ ان کے چہروں کے نقوش جاپانی اور چائنی ہیں۔ یہ لوگ نیپال، بھوٹان اور تبت میں رہتے ہیں۔ مذہبی لحاظ سے یہ زیادہ تر بدھ مت ہیں مگر ان میں بھی ہندو مسلمان پائے جاتے ہیں۔ گھورکھ پور سرحدی شہر ہے یہ لوگ اپنی ضروریات خریدنے یہاں پر آتے ہیں اور کچھ نے اپنا ٹھکانا بھی میدانی علاقوں میں بنالیا ہے اور آہستہ آہستہ یہ اس کے عادی ہوگئے ہیں۔ برٹش گورنمنٹ کی پیدل آرمی میں ان کی ایک گورکھا رجمنٹ بھی ہے اور بہت بہادر رجمنٹ کہلاتی ہے۔

میں نے آنے والے سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ بولا۔ "ہمرا نام گوباشو ہے جی۔" اس نے جواب دیا۔

"تو گوباشو میں نے تم کو دیکھا۔ تم تو ٹھیک ہے پھر تم ادھرا تا دور ہمارے پاس کیوں آرہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم حکیم کامل کے پاس آیا۔ ہم کو بتاؤ وہ ادھر ہے۔" وہ بولا۔

میں نے رولوکا کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "یہ حکیم کامل ہیں۔"

گوباشو اٹھ کر رولوکا کے پاس گیا اور بولا۔ "آپ کا ضرورت ہے ہم بہت پریشان ہے۔"

"بیٹھ جاؤ میں جو کرسکتا ہوں کروں گا۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"ہم ادھر گورکھ پور میں رہتا ہے۔ پہلے سرحد سے دور نیپالی گاؤں میں رہتا تھا۔ پہاڑی گاؤں میں دو چار گھر اِدھر تھا اُدھر کچھ نہیں تھا پھر ہم گورکھ پور گیا۔ گاؤں کا تھوڑا زمین تھا۔ دو چار جانور تھا سب چھین لیا کا ہم کوشش کیا ہم کو بہت مارا ہمارا ایک لڑکی کو بھی وہ لے گیا۔ گورکھ پور میں بھی ہم اس کا کچھ نہیں کیا۔" وہ بولا۔

"وہ کون ہے یہ کس نے کیا؟" رولوکا نے پوچھا۔

"وہ ایک نیپالی ہے۔ بھکشو ہے مگر ہم بولتا ہے وہ

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

کچھ نہیں ہے وہ بدھی ستو نہیں ہے۔ اس کو ورد ان نہیں ملا ہے وہ دھوکا دیتا ہے۔ وہ شاکیہ منی کو بدنام کرتا ہے وہ بدھشٹ بھی نہیں لگتا وہ ایسا کام کرتا ہے کہ ہم بتا نہیں سکتا۔" وہ بولا۔

"انسان کسی دھرم کا ہو بھٹکنا انسانی فطرت ہے۔ انسان اور شیطان کا تعلق ازل سے ہے۔ شیطان ہر وہ دروازہ کھولتا ہے جو برائی کی طرف جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کو یہی کرنا ہے اس نے رب کائنات سے اس کے بندوں کو بھٹکانے کا وعدہ کیا ہے۔

مگر رب کائنات نے شیطان کو بھگانے کا طریقہ بھی تو بتایا ہے۔ شیطان کے ہر عمل کا توڑ بھی تو دیا ہے اگر شیطان کے کارندے مصروف عمل ہیں تو کیا ہوا اس کا توڑ کرنے والے بھی تو ہر جگہ ہر وقت موجود ہیں۔" رولو کا نے کہا۔

ٹھیک بولا۔ "ہم نہیں جانتا ہم کو کوئی بتایا تو ہم ادھر آیا۔" گوباشو نے کہا۔

"تمہارا گھر گورکھ پور نہیں ہے۔" رولو کا نے کہا۔

"گھر کدھر ہے جھونپڑا ہے۔ ہمارا سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ وہ ظالم چھین لیا۔"

"دیکھو میں حکیم ہوں علاج کرتا ہوں حکیم کے ساتھ مریض کا بھی فرض ہے کہ کوئی بات نہ چھپائے پوری بات بتائے۔ دشمنی بلاوجہ تو نہیں ہوتی وہ تمہارا دشمن کیوں ہے تم کو نقصان کیوں پہنچا رہا ہے۔ اس کی کوئی تو بنیادی وجہ ہوگی۔" رولو کا نے پوچھا۔

"ہاں بتاتا ہے۔ وہ ہمرے پاس آیا تھا بولتا تھا اپنی لڑکی کو ہمارا ساتھ شادی کر دو۔ ہم منع کر دیا وہ بہت غصہ ہوا چلا گیا۔"

"تم نے اپنی لڑکی کی شادی اس کے ساتھ کیوں نہیں کیا؟" رولو کا بولا۔

"اس کے گھر بہت عورت لوگ ہے۔ وہ اسی طرح ڈرا کر شادی کرتا ہے ہم کو پتہ تھا تو ہم منع کر دیا بس اس دن کے بعد ہم پریشانی میں پڑ گیا۔ روز کوئی نیا بات ہوتا تھا۔ بچہ بیمار، گائے بیمار، چھوٹا سا کھیت تھا وہ جل گیا۔ ہم کو کوئی بولا تم ادھر رہے گا تو ایسا ہی ہوگا۔ تم کو اس کا بات ماننا پڑے گا۔ ہم اس کا بات نہیں مانا گھر چھوڑ دیا اور خالی ہاتھ گورکھ پور آ گیا۔ ادھر بھی ہمارا جان نہیں بچا اور وہ ہمارا لڑکی کو لے گیا۔ ہم اس کو نہیں روک سکا۔ اب ہم ادھر پہاڑ پر نہیں جا سکتا سب لوگ اس سے ڈرتا ہے۔ وہ بہت خطرناک ہے ہر کوئی اس کے سامنے نہیں جاتا۔ وہ جادو کرتا ہے اور خود کو بھگشو کہتا ہے۔ شاکیہ منی کا بھگشو ایسا نہیں کرتا وہ جادوگر ہے۔"

"اچھا تم آج رات آرام کرو۔ کل گورکھ پور اپنے گھر جاؤ پتہ بتا کر جانا میں تمہارے پاس آ جاؤں گا پھر جو ہوگا وہ کریں گے۔" رولو کا نے کہا۔

میں نے اس کے سونے کا اور کھانے کا بندوبست کر دیا۔ صبح وہ گورکھ پور چلا گیا۔

رولو کا نے کہا۔ "میں گورکھ پور جا رہا ہوں۔"

گورکھ پور ہندوستان کا سرحدی شہر ہے اس سے آگے کوئی شہر نہیں ہے۔ کچھ فاصلے سے پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا ہے اور پھر نیپالی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں سے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ کسی قسم کی روک ٹوک نہیں ہے۔ سرحد کی قریبی آبادی زیادہ تر ہندوؤں کی ہے مگر بدھشٹ اور مسلمان بھی پائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد گو کہ کم ہے۔

گوباشو کا مکان بلکہ جھونپڑا گورکھ پور کی آبادی سے باہر تھا۔ یہاں اور بھی نیپالی بدھشٹ رہتے تھے۔ میں نے اس کو بتا دیا کہ میں آ گیا ہوں اور نیپال جا رہا ہوں۔ تو وہ بولا۔

"ہم ساتھ چلے گا تم کو وہ جگہ نہیں ملے گا۔"

میں نے کہا۔ "چلو مجھے اعتراض نہیں ہے۔ مگر سوچ لو وہ مجھے نہیں جانتا مگر تمہارے لئے تو خطرہ ہے"

"ہم تمہارا ساتھ جائے گا تو ہم کو خطرہ نہیں ہوگا"

صبح ہی صبح ہم نکل کھڑے ہوئے۔ ایک بیل گاڑی میں ہم نے وہاں تک سفر کیا جہاں تک جا سکتے تھے اس کے بعد پہاڑیاں تھیں اور پیدل سفر کرنا تھا۔ گوباشو بہت تیزی سے میرے آگے آگے چل رہا تھا تین گھنٹے کے بعد اس نے راستہ بدل لیا اور وہ اس طرف چل دیا جو کہ راستہ نہیں تھا میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔

اب پہاڑوں کی چڑھائیاں خطرناک ہو گئی تھیں۔ مگر وہ ان کا عادی تھا۔ کوئی نہ کوئی راستہ اوپر جانے کا وہ تلاش کر لیتا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اب تک چاک چوبند تھا تھکن کے آثار مجھے نظر نہیں آتے تھے۔ یہاں کے پہاڑوں میں سبزہ نہیں تھا کہیں کہیں جھاڑیاں نظر آ جاتی تھیں مگر ان کے پتوں کا رنگ بھی مٹیالہ ہرا تھا۔ آسمان پر کبھی کبھی کوئی پرندہ بھی اڑتا نظر آ جاتا تھا۔ اب ہمارے سامنے ایک دیوار کھڑی تھی۔ پتھر کی دیوار بہت اونچی جس پر چڑھنا انسان کے لئے قطعی ناممکن تھا اس دیوار کی جڑ بھی نظر نہیں آتی تھی کیونکہ گہری کھائی تھی اور اس کھائی میں درختوں کے جھنڈ تھے اگر اس کھائی میں اترا جائے تو بھی پتہ نہیں وہ کھائی کتنی گہری ہے۔ مگر گوباشو اس کھائی میں اتر رہا تھا۔ میں بھی اس سے قدم ملا کر چل رہا تھا۔ اب ہم درختوں تک آ چکے تھے۔ اوپر پہاڑ آسمان تک جاتے محسوس ہوتے تھے۔ درختوں کے قریب کی آب و ہوا بدل چکی تھی یہاں پر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور ان درختوں کی جڑوں میں پانی نظر آ رہا تھا۔ گوباشو اس پانی کے اندر چلا گیا۔ پانی زیادہ گہرا نہیں تھا۔ ہم آگے بڑھتے گئے اب ہم درختوں کے سائے میں چل رہے تھے اوپر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا پتہ نہیں ہم سطح زمین سے کتنے نیچے تھے۔ وقت کی گردش کو کون روک سکا ہے روشنی اور اندھیرے کا یہ کھیل صدیوں سے جاری و ساری ہے۔ قدرت نے سورج اور چاند کو جس کام پر لگایا ہے وہ کر رہے ہیں ہر روز صبح ہوتی ہے روشنی ہوتی ہے اور پھر اپنے وقت مقررہ پر رات ہو جاتی ہے اور رات ہو گئی ہر طرف ہیبت ناک اندھیرا پھیل گیا۔ ہمارے چاروں طرف سنگلاخ چٹانیں تھیں ہم ایک ایسے قلعہ میں قید تھے جس کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ درخت خاموش تھے۔ رات کے اندھیرے میں درخت بھی خوفناک عفریت نظر آتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس مقام پر کبھی حضرت انسان کے قدم نہیں آئے۔

گوباشو مجھے یہاں کیوں لایا تھا۔ کیا وہ راستہ بھول گیا تھا۔ یا ان بھول بھلیوں میں ہی راستہ تھا۔ گوباشو کے اندر میں نے جھانکا مگر اس کے اندر کچھ نہیں تھا وہ میرے قریب آ گیا اور بولا۔ "آج کا رات ادھر رہنا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا کیا؟"

"تھا صاحب وہی راستہ تھا جو سب استعمال کرتا ہے وہ ہمارے واسطے خطرناک تھا۔ اس واسطے ہم ادھر آیا۔ تھوڑا الجھا ہے پر ادھر وہ نہیں آ سکتا۔ آپ ادھر آرام کرو ہم جائے گا۔"

میں نے گردن ہلائی اور زمین پر لیٹ گیا۔ اس کو میں کیا بتاتا کہ میں رات میں بہت کم سوتا ہوں۔ وہ ایک درخت کی موٹی جڑ پر بیٹھ گیا۔ "تم کو بھوک نہیں لگتی۔" میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے میری طرف شاید دیکھا تھا اور پھر آواز آئی۔

"لگتا ہے کھائے گا۔ ابھی تھوڑی دیر میں کھائے گا۔"

"تم کھانا تو لایا نہیں ہے کھائے گا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ادھر رات کو پانی کے واسطے بہت جانور آتا ہے۔ وہی کھائے گا۔" گوباشو نے جواب دیا۔

"تم پہلے اس راستے پر آ چکے ہو۔" میں نے پھر پوچھا۔

"ہاں کئی دفعہ آیا ہوں اور شاید میں اکیلا ہوں جو یہ راستہ جانتا ہے یہ بولے کہ یہ راستہ ہم نے کھوجہ ہے تو بھی ٹھیک ہے۔" گوباشو نے جواب دیا۔

میں جاگ رہا تھا اور گوباشو پیڑ کے گرے ہوئے تنے پر خاموش بیٹھا تھا۔ درختوں کے گرے پتوں پر سرسراہٹ ہوئی اور میں نے کروٹ اسی طرف کر لی۔ گوباشو اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔ دیکھنا یہ تھا کہ شکاری کون ہے آنے والا گوباشو کو شکار کرتا ہے یا گوباشو شکاری بنتا ہے۔ میں درمیان میں خاموش تماشائی تھا۔ مگر نہیں میں تماشائی تو تھا مگر ایک ایسا تماشائی جو گوباشو کا مددگار بھی تھا۔ سرسراہٹ تیز ہو گئی مگر آنے والا شکاری نہیں شکار تھا۔ خرگوش جیسے ہی گوباشو کے قریب آیا گوباشو کے جسم میں جان پڑ گئی اور خاموش شکار ہو گیا۔ اس طرح تین خرگوش گوباشو نے پکڑ لئے پھر اس نے ان کی کھال

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

اتار کر تین لکڑیوں کا جھولا بنا کر اس پر ٹانگ دیا اور آگ جلادی۔ گوباشو کا کھانا تیار ہوگیا۔ میں نے کروٹ بدل لی اور آنکھیں بند کرلیں اور رات کے پہرے دار کو کھڑا کیا اور سوگیا۔ رات کا پہرے دار میرا جاگتا الوہی ہے۔

صبح ہوگئی۔ درختوں پر زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔ پرندے اڑ کر اپنی خوراک کے لئے روانہ ہوئے گوباشو میرے قریب آ گیا اور بولا۔ ''بھوک لگا ہے تو بندوبست کرتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''میری فکر نہ کرو۔ میں تین دن اور نہیں کھاؤں گا۔''

گوباشو نے حیرت سے میری طرف دیکھا مگر خاموش رہا تو میں نے کہا۔ ''اب آگے چلنے کی تیاری کرو۔'' اور گوباشو آگے پانی کے کنارے کنارے چل پڑا۔ ہم ایک وادی میں تھے اس کے چاروں طرف بلند و بالا پہاڑی سلسلہ تھا اور اس پہاڑی سلسلے کی جڑ میں یہ پانی بہہ رہا تھا۔ یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ پانی کہاں سے آرہا تھا اور کہاں جارہا تھا۔ اس پانی کی وجہ سے درخت بہت گھنے تھے مگر یہ درخت پہاڑوں سے بہت نیچے تھے اس وادی کا کٹاؤ کچھ اس طرح تھا کہ ہر پہاڑ سے یہ وادی نظر نہیں آتی تھی اور نہ ہی وہاں سے نیچے آنے کا کوئی راستہ تھا۔ گوباشو ایک مقام پر رک گیا اور بولا۔

''پانی ادھر سے آتا ہے وہ دیکھو بلبلا بنتا ہے۔'' میں نے غور سے ادھر دیکھا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ پانی زمین سے ابل رہا تھا۔ گوباشو نے کہا۔

''ہم پہلے جائے گا۔ دیکھے گا پانی پورا سرنگ بھر کر آتا ہے یا کم ہے، ہم پھر واپس آئے گا اور تم کو ساتھ لے کر جائے گا۔ اگر سرانگ بھر کر پانی آیا تو رکنا ہوگا ہم دیکھ کر آتا ہے اور گوباشو پانی میں غائب ہوگیا او آدھے گھنٹے کے بعد واپس آ کر بتایا کہ تھوڑا پانی کے اندر چلنا ہوگا سانس روکنا ہوگا اس کے بعد سرنگ میں پانی کم ہوجائے گا اور ہم گردن پانی سے نکال سکے گا۔ شروع میں سرنگ چھت تک پانی میں ڈوبی ہے۔ میں بھی پانی میں اتر گیا اور آگے بڑھنے لگا تو گوباشو میرے آگے اچانک غائب ہوگیا۔ میں گوباشو کے مقام پر پہنچا تو میں بھی ایک دم سرنگ میں گر گیا۔ اب ہمیں پانی کے اندر چلنا تھا اور پانی کے مخالف سمت سفر کرنا تھا۔ گوباشو ایک اچھا تیراک تھا۔ وہ بہت تیزی سے جارہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے کئی دفعہ پلٹ کر مجھے دیکھا اور آگے بڑھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد پانی چھت سے نیچے ہوگیا اور گوباشو نے گردن پانی سے باہر نکال لی میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ سرنگ میں اندھیرا ضرور تھا مگر کسی قسم کی گھٹن نہیں تھی۔ پانی موتی کی طرح صاف تھا اور کسی قسم کا جانور پانی میں نہیں تھا۔ ایک گھنٹہ اور سفر کرنا پڑا اور چھت ہمارے سروں سے ہٹ گئی اب ہم ایک آبشار کے نیچے تھے اور اوپر سے پانی تیزی سے گر رہا تھا۔ آبشار کے اطراف درخت تھے اور دور دور ہریالی نظر آتی تھی۔ جنگلی پھولوں کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی میں نے آبشار کے چاروں طرف نظریں گھمائیں تو پتہ چلا ہم ایک بہت بڑے کنویں میں ہیں اور اوپر سے آبشار گر رہا ہے۔ سنگلاخ چٹانوں کی دیواریں ہمارے چاروں طرف کھڑی ہیں۔ جس جگہ ہم کھڑے تھے وہاں سورج کی روشنی تھی اوپر جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے گوباشو سے پوچھا تو اس نے بتایا۔ ''کوئی فکر کا بات نہیں ہے ہم کو اوپر جانے کا ابھی ضرورت نہیں ہے۔'' اور وہ ایک طرف چل پڑا۔ ایک جگہ جنگلی بیر کی گھنی جھاڑیاں پہاڑ کی جڑ میں اگی ہوئی تھیں۔ گوباشو نے نیفے سے ایک چھری نکالی اور جھاڑیوں کو کاٹنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا میں اس کے قریب گیا تو میں نے دیکھا جھاڑیوں کے پار ایک سرنگ تھی اس کی چھت زیادہ سے زیادہ پانچ فٹ تھی اور اندر اندھیرا تھا۔ گوباشو جھاڑیاں پھلانگ کر سرنگ میں داخل ہوگیا۔ میں بھی اس کے اندر چلا گیا۔ گوباشو نے اندھیرا ہوتے ہی میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ دوسرے ہاتھ میں اس نے چھری پکڑی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔

''کیا اندر کچھ خطرہ ہے؟'' تو وہ بولا۔

''نہیں خطرہ نہیں ہے اندھیرا ہے احتیاط ضروری ہے۔'' ''یہ سفر کتنی دیر کا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''زیادہ نہیں صرف ایک گھنٹہ لگے گا۔''

سرنگ میں روشنی نہیں تھی مگر ہوا کا گزر خوب تھا۔ ہم جس طرف جارہے تھے اس طرف سے ہوا آرہی تھی اور جس راستے سے آئے تھے وہاں سے نکل رہی تھی۔ یہ سرنگ انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی نہیں تھی کبھی اس سرنگ سے پانی آتا جاتا ہوگا مگر اب یہ سوکھی تھی اس کی اونچائی کہیں ایک دم کم ہوجاتی اور کہیں پر ہمارے سروں سے بھی زیادہ ہوجاتی تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس سرنگ میں کسی قسم کے کیڑے مکوڑے نہیں تھے۔ شاید اس کی وجہ وہ بوٹی جو اس میں پھیلی ہوئی اور وہ بوٹی گندھک کی۔ ایک گھنٹہ چلنے کے بعد ہم ایک قدرے کھلے علاقے میں نکل آئے۔ یہاں بھی دہانے پر جھاڑیاں کاٹنی پڑیں۔ اس جگہ کو میدانی تو نہیں کہہ سکتے۔ پہاڑ دور دور ضرور نظر آتے تھے۔

گوباشو نے کہا۔ ''میں اپنے گھر آ گیا ہوں۔ اوپر میرا گھر ہے یہ علاقہ میرے لئے اب خطرناک ہوگیا ہے۔ میں نے آپ کو محفوظ راستے سے ادھر پہنچا دیا ہے۔ وہ ظالم اوپر ہوگا ضرور۔ اب جو کرنا ہے وہ آپ کو کرنا ہے میرا کام یہاں پر ختم ہوا، بولو تو اوپر بھی پہنچا سکتا ہوں۔''

''تم صرف یہ کرو کہ اس راستے سے میرے آگے اوپر چلو۔ ڈرو نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے صاحب۔'' اور وہ ایک چڑھائی چڑھنے لگا۔ اتنا سفر کرنے کے باوجود بھی اس میں تھکن کے آثار نہیں تھے۔ وہ واقعی ایک پہاڑی آدمی تھا۔ پہاڑوں پر چڑھنا اترنا اس کے لئے معمولی بات تھی۔

وہ بہت تیزی سے اوپر جارہا تھا۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہوا کہ درمیان میں خلاء آ گیا اور بڑی لمبی چھلانگ لگانی پڑی اگر وہ ذرا چوکتا یا چھلانگ چھوٹی پڑ جاتی تو وہ کھائی میں گر پڑتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس کے قدم بڑے میکانکی انداز میں آگے اور اوپر بڑھتے رہے یہ سفر تھکا دینے والا تھا مگر گوباشو شاید اپنی عادت اور مشق کی وجہ سے تازہ دم تھا۔

چڑھائی ختم نہیں ہوئی۔ مگر ہم جہاں تک پہنچے تھے وہاں پر بائیں طرف کچھ میدانی علاقہ تھا اس کے بعد پہاڑی سلسلہ شروع ہورہا تھا۔ گوباشو ایک ٹیلے کی آڑ میں بیٹھ گیا اور بولا۔

''اس میدان کے آخری سرے پر میرا مکان ہے اور یہ میدان میری ہی زمین ہے۔ میں اسی پر کچھ کاشت کرتا تھا۔ میں اس سے آگے جانے کی جرأت نہیں کرسکتا کیونکہ اگر اس نے دیکھ لیا تو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔'' ''مگر تم یہاں کبھی خود کو محفوظ نہیں کرسکتے۔ اس لئے تم میرے ساتھ رہو۔''

میں نے اپنے کارندے کو ہوشیاری کا اشارہ کردیا تھا؟ اور میں میدان کی طرف چل دیا تھا۔ میدان کے درمیان میں ہم دونوں پہنچے تھے سامنے کوئی آتا نظر آیا۔

گوباشو نے مجھے بتایا۔ ''وہ سامنے آرہا ہے۔''

وہ ایک طویل قامت شخص تھا۔ اس کے جسم پر صرف اور صرف ایک دھوتی تھی۔ اس کا چہرہ اس کو تبت کا باشندہ ظاہر کرتا تھا۔ مگر قد اس کو منگول نسل کا ظاہر کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی جو کئی جگہ سے خم کھائی ہوئی تھی اس لکڑی کے آخری سرے پر ایک سرخ رنگ کا کپڑا لپٹا ہوا تھا اور اس نے اس کو مٹھی میں پکڑا ہوا تھا۔ اب وہ ہمارے قریب آ گیا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کی اس بات سے اس کی گہرائی کا اندازہ ضرور ہوتا تھا۔

اس کا بدن کسی ساز کے کسے ہوئے تاروں کی طرح سیدھا اور چمکیلا تھا۔ مگر اسکو اپنی آنکھوں پر کنٹرول نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں نفرت و عداوت کی آماجگاہ نظر آتی تھیں۔ اس نے آتے ہی اپنی لکڑی زمین پر ماری اور بولا۔

''تو پھر آ گیا۔ میں نے منع کردیا تھا آئے گا تو مارا جائے گا۔'' وہ کچھ اور بھی کہتا کہ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو روکا اور پوچھا۔

''میں تیرے پاس چل کر آیا ہوں۔ اس طرح میں تیرا مہمان ہوا اور تو یہ سلوک کرتا ہے اپنے مہمانوں کے ساتھ۔''

اس نے ایک قہر میں ڈوبی نظر مجھ پر ڈالی اور کہا۔ ''تو کون ہے۔ مجھے نہیں پتہ پر یہ ضرور جانتا ہوں کہ تو اس

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

میرے دشمن کے ساتھ آیا ہے۔ تو ضرور اس کا حمایتی ہے۔ یہ تجھے بھی پتہ ہوگا کہ دشمن کا حمایتی کون ہوتا ہے۔"

"یہ صرف تیرے اندازے ہیں۔ صرف اندازوں کو بنیاد بنا کر اگر تو فیصلہ کرے گا تو بعد میں پچھتانا پڑے گا اس لئے پہلے پوری بات کر لے پھر کوئی فیصلہ کرنا۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے لکڑی زمین پر ٹکا دی اور بولا۔ "تو بتا تو کون ہے اور کیوں آیا ہے؟"

"میں حکیم ہوں۔ صرف جسمانی حکیم نہیں ہوں میرا نام حکیم کامل ہے دلی میں ہوتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تو کہاں آ گیا حکیم۔ یہاں کوئی بیمار نہیں ہے۔" وہ تمسخرانہ انداز میں بولا۔

"مجھے مریض نظر آ رہا ہے اور تم کہتے ہو کوئی مریض نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"تو شاید مجھے مریض کہہ رہا ہے۔ میں تبت کا مشہور اور شاکیہ منی کا نمائندہ ہوں تو نہیں جانتا۔ ہلاٹی ہوں ان پہاڑوں پر میری حکومت ہے تو کتنا پاگل ہے کہ مجھے مریض کہتا ہے۔"

"تو حکومت کرنے کا شوقین ہے شاید۔" میں نے کہا۔

"یہ شوق کس کو نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔

"تو پھر تو بدھ مت نہیں ہو سکتا۔ شاکیہ منی نے تو اپنا راج پاٹ چھوڑ کر گیان پایا تھا۔ وہ سچائی کی تلاش میں محل چھوڑ کر جنگلوں میں نکل گیا تھا۔ سخت تکلیفیں برداشت کرتا رہا۔ بدھ کی تعلیم آدمی کو راست بازی اور نیک دلی کی ہدایت کرتی ہے تو کیسا اس کا پیروکار ہے کہ حکومت کرنے کا شوق رکھتا ہے یہ تو اس کی تعلیمات سے بالکل الگ ہے۔" میں نے کہا۔

وہ چند منٹ غور سے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر بولا۔ "تو بھی تو حکیم نہیں ہے میری طرف انگلی اٹھانے سے پہلے اپنی اصلیت بھی تو کھول دے۔"

"میری اصلیت یہی ہے۔ میں علاج کرتا ہوں مگر تو تو بدھا کو بدنام کرتا ہے جس کا خود کو پیروکار بتاتا ہے۔ میں جانتا ہوں تو نے صرف ایک لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔" میں نے کہا۔

"بہت باتیں کر لیں اب تو جا پھر واپس مت آنا چھوڑ اس لئے رہا ہوں کہ تیری میری لڑائی نہیں ہے۔ مگر یہ نہیں جائے گا۔" اس نے گوباشو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ بھی جائے گا اور میں بھی جاؤں گا۔ تو ذرا آسمان کی طرف دیکھ کون آ رہا ہے۔"

اس نے فوراً آسمان کی طرف دیکھا اور یہی اس کی بھول تھی۔ آسمان پر ایک بادل اس کو نظر آیا۔ مگر نظریں میری طرف کرنے سے پہلے اس کی لکڑی ہوا میں اڑ گئی۔ اس نے دوڑ کر اس کو پکڑنے کی کوشش کی تو میں نے کہا۔ "بے کار ہے تیری جادو کی لکڑی کو ہوا اڑا لے گئی۔"

"تو نے دھوکا کیا ہے میرے ساتھ۔" وہ غصے سے بولا۔

"آسمان پر کچھ تجھے نظر آیا۔" میں نے پوچھا۔

اس نے پھر اوپر دیکھا اور اس کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ آواز منہ سے نہیں نکلی تو میں نے کہا۔ "اب بتا کس کی حکومت ہے۔ یہ لاتعداد چھوٹی چھوٹی مکھیاں ہیں، تو ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور چلا ہے حکومت کرنے تیرا سارا جادو منتر ایک لکڑی میں تھا اور وہ لکڑی بھی نہیں سنبھال سکا، تو کس منہ سے حکومت کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ تیرا دھوکے باز گرو جس نے تجھے بانس پر چڑھا کر رکھا تھا وہ کہاں ہے۔ اس کو آواز دے۔ مگر وہ آئے گا نہیں۔ بتا وہ لڑکی کہاں ہے جس کو تو گوباشو کے گھر سے اٹھا کر لایا تھا۔"

"میں بتا دوں گا۔ تو پہلے ان کو روک۔" وہ آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔

"پہلے بتا کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں بتاتا ہوں۔" وہ ایک طرف چل دیا۔ کچھ ہی دیر چلنے کے بعد ایک مکان نظر آنے لگا۔ وہ مکان پہاڑ کے دامن میں تھا اور بہت بڑی جگہ میں تھا۔ گوباشو نے کہا۔ "یہی میرا مکان ہے۔"

اندر سے یہ مکان بہت بڑا تھا حالانکہ ایسا باہر سے نظر نہیں آتا تھا۔ ہلاٹی اندر چلا گیا۔ وہ ایک پتھر کی بہت بڑی سل پر جا کر بیٹھ گیا اور اس نے منہ سے کچھ آواز نکالی۔ ایک آدمی دوڑ کر اس کے قریب آ گیا اور گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ ہلاٹی کے بولنے سے پہلے میں نے کہا۔ "ہلاٹی کھڑا ہوا جا یہ تیرا مکان نہیں ہے مالک مکان کھڑا ہے اور تو مالک کی طرح بیٹھا ہے۔ کچھ شرم حیا تیرے اندر ہے۔"

اس کا چہرہ یہ سن کر سرخ ہو گیا۔ وہ چیخ کر بولا۔

"تو کیا سمجھتا ہے میں اتنی آسانی سے سب کچھ چھوڑ دوں گا۔"

"آسمان کی طرف ایک دفعہ اور دیکھ لے کیونکہ اس کے بعد تجھے گردن اٹھانے کی مہلت نہیں ملے گی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھنے کے بجائے پتھر کی سل پر پیروں کو رگڑا۔ اس کی رگڑ سے چنگاریاں اور آگ کے شعلے نکلے اور آسمان کی طرف چلے گئے۔ آسمان پر مکھیوں کا بادل درمیان سے پھٹ گیا اور شعلے اوپر چلے گئے اور پھر واپس نہیں آئے بادل پھر اپنی جگہ قائم ہو گیا۔

"اور کچھ تیرے پاس ہے تو وہ بھی نکال لے۔" میں نے کہا۔

اس نے پھر پتھر کی سل پر پیر رگڑ دیئے۔ اس کے ایسا کرتے ہی وہ بھاری سل ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ ہوا میں معلق ہو گئی ہلاٹی اس پر کھڑا تھا۔ میں نے کہا۔ "تیرے اوپر آسمان نہیں بادل ہے زہریلی مکھیوں کا بادل۔ تیرے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں ہے۔ اس لئے زمین پر آ جا۔"

وہ گردن اکڑا کر بولا۔ "تو اتار سکتا ہے۔ بول تجھ میں اتنی شکتی ہے۔"

میں نے جواب دیا۔ "مجھے اتارنے کی ضرورت نہیں ہے تو خود اتر آئے گا۔" اور پھر بادل قریب آنے لگا۔ وہ منتر پڑھ پڑھ کر اس پر پھونکتا رہا اور مکھیاں اس سے لپٹ گئیں اور چند منٹ میں ہلاٹی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور جب مکھیاں اس کے جسم سے اڑ گئیں تو اس کی جگہ ایک ایسا بدن میرے سامنے پتھر کی سل پر پڑا تھا جس کے بدن پر مساموں سے زیادہ سوراخ تھے اور زہر کی زیادتی کی وجہ سے اس کا پورا بدن نیلا ہو گیا تھا۔ گوباشو نے حیرت سے اس کو دیکھا مگر زبان سے کچھ نہ بولا۔

میں نے کہا۔ "گوباشو! یہ تمہارا دشمن سامنے مرا پڑا ہے۔ تم کو مبارک ہو تمہارا مکان تم کو مل گیا تم اپنی لڑکی کو دیکھو اور مجھے بتاؤ وہ ٹھیک ہے کہ نہیں"

وہ مکان کے اندر چلا گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ساتھ بیس عورتیں تھیں اس نے اپنی لڑکی کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ "یہ سب عورتیں زبردستی اٹھائی ہوئی ہیں۔" گوباشو نے بتایا۔

"تم ان سب کو ان کے گھروں پر پہنچا دو۔ ان کو بتا دو کہ شیطان مر چکا ہے اور وہ اب آزاد ہیں۔" اور میں واپس پلٹ گیا۔

❁.....❁.....❁

"ہر آدمی اولاد کی خواہش کرتا ہے اور اس کی اولین خواہش اولاد نرینہ کی ہوتی ہے۔ اولاد تو اولاد ہے۔ وہ لڑکی ہے تو اور لڑکا ہو تو۔ پھر اولاد نرینہ کی خواہش ہی کیوں کرتا ہے۔ اس کی چند معاشرتی اور کچھ فطری وجوہات ہیں۔ فطری وجہ تو یہ ہے کہ اس کے کان میں شروع سے یہ پھونکا گیا ہے کہ لڑکے سے نام چلتا ہے۔ یہ صرف دل کو بہلانے کا بہانہ ہے۔ بیٹا باپ کے خانے میں اس کا نام لکھتا ہے جب وہ باپ بنتا ہے تو باپ کے خانے میں اس کا نام آتا ہے۔ دادا کا نام دور چلا جاتا ہے۔ آگے اسی طرح چلتا ہے۔ اور آدمی کا نام ایک دن ختم ہو جاتا ہے۔ پھر نام چلنے والی بات تو ختم ہو گئی۔

معاشرتی طور پر آدمی خود غرض ہے۔ وہ اپنی کھوئی چیز کسی کے حوالے کرنے پر راضی نہیں ہوتا وہ چاہتا ہے اس کی دولت اس کا بیٹا حاصل کرے کسی اور کو وہ دینا نہیں چاہتا۔ اس لئے اس کو بیٹے کی ضرورت پڑتی ہے۔ انسان کے مرنے کے بعد اس کی دولت اس کا بیٹا کھائے یا کوئی اور مرنے والے پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ بیٹا کھاتا ہے تو اس کا کیا فائدہ ہوا اور گھر کسی دوسرے نے کھایا تو کیا نقصان ہوا؟ دنیا میں نام مرنے کے بعد بھی چلتا ہے مگر صرف ان خصوصی لوگوں کا جو کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دے جاتے

READING CORNER
http://readingcornerblogspot.com/

ہیں۔ یا انسانیت کے لئے فلاح و بہبود کا کام کر جاتے ہیں۔ اولاد نرینہ سے صرف نسل چلتی ہے۔ نام نہیں چلتا اور نسل بھی ایک حد تک ہی چلتی ہے۔ ہمیشہ وہ بھی نہیں چلتی۔ لوگ بڑے نام اپنے نام کے ساتھ جوڑ کر اس کی نسل کو ظاہر ضرور کرتے مگر ان میں کتنے سچے ہوتے کوئی نہیں پوچھتا۔"

رولو کا خاموش ہوا تو میں نے کہا۔ "یہ آج اولاد نرینہ کا خیال آپ کو کیونکر آ گیا۔"

"آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے ایک مریض آئے تھے۔ ان کو میں نے دیکھا تھا وہ صاحب اولاد تھے۔ پانچ لڑکیوں کے باپ تھے اور اولاد نرینہ کے خواہش مند تھے۔" رولو کا نے جواب دیا۔

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟" میں نے پوچھا۔

"انسان کے بس میں یہ نہیں کہ وہ اولاد پیدا کرا دے۔ لڑکا لڑکی کا پیدا کرنا تو دور کی بات ہے تم صاحب اولاد ہو جو کچھ ملا ہے اس پر صبر کرو۔ میں نے ان کو سمجھایا۔" رولو کا نے کہا۔

"تو پھر ان کی سمجھ میں آ گیا۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں ان کو کسی نے بتا دیا ہے کہ دواؤں سے نرینہ اولاد ہو سکتی ہے۔" رولو کا نے کہا۔

"اب پھر آئیں گے۔" میں نے پوچھا۔

"ضرور آئیں گے۔ کیونکہ وہ مجھ سے ملنے نہیں آئے تھے وہ تمہارا نام سن کر آئے تھے۔" رولو کا نے جواب دیا۔

"میرا نام میں نے کب اولاد پیدا کروانے کا دعویٰ کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"کل آئیں گے آپ پتہ کر لیں۔" رولو کا نے بتایا۔

دوسرے دن شام چھ بجے موصوف تشریف لے آئے۔ شکل سے ہی کھاتے پیتے گھرانے کے لگتے تھے۔ سفید برق کرتہ اور کلی دار پاجامہ، کامدار سلیم شاہی ان کا لباس تھا۔ عمر کا اندازہ تیس اور چالیس کے درمیان تھا۔ نہایت عمدہ صحت اور چہرے پر فارغ البالی کی مہر لگی تھی۔

آتے ہی بولے۔ "ہمیں حکیم وقار احمد سے ملنا ہے۔"

"میں نے کہا۔" میں حاضر ہوں فرمایئے میں حکیم وقار ہوں۔"

"میں کل آیا تھا آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔" وہ بولے۔

"آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔" میں نے کہا۔

"ہمارا نام نواز شیر جنگ ہے اور اورنگ آباد کے قریب ہماری زمینداری ہے۔ آپ کا نام ہم نے سنا تھا تو ہم آئے ہیں۔" وہ بولے۔

"بڑی ذرہ نوازی آپ کی۔ فرمایئے ہم آپ کی کیا خدمت کریں۔"

"آپ ہمارا علاج کر دیں پھر خدمت تو ہم کریں گے۔" وہ بولے۔

آپ کو کیا تکلیف ہے۔ پہلے زبانی بتا دیں اس کے بعد معائنہ بھی کر لوں گا۔" میں نے کہا۔

"میری پانچ لڑکیاں ہیں اور دو بیویاں ہیں مگر اولاد نرینہ نہیں ہے۔" وہ بولے۔

"دیکھئے اگر آپ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ ہوتے تو میں آپ کا علاج ضرور کرتا کیونکہ یہ ایک مرض ہوتا اور ہر مرض کی دوا قدرت نے بنائی ہے۔ بات صرف اس کو استعمال کرنے کے طریقے کی ہے۔ مگر آپ کا کیس دوسرا ہے آپ بھی اولاد پیدا کرنے کے قابل ہیں اور آپ کی بیویاں بھی کسی کو اس قسم کا مرض نہیں ہے پھر میں علاج کیا کروں۔" میں نے کہا۔

"میں نے سنا ہے حکمت میں ایسی دوائیں ہیں کہ نرینہ اولاد پیدا ہو جاتی ہے۔" وہ بولے۔

"دیکھئے میرے بھائی قدرت نے کچھ کام اپنے پاس رکھے ہیں ان کے کرنے کا اختیار انسان کو نہیں دیا ہے۔ کون چاہتا ہے اس کا کوئی عزیز مر جائے مگر مر جاتا ہے۔ انسان اس کو مرنے سے نہیں روک سکتا۔ اسی طرح اور بھی بہت سے کام ہیں ان میں سے اولاد پیدا کرنے کا معاملہ ہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ دونوں فریق صحت مند ہیں مگر اولاد نہیں ہوتی اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ شادی کے بیس سال بعد اولاد ہو جاتی ہے۔ یہ کام بھی قدرت نے اپنے پاس رکھا

ہے۔ اس میں مداخلت نہیں ہوتی وہ جب چاہے گا تم کو بیٹا دے دے گا۔ ہر کام وقت پر ہوتا ہے صبر کرنے کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

"میں اگر بوڑھا ہو گیا اور پھر بیٹا ہوا تو کیا فائدہ نہ میں اس کو دیکھ سکوں گا اور نہ پرورش کر سکوں گا۔" وہ بولے۔

"دیکھئے نواب شیر جنگ صاحب۔ آپ سے نہیں میں ایک عام بات کر رہا ہوں۔ انسان بہت خود غرض ہے۔ وہ صرف وہی بات سوچتا ہے جس میں اس کو فائدہ ہوتا ہے۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس کی جدوجہد اس کو کامیابیاں دلا رہی ہیں۔ وہ قدرت کے فیصلوں پر دھیان نہیں دیتا۔ وہ نہیں سمجھتا کہ اس کے لئے راستے قدرت بنا رہی ہے۔ اگر اس کی سمجھ میں یہ بات آ جائے تو وہ کبھی مغرور نہ ہو، بے شک ہر انسان کو اولاد کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ ایک قدرتی عمل ہے۔ اس خواہش کو قدرت نے ہر انسان میں رکھا ہے اور اس کی پرورش کو ماں کا جذبہ بھی دیا ہے۔ مگر اولاد کا دینا نہ دینا کب اور کس طرح دینا ہے یہ صرف قدرت ہی جانتی ہے۔ حکیم ڈاکٹر علاج کرتے ہیں مگر گارنٹی کوئی نہیں دے سکتا۔" میں نے بات ختم کی۔

"آپ نے ٹھیک فرمایا۔ مگر میں نے سنا ہے کہ جڑی بوٹیوں میں ایسی تاثیر ہوتی ہے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے میں آپ سے متفق ہوں اس کے باوجود چاہتا ہوں کہ آپ کچھ کوشش تو کریں۔" شیر جنگ نے کہا۔

"آپ کا یہ کہنا کہ جڑی بوٹیوں میں حیرت انگیز تاثیر ہوتی ہے درست ہے۔ ہر علاقے کی جڑی بوٹیاں الگ الگ تاثیر کی حامل ہوتی ہیں۔ زمین کے اندر کارخانہ قدرت اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ مٹی پتھر بن جاتی ہے اور ہزاروں سال کے بعد یہی پتھر تانبہ بن جاتا ہے اور پھر یہی تانبہ سونا بن جاتا ہے اس کی بھی ایک مدت ہوتی ہے اس کے بعد یہ بھی اپنی شکل تبدیل کر لیتا ہے۔ یہ ہزاروں سال کا چکر ہے اس کائنات کے خالق کو ہی اس پر کنٹرول حاصل ہے جڑی بوٹیوں میں بے شک حیرت انگیز خصوصیات ہوتی ہیں صاحب نظر ان کو جانتے ہیں پہچانتے ہیں اور اس سے انسانوں کے دکھ دور کرتے ہیں۔ ان جڑی بوٹیوں میں زندگی اور موت کے راز پوشیدہ ہیں جو لوگ ان کو پہچانتے ہیں وہ مبارکباد کے مستحق ہیں نباتات کی تاثیر جو جانتا ہے وہی اچھا معالج بھی ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"حکیم صاحب آپ کی عالمانہ اور ماہرانہ باتیں سن کر میرا دل کہتا ہے کہ آپ کچھ کوشش تو کریں۔" شیر جنگ نے کہا۔

رولو کا موجود تھا مگر ہماری گفتگو میں اس نے حصہ نہیں لیا ویسے بھی رولو کا بلاوجہ کی گفتگو نہیں کرتا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے زبان کھولی۔

"نواب صاحب کوشش کرنے میں حرج نہیں ہے مگر آپ توقع مت رکھنا یہ آپ کی تقدیر کا معاملہ ہے کوئی کسی کی تقدیر نہیں بدل سکتا جو کچھ اوپر لکھا جا چکا ہے وہ پتھر کی لکیر ہے۔ ہم سے گلہ شکوہ آپ نہ کرنا اور ہاں آپ سے صرف دعا کے طالب ہیں کوئی رقم کسی شکل میں ہم قبول نہیں کریں گے کامیاب نہ ہوں یا ہوں دونوں صورتوں میں۔"

"مجھے آپ کی آخری بات سے ذرا سا اختلاف ضرور ہے مگر مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔" شیر جنگ نے خوش ہو کر کہا۔

"تو پھر آپ اپنا پتہ بتا جائیں۔ میں آپ کے پاس خود آ جاؤں گا اور پھر آپ کا ماحول اور حالات کے مطابق کچھ کروں گا۔" رولو کا نے کہا۔

"بہت بہتر، میں آپ کا انتظار بڑی بے چینی سے کروں گا۔" شیر جنگ نے کہا۔

اور پھر وہ چلا گیا اس کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ "یہ کام تو ہمارے بس سے باہر ہے پھر تم نے کیوں وعدہ کر لیا؟"

"ہے تو ہمارے بس سے باہر مگر بعض اوقات جو کچھ سامنے نظر آتا ہے وہ حقیقت نہیں ہوتی اصل بات کچھ ہوتی اور نظر کچھ آتی ہے۔ میں ان کے پاس جاؤں گا وہاں کے حالات کا جائزہ لوں گا اور اگر واقعی قدرت کا یہ فیصلہ نظر آیا کہ ان کو اولاد نرینہ نہ ہو تو معافی مانگ لوں گا سارا کچھ تو اس کو

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

بتا دیا ہے۔" اور رولو کا دوسرے دن اورنگ آباد روانہ ہو گیا۔

❁.....❁.....❁

اورنگ آباد سے بیس میل دور بہادر جنگ گڑھی تھی۔ یہاں کی ساری زمین اور اطراف کے کئی گاؤں شیر جنگ کی زمینداری میں شامل تھے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں خاموشی سے اپنا کام کروں گا مگر میرے پہنچتے ہی شیر جنگ اتنا خوش ہوا کہ اس نے حویلی میں ایک جشن کا سا سماں باندھ دیا۔

"آپ اتنی جلدی تشریف لائیں گے میں نے نہیں سوچا تھا۔" شیر جنگ نے کہا۔

"کام کرنا ہو تو اس کو ذمہ داری سے اور جلدی کرنا چاہئے۔" میں نے کہا۔

"بہت خوب، میں نے جیسا سنا تھا آپ کو اس سے بھی آگے دیکھ رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"یہ آپ کی مہربانی ہے مگر آپ کوئی خصوصی بندوبست میرے لئے نہیں کریں گے۔ میں اگر ہوا تو آپ کے ساتھ ہی کھانا وغیرہ کھاؤں گا اور اگر نہ ہوا تو تردد نہ کیجئے گا۔ میں دن بھر کو بھی جا سکتا ہوں اور رات بھر بھی غائب رہوں گا۔ معاف کرنا محترم ہمارا اپنا طریقہ کار ہے میری آمد کو آپ نے آشکار کر دیا مگر اس میں آپ کا قصور نہیں ہے کیونکہ میں نے آپ کو نہیں بتایا تھا۔" میں نے کہا۔

"اب تو سب کو پتہ ہے آپ حکیم ہیں اور علاج کے غرض سے آئے ہیں اب میں کیا کروں۔" شیر جنگ نے کہا۔

"اس سے زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ ایک بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ اگر میں اپنے کمرے میں موجود ہوں اور کوئی بھی مجھ سے ملاقات کرنا چاہے خواہ وہ آپ خود ہی ہوں صرف ایک بار دروازے پر دستک دیں گے جواب ملا تو ٹھیک ہے میں دروازہ کھول دوں گا اگر جواب نہ ملے تو دوبارہ دستک نہیں دینی ہے اور دروازہ کھولنے کی کوشش نہیں کرنی ہے۔ اگر میری بات پر عمل نہ ہوا تو نقصان آپ کا ہی ہوگا۔" میں نے کہا۔

شیر جنگ نے بڑے غور سے میری بات سنی اور کہا۔ "ایسا ہی ہوگا۔"

رات کے کھانے پر حویلی کے سارے مکین موجود تھے۔ شیر جنگ نے تعارف کرایا۔ انہوں نے دو خواتین کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ میری شریک حیات ہیں۔ یہ بڑی ہیں اس نے ہرے سوٹ والی کی طرف اشارہ کیا ان کا نام خیر النساء بیگم ہے۔ یہ پیلے سوٹ میں ارم بیگم ہیں۔"

پھر ایک چالیس سالہ عورت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ میری بڑی بہن ہیں اور ان کے برابر میرے برادر نسبتی تشریف رکھتے ہیں۔ اس حویلی کا یہ دستور ہے کہ رات کے کھانے پر سب بڑے شریک ہوتے ہیں بچوں کو پہلے فارغ کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہم لوگ اسی وقت ضروری گفتگو بھی کرتے ہیں۔ بچے ہوں گے تو وہ مداخلت کریں گے۔"

سب لوگ ان کی باتیں خاموشی سے سن رہے تھے۔

انہوں نے پھر سلسلہ کلام جوڑا میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ حکیم صاحب ہیں دلی سے آئے ہیں۔ بیگمات کا کچھ علاج وغیرہ کریں گے یہ میرے معزز مہمان بھی ہیں۔" اس کے بعد کھانا کھایا گیا اور میں خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گیا۔ شیر جنگ جب تعارف کرا رہے تھے تو میں سب چہروں کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ صرف ان کی بہن مشتری بیگم اور بہنوئی اختر میاں کے چہرے کے تاثرات کچھ ناگوار سے تھے انسان کا چہرہ ایک آئینہ ہوتا ہے اس آئینہ میں نظر رکھنے والا آدمی انسان کے اندر کا کچھ نہ کچھ تو اندازہ لگا ہی لیتا ہے۔ تو میرا اندازہ تھا کہ پہلے ہی سڑک پر گاڑی دوڑاؤں گا۔

حویلی بہت بڑی تھی اس میں بے حساب کمرے تھے۔ کچھ میں ملازمین بھی رہتے تھے جو کہ نچلی منزل پر تھے مالکان کے کمرے پہلی منزل پر تھے ان کمروں میں ضرورت کی تمام سہولتیں موجود تھیں۔ میں ایک گھنٹے کے بعد روپوشی کی حالت میں کمرے سے باہر آ گیا۔ پہلے ملازمین کے کمروں کے اندر دیکھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں کچھ کمرے اندر سے بند تھے مگر میں اپنے طریقے سے اندر چلا گیا۔ اس طرح کی خلوت میں جانا مناسب تو نہیں تھا مگر میں ان کی باتیں سننا چاہتا تھا۔ ملازمین کے کمروں میں کچھ میں مجھے ایسے

نظارے جس کا تصور اس حویلی کے مالکان نہیں کر سکتے نظر آئے مگر یہاں پر میرے کام کی چیز کچھ نہیں تھی۔ اوپری منزل پر کونے میں چار کمرے مشتری بیگم کے پاس تھے۔ میں سیدھا اس کمرے میں چلا گیا۔ جہاں پر مشتری بیگم اور ان کے میاں اختر میاں موجود تھے۔ میں ان کے قریب چلا گیا وہ باتیں کر رہے تھے۔

"میں کہتی ہوں یہ نگوڑا حکیم کہاں سے ٹپک پڑا۔ کیا علاج کرے گا۔" مشتری بیگم نے کہا۔

"آیا ہے تو کچھ نہ کچھ کرے گا ہی۔" اختر میاں بولے۔

"کچھ نہیں ہوگا۔ پوتی ہی ہوگی۔ شیر جنگ پوتے کو ترستا ہی رہے گا۔" وہ بولی۔

"اور اگر ہو گیا تو پھر ہم لوگاں کیا کریں گے۔" اختر میاں بولے۔

"وہی کریں گے جو پہلے کیا تھا۔" مشتری بیگم بولیں۔

"ارے ایسا اتفاق بار بار کیسے ہوگا۔ پہلے تو تم نے پوتی کو جنم دیا تھا تو کام بن گیا بار بار ایسا نہیں ہوتا۔ مجھے لگتا ہے کچھ گڑبڑ ہونے کو ہے۔"

"میں بولتی ہوں تم اپنی زبان پر قابو کرو۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ خاموشی سے میرا کھیل دیکھتے جاؤ۔ اپنی زبان کو بند کرو۔" مشتری بیگم نے اختر میاں کو جھاڑا۔

"کیا کرو گی کچھ پتہ تو چلے۔" اختر میاں نے پوچھا۔

"تم یہ تو مانتے ہو نا کہ میں تم سے زیادہ چتر چالاک ہوں۔ میری وجہ سے تم زمیندار بنے بیٹھے ہو اگر میں بھائی کو ہاتھ میں نہ رکھتی تو تم حیدر آباد میں ملازمت کرتے ہوتے۔" مشتری بیگم نے کہا۔

"سو تو ہے۔ تم نے کمال ہی کر دیا۔ شیر جنگ کی دونوں بیگمات بھی تمہارا ہی دم بھرتی ہیں۔" اختر میاں نے تعریف کی۔

"تو پھر خاموش رہو۔" مشتری بیگم نے کہا۔

"خاموش ہی ہیں۔" اختر میاں بولے۔

اب اور میرا وہاں رکنا بیکار ہی تھا۔ ان کی باتوں سے یہ اندازہ تو ہوا کہ کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔ پھر میں ملازمین کی طرف رجوع ہوا۔ تو پتہ چلا کہ حویلی کا پورا کنٹرول مشتری بیگم کے ہی پاس ہے۔ حویلی میں جو خرچ ہوتا ہے اور جو ملازمین کو دیا جاتا ہے سب کا حساب مشتری بیگم کے پاس رہتا ہے۔ شیر جنگ کی دونوں بیگمات نہایت سادہ اور آرام پسند ہیں۔ مشتری بیگم نے اپنی چالاکی اور چرب زبانی سے دونوں کا اعتماد حاصل کر لیا ہے۔ میں روز ہی مشتری بیگم کے کمرے میں جاتا رہا۔ ان کے برابر میں جو کمرہ تھا اس میں ان کا دس سالہ لڑکا رہتا تھا اور اس کے برابر ہی ان کی لڑکی کا کمرہ تھا۔ ایک رات میں گیا تو دونوں باتیں کر رہے تھے۔

"بیگم ذرا سوچو! ہم کو کیا ایک پوتے کی ضرورت نہیں ہے۔" اختر میاں نے کہا۔

"ہے تو پھر کیوں اور کا جھنجھٹ پالوں۔" مشتری بیگم نے تیوریاں بدل کر کہا۔

"وہ تو ہے پر خالص اپنا بھی ہونا چاہئے۔" اختر میاں نے کہا۔

"آج پھر تم کو دورہ پڑا ہے پوتے کا۔" مشتری بیگم نے کہا۔

"اولاد کا شوق تو سب کو ہوتا ہے نا۔ میں کوئی نرالی بات بولا کیا۔" اختر میاں نے کہا۔

"ہوتا ہے مگر تم مجھ سے اب امید مت رکھنا۔" مشتری بیگم نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔

"تو پھر کس سے بولوں گا۔ کرائے کی اولاد کو اپنی اولاد کہتے میرا دل نہیں کرتا۔" اختر نے کہا۔

"میاں ہوش میں تو ہو، کیا اول فول بکنے لگے آئندہ پھر ایسی بات ہرگز مت کرنا دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں یہ میں پہلے بھی بولی تھی مگر تم ہو پورے گاؤدی ایک دفعہ کہے کی بات سمجھتے نہیں ہو۔ میں بولتی ہوں اپنی اوقات میں رہو بڑا شوق ہوا ہے اپنے پوتے کا۔" مشتری بیگم نے بگڑ کر کہا۔

READING CORNER
http://readingcornerblogspot.com

"تم کچھ کہو میں اپنی اس خواہش کو دبا نہیں سکتا۔" اختر میاں بولے۔

"نہیں دبا سکتے تو پھر حیدرآباد چلے جاؤ۔ اپنے گھر۔ میں اب اور بچے پیدا کرنے کے لائق نہیں ہوں۔" مشتری بیگم نے سخت غصے سے کہا۔

"ہاں چلا ہی جاؤں گا مگر یاد رکھو جانے سے پہلے تمہاری جعلسازی کی داستان سب کو بتا کر جاؤں گا کہ تم نے کتنی ہوشیاری اور چالاکی سے اپنی لڑکی کو شیر جنگ کے لڑکے سے بدل لیا۔ ہماری لڑکی شیر جنگ کی ہو گئی اور اس کا لڑکا ہمارا بن گیا۔ اس کے بعد تم نے صرف ایک لڑکی اور پیدا کر دی۔ مجھے تو تم نے کوئی بیٹا دیا نہیں جس کو میں اپنا کہہ سکوں۔ مگر اب کان کھول کر سن لو میں اپنے مطالبے سے ہرگز ہرگز دستبردار نہیں ہوں گا۔ اختر میاں نے غصے سے کہا۔

مشتری بیگم کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا۔ مگر زبان سے ایک لفظ نہیں نکلا اور پھر پینترا بدل کر نہایت ملائم آواز میں بولیں۔

"تم تو ناراض ہی ہو گئے۔ یہ بہت بری عادت ہے تم میں۔ ذرا ذرا سی بات کو دل پر لگا لیتے ہو میں تمہاری بیگم ہوں تم بولو تو میں ایک کیا ایک درجن بچے تم کو پیدا کر دوں میں تو اپنی صحت کی وجہ سے کہہ رہی تھی اور تم سنجیدہ ہی ہو گئے۔ میری بات کو ذرا سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ انور ہی اس ساری زمینداری کا مالک بننے والا ہے۔ میں نے تمہارا اپنا اور اپنی اولاد کا مستقبل سنوارنے کو ہی تو یہ کھیل کھیلا ہے۔ بھائی کی آنکھیں بند ہونے کے بعد کوئی وارث ہو گا۔ ان کی تو اولاد نرینہ ہی نہیں ہے اور اگر آئندہ ہو گی بھی تو میں نے دائی کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ ہوتے ہی اپنا کام کر دے گی۔ وارث تو انور ہی ہو گا۔ تم میری بات پر ٹھنڈے دماغ سے غور کرو۔ میں بھی تمہارے مطالبے پر غور کروں گی میں تم سے دور نہیں رہ سکتی۔" اس کے بعد بدنی کرتب شروع ہو گئے اور میں کمرے سے باہر آ گیا۔ ساری کہانی سامنے آ گئی انور جو کہ مشتری کا بیٹا بنا ہوا تھا وہ سب بچوں میں سب سے بڑا تھا اور ایک بیٹی اتنی ہی عمر کی شیر جنگ کی بڑی بیگم کی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ لڑکی مشتری کی اور انور شیر جنگ کا بیٹا تھا۔ اب مجھے یہ بات ثابت کرنا تھی۔ حویلی کے اردگرد بھی کچھ خاندان آباد تھے ان میں زیادہ تر تو ہاری وغیرہ تھے۔ مگر کچھ حویلی کے ملازم بھی تھے۔ وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔

میں نے شیر جنگ کا علاج بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کی بیگمات کو بھی دوائیں دے رہا تھا۔ یہ دوائیں صرف طاقت کی تھیں اور ان کو دینے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ یہ سمجھتا رہے کہ اس کا علاج ہو رہا ہے میری مصروفیت کا اس کو اندازہ نہیں تھا۔ میں اس دایہ کی تلاش میں تھا جس نے شیر جنگ کی بڑی بیگم کی پہلی زچگی کرائی تھی۔ مگر کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ جب ہر طرف سے مایوسی ہوئی تو میں نے شیر جنگ سے بات کرنے کی ٹھان لی اور ایک رات کھانے کے بعد میں نے کہا۔

"نواب صاحب کچھ ضروری بات تنہائی میں کرنی ہے۔"

"ہاں ضرور کریں آیئے۔" اور ہم ان کی شاندار بیٹھک میں آ کر بیٹھ گئے۔

میں نے پہلا سوال کیا۔ "بعض اوقات اناڑی دایہ اس طرح زچگی کراتی ہیں کہ کوئی نہ کوئی نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ کی بڑی بیگم کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں ان کو زچگی کے بعد کیا دوائیں دی گئی تھیں۔" میں نے بہت گھما پھرا کر سوال کیا۔

شیر جنگ نے بہت غور سے میرا سوال سنا اور پھر کہا۔ "حکیم صاحب یہ عورتوں کا معاملہ ہے میں نے پوچھا نہیں۔"

"زچگی کے وقت کون کون تھا۔ یہ تو پتہ ہو گا۔" میں نے پھر پوچھا۔

"ایک تو دایہ تھی۔ دوسری میری ہمشیرہ مشتری بیگم تھیں۔" شیر جنگ نے جواب دیا۔

"ان کے علاوہ اور کوئی تھا۔" میں نے کہا۔

"نہیں ہمشیرہ نے سختی سے سب کو منع کر دیا تھا۔

کیونکہ اس سے شور ہوتا ہے اور زچہ پر اس کا خراب اثر پڑتا ہے۔ اس لئے وہ دو ہی تھیں۔" شیر جنگ نے جواب دیا۔

"آپ کو بچی کی پیدائش کے کتنی دیر بعد پتہ چلا۔" میں نے سوال کیا۔

"میں گاؤں گیا ہوا تھا۔ کیس شام کو ہوا اور میں رات گیارہ بجے کے قریب آیا تو مشتری بیگم نے بچی کی مبارکباد دی تھی۔"

"میں اس دایہ سے ملنا چاہتا ہوں مگر۔" میں نے کہا۔

"وہ میرے پاس ہی ملازم تھی مگر نادبڑہ کی رہنے الی تھی۔ اس کا بیٹا اس کو وہیں لے کر چلا گیا۔ اب وہ میرے پاس نہیں ہے۔" شیر جنگ نے جواب دیا۔

"نادبڑہ میں اس کا پتہ تو ہو گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں وہ مل جائے گا۔ منشی کے پاس سب ریکارڈ رہتا ہے۔" شیر جنگ بولا۔

اور میں پتہ لے کر نادبڑہ روانہ ہو گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے اور نواب حیدرآباد کی حکومت میں ہی ہے۔ دکنی تہذیب یہاں پر پوری طرح نظر آتی ہے۔ زبان دکنی اردو بولی جاتی ہے۔ آبادی مسلمانوں کی بہت ہے مگر پھر بھی ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ مگر چونکہ مسلمانوں کی حکومت ہے اس لئے مسلمان ہندوؤں سے بہتر حالات میں ہیں۔ اکثریت ہنرمند ہے یا تعلیم یافتہ ہے۔ سرکاری دفاتر میں اردو کا رواج ہے میں اسٹیشن سے سیدھا دیئے گئے پتے پر چلا گیا۔ میں ٹرین سے اس لئے آیا تھا کہ نواب شیر جنگ نے ایک آدمی میرے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔ اس کا نام موسیٰ خان تھا اور وہ نواب کا خاص آدمی تھا۔

موسیٰ خان نے دایہ اصغری کا گھر نہیں دیکھا تھا۔ مگر وہ نادبڑہ سے واقف تھا۔ ایک دو جگہ پتہ کرنے کے بعد ہم خولجہ پور محلے میں پہنچ گئے۔ دایہ کے بیٹے کا نام رمضان میاں تھا۔ اس کا پتہ کیا اور ہم اس کے دروازے پر تھے۔ موسیٰ خان نے دروازے پر دستک دی تو ایک عورت نے دروازہ کھولا اور پوچھا۔ "کس کو ملنا ہے۔"

موسیٰ خان نے آگے بڑھ کر کہا۔ "میں نواب شیر جنگ کے پاس سے آیا ہوں اصغری دایہ سے ملنا ہے۔"

بے کار ملنا ہے جی۔ اب وہ کسی کام کی نہیں ہیں جی۔"

"کام کچھ ان سے نہیں کروانا ہے۔ خالی دو چار باتاں کرنی ہیں۔"

"ہاؤ بڈھی ہے۔ بیمار ہیں زیادہ پریشان نکو کرنا۔" وہ بولی۔

"نہیں کچھ ضروری بات ہے اس لئے آئے ہیں۔" موسیٰ خان نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے اندر آ جاؤ۔" وہ ایک طرف ہو گئی۔

موسیٰ خان نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔ "وہ آپ کی کون ہیں؟"

"وہ میری ساس ہیں اور خالہ بھی ہیں۔" عورت نے جواب دیا۔

وہ ہم کو ایک کمرے میں لے گئی۔ ایک چارپائی پر ایک بوڑھی عورت لیٹی تھی۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ اس کا چہرہ جھریوں سے پر تھا۔ سفید بالوں کے درمیان اس کا کالا چہرہ منہ میں کسی دانت کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ چہرے پر کسی اندرونی تکلیف سے کرب کے آثار تھے۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تب بھی اس میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نبض دیکھی بہت آہستہ چل رہی تھی۔ اس کی زندگی کا سفر اب کم نظر آتا تھا۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا مجھے اس کی ضرورت تھی۔ میری گواہ تھی۔ مجھے اس کو اس قابل کرنا تھا کہ یہ ایک بار پھر نواب شیر جنگ کی حویلی چلے اس لئے میں نے کہا۔

"یہ تو سخت بیمار ہیں آپ نے ان کا علاج نہیں کرایا۔"

"کرائے جی پر آرام نہیں آتا۔ ہم لوکاں تو بہت پریشان ہیں۔" عورت نے جواب دیا۔

"یہ ابھی ہمارے کسی سوال کا جواب دینے کے قابل نہیں ہیں پہلے میں ان کا علاج کروں گا اس کے بعد جب یہ

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com

صحت مند ہوں گی تو آگے بات کریں گے۔" اس کے بعد میں نے اس کا تفصیلی معائنہ کیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ موسیٰ خان تم ادھر ٹھہرو میں دوائیں لے کر آتا ہوں اور میں روانہ ہوگیا۔ کچھ دوائیں میں نے بازار سے خرید لیں اور چند بوٹیوں کے لئے اپنے طور سے جنگل جانا پڑا۔ اس کام میں مجھے چار گھنٹے لگے کیونکہ یہاں سے جنگل بہت دور تھا۔ اس کو جو مرض تھا میں اس کی مجرب اور آزمودہ دوائیں لے آیا تھا۔ میں نے آتے ہی علاج شروع کردیا۔

موسیٰ خان نے ایک سرائے میں رہنے کا بندوبست کرلیا تھا۔ ہم دونوں روزانہ دایہ کے گھر جاتے تھے۔ دوائیں میں خود دیتا تھا اور جو رات کو دینے کی تھیں وہ اس کو اس کی بہو دے دیا کرتی تھی۔ اس دوران اس کے بیٹے رمضان سے ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ موسیٰ خان نے اس کا پتہ کیا تو عورت رونے لگی اور بولی۔ اس کو جب روپے کی ضرورت ہوگی تو آئے گا۔"

"تو پھر تمہارا گزارہ کس طرح ہوتا ہے۔" موسیٰ خان نے پوچھا۔

"اللہ نواب شیر جنگ کو حیات رکھے۔ وہی انتظام کرتے ہیں۔ پہلے بھی اور اب بھی۔" وہ بولی۔

میں نے یہ سن کر سوچا واہ ری دنیا کیسا تماشہ ہے کہ جو اب تک کفالت کر رہا ہے اسی نے اس کے گھر کو اندھیروں میں ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ انسان کی کتنی پرتیں ہیں کچھ پتہ نہیں چلتا اور خوبی یہ ہے کہ ہر انسان کی پرتیں الگ الگ ہیں۔ کوئی احسان کے بدلے زندگی ہارنے پر راضی ہے تو کوئی احسان کرنے والے کا دشمن بن جاتا ہے۔ یہ انسان بھی عجیب و غریب جانور ہے غلطیوں پر غلطی کرتا چلا جاتا ہے اور ان کو محسوس نہیں کرتا اور کر بھی لے تو ان کی عجیب و غریب توجیہات کر کے خود کو برحق ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دایہ اصغری ایک ہفتہ کے بعد پہلے سے بہت بہتر ہوگئی۔ اس کو نہیں بتایا گیا تھا کہ میں کون ہوں وہ مجھے حکیم ہی سمجھتی تھی۔ دو ہفتہ کے بعد وہ اٹھ کر چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی۔ اب وہ پوری غذا بھی کھاتی تھی۔ ایک مہینے کے بعد وہ بالکل تندرست تھی۔ میں روزانہ ہی اس کے پاس جا رہا تھا۔ ایک روز میں نے اس سے کہا۔

"اب تم تندرست ہو میں تم سے ایک بات کرنے آیا تھا۔ مگر تمہاری حالت ایسی نہیں تھی کہ میں کچھ کہتا اس لئے میں نے اب تک تم سے کوئی بات نہیں کی اب تم خود کو کیسا پاتی ہو۔

وہ بولی۔ "مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں ٹھیک ہوں۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ اس نے تم کو یہاں بھیج دیا اور میں موت کے منہ سے نکل آئی۔"

"دیکھو اصغری بیگم انسان جو کچھ کرتا ہے وہ سب ریکارڈ پر رہتا ہے۔ یہ قدرت کا نظام ہے اس میں کبھی غلطی نہیں ہوتی کبھی چوک نہیں ہوتی۔ انسان اپنے کئے کو بھول سکتا ہے مگر قدرت کے ریکارڈ پر جو کچھ ایک بار آ گیا وہ ختم نہیں ہوتا اگر وہ اچھا کرتا ہے تو وہ بھی رہتا ہے اور برا کرتا ہے تو وہ بھی رہتا ہے۔ اگر اس نے کسی کے لئے برا کیا ہے تو اس کی سزا دنیا میں بھی ملتی ہے اور مرنے کے بعد بھی اس کو نہیں چھوڑا جاتا۔

جس نے اتنی بڑی کائنات بنائی ہے اس نے اس کو چلانے کا نظام بھی بنایا ہے۔ اس کا یہ نظام کروڑوں سال سے چل رہا ہے۔ جو دور ہونے کے باوجود ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے جو نظر نہیں آتا مگر ہر جگہ موجود ہے جس نے ہمارے فانی جسم میں روح ڈالی ہے جو رحم مادر میں غذا پہنچانے کا بندوبست کرتا ہے جو پتھر کے اندر کیڑے کو رزق دیتا ہے۔ وہ سب جانتا ہے۔ ہماری برائیاں اس کے سامنے ہیں وہ دیکھتا ہے اس کی سزا بھی وہ فوراً دے سکتا ہے۔ مگر نہیں دیتا وہ دیکھتا ہے کہ بندہ کہاں تک اس کے احکامات کو نہیں مانتا وہ موقعہ دیتا ہے کہ شاید وہ اچھائیوں کی طرف پلٹ آئے اور میں اس کو معاف کردوں۔ وہ سب سے بڑا مہربان ہے۔ سب سے زیادہ شفیق، سب سے زیادہ رحیم، سب سے زیادہ قدیر ہے۔ میری تمہید ذرا زیادہ ضرور ہوگئی ہے مگر یہ ضروری بھی تھی۔ اب تم خود اپنا محاسبہ کرو گزرے وقت کو دوبارہ اپنے ذہن کے پردے پر لاؤ پھر بتاؤ

آج سے دس سال پہلے کیا ہوا ہے؟" میں خاموش ہوگیا۔

وہ گردن جھکا کر خاموش بیٹھی رہی جیسے کسی پرانی کتاب کے ورق الٹ رہی ہو۔ اس کے چہرے پر ندامت کے آثار نظر آنے لگے اور آنکھوں سے ندامت کے دو آنسو ٹپک پڑے اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"ہاں دس سال پہلے میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا تھا۔ میں نے نمک حرامی کی تھی مگر میں کیا کرتی ایک تو میں ضرورت مند تھی دوسرے مجھ پر مشتری بیگم کا دباؤ تھا۔

اس نے کہہ دیا تھا کہ جو میں کہتی ہوں وہ کرنا پڑے گا نہیں کرے گی تو بے عزت کر کے حویلی سے باہر نکال دوں گی۔ ایک طرف بے روزگاری تھی، بھوک تھی، بے عزتی تھی۔ دوسری طرف کرارے نوٹ تھے، میرا لڑکا شرابی ناکارہ تھا، میرا گھر صرف نواب صاحب کی مہربانی سے چلتا تھا میں کیا کرتی۔ میں بک گئی مشتری بیگم نے مجھے صرف پانچ ہزار روپے میں خرید لیا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہتا۔ میں اندر ہی اندر کڑھتی رہی نہ کسی کو اپنا دکھ بتا سکتی تھی نہ ضمیر کو مطمئن کرسکتی تھی۔ میری صحت گرتی گئی اور پھر میں نے حویلی چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ مگر اس فرشتہ صفت نواب نے میرا آج تک ساتھ دیا ہے۔ مگر میں نے اس کا نمک کا حق ادا نہیں کیا یہ میرا بہت بڑا گناہ ہے۔ مشتری بیگم کی لڑکی کو میں نے نواب کی حویلی پہنچایا تھا اور بڑی بیگم کو جو لڑکا ہوا تھا اس کو بھی میں نے مشتری بیگم کے کمرے میں پہنچا دیا تھا صرف دو دن وہ لڑکی بڑی ہے مگر کسی کو اس کا پتہ نہیں ہے مشتری بیگم نے بڑی ہوشیاری سے یہ بات اڑائی تھی کہ ان کے ہاں لڑکا ہوا ہے۔ یہ بات بھی میں نے اپنے تجربے کی روشنی میں ان کو بتا دی تھی کہ بڑی بیگم کو لڑکا ہی ہوگا اور تم کو لڑکی ہوگی۔ وہ پہلے سے پروگرام بنائے ہوئے تھیں میں بے شک بہت بڑی گناہ گار ہوں حکیم صاحب مجھے کوئی راستہ بتائیں۔" وہ خاموش ہوگئی۔

"راستہ تو ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں آپ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کو تیار ہوں۔" وہ بولی۔

"تم کو ایک بار پھر میرے ساتھ حویلی چلنا ہوگا۔"

"میں چلوں گی۔ چاہے جتنی ذلالت برداشت کرنا پڑے۔ نواب صاحب جوتیاں مار لیں مجھے منظور ہے۔" وہ بولی۔

"تو پھر تیار ہو جاؤ۔ کل چلیں گے تم کو قدرت نے اپنے گناہوں کی تلافی کرنے کا موقعہ دے دیا ہے۔" میں نے جواب دیا اور دوسرے دن ہم شیر جنگ کے پاس جانے کو روانہ ہوگئے۔ پہنچتے ہی میں نے دایہ اصغری کو نواب شیر جنگ کے سامنے پیش کردیا اور کہا۔ "آپ تنہائی میں ان سے کچھ باتیں کریں میں بھی ساتھ ہوں ہمارے علاوہ کوئی نہ ہو۔" میں نے کہا اور ہم تینوں بیٹھک میں آ گئے دروازہ بند کرلیا گیا۔ تو میں نے کہا۔ "جو باتیں یہ کریں گی وہ میں بھی کرسکتا تھا مگر اس میں شک و شبے کی گنجائش رہتی۔ اس لئے میں ان کو ہی لے آیا تاکہ یہ اپنی زبان سے سب کچھ بیان کریں۔ پھر میں نے اصغری کو اشارہ کیا اور اس نے شروع سے پوری کہانی بیان کردی۔ وہ جس قدر آگے بڑھتی جاتی تھی اسی قدر نواب کے چہرے کی رنگت اور تاثرات بدلتے جاتے تھے۔ روداد ختم ہوگئی۔ پورے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ صرف نواب کی غصہ بھری تیز سانسوں کے سوا کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ آخر بڑی دیر کے بعد وہ بولے۔

"دل کرتا ہے تجھے کتوں کے سامنے ڈلوا دوں۔ مگر میں تجھ سے پوچھتا ہوں تجھے کیا سزا دوں بول۔" اصغری خاموش ہوگئی مگر میں نے کہا۔ "بے شک یہ سزا کی مستحق ہے۔ مگر اصل محرک کی طرف بھی ذرا دھیان فرمائیں۔"

"ہاں وہ بھی اسی لائق ہے۔ میں نے دونوں کے لئے کیا نہیں کیا اور انہوں نے میرے ساتھ یہ کیا۔" نواب بولے۔

"یہ ایک غریب عورت ہے۔ اس کی مجبوریوں نے اس کو خرید لیا۔ مگر جو خریدار ہے اس کو کیا مجبوریاں تھیں۔ اس کے گناہ سے کئی گنا بڑا گناہ تو مشتری بیگم کا ہے وہ آپ کی بہن ہے شاید اس لئے آپ اس کو بڑا مجرم سمجھ رہے ہیں اگر ایسا ہے تو یہ انصاف کے منافی بات ہے۔" میں نے کہا۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

نواب شیر جنگ گردن جھکائے کچھ خاموش رہے پھر بولے۔ "تو پھر حکیم صاحب آپ ہی فیصلہ کردیں۔"

"دیکھئے نواب صاحب۔ انسان گناہ کرتا ہے خوب کرتا ہے مگر ایک وقت آتا ہے کہ اس کا ضمیر جاگ جاتا ہے وہ توبہ کرتا ہے۔ توبہ کے دروازے تو ہمیشہ کھلے رہتے ہیں اور اس کی توبہ بھی قبول ہوجاتی ہے اور وہ اس گناہ کی نگری سے نکل جاتا ہے۔ شیطان ہار جاتا ہے جب انسان جھوٹ کی سیاہی سے نکل کر سچ کی روشنی میں آجاتا ہے تو اس کو پھر معاف کردینا ہی سب سے احسن کام ہے۔ کم از کم اس کو احساس تو ہوگیا ہے کہ اس نے گناہ کیا تھا اور یہ معافی مانگنے اور سچائی بتانے تو آگئی ہے۔ اس کو کیا کہیں جو اب تک شیطان کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہی ہے۔ جس کو اب تک اپنے گناہ کا احساس تک نہیں ہوا ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ نے درست کہا۔ میں اس کو بلاتا ہوں بات آج اور ابھی صاف ہوجانی چاہئے۔" اور نواب شیر جنگ دروازے پر گئے اور مشتری بیگم کو بلوایا۔

چند منٹ کے بعد ہی مشتری بیگم آگئیں۔ ان کی نظر جب دایہ اصغری پر پڑی تو ان کو ایک جھٹکا لگا چہرے کے تاثرات بدل گئے مگر زبان سے صرف یہ کہا۔ "تم کب آئیں اصغری۔"

اصغری نے جواب نہیں دیا۔ نواب صاحب بولے۔ "ان کو حکیم صاحب لائے ہیں اور اپنے ساتھ ایک بھیانک مطلب پرستی اور دولت کی حوس کی کہانی بھی لائے ہیں اس کہانی کا آغاز دس سال پہلے اس وقت ہوا جب ایک لالچی عورت نے اپنے سگے بھائی کے گھر میں نقب لگائی اور اس کے پہلوٹھی کے لڑکے کو چرالیا اور اپنا بیٹا بنالیا۔ اس کے بعد اتفاق سے کوئی لڑکا ہوا ہی نہیں اور اگر ہوتا تو وہ بھی چوری ہوجاتا۔ میں صرف یہ پوچھتا ہوں کہ تم کو ایسا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ کیا تم حویلی میں حکومت نہیں کرتی تھیں۔ تمہارے پاس کس چیز کی کمی تھی۔ تم نے جس ہانڈی میں کھایا اسی کو توڑنے کی کوشش کی۔ مجھے وارث سے محروم رکھ کر تم کو یہ زمین مکان روپیہ سب مل جاتا اس لئے تم نے ایسا کیا۔ مرنا صرف مجھ ہی کو ہے تم نہیں مرو گی تمہارے کس کام آئے گا یہ سب۔ کیا قبر میں ساتھ لے کر جاؤ گی اور اگر تم میری بہن نہ ہوتیں تو شاید میں تمہارے ساتھ ایسا سلوک کرتا کہ پوری دنیا دیکھتی اور تمہارے چہرے پر تھوکتی مگر میں صرف یہ کرتا ہوں کہ تم کو اس حویلی میں کل سے نہیں دیکھوں گا۔ اپنی لڑکی کو لے جاؤ اور میرا بیٹا میرے حوالے کردو۔"

مشتری بیگم کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموش خلاؤں میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہلدی کی طرح زرد چہرہ تھا کوئی معافی کا لفظ اس کی زبان پر نہیں تھا وہ لڑکھڑا کر اٹھی اور نواب کے پیروں میں گر پڑی۔ نواب نے اپنے پیر سکوڑ لئے اور کھڑے ہوکر کہا۔ "اگر تم خود سے اعتراف کرتیں تو کچھ گنجائش نکل آتی مگر تم نے ایسا نہیں کیا۔ میں تم کو معاف نہیں کروں گا۔ اصغری نے خود اعتراف کیا ہے میں اس کو معاف کرتا ہوں۔ تمہارے لئے میرا وہی حکم ہے کہ کل تم حویلی میں نظر نہ آؤ۔" اور نواب شیر جنگ کمرے سے چلے گئے۔

انسانی دوست بن کر دشمنی کی یہ داستان ردولوکا نے ختم کی تو میں نے کہا۔ "واقعی آدمی جب گرتا ہے تو گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ شیطان اس کو نت نئے راستے دکھاتا ہے اور وہ ان راستوں پر اتنی دور نکل جاتا ہے کہ واپسی کا راستہ تک بھول جاتا ہے۔ وہی حال مشتری کا ہوا۔ شیطان انسان کو کس کس طرح اپنے جال میں پھنساتا ہے اور جب ایک دفعہ انسان پھنس جاتا ہے تو وہ اس بدی کو پائیدار بنانے کو اور کوئی ترکیب انسان کو بتاتا ہے اور پھر وہ ایک ایسے بھنور میں الجھ جاتا ہے کہ پھر نکلنا دشوار ہوجاتا ہے۔"

"آپ نے ٹھیک کہا حکیم صاحب۔ مگر نیکی کی روشنی بہت جاندار ہوتی ہے۔ بدی کتنی بھی قوی ہوجائے نیکی کی ایک کرن بھی اس کو ختم کردیتی ہے۔ نیکی کا عمل کبھی بھی ختم نہیں ہوتا۔ نیکی خود بخود پھیلتی ہے اور خود ہی پائیدار بھی ہوجاتی ہے۔ یہ دل میں از خود پیدا ہوتی ہے۔ ہر آدمی کے اندر بھی ایک آدمی بیٹھا ہے۔ جس کو آپ ضمیر کے نام سے جانتے ہیں وہ کبھی مرتا نہیں کمزور ضرور ہوجاتا ہے۔ مگر ایک وقت ایسا

ضرور آتا ہے کہ وہ خود بخود قوی ہوکر انسان کو سیدھی راہ دکھاتا ہے اور روشنی کی طرف لے جاتا ہے گھپ اندھیرے میں اس کی روشنی کی ایک ہی کرن روشنی پھیلادیتی ہے اور اندھیرا دور ہوجاتا ہے۔ کبھی یہ بہت دیر میں ہوتا ہے کبھی جلدی مگر ہوتا ہے۔ مشتری بیگم کے اندر کا ضمیر اس کو ضرور روشنی کی طرف لاتا ہے مگر کب یہ میں نہیں بتاسکتا۔ ایک نہ ایک دن حق دار کو حق ضرور ملتا مگر وقت کا فیصلہ میں نہیں کرسکتا اس لئے مجھے یہ کام کرنا پڑا اور مشتری کو ذلیل ہونا پڑا۔"

❁......❁......❁

رام بھروسے بجنور کے محلے رام بسایا میں رہتا تھا۔ اس کی دو لڑکیاں جوان تھیں اور شادی کے لائق تھیں۔ اس کی تیسری اولاد ایک لڑکا تھا جو کہ ایک سال کا تھا۔ اس کا ذریعہ معاش یہ تھا کہ وہ چاٹ کا ٹھیلا لگاتا تھا۔ اس کی بیوی بھبوتی اور لڑکیاں دو بجے تک ٹھیلا تیار کردیا کرتی تھیں وہ سب صبح سے ہی آلو کے کباب، دہی بڑے بنانا شروع کردیا کرتی تھیں، لڑکیاں میٹھی میٹھی چٹنیاں بنانے میں لگ جاتی تھیں دو بجے رام بھروسے ٹھیلا لے کر نکل جاتا تھا۔ سارا گھر کام کرتا تھا۔ تب جاکے دس روپے کی بچت ہوتی تھی کبھی کبھی مال بچ جاتا تھا تو منافع بھی کم ملتا تھا اور الٹا نقصان بھی ہوجاتا تھا۔ مگر وہ کیا کرتا کوئی ہنر اس کو آتا نہیں تھا تعلیم کے نام پر صفر تھا کرتا تو اس کو یہی کام تھا سو وہ کر رہا تھا۔ بڑی لڑکی کا رشتہ اس نے اپنی موسی کے لڑکے کو دے دیا تھا۔ صرف تیاری کرکے پھیرے کرانا باقی تھا۔ یہ لڑکی شکل صورت کی واجبی سی تھی اس سے چھوٹی اس کا نام گومتی تھا۔ وہ البتہ سب سے الگ سی لگتی تھی اس کی اٹھان بھی اچھی تھی۔ ناک نقشہ بھی خاندان سے الگ تھا۔ رنگ بھی گورا تھا۔ رام بھروسے بازار میں کاروبار کرتا تھا۔ لوگوں کی اچھی بری نظروں کو پہچانتا تھا اور زمانے کے رنگ ڈھنگ کو بھی سمجھتا تھا۔ آدمی کا گناہ اس دنیا میں یہ ہے کہ وہ غریب ہے اس گناہ کی سزا اس کو عمر بھر بھگتنا پڑتی ہے۔ غریب عورت کا حسین ہونا بھی ایک گناہ بن جاتا ہے ہر کوئی لوٹ کا مال سمجھتا ہے۔ ہر کوئی اس پر اپنا حق جتاتا ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ غریب ہے۔ غربت اس معاشرے میں ایک گالی بن چکی ہے۔ ہندو معاشرے میں تو یہ اور بھی زیادہ گئی گزری بات ہے۔ شودر ہونا بذات خود ایک گالی ہے۔ شودر کتنا بھی نیک شریف ہو اس کو عزت مل ہی نہیں سکتی۔ ہندو جاتی کی کوئی قوم اس کو عزت نہیں دے گی۔ کیونکہ اس معاشرے کو جن لوگوں نے بنایا ہے انہوں نے صاف صاف دھارمک کتابوں میں لکھ دیا ہے کہ شودر کے کچھ حقوق نہیں ہیں۔ وہ صرف خدمت کرنے کو پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی کوئی املاک نہیں ہے۔ وہ اس راستے پر بھی چل نہیں سکتا جس پر بڑی ذات کے چلتے ہیں۔ ان کو اپنا کنواں الگ بنانا ہوگا۔ مندر الگ بنانا ہوں گے کیونکہ ان کا بھگوان الگ ہے اور بڑی ذات کا مالک ہے۔ شودر کی ہر اچھی چیز کو وہ بلا معاوضہ لے سکتے ہیں اور وہ منع نہیں کرسکتا۔ یہ باتیں شاید حیرت انگیز لگیں مگر یہی حقیقت ہے۔

پھر گھومتی کا حسین ہونا گناہ ہی تو ہوا۔ رام بھروسے سب جانتا تھا اس نے گھومتی کو بارہ سال کی عمر سے ہی پردے میں بٹھادیا تھا اور اس کی ماں کو بھی بتادیا تھا کہ اس کو باہر ہرگز نہ جانے دے۔ اس طرح اس کی عمر اٹھارہ سال ہوگئی۔ باغ میں جب پھول کھلتے ہیں تو ان کی خوشبو پورے باغ میں پھیل جاتی ہے۔ گھومتی تو غریب کے گھر کا پھول تھی اس کی خوشبو کیوں نہ پھیلتی اور پھر ایک رات ایک پھولوں کا ندیدا آگیا اور پھول کو ڈالی سے توڑ کر لے گیا۔ رام بھروسے کچھ نہ کرسکا۔ نہ پولیس نے اس کا ساتھ دیا نہ کسی عزیز نے کچھ مدد کی اور صرف ایک ماہ بعد لوگ بھول بھی گئے۔ رام بھروسے کے دل پر ایک گہرہ گھاؤ پڑگیا مگر وہ کس کو دکھاتا اندر ہی اندر سلگتا رہا جلتا رہا اور بڑی کے ہاتھ پیلے کرتے ہی پرلوک سدھار گیا۔ اس کا لڑکا اس وقت آٹھ سال کا تھا اس کا نام واس دیو تھا۔ رام بھروسے کی بیوی خاموش ضرور تھی مگر اندر اس کے بھی گہرا زخم تھا۔ اس نے زندگی بھر محنت کرکے بچوں کو پالا تھا اور اس کا سب سے اچھا اور پسندیدہ کھلونا کوئی چھین کر لے گیا تھا مگر غریب کا گناہ اس کی زبان بند کیے ہوئے تھا اور پھر ایک دن وہ بھی اپنے پتی کے پاس چلی گئی۔ جتنی خاموشی سے پیدا ہوئی تھی اتنی ہی خاموشی سے دنیا

READING CORNER
http://readingpk.blogspot.com/

چھوڑ گئی۔ یہی غریب شودر کی زندگی ہے ان کی زندگی میں کوئی ہلچل نہیں ہے کوئی خوشی نہیں ہے خاموشی سے آتے ہیں خدمت کرتے ہیں جوتے کھاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔

واس دیو اکیلا رہ گیا۔ بجنور میں وہ کیا کرتا ایک اپنے جیسے دوست کے ساتھ دلی چلا آیا اور ایک کارچوبی کے کارخانے میں ملازم ہو گیا۔ اس کارخانے کا مالک ایک مسلمان نور احمد تھا۔ واس دیو دن میں کارخانے میں کام کرتا اور سیکھتا اور رات کو چھت پر ہی سو جاتا کیونکہ اس کا کوئی گھر نہیں تھا۔ اس چھت پر اس کے علاوہ اور لوگ بھی سوتے تھے۔ نور احمد کا سلوک سب کاریگروں کے ساتھ ایک جیسا تھا وہ نہ کسی ذات برادری کو دیکھتا تھا نہ ہندو مسلمان میں فرق کرتا تھا۔ وہ صرف کام دیکھتا تھا اور سب کو ان کی محنت کا معاوضہ ایمانداری سے ادا کرتا تھا۔ یہاں کا ماحول بجنور کے کے ماحول سے بہت مختلف تھا۔ واس دیو نے ایسا کب دیکھا تھا اس کے ساتھ تو ہمیشہ گرا ہوا سلوک ہوتا رہا تھا۔ کبھی کسی نے اس کے نام سے نہیں پکارا تھا۔ وہاں سب ہی اوئے ابے واسو کہا کرتے تھے۔ یہاں پر سب کو کام کے اعتبار سے عزت ملتی تھی۔ وہ شروع میں اٹھائی دھرائی کا کام کرتا سب لوگ واسو کہتے تھے اور وہ جب کاریگر بن گیا تو واس دیو ہو گیا۔

یہاں پر عزت کام کی تھی ذات برادری کی نہیں تھی۔ اس سے نور احمد نے کبھی نہیں پوچھا کہ اس کا باپ کیا کرتا تھا کس ذات کا تھا۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ یہ ہندو ہے اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ واس دیو کسی مندر میں نہیں جاتا تھا ایک تو وہ مذہب سے زیادہ لگاؤ نہیں رکھتا تھا۔ دوسرے اس کے دل میں ایک خوف بھی تھا کیونکہ وہ شودر تھا یہ تو وہ جانتا تھا کہ ہندو معاشرے میں اس کی کیا عزت ہے۔ وہ کسی مذہب کی بات بھی نہیں کرتا تھا۔ اس کا دوست گوپی جس کے ساتھ وہ آیا تھا وہ کہا کرتا تھا کہ واس دیو تو ناستک ہو گیا ہے دھرم کی تو بات ہی نہیں کرتا حالانکہ وہ خود بھی کبھی مندر نہیں گیا تھا۔

واس دیو کسی دھرم کو نہیں جانتا تھا اس نے کسی مندر کو اندر سے نہیں دیکھا تھا وہ کسی مندر میں جا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے اندر ایک خوف کا دیو بیٹھا تھا کیونکہ اس کا باپ کہا کرتا تھا کہ ہم تو خدمت گار ہیں۔ گندے ہیں بھگوان نے ہمیں اسی لئے پیدا کیا ہے کہ بڑی ذات کی چاکری کریں۔ ان کے جوتے کھائیں اور مر جائیں۔ باپ کی یہ باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا اس کی سمجھ میں یہ باتیں آتی گئیں مگر کبھی کبھی وہ سوچتا ضرور تھا کہ بھگوان اتنا ظالم ہے کہ اس نے سارے حقوق بڑی ذات والوں کو دے دیئے ہیں۔ کیا ہم اپنی مرضی سے دنیا میں آئے ہیں ہم کو کیا اس نے پیدا نہیں کیا۔ اس سے آگے اس کا دماغ کام نہیں کرتا تھا۔ اس کا ماحول بھی ایسا تھا کہ اس کے دل میں اٹھنے والے سوالات کا جواب اس کو نہیں ملتا تھا۔ دلی سے آنے کے بعد اس نے ایک نئی دنیا دیکھی، نور احمد کا سلوک اور اس کا طریقہ انسانوں والا تھا۔ نور احمد پکا مسلمان تھا۔ وہ ہر کام اپنے مذہب کے دائرہ کار میں رہ کر کرتا تھا۔ مسلمان کاریگروں کے ساتھ وہ کھانا بھی کھاتا تھا مالک اور ملازم کا فرق یہاں نہیں تھا۔ کسی ذات برادری کا بھید بھاؤ وہ نہیں جانتا تھا۔ سب کے ساتھ نماز پڑھتا تھا۔ واس دیو کے لئے یہ ایک نئی بات تھی وہ سوچتا کیا ان کے یہاں ذات برادری نہیں ہے کوئی چھوت چھات نہیں ہے۔ غریب امیر کا فرق نہیں ہے ایک صف میں سب اپنے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور ایک ہی پلیٹ میں کھاتے ہیں اور اس نے جو ظلم و ستم اب تک دیکھے تھے اس کے مقابلے میں یہ ایک نئی بات تھی۔ اس کا اس سے متاثر ہونا تو لازمی تھا۔

آہستہ آہستہ وہ اسلام کے قریب آتا گیا۔ اس کا دل بھی کرتا کہ وہ سب کے ساتھ کھانا کھائے سب کے ساتھ مسجد جائے۔ عید پر نئے کپڑے پہن کر نور احمد کے ساتھ جامع مسجد جائے اور نور احمد سے عیدی طلب کرے۔ مگر وہ تو ایک ہندو تھا اور ہندو بھی شودر جس کی زبان تو پیدا ہوتے ہی کاٹ دی جاتی ہے۔ اس کے دل میں بڑی ذات والوں کا خوف بھر دیا جاتا ہے صرف ہاتھ اور پیر چھوڑے جاتے ہیں تاکہ وہ ان کی غلامی کر سکے۔ اس کی زبان پر تو تالے پڑے ہوئے تھے وہ نور احمد سے بہت کچھ

کہنا چاہتا تھا مگر پشت ہا پشت کی بزدلی اور زبان کی تالابندی کی وجہ سے کچھ نہیں کہہ پاتا تھا۔

یہی حالت گوپی کی تھی دونوں نور احمد اور سب مسلمان کاریگروں کو دیکھتے تھے کسی نے ان کو شودر یا نیچ کہہ کر ان کی عزت نفس کو بے عزت نہیں کیا تھا۔ کسی نے ان کو گھٹیا انسان نہیں سمجھا۔ وہ خود ہی ڈرے ڈرے سہمے ہوئے رہتے تھے۔ ان میں کسی کی کیا غلطی تھی یہ خوف صدیوں کا خوف تھا چند دن میں تو دور نہیں ہو سکتا تھا گوپی اور واس دیو دونوں اب بہترین کاریگر تھے۔ نور احمد بھی ان سے خوش تھا۔ چھ ماہ گزر گئے رمضان کا مہینہ آ گیا نور احمد کے ساتھ سارے مسلمان ملازمین روزہ رکھنے لگے۔ پہل روزے والے دن نور احمد نے واس دیو اور تمام غیر مسلم ملازمین جن کی تعداد کل سات تھی کہا۔

”دوپہر کا کھانا تو رمضان کی وجہ سے ہم سب کا بند ہے۔ یہ اللہ کا مہینہ ہے سب مسلمان روازہ رکھیں گے آپ لوگوں کے کھانے پر پابندی نہیں آپ لوگ چھت پر جا کر کھا لیا کریں اور پانی بھی وہیں جا کر پی لیں سگریٹ بیڑی جو پیتا ہے وہ بھی چھت پر اپنا شوق پورا کر سکتا ہے۔ ہماری طرف سے کوئی پابندی نہیں آپ لوگ افطار سے پہلے چھٹی بھی کر لیں کام بند کر دیں کیونکہ یہاں پر افطار کا بندوبست باقی سب کے لئے کرنا ہوتا ہے۔ اگر کام باقی ہے اور کرنا ہو تو ایک گھنٹے کے بعد آ جانا کام کر لینا لیکن مسلمان کاریگر افطار کے بعد کام نہیں کریں گے کیونکہ کھانے کے بعد نمازوں کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ آپ لوگ کام کرنا چاہیں تو افطار کے بعد کر سکتے ہیں۔“

واس دیو نے پوچھا۔ ”استاد روزہ کیا ہوتا ہے۔“

نور احمد نے کہا۔ ”اللہ کا حکم ہے۔ سال میں ایک مہینہ روزہ رکھو اس کے بہت سے فائدے ہیں۔ میں مولوی تو نہیں ہوں میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ یہ اللہ کا حکم ہے اس کو پورا کرنا ہے۔“

”میں بھی روزہ رکھنا چاہوں تو رکھ سکتا ہوں۔“ واس دیو نے پوچھا۔

”نہیں تم روزہ نہیں رکھ سکتے اس لئے کہ پہلی شرط مسلمان ہونا ہے۔“ نور احمد نے جواب دیا۔

”مجھے مسلمان اور ان کے طریقے اچھے لگتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں میں بھی ان جیسا بن جاؤں تو پھر میں کیا کروں۔“ واس دیو نے پوچھا۔

”تمہارا دل اگر اسلام کی طرف راغب ہے تو تم مسلمان ہو جاؤ۔“ نور احمد نے کہا۔

”میں تیار ہوں مجھے کیا کرنا ہوگا۔“ واس دیو نے پوچھا۔

”تم دل سے مسلمان ہونا چاہتے ہو تو تم کو کچھ نہیں کرنا ہوگا میں سب کچھ کروں گا مگر میں تم کو مشورہ دوں گا کہ تم پہلے اسلام کو سمجھو اور اپنے اندر کی آواز پر لبیک کہو۔“ نور احمد نے جواب دیا۔

”میں بہت دن سے تیار ہوں۔ مجھے تمہارے اصول قاعدے اچھے لگے ہیں مگر میری زبان پر یہ نہیں آ رہا تھا اس لئے خاموش تھا۔“ وہ بولا۔

”یہ رمضان شریف کی برکت ہے اور میں بہت خوش ہوں کہ تم کو میرے اصول اور قاعدے اچھے لگے۔ یہ اصل میں میرے پیارے نبیؐ کے اصول و قاعدے ہیں جن پر ہم عمل کرتے ہیں میں آج ہی جامع مسجد جاؤں گا۔ وہاں امام صاحب سے تمہارا ذکر کروں گا اور پھر تم کو ان کے پاس لے کر جاؤں گا۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوگا۔“ اور اس طرح واس دیو جمیل احمد بن گیا اور رمضان کے روزوں کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کرنے لگا۔ اس کے ساتھ اس کا دوست گوپی بھی مسلمان ہو گیا۔ اس کا نام غفور احمد رکھ دیا گیا۔

بات یہاں پر ختم نہیں ہوئی یہ بات پھیلتی گئی نور احمد کے خلاف ہندوؤں نے یہ اڑا دی کہ یہ ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کر رہا ہے دھرم کے نام پر ہندوؤں کو ایک مقام پر لانے کا کام پنڈت کشن چند نے کیا اور ایک دن کشن چند اور اس کے کچھ چیلے نور احمد کے کارخانے آ گئے۔

کشن چند نے آتے ہی نور احمد سے کہا۔ ”یہ تم اچھا نہیں کر رہے میاں جی۔ ابھی ہم مر نہیں گئے ہیں ہم زندہ

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

ہیں اور دھرم بھی زندہ ہے اور اس زندہ دھرم کی خاطر ہم اپنی جان لڑا دیں گے۔"

"میں نے کیا کیا ہے۔ کچھ پتا تو چلے۔" نور احمد نے کہا۔

"تم نے دو ہندو لونڈوں کو مسلمان بنا لیا وہ بھی زبردستی۔" پنڈت کشن چند نے کہا۔

"میرے کارخانے کے دو ملازمین نے اسلام قبول ضرور کیا ہے مگر ان کے ساتھ زبردستی کسی نے نہیں کی۔ وہ اپنی مرضی سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ہیں۔" نور احمد نے جواب دیا۔

"میں تمہاری بات پر اعتبار نہیں کرتا اور اگر تم سچے بھی ہو تو کان کھول کر سن لو ہم ان کو یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ اس طرح تو ساری دلی کو تم مسلمان کر لو گے ہمارا دھرم اس کی اجازت نہیں دیتا۔" پنڈت کشن چند نے غصے سے کہا۔

"پنڈت جی آپ بات کو غلط رنگ دے رہے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ وہ دونوں اپنی خوشی سے مسلمان ہوئے ہیں۔ ہمارے یہاں تو زبردستی کی اجازت ہی نہیں ہے پھر ہم ایسا کیوں کریں گے اگر ان سے پوچھنا چاہیں تو خود پوچھ لیں۔" نور احمد نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے ان کو بلواؤ۔" پنڈٹ نے جلدی سے کہا۔ چند منٹ ہی میں دونوں آ گئے، تو پنڈت نے کہا۔

"تم دونوں میں سے واس دیو کون ہے؟" دونوں خاموش رہے کوئی جواب نہیں دیا۔ پنڈت کی تیوریوں پر ہزاروں بل چڑھ گئے۔ وہ پھر غصے سے بولا۔

"کیا تم دونوں بہرے ہو کہ میری بات کا جواب نہیں دے رہے۔ جلدی بتاؤ۔" مگر دونوں ہی خاموش تھے اب تو پنڈت غصے سے لال بھبوکا ہو گیا۔

"جواب تو تم کو دینا ہوگا باندھ کر لے جاؤں گا پھر تو بتاؤ گے۔" پنڈت نے کہا۔

"ہم نے ایسا کیا جرم کر دیا ہے کہ آپ اس قدر ناراض ہیں۔" جمیل نے پوچھا۔

"پنڈت نے جمیل کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا الٹا سوال کر دیا۔ "تو ہی واس دیو ہے۔"

"نہیں میرا نام جمیل احمد ہے اور یہ غفور احمد ہے۔ یہاں کوئی واس دیو نہیں ہے۔" جمیل احمد نے جواب دیا۔

"تم کو اس نے کیا لالچ دیا ہے۔" پنڈت نے نور احمد کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"اس کی محبت ایک انسان سے انسان کی محبت ہے۔ اس کا سلوک برابری کا درجہ یہ اس کا لالچ ہے آپ مجھے یہ لالچ دے سکتے ہیں آپ مجھے وہ عزت دے سکتے ہیں جو اس نے دی ہے۔ میں ان کے ساتھ ایک پلیٹ میں کھانا کھاتا ہوں آپ ایسا کر سکتے ہیں۔ دھرم دھرم کی ڈونڈی بجاتے ہو۔ تمہارا دھرم صرف بڑی ذات کا دھرم ہے۔ میں نے اپنی خوشی سے اسلام قبول کیا ہے میں مر سکتا ہوں مگر اس پیارے دھرم کو نہیں چھوڑوں گا اور یہ میرا دوست اس نے بھی میری طرح ہی اسلام قبول کیا ہے مگر یہ بھی میری طرح آزاد ہے۔ اس کا دل کرے تو یہ آپ کے ساتھ جا سکتا ہے کوئی اس کو نہیں روکے گا۔

"لو یوں کہو کہ گھورے کی اینٹ چوبارے پر لگ گئی ہے مگر یاد رکھ بچو میرا نام کشن چند ہے۔ میں بھی تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ پھر گھورے پر پہنچا کر دم لوں گا اور یہ جو تیرا سرپنچ تیرے سر پر ہاتھ رکھ رہا ہے اس کا تو وہ حشر کروں گا کہ آئندہ کبھی ایسا کرنے کے لائق ہی نہیں رہے گا۔ آؤ سجنوں اب کوئی دوسرا ہی راستہ اپنانا ہوگا۔" اور پنڈت پھنپھناتا ہوا چلا گیا۔

پنڈت کشن چند کٹر ہندو تھا اور پھر برہمن۔ وہ کب یہ چاہے گا کہ ان کا ایک غلام کم ہو جائے اور وہ عزت کی زندگی گزارے۔ اس نے اپنے حلقے میں اس بات کو پھیلانا شروع کر دیا۔ نور احمد کے خلاف ایک محاذ بنا لیا جمیل اور غفور کا گھر سے نکلنا دشوار ہو گیا۔ یہ حالت نور احمد نے دیکھی تو وہ امام صاحب سے ملا ان کو حالات بتائے تو انہوں نے کہا۔ "نور احمد تم نے ایک نیک کام کیا ہے اور ہر نیک کام کرنے والے کو قربانی دینا پڑتی ہے۔ تم ان حالات سے مت گھبراؤ میں

تمہارے ساتھ ہوں۔ ساری دلی کے ہندو بھی اگر ایک ہو جائیں تو بھی ہم قدم پیچھے نہیں ہٹائیں گے۔"

جمیل احمد اور غفور احمد پر ہر طرح کا دباؤ ڈالا گیا۔ ہندوؤں کے اس زمانے کے سرکردہ ہندو نیتاؤں نے بڑے بڑے لالچ ان دونوں کو دیئے مگر کچھ نہ ہوا۔ بجنور کے دو گمنام لڑکے جن کا کوئی پرسان حال نہیں تھا جو ہندوؤں کی گھٹیا ترین ذات سے تعلق رکھتے تھے اچانک ہندوؤں کے ناک کا بال بن گئے۔ ان کی عزت کا سوال بن گئے یہ سب پنڈت کشن چند کا کیا دھرا تھا۔ جب کسی طرح ان کا بس نہیں چلا تو وہ گھٹیا حرکتوں پر اتر آئے۔ ایک دو دفعہ ان دونوں پر حملہ کرانے کی کوشش کی مگر نور احمد نے ان کی حفاظت کا ایسا انتظام کیا ہوا تھا کہ ہندو ناکام ہوئے مگر ان کی کوششیں جاری رہیں۔ مسلمان بھی تیاری پر تھے دلی کی فضا بڑی کشادہ تھی۔ مگر انگریزی قانون دونوں کے لئے برابر تھا۔ ہندوؤں کو ہندو نیتا ڈھارس دے رہے تھے تو مسلمانوں کے ساتھ بھی مسلمان لیڈر تھے۔ کسی وقت بھی چنگاری بھڑک کر بھیانک آگ بن سکتی تھی انگریز انتظامیہ کو بھی احساس ہو گیا تھا اس نے دونوں فریقوں کو ایک میز پر جمع کر دیا۔

ہندوؤں کا موقف تھا کہ یہ لوگ زبردستی ہندوؤں کو مسلمان کر رہے ہیں مگر اس دلیل کے لئے ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ مسلمانوں نے کہا کہ اگر کوئی اپنی خوشی سے ہمارے اخلاق یا ہماری تعلیمات سے متاثر ہو کر مسلمان ہوتا ہے تو ہم اس کو منع نہیں کر سکتے۔ اس کیس میں بھی یہی ہوا ہے جمیل احمد اور غفور احمد کو بلایا گیا انہوں نے وہی کہا جو مسلمان کہہ رہے تھے۔ ہندوؤں کو تاکید کر دی گئی کہ آئندہ وہ یہ ایشو نہ اٹھائیں، پنڈت کشن چند کو پابند کر دیا گیا کہ اگر کسی قسم کا جھگڑا ہوا تو اس کا ذمہ دار اس کو سمجھا جائے گا اور سزا بھی اس کو ہی ملے گی۔ یہ مسلمانوں کی فتح تھی مگر انگریز نے ان کو بھی پابند کر دیا کہ خاموشی اختیار کریں۔ وقتی طور پر یہ معاملہ ختم ہو گیا۔ بیان بازی کا سلسلہ بھی رک گیا مگر اندرونی طور پر ختم نہیں ہوا، پنڈت کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی وہ دو طرح سے ناکام ہوا تھا ایک تو مسلمانوں کا موقف مانا گیا دوسرے وہ نیچ ذات دعزت والا بن گیا۔

اور پھر وہ بجنور چلا گیا۔ یہ پتہ کرنے کہ واس دیو کے ماتا پتا کہاں رہتے تھے اور کیا کرتے تھے وہاں اس کو پتہ چل گیا کہ واس دیو کے پتا کا نام رام بھروسے تھا۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکے کا باپ تھا اور چاٹ کا ٹھیلا لگاتا تھا۔ بڑی لڑکی کی شادی کر دی تھی چھوٹی کسی کے ساتھ بھاگ گئی یا کوئی اٹھا کر لے گیا۔ لڑکا اکیلا رہ گیا تھا وہ دلی چلا گیا۔ اس کا ہی نام واس دیو تھا۔

اس کو یہ بھی پتہ چل گیا کہ لڑکی کا نام گھومتی تھا اور وہ بہت خوب صورت تھی۔ اس پر ٹھاکر ہری سنگھ کا دل آ گیا اور وہ لے گیا تھا۔ ٹھاکر ہری سنگھ اس علاقے کا اثر و رسوخ والا آدمی تھا۔ پنڈت ایک کائیاں مطلب پرست آدمی تھا اس کے شیطانی ذہن میں یہ بات آ گئی کہ ٹھاکر کو استعمال کیا جا سکتا ہے اور وہ ٹھاکر ہری سنگھ کے پاس چلا گیا۔ ٹھاکر بجنور سے ذرا فاصلے پر رہتا تھا اور ایک بڑی جاگیر کا مالک تھا۔ بلا کا عیاش اور شرابی تھا عیاری مکاری میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ پنڈت سے وہ عزت سے ملا مگر اتنی عزت اس نے نہیں کی جتنی کا پنڈت خود کو اہل سمجھتا تھا۔ مگر زبان سے کچھ نہیں بولا کوئی اور موقعہ ہوتا تو شاید پنڈت اپنی بڑی ذات ہونے کا ٹھاکر کو احساس کرانے کی کوشش کرتا۔ مگر یہ موقعہ اس کے لئے مناسب نہیں تھا وہ اپنی غرض سے آیا تھا اس کو ٹھاکر کی کیا ضرورت تھی۔

پنڈت اندر ہی اندر کڑھتا رہتا مگر ٹھاکر نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ "ہاں مہاراج پنڈت کشن چند جی اتنی دور آنے کا کاہے کشٹ اٹھایا۔"

پنڈت چونک پڑا اور بولا۔ "ارے ٹھاکر صاحب شرمندہ کر رہے ہیں۔"

"نہیں میں پوچھ رہا ہوں۔ کاہے آنا ہوا۔" ٹھاکر نے کہا۔

"کچھ برس پہلے ایک کنیا آپ کے پاس آئی تھی۔ اس کا نام گھومتی تھا۔ بڑی کٹیلی کنیا تھی وہ واقعی اس لائق تھی کہ آپ کی حویلی میں سجائی جائے۔ وہ سرا اس کا باپ

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

چاٹ فروش کیا اس کی قدر کرتا۔ اچھا کیا کہ آپ نے اس پر یہ احسان کر دیا۔

پنڈت خاموش ہوا تو ٹھاکر بولا۔ اس کے چہرے پر کوئی اچھے تاثرات نہیں تھے۔ ”تم کو یہ بات کس نے بتائی کہ وہ چھوری میری حویلی میں آ گئی ہے۔“

”ارے ٹھاکر جی یہ بات تو بجنور کے سب لوگوں کو پتہ ہے آپ کے پاس کوئی نہیں آیا اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ یہ بات کسی کو پتہ نہیں ہے رام بھروسے مر گیا اس کی گھر والی مر گئی کون بات اٹھاتا کسی اور کو کیا غرض پڑی ہے کہ دوسرے کے پھٹے میں ٹانگ پھنسائے۔“

”تو پھر پنڈت تم کاہے پریشان ہو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔“ ٹھاکر نے ناگوار لہجے میں کہا۔

”شریمان ہم تو اپنا کام ہی کر رہے ہیں بات ہندو جاتی کی عزت کی آن پڑی ہے اس لئے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ دھرم کی خاطر تو ہم اپنی جان پر کھیل جائیں۔“ پنڈت نے آواز کو پر اثر بنا کر کہا۔

”تم ان چکروں میں مت پڑو بھجن کیرتن کرو دان دکھشنا لو اور مفت کی روٹیاں کھا کر جان بناؤ تمہارا کام جان دینا اور لینا نہیں ہے اور دھرم کو میری وجہ سے کیا خطرہ ہو گیا کہ تم میرے پاس دوڑے آئے ہو۔ ذرا یہ تو بتاؤ۔“ ٹھاکر نے پوچھا۔

”ہاں بتاتے ہیں وہی بتانے تو آئے ہیں۔ اس چھوری کا ایک بھائی واس دیو تھا وہ اور ایک چھورا چھوری کے جانے کے بعد دلی چلے گئے تھے۔ وہاں پر وہ ایک کار چوبی کے کارخانے میں کام کرنے لگے۔ اس کارخانے کا مالک مسلمان نور احمد ہے۔ وہ وہاں پر کام کرتے رہے اور وہیں رہتے بھی تھے اور کچھ دن کے بعد وہ دونوں مسلمان ہو گئے۔ دلی کے ہندوؤں نے بڑا شور مچایا مگر ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے کیونکہ ان دونوں نے انگریز سرکار کے سامنے یہ اقرار کر لیا کہ وہ اپنی مرضی سے مسلمان ہوئے ہیں اب بتاؤ یہ ڈیڑھ مسلمان ہوتے گئے تو مسلمانوں کی طاقت تو دلی شہر میں بہت بڑھ جائے گی اور ہم دیکھتے ہی رہیں گے۔ اس کی روک تھام تو کرنا پڑے گی کچھ تو اپائے کرنا پڑے گا۔“ پنڈت نے کہا۔

”چنتا کی بات تو ہے مگر اتنی نہیں جتنی تم نے بتائی ہے تم دلی والے کوئی اپائے کرو میں کیا کروں میں تمہاری لڑائی میں ٹانگ کیوں ڈالوں۔“ ٹھاکر نے صاف جواب دے دیا۔

پنڈت یہ سن کر ذرا تلملایا مگر وہ ہار ماننے والا کب تھا اس نے دوسرا داؤ مارا۔ ”اب یہ آگ دلی سے بجنور آنے والی ہے۔ وہاں کے مسلمانوں کو پتہ چلا ہے کہ واس دیو جو کہ اب جمیل احمد ہے کی بہن آپ کی حویلی میں موجود ہے۔ مسلمان تیاری کر رہے ہیں کہ اس کو یہاں سے برآمد کرا دیں اب تو آپ اور میں ایک ہی کشتی میں سوار ہو گئے۔“ پنڈت نے کہا۔

”پنڈت تم پوری تیاری کر کے آئے ہو۔ مگر کان کھول کر سن لو مسلمان تو کیا تم بھی ان کے ساتھ آ جاؤ تو بھی کنیا کو برآمد نہیں کر سکتے اول تو تمہاری بات پر مجھے یقین ہی نہیں ہے۔“ ٹھاکر نے جواب دیا۔

”یہ بھی خوب رہی میں دھرم کے رشتے چتاونی دینے آیا ہوں اور تم ہو کہ میری بات کا یقین ہی نہیں کرتے تمہاری مرضی نہ کرو میں نے تو دھرم کے ناطے جو کرنا تھا وہ کر دیا۔ اب آ گیا دو میں چلتا ہوں۔“ پنڈت چلا گیا مگر ٹھاکر کے دل میں ایک پھانس ضرور ڈال گیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ساری ہندو برادری پر بھاری پڑ سکتا تھا مگر مسلمانوں سے لڑنا بہت مشکل تھا۔ سینکڑوں سال کی تاریخ گواہ تھی کہ مسلمان ہندوستان پر حکومت کرتا آیا تھا اور صرف اپنی بہادری کی وجہ سے وہ کامیاب ہوا تھا۔ پنڈت بھاری تھا مگر مسلمان اس پر بھاری تھا نے بہت غور کیا اور پھر ایک فیصلہ کر لیا۔

پنڈت کے تن بدن میں ٹھاکر کے رویہ نے آگ لگا دی تھی۔ اندر سے وہ ٹھاکر کا بھی دشمن ہو گیا تھا وہ اس کے غرور کے شیشے کو بھی چکنا چور کرنا چاہتا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس کے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی اور اس نے

اپنے چہرے پر ایک چہرہ اور چڑھا لیا دوستی کا چہرہ محبت کا چہرہ اس کے بولنے کا لب ولہجہ بھی بدل گیا اور وہ مسلمانوں سے میل ملاقات بھی کرنے لگا۔ نور احمد کے پاس بھی آنے جانے لگا۔ جمیل اور غفور سے ملنے لگا کچھ اعتماد کی فضا بحال کرنے کے بعد ایک دن پنڈت نے جمیل کی طرف ایک باریک سا کنکر پھینکا۔

”میں نے سنا ہے تمہاری ایک بہن بھی ہوا کرتی تھی۔“

”ایک نہیں دو بہنیں تھیں۔“ جمیل نے جواب دیا۔

”ایک کی تو شادی ہو گئی تھی۔ دوجی کیا ہوئی۔“ پنڈت نے پوچھا۔

جمیل نے جواب نہیں دیا۔ خاموش رہا تو پنڈت نے پھر کریدا۔ ”تم نے بتایا نہیں دوجی کا کیا ہوا۔“ پنڈت نے کہا۔

”گڑے مردے مت اکھاڑو پنڈت اس بات کو رہنے دو رنج ہوتا ہے۔“ جمیل نے کہا۔

”تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے میں تم کو رنج پہنچانے کو نہیں پوچھ رہا تھا۔ نہیں بتاتے تو نہ بتاؤ مگر مجھے پتہ یہ چلا ہے کہ ٹھاکر ہری سنگھ کی حویلی میں بچاری قید کی زندگی گزار رہی ہے اب تم ہوشیار ہو کوئی اپائے کر کے اس کی جان اس قید سے چھڑا سکتے ہو۔ تم بھائی ہو اور تمہارے پیچھے مسلمانوں کی ایک بڑی طاقت بھی ہے۔ یہ ٹھاکر تمہارے سامنے کیا ہے اب تم واس دیو نہیں ہو واس دیو تو بچارا مجبور و لاچار تھا تم تو نہیں ہو۔“ پنڈت یہ کہہ کر جمیل کے چہرے پر آتے رنگ دیکھنے لگا۔

پنڈت نے تو ایک کنکر پھینکا تھا مگر اس کنکر نے جمیل احمد کے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ پنڈت سب دیکھ رہا تھا وہ سمجھ چکا تھا کہ لوہا سرخ ہو چکا ہے اب چوٹ لگانے کا وقت ہے وہ بولا۔ ”میں تمہارے دکھ کو سمجھتا ہوں مسٹر مگر یہ کام رونے دھونے سے نہیں ہو گا تم کو کمر کسنا پڑے گی وہ پاکھنڈی ٹھاکر تمہارے آنسو دیکھ کر نہیں پگھلے گا میں اس کو جانتا ہوں تم کو اس کے پاس طاقت کے ساتھ جانا ہو گا۔“ پنڈت نے کہا۔

”اور اگر یہ بات جھوٹ ہوئی تو پھر کیا ہو گا۔“ جمیل نے پوچھا۔

”میرے علاوہ بھی تم بجنور میں جا کر پتہ کر لو۔ تمہاری بہن ٹھاکر کی حویلی میں ہی ہے۔“ پنڈت نے کہا۔ پنڈت تو آگ لگا کر چلا گیا مگر جمیل کا سکون وچین بھی ساتھ ہی لے گیا۔ اندرونی کرب اور بے چینی اس کے چہرے پر نظر آنے لگی تو نور احمد نے پوچھا۔

”کیا بات ہے جمیل تم کچھ پریشان ہو۔“

”ہاں استاد میں بہت پریشان ہوں۔“ جمیل نے جواب دیا۔

”اپنی پریشانی میں مجھے شریک نہیں کرو گے۔“ نور احمد نے کہا۔

”آپ کے سوا میرا کون ہے میں آپ کو ہی بتاؤں گا۔ بات یہ ہے کہ میری دو بہنیں تھیں ایک کی شادی میرے باپ نے کر دی تھی اور ایک کو کوئی اٹھا کر لے گیا تھا۔ اسی غم میں ماں باپ دونوں مر گئے میں غفور کے ساتھ دلی چلا آیا۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ میری بہن کہاں کس حال میں ہے مگر اب پتہ چلا ہے کہ وہ ٹھاکر ہری سنگھ کی حویلی میں قیدی کی زندگی گزار رہی ہے۔“ جمیل خاموش ہو گیا۔

”اور یہ ٹھاکر ہری سنگھ کہاں رہتا ہے۔“ نور احمد نے پوچھا۔

”وہ بجنور سے قریب ہی اپنی جاگیر میں رہتا ہے بہت بڑا جاگیردار ہے۔ میں نے اس کا صرف نام سنا ہے دیکھا کبھی نہیں۔ میں اس کا کچھ بھی نہیں کر سکتا وہ اپنی جاگیر میں بہت مضبوط ہے۔“ جمیل نے جواب دیا۔ نور احمد کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے۔

”مایوس مت ہو۔ بے شک وہ بہت مضبوط ہے اپنی جگہ پر مگر اللہ نے چاہا تو کوئی راستہ ہم بھی پالیں گے ہر بدی کو ختم کرنے کے لئے نیکی آ جاتی ہے یہ ہمارا ایمان ہے۔“ نور احمد نے کہا۔

”میری تو نیند اڑ گئی ہے۔ سخت بے چینی ہے دل کرتا

Reading Corner
http://readingcornerpk.blogspot.com/

ہے اڑ کر بجنور جاؤں اور اس ٹھاکر سے بھڑ جاؤں۔" جمیل نے جذباتی ہو کر کہا۔

"نہیں تم ایسا ہرگز نہیں کرو گے کیونکہ جذباتی فیصلے ہمیشہ نقصان پہنچاتے ہیں اور جو فیصلے دماغ کرتا ہے وہی کامیابی دلاتے ہیں۔ تم خود پر کنٹرول کرو تم نے مجھے بتا دیا یہ معاملہ اب میرا ہے تم سکون سے رہو انشا اللہ بہتر راستہ نکل آئے گا۔"

جمیل کے اندر تو آگ بھڑک رہی تھی اس کو ایک پل چین نہیں آ رہا تھا جب تک اسے پتہ نہیں تھا اس وقت تک وہ مجبور تھا۔ کہاں تلاش کرتا مگر اب تو وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں بہن کہاں پر ہے اس کے ساتھ ساتھ بھیانک اور شرمناک خیالات اس کو آتے جا رہے تھے۔ وہ اس کی بے چینی کو اور بڑھا رہے تھے۔ دو دن کے بعد اس کی حالت اور خراب ہو گئی اور اس کو سخت بخار چڑھ گیا۔ کھانا پینا تو اسی دن سے چھوٹ گیا تھا جس دن پنڈت کنکری مار گیا تھا۔ نور احمد پریشان ہو گیا۔ کئی جگہ سے دوائیں وہ لایا مگر جو آگ جمیل کے اندر تھی وہ کب بخار اترنے دیتی۔ نور احمد اس کے دکھ کو سمجھ رہا تھا مگر اس کا علاج اس کے پاس نہیں تھا۔ جمیل کی حالت گرتی جا رہی تھی اس کو اندر کا غم ایک منٹ چین نہیں لینے دے رہا تھا اور اسی حالت میں اس کو میرے پاس لایا گیا۔

میں نے اس کا تفصیلی معائنہ کیا۔ کوئی بڑی خرابی ایسی نظر نہیں آئی جو بخار اترنے نہیں دے رہی تھی۔ میں نے رولوکا کو اشارہ کیا اس نے بھی معائنہ کیا اور پھر کہا۔ "یہ بخار کسی جسمانی خرابی کا نتیجہ نہیں لگتا مریض کو کوئی بہت ہی گہرا صدمہ ہے اس کے اندر ایک بھٹی سی جل رہی ہے اس کے تفصیلی حالات پتہ کریں۔"

میں نے کچھ ضروری اور کچھ مقوی دوائیں مریض کو دیں اور پھر نور احمد سے پوچھا۔ "مریض سے آپ کا کیا رشتہ ہے۔ تو اس نے مریض کی پوری کہانی بیان کر دی۔ میرے ساتھ رولوکا بھی یہ کہانی سنتا رہا۔ نور احمد خاموش ہوا تو میں نے کہا۔

"تم نے اپنا فرض ادا کر دیا اب یہ میرا فرض ہے یہ انشا اللہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا اس کا مرض سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ جسمانی مریض تھا ہی نہیں۔ تم اس کو میرے پاس رہنے دو اگر تم خود بھی رہنا چاہو تو رہو۔" میں نے کہا۔

"میرا رہنا اگر ضروری نہیں تو چلا جاتا ہوں صبح پھر آ جاؤں گا۔ میرے گھر سے آپ کا مطب تانگے میں صرف آدھا گھنٹے کا سفر ہے۔" نور احمد نے بتایا۔

"میں اس کو رات کو کچھ اور دوائیں دینا چاہتا ہوں۔ صبح جب تم آؤ گے تو انشا اللہ یہ تم کو ٹھیک ملے گا۔ پھر میں آپ کے سامنے کچھ باتیں کروں گا اور اس کی مشکل کا حل تلاش کروں گا۔" میں نے کہا۔

نور احمد چلا گیا تو میں نے رولوکا سے مشورہ کیا اور ایک آزمودہ نسخہ جمیل کو کھلا دیا۔ نور احمد صبح آیا تو جمیل بستر پر بیٹھا تھا۔ اس کا بخار اتر چکا تھا مگر چہرہ پھر بھی اداس تھا اور کرب و تکلیف کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے جمیل کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "اب کیسا محسوس کر رہے ہو جمیل۔"

اس نے نہایت کمزور آواز میں کہا۔ "بہتر ہوں۔"

"اب تم بہتر ہی رہو گے۔ خوش ہو جاؤ تمہارے صحت مند ہوتے ہی ہم تمہارے ساتھ بجنور جائیں گے اور انشا اللہ تمہاری بہن کو لے آئیں گے۔ تم اکیلے نہیں ہو میں چلوں گا۔ خود ٹھاکر سے بات کروں گا۔ اگر وہ نہ مانا تو ہم تمہاری بہن کو وہاں نہیں رہنے دیں گے۔ بس تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔" میں نے کہا۔

جمیل کے چہرے پر امید کی ایک روشنی سی پیدا ہوئی اور وہ آہستہ سے بولا۔ "کیا ایسا ہو سکتا ہے۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا ہم ہرگز ہرگز تمہاری بہن کو وہاں نہیں رہنے دیں گے۔" میں نے جواب دیا۔ جمیل احمد کے کمزور جسم میں جان سی پڑ گئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔" جمیل نے کہا۔

"ہم جو کام کرتے ہیں اپنا فرض سمجھ کر کرتے ہیں۔ کسی پر احسان نہیں کرتے۔" میں نے جواب دیا۔

ایک ہی ہفتہ کے بعد جمیل احمد بالکل ٹھیک ہو گیا۔ رولوکا اور میں اس کے ساتھ بجنور روانہ ہو گئے۔ ریلوے اسٹیشن پر اس نے کہا۔ "حکیم صاحب یہاں پر میرا تو کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ سرائے وغیرہ میں ٹھہرنا ہو گا۔"

"ہم ہمیشہ ہی ایسا کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم کو ٹھاکر ہری سنگھ کا ٹھکانا پتہ ہے۔" رولوکا نے پوچھا۔

"میں نے تو اس کا نام بھی پہلی بار سنا ہے۔" جمیل احمد نے جواب دیا۔

"خیر پتہ کر لیں گے مشہور آدمی ہے پتہ چل جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

اور پھر ہم نے اسٹیشن کے قریب ہی ایک سرائے میں ٹھکانا بنا لیا۔ یہ سرائے مسلمان سرائے تھی اس لئے کھانے کی بھی فکر نہیں تھی۔ رات کے کھانے کے بعد میں نے سرائے کے مالک سے پوچھا۔ "رشید صاحب بجنور میں ایک صاحب سے ملنے آئے ہیں مگر ان کا ٹھکانا ہم کو پتہ نہیں ہے آپ ہماری کچھ مدد کر سکتے ہیں۔"

رشید سرائے کے مالک کا نام تھا وہ بولا۔ "مجھے پتہ ہو گا تو ضرور بتاؤں گا پوچھئے۔"

"ایک بہت بڑے جاگیردار ہیں ان کا نام ٹھاکر ہری سنگھ ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی خوب رہی کسی تانگے والے کو کہہ دیتے وہ آپ کو ان کے پاس پہنچا دیتا۔ بہت مشہور آدمی ہیں سب ان کو جانتے ہیں۔" رشید نے جواب دیا۔

"آپ کا بہت شکریہ۔" میں نے کہا۔ تو وہ بولا۔

"شکریہ کی کیا بات ہے میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔"

دوسرے روز ہم ایک تانگے پر جاگیردار کی طرف روانہ ہوئے ایک گھنٹہ کے بعد ہم جاگیردار ٹھاکر ہری سنگھ کی حویلی کے سامنے کھڑے تھے۔ حویلی کے چاروں طرف باغ لگا ہوا تھا بہت بڑی چار دیواری تھی اس چار دیواری کے درمیان یہ حویلی دو منزلہ بنی ہوئی بہت قدیم عمارت تھی مگر نئی معلوم ہوتی تھی دروازے پر ایک بنچ پر دو آدمی بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ہم کو دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے اور ایک بولا۔

"کس سے ملنا ہے؟"

میں نے کہا۔ "ٹھاکر صاحب سے کام ہے۔"

دوسرا بولا۔ "کیا کام ہے یہ بھی تو بتاؤ۔"

میں نے جواب دیا۔ "ان کو ہی بتائیں گے تم ان کو اطلاع کر دو۔"

"کیا کہوں کچھ نام پتہ تو ہو۔" وہ بولا۔

"کہو دلی سے حکیم آئے ہیں۔" رولوکا نے جواب دیا۔

اس نے سر سے پیر تک رولوکا کو دیکھا اور خاموشی سے اندر چلا گیا۔ دس منٹ کے بعد آ کر بولا۔ "میرے ساتھ آ جاؤ بلاتے ہیں۔"

تانگہ ہم نے مین گیٹ کے باہر چھوڑ دیا اور اس کو ٹھہرنے کا اشارہ کر دیا ہم چوکیدار کے ساتھ حویلی کی طرف چلے سڑک تھی لال بجری ڈالی گئی تھی اور اس کے دونوں طرف ہری گھاس تھی۔ پھولوں کی کیاریاں بڑے ڈھب سے بنائی گئی تھیں اور اس میں مختلف قسم کے پھول بہار دکھا رہے تھے۔

حویلی کے اندر دروازے پر اس نے ہم کو ایک اور آدمی کے حوالے کر دیا۔ حویلی نہایت خوب صورت تھی جدید طرز کا سامان بھرا ہوا تھا۔ چھت پر خوب صورت فانوس لٹک رہے تھے۔ دیواروں پر رنگ و روغن بھی اچھا تھا۔ ٹھاکر ہری سنگھ جتنا بڑا جاگیردار تھا اس کی رہائش بھی اتنی ہی شاندار تھی۔

ایک بہت وسیع و عریض ڈرائنگ ہال میں اس نے ہمیں پہنچا دیا۔ اس کمرے کی ہر شے سے امارت ٹپک رہی تھی۔ دیواروں پر قد آدم تصویریں لگی ہوئی تھیں اور ان تصویروں میں جمالیات کی تسکین کا تمام تر سامان موجود تھا۔ میں نے پہلی نظر میں ہی اندازہ کر لیا کہ جاگیردار کس مزاج کا ہے کچھ تصویریں ہیجان انگیز اور جذبات کو بھڑکانے والی بھی دیوار پر موجود تھیں۔

سامنے ہی ایک بہت بڑا تخت پڑا تھا۔ اس پر گلابی کھڑکی چادر پڑی تھی۔ تخت کے اوپر بڑی خوب صورت چھت تھی اس کے کناروں پر بھی گلابی بیل لگی ہوئی تھی پورا

READING CORNER
http://readingcornerforblogspot.com/

کمرہ روشن تھا ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ اس پر ایک شخص بیٹھا تھا وہ بھی بہت رعب دار تھا چہرہ چوڑا تھا اور اس پر اس کی داڑھی نے اور چوڑا کر دیا تھا۔ سفید کرتا اور سفید ہی دھوتی اس کا لباس تھا۔ ایک طرف ایک بہت بڑا حقہ رکھا تھا اور اس کی اسٹک اس کے ہاتھ میں تھی۔ اسٹک کا آخری سرا جس کو منہ میں لگا کر وہ کش لے رہا تھا ہاتھی دانت کا تھا۔ ایک تو وہ شکل سے بارعب تھا دوسرے اس کمرے کا ماحول اس کو اور رعب دار بنا رہا تھا۔ تخت کی پچھلی طرف ایک آدمی کھڑا تھا، خاموش اور بے حرکت جیسے پتھر کا بت کھڑا کر دیا ہو۔

ٹھاکر نے بھرپور نظر سے ہم تینوں کو دیکھا اور کہا۔

"کیسے آنا ہوا سجنوں۔" اس کی آواز بڑی متوازن اور بھاری تھی چہرے کی طرح آواز میں بھی رعب ظاہر ہوتا تھا۔

"ہم لوگ دلی سے آئے ہیں اور ظاہر ہے کہ کسی کام سے آئے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"وہی پوچھ رہا ہوں کیا کام ہے۔" ٹھاکر نے کہا۔

"ہمارے یہاں یہ دستور ہے کہ آنے والوں کو پہلے بٹھایا جاتا ہے مجھے پتہ نہیں بجنور میں کیا طریقہ ہے۔" میں نے کہا۔

ٹھاکر کے چہرے پر ذرا ناگواری کے تاثرات ابھرے مگر وہ پھر نارمل ہو گیا اور بولا۔ "دستور تو یہ ہی ہے مگر ہم پہلے پوچھتے ہیں پھر بٹھاتے ہیں۔"

"خیر یہ تو اپنا اپنا طریقہ ہے۔ کچھ آنے والوں کو عزت دیتے ہیں کچھ نہیں دیتے۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ حکیم ہیں۔" ٹھاکر نے پوچھا۔

"ہاں ہم دونوں حکیم ہیں اور یہ جمیل احمد ہے۔ اس کا پہلے نام واس دیو ہوا کرتا تھا۔ اس کے باپ کا نام رام بھروسے تھا یہ بجنور کے ایک محلے کا ہی رہنے والا تھا۔ اس کی دو بہنیں ہوا کرتی تھی۔ ایک کی ماں باپ نے شادی کر دی تھی مگر دوسری کو کسی نے اغوا کر لیا۔ یہ غریب بچہ تھا کیا کرتا۔ اغوا کرنے والا بڑا آدمی اور بڑے اثر و رسوخ والا تھا۔ یہ دلی چلا گیا اور محنت مزدوری کرنے لگا اور آج تک اپنی بہن کو تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ مگر اب پتہ چلا ہے۔" میں اتنا کہہ کر ٹھاکر کی طرف دیکھنے لگا میری باتیں سن کر ٹھاکر کے چہرے پر ایک رنگ آتا رہا ایک جاتا رہا۔ اس کی اخلاقی گراوٹ تو ہمارے سامنے تھی۔ کردار کی گراوٹ بہت پہلے ہی ظاہر ہو گئی تھی۔ صرف چہرے اور امارت کے دبدبے میں ہم آنے والے نہیں تھے۔

"میرے پاس آنے کا مقصد بتاؤ۔ ادھر ادھر کی کہانیاں سننے کا مجھے شوق نہیں ہے۔" ٹھاکر نے غصے سے کہا۔

"آپ کو یہ کہانی ادھر ادھر کی معلوم ہو رہی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ہی آپ ہیں۔" میں نے کہا۔

"اپنی زبان کو لگام دو حکیم، میری چھت کے نیچے مجھے ہی گالی دے رہے ہو۔" ٹھاکر آگ بگولا ہو گیا۔

"انسان ہر جگہ طاقتور نہیں ہوتا بے شک تم اپنی حویلی اور جاگیر میں خدا بنے ہوئے ہو مگر یہ خدائی صرف کچھ دن کی ہے آخر اس کا آخری سرا آ جائے گا۔ پھر تم کیا کرو گے۔ کچھ گنجائش چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔

"تم کہتے ہو کہ حکیم ہو۔ مگر باتیں لیڈروں والی کرتے ہو۔ خود کو دیکھو اور مجھے دیکھو اور پھر موازنہ کرو۔" ٹھاکر تحقیرانہ انداز میں بولا۔

"وہ تو میں نے کر لیا ہے۔" رولو کا درمیان میں بولا۔

"اچھا تم بھی بات کرتے ہو۔" ٹھاکر نے مذاق اڑایا۔

"اس لڑکی کا نام گھومتی تھا ہم اس کو لینے آئے ہیں۔" رولو کا نے صاف بات کی۔

"تو پھر کان کھول کر سن لو۔ یہ درست ہے کہ میں نے اس کو اٹھوایا ہے کیونکہ اچھے اچھے پھول حویلی میں اگانا اور خوب صورت عورتیں رکھنا ہمارا خاندانی شوق ہے۔ تم اور تم جیسے نہ جانے کتنے آ چکے ہیں مگر ایک عورت بھی یہاں سے نکال کر نہیں لے جا سکے۔" ٹھاکر نے کہا۔

"اچھا ٹھاکر یہ تو بتاؤ تم اتنی عورتوں کا کیا کرتے ہو۔" رولو کا نے پوچھا۔

"وہ کھلونے ہیں ان سے کھیلتے ہیں۔" ٹھاکر نے

گردن تان کر کہا۔

"مگر عورتیں تو مرد رکھا کرتے ہیں تم کیوں رکھتے ہو۔" رولو کا کے اس سوال پر ٹھاکر کے ساتھ میں بھی چونک گیا۔ ٹھاکر کا پارہ ایک دم آسمان پر پہنچ گیا۔ وہ دھاڑ کر بولا۔

"ابے ہم مرد ہیں تجھے ابھی بتاتے ہیں کہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔" اور اس نے اپنے پیچھے کھڑے کڑیل جوان کو اشارہ کیا۔ مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا تو غصے سے بولا۔ "کیا مر گیا ہے۔ دبوچ کر لے جا اور ڈال دے کال کوٹھری میں۔" مگر جوان پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ ٹھاکر غصے سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

"میں خود دیکھتا ہوں۔" مگر کھڑا ہی رہا اس نے آگے قدم بڑھانے کی کوشش ضرور کی مگر بڑھا نہ سکا۔ اس نے باہر سے کسی کو بلانے کو آواز دینا چاہی تو اتنی آہستہ آواز نکلی کہ وہ گردن پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ جب ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو پھر بیٹھ گیا اور من مناتی آواز میں بولا۔ "کون ہے تو یہ سب کیا ہو رہا ہے۔"

"میں کوئی بھی ہوں مگر تو سخت بداخلاق بدزبان اور بدکردار آدمی ہے۔" رولو کا نے کہا۔

ٹھاکر خاموش رہا اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا جب کسی کو اپنی بے عزتی کا احساس ہوتا ہے تو اس کا چہرہ بگڑ جاتا ہے۔ ٹھاکر جو اس جگہ کا مالک تھا اپنی ہی حویلی میں وہ بے بس تھا یہ احساس اس کو مارے ڈال رہا تھا۔

"وہ لڑکی کہاں ہے جس کا نام گھومتی ہے۔" رولو کا نے پوچھا۔

"وہ حویلی میں نہیں ہے۔" ٹھاکر کی باریک آواز نکلی وہ خود اپنی آواز سن کر پریشان ہو گیا۔

"تم نے اس کو کہاں بھیج دیا ہے۔" میں نے پوچھا۔

ٹھاکر خاموش رہا تو رولو کا نے کہا۔ "لڑکی کہاں ہے اس کا پتہ چلانا کوئی مشکل نہیں ہے۔ یہ بت جو خاموش کھڑا ہے فر فر بتائے گا، اس کو پتہ نہ ہوا تو کوئی دوسرا بتائے گا۔ مگر پھر اپنا انجام سوچ لینا۔"

"وہ میں نے اس کو ایک دوست کو تحفہ دے دیا۔" ٹھاکر بولا۔

"تم ذلالت کی آخری سیڑھی تک جا چکے ہو۔ وہ کون دوسرا ذلیل تھا جس نے وہ تحفہ وصول کیا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"وہ ٹھاکر ہرنام سنگھ ہے یہاں سے بیس کوس پر ایک اور جاگیر ہے۔ وہ اس کا مالک ہے۔ اس نے گھومتی کو مانگا تھا۔" ٹھاکر نے بتایا۔

"اتر سے اتر ملے کیچ سے کیچ۔ بہت خوب جیسا تو ہے ویسا ہی تیرا دوست ہے۔" میں نے کہا۔

ٹھاکر خاموش رہا تو رولو کا نے کہا۔ "اب ہم تیرے ٹھاکر ہرنام سنگھ کو دیکھتے ہیں۔ اور سن لے اچھی طرح تو اب کسی عورت کے قابل نہیں رہا۔ سب کو آزاد کر دے تیری آواز بھی بس اتنی ہی رہے گی اگر زیادہ ہاتھ مارے گا یعنی دوا دارو کرے گا تو بالکل جاتی رہے گی۔ انسانوں کے ساتھ انسانوں والا سلوک کرنا میں پلٹ کر دوبارہ بھی آ سکتا ہوں۔ میرے جانے کے بعد تیرا یہ پتھر کا بت بھی آدمی بن جائے مگر میری طرف مت آنا۔" اور ہم حویلی سے نکل آئے میرے لئے تو یہ سب کچھ نیا نہیں۔ میں رولو کا کے بہت سے کھیل دیکھ چکا تھا۔ مگر جمیل احمد کی آواز تو مارے حیرت کے بند تھی۔ تانگے والا موجود تھا۔ میں نے کہا۔

"میاں کوچوان تم کو ذرا انتظار کرنا پڑا معاف کرنا دیر ہو گئی۔"

"نہیں میاں جی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔" وہ بولا۔

"اب یہ بتاؤ آگے چلو گے۔ سفر ذرا لمبا ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ حکیم کریں میرا گھوڑا تگڑا ہے۔ زیادہ لمبا سفر ہو تو بیچ میں تھوڑا آرام کر لیں گے گھوڑے کو تازہ کر لیں گے چنتا کی کیا بات ہے۔" کوچوان نے کہا۔

"ٹھاکر ہرنام سنگھ کی جاگیر پر جانا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ "وہاں کے دو راستے ہیں۔ ایک تو صاف ہے مگر لمبا ہے کوئی بیس کوس ہے۔ رک رک کر جانا ہو گا۔ وقت بہت لگے گا۔ دوسرا ایک راستہ جنگل کی

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

طرف سے بھی ہے۔ یہ ہے تو کم مگر بڑا بدنام ہے یہاں پر ڈاکو وغیرہ بھی رہتے ہیں اس لئے لوگ اس پر سفر نہیں کرتے۔" کوچوان نے کہا۔

"تم یہ بتاؤ تم کو فائدہ کس طرف سے جانے میں ہے ڈاکوؤں کی تم فکر نہ کرو۔" رولوکا نے پوچھا۔

"جنگل والا راستہ چھوٹا ہے۔ دوسرے یہاں گھوڑے کی غذا بھی بہت ہے مگر ڈر لگتا ہے۔" کوچوان بولا۔

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں تم ادھر سے ہی چلو۔"

اور تانگہ چل پڑا۔ کچھ دور جانے کے بعد تانگہ بائیں طرف چلنے لگا۔ دن کے دوڈھائی کا وقت تھا۔ سڑک دور تک ویران تھی۔ دور دور کسی سواری کا نشان نہیں تھا۔ درختوں کے درمیان سڑک تھی۔ درختوں کے بعد گھنی جھاڑیاں نظر آتی تھیں۔ آدمی تو کجا کوئی جانور بھی نظر نہیں آتا تھا۔ سڑک ہموار تھی اور گھوڑا دلکی چال سے چل رہا تھا۔ دو تین میل کا سفر کیا تھا کہ اچانک گھوڑا رک گیا گھوڑے کا اس طرح رکنا خطرے کی علامت تھی کوچوان نے کوشش کی کہ گھوڑا آگے چلے مگر اس نے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا تو وہ بولا۔ "یہ آگے نہیں جائے گا کیونکہ آگے ضرور کوئی موذی جانور ہے۔"

رولوکا تانگے سے اتر پڑا اور بولا۔ "ہاں تم نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ گھوڑا اور کتا بہت حساس ہوتا ہے۔ ضرور کچھ ہے تم یہیں پر کھڑے رہو میں دیکھتا ہوں اور رولوکا اسی سڑک پر پیدل آگے جانے لگا۔ دس بارہ گز جانے کے بعد وہ کھڑا ہوگیا۔ جہاں وہ کھڑا ہوا تھا وہاں پر ایک بڑا موٹا نیم کا درخت سڑک کے کنارے کھڑا تھا اور اس درخت کی جڑ کے پاس ایک ناگ کالے رنگ کا پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔ وہ رولوکا کو دیکھ کر بھاگا نہیں وہیں جما بیٹھا رہا۔ رولوکا اس کے قریب چلا گیا دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور پھر ناگ قریب کی جھاڑیوں میں رینگتا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رولوکا واپس آ گیا تو کوچوان نے پوچھا۔

"کیا تھا سرکار۔ میرا خیال ہے کوئی ناگ ہوگا۔"

رولوکا نے پوچھا۔ "تم نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ ناگ ہوگا۔"

"میرا گھوڑی کسی موذی سے ڈرتا ہے تو صرف ناگ سے ڈرتا ہے اس لئے میں نے کہا۔"

"ہاں ناگ تھا وہ چلا گیا اب آگے بڑھو۔"

کوچوان نے لگام پکڑی اور گھوڑا پھر سڑک پر چلنے لگا۔ آگے سڑک اور دشوار ہوگئی درخت اور جھاڑیاں اتنی گھنی ہوگئیں کہ تانگہ جب گزرتا تھا تو ہمیں لگتی تھیں۔ یہاں پر سڑک بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ تانگے کی رفتار بھی کم ہوگئی تھی اب شام کے سائے بھی پھیلنا شروع ہوگئے تھے۔ کوچوان کے اندازے سے زیادہ وقت اس راستے پر لگ رہا تھا۔ مگر تانگہ چل رہا تھا گو کہ رفتار کم تھی ہم رات ہونے سے پہلے اس سڑک کو پار کرنا چاہتے تھے۔ جنگل گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ دو تین میل اسی طرح چلتے رہے۔ پہلے سائے لمبے ہوئے تھے مگر اب سائے مٹتے جا رہے تھے اور رات کی آمد آمد تھی اس ویرانے میں رات گزارنے کا تصور رونگٹے کھڑے کر دیتا تھا۔ کوچوان کا چہرہ فکر مند تھا۔ مگر رولوکا بڑے سکون سے بیٹھا تھا جیسے خاموش تھا۔

اندھیرا پوری طرح نہ پھیلا تھا کہ ایسا لگا جیسے ہم کسی نئی سڑک پر پہنچ گئے ہیں۔ سڑک کے کنارے جھاڑیاں نہیں تھیں اور زمین صاف تھی ایسا لگتا تھا یہ جگہ صاف کی گئی ہے۔ پھر چند لوگ سڑک پر درمیان میں آ کر کھڑے ہوگئے اور رکنے کا اشارہ کرنے لگے۔ رولوکا نے کہا۔ "تانگہ روک دو۔" تانگہ کھڑا ہوگیا۔ سب سے پہلا رولوکا کو دکر اترا اس کے بعد ہم سب تانگے سے اتر پڑے۔ ایک لمبا چوڑا کالے لباس والا رولوکا کے سامنے آ کھڑا ہوا اور رعب سے بولا۔ "کہاں سے آئے ہو اور کہاں جاتے ہو؟"

رولوکا نے بتایا۔ "ہم ذرا جلدی میں ہیں۔ ہمیں جاگیردار ہرنام سنگھ ٹھاکر سے ملنا ہے۔"

"تم اس طرف کیوں آئے ایک راستہ اور بھی تو ہے؟" وہ بولا۔

"میں نے کہا نا کہ جلدی کی وجہ سے آئے ہیں۔"

رولوکا نے جواب دیا۔

"آگے اب تم نہیں جاؤ گے واپس جانا ہوگا۔" وہ بولا۔

"مجھے تم اپنے سردار کے پاس لے چلو، میں اس سے اجازت لے لوں گا۔" رولوکا نے کہا۔

"سردار بیمار ہے وہ نہیں ملے گا۔" جواب ملا۔

"ہم دونوں حکیم ہیں۔" رولوکا نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ "شاید ہم تمہارے سردار کے کچھ کام آ جائیں۔"

"تم کیا علاج کرو گے اس کو کسی سانپ نے ڈسا ہے۔" وہ بولا۔

"فکر نہ کرو علاج سب چیز کا ہے۔" رولوکا نے جواب دیا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر بولا۔ "آؤ میرے ساتھ مگر صرف تم دونوں یہ دونوں یہاں رہیں گے۔"

"ٹھیک ہے مگر ان دونوں کی تم لوگ حفاظت کرو گے۔" رولوکا نے کہا۔

اس نے اپنے دوسرے ساتھیوں سے کہا۔ "ذرا خیال رکھنا چھورے کا۔"

اور وہ ایک طرف چل دیا اس کے ساتھ ہم دونوں بھی چل پڑے۔ کچھ ہی دور گھنی جھاڑیوں کے درمیان ایک بڑا سا لکڑی کا جھونپڑا بنا ہوا تھا۔ اس کے دروازے پر دو آدمی بندوقیں لے کر کھڑے تھے وہ لوگ آنے والے کو دیکھ کر ایک طرف ہوگئے اور ہم سب جھونپڑے کے دروازے میں داخل ہوگئے۔ یہ ایک بڑا ہال نما کمرا تھا ایک تخت پر گھاس کا بستر تھا اس پر ایک شخص پڑا تھا۔ رولوکا بہت تیزی کے ساتھ آگے بڑھا نبض پر ہاتھ رکھا پھر دل کی حرکت سنی اور بولا۔ "ابھی زندہ ہے۔" پھر اس آدمی سے بولا۔ "ایک بوٹی کی ضرورت ہے یہ میرا ساتھی یہاں موجود ہے میں جنگل سے وہ لے کر آتا ہوں۔" اس نے گردن ہلا کر اجازت دے دی۔

آدھے گھنٹے میں رولوکا ایک پودا لے آیا۔ اس کا رنگ ہرا تھا اور پیلے پھول بہت باریک لگے ہوئے تھے۔ رولوکا نے وہ پھول توڑے۔ ان کو ہتھیلی پر رکھ کر رگڑا اور اس میں سے جو رس نکلا وہ مریض کے منہ میں ٹپکایا اور اس پودے کو مریض کے سر کے نیچے رکھ دیا اور پھر بولا۔ "اب خطرہ نہیں ہے مگر کام ختم نہیں ہوا ہے۔ تم ایسا کرو کم از کم چار پانچ ٹوکری گوبر کا بندوبست کرو۔ گوبر تازہ ہو پرانا سوکھا ہوا نہ ہو۔" وہ آدمی فوراً باہر آیا اور اس نے گوبر لانے کو آدمی دوڑا دیئے اور ایک بڑی سی لالٹین کمرے میں روشن کر دی۔ رولوکا نے کہا۔ "ہمارے دونوں آدمی کہاں ہیں؟"

"وہ وہیں ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"تو کیا ساری رات ان کو کھلے آسمان تلے رکھو گے۔" رولوکا نے پوچھا۔

"نہیں ہم ان کو دوسرے ٹھکانے پر پہنچائے دیتے ہیں اور کھانے کا بھی بندوبست کر دیتے ہیں۔"

"اور گوبر کب آئے گا؟" رولوکا نے پوچھا۔

"آدمی آنے والے ہوں گے قریب ہی ایک گاؤں ہے وہیں سے لائیں گے۔"

کچھ دیر میں پتہ چلا کہ گوبر آ گیا ہے۔ اب رولوکا نے ایک نیا حکم دیا۔ ایک چار فٹ گہرا گڑھا کھدواؤ وہ صرف دو فٹ چوڑا اور دو فٹ لمبا ہو۔ میں کچھ کچھ سمجھ رہا تھا مگر میں نے سانپ کے کاٹے کا اس طرح کبھی علاج نہیں کیا تھا۔ گڑھا تیار ہوگیا۔ پھر اس نے کہا۔ مریض کو اس میں بٹھا دیا جائے۔ دو آدمیوں نے سردار کو جو کہ ابھی تک بے ہوش تھا پکڑ کر گڑھے میں بٹھا دیا۔ رولوکا نے اس گڑھے کو گوبر سے بھرنا شروع کر دیا اور وہ گڑھا پورا بھر دیا اب سردار کا صرف چہرہ گوبر سے باہر تھا ایک آدمی اس کو پکڑ کر بیٹھ گیا۔ رولوکا نے وہی بوٹی جو اس کے سر کے نیچے رکھی تھی لا کر ایک ایک پتی اس گوبر میں ڈال دی اور وہیں پر بیٹھ گیا۔ ساری رات رولوکا کے ساتھ میں بھی وہیں رہا اور اس کے سارے آدمی بھی سردار کے گرد رہے۔

رات کا سفر تمام ہوا۔ چاند تھک کر چلا گیا اور سورج اپنی ڈیوٹی پر آ گیا تو رولوکا نے گوبر میں انگلی گاڑ کر دیکھی۔ گوبر سوکھ گیا تھا اور اس کی رنگت نیلی ہوگئی تھی۔ دھوپ پھیلتے

READING CORNER
http://readingcorner.blogspot.com/

ہی رولو کا نے سردار کو گوبر سے نکال لیا۔ دل کی حرکت اور نبض وغیرہ چیک کی اور پھر اعلان کیا۔ ”تمہارا سردار ٹھیک ہو گیا ہے اب وہ سو رہا ہے بڑی گہری نیند میں ہے دوپہر تک خود بخود اٹھ جائے گا۔“ اس کے سب ساتھی خوشی سے نعرے لگانے لگے۔

وہی شخص آگے بڑھا اور بولا۔ ”آپ نے تو کمال کر دیا ہم سب تو ناامید تھے۔ اب آپ سردار سے ملاقات کر کے ہی جائیں گے۔ اگر ہم نے آپ کو جانے دیا تو سردار اٹھنے کے بعد بہت ناراض ہوگا۔“ ہم جو جلدی میں تھے اب ان کی بات کو کیسے ٹھکراتے دوپہر تک رک گئے۔ اس جنگل میں ہم کو جو ناشتہ کروایا گیا وہ بھی ایک یادگار تھا اور جن برتنوں میں پیش کیا گیا وہ بھی تعجب خیز بات تھی۔ ٹھیک ساڑھے بارہ بجے سردار اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے آواز لگائی۔ ”ارے او موہن سنگھ۔“

موہن سنگھ جو ہمارے ساتھ ساتھ رہا تھا دوڑ کر اندر چلا گیا اور جاتے ہی بولا۔ ”مبارک ہو سردار۔“

”ارے کاہے کی مبارک کا میرے ہاں چھورا ہوا ہے۔ سردار نے تعجب سے کہا۔

”ارے سردار ہم تو سب تم کا کریا کرم کرن کی تیاری میں تھے کہ بس چینکار ہو گیا۔“ موہن بولا۔

”کا گول بات کرے ہے صاف بتا۔“ سردار نے پوچھا۔

”تم کا ایک بہت خطرناک ناگ نے ڈس لیا تھا۔ تم تو ایک پل میں گر پڑے اور اس کے بعد تم کا کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوا۔ ہم بتاتے ہیں ہم تم کا اٹھا کے ڈیرے پر لے آئے جو کچھ دوادارو کر سکتے تھے کیا پر تمہاری حالت خراب ہوتی گئی ہم نے سمجھ لیا کہ بس اب تمہارا ہمارا ساتھ چھوٹا کہ بھگوان کی کرپا سے ایک تانگہ آ گیا ہے نا چینکار۔ بھلا کب ادھر تانگہ آیا ہے۔ پر آ گیا چار آدمی اس میں سوار دو حکیم۔ او حکیم نے تم کا دیکھا اور علاج کر دیا تم پھر سے زندہ ہو گئے۔“ موہن سنگھ نے بات ختم کی۔

”اوہ وہ سب کا چلے گئے۔“ سردار نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں ہم نے تم سے ملوانے کو روک رکھا ہے۔“ موہن نے جواب دیا۔

”ارے تو جلدی بلاؤ ان کو میرے پاس لو بھلا یہ کوئی بات ہوئی اتنا بڑا ابکار مجھ پر کر دیا۔“

موہن دوڑ کر ہمارے پاس آیا اور بولا۔ ”سردار اٹھ گئے بلاتے ہیں۔“

ہم سب اس کے بڑے جھونپڑے میں چلے گئے۔ سردار بستر پر بیٹھا تھا۔ کسی قسم کی بیماری کے یا کمزوری کے آثار نہیں تھے۔ وہ ہم کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور سب سے گلے ملا اور بولا۔ ”آپ لوگ سب حکیم ہیں۔“

میں نے جواب دیا۔ ”میں اور یہ حکیم ہیں۔ جا تو رہے تھے کسی اور کے علاج کو مگر آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر بھلا کس طرح جا سکتے تھے۔“

”آپ نے جو احسان مجھ گناہ گار پر کیا ہے اس کا تو کوئی بدل ہی نہیں ہے یہ زندگی آپ نے مجھے دی ہے اگر اس کی ضرورت کبھی پڑ جائے تو میں آپ کو منع نہیں کروں گا۔“ وہ جذباتی لہجے میں بولا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے ہمیں۔ اب تک تمہارا نام پتہ نہیں چلا۔“ میں نے کہا۔

”میرا نام تو جلوانی سنگھ ہے۔ مگر سب جلوڈا کو کے نام سے جانتے ہیں۔“

”اب تم ہمیں جانے کی اجازت دے دو کیوں کہ ہم جہاں جا رہے ہیں وہاں پر بھی ایک مریض ہے اس کا علاج بھی کرنا ضروری ہے کیونکہ اس کی بیماری کچھ ایسی ہے کہ اس کے ساتھ دوسرے لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا تو جلو نے پوچھا۔

”کہاں جانا ہے۔ بتائیں تو میں آپ کے ساتھ آپ کو پہنچا کر آؤں گا۔“

”تم ہمارے ساتھ نہیں چلو گے، ہم جس طرح یہاں آئے ہیں اسی طرح اس تک جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”یہ تو بتا دیں کہ کس گاؤں جاؤ گے۔“

”ہم ٹھاکر ہرنام سنگھ کے پاس جا رہے ہیں۔“ رولو کا نے کہا۔

ٹھاکر ہرنام کا سن کر جلو چونکا اور بولا۔ ”حکیم صاحب وہ بہت ٹیڑھا آدمی ہے۔ وہ آدمی کو آدمی نہیں سمجھتا چھوٹ گالی دیتا ہے۔ زبان اور کردار دونوں کا خراب ہے۔“ جلو نے کہا۔

”یہی تو اس کی بیماری ہے۔ اس کا ہی تو علاج کریں گے۔“ رولو کا نے کہا۔

جلو حیرت سے بولا۔ ”کیا اس کا بھی علاج ہوتا ہے۔“

”ہر مرض کا علاج ہوتا ہے۔ تم کو ایک بہت ہی زہریلے ناگ نے ڈسا تھا اس کا علاج ایک مفت کی چیز گوبر سے ہوا اور ہرنام کا علاج بھی کسی مفت کی دوا سے ہوگا۔ ہمارا طریقہ علاج سب سے الگ ہے کوئی مریض اپنا علاج نہیں بھی کرانا چاہے تو بھی ہم زبردستی اس کا علاج کر دیتے ہیں۔ تم حیران مت ہو اس دنیا میں ایک سے بڑا ایک دیوانہ پڑا ہے۔“ رولو کا نے مسکرا کر کہا۔

”ہے تو بات حیرت کی۔ میری ضرورت اگر کسی مقام پر پڑے تو ضرور یاد رکھیں۔“ وہ بولا۔ اور ہم تانگے میں ہرنام کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب روڈ صاف تھا جھاڑیاں اور درخت بھی روڈ سے دور تھے دن کا وقت تھا شام تک ہم ہرنام سنگھ کی جاگیر میں تھے اب ہمیں جلدی دیر کی پرواہ نہیں تھی کیونکہ جو دیر ہونا تھی وہ تو ہو چکی تھی ہم نے ہرنام کی حویلی کا پتہ معلوم کیا اور سیدھے وہیں پر چلے گئے۔ اس کی حویلی کا وہ کروفر نہیں تھا۔ آدمی حویلی کے چاروں طرف نظر آنے لگے۔ دروازے پر دو آدمی بندوق لے کر بیٹھے تھے دونوں کے سروں پر پگڑی تھی جسمانی طور پر بھی یہ تگڑے جوان تھے۔ میں اور رولو کا دونوں تانگے سے اتر کر ان کے پاس چلے گئے۔ میں نے ایک کو کہا۔ ”ہمیں ٹھاکر ہرنام سنگھ سے ملنا ہے۔“ اس نے سر سے پیر تک ہمارا جائزہ لیا اور بولا۔

”کیوں کیا کام ہے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”ذاتی کام ہے ان کو ہی بتائیں گے۔“

”پھر تو ملنا مشکل ہے ہم کا نہ کو کھڑے ہیں پہلے ہم کا بتاؤ پھر آگے بات بنے گی۔“ وہ بولا۔

”یہ ٹھاکر صاحب کی ذاتی بات ہے تم کو کیا بتائیں۔“ میں نے جواب دیا۔

دوسرا بولا۔ ”ارے یہ ذاتی بات کا ہوت ہے سمجھ تو آ جائے پھر ٹھاکر کو بتائیں۔“

رولو کا آگے بڑھا اور بولا۔ ”زیادہ ہوشیاری مت کرو۔ کیا فائدہ کہ ٹھاکر تم کو مار بھگائے بات بتانے والی نہیں ہے۔“

پہلا بولا۔ ”تو یہ کہو نا یہ ذاتی باتی ہم نہ سمجھیں ذرا ٹھہرو ابھی آتے ہیں۔“ اور وہ اندر چلا گیا۔

”اندر آنے کا حکم نا دیا ہے۔ وہ خود آتے ہیں۔ باہر ہی بات کریں گے۔“ کچھ ہی دیر میں ایک پھولے پھولے گالوں والا بھاری بھرکم آدمی ہاتھی کی چال چلتا ہوا دروازے سے برآمد ہوا اور نہایت بازاری زبان میں بولا۔ ”کون آ مرا اس وقت مزا کرکرا کر دیا۔“ میں آگے بڑھا اور کہا۔

”ہم لوگ بہت دور سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔“

”ارے تو میں کیا کروں۔ مجھ پر کیا احسان کر دیا۔ میرا تو مزا خراب کر دیا۔ یہ بھی کوئی آنے کا وقت ہے منہ اٹھایا اور چلے آئے ضرور کوئی کام ہوگا۔ کر تو نہ گن نہ احسان، نہ کر تو بدنام کریں گے۔“ وہ ناگواری سے بولا۔

”کام تو ہے مگر وہ کام آپ نہیں کریں گے اور ہاں ایک بات آپ کو بتا دیں کہ تم اپنی گل فشانی گفتار کو ذاتی کنٹرول میں رکھنا۔“ میں نے کہا۔

”کس کو کنٹرول میں رکھوں تم نے کیا کہا ہے۔“ ہرنام بولا۔

”اپنی زبان کو۔ تم نے اب تک ایک لفظ شریفانہ نہیں کہا ہے۔ سب کو ایک لکڑی سے نہیں ہانکا جاتا۔“ میں نے کہا۔

READING CORNER
http://readingcornerblogspot.com

"تو تم مجھے سبق پڑھانے آئے ہو۔ میں بہت پڑھ چکا ہوں کام بتاؤ کیوں آئے ہو؟" وہ بولا۔

"ٹھاکر ہری سنگھ کو تم جانتے ہو۔" رولوکا نے پوچھا۔

"کون ہری سنگھ ٹھاکر......" ہرنام نے گردن ٹیڑھی کر کے کہا۔

"بہت خوب تمہاری یادداشت بھی کمزور ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"زبان کو لگام دو میرے ایک اشارے پر تم زمین پر پڑے ہو گے۔ تم میرے گھر پر اور میری زمین پر ہو جو بات کرو یہ ضرور ذہن میں رکھنا یہاں پر میرا قانون چلتا ہے۔" وہ غصے میں بولا۔

"وہ ہری سنگھ جس نے تم کو ایک تحفہ دیا ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"مجھے یاد نہیں مجھے تو روز ہی تحفے ملتے رہتے ہیں میں کس کس کو یاد رکھوں۔" وہ غرور سے بولا۔

"تمہارے بارے میں جو سنا تھا تم اس سے بھی اوپر ہو۔" میں نے کہا۔

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ منہ گالیوں سے بھر گیا مگر ایک لفظ بھی ادا نہیں ہوا۔ اس نے آدمیوں کو ہم پر حملہ کرنے کا اشارہ کیا۔ مگر کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلا جو جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ وہ خود اپنی جگہ ہاتھی کی مانند جھومتا رہا اور پھر بولا۔

"ارے سب مر گئے کیا۔"

رولوکا نے اس کے قریب جا کر کہا۔ "ان سب کو مردوں میں ہی شمار کر لو۔ کوئی تم کو بچانے نہیں آئے گا اب بتاؤ وہ لڑکی کہاں ہے؟"

ہرنام بڑا ڈھیٹ ہڈی کا تھا بولا نہیں خاموش رہا۔ "نہ بتاؤ میں خود اندر جا کر تلاش کر لوں گا۔" رولوکا نے کہا۔

"اندر تم کو کون جانے دے گا۔ میرے آدمی دروازے پر ہیں۔" وہ بولا۔

"وہ مٹی کے بت ہیں۔ وہ کیا کریں گے اور تو خود اپنی بتا زمین نے تیری ٹانگیں باندھ دی ہیں۔" ہرنام نے پیر ہلانے کی کوشش کی پھر چیخ کر بولا۔ "تو کون ہے رے مجھے باندھ دیا۔"

"میں توڑ ہوں۔ تیرے غرور کا توڑ۔ تو جتنا بدآدمی ہے کہ شاید تیری برابری ہری سنگھ بھی نہیں کر سکتا۔ تجھے پورا حساب آج دینا ہوگا۔ سب کھایا پیا نکالنا پڑے گا۔" رولوکا نے جواب دیا۔

رولوکا دروازے کے اندر چلا گیا۔ یہ ایک بہت بڑا کمرہ تھا۔ نہایت واہیات قسم کی تصویریں دیواروں پر لگی ہوئی تھیں۔ ایک نظر میں ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ ایک اوباش اور عیاش آدمی کا کمرہ ہے۔ کمرے کے درمیان میں ایک بڑی سی میز پر شراب کی بوتلیں اور سوڈے کی بوتلیں رکھی تھیں۔ ایک بہت بڑی مسہری پڑی تھی اس پر ایک عورت اس ہوشربا انداز سے بیٹھی تھی کہ رولوکا کی جگہ اگر کوئی اور مرد ہوتا تو اس کو بار بار دیکھتا ہی رہتا۔ اس کا سارا بدن جھلک جھلک کر دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ رولوکا نے پہلی نظر اس پر ڈالی اور کہا۔

"کھڑی ہو جا اور اندر چلی جا۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی۔ "زمیندار جی کہاں ہیں۔ میں ان کے حکم کے بنا کمرے سے باہر کیسے جاؤں۔"

"زمیندار اندر نہیں آئے گا۔ تو یہ بتا تیرے علاوہ اور کتنی عورتیں حویلی میں ہیں۔" رولوکا نے پوچھا۔

"مجھے کیا پتہ آج میرا دن تھا تو میں آئی ہوں۔" وہ اٹھلا کر بولی۔

"اپنے بدن اور زبان دونوں پر قابو رکھ، کس کو پتہ ہو گا یہ بتا۔" رولوکا نے پوچھا۔

"منشی رگھبیر کو سب پتہ ہے۔" وہ بولی۔

"جا اس کو بلا کر لا جلدی کر۔" رولوکا نے کہا۔

رولوکا نے کچھ اس انداز سے حکم دیا تھا کہ وہ اندر دوڑ گئی اور جلد ہی ایک آدمی کے ساتھ آئی، رولوکا نے اس آدمی سے پوچھا۔ "تو منشی ہے؟"

"ہاں جی میں ہی منشی ہوں۔ مگر تم کون ہو۔ جاگیر دار صاحب کے کمرے میں کیا کر رہے ہو۔"

"زیادہ پر مت نکال۔ میں جو پوچھتا ہوں وہ بتا۔"

رولوکا نے کہا۔

"پر کیوں بتاؤں خواہ مخواہ تم کون ہو؟" وہ پھر بولا۔

"اگر اپنے ہاتھ پیر سے پیار ہے تو بتائے گا۔ میرے سوال کا جواب دے۔ حویلی میں کتنی عورتیں ہیں۔"

"بہت ہیں گنتی یاد نہیں ہے۔" وہ لاپرواہی سے بولا۔

"تیرا دماغ بہت اوپر ہے۔ نیچے لانا پڑے گا۔" رولوکا نے ایک آنکھ کا اشارہ کیا تھا کہ اس کے گال پر ایک بہت بھاری ہاتھ پڑا اور اس کی آنکھوں کے سامنے تاروں کی بارات آ گئی۔ چکرا کر گر پڑا مگر ہوش میں رہا رولوکا نے کہا۔ "بات کچھ سمجھ میں آ گئی تو جوتے کا بھوت ہے باتوں سے نہیں مانے گا۔"

وہ جلدی سے بولا۔ "ہاں بتاتا ہوں مارنا نہیں۔ پندرہ چھوریاں ہیں۔ سب حویلی میں الگ الگ رہتی ہیں۔" منشی بولا۔

"ان سب کو باہر لے آ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ میں۔" رولوکا نے کہا۔

منشی مشینی انداز میں اندر دوڑ گیا اور رولوکا پھر دروازے سے باہر آ گیا۔ باہر سب اپنی اپنی جگہوں پر اسی طرح موجود تھے جیسے وہ چھوڑ گیا تھا۔ رولوکا میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

چند منٹ گزرے تھے کہ دروازے سے عورتیں آنا شروع ہو گئیں۔ پندرہ تو جوان عورتیں تھیں اور چار کچھ زیادہ عمر کی تھیں۔ منشی نے بتایا یہ خدمت گار عورتیں ہیں۔ وہ سب لائن میں کھڑی تھیں۔ رولوکا ہرنام سنگھ کے قریب گیا اور پوچھا۔ "یہ عورتیں کون ہیں۔" ٹھاکر ہرنام سنگھ خاموش رہا۔

رولوکا نے ایک زور کا تھپڑ اس کے گال پر مارا۔ ہرنام اپنی جگہ کھڑا رہا مگر اس کا چہرہ اپنی بے عزتی اور تھپڑ کی تکلیف سے بگڑ گیا۔ کانوں تک چہرہ سرخ ہو گیا مٹھیاں بند ہونے اور کھلنے لگیں اور اس نے پیروں پر پوری طاقت لگا دی مگر خود کو ہلا تک نہ سکا۔ اس کی حرکات و سکنات کو رولوکا دیکھ رہا تھا اس کے دلی جذبات کو سمجھ رہا تھا وہ اس کے آدمیوں کے سامنے اس کی عزت دو کوڑی کی کر رہا تھا وہ اس کو احساس دلا رہا تھا کہ انسان کی بے عزتی جب ہوتی ہے تو وہ کیسا محسوس کرتا ہے۔ آج تک ہرنام سنگھ سب کی بے عزتی کرتا آیا تھا اس کو پتہ نہیں تھا کہ ہر شخص کی عزت نفس ہوتی ہے وہ غریب ہو امیر ہو کوئی ہو۔ وہ گالی کھا کر اگر خاموش رہتا ہے تو یہ اس کی مجبوری ہوتی ہے مگر دل میں تو گالی کا جواب گالی سے ضرور دیتا ہے، جس طرح اس وقت ٹھاکر ہرنام سنگھ رولوکا کو دل میں گالیاں دے رہا تھا۔

"تو نے بتایا نہیں یہ عورتیں کون ہیں تیری مائیں ہیں، بہنیں ہیں، بیویاں ہیں، کون ہیں۔" رولوکا نے پوچھا۔ ٹھاکر خاموش تھا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

رولوکا جمیل کے قریب آیا اور اس سے پوچھا۔ "تم اپنی بہن کو پہچانتے ہو۔"

"میں نے اس کو اس وقت دیکھا تھا جب زیادہ ہوشیار نہیں ہوا تھا۔ اب وہ کیسی ہوگی میں نہیں پہچان سکتا۔" جمیل نے جواب دیا۔

"خیر کوئی بات نہیں میں پتہ کرتا ہوں۔" رولوکا نے کہا اور عورتوں کے قریب چلا گیا۔ "تم میں سے گھومتی کون ہے، جو پہلے ٹھاکر ہری سنگھ کے پاس تھی۔" رولوکا نے کہا۔

ہری ساڑھی میں ایک جوان عورت آگے بڑھی اور بولی۔ "میرا نام گھومتی ہے۔"

رولوکا نے جمیل کو اشارہ کیا۔ جمیل اس کے پاس کھڑا ہو گیا تو رولوکا نے کہا۔ "گھومتی یہ تیرا اکلوتا بھائی ہے واس دیو۔ تو نے پہچان لیا۔"

گومتی نے چند منٹ غور سے جمیل کو دیکھا اور "میرا بھیا" کہہ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ دونوں کی آنکھوں سے نہ جانے کب کا رکا آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا۔ ان کی زبانیں مارے جذبات کے بند ہو گئیں۔ ہم سب کے لئے یہ منظر بڑا اثر انگیز تھا۔ سب عورتیں بھی خاموش تھیں وہ بھی اپنوں کو یاد کر رہی تھیں۔ کچھ دیر تک آنسوؤں کی بارش ہوتی رہی جذبات میں ذرا ٹھہراؤ آ گیا تو رولوکا نے ہرنام کو کہا۔

"تو نے دیکھا، ظالم انسان۔ یہ دونوں کتنے بے

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

چین تھے۔ تو نے ان کے ماں باپ کو ان سے چھین لیا ان دونوں کو جدا کر دیا یہ عورتیں جو کھڑی ہیں ان سب کی ایسی ہی کہانی ہے تو نے اپنے عیش کی خاطر کیا کیا ظلم غریبوں پر ڈھائے ہیں تجھے اس کا احساس نہیں ہے۔ مگر میں تجھے یہ احساس ضرور کراؤں گا۔" پھر منشی کو رولوکا نے اپنے پاس بلایا اور کہا۔ "تجھے سب پتہ ہے کہ یہ عورتیں کہاں کہاں سے لائی گئی ہیں تو ان عورتوں کو ان کے گھر پہنچا کر آئے گا۔ میں یہاں پر ہوں تو یہ کام ابھی سے شروع کر دے۔ سب اپنے اپنے گھر چلی جائیں گی میں تب جاؤں گا۔"

منشی ایک تھپڑ کا غلام تھا۔ تیزی سے کام میں لگ گیا۔ شام ہوئی اور پھر رات ہوگئی۔ میں، جمیل، کوچوان اور گھومتی ایک کمرے میں چلے گئے۔ کسی نے کچھ نہیں کھایا۔ گھومتی نے کھانا لانے کو کہا بھی مگر میں نے انکار کر دیا۔ رولوکا اسی جگہ کھڑا رہا۔ ٹھاکر اور اس کے آدمی بھی پتھر کے بت بنے رہے۔ نہ کوئی بولتا تھا نہ جنبش کرتا تھا۔ صرف ٹھاکر کی آواز نکلتی تھی۔ وہ اتنی باریک اور ہلکی ہوتی تھی کہ اس کو خود اس پر شرم آتی تھی۔ ساری رات منشی تانگہ دوڑاتا رہا۔ ملازمائیں بھی چلی گئیں اب صرف وہی لوگ تھے جو دروازے کے باہر موجود تھے اور ان کو باندھا ہوا تھا۔ صبح ہوگئی منشی نے کہا۔

"سب کو ان کے گھروں پر پہنچا دیا ہے سرکار۔"

"ان کے علاوہ بھی کوئی اور ہیں وہ بھی بتا دے۔" رولوکا نے کہا۔

"سرکار وہ تو کرائے پر آتی ہیں اپنا کام ختم کر کے چلی جاتی ہیں۔" منشی نے جواب دیا۔

"تیرے علاوہ کتنے لوگ ہیں جو اس کی عیاشی کا بندوبست کرتے ہیں۔" رولوکا نے پوچھا۔

"سب ہی موجود ہیں ایک دو دور سے مال لے کر آتے ہیں۔ رقم لے کر چلے جاتے ہیں ملازم نہیں ہیں۔"

"تو جو بات کر رہا ہے وہ سب سچ کر رہا ہے۔" رولوکا نے پوچھا۔

"حضور میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ بال بچے دار آدمی ہوں۔ ایک تھپڑ کے ہی لائق تھا۔ دوسرا برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ مجھے معاف کر دو میں اب یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں گا۔ ٹھاکر کی نوکری نہیں کروں گا جتنا دیکھ لیا ہے وہ بہت ہے۔" منشی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"تو کہیں نہیں جائے گا۔ ہاں یہ سب ضرور جائیں گے۔" اور رولوکا نے اشارے سے سب آدمیوں کو اپنے پاس بلایا وہ سب دوڑ کر اس کے قریب آگئے اور حیران رہ گئے کہ رولوکا کے بلانے پر وہ چلنے کے قابل ہوگئے۔ رولوکا نے ان سب کو جو کہ تعداد میں گیارہ تھے مخاطب کر کے کہا۔

"تم سب ابھی اور اسی وقت اس جاگیر سے دور چلے جاؤ اور پھر کبھی ادھر مت آنا۔ آؤ گے تو پچھتاؤ گے۔ کوئی سوال مت کرنا اپنا سامان مال مویشی سب لے جاؤ۔ اس کی تم کو اجازت ہے جاؤ۔"

وہ سب اس طرح بھاگے جیسے ان کے پیچھے شیر آ رہا ہو۔ اب صرف منشی اور ہرنام سنگھ ٹھاکر رہ گئے تھے رولوکا نے کہا۔ "منشی تم اس بدبخت کے پاس ہی رہنا۔ اس کو بھی روٹی کھلانا اور خود بھی کھانا کیونکہ یہ اب خود سے روٹی بھی نہیں کھا سکے گا۔" رولوکا نے کہا۔

ہرنام سنگھ ٹھاکر نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا۔

"اتنی بڑی سزا نہ دو مجھے معاف کر دو میں آئندہ انسان بن کر رہوں گا۔" رولوکا نے منشی سے پوچھا۔ "تو کیا کہتا ہے یہ انسان بن جائے گا۔"

"سرکار میں بھی تو اس جیسا ہی تھا ایک تھپڑ نے مجھے انسان بنا دیا اس کو تو پھر لمبی سزا ملی ہے۔"

"تم دونوں اپنی اصلی حالت سے رہو گے مگر کسی ناری پر غلط نگاہ مت ڈالنا اگر ڈالو گے تو میں پھر آ جاؤں گا انسانوں کی خدمت کرنا اپنی طاقت کا غلط استعمال مت کرنا۔"

❁.....❁.....❁

کچھ لوگ پیدائشی لاپرواہوتے ہیں مگر کتنے بھی لاپروا ہوں، اپنے آپ سے کتنے ہی بے نیاز ہوں، اپنے اور دوسروں کے لئے ان کا سوچنے کا انداز کچھ بھی ہو مگر ہیں تو

انسان ہی انسانی ضروریات سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اس سے ان کی دل شکنی اور فطری طلب دونوں برقرار رہتی ہیں اور جو صفات قدرت نے انسان کو دی ہیں وہ ان کا استعمال بھی کرتا ہے ان میں حسن و دلکشی سے پسندیدگی بھی شامل ہے کسی بھی حسین شخصیت کی قربت کا احساس بھی اس میں شامل ہے اس کا کسی حسین چہرے سے متاثر ہونا بھی شامل ہے۔

باقر علی نواب کی اولاد تھا نواب جعفر علی ان کا نام تھا اور ان کی بہت بڑی جاگیر امروہہ سے دس میل تھی۔ نواب جعفر خود کو نواب واجد علی کا رشتہ دار بھائی کہا کرتے تھے اور یہ جاگیر بھی نواب واجد کی بخشی ہوئی تھی مگر نواب جعفر میں وہ خصوصیات نہیں تھیں جس کے لئے نواب واجد علی مشہور تھے۔

مگر ان کا بیٹا نواب باقر علی باپ سے بہت آگے تھا۔ حویلی میں باندیوں کے درمیان پل کر نوجوان ہوا۔ نواب کے محلوں میں باندیاں بھی دیکھ بھال کر رکھی جاتی ہیں اس لئے کہ وہ صرف گھر کی صفائی ستھرائی کے لئے نہیں ہوتیں کسی بھی وقت نواب صاحب کو کوئی کام پڑ سکتا ہے۔ اس لئے ان کا نک سک سے درست ہونا بھی ضروری ہے۔ چھوٹے نواب کی خدمت پر بھی یہی مامور تھیں۔ رات سونے تک ان کا دل بہلانا، ان کو موسیقی سنانا، پیر دبانا، بدن دبانا، نواب باقر پندرہ سال کی عمر تک آتے آتے سارے منازل طے کر گئے۔ ان کو وہ ہنر از بر کر دیئے گئے جو عام آدمی اتنی جلدی نہیں سیکھتا۔ باندیاں سب ایک سے ایک کھائی کھیلی ان کی استاد تھیں پھر نواب کی خوشنودی اور مراعات حاصل کرنے کی ان میں دوڑ لگی ہوئی تھی۔ سب اپنے اپنے تجربات سے فائدہ اٹھا رہی تھیں اور نواب باقر علی ایک ایسا کھلونا بنے ہوئے تھے جو چابی سے چلتا ہے ہر کوئی چابی بھرتا خوب دوڑاتا کھیلتا اور جب چابی ختم ہو جاتی۔ پھر دوسرا چابی بھرتا اور چلاتا رہتا۔

لاکھ بے فکری کی زندگی تھی نہ کمانے کی فکر تھی نہ دولت کا ٹھکانا تھا۔ باقر علی کو اتنی سمجھ نہیں تھی کہ اس کو اپنی صحت جوانی کے خرچ ہونے کا احساس ہوتا۔ وہ تو سمجھتا تھا کہ یہ عیش ہمیشہ رہے گا۔ نواب باقر علی جسمانی ساخت اور چہرے مہرے سے بے شک ٹھیک نظر آتے تھے مگر وہ جانتے تھے وہ کتنے ٹھیک ہیں۔

بڑے نواب جعفر علی کی خواہش تھی کہ اب نواب باقر علی کی شادی کر دی جائے۔ مگر یہ وہ نہ کر سکے اور ان کا بلاوا آ گیا۔ ان کے انتقال کے بعد جاگیر کی ساری ذمہ داری باقر علی پر آ گئی۔ باپ کی اچانک موت نے ماں کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ بیٹے کی شادی کر دی جائے۔ باپ بیٹے کا سہرہ نہ دیکھ سکا لیکن میں تو دیکھ لوں مگر بیٹا شادی کے نام سے چڑتا تھا ان کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ مردانے میں اب کسی بھی لونڈی باندی کا داخلہ بند ہے۔ مگر ان کو یہ بھی پتہ تھا کہ باندی پہلے نواب باقر علی کی خدمت میں آتی تھی۔ اب کیا ہوا۔ کیا بیٹا اتنا دین دار ہو گیا کہ عورتوں سے ہی منہ موڑ لیا یا کچھ اور..... ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی ایک دن ماں نے بیٹے کو طلب کر لیا۔ نواب باقر علی ماں کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

"بیٹا آپ نے دیکھا کہ بڑے نواب صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا۔ کیا میں یا آپ یہ گمان کر سکتے تھے۔" ماں نے پوچھا تو نواب نے جواب دیا۔ "میں کیا کوئی بھی ابا حضور کے متعلق ایسا نہیں سوچ سکتا تھا۔"

"بیٹا موت کا تذکرہ ہمیشہ باعث رنج ہوتا ہے۔ موت کسی کی ہو امیر کی ہو غریب کی ہو اپنے کی ہو پرائے کی ہو دکھ ہی پہنچاتی ہے میں آج ہوں کل نہ ہوں۔ تمہارے والد دل میں تمہارے سہرے کی حسرت لے کر چلے گئے۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ تم میری یہ آخری خواہش پوری کر دو۔" بڑی بیگم نے کہا۔ نواب باقر علی کچھ دیر خاموش گردن جھکائے رہے پھر بولے۔

"امی میں ابھی ذہنی طور پر شادی کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ ابا حضور کے انتقال کے بعد جاگیر کا سارا بوجھ ناتواں کاندھوں پر آ پڑا ہے ابھی تو میں اس کے داؤ پیچ سیکھ رہا ہوں میں معافی چاہتا ہوں۔"

"دیکھو بیٹا۔ عورت کا دل بھی قدرت نے خوب بنایا

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

ہے۔شادی کے بعد اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ماں کہلائے اور جب ماں بن جاتی ہے تو پھر اس کے دل میں یہ خواہش جنم لیتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کی اولاد کو کھلائے ہر انسان موت سے ڈرتا ہے میں بھی ڈرتی ہوں مگر یہ ضرور چاہتی ہوں تمہاری اولاد دیکھ لوں۔"

"مگر امی جان میرے لئے یہ بہت مشکل ہے میری مصروفیات مجھے بیوی کے ساتھ انصاف نہیں کرنے دیں گی۔" نواب نے جواب دیا۔

"مگر میں تمہاری مجرد زندگی نہیں دیکھ سکتی۔ میں خاندان کو آگے چلانا چاہتی ہوں۔ نواب مرحوم کی تم واحد اولاد نرینہ ہو اس خاندان کا نام صرف تم سے آگے چلے گا۔" بڑی بیگم نے کہا۔

"آپ کا فرمانا اپنی جگہ درست ہے مگر میں مجبور ہوں جلدی نہ کریں۔" باقر علی نے جواب دیا۔

"میں جلدی نہیں کرتی مگر تم بھی اتنی دیر نہ کرنا کہ میں اپنی حسرت لے کر چلی جاؤں۔" بڑی بیگم نے کہا۔

"اللہ آپ کا سایہ میرے سر پر رکھے یہ بات اپنی زبان پر نہ لائیں۔" نواب باقر نے کہا۔

"تو پھر جلدی فیصلہ کرلو تمہاری شادی کی یہی عمر ہے۔"

آدمی جو کرتا ہے اگر وہ اس کے اچھے برے نتائج پر غور کرلے، آتے وقت کے ورق کو پڑھ لے تو بہت سی پریشانیاں جن کو وہ خود بلاتا ہے اس سے بچ سکتا ہے۔ نواب کچھ تو نادانی اور کچھ اشیائے صرف کی آسان دستیابی نے اس کو اس منزل پر کھڑا کردیا تھا کہ وہ عورت کے قریب بھی جانے کا تصور نہیں کرسکتا تھا اور یہ سلسلہ اب آہستہ آہستہ جسمانی کے ساتھ ساتھ نفسیاتی بھی ہوگیا تھا۔

اس نے ماں سے جھوٹ بولا تھا وہ اپنی حالت بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔ جھوٹ تو ہمیشہ سہا ہوا رہتا ہے۔ وہ تذبذب میں گرفتار تھا۔ وہ ایک ایسے دوراہے پر کھڑا تھا جہاں سے ایک راستہ اس کی بدنامی اور رسوائی کی طرف جاتا تھا اور ایک ماں کی نافرمانی کی طرف جاتا تھا دونوں ہی اس کو ناپسند تھے مگر ان دو میں سے ایک کو ہی چننا بھی تھا۔

ہر دوسرے روز ماں کی طرف سے یاددہانی کروائی جاتی۔ وہ کیا کرے کیا نہ کرے اور اس نے ایک فیصلہ کرلیا۔ شادی کرنے کا فیصلہ۔ مگر ایک شرط کے ساتھ۔ وہ شرط یہ تھی کہ وہ کسی نواب یا جاگیردار کی لڑکی سے شادی نہیں کرے گا۔ کسی معمولی غریب لڑکی سے شادی کرے گا۔ اس سے اس نے یہ فائدہ حاصل کرنا چاہا کہ برابری کی لڑکی ہوگی تو وہ میرا راز افشا کردے گی۔ اگر غریب گھر کی ہوئی نیک اور شریف ہوئی تو شاید میرا پردہ رکھ لے اور عزت رہ جائے۔ اس نے اپنی شرط والدہ کو بتادی۔ پہلے تو وہ اس کی شرط سن کر حیران ہوئیں اور سختی سے منع کردیا کہ بھلا نواب ابن نواب کسی غریب ہاری کا داماد بنے گا۔ مگر بیٹے کی ضد کے آگے ان کو جھکنا پڑا کیونکہ ان کو ڈر تھا کہ پھر بیٹا شادی سے انکاری نہ ہوجائے۔

اب نواب باقر علی کو ایک غریب اور معصوم لڑکی کی تلاش ہوئی اور ان کی نگاہ ایک ہاری حکیم خان کی لڑکی پر پڑی حکیم خان ان کا بہت پرانا ہاری تھا۔ خاندان در خاندان نواب کی خدمت کرتا آرہا تھا۔ نواب مرحوم کے اس پر بڑے احسانات تھے۔ اس کی گردن بھی نواب جعفر اور نواب باقر کے سامنے نہیں اٹھتی تھی۔

ایک دن نواب باقر اس کے گھر گاؤں چلا گیا وہ بھی اکیلا۔ دروازے پر گھوڑا کھڑا کر کے آواز دی۔

حکیم خان باہر آیا تو ہکا بکا دیکھتا رہ گیا نواب صاحب بذات خود موجود تھے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ نواب باقر علی گھوڑے سے اتر آئے اور مسکرا کر کہا۔ "کیا بات ہے حکیم خان حیران کیوں ہو؟"

"حیرت کی بات ہے مجھے طلب کرلیا ہوتا آپ نے زحمت کیوں اٹھائی۔" حکیم خان نے گڑگڑا کر کہا۔

"کام ہمارا تھا تو ہم کو ہی آنا تھا تم کو کیوں بلاتے۔" نواب نے کہا۔

"میں حاضر ہوں حکم فرمائیں مگر پہلے آپ اندر

غریب کی کٹیا کو عزت بخش دیں۔" حکیم خان نے بڑی مشکل سے یہ کہا۔

"پہلے تم اپنی گھبراہٹ پر قابو کرو پریشانی کی بات نہیں ہے۔" باقر نے اطمینان سے کہا۔

"آیئے اندر آیئے۔" اندر کمرے میں ایک کھاٹ پڑی تھی اس نے اس پر جلدی سے دری اور ایک صاف چادر بچھادی اور بولا۔ "یہ آپ کی شان کے مطابق نہیں ہے۔"

"اب بس کرو حکیم خان مانا کہ تم اہل زبان ہو مگر مجھے شرمندہ نہ کرو۔" نواب نے جواب دیا۔

"میری مجال ہے کہ آپ کو شرمندہ کرنے کی کوشش کروں۔ پشت ہا پشت سے آپ کا نمک کھا رہا ہوں۔ ایسی جسارت کس طرح کرسکتا ہوں۔" حکیم خان نے کہا۔

"اور اس گھمنڈ میں ہم آئے ہیں کہ تم ہمیں ناامید نہیں کروگے۔" نواب نے کہا۔

"سب کچھ آپ کا ہی ہے سرکار۔ میرے پاس جو ہے وہ آپ کا ہے آپ حکم کریں۔" حکیم خان بولے۔

"والدہ کی خواہش ہے کہ ہم شادی کرلیں۔" حکیم خان نے کہا۔

"بہت نیک خواہش ہے بیگم صاحبہ کی۔" حکیم خان نے جواب دیا۔

"مگر میں کسی جاگیردار امیر زادی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔" نواب نے کہا۔

"یہ آپ نے کیا فرمادیا۔ رشتے تو برابری والوں سے ہی پائیدار ہوتے ہیں۔" حکیم خان بولے۔

"میرے خیالات دوسرے ہیں۔ حکیم خان میں کسی غریب کی لڑکی کو اپنی بیوی بنانا چاہتا ہوں۔" نواب نے جواب دیا۔

"محل میں ٹاٹ کا پیوند کچھ اچھا نہیں لگے گا سرکار۔" حکیم خان بولے۔

"میں اس ٹاٹ کو بھی مخمل بنالوں گا۔" نواب باقر نے کہا۔

"میں آپ کو کیا بتاؤں بس یہ سمجھ لیں کہ جس غریب کی لڑکی آپ پسند کریں گے وہ اپنی قسمت پر رشک کرے گا کیونکہ اس رشتے سے اس کی تو عزت ہی بڑھے گی۔ مگر آپ کو کیا ملے گا شاید آپ بعد میں پچھتائیں بھی لوگوں کی تنقید کا نشانہ بھی بننا پڑے۔ اس لئے صرف یہی کہوں گا کہ ایک بار پھر اپنے فیصلے پر غور کرلیں۔" حکیم نے کہا۔

"میں تمام پہلوؤں پر خوب غور کر کے تمہارے پاس آیا ہوں اور اس لئے آیا ہوں کہ تمہاری لڑکی سے عقد کرنا چاہتا ہوں بولو تم کو منظور ہے۔" نواب نے اپنا فیصلہ سنادیا۔

حکیم خان یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ آج کتنا اچھا دن ہے کہ لڑکی کا رشتہ آیا اور رشتہ بھی ایسا کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ گم صم بیٹھا رہ گیا کوئی جواب نہ دے سکا۔

"تم نے جواب نہیں دیا حکیم خان۔" نواب نے پوچھا۔

"میری عقل گم ہے کیا جواب دوں آپ مجھ غریب سے مذاق کررہے ہیں۔" حکیم خان نے بڑی مشکل سے کہا۔

"آپ میرے بزرگ ہیں میں مذاق کروں یہ سوچ بھی نہیں سکتا میں سنجیدہ ہوں آپ کو اختیار ہے کہ آپ اگر مجھے پسند نہیں کرتے تو منع کردیں میں برا نہیں مانوں گا۔" نواب نے کہا۔

"منع کس برتے پر کروں گا۔ میں کیا میری اوقات کیا۔ پشت ہا پشت سے آپ کا دیا کھا رہا ہوں اب میرا نصیب کھلا ہے کہ آپ نے کچھ طلب کیا ہے ورنہ ہمیشہ تو دیا ہی ہے۔ منع کیوں کر کروں گا ایک کیا جتنی بھی بیٹیاں ہوتیں میں نذر کردیتا آپ کی امانت ہے جب دل کرے دو بول پڑھا کر لے جائیں۔"

بڑی بیگم نے جب یہ سنا کہ نواب باقر علی ایک ہاری حکیم خان کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو ایک دم ناراض ہوگئیں۔

"آخر تم نے یہ کیسے سوچا۔ ایک گھورے کی اینٹ کو چوبارے میں فٹ کروگے۔ تم ایک بڑے جاگیردار ہو کیا تمہارے برابر کوئی نہیں ہے کہ ایک ہاری کی لڑکی کو اس حویلی کی دلہن بناؤ گے میری زندگی میں یہ ہرگز نہیں ہوگا کان کھول

READING CORNER http://readingcornerpk.blogspot.com/

کرسن لو۔"

"تو پھر آپ بھی میری بات سن لیں۔ میں شادی کروں گا ہی نہیں۔" نواب نے کہا۔

"میری بات کو غور سے سنو۔" بیگم بولیں۔

"اس حویلی میں اعلیٰ خاندان کی بہوئیں آتی رہی ہیں۔ میرے والد نواب تھے۔ تمہارے والد نواب تھے ان کے والد بھی نواب تھے۔ اس پشت ہا پشت کے نوابی خاندان میں تم داغ کیوں لگانا چاہتے ہو۔ مجھ سے کہو میں ایک سے ایک حسین اور خاندانی لڑکی تمہارے لئے تلاش کر سکتی ہوں۔ ذرا سوچو میرے اور تمہارے والد کے سب ہی لوگ نواب جاگیردار ہیں ان کی رشتہ داریاں بھی ایسوں میں ہی ہیں تم ایک ہاری کے داماد بن کر کیا فخر کر سکو گے۔ اپنی سسرال کسی کو لے جا سکو گے تم نکو بن جاؤ گے کسی کے پاس اٹھنے بیٹھنے کے قابل نہیں رہو گے تمہارے منہ پر نہ کہیں مگر پیٹھ مڑتے ہی تم کو برا کہیں گے آخر اس لڑکی میں کیا خاص بات ہے کہ تم اس سے ہی شادی کرنا چاہتے ہو مجھے یہ بتاؤ۔" بیگم نے کہا۔

"اس لڑکی میں کوئی بات نہیں۔ میں نے اس کو صرف ایک بار دیکھا ہے۔" نواب نے جواب دیا۔

"پھر اس قدر اس پر مرمٹنے کی کیا بات ہو گئی ہے۔" بیگم نے پوچھا۔

"اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے میں اس پر مرمٹا بھی نہیں ہوں۔ میں نے اس سے عشق بھی نہیں کیا اب تک میں نے اس کی آواز بھی نہیں سنی اور نہ اس نے میری آواز سنی۔" باقر علی نے جواب دیا۔

"پھر تو یہ اور بھی زیادہ تعجب کی بات ہے۔ کوئی تو خاص بات اس میں ہو گی۔" بیگم نے کہا۔

"اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں خاص بات نہیں ہے۔" باقر علی نے کہا۔

"پتہ نہیں کس زبان میں گفتگو کر رہے ہو۔ میری تو سمجھ میں نہیں آیا۔" بیگم جھنجلا کر بولیں۔

"امی آپ عورت ہیں آپ کو کسی بھی عورت میں خاص چیز نظر نہیں آئے گی میری نظر اور آپ کی نظر میں بہت فرق ہے۔ ایک عورت دوسری عورت کے سامنے ذرا پراسرار بن جائے یا بنا دی جائے تو دوسری عورت کا سکون برباد ہو جاتا ہے۔ وہ پہلی عورت کے اسرار جاننے کے لئے بے چین ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات تو وہ اتنی بے چین ہو جاتی ہے کہ کھانا پینا سونا تک چھوڑ دیتی ہے اور آخر راز جان کر رہتی ہے۔ اور پھر راز جاننے کے بعد اس کے پیٹ میں وہ راز رہتا نہیں وہ جب تک کسی کے سامنے اس راز کو فاش نہیں کر لیتی اس کے پیٹ میں درد رہتا ہے۔" نواب نے ہنس کر کہا۔

"تم مجھ پر طنز کر رہے ہو۔" بیگم ناراضگی سے بولیں۔

"میری یہ جسارت کس طرح ہو سکتی ہے۔ میں ایک عام عورت کی فطرت بیان کر رہا تھا۔" نواب نے جواب دیا۔

"اور میری فطرت یہ بھی ہے کہ میں تم کو اس کی اجازت نہ دوں خاندان کے نام کو بٹہ نہ لگنے دوں۔ تم بے شک پوری جاگیر کے وارث ہو۔ مالک ہو بہت بڑے جاگیردار ہو، ہزاروں لوگ تم کو سلام کرتے ہیں مگر یاد رکھو میں تمہاری ماں ہوں۔ میرا کہنا ماننا بھی تمہارا فرض ہے۔" بیگم نے کہا۔

"امی آپ کا کہا میرے لئے پتھر کی لکیر کی مانند ہے مگر کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا مشورہ اولاد اپنے ماں باپ سے نہیں کرتی۔ میں آپ کی کسی بات سے انحراف کرتا ہوں تو اس کو آپ میری مجبوری خیال کریں گستاخی نہ خیال کریں۔ اس طرح اگر آپ سوچیں گی تو شاید آپ کے دل میں میری بات کا وزن بڑھ جائے گا۔ اور مجھے آپ گستاخ اور بے ادب نہیں کہیں گی۔" نواب نے بڑے ادب سے سر جھکا کر کہا۔

بیگم نے ایک نظر نواب کو سر سے پیر تک غور سے دیکھا زبان سے کچھ نہیں کہا اور چلی گئیں۔

بیگم نے سب طرف دیکھا ان کا ایک ہی بیٹا تھا۔ وہ اس سے محبت بھی بہت کرتی تھیں۔ ہر عورت اپنی اولاد سے محبت کرتی ہے محبت میں پائے جانے کی ہی تمنا نہیں ہوتی وہ صرف چاہنے کے لئے ہوتی ہے۔ کچھ دینے کے لئے ہوتی

ہے وہ ماں تھیں ان کو ہی کچھ دینا تھا اپنی انا کی قربانی خاندان کی قربانی اگر وہ ایسا نہ کریں تو پھر کیا ہو گا۔ بیٹے کا گھر نہیں بسے گا جس خاندان کا نام وہ اونچا رکھنا چاہتی ہیں باقر کے بعد ختم ہو جائے گا کوئی نام لیوا نہیں ہوا تو یہ جاگیر اجڑ جائے گی نام مٹ جائے گا۔ "مجھے باقر کا گھر بسانا ہے اجاڑنا نہیں ہے مجھے اپنی محبت کا ثبوت دینا ہے وہ اگر ایک ہاری کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے تو بھی مجھے اس بات کو تسلیم کرنا ہے۔"

اور انہوں نے باقر علی کو کہا۔ "میں نے بہت غور کیا ہے تمہاری بات پر۔ تم نے میری بات پر غور کیا تھا۔"

"ہاں امی میں نے آپ کے فرمان پر خوب غور کیا مگر میں آپ سے متفق نہیں ہو سکتا۔" نواب نے جواب دیا۔

"بیٹا تم عقل مند بھی ہو اس کا ثبوت جاگیر کا انتظام ہے اور ذہین بھی ہو کہ تم نے اچھے الفاظ میں مجھ سے اختلاف بھی کر دیا۔ مگر یاد رکھو یہ ضروری نہیں کہ جو ذہین ہوں وہ غلطیاں نہ کرتے ہوں۔ سمندر میں اچھے تیراک بھی ڈوب جاتے ہیں۔ میری بات پر پھر غور کرو گے۔" بیگم نے پوچھا۔

"اب عمل کا وقت آ رہا ہے۔ جو سوچنا تھا غور کرنا تھا وہ وقت ختم ہوا۔" نواب نے کہا۔

"اتنی جلدی عمل کا وقت آ گیا۔" بیگم نے کہا۔

"جی ہاں یہ بھی آپ کے فرمان کے مطابق ہوا ہے۔" نواب نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تیاری کر لو میں تمہاری رضا کے ساتھ ہوں۔" بیگم نے کہا۔

"مجھے پتہ تھا امی آپ ضرور راضی ہو جائیں گی ایک وعدہ آپ کو اور کرنا ہو گا۔" نواب نے کہا۔

"شرطیں منواؤ گے مجھ سے۔" بیگم نے کہا۔

"نہیں درخواست ہے۔" نواب نے جواب دیا۔

"میں تمہارے بغیر بتائے بھی درخواست قبول کرتی ہوں۔" بیگم نے جواب دیا۔

"پہلے آپ سن لیں میری درخواست تو آپ میرے بغیر بتائے بھی مان رہی ہیں مگر وہ لڑکی آپ کی نہیں ہو گی وہ ایک غریب گھر سے آئے گی ہو سکتا ہے آپ کے معیار پر پوری نہ اترے وہ حویلی کے طور طریقوں کو نہیں جانتی۔ غلطیاں بھی ہوں گی اس کے عادت و اطوار بھی حویلی والوں جیسے نہ ہوں گے اس کے باوجود اس کو آپ گوارہ کریں گی اور یہ کہ آپ اس کو اپنی بہو جانیں گی یہ بھول جائیں گی کہ وہ کس کی بیٹی ہے کہاں سے آئی ہے۔"

نواب نے بات ختم کی تو بیگم نے ایک لمبی ہوں کی اور بولیں۔ "مجھے یہ سب منظور ہے۔" اور پھر ایک دن رضیہ بنت حکیم خان نواب باقر علی کی دلہن بن کر حویلی میں آ گئی۔ یہ ایک انہونی تھی جس کو پوری جاگیر نے حیرت سے دیکھا۔ ہر ایک نے اپنا اپنا خیال ظاہر کیا مگر اصلیت کیا تھی اور آگے کیا ہونے والا تھا اس کا پتہ صرف نواب باقر کو تھا۔ شادی کی خوشی میں تمام ہاریوں اور دور دور کے گاؤں والوں کو کھانا کھلایا گیا بہت کچھ بانٹا گیا بہت کچھ معاف کیا گیا۔ سب ہی نے نواب کے گن گائے، دعائیں دیتے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

اب زندگی کی وہ اہم رات آنے والی تھی جس رات کے انتظار میں لڑکے سالوں سے رہتے ہیں۔ لڑکیاں اس رات کے خواب دیکھا کرتی ہیں۔ مگر نواب باقر علی کے ساتھ ایسا کچھ نہ تھا وہ دلہن کے پاس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ تیاری اس بات کی تھی کہ وہ کس طرح اس کو اپنی مجبوری بتائے گا۔ کس طرح خود کو اس کے سامنے مجبور ظاہر کرے گا اس کو کس طرح متاثر کرے گا اور آخر اس کو دلہن کے کمرے میں جانا تو تھا۔

پہلی رات کی دلہن روایتی انداز میں پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ گھونگٹ میں چھپا ہوا تھا۔ اس کو دیکھ کر باقر علی کو بڑا رحم آیا خود کو دنیا کا بہت بڑا ظالم آدمی اس نے محسوس کیا۔ باقر علی کو اپنی رنگین راتیں یاد نہیں تھیں مگر موجودہ پریشانی اس کے سر پر ضرور سوار تھی۔ اس کی حالت قابل رحم اور عبرت ناک تھی۔ چہرہ فق تھا اس رات کے انتظار میں دولہا پر جو کیف و سرور کی کیفیت ہوتی ہے اس کی جگہ ذہنی کوفت اور روحانی تکلیف تھی۔ وہ ایک ذہنی عذاب میں مبتلا تھا۔ ایک معصوم لڑکی کے ڈر سے اس کا برا حال تھا۔ اس کا بس چلتا تو

READING CORNER
http://readingcornerkb.blogspot.com/

شاید وہ اس کا سامنا ہی نہ کرتا مگر اس سے اب کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا اب تو سامنا کرنا ہی تھا۔

وہ اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ دلہن گٹھری بنی بیٹھی رہی۔ وہ بھی کھڑا تھا۔ اس کی ہمت اس کو ہاتھ لگانے کی نہیں ہو رہی تھی جیسے وہ کانچ کی گڑیا تھی۔ جیسے وہ بجلی کا ننگا تار تھی وہ کھڑا رہا کافی دیر گزر گئی۔ گٹھری میں سے ایک باریک متلجیانہ سی آواز آئی۔ ''بیٹھ جائیں تھک جائیں گے۔''

یہ جملہ بڑے معصوم خلوص کے ساتھ ادا کیا گیا تھا۔ مگر نواب باقر کے دل پر توپ کے گولے کی مانند لگا۔ ایک سسکاری اس کے منہ سے نکل آ کر رہ گئی۔ وہ ممنونیت آمیز لہجے میں بولا۔ ''آپ یہ گھونگھٹ تو اٹھا دیں کچھ ضروری بات کرنی ہے۔''

''یہ تو آپ کا کام ہے۔'' باریک سی آواز آئی۔

''میں بہت گناہ گار پلید آدمی ہوں۔ کسی پاک چیز کو کیسے ہاتھ لگاؤں۔'' احساس ندامت اس کی آواز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

''میں تو آپ کی ہوں۔'' باریک آواز آئی۔

''دنیا کی نظر میں تم میری بیوی ہو میری شریک حیات ہو۔ میرے دکھ سکھ میں ساتھی ہو مگر یہ پردہ تم خود اٹھا دو میں تم سے ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں خود ہٹائے دیتی ہوں۔'' اور دلہن نے گھونگٹ اٹھا دیا۔ گھونگٹ کے اندر ایک چاند تھا۔ جو بدلیوں سے باہر آ گیا تھا نواب نے اس کو ایک دفعہ سرسری نظر سے دیکھا مگر یہ تو حسن کا بہتا دریا تھا۔

اس کا احساس ندامت اور بڑھ گیا۔ احساس جرم میں اور اضافہ ہو گیا۔ ''آپ کچھ کہنا چاہ رہے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مگر کہاں سے شروع کروں یہ سوچ رہا ہوں۔'' نواب نے کہا۔

''کہنا شروع کر دیں، سوچ کیا رہے ہیں۔'' دلہن نے پھر کہا۔

''یہ کہانی دس سال پہلے شروع ہوئی تھی۔ ایک پندرہ سال کا تناور بنتا ہوا درخت ایک دلدل میں گر گیا تھا اس دلدل میں بڑی رنگین مٹی تھی بھانت بھانت کی خوشبوئیں اس مٹی میں تھیں وہ مٹی درخت میں لپٹ گئی وہ بھی اس میں پڑا رہا اور پھر ایک وقت آیا کہ وہ درخت جڑ سے چوٹی تک سوکھ گیا کوئی زندگی کی رمق اس میں نہیں تھی۔ میری کہانی زیادہ الجھی ہوئی نہیں ہے میں زندگی کی بھول بھلیوں میں خود ہی الجھ گیا ہوں اس میں کسی کا قصور نہیں ہے مجھے کسی نے لوٹا نہیں ہے میں کسی کو قصوروار نہیں کہتا اگر کوئی قصوروار ہے تو وہ اس حویلی کا ماحول ہے جہاں ہر کام کے لئے نوجوان باندیاں ہاتھ باندھ کر کھڑی رہتی ہیں ان کھاگ اور مزاج شناس باندیوں میں مجھ جیسا پندرہ سالہ لڑکا کیا کرتا۔ ہاں میں تمہارا مجرم ضرور ہوں تم یہ کہہ سکتی ہو کہ میں نے شادی کیوں کی۔ تمہارا یہ سوال جائز بھی ہے اور فطری بھی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا میں نے ہر طرح سے اس موضوع کو ٹالنا چاہا۔ مگر میری ایک ماں بھی ہے اس کے کچھ ارمان بھی ہیں وہ خاندانی نام کو آگے بھی بڑھانا چاہتی ہے۔ مگر جس کشتی میں وہ آگے جانا چاہتی ہے وہ تو پوری کی پوری دیمک زدہ ہے مگر اس کو یہ بات کون بتائے۔ وہ اپنے معیار کے مطابق دلہن لانا چاہتی تھی اس کے بعد کیا ہوتا۔ خاندانی نام برسوں سے بنی ہوئی عزت دھول ہو جاتی وہ رئیس زادی وہ نازوں کی پلی زمین آسمان ایک کر دیتی اور نواب باقر علی منہ چھپائے روپوش ہوتے یا کسی کنوئیں سے ان کی لاش برآمد ہوتی۔ یہ تھے وہ حالات جو مجھے تمہارے گھر تک لے گئے۔ میں نے سچ بولنے کا عہد کیا ہے میں دس سال جھوٹ میں گزار کر اب سچ کی طرف پلٹا ہوں۔ میں اپنے مطلب سے تمہارے گھر تک گیا تھا۔ میں نے تم کو دیکھا نہیں تھا تم جیسی بھی تھیں مجھے اس سے غرض نہیں تھی مجھے تو ایک لباس چاہئے تھا جس کو پہن کر میں اپنی ماں کے اور سب لوگوں کے سامنے جا سکوں تم چونکہ میرے ہاری کی بیٹی ہو اس لئے تمہارے منہ میں اپنی زبان ڈال سکوں۔ مگر تم کو دیکھ کر میرا ضمیر مجبور کر رہا ہے کہ سب کچھ سچ سچ بتا دوں اور میں نے تم کو پوری کہانی اور اپنا ارادہ بتا دیا۔

میں ایک سوکھا درخت ہوں تم چاہو تو صبح اعلان کر دو دنیا کو بتا دو اس کی فکر نہ کرو کہ میرا کیا ہوگا میں نے تمہارے ساتھ دھوکا کیا ہے تم کو بھی یہ حق ہے کہ تم اس کا بدلہ لو۔'' نواب خاموش ہو گیا۔

دلہن گردن جھکائے اپنی تقدیر کا فیصلہ سن رہی تھی۔ اس کے خواب چکنا چور ہو چکے تھے جذبات پر برف پڑ چکی تھی ساری امنگیں آرزوئیں دم توڑ چکی تھیں۔ مگر وہ خاموش تھی۔

نواب باقر علی کی تو کہانی ختم ہو گئی آگے کیا بیان کرتا اس لئے خاموش تھا اور دلہن رضیہ سلطانہ کی دنیا میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں کھڑی تھی ہر طرف گھپ اندھیرا کوئی راستہ نہ تھا حکیم خان کی طرف وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ باپ نے تو وداع کر ہی دیا پھر وہ میرا گھر کہاں رہا۔ یہی گھر اب میرا ہے میرا شوہر تو ہے چاہے نام کا ہے دنیا میں ہر چیز تو نہیں ملتی کہیں نا کہیں کچھ نہ کچھ کمی تو رہتی ہے مجھے اگر ایک چیز نہ ملی تو کیا ہوا وہ ایک فیصلے پر پہنچ گئی اس نے پہلی بھرپور نظر نواب باقر پر ڈالی اور بولی۔

''آپ نے مجھے بیوی تسلیم کر لیا ہے۔''

''ہاں دل سے میں تمہیں بیوی تسلیم کرتا ہوں۔'' نواب نے کہا۔

''میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں مگر میں نے کہیں پر پڑھا ہے کہ جسموں کی تسکین عارضی چیز ہے۔ اصل تسکین روحانی ہوتی ہے اور روحانی تسکین جذبوں میں ہوتی ہے میں جسمانی تسکین کو ترک کرتی ہوں مگر دل سے آپ کو اپنا شوہر جانتی ہوں۔ آپ کا راز میرے سینے میں آج دفن ہو گیا مرتے دم تک زبان پر نہیں آئے گا۔''

نواب کی آنکھیں بھیگ گئیں اور اس نے اپنا منہ دلہن کی گود میں ڈال دیا۔ جذبات کی آندھیاں رک چکی تھیں۔ بادل البتہ بھرے ہوئے تھے بہت دیر تک بارش ہوتی رہی اور پھر صبح ہو گئی۔

ولیمہ کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور لوگ پلاؤ کھا کر چلے گئے۔ نواب باقر بیوی کے اشارے کے منتظر رہتے۔ اس کا کہا پتھر کی لکیر تھا۔ بڑی بیگم کا حکم حویلی پر چلتا تھا مگر نواب باقر پر رضیہ سلطانہ کی حکومت تھی۔

ایک سال گزر گیا۔ بڑی بیگم کو خوش خبری سننے کی جلدی تھی مگر ادھر خاموشی تھی کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ بڑی بیگم نے کچھ ہوشیار عمر رسیدہ عورتوں سے مشورہ کیا اور فیصلہ یہ ہوا کہ دلہن کو کسی کو دکھایا جائے۔ مگر اس پر نہ نواب باقر راضی ہوئے نہ دلہن راضی ہوئی۔ اس طرح وقت گزر گیا بڑی بیگم کی عمر کی پونجی ختم ہو رہی تھی۔ وہ جلد از جلد دادی بننا چاہتی تھیں مگر رضیہ سلطانہ ایک بے پھل درخت تھی ایک تو ان کے دل میں دلہن کے لئے پہلے ہی پھانس تھی دوسرے اس کا بے ثمر ہونا وہ خود پر قابو نہ رکھ سکیں اور ایک دن بیٹے سے بولیں۔

''تم نے اپنی ضد پوری کر لی۔ میری ناک نیچے کرا دی۔ مگر تم کو اس کا کیا فائدہ ہوا کوئی مالی یہ برداشت نہیں کرتا کہ اس کا لگایا ہوا پودا بے ثمر رہے وہ اس کو کاٹ ڈالتا ہے اور دوسرا پودا لگا دیتا ہے دو سال سے اوپر ہونے کو آئے ہیں۔ اب تک وارث کے انتظار میں بیٹھی ہوں تم کو اس کا کچھ خیال ہے۔''

نواب نے سکون کے ساتھ ماں کی بات سنی وہ جانتا تھا ایک نہ ایک دن یہ مقام آئے گا اس نے جواب بھی سوچ رکھا تھا بولا۔ ''امی جس طرح قدرت نے بہت سی باتیں بہت سے کام اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں اسی طرح اولاد دینا اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ انسان نہ بے وقت مر سکتا ہے نہ پیدا ہو سکتا ہے اس لئے ہم صرف انتظار کر سکتے ہیں جب اس کا حکم ہوگا تو اولاد ہو ہی جائے گی۔ اس کے لئے کیا فکر کریں۔''

''تم صرف یہ کہہ کر اپنی ذمہ داری سے بھاگ رہے ہو۔ اگر کوئی بیمار ہوتا ہے تو اس کا علاج بھی تو کراتے ہیں ہو سکتا ہے دلہن میں کچھ نقص ہو۔ اس کو ہوشیار معالج ٹھیک کر سکتا ہے۔ تم علاج کی اجازت تو دو۔'' بڑی بیگم نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

مگر نواب نے ان کے خیال کو نہ مانا۔ کیونکہ اصل حقیقت تو وہ وہی جانتا تھا۔ مگر بوڑھی بڑی بیگم کہاں ماننے والی تھیں وقت گزرتا جا رہا تھا ان کی بے چینی میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

دلی میں ان کی ایک بہن رہا کرتی تھیں وہ ان کے پاس آئی ہوئی تھیں۔ دونوں بہنوں میں سر جوڑ کر ایک خاص میٹنگ ہوئی اور ان کی بہن نے نواب باقر علی اور اس کی بیگم کی دعوت کردی اور دعوت بھی اپنے گھر دلی میں اور بڑی چالا کی سے وہ ان کو بمعہ اپنی بہن کے دلی لے آئیں۔ اصل بات کی ان کو بھنک تک نہیں لگنے دی۔ دلی بڑا شہر اور اس میں اس کے مرحوم شوہر کی بڑی حویلی، خاندانی رئیس ساری دلی کے بڑے لوگوں سے مراسم۔ نواب باقر کی دعوت کا اہتمام بھی بڑے پیمانے پر کیا گیا شہر کے تمام شرفا کو دعوت دی گئی اور اس دعوت میں مجھے بھی بلایا گیا۔ بڑی بیگم اور ان کی دلہن نے دعوت سے پہلے میرے پاس آ کر تمام حالات بیان کر دیئے اور اس دعوت کا اصل مقصد بھی بتا دیا۔ مجھے نواب باقر اور اس کی دلہن سے ملوانا تھا اور مجھے اپنے تجربے سے ہی کچھ اندازے کرنے تھے۔ کام بہت مشکل تھا کیونکہ کسی سے بھی سوال کرنے کی گنجائش نہیں تھی میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ میرے ساتھ میرے ایک دوست حکیم کامل بھی آئیں گے۔

یہ میری زندگی کا ایک انوکھا تجربہ تھا اور ایک بڑا چیلنج بھی تھا۔ اس لئے میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ آپ صدفی صد توقع نہ رکھیں کیونکہ میں نے اس طرح مرض کی تشخیص کبھی نہیں کی ہے۔ تقریباً رات آٹھ بجے تھے میں اور رولوکا ٹھیک وقت پر پہاڑ گنج حویلی پہنچ گئے۔ ایک بہت بڑی کشادہ جگہ پر دلی کے شرفا جمع تھے۔ دو دو چار کی ٹولیوں میں باتیں کر رہے تھے ملازمین ان کی خاطر مدارت میں مصروف تھے میں دلی کا آبائی باشندہ نہیں تھا مگر میرے پیشے کی وجہ سے بہت لوگ مجھے جانتے تھے۔ میں نے اور رولوکا نے سب سے ہاتھ ملایا۔ صاحب خانہ نے بڑے احترام سے ہم دونوں کو ایک بڑی میز پر بٹھا دیا اس میز پر صرف چار کرسیاں تھیں دو پر ہم دونوں بیٹھ گئے صرف چار کرسیاں لگانے کا مقصد میری سمجھ میں آ رہا تھا چند ہی منٹ کے بعد بڑی بیگم اور ان کی بہن آ گئیں۔ بڑی بیگم نے کہا۔ ”میں دونوں میاں بیوی کو لے کر آتی ہوں ان دو کرسیوں پر ان کو بٹھا کر میں چلی جاؤں گی ان کو آپ باتوں میں لگا ئیں ادھر کوئی نہیں آئے گا۔ جتنی دیر آپ چاہیں ان کو روک لیں۔ آپ کی قابلیت پر ہے۔“ اور دونوں چلی گئیں اور پھر ایک جوڑے کو لے کر آ گئیں۔ نواب باقر علی جوان آدمی تھے مگر کچھ مرجھائے بچوں کی مانند نظر آتے تھے۔ ان کی بیگم رضیہ سلطانہ ایک حسین عورت تھی۔ میں نے اور رولوکا نے بہت غور سے اسی کو دیکھا اور رولوکا کی تجربہ کار نگاہیں پرکھتی رہیں اور میں نے باتیں شروع کردیں۔ اپنے دلچسپ سفر بیان کرنا شروع کر دیئے۔ مطلب ان کو زیادہ سے زیادہ روکنا تھا ان کے مشاغل پوچھتا رہا۔ علاج معالجے کی کوئی بات درمیان میں نہیں آنے دی اور پھر رات نو بجے کھانے کا اہتمام ہوا اور وہ اٹھ کر چلے گئے۔ میں نے رولوکا کی طرف دیکھا رولوکا نے گردن ہلائی اور کھانا کھانے لگا اس کے بعد ہم نے کسی سے کوئی بات نہیں کی اور واپس چلے گئے۔

واپس آ کر میں نے رولوکا سے پوچھا۔ ”یہ نیا تجربہ کیسا رہا۔“

”پہلے آپ بتائیں۔“ رولوکا نے میرے کورٹ میں گیند پھینک دی۔

”ٹھیک ہے میں اپنا خیال بتائے دیتا ہوں۔ لڑکی کی چال ڈھال بیٹھنے اور پھر اٹھنے کا انداز اور جسم کی بناوٹ اس کو ایک شادی شدہ عورت ثابت نہیں کرتی۔ کنواری لڑکی اور شادی شدہ عورت میں جو فرق ہونا چاہئے وہ میں اس میں نہیں پاتا۔“ میں نے بات ختم کی تو رولوکا ہنس کر بولا۔

”آپ کی نظر واقعی بہت گہری ہے آپ نے بہت دور تک دیکھ لیا مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ اب رہے نواب باقر علی تو معاملہ صاف ہے خرابی تو کسی ایک میں ہی ہوگی بظاہر نواب تندرست نظر آتے ہیں مگر ان کا جوانی میں مرجھایا ہوا چہرہ بھی کچھ بیان کر رہا ہے کچھ اندرونی کرب کے آثار چہرے پر نمایاں ہیں۔ اس سے زیادہ اس وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا ان کے بارے میں کچھ کھوج کرنا ہوگی ان کی بیگم کے متعلق اور ان کی بابت کچھ معلومات جمع کرنا ہوں گی ان کی خلوت میں بھی جانا پڑے گا۔“ رولوکا نے کہا۔

”تو پھر بیگم کو کیا جواب دیا جائے۔“ میں نے

پوچھا۔

”کہہ دیں ایک ہفتہ کے بعد ہم خود ان کی جاگیر پر حاضر ہو جائیں گے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

میں نے بڑی بیگم کو بتا دیا کہ آپ کا کام ہو جائے گا ابھی ہم کچھ نہیں کہتے ہم خود ایک ہفتہ کے بعد ان کے دولت خانے پر آ جائیں گے اور وہیں پر بتائیں گے۔ بڑی بیگم کچھ ناامید ہوئیں وہ چٹ منگنی پٹ بیاہ کے چکر میں تھیں چلی گئیں۔ دو دن کے بعد سب لوگ بھی امروہہ چلے گئے۔ ان کے ساتھ ہی رولوکا بھی چلا گیا۔ مگر کسی کو پتہ نہیں تھا کہ ان کے قافلے میں ایک کا اضافہ ہو گیا ہے۔ تین دن کے بعد رولوکا واپس آ گیا اور بولا۔ ”کام ہو گیا حکیم صاحب۔“

میں نے پوچھا۔ ”تفصیل بتاؤ تو پتہ چلے۔“

”نواب باقر علی خالی ڈھول ہیں وہ قابل علاج ہیں بیگم ٹھیک ہے۔ ان کی بیگم ایک غریب ہاری کی لڑکی ہے۔ نہایت نیک اور بے زبان اسی لئے نواب نے اس سے شادی کی ہے کہ وہ غریب خاموش رہے گی یہ بات کسی کو پتہ نہیں ہے۔ نواب کے ناکارہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بہت کم عمری سے وہ خرچ ہونا شروع ہو گئے تھے حویلی میں ایک سے ایک تجربہ کار اور گھاگ عورتیں تھیں۔ انہوں نے نواب کا آخر تک پیچھا کیا اور سب کچھ ختم ہو گیا۔ ان کا علاج ہو تو سکتا ہے اگر وہ کروائیں تو۔“ رولوکا نے بات ختم کی۔

”ٹھیک ہے پھر دونوں چلتے ہیں ان سے بات کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

اور ہم دونوں نواب باقر علی کی حویلی پہنچ گئے ہمارے حسب وعدہ پہنچنے پر بڑی بیگم بہت خوش ہو گئیں مگر نواب باقر دیکھ کر حیرت سے بولے۔ ”آپ لوگ کس طرح آ گئے حکیم صاحب۔“

”بات یہ ہے نواب صاحب کہ ہم سیلانی طرز کے حکیم ہیں۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے چلے جاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”بہت خوب مگر یہاں تو سب تندرست ہیں۔“ نواب نے جواب دیا۔

”مگر میرا تجربہ بتاتا ہے کہ سب تندرست نہیں ہیں کچھ مرض نظر آتے ہیں اور کچھ ہوتے ہیں مگر نظر نہیں آتے۔ ہم لوگ ان امراض کا بھی علاج کرتے ہیں جو نظر نہیں آتے۔“ میں نے کہا۔

”حیرت کی بات ہے حکیم صاحب۔“ نواب نے کہا۔

”حیرت کی تو ہے مگر پیشہ ورانہ انداز میں دیکھا جائے تو اتنی حیرت کی نہیں ہے جو چیز آپ کو حیران کرتی ہے وہ میرے لئے باعث حیرت نہیں ہے اسی طرح کچھ باتیں مجھے حیرت میں ڈال دیں گی مگر وہ آپ کے لئے معمولی بات ہوگی یہ سب اپنے اپنے شعبے کی مہارت کی وجہ سے ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”بے شک آپ نے درست فرمایا تو پھر میں یہ سمجھ لوں کہ یہاں پر کوئی نا کوئی بیمار ضرور ہے۔“ نواب نے کہا۔

”آپ نے درست نظریہ قائم کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر میں مریض کا نام بھی پتہ کروں گا۔“ نواب نے پوچھا۔

”میں بتاؤں گا تو آپ پریشان نہیں ہوں گے چونکیں گے نہیں وہ مریض آپ خود ہیں۔ آپ نے خود کو کچھ اس طرح برتا ہے کہ اندرونی طور پر متاثر ہو گئے ہیں۔ مگر آپ فکر نہ کریں ہر مرض کا علاج ہے آپ پھر وہی توانائی حاصل کریں گے اور صاحب اولاد ہو جائیں گے انشاءاللہ۔ مگر آپ وہ کریں گے وہ کھائیں گے جو میں آپ کو بتاؤں گا۔ اس علاج پر چھ ماہ سے ایک سال تک کا عرصہ لگ سکتا ہے جب تک میں نہ کہوں خود پر کنٹرول کرنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

نواب کے چہرے پر رونق آ گئی وہ حیرت سے بولا۔ ”مگر آپ کو میری کیفیت کا کس طرح پتہ چلا۔“

”دعوت کے دن میں نے آپ کو چیک کر لیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”مگر اس دن تو آپ نے مجھ سے نہ کچھ پوچھا نہ میرے جسم کو ہاتھ لگایا تھا۔“ وہ پھر بولا۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com

"یہ حکمت ہے نواب صاحب۔ اچھا طبیب شکل دیکھ کر بھی مرض پکڑ لیتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ واقعی اپنے فن کے ماہر آدمی ہیں۔" نواب نے کہا۔

"آپ کی عزت نوازی ہے اور پاک بے نیاز کا کرم ہے۔" میں نے کہا۔

اور نواب باقر علی کا علاج شروع ہو گیا۔ مگر آپ حیران ہوں گے کہ ہم نے بڑی بیگم کو یہ بتایا کہ بیگم باقر علی کا علاج ہو رہا ہے۔ دوائیں نواب کی ہوتی تھیں اور بتایا جاتا تھا بیگم کی ہیں۔ اس طرح بڑی بیگم خوش تھیں کہ ان کے اندازے درست تھے۔ خرابی بیٹے میں نہیں بیوی میں ہی تھی۔ میں دوائیں اور خوراک کا چارٹ بنا کر واپس دلی آ گیا تھا۔ رولوکا البتہ آتا جاتا رہتا تھا۔ دوائیں بھی وہی پوری کرتا تھا ان میں کچھ عجیب طرز کے پھل اور پھول تھے جو رولوکا ہی لا سکتا تھا۔ وہ دوائیں بہت تیزی سے اثر کر رہی تھیں۔

یہ علاج چھ ماہ تک چلتا رہا اور پھر رولوکا نے نواب کو پوری طرح تندرست قرار دے دیا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ کچھ ضروری باتیں بھی نواب باقر علی کے گوش گزار کر دیں اور پھر وقت آگے بڑھ گیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ نواب خود مٹھائی لے کر دلی آ گیا۔ اس کو وارث مل گیا تھا۔

"نواب باقر علی کی کہانی صرف اتنی سی تھی مگر یہ کہانی ہر اس خاندان میں دہرائی جاتی رہی ہے جہاں دولت کی فراوانی ہے، جہاں والدین کو اپنے مشاغل سے فرصت نہیں ہے اولاد لڑکا ہو یا لڑکی پوری توجہ مانگتا ہے اور ایک عمر کا ایسا دور ان پر ضرور آتا ہے کہ وہ کیوں اور کیسے کے چکر میں پھنس جاتے ہیں اور جس مقام پر ان کو اس قسم کے مواقع زیادہ میسر ہوں وہاں تو وہ بے راہ روی کا شکار ہو ہی جاتے ہیں۔ عمر کے اس نازک موڑ پر ان پر کڑی نظر رکھی جائے تو ان کے لئے ہی بہتر نہیں بلکہ وہ والدین کے لئے بھی اچھا ہے۔" میں نے بات ختم کی تو رولوکا نے کہا۔

"آپ نے درست فرمایا حکیم صاحب۔ مگر ان خاندانوں میں جہاں پر ملازمین کی فوج ہو والدین کچھ نہیں کرتے وہ سب کچھ نوکروں پر چھوڑ دیتے ہیں اور اس کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ آپ نے دیکھ لیا۔"

"میرٹھ جانے کا تم کو کبھی اتفاق ہوا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"آپ نے دیکھا ہوگا۔ میں تو کبھی نہیں گیا۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"یہ بھی ایک شہر ہے۔ وہاں سے ایک مریض آیا تھا۔" میں نے کہا۔

"دعوت دے گیا ہوگا۔" رولوکا نے کہا۔

"دعوت نہیں دے گیا بلکہ ایک کیس دے گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"کچھ تفصیل تو بتائیں۔" رولوکا نے پوچھا۔

"اس کا نام فرید احمد ہے اور کاروبار برتن بنانے کا ہے۔ ایک بڑے کارخانے کا مالک ہے سارے ہندوستان میں اس کے برتن جاتے ہیں اور وہ خود بھی ان کی فروخت اور وصولی کے لئے شہروں شہروں پھرتا رہتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ مسئلہ ہے کہ اس کی ملاقات ایسے لوگوں سے ہو جاتی ہے جو مر چکے ہیں۔ مگر اس کو پتہ نہیں ہوتا کہ وہ لوگ مر چکے ہیں۔ وہ ان لوگوں کے پیغامات ان کے گھروں پر پہنچانے جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ جس کا پیغام وہ لایا ہے وہ تو ایک سال پہلے مر چکا ہے اس کے ساتھ کئی دفعہ ایسا ہو چکا ہے اس کی حالت خراب ہو گئی ہے اب وہ کسی بھی شہر میں صرف ان لوگوں سے ملتا ہے جن سے اس کو کام ہوتا ہے مگر پھر بھی کہیں نا کہیں پھنس ہی جاتا ہے کچھ عجیب سی ذہنی پریشانی میں مبتلا ہو گیا ہے۔" میں نے بتایا۔

"کیس تو دلچسپ ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"مزے کی بات یہ ہے کہ وہ کسی طرح ذہنی مریض بھی نظر نہیں آتا۔" میں نے کہا۔

"وہ ذہنی مریض نہیں ہوگا۔ مگر اسی طرح ہوتا رہا تو ایک دن پاگل خانے میں ہوگا۔" رولوکا نے کہا۔

"میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کے پاس میرٹھ آؤں گا۔ وہ کسی نئے سفر پر نہ جائے۔" میں نے کہا۔

"تو پھر چلیں۔ میرٹھ بھی دیکھ لیں گے۔" رولوکا نے کہا۔

میرٹھ بھی یوپی کا ایک درمیانہ درجے کا شہر ہے یہاں پر برتنوں کی گھریلو صنعت ہے اور بہت بڑی فوجی چھاؤنی بھی ہے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کا آغاز بھی یہیں سے ہوا تھا۔

لوگ سیدھے سادھے اور محنت کش ہیں بڑی تعداد مسلمانوں کی یہاں پر آباد ہے اور برتنوں کا سارا کاروبار بھی ان کے پاس ہے سارے ماہر کاریگر مسلمان ہیں۔ شہر کے وسط میں ایک بہت بڑا بازار ہے۔

اس بازار میں ہر چیز کی دکانیں ہیں دکاندار زیادہ تر ہندو بنئے ہیں۔ فرید احمد کا پتہ میرے پاس تھا ہم سیدھے اس کے پاس چلے گئے۔ فرید احمد کا مکان دو منزل بنا ہوا تھا اور کافی قدیم معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس کی مرمت اور رنگ و روغن کا خیال رکھا گیا تھا۔ نچلی منزل پر کارخانہ تھا اور اوپر رہائش تھی۔ فرید احمد ایک درمیانی عمر کا آدمی تھا۔ صحت بھی اچھی، اس کے صرف دو بچے تھے۔ لڑکی کی شادی کر چکا تھا اور لڑکا پندرہ سولہ سال کا تھا۔ اوپر مکان بہت بڑا تھا اس نے ہم دونوں کو ایک صاف ستھرے کمرے میں ٹھہرا دیا۔ رات کھانے کے بعد وہ ہمارے پاس آ گیا۔

"مجھے بہت ضروری بڑودہ جانا تھا۔ مال گئے کافی دن ہو گئے ہیں رقم ابھی تک نہیں آئی مگر آپ نے منع کر دیا تھا اس لئے نہیں جا سکا۔" فرید احمد نے بات شروع کر دی۔

"فرید احمد یہ میرے ساتھی اور حکیم کامل خان ہیں۔ اب ذرا تفصیل سے بتاؤ ماجرہ کیا ہے اور پہلی بار کب تمہارے ساتھ پیش آیا۔" میں نے کہا۔

"میرا مال گجرات بھی جاتا ہے تو میں اندور گیا ہوا تھا۔ کام تو ایک روز کا ہی تھا مگر جس سے ملنا تھا وہ نہیں ملا تو رکنا پڑا تھا میں بازار سے اسٹیشن کی طرف آ رہا تھا کہ سامنے سے گوپال شرما آتے نظر آ گئے۔ یہ میرے والد کے زمانے کے گاہک تھے اور والد صاحب سے ان کی بڑی دوستی تھی میں ادب سے ان کو چچا کہا کرتا تھا۔ والد صاحب کی موت کے بعد میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی کیوں کہ وہ پھر نہیں آئے۔ رہنے والے وہ بھی میرٹھ کے تھے اور ان کی دکان بھی بڑے بازار میں تھی۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو پہچان لیا میں نے بھی اچھی طرح پہچان لیا وہ بڑی شفقت سے پیش آئے میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے بتایا۔ اندور میں کچھ کام شروع کر دیا ہے اسی لئے یہاں پر رہتا ہوں۔ جب بھی آؤ ملنا ضرور مگر پتہ نہیں بتایا۔ پوچھا کب میرٹھ جاؤ گے میں نے ان کو بتا دیا کہ ایک دو روز میں چلا جاؤں گا اچھا تو پھر میرے گھر چلے جانا کہنا میں ٹھیک ہوں امرت لال ہوشیار رہے زیادہ گانا سننے نہ جایا کرے اور دکان کا خیال رکھے نہیں مانے گا تو خود آ کر کان کھینچوں گا۔ امرت لال ان کے لڑکے کا نام تھا میں دوسرے ہی روز واپس آ گیا اور ان کے گھر چلا گیا۔ امرت لال اور اس کی ماں دونوں ہی مجھے جانتے تھے دونوں گھر پر مل گئے میں نے پورا پیغام ان کو بتا دیا۔ وہ لوگ حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگے۔ امرت لال بڑی مشکل سے بولا۔

"ایسا کس طرح ہو سکتا ہے۔ تم کو کوئی اور ملا ہوگا باپو سے تم نہیں ملے کوئی بہروپیہ تم کو فریب دے گیا ہے۔"

"کیا بات کرتے ہو امرت میں نے چچا گوپال کو سینکڑوں بار دیکھا ہے میں دھوکا کیسے کھاؤں گا؟" میں نے کہا۔

تو وہ بولا۔ "تو پھر ہم بتلائے دیتے ہیں کہ ان کو سورگباشی ہوئے پورا ایک سال ہو گیا ہے۔" وہ بولا۔

اب میری حالت وہ تھی جو کچھ دیر پہلے امرت کی تھی۔ میں صرف یہ کہہ سکا۔ "مذاق کر رہے ہو؟"

"ارے میں مذاق کیوں کروں گا۔ ماں سے پوچھ لو بازار میں پوچھ لو سب کو پتہ ہے میں نے خود چتا میں آگ دی ہے۔ میرے سامنے سارا شریر راکھ ہوا ہے اور پھر میں نے وہ راکھ جمنا میں بہائی ہے یہ سب جھوٹ نہیں ہے۔ تم چاہے جس سے پتہ کر لو۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر وہ بہروپیہ تھا تو اس کو میرا نام کس طرح پتہ ہوا اور میں گانا سننے جاتا ہوں یہ کس طرح پتہ ہوا۔ اس کا تو گھر میں بھی کسی کو پتہ نہیں ہے۔" امرت لال حیرت سے بولا۔

READING CORNER
http://readingcornerblogspot.com/

"بات تو حیرت کی ہی ہے میں نے چچا گوپال کو پہچاننے میں ہرگز غلطی نہیں کی ہے۔" میں نے کہا۔

"میری تو کھوپڑی کام نہیں کرتی۔" امرت لال نے جواب دیا۔ اس کے بعد میرے ساتھ کئی واقعات اور ہوگئے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کہ میری بڑی بڑی رقمیں رکنا شروع ہوگئیں گاہک رقم دینے میں ٹالنے لگے۔"

"اچھا یہ بتاؤ تم کو مرا ہوا آدمی جب بھی ملا کیا وہ دن کا وقت تھا۔" رولو کا نے پوچھا۔

"نہیں دن کے وقت مجھے کوئی نہیں ملا۔ غروب آفتاب کے بعد ہی ملا۔"

"تمہاری اب تک جتنے لوگوں سے ملاقات ہوئی ہے ان کے بارے میں تم جانتے تھے کہ وہ مر گئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں مجھے کسی کے بارے میں پتہ نہیں تھا کہ وہ مر گئے ہیں۔" فرید احمد نے جواب دیا۔

"آخری آدمی تم کو کب ملا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"یہ مجھے روجھا اسٹیشن پر ملا تھا۔ اس کی میرٹھ میں پان کی دکان تھی۔ میں بازار جاتا تھا تو اس کے پاس سے پان ضرور کھاتا تھا۔ اس کا نام بنرجی تھا۔ پھر اس کی دکان بند ہوگئی۔ میں بھی کبھی کبھی کا اس کا گاہک تھا اور پھر زیادہ تر شہر سے باہر رہا کرتا تھا۔ مجھے نہیں پتہ کہ اس کی دکان کیوں بند ہوئی تھی۔ جبل پور میں میری اس کی ملاقات ہوگئی۔ میں نے پوچھا تم نے میرٹھ کی دکان بند کردی ہے تو اس نے بتایا وہاں کا روبار بہت مندہ تھا۔ اس لئے جبل پور آ گیا ہوں آپ تو ٹھیک ہیں میں نے جواب دیا۔ ہاں ٹھیک ہوں۔ میں میرٹھ واپس آ گیا میرے دل میں یہ بات تھی کہ کہیں یہ بھی تو نہیں مر گیا۔ میں بازار گیا اور پتہ کیا کہ بنرجی پان والا کہاں چلا گیا تو اس کے اردگرد کے دکانداروں نے بتایا کہ وہ تو کب کا مر گیا ہے۔ میرا شک درست نکلا۔ بنرجی مرنے کے بعد مجھے ملا تھا۔ میں نے اس کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔"

"اب کاروبار کا کیا حال ہے۔" میں نے پوچھا۔

"بہت برا حال ہے مارکیٹ میں بہت سرمایہ جام ہوگیا ہے۔ لوگ مال لیتے ہیں ادائیگی نہیں کرتے۔ میں آگے کس طرح مال بناؤں گا یہ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" فرید احمد مایوسی سے بولا۔

"یہ بتاؤ تمہارا کوئی کاروباری رقیب ہے اس شہر میں۔" رولو کا نے پوچھا۔

"رقابت تو میں کسی سے نہیں رکھتا۔" فرید احمد نے جواب دیا۔

"کوئی ایسا جس کا تمہاری وجہ سے کاروبار دب رہا ہو۔" میں نے پوچھا۔

"یہ تو چلتا ہی رہتا ہے۔ شرما جی کا بھی یہی کام ہے مگر میرے پاس مسلمان کاریگر اچھے ہیں میرا مال مارکیٹ میں پہلے اٹھ جاتا ہے ان کو دیوالی تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔" فرید احمد نے جواب دیا۔

"دیوالی تک کیوں....." میں نے پوچھا۔

"ہندوؤں کا ایک تہوار ہوتا ہے اس میں یہ لوگ اپنے برتن خریدتے ہیں اس وقت انیس بیس سب بک جاتے ہیں مگر میرا مال سارے سال بکتا ہے۔ ہندو مسلمان سب خریدتے ہیں۔" فرید احمد نے جواب دیا۔

"کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہ تمہارے شرما جی کچھ شرارت کر رہے ہوں یا کروا رہے ہوں۔" میں نے کہا۔

"مجھے لگتا تو نہیں کیونکہ اس کے علاوہ ہماری اچھی بات چیت ہے شادی بیاہ میں آنا جانا بھی ہے لین دین بھی ہے میں تو کم از کم ایسا گمان بھی دل میں نہیں لاسکتا۔" فرید احمد نے کہا۔

"تم ایسا کہتے ہو مگر زندگی کے کھیل بڑے نیارے اور پرفریب ہوتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو انسان کی داستان حیات ادھوری رہ جائے۔ کچھ واقعات ایسے بھی پیش آتے ہیں جن کے بارے میں انسان نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا۔ دوسری وجہ انسان کے اندر جہاں سینکڑوں خواہشیں اور جذبے ہیں وہیں پر ایک جذبہ لالچ کا بھی ہے جب اس کا یہ جذبہ انسان پر حاوی ہوتا ہے تو وہ صرف نیلے پیلے ہرے نوٹ دیکھتا ہے۔ وہ نوٹ اس کو ہر بات بھلا دیتے ہیں،

دوستی، محبت، رشتہ داری سب دھندلا جاتی ہے وہ صرف نوٹ گنتا ہے اور پھر وہ ایسا کر گزرتا ہے جس کا تم گمان نہیں کرتے۔ تم شرما جی کا بتاؤ وہ کہاں ہوتے ہیں ان کو چیک کرنا ہوگا۔" میں نے تفصیل سے فرید احمد کو بتایا۔

"وہ میرٹھ کے محلے بھگوان پورہ میں رہتے ہیں وہیں ان کا کارخانہ بھی ہے۔" فرید احمد نے بتایا۔

"تمہارا باہر جانے کا ارادہ ہے۔" رولو کا نے پوچھا۔

"ارادہ تو ہے مگر صرف خرچہ ہی ہے ادھاری تو ملتی نہیں۔ ذہنی انتشار میں مبتلا ہوں۔" فرید بولا۔

"تم جہاں جانا چاہتے ہو ضرور جاؤ اور اپنا ادھار وصول کرو۔" رولو کا نے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ کا حکم ہے تو احمد آباد چلا جاتا ہوں وہاں کے دکانداروں پر میرا ادھار ہے۔" فرید نے کہا۔

دوسرے روز ہی فرید احمد روانہ ہوگیا رولو کا اس کے ساتھ تھا۔ مگر یہ بات فرید کو پتہ نہیں تھی۔ گجرات کا ایک بہت بڑا صنعتی شہر احمد آباد ہے۔ اکثریت گجراتی اور میمنی بولنے والوں کی ہے۔ ٹیکسٹائل کی انڈسٹری بہت زیادہ ہے۔ ملوں کے مالکان ہندو بنئے ہیں۔ مگر فنی کاریگر زیادہ تر مسلمان ہی ہیں۔ بہت پررونق بازار ہے۔ فرید احمد دن دس بجے ٹرین سے اتر کر سیدھا بڑے بازار کی طرف چلا گیا۔ ایک بہت بڑی دکان میں وہ گھس گیا۔ دکان کے اندرونی حصے کی طرف دکان کا مالک سیٹھ ہری ہرن بڑے موٹے سے گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا تھا۔ اس کی پیٹھ کی طرف ایک بہت بڑی تجوری رکھی تھی۔ سیٹھ ہری ہرن بہت موٹا آدمی تھا چہرہ بھی بہت چوڑا تھا۔ اس چوڑے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں اس کے دہانے کو چھپائے ہوئے تھیں۔ اس نے فرید احمد کو آنکھیں سکوڑ کر دیکھا اور بولا۔ "ارے آؤ سیٹھ کیسے آنا ہوا۔"

"ہری سیٹھ ایک ہی کام تو آپ سے ہے۔ مال بھی ایک مہینے سے نہیں لیا اور بقایا سے کچھ آپ نے دیا بھی نہیں۔" فرید نے کہا۔

"دینے کا تو تم بھول ہی جاؤ۔ تمہارا مال بک ہی نہیں رہا، دوں کیا۔ دکان میں جگہ اور گھیر رہا ہے۔" ہری سیٹھ نے جواب دیا۔

"اگر نہیں بک رہا تھا تو واپس کردیتے۔" فرید نے کہا۔

"لو بھلا خوامخواہ کا خرچ اور کرتا۔" ہری سیٹھ نے جواب دیا۔

"یہ بات آپ نے پہلی بار بتائی ہے۔" فرید نے کہا۔

"اب ضرورت پڑی ہے تو بتا دیا ہے۔ تم تو سر پر سوار ہو جاتے ہو روکڑا لاؤ۔ ارے یہاں روٹی کے دانتے ہیں تم کو کہاں سے دوں۔" ہری سیٹھ نے تیوریاں بدل کر کہا۔

اچانک فرید احمد کا لہجہ بدل گیا۔ وہ بولا۔ "ہری سیٹھ میں قرض وصول کرنے آیا ہوں۔ قرض مانگنے نہیں آیا۔ تم سیٹھ ہو اس تجوری میں روپے بھرے پڑے ہیں اور تم روٹیوں کے دانتے کہتے ہو۔ بہت بڑے ناشکرے تم ہو۔ کان کھول کر سن لو برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ تمہاری طرف میری رقم دس ہزار ہے۔ تجوری کھولو اور مجھے ادا کرو۔" فرید احمد نے کہا۔

سیٹھ ہری نے حیرت سے فرید کو دیکھا۔ "یہ کون ہے فرید تو اس طرح نہیں بولتا۔" پھر غصے سے بولا۔

"تم عزت سے جاؤ گے یا بلاؤں کسی کو۔"

فرید نے کہا۔ "جب تک تم مجھے روپیہ ادا نہیں کرو گے اندر کوئی نہیں آئے گا۔"

ہری سیٹھ نے ترچھی نگاہوں سے فرید کو دیکھا اور آواز لگانے کو منہ کھولا مگر منہ سے کوئی آواز نہ نکلی اس نے پھر کوشش کی مگر پھر ناکام ہوا۔ اٹھنے کی کوشش کی مگر اپنی جگہ سے ہل نہیں سکا۔ بھاڑ سا منہ کھول کر لمبی لمبی سانسیں لینے کے بعد پھر آواز دینے کی کوشش کرنے لگا مگر آواز کی جگہ صرف خرخری بارگشت سنائی دی۔ چند منٹ میں ہی اس کی حالت خراب ہوگئی۔ فرید احمد نے پھر کہا۔

"بولو میری رقم اسی وقت ادا کرتے ہو۔" اس نے گردن ہلا کر اقرار کیا تو فرید نے کہا۔ "جاؤ تجوری کھولو۔"

ہری سیٹھ ایک جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔ کھڑے ہو کر اس نے خود کو دیکھا جب اس کو یقین آ گیا کہ وہ کھڑا ہوسکتا

READING CORNER
http://pkreadingcorner.blogspot.com/

ہے تو وہ تجوری کی طرف گیا دھوتی کی لگام سے چابیوں کا گچھا نکالا اور تجوری کھول کر پورے دس ہزار روپے فرید احمد کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ فرید احمد روپے پا کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "میری یہ بات یاد رکھنا سیٹھ ابھی جو کچھ ہوا ہے کسی دوسرے کو پتہ نہ چلے ورنہ تم پھر مٹی کے مادھو بن جاؤ گے اچھا اب چلتا ہوں۔"

فرید احمد نے روپے جیب میں رکھ لئے۔ یہ فرید نے خود کیا مگر وہ خود حیران تھا میں نے یہ کیسے کیا۔ میں نے تو آج تک اس لہجے میں کسی سے بات ہی نہیں کی اور ہری سیٹھ کی آواز کو کیا ہوا تھا۔ ہری سیٹھ کی نیت تو خراب ہو چکی تھی اس نے کتنی آسانی سے رقم ادا کر دی وہ سوچتا رہا مگر سمجھ میں اس کے کچھ نہیں آیا اور وہ اسی بازار کے دوسرے دکاندار کے پاس چلا گیا۔ یہ بھی ایک بڑی برتنوں کی دکان تھی۔ کئی گاہک کھڑے تھے اور سیلز مین مال دکھا رہے تھے فرید نے سیٹھ کا پوچھا تو اس نے اندر اشارہ کر دیا۔ اندر سیٹھ گنگا مل گاؤ تکیئے کے سہارے بیٹھے تھے ان کے قریب ہی ان کا منشی بھی کھاتہ لئے بیٹھا تھا۔ انہوں نے فرید کو دیکھا تو غصے سے آنکھیں سکڑ گئیں بولا۔

"جب دیکھو منہ اٹھائے چلے آتے ہو۔ نہ دیکھتے ہو کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ ہر دبھرو کے کھوٹی کرتے ہو جاؤ بعد میں آنے کا ہے ابھی ٹائم نہیں ہے۔" مگر فرید احمد نے اس کی بات نہیں سنی وہ ان کے قریب ہی تخت پر بیٹھ گیا۔ گنگا مل سیٹھ کی تجوری بھی اس کے دائیں پہلو رکھی تھی۔ گنگا مل تاؤ ہی کھا گیا بلبلا کر بولا۔

"ارے تم آدمی ہے کہ کیا ہے تم کو بولا جاؤ تم ادھر بیٹھ گیا ارے ہم کیا تمہارا دعوت کیا ہے۔"

فرید احمد نے مسکرا کر کہا۔ "دعوت بھی کرو گے اور ادھاری بھی دو گے۔"

"تمہاری مستک میں کچھ گڑبڑ نظر آتا ہے۔ ارے کون سا روپیہ کون سا ادھاری۔" وہ بولا۔

"تم نے مال منگوایا تھا۔ ایک دفعہ نہیں چھ دفعہ پورے بیس ہزار کی رقم ہے تم کہتے ہو کون سا روپیہ تم تو پرلے درجے کے بے ایمان آدمی ہو۔" فرید نے کہا۔

"ارے یہ کون چریا اندر آ گیا۔ منشی ویرو اس کو باہر تو نکال۔" سیٹھ گنگا مل نے غصے سے کہا۔

مگر منشی وہیں اسی طرح کھاتا پکڑے بیٹھا رہا۔ سیٹھ نے پھر کہا۔ "منشی کیا مر گیا میں کیا بولا۔"

فرید احمد نے مسکرا کر کہا۔ "اس غریب کو چھوڑ وہ تو تیری نہ سن رہا ہے نہ دیکھ رہا ہے۔ تو خود ہی تجوری کھول کر رقم دے۔"

"ارے تم کیا رقم رقم کرتا ہے۔" اور اس نے آواز دینے کو منہ کھولا مگر ہری سیٹھ کی طرح اس کی بھی کوئی آواز نہ نکلی۔ اس نے تین چار دفعہ کوشش کی مگر ناکام ہوا۔ پھر غصے سے اٹھنے لگا مگر جسم نے ہلنے سے انکار کر دیا۔ فرید احمد اس کو دیکھ کر مسکراتا رہا۔ سیٹھ گنگا مل اس کی مسکراہٹ سے جل اٹھا اس نے ہر طرح کوشش کر لی کہ اپنے جسم کو حرکت دے سکے مگر پھر آہستہ آہستہ اس کی حالت خراب ہونے لگی چہرہ پیلا پڑ گیا اور گھبراہٹ نمایاں نظر آنے لگی وہ ہری سیٹھ سے زیادہ چالاک اور ہوشیار تھا عمر بھی اس سے کم لگتی تھی اور اس کے اعصاب بھی قوی معلوم ہوتے تھے مگر موجودہ حالت اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ فرید احمد نے سمجھ لیا کہ اب بات کرنے کا وقت ہے تو وہ بولا۔ "ہاں سیٹھ کھوپڑی ٹھکانے آ گئی ہے تو بول تو بات کر سکتا ہے۔"

"تو وہی میرٹھ کا برتن والا ہے یا کوئی اور ہے۔" وہ بولا۔

"میں وہی ہوں مگر تو وہ نہیں ہے صرف بیس ہزار کی رقم کے لئے تو بے ایمان ہو گیا۔" فرید نے کہا۔

"تو غلط سمجھا میں تو تجھے پرکھ رہا تھا۔" وہ بولا۔

"اور میں نے بھی تیری بہادری کی پرکھ کی تھی تو نے ہاتھ پیر ہی ڈال دیئے۔" فرید نے کہا۔

"میں تیری رقم ادا کر دوں گا خود بھیج دوں گا چنتا مت کر۔" اس نے پھر داؤ مارا۔

"اب بھی داؤ چلا رہا ہے کھڑا ہو جا اور تجوری کھول کر میری رقم ادا کر دے۔" فرید نے کہا۔

گنگا چابی کے گڈے کی طرح کھڑا ہو گیا اور پھر

تجوری کھول کر بیس ہزار روپے فرید کے ہاتھ میں دے دیئے۔ فرید نے بغیر گنے نوٹ جیب میں رکھ لئے اور کہا۔ "اب میں جا رہا ہوں ابھی کچھ دیر پہلے کچھ نہیں ہوا۔ اگر کسی کو کانوں کان خبر ہوئی تو پھر ایسا ہی ہو جائے گا اور یہ منشی اس نے تو کچھ نہ دیکھا اور نہ سنا یہ تو پتھر کا بت ہے۔ میرے جانے کے بعد یہ بت انسان بن جائے گا۔" اور فرید دکان سے باہر نکل گیا۔

اس کو اپنے لب و لہجے پر یقین نہیں آ رہا تھا اس نے پہلے ایسا لب و لہجہ کبھی نہیں اختیار کیا تھا۔ اب فرید کی جیب میں بڑی رقم تھی اس سے وہ اپنی گرتی ساکھ بحال کر سکتا تھا۔ وہ واپس آنے کو اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ رولوکا اس کے ساتھ، اچانک رولوکا کو ایسا لگا جیسے کوئی عین فرید کے پیچھے چل رہا ہے مگر نہ فرید کو اس کا پتہ ہے نہ کوئی اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ سایہ نما اچانک غائب ہو گیا۔ فرید ٹکٹ کی کھڑکی کی طرف چلا تو ایک آدمی اس سے ٹکرا گیا۔ فرید نے اس کو دیکھا تو حیرت سے بولا۔ "ارے بابو خان تم متھرا سے یہاں آ گئے ہو؟"

بابو خان فرید سے لپٹ گئے اور بولے۔ "کتنے دنوں کے بعد ملے ہو ٹھیک تو ہو۔"

"ہاں ٹھیک ہوں اگاری کو آیا تھا۔ واپس جا رہا ہوں تم نے متھرا کی دکان بیچ دی ہے۔"

"میں نے نہیں لونڈوں نے بیچ دی......" بابو خان بولے۔

"چلتی دکان تھی کاہے بیچ دی۔" فرید نے پوچھا۔

"ارے ہم نے کہاں بیچی۔ کیا بتائیں ہمارے مرنے کے بعد ان میں پڑ گئی پھوٹ ایک دوسرے کا سر پھاڑ دیا اور ہو گیا ایک ٹنٹا بس اسی چکر میں بیچ باچ کر سب چلے گئے۔"

آگے بابو خان نے اور کیا کہا فرید کو پتہ نہیں وہ حیرت سے ان کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "تو پھر تم مر گئے۔" بابو خان نے گردن ٹیڑھی کر کے کہا۔ "ہاں مر گئے ہم بھی مر گئے۔"

رولوکا قریب تھا دونوں کی بات چیت سن رہا تھا۔ اس نے اچانک بابو بھائی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بابو بھائی چونک کر بولا۔ "اچھا اب چلتا ہوں ہاتھ تو چھوڑ۔"

فرید احمد دور جا کھڑا ہوا اور بولا۔ "میں تو اتنی دور ہوں میں نے کہاں پکڑا ہے۔"

"تو پھر کون ہے ارے چھوڑ جانے دے۔" بابو بھائی پھر بولا۔ فرید احمد اسٹیشن کے اندر چلا گیا۔ گاڑی آنے والی تھی۔

بابو خان گڑگڑا کر بولا۔ "معاف کر دے جانے دے۔"

"تو ہے کون کاہے اس کا پیچھا کرتا ہے۔" رولوکا نے پوچھا۔

"میں تو سرکار نوکر ہوں جو مالک کا حکم وہی کرتا ہوں۔" بابو خان بولے۔

"تو کون ہے یہ بتا؟"

"میں چھلاوہ ہوں میں جو کرتا ہوں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔"

"تجھے اس کام پر کس نے لگایا ہے۔" رولوکا نے پوچھا۔

"میں بتا نہیں سکتا، بتایا تو بہت بری میرے ساتھ گزرے گی۔" چھلاوہ بولا۔

"تو اور کیا کرتا ہے؟" رولوکا نے پوچھا۔

"میں مسافروں کو راہ سے بھٹکاتا ہوں۔ کاروبار دھندہ خراب کرتا ہوں۔ خوف زدہ کرتا ہوں۔ اس سے زیادہ میری طاقت نہیں ہے۔" چھلاوہ بولا۔

"اگر میں یہ کہوں کہ تیرے ساتھ کچھ نہیں ہوگا تو تو آگے بتائے گا۔"

"نہیں میں ہرگز نہیں بتاؤں گا۔" وہ بولا۔

"اور میں جو تیرے ساتھ کروں گا اس کا تجھے پتہ ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"مجھے نہیں پتہ......" چھلاوہ بولا۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

"ایک منٹ کا وقت تیرے پاس ہے اس کے بعد میں تیری وہ درگت بناؤں گا کہ............"

"بتادوں تو تم مجھے چھوڑ دو گے۔" چھلاوہ بولا۔

"ہاں چھوڑ دوں گا مگر کچھ باتیں میری تجھے ماننا پڑیں گی......" رولوکا نے جواب دیا۔

"شرما کیدار ناتھ کا حکم چلتا ہے مجھ پر۔" چھلاوہ بولا۔

"ٹھیک ہے میں تجھے چھوڑ دیتا ہوں اس شرط پر کہ تو اب شرما کیدار ناتھ کے پاس نہیں جائے گا۔" رولوکا نے کہا۔

"اس نے جاپ کر کے مجھے پایا ہے وہ کب چھوڑے گا۔" چھلاوہ بولا۔

"تو اس کی فکر نہ کر تیرا جاپ تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"تو میں جاؤں اجازت ہے۔" چھلاوہ بولا۔ رولوکا نے سر کے اشارے سے اس کو اجازت دے دی۔

رولوکا نے سوچا یہ ضرور شرما کیدار ناتھ وہی ہے جو فرید احمد سے ملتا بھی ہے دوستی بھی رکھتا ہے اور در پردہ اس کا دشمن بھی ہے۔ یہ ہے دنیا جو دوست ہے وہی دشمن بھی ہے۔ فرید احمد کو ذہنی طور پر مفلوج کر کے اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ مالی دشواریاں بھی کھڑی کر رہا ہے واہ رے دوست۔

رولوکا فوراً فرید احمد کے پاس گیا اور پوچھا۔ "تمہارے دوست شرما جی کا پورا نام کیا ہے؟"

فرید نے بتایا۔ "ان کا پورا نام شرما کیدار ناتھ ہے۔ کیوں کیا ضرورت پڑ گئی؟" فرید نے پوچھا۔

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا......" اور رولوکا بھگوان پورہ روانہ ہو گیا۔ جہاں شرما جی کا مکان تھا۔

بھگوان پورہ ہندوؤں کا محلہ ہے۔ یہاں کسی مسلمان کا ملنا مشکل ہے۔ سب کاروباری لوگ ہیں۔ شرما جی اپنے کارخانے میں موجود تھے۔ رولوکا حکیم کامل کے روپ میں تھا۔ پہناوے سے مسلمان نظر آتا تھا۔

شرما جی بھی اس کو مسلمان سمجھے اور پوچھا۔ "اپن سے کچھ کام ہے کیا۔ بولو کیا بولتا ہے؟"

"کام تو ہے اگر تھوڑا سا وقت دیں اور اکیلے میں بات کریں تو......" رولوکا نے جواب دیا۔

"اپنے پاس ٹائم کا بہت کھوٹی ہے۔ ادھر ہی بولو کیا مانگتا ہے۔" شرما جی بولے۔

رولوکا اس کے قریب چلا گیا اور بولا۔ "ٹائم تو تم کو دینا ہی ہوگا۔"

"تم کیسا بات کرتا ہے۔ ہم بولا ادھر ہی بات کرو۔ ادھر کیا مسئلہ ہے۔" شرما نے کہا۔

"تم گجراتی لوگ اپنے مہمان سے ایسا ہی سلوک کرتے ہو؟" رولوکا نے دوسرا رخ اختیار کیا۔

"کون بولا اس کا نام بتاؤ......" شرما نے پوچھا۔

"اس کا نام شرما کیدار ناتھ ہے۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"ارے کیا بولتا ہے سامنے سامنے جھوٹ بولتا ہے ہم کب بولا۔

"میں تمہارے پاس دلی سے چل کر آیا ہوں اور تم ہو کہ مجھے ٹال رہے ہو۔ دلی کبھی آؤ، دیکھو ہم تمہاری کتنی خدمت کرتے ہیں۔ مگر تم سے مل کر افسوس ہوا کیا آپ لوگوں کا یہی دستور ہے؟" رولوکا نے دوسرا پتہ پھینکا۔

کیدار ناتھ اب ذرا سا متاثر ہوا بولا۔ "بابا بات ایسا ہے کہ ادھر لوگ آتا ہے ٹائم خراب کرتا ہے......ابی اپن لوگ دھندے والا مانو ہے۔ سب کا کیا سنے گا۔ اس واسطے ایسا بولا تھا۔ آؤ دفتر میں بات کرتا ہے۔" اور وہ رولوکا کو اپنے دفتر میں لے آیا۔

وہاں پر ایک آدمی پہلے سے تخت پر بیٹھا تھا۔ تخت کے ساتھ ہی چار کرسیاں بھی رکھی تھیں۔ رولوکا کی بات کا اثر شرما پر ابھی تک تھا۔ بولا۔ "ہاہاہا بتاؤ کیا پئے گا ٹھنڈا یا گرم......"

"بہت شکریہ سیٹھ شرما میں کسی بھی چیز کا شوقین نہیں ہوں۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"ارے نہیں ایسا کیسے ہو گا تم دلی سے آیا ہے ابی ہم لوگ اتنا کنجوس نہیں ہے کہ تمہاری کچھ خاطر بھی نہیں کرے تم

دلی جا کر کیا بولے گا۔" شرما نے کہا۔

"آپ میری بات سن لیں چند منٹ کی بات ہے۔ یہی بہت بڑی آپ کی خاطر داری ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"ہاں بولو نا میں سن رہا ہوں۔" شرما نے جواب دیا۔

رولوکا نے اس آدمی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "تنہائی ضروری ہے۔ اس میں آپ کو ہی فائدہ ہے۔"

فائدے کی بات سن کر شرما نے کہا۔ "ارے منشی تم باہر جاؤ وہاں اپنا کام کرو۔" اس کے جانے کے بعد شرما نے کہا۔ "ہاں اب کرو کیا فائدے کی بات ہے؟"

"شرما جی میری بات دھیان سے سننا...... میں صرف ایک بار ہی اپنی بات کہتا ہوں۔ انسان میں ایک شکتی مایا کی ہوتی ہے۔ یہ شکتی وہ دوسروں کو مار کر، دھکیل کر، دھوکا دے کر دنیا میں حاصل کرتا ہے اور ایک شکتی ہوتی ہے کایا شکتی۔ وہ اپنی جسمانی طاقت کا استعمال جائز اور ناجائز استعمال کر کے لوگوں کو نیچا دکھاتا ہے۔ مگر ان کے علاوہ بھی اس دنیا میں بہت کچھ ہے اس لئے آدمی صرف یہاں تک ہی نہیں رہتا۔ وہ کچھ اور آگے چلتا ہے اور ماورائی شکتی کی طرف قدم بڑھا دیتا ہے۔ اس کے ذریعہ وہ مایا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دوسرے آدمی کو نیچے گرانا چاہتا ہے۔ اس کا یہ جنون اتنا بڑھ جاتا ہے کہ وہ اپنے دشمن اور دوست میں تمیز نہیں کرتا۔ تم بھی اسی پھیر میں پڑ گئے ہو۔ تم نے ایک آسان جاپ کسی بھجن کرتن کرنے والے پنڈت سے سیکھ لیا اور اس کو پورا کر لیا اور اس کے بیر کو اپنے ایک متر کے ساتھ لگا دیا۔ میں تم کو زیادہ خطاوار نہیں سمجھتا کیونکہ تم بھی اسی کے بہکاوے میں آ گئے ہو جو ساری دنیا کو بہکانے میں لگا ہوا ہے۔ تم کو اس نے یہ بھلا دیا کہ سب سے پہلے آدمی انسان ہے۔ انسانوں کے کام آئے۔ کیوں کہ ہر آدمی پیدائشی انسان ہوتا ہے۔ دین دھرم کی باتیں اس کو بعد میں آتی ہیں۔ مگر شیطان اس کو اپنی خواہشوں کے جال میں جکڑ لیتا ہے اور اس سے انسانیت سوز کام کرواتا ہے۔ میں جانتا ہوں تم وہ نہیں ہو جو تم کو شیطان بنانا چاہتا ہے۔ مگر تم نے غلطی سے ایک قدم اس کے کہنے پر اٹھا لیا ہے۔ اب وہ تم کو اور آگے لے جائے گا تم دین دھرم سے کٹ جاؤ گے اور صرف شیطان کے غلام بن جاؤ گے۔ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو اور اپنا فیصلہ مجھے بتاؤ۔ اگر تم شیطانی راستے پر جانا چاہتے ہو مایا جال میں پھنسنا چاہتے ہو تو شوق سے جاؤ۔ مگر یاد رکھو فرید احمد کا تم کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔" رولوکا خاموش ہو گیا اور شرما کے چہرے کے تاثرات پڑھنے لگا۔

شرما کے چہرے کے تاثرات پل پل بدل رہے تھے۔ وہ خاموش تھا مگر چہرے پر تحریریں آ رہی تھیں، مٹ رہی تھیں کوئی تحریر زیادہ دیر نہیں رکتی تھی۔ اس کے اندر جو بھونچال آیا ہوا تھا وہی سب کچھ اس کے چہرے کی اسکرین پر نظر آ رہا تھا۔ کافی دیر یہ کیفیت رہی۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ رولوکا بھی کھڑا ہو گیا۔ شرما آگے بڑھا اور رولوکا کے گلے سے لپٹ گیا...... اس کی آنکھوں سے دو ندامت کے آنسو نکل کر رخساروں پر لڑھک گئے۔ رولوکا نے اس کی پیٹھ کو تھپ تھپایا اور کہا۔ "تمہارے ان پچھتاوے کے دو آنسوؤں نے تمہاری بہت سی خطائیں معاف کر دی ہیں۔ میں جانتا تھا کہ تم بھٹک گئے ہو تم ٹھیک ہو جاؤ گے اس لئے میں نے یہ راستہ اختیار کیا۔" رولوکا نے کہا۔

"میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ تم نے مجھے گرنے سے روک لیا۔" شرما نے کہا۔

"شکر کی ضرورت نہیں......محنت اور دیانت داری کی روزی میں بہت مزا ہوتا ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"میں نے جو غلطی کی ہے جاپ کیا ہے اس کا کیا ہو گا۔" شرما فکر مندی سے بولا۔

"کچھ نہیں ہو گا۔ وہ ایک بہت کم درجے کا بیر تھا۔ میں نے اس کا انتظام کر دیا ہے وہ اب تمہارے قریب نہیں آئے گا۔"

"یہ تم نے ایک اور مہربانی کر دی۔" شرما نے کہا۔

"اب تم مجھے اجازت دو۔" رولوکا نے کہا۔

"تم نے تو مجھے کوئی خدمت کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا۔" شرما نے کہا۔

رولوکا واپس آ گیا اور اس نے کسی کو نہیں بتایا کہ اصل

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com

بات کیا تھی۔ فرید احمد کا کاروبار پھر ٹھیک ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

نام تو اس کا رام لال تھا مگر سب رامو ہی کہا کرتے تھے۔ غریب کا کیا نام جو پکارا گیا وہی نام ہو گیا۔ کسی نے کہا، ہے مایا تیرے تین نام پرسا، پرسو، پرس رام۔ تو رامو کے بھی دو نام تو تھے۔ رہنے والا تو وہ روہتک کا تھا مگر ستایا ہوا اپنوں کا تھا۔ اپنے حق کے لئے بھی وہ آواز نہ اٹھا سکا اور پردیس سدھار گیا اور ناگ پور میں جا کر رک گیا۔ دیہاتی سیدھا سادھا شہری ہنر سے ناآشنا..... وہ صرف ایک ہی ہنر جانتا تھا اور وہ ہنر تھا کاشت کاری، وہ پیدائشی کسان تھا۔ آسمان کا رنگ دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ بارش ہو گی کہ نہیں۔ ستاروں کو دیکھ کر ٹھیک وقت بتا دیتا بھی اس کے لئے مشکل نہ تھا۔ محنت مزدوری کے سوا شہروں میں اس کو کوئی کام نہیں تھا۔ بدن کا اچھا تھا۔ لمبا چوڑا جوان تھا وہ..... کام کی تلاش میں تھا کہ ایک مالی سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ اس کو ایک آدمی کی ضرورت تھی کیونکہ وہ خود بوڑھا آدمی تھا بھاری کام نہیں کر سکتا تھا وہ کمشنر ہڈسن کے بنگلے پر کام کرتا تھا۔ رامو نے کبھی مالی کا کام نہیں کیا تھا مگر بوڑھے مالی کو اس کی یہ خصوصیت اچھی لگی کہ وہ ایک کسان تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کسان ہی اچھا مالی بن سکتا ہے۔ بوڑھا مالی اس کو لے کر ہڈسن کے بنگلے پر پہنچا۔ کمشنر ہڈسن گھریلو معاملات میں نہیں بولتا تھا۔ ان کی بیگم میری ہڈسن سارے معاملات دیکھتی تھیں۔ ان کو بھی رامو ٹھیک لگا اور اس کو بوڑھے مالی کا ہیلپر بنا دیا گیا۔ بوڑھے مالی نے بڑی ایمانداری سے رامو کو مالی گیری کے سارے گر بتا دیئے۔ پودوں کو بیج ڈال کر اگانے پھر پرورش کھاد اور پانی دینے کا طریقہ۔ موسم کے حساب سے کون سا پودا لگانا چاہئے۔ پھول سے بیج پیدا کرنا۔ رامو آہستہ آہستہ سیکھتا گیا۔ ایک تو وہ کسان تھا۔ دوسرے زمین اور آسمان دونوں سے اس کا گہرا تعلق تھا جو کہ ہر کسان کا ہوتا ہے۔ اس کو یہاں آتے ہی سرونٹ کوارٹر مل گیا تھا۔ اس کا ایک لڑکا تھا۔ ایک سال کا۔ اب اس کو کام کرتے چھ سال گزر چکے تھے۔ بوڑھا مالی مر چکا تھا اور وہی پورے باغ کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ بیگم ہڈسن اس سے خوش تھی۔ وہ بھی بڑی محنت سے کام کرتا تھا۔ اس نے باغ میں پھولوں کی کبھی کمی نہیں ہونے دی تھی۔

ہڈسن صاحب واپس جا رہے تھے۔ ان کی جگہ دوسرا کمشنر آ رہا تھا۔ وہ بھی انگریز تھا۔ رامو نے سوچا ہمیں کیا ہمارے لئے تو وہ بھی صاحب ہی ہے۔ ہمارا کام تو پھول اگانا ہے۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ پھول اگانے والے کانٹوں میں رہتے ہیں۔ ہڈسن صاحب چلے گئے۔ بنگلہ خالی نہیں رہا۔ دوسرا کمشنر آ گیا۔ اس کا نام مونٹی تھا۔ اس کی بیوی کا نام مونی تھا۔ یہ کمشنر کم عمر تھا اور اس سے بھی کم عمر اس کی بیوی تھی۔ مونٹی کو تھوڑی اردو، ہندی آتی تھی مگر مونی تو بالکل نئی تھی۔ اس کو ایک لفظ بھی نہیں آتا تھا۔ پہلے والے کمشنر کی بیوی میری تو فر فر اردو میں بات کرتی تھی۔

رامو نے سوچا کہ مجھے کیا میں تو اپنا کام کروں گا۔ مونٹی باغ دیکھ کر خوش ہوا اور اس نے ایک روپیہ رامو کو انعام دیا۔ رامو بہت خوش ہوا۔ انعام تو اس کو پہلے بھی مل چکا تھا مگر پہلے ہی دن صاحب اس سے خوش ہوا۔ یہ اس کے لئے بڑا اہم تھا۔ رامو کو دیکھ کر مونی بھی خوش تھی۔ رامو شکل و صورت کا بھی برا آدمی نہیں تھا۔ اس پر وہ محنتی ہاتھ پیر کا مگر اور مونٹی سے بھی قد میں دو انچ اونچا تھا۔ مونی نے پہلی نظر میں ہی سارے پروگرام ترتیب دے لئے۔ نیا صاحب آیا تو کچھ نئے کام بھی رامو کے ذمے آ گئے۔ ٹھیک دس بجے ایک بڑا سا گل دستہ بنا کر مونی کے بیڈ روم میں پہنچانا پڑتا۔ مونٹی تو نو بجے ہی دفتر چلا جاتا تھا۔ مونی کمرے میں اکیلی ہوا کرتی تھی۔ وہ دبے پاؤں جاتا تا کہ اس کی نیند خراب نہ ہو اور گل دستہ سجا کر واپس آ جاتا۔ اس کی پوری ڈیوٹی میں یہ کام سب سے زیادہ مشکل تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر جاتا تو اپنی نظر پلنگ پر کبھی نہیں ڈالتا تھا۔ اس کو نہیں پتہ کہ مونی سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے اور جتنی جلدی واپس آ سکتا تھا آ جاتا تھا۔ اس کی بدحواسی مونی روز دیکھتی تھی۔ وہ حیران تھی کہ آخر وہ کیسا مرد ہے کہ میری طرف دیکھتا بھی نہیں۔ وہ بار بار آئینہ میں اپنے سراپے کا جائزہ لیتی، اسے خود میں کوئی کمی نظر نہ آتی۔ یہ

غلامی کی زنجیروں میں جکڑے غربت اور بھوک کے ستائے ہوئے مرد ایک انگریز حاکم کی بیوی پر کیسے نظر ڈال سکتے ہیں۔ ان کی یہ جرأت بھلا کس طرح ہو سکتی ہے۔ کمشنر صاحب بہادر کا ایک اشارہ ان کو کال کوٹھڑی بلکہ پھانسی کے تختے تک پہنچا سکتا ہے۔ ان کے دلوں میں جو ڈر اور خوف پیدائشی پیدا کر دیا گیا ہے اور ذہنی طور پر غلامی کی جو ہتھکڑی ان کے ہاتھ پاؤں میں ڈال دی گئی ہے وہ ان کو کیسے نظر اٹھانے دے گی۔ مونی یہ نہیں جانتی تھی۔ وہ صرف یہ جانتی تھی کہ وہ ایک پورا مرد ہے اور وہ ایک عورت ہے۔ وہ اس کی ایک نظر کی منتظر تھی مگر رامو تو پتھر کی سل تھا۔ وہ صرف اپنا کام کرتا تھا۔ اس کے سامنے اس کے بچے کا مستقبل تھا۔ اس کے سامنے اپنی بیوی کی ذمہ داری تھی۔ وہ بھوک اور افلاس کے جس دریا سے گزر کر اس بنگلے تک پہنچا تھا وہ اس کو کہیں نظر اٹھانے نہیں دیتی تھی۔ وہ بے حس نہیں تھا وہ بھی انسان تھا۔ آنکھوں کی زبان قدرتی طور پر وہ بھی جانتا تھا۔ مونی کے رنگ ڈھنگ، اس کی طرف دیکھنے کا انداز اس کو کوئی پیغام دیتا تھا وہ کچھ سمجھنے پر بھی نا سمجھ تھا۔ ایک تو وہ سیدھا سادہ کسان تھا وہ سیدھی راہ پر چلنے والا آدمی تھا۔ دوسرے اس کے حالات ایسے تھے کہ ذرا بھی غلطی کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ خود کو ایک بھاری پتھر کے نیچے دبا محسوس کرتا تھا۔ ایسا بوجھ جو اس پر کبھی نہیں آیا تھا۔ اس نے دوسری ملازمت کی تلاش شروع کر دی تھی۔ ادھر مونی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

صبح حسب معمول رامو گل دستہ لے کر مونی کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی نظر اس ٹیبل پر تھیں جہاں گل دستہ سجایا جاتا تھا۔ اس نے کسی طرف نہیں دیکھا۔ سیدھا ٹیبل کی طرف گیا۔ مونی اس کو دیکھ رہی تھی اس کے جسم پر صرف ایک ریشمی گاؤن تھا۔ رامو کو پتہ بھی نہ چلا کہ مونی نے اٹھ کر کب دروازہ لاک کر دیا اور دیوانہ وار رامو سے لپٹ گئی۔

رامو نے بوکھلا کر خود کو چھڑانا چاہا مگر مونی جونک کی طرح اس کو پکڑے ہوئے تھی۔ وقت کا سیلاب خس و خاشاک کی طرح اس کو بہا کر لے جا رہا تھا۔ جس غیر متوقع انداز میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا وہ اس کے سحر میں مبتلا تھا پھر اس نے اپنے ذہن کو آزار چھوڑ دیا۔ اس کی روح کی پاکیزگی ختم ہو گئی مونی کو سکون مل گیا۔ اور رامو تھکے تھکے قدموں سے کمرے سے باہر آ گیا۔ اس کی زندگی کا یہ تجربہ بالکل نیا تھا اور انوکھا بھی تھا۔ اب اس کو کیا کرنا چاہیے۔ رامو نے سوچا۔ نوکری چھوڑ دینی چاہئے۔ پھر سر چھپانے کا آسرا بھی نہیں رہے گا۔ دوسری نوکری کب ملے گی کچھ پتا نہیں تھا۔ سب سے بڑا نقصان تو یہ کہ اگر بیگم نے صاحب سے شکایت کر دی تو زندگی اجیرن کر دی جائے گی میرے بچے کا کیا بنے گا بیوی در بدر ہو جائے گی۔ بہت سے سوال اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے کسی سوال کا جواب اس کے پاس نہ تھا تو پھر میں کیا کروں۔

"تو ایک پیدائشی مزدور ہے تیرا مقدر مزدوری ہے۔ تیری ڈیوٹی میں ایک کام کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ تجھے وہ ڈیوٹی پوری کرنا ہے۔" اس نے گردن ہلا کر اقرار کیا۔ "میں ڈیوٹی پوری کروں گا۔" اور پھر روز اس کی روح کی پاکیزگی کو روندا جانے لگا۔ وہ وقت مقررہ پر روز جاتا رہا۔ اتوار کو بھی وہ جاتا تھا۔ صاحب اتوار کو بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ حیران ہوتا کہ آج تو دفتر بند ہے۔ پھر صاحب کہاں چلا جاتا ہے۔ مونی کا جوش ویسا ہی تھا۔ ایک ناشتے کا جام اس کو دن بھر نشے میں رکھتا تھا۔ رامو دو دھاری تلوار کے تلے زندگی گزار رہا تھا مگر اب ذرا ذرا اس کو اپنا فائدہ بھی نظر آنے لگا تھا۔ اس نے لڑکے کو اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ مونی صاحب کے سامنے بھی رامو سے بے تکلف ہو جاتی تھی۔ رامو بھی اس کو خوش کرنے کے طریقوں سے واقف ہو گیا۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ رامو مونی کی ضرورت بن گیا تھا تو بھی غلط نہیں تھا۔ رامو اپنی حیثیت کا فائدہ اٹھانا بھی سیکھ گیا تھا۔ ناگ پور کے مین بازار میں اس نے کئی مکان اور دوکانیں اپنے نام کروائیں جس قدر فائدہ کمشنر بہادر سے اٹھا سکتا تھا خود کو کیش کروا کر اس نے اٹھایا۔ مونی کے لئے وہ ایک اہم آدمی تھا۔ وہ بھی اپنی اہمیت جانتا تھا۔ اب وہ ایک سیدھا سادہ کسان نہیں تھا۔ انگریز کی صحبت نے اس کو بھی عیاری و مکاری سکھا دی تھی۔ وہ بھی چاروں طرف دیکھنے لگا تھا۔ کبھی

READING CORNER
http://readingcornerblogspot.com/

کبھی اس کے اندر سے کچھ سوال دماغ تک آتے ضرور تھے مگر وہ ان کا جواب نہیں دیا کرتا تھا۔ ایک تو کچھ کے جواب اس کے پاس تھے ہی نہیں اور کچھ کے وہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ راموا ب غریب مالی نہیں تھا۔ وہ مونٹی کا خاص آدمی تھی۔ مونٹی جو پورے شہر کا مالک و مختار تھا اور رامو کا حکم اس پر بھی چلتا تھا۔ کیونکہ مونی اس کی پشت پر موجود تھی۔ مونٹی نہ معلوم کیوں مونی سے دبتا تھا۔ رامو اور اس کے بارے میں مونٹی سب جانتا تھا مگر پھر بھی اس کی نظریں رامو کے لئے وہی تھیں شاید ان کے معاشرے میں یہ تعلق معیوب نہیں تھا۔

گوبندہ رامو کا لڑکا جوان ہو چکا تھا۔ وہ بنگلے پر نہیں رہتا تھا۔ رامو نے اس کو ایک ہوسٹل میں رکھا ہوا تھا وہ وہیں پر پڑھتا تھا۔ رامو کے پاس آنے کی اس کو اجازت نہیں تھی۔ کیونکہ وہ بھی باپ کی طرح لمبا چوڑا کڑیل جوان تھا۔ وہ ڈرتا تھا اس بات سے کہ کہیں مونی کی نظر اس پر نہ پڑ جائے۔

مگر جو ہونا ہے اس کو کون روک سکتا ہے۔ رامو نے اپنی عقل سے جو پروگرام بنا رکھا تھا وہ دھرا کا دھرا رہ گیا اور گوبندہ مونی کی نظر میں آ گیا۔ اب رامو کا صحت مند جسم مونی کو باسی باسی لگنے لگا۔ مونی نے ایک دن رامو سے پوچھا۔ ”رامو تمہارا سن کدھر ہے۔ ہم اس کو ادھر دیکھا تھا۔“ مونی اب اردو بولنے لگی تھی۔ رامو کے اندر ایک بہت بھاری دھماکا ہوا۔ وہ چپ رہا جیسے اس نے سنا ہی نہ ہو۔ ”تم نے جواب نہیں دیا۔ اس کا نام کیا ہے۔“

”اس کا نام گوبندہ ہے...... کالج میں پڑھتا ہے۔“ رامو کو جواب دینا پڑا۔

”تم اس کو ادھر بلاؤ...... ہم سے ملواؤ وہ اچھا لڑکا دکھتا ہے۔“ مونی نے کہا۔

”اچھا تو لگے گا ہی......“ رامو نے دل میں کہا مگر زبان سے کہا۔ ”آئے گا تو ملائے گا۔“

”تم کل اس کو بلاؤ ہم اس کو گفٹ دے گا۔“ مونی نے کہا۔

”اس کا پڑھائی کا ہرج ہوگا میم صاحب...... جب آئے گا تو ملوائے گا۔“ رامو نے کہا۔

”غلط بات مت کرو۔ کل بلاؤ ہم مونٹی کو بولے تو وہ بلائے گا۔“ مونی نے کہا۔

رامو جانتا تھا مونٹی اب بھی حکومت کرتا ہے۔ وہ ضرور بلا سکتا ہے۔ اس کے بعد میں نے جو کچھ کمایا ہے سب بجق سرکار چھین لیا جائے گا۔ میرا بھی حشر خراب ہو جائے گا۔ بچت کی کوئی امید نہیں ہے۔ بلانا ہی پڑے گا۔ بھوکی بلی کو تازہ گوشت نظر آ گیا ہے۔

”میم صاحب میں کل جاؤں گا وہ ضرور آئے گا آپ بولیں اور وہ نہ آئے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ رامو نے کہا۔

”گڈ! ہم اس کو خوش کرے گا۔“ مونی نے کہا۔

”خوش تو مجھے بھی کیا ہے۔“ اس نے دل میں کہا مگر زبان خاموش ہی رہی۔

اب وہ کیا کرے پورے ہندوستان پر اس گوری چمڑی کی حکومت ہے میں کہاں بھاگ کر جاؤں ہر جگہ پکڑا جاؤں گا۔ میری کون سنے گا، کون میرا ساتھ دے گا، یہاں سب چڑھتے سورج کو پوج رہے ہیں۔ کوئی رائے بہادر بن رہا ہے۔ کوئی خاں صاحب بن رہا ہے۔ سب اپنوں کا گلہ کاٹ رہے ہیں اور تمغے سینے پر سجا رہے ہیں۔ جاگیریں پا رہے ہیں۔

ہندوستان کے شہری کیا دیہاتی کیا سب احساس محرومی کا شکار ہیں کسی کو کچھ نہیں آ رہا تھا۔ سب صاحب بہادر کی خوشامد میں لگے ہوئے تھے اور جو کہیں کہیں سے آواز آتی بھی تھی تو وہ بہت کمزور تھی۔ ان حالات میں رامو بچارا کس کھیت کی مولی تھا۔ وہ دوسرے دن گوبندہ کو ملنے چلا گیا۔

”دیکھو بیٹا! میں نے تیری بڑی حفاظت کی مگر پھر بھی وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا تو میری طرح ہی ہے۔ میں جس چکی میں پس چکا ہوں، اسی میں تجھے جھونکنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ میں نے بہت سوچ بچار کیا۔ ناگ پور سے بھاگ جانا بھی چاہا مگر پورے ہندوستان پر گورے کی حکومت ہے۔ مجھے اور تجھے ڈھونڈنا اس کے لئے زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اس کے بعد بھی اس کی مرضی ہی ہوگی فرق یہ ہوگا کہ جو کچھ میں نے اپنی آتما کو گھائل کر کے پایا ہے

میری اوقات سے بھی زیادہ ہے۔ وہ سب چلا جائے گا۔ اب کم از کم یہ صبر تو ہے کہ میں نے کچھ دیا تو کچھ لیا بھی ہے۔ تجھے پڑھا دیا تو اپنے پیروں پر چل سکتا ہے۔ آنے والا وقت تجھ پر بھاری ضرور ہے مگر تجھ کو وہ بوجھ اٹھانا ہے کیونکہ مجھے تیری ضرورت ہے۔ شاید آگے تقدیر کچھ اور نیا راستہ بتلا دے۔“

گوبندہ بنگلے پر آ گیا۔ مونی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ گوبندہ نے بڑے دھیان سے باپ کی بات سنی تھی اور سمجھ لی تھی۔ مونی گوبندہ کو لے کر اپنے بیڈروم میں آ گئی اور بولی ”تم بہت ہینڈسم ہے۔“

گوبندہ اپنی تعریف سن کر خوش نہیں ہوا۔ اس کو ایسے لگا جیسے وہ ایک چوہا ہے اور مونی بھوکی بلی ہے۔ اس کا تعریف کرنا اس سے کھیلنا بالکل بلی کا کھیل تھا۔ نہ وہ بھاگ سکتا تھا نہ بلی پر حملہ کر سکتا تھا۔ دونوں صورتوں میں نقصان اس کا ہی ہونا تھا۔ اس لئے وہ خاموش تھا۔ لیکن گوبندہ نے اپنے لئے اور اپنے خاندان کے لئے بہت کچھ حاصل کر لیا۔ اس نے سوچا کہ جب مجھے خوراک ہی بننا ہے تو میں کیوں شرم کروں۔ وہ کم از کم اپنے باپ سے تو ہوشیار تھا جو بات رامو کی سمجھ میں دیر سے آئی تھی وہ بات گوبندہ کی سمجھ میں فوراً آ گئی۔

چند مہینوں میں گوبندہ شہر کا دولت مند آدمی تھا۔ اس کا حکم چلتا تھا۔ انگریز گورنمنٹ سے وہ جو چاہتا حاصل کر لیتا۔ بہترین زمینیں اس کے پاس تھیں۔ بہت بڑا مکان تھا اور ہر عیش اس کو حاصل تھا۔ اس نے بہت آگے کا سوچ لیا تھا۔ رامو کی سوچ جہاں ختم ہوتی تھی۔ وہیں سے گوبندہ کی سوچ شروع ہوتی تھی۔ اس کے تعلقات صرف مونی تک نہیں تھے...... انگریزوں کی اور بھی بہت سی بیگمات اس کی دوست تھیں۔ وہ صرف بہت بڑے آفیسرز کی بیگمات سے ہی ملتا تھا۔ اس نے اپنا ایک معیار قائم کر دیا تھا۔ گوبندہ ان سے بڑے فائدہ اٹھا لیا کرتا تھا۔ اب اس کا پھیلاؤ ناگ پور سے نکل کر دوسرے شہروں تک آ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا گوروں کو ایک نہ ایک دن یہ ملک چھوڑنا پڑے گا۔ وہ پڑھتا تھا۔ اخبارات اس کی طرف اشارہ کر رہے تھے...... اندر ہی اندر کھچڑی پک رہی تھی۔ مگر انگریزی گورنمنٹ کا دباؤ اور خوف سب کو روکے ہوئے تھا۔ مگر کب تک آخر میرٹھ سے صدائے آزادی آ گئی اور باغی فوج نے دلی کی طرف کوچ کر دیا۔ درمیان میں گوروں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ جس کا انتظار رامو کو تھا وہ وقت آ گیا۔ نفرت کا جو دریا رامو کے اندر رکا ہوا تھا وہ باہر آنے کو بے چین ہو گیا۔

رامو پر مونٹی کو بہت بھروسہ تھا۔ پولیس کے علاوہ رامو کی بھی یہ ڈیوٹی تھی کہ وہ ان کا خیال کرے گا۔ مونٹی تو بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ مونی کی حفاظت رامو پر تھی۔ بنگلے کے باہر سخت پہرہ تھا۔ مگر رامو اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا اور اس نے مونی کے ٹکڑے کر دیئے اور پھر خود ہی مونی کے مارے جانے کا شور کر دیا اور دہاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس نے بڑا کامیاب ڈرامہ کیا۔ مونٹی بھی اس کے ڈرامے سے متاثر ہوا۔ اس نے بیان دیا کہ وہ اپنے کواٹر میں گیا ہوا تھا کہ رات کو واپس آیا تو مونی کی لاش پڑی تھی۔ اس نے کسی قاتل کو نہیں دیکھا۔ مگر انگریز بال کی کھال اتارنے والی قوم ہے انگریز وکیلوں نے چکر دے کر ہر پہلو سے اس سے سوالات کئے مگر وہ اپنے بیان پر جما رہا۔ مونٹی نے اس پر شک نہیں کیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ رامو تو مونی کا پالتو کتا تھا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کتے کے اندر ایک انسان بھی تھا۔

اب گوبندہ پر انگریز کی نظریں پڑیں۔ رامو کا تو وہ کچھ نہیں کر سکے۔ اس لئے کہ مونٹی نے اس پر شک نہیں کیا تھا۔ مگر گوبندہ کے معاملے میں اس نے رامو کی کوئی مدد نہیں کی اور گوبندہ کو پولیس نے دلی سے گرفتار کر لیا۔ جس وقت دلی اور اس کے اطراف کے حالات خراب ہوئے وہ اس وقت بھی دلی میں تھا۔ مگر اس کی ناگ پور میں قتل کرنے کا الزام لگایا گیا۔ حیرت سب کو تھی۔

دلی کے ہر دروازے پر پھانسی کا پھندا لٹکا ہوا تھا وہ جس کو چاہتے پھانسی پر چڑھا دیتے کوئی مقدمہ نہیں چلتا تھا۔ اس دور میں اگر گوبندہ پر قتل کا الزام آیا تو کیا انوکھی بات تھی۔ رامو کے پاس بہت روپیہ تھا۔ اس نے ذرا دیر نہیں کی اور دلی کے قابل وکیلوں سے رابطہ کر لیا۔ ذرا دیر کرتا تو شاید انگریزی

READING CORNER
http://readingcorner.blogspot.com/

پولیس اس کو پھانسی گھر کی زینت بنا دیتی۔ مقدمہ دلی میں چلا گیا۔ گوبندہ نے بڑے پختہ ثبوت ناگ پور سے باہر ہونے کے دیئے۔ مگر اس کو نہیں چھوڑا گیا۔ ایک کمشنر کی بیوی قتل ہوئی تھی اور کمشنر بھی خاص ولایت سے آیا ہوا تھا۔ بھلا انگریز کس طرح گوبندہ کو چھوڑ سکتا تھا..... کیس کی تاریخیں پڑتی رہیں..... گواہیاں گزرتی رہیں..... مگر انگریز کی ٹانگ اوپر ہی رہی۔ اس نے گوبندہ کو نہیں چھوڑا۔ انگریز جج کسی طرح قائل نہ ہوا اور گوبندہ جیل میں ہی رہا۔

یہ کیس اتنا مشہور ہوا کہ اس کی بھنک مجھ تک بھی آ گئی اور میں نے رولوکا سے اس کا تذکرہ کر دیا۔ رولوکا نے کہا۔ "ہاں مجھے پتہ ہے۔ وہ لڑکا تو واقعی بے قصور لگتا ہے۔"

"مگر پولیس اس کو چھوڑے گی نہیں۔" میں نے کہا۔

"ایک بے گناہ کو پھانسی نہیں ہونی چاہئے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟" رولوکا نے پوچھا۔

"میں تم سے متفق ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تو پھر کرتے ہیں کچھ....." رولوکا نے جواب دیا۔

جیل میں گوبندہ کو ایک الگ کوٹھڑی میں رکھا گیا تھا اس سے ملاقات پر بھی پابندی تھی۔ مگر رولوکا کے لئے یہ پابندی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ اسی رات گوبندہ کے پاس جیل چلا گیا۔

رات دس بجے کا وقت تھا۔ پہرے پر پولیس والا کوٹھڑی کے باہر بیٹھا تھا۔ کوٹھڑی میں ایک بہت کم روشنی کا بلب روشن تھا۔ رولوکا اندر چلا گیا تالا اپنی جگہ جوں کا توں لگا رہا اور پہرے دار بھی بیٹھا رہا۔ گوبندہ ایک میلے کمبل پر لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں، جاگ رہا تھا۔ رولوکا اس کے سامنے کھڑا تھا اور پھر رولوکا حکیم کامل کے روپ میں ظاہر ہو گیا۔ اس نے حیرت سے پہلے اس کی طرف دیکھا۔ پھر دروازے کو دیکھا۔ وہ بند تھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

رولوکا نے سکون سے کہا۔ "گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔"

"آپ کون ہیں اور بند دروازے سے کس طرح اندر آ گئے۔" وہ حیرت سے بولا۔

"پہرے دار کی مہربانی ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ تم نے جو گواہیاں عدالت میں کان پور سے غیر حاضر ہونے کی پیش کی ہیں وہ ٹھیک ہیں۔ جواب دینے سے پہلے میری یہ بات بھی سن لو کہ میں تمہاری ہمدردی میں آیا ہوں جو سچ ہو وہی بیان کرنا۔ جھوٹ بولو گے تو تم اپنا ہی نقصان کرو گے۔ تمہارا سچ تمہارا بچاؤ کرے گا۔ اب بولو۔" رولوکا نے کہا۔

"میں نہیں جانتا کہ آپ کون ہیں اور میری مدد کیوں کرنا چاہتے ہیں اور اس مدد کے بدلے مجھ سے کیا چاہیں گے اور کس طرح میری مدد کریں گے۔ جبکہ انگریز سرکار میرے خلاف ہے۔" گوبندہ نے کہا۔

"بے شک تم نے درست کہا۔ یہ دنیا مکر و فریب سے بھری ہوئی ہے۔ کوئی کسی کے کام بغیر لالچ یا فائدے کے نہیں آتا مگر تم یہ بھی تسلیم کر لو کہ بعض اوقات انسان ایسے سہاروں کو بھی اہمیت دیتا ہے جو اس کے لئے قابل قبول نہیں ہوتے۔" رولوکا نے کہا۔

"اس کال کوٹھڑی میں آپ کا اس طرح اچانک آ جانا ہی میرے لئے باعث حیرت ہے۔ اس پر آپ میری مدد بھی کرنا چاہتے ہیں جبکہ سرکار کی پوری مشنری میرے خلاف ہے۔ آپ کس طرح میری مدد کریں گے میں تو اپنی موت کا انتظار کر رہا ہوں اور آپ زندگی کی نوید سنا رہے ہیں۔ میرا دماغ اس کو قبول نہیں کر رہا۔ آپ کون ہیں اور کس طرح میری مدد کریں گے۔ ذرا سی وضاحت کر دیں تو سکون سے میں آپ کو بہت کچھ بتاؤں گا۔" گوبندہ نے پوچھا۔

"دیکھو دوست ہر چیز کا ایک ماضی ہوتا ہے۔ میں بھی تمہاری طرح ہی ہوں۔ دو ہاتھ، دو پیروں والا انسان۔ میرا سارا وجود انسانوں جیسا ہے تم جیسا ہے لیکن وقت نے، حالات نے بلکہ یہ کہا جائے کہ اس دنیا نے مجھے یہ مزاج بخشا ہے کہ میں کسی بھی مصیبت زدہ انسان کی مصیبت میں ٹانگ پھنسا دیتا ہوں۔ یہ مزاج آہستہ آہستہ میری عادت بن گیا ہے۔ مگر میں صرف ان لوگوں کی مدد کرنے کی کوشش کرتا ہوں جو حقیقی طور پر بے گناہ ہوتے ہیں۔ سب سے اہم

بات یہی ہے کہ میں نے کہا تھا کہ جھوٹ والا چھپ نہیں سکتا۔ اس کو ضرور سزا ملتی ہے۔ اگر تم سے غلطی ہوئی بھی ہے تو وہ بھی سچ کی پلیٹ میں میرے سامنے رکھ دو۔ میں اس کو ہضم کر جاؤں گا۔" رولوکا نے کہا۔

"ٹھیک ہے مہربان دوست! میں اپنی کہانی آپ کو سناتا ہوں۔" گوبندہ نے اپنی اور اپنے باپ کی پوری کہانی بیان کر دی۔ رامو اور مونی کے بارے میں بھی بتا دیا۔ اپنے اور مونی کے تعلقات بھی بتا دیئے۔ مونی کا قتل رامو نے کیا تھا۔ یہ بات اس کو رامو نے بتا دی تھی وہ بھی گوبندہ نے بتا دیا۔ کسی بات میں کہیں ذرا بھی جھوٹ کا سہارا نہیں لیا۔

"میں نے سچائی کی کڑوی گولی کھالی ہے۔ میں یہ سچائی کسی عدالت میں نہیں بول سکتا تھا مگر آپ کی باتیں میرے دل چھو رہی تھیں۔ اس لئے میں نے کسی مقام پر جھوٹ کا سہارا نہیں لیا۔" گوبندہ خاموش ہو گیا۔

"میں جانتا ہوں تم نے سچ بولا ہے۔ سچ اپنے بارے میں خود اعلان کرتا ہے کہ وہ سچ ہے۔ مگر ہر کسی کے کان اس اعلان کو نہیں سن پاتے۔ اسی طرح عقل دانش سے پرے ایک ایسی پراسرار دنیا کا وجود بھی ہے جہاں کی باتیں مکمل طور پر انسانی سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں کس طرح تمہارے پاس آیا ہوں اور کس طرح آتا رہوں گا یہ سارے پہرے دار اندھے ہیں۔ بہرے ہیں۔ تم ان باتوں پر غور مت کرنا اور کسی سے میرا ذکر مت کرنا۔" رولوکا نے کہا۔

گوبندہ نہایت خاموش متعین اور سنجیدہ مزاج رکھتا تھا۔ مگر اس کے ذہن میں سوالات پر سوالات آ رہے تھے۔ وہ خاموشی سے رولوکا کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی عقل اس کو کوئی جواب نہیں دے رہی تھی۔ رولوکا مسکرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "میں جانتا ہوں تمہارے اندر کیا بھونچال آیا ہوا ہے مگر تم کو اس پر بند باندھنا ہے۔ زیادہ کریدا اور حد سے زیادہ بڑھا ہوا تجسس نقصان بھی کرتا ہے۔ میں جا رہا ہوں پھر بہت جلد آؤں گا۔" اور رولوکا لوہے کا بند دروازہ کھول کر چلا گیا۔ گوبندہ کے لئے یہ بھی کم حیرت ناک نہ تھا۔ گوبندہ کی رہائی میں سب سے بڑی رکاوٹ انگریز جج تھا۔ وہ کمشنر مونٹی کا دوست تھا۔ رولوکا کے لئے یہ پتہ چلانا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ وہ ناگ پور مونٹی کے بنگلے پر چلا گیا۔ مونٹی کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ مگر وہ کہیں نہیں جا سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رولوکا مونی کے روپ میں اس کے پاس گیا تھا۔ مونی جو مر چکی تھی جس کو رامو نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ رولوکا نے اس کے فوٹو وغیرہ دیکھ کر اس کی عادت و اطوار چیک کرنے کے بعد یہ روپ دھارا تھا۔ مونٹی اس کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ پہلے تو ڈرا پھر والہانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا۔ مونی اس سے دور ہو گئی اور بولی۔ "میرے قریب نہ آنا۔ میں زندہ نہیں ہوں تم نے خود تابوت میں مجھے دفن کیا ہے۔"

مونٹی ڈر کر رک گیا اور خوف زدہ آواز میں بولا۔ "تو پھر تم کس طرح آ گئیں۔"

"مجھے آنا تو تھا مگر آنے میں دیر ہو گئی۔ تم نہیں جانتے تم زندہ ہو۔ مرنے کے بعد آدمی پر کچھ سختی ہوتی ہے۔ اس کے لئے اپنی جگہ چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ میں تمہیں بتانا چاہتی تھی کہ زندگی بڑی بے رحم ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ جو زندگی گزاری..... اس میں نہ میں مخلص تھی نا تم تھے۔ انسان آرزوؤں کی آغوش میں جاگتا ہے اور ساری عمر جس گاڑی پر سفر کرتا ہے وہ دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک جھوٹ کی اور ایک سچ کی۔ میں نے مرنے کے بعد دیکھا کہ جو لوگ سچ کی گاڑی پر چڑھ کر اوپر گئے وہ سکون سے ہیں اور جو جھوٹ کی گاڑی پر آئے وہ بے چین ہیں۔ ابھی فیصلے کا تو وقت آیا ہی نہیں جب فیصلہ ہو گا تو آگے کا پتہ چلے گا۔ میں نے جو کچھ کیا اس سے مجھے صرف مایوسیاں اور اندھیرے ملے ہیں۔

زندگی کی کہانی بہت مختصر بھی ہے اور بہت لمبی بھی ہے اور بہت بھیانک بھی ہے۔ تم نے ایک بے گناہ کو سزا دینے کا پکا ارادہ کر رکھا ہے اور گناہ گار آزاد ہے۔ میں تم کو بتانے آئی ہوں کہ میرا قاتل رامو ہے گوبندہ بے قصور ہے۔ تم رامو پر قتل کا الزام لگا سکتے ہو مگر اس نے جن حالات میں قتل کیا وہ حالات میں نے خود پیدا کئے تھے..... میرے اور تمہارے معاشرے نے پیدا کئے تھے۔ بس یہی مجھے کہنا تھا۔ اب جو کرنا ہے تم کو کرنا ہے۔ اگر اب بھی تم نہ سمجھے تو یاد رکھو

READING CORNER http://readingcornerpk.blogspot.com/

تم کو بھی ایک دن مرنا ہے۔ تم بھی جھوٹ کی گاڑی پر آؤ گے اور اندھیرے تمہارا بھی مقدر ہوں گے۔"

اور موتی اچانک غائب ہو گئی۔ رولو کا روپوش ہو کر موتی کا ردعمل دیکھنے لگا۔ موتی کا چہرہ سرخ تھا وہ کمرے میں چکر لگا رہا تھا۔ پھر میز کے قریب گیا۔ اس پر چھٹی کی درخواست لکھی اور دفتر چلا گیا۔ وہ دوسرے دن دلی جا رہا تھا۔ رولو کا اس کے ساتھ تھا۔ موتی گاڑی سے اتر کر سیدھا جج کے بنگلے پر گیا۔ جج اس کو اچانک سامنے پا کر حیران ہوا اور بولا۔ "موتی تم کیسا آیا ہم ادھر ہے نا۔"

"مجھے پتہ ہے تم نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔ گوبندہ کو چھوڑ دو وہ قاتل نہیں ہے۔" موتی نے کہا۔

"یہ تو مجھے پتہ ہے مگر اس کو چھوڑ کیوں دوں......" جج نے جواب دیا۔

"اصل قاتل اس کا باپ رامو ہے میں سخت غلطی پر تھا" موتی نے کہا۔

"تم پہلے اس کو بچایا تھا۔" جج نے کہا۔

"موتی کا اصل لور رامو ہی تھا۔ وہ رامو کو بہت پسند کرتی تھی۔ پھر اس کا لڑکا جوان ہوا۔ موتی نے اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ رامو نے شاید اسی غصے میں اس کو قتل کر دیا تھا۔ موتی نے مجھے خود بتایا ہے کہ اس کا قاتل رامو ہے۔"

موتی خاموش ہوا تو جج نے حیرت سے کہا۔

"موتی تم ادھر انڈیا میں رہ کر دقیانوس ہو گیا ہے۔ موتی مر گئی پھر تمہارے پاس کیونکر آ کر بتا گئی۔ تمہارا دماغ ٹھکانے پر نہیں ہے۔ تم چھٹی لے کر آرام کرو۔ دونوں ایک ہفتہ کے واسطے میسور چلتے ہیں ریسٹ کریں گے اور موج کریں گے۔" جج نے کہا۔

"میں جانتا ہوں تم میری بات کا اعتبار نہیں کرو گے۔ مگر یہ حقیقت ہے موتی میرے پاس آئی تھی۔ اس کی خواہش ہے کہ گوبندہ کو چھوڑا جائے۔ اگر سزا دینی ہے تو رامو کو دی جائے۔" موتی نے کہا۔

"دل نہیں مانتا مگر یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے گوبندہ کو چھوڑ دوں گا مگر تم یہ انڈین لوگ سے ہمدردی کا ڈرامہ ختم کرو۔ پہلے رامو کو بچایا۔ اب گوبندہ کو بچاتے ہو۔ یہ بات ہم لوگ کی پالیسی کے خلاف ہے۔ ہم کو حکومت کرنا ہے۔ انڈیا پر ہم لوگ رحم کریں گے تو یہ لوگ ہم کو قابل رحم بنا دیں گے۔ تم نے دیکھا میرٹھ سے دلی تک کیا ہوا۔ ان کو ذرا بھی موقع ملے گا تو یہ لوگ پھر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ان کو اس قابل ہی نہ رہنے دو کہ دوبارہ کھڑے ہوں۔ تم میرے دوست ہو اس لئے سمجھا رہا ہوں۔ دوسرا ہوتا تو اس کو واپس جانا پڑتا۔ میری بات سمجھ میں آ گئی۔"

"تم کو میں بھی اپنا دوست مانتا ہوں۔ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں خود توہمات پر یقین نہیں کرتا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ موتی میرے پاس آئی تھی دن کا وقت تھا میں نے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ میری عقل اس کو نہیں مانتی مگر تم یہ بتاؤ تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے۔" موتی نے کہا۔

"میں کیا کرتا یہ تو بتانا مشکل ہے لیکن تم نے جو کہا ہے میں وہی کروں گا۔ گوبندہ کو چھوڑ دوں گا۔"

اور وہی ہوا گوبندہ تین پیشیوں کے بعد رہا کر دیا گیا اور رامو گرفتار ہو گیا۔ مگر رامو نے اقرار قتل نہیں کیا۔ پھر نئی گواہیاں ہونے لگیں۔ ناگ پور میں پولیس کو چشم دید گواہ کوئی نہیں ملا۔ اخبارات روز نئی کہانی بیان کرنے لگے۔ پہلے جج گوبندہ کو سزا دینا چاہتا تھا جبکہ وہ جانتا تھا کہ گوبندہ ناگ پور میں قتل والے دن نہیں تھا۔ رامو کے بارے میں جانتا تھا کہ وہ قاتل ہے مگر عدم ثبوت کی وجہ سے سزا دینا مشکل ہو رہا تھا۔ گوبندہ نے بڑے بڑے اچھے وکیل کیے تھے۔ کیس کی نوعیت ہر روز بدل رہی تھی۔ ہر روز نئی خبر اخبارات میں آ رہی تھی۔ سرکار انگلشیہ کی پوری مشنری رامو کے خلاف کام کر رہی تھی مگر بات چونکہ قانونی ہو گئی تھی اس لئے جج چاہتے ہوئے بھی سزا کس بنیاد پر دے۔ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

پھر ایک دوسرا حربہ اختیار کیا گیا۔ موتی نے ایک چوری کی رپورٹ بنوائی۔ یہ قتل سے دو روز پہلے کی تاریخ کی تھی اور چوری کا الزام رامو پر ڈالا گیا اور اس جرم میں جج نے زیادہ سے زیادہ سزا پانچ سال سنا دی۔ قتل کا مقدمہ ختم کر دیا

اور رامو پانچ سال کے لئے جیل چلا گیا۔ اس مقدمے میں رولو کا کہیں سامنے نہیں آیا۔ رامو کے خلاف سارے ثبوت البتہ رولو کا نے ختم کرائے۔ مگر چوری کے مقدمے میں وہ الگ ہو گیا اور رامو ایک ناکردہ گناہ کی پاداش میں جیل چلا گیا۔ میں نے اس بارے میں رولو کا سے پوچھا۔

"تم نے آخری لمحات میں رامو کو اکیلا چھوڑ دیا...... کیوں......؟"

"بہت موٹی سی بات ہے حکیم صاحب۔ اس نے گناہ تو کیا تھا نا۔ مانا کہ حالات نے اس سے یہ سب کرایا تھا کسی بھی انسان کا خون ہو، سب کا رنگ سرخ ہی ہوتا ہے کسی کو یہ حق نہیں کہ کوئی کسی کی جان لے لے۔ رامو کو سزا تو دینا تھی اور سزا اس کو مل گئی۔" رولو کا نے جواب دیا۔

"ہاں ایک محکوم قوم کو سزا تو ملتی ہی ہے رامو کا گناہ تو ہم کو پتہ ہے مگر بعض دفعہ بلکہ اکثر تو یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس گناہ کی سزا ہے۔ انگریزی قانون دو طرح کا ہے ایک کالی قوم کے لئے ایک گوری قوم کے لئے جو قوانین ہندوستان میں چلتے ہیں۔ وہ انگلینڈ میں نہیں ہیں۔ یہ قانون صرف محکوم قوم کے لئے بنائے گئے ہیں۔ پولیس اور انتظامیہ کو بے حساب اختیارات دیئے گئے ہیں تاکہ وہ ہندوستانی عوام کو دبا سکیں۔" میں نے جواب دیا۔

☆......☆......☆

راجستھان میں ایک چھوٹا سا شہر بیکانیر ہے۔ یہاں پر چھوٹی لائن کی ریلوے چلتی ہے اور ساری گاڑیاں پتھر کے کوئلے سے چلائی جاتی ہیں۔ ریلوے ملازمین کے لئے ایک کالونی اسٹیشن کے قریب ہی بنائی گئی ہے۔ یہیں پر امام دین رہتا ہے۔ امام دین فائر مین کا کام کرتا ہے۔ فائر مین کا کام انجن میں کوئلہ جھونکنا ہوتا ہے۔ فائر مین کا اٹھنا بیٹھنا سب کوئلے کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ وہ بھی کوئلہ نظر آنے لگتا ہے۔ پتھر کا کوئلہ چمکیلا کالا ہوتا ہے۔ امام دین جب ریلوے میں بھرتی ہوا تھا اس وقت اس کا رنگ سانولا تھا۔ مگر دس سال تک کوئلے کی محبت میں رہ کر وہ خود بھی کوئلے کے رنگ کا ہو چکا تھا۔ وہ دو دو دن گھر سے دور رہا کرتا تھا۔ اس کا سارا وقت کوئلہ توڑنے اور جھونکنے میں گزرتا تھا۔ کوئلے کے انجن میں اتنی جگہ نہیں ہوتی کہ وہ کسی وقت تھک کر بیٹھ سکے۔ اگر بیٹھنا ضروری ہی ہو تو کوئلے کے اوپر ہی بیٹھا جا سکتا ہے۔ وہاں پر اس کا ایک ساتھی مگر رینک میں اس سے ایک درجے کم آدمی ہوتا ہے۔ اس کا کام کوئلہ کے بڑے بڑے ڈھیلوں کو اتنا چھوٹا کرنا ہوتا ہے جو بیلچے میں اٹھائے جا سکیں۔ انجن کی رفتار کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو پورا ایندھن دیا جائے۔ یہ ذمہ داری فائر مین پر ہوتی ہے۔ بوائلر میں ایک گول کھڑکی اندر کی طرف کھلتی ہے۔ اس کے کھلتے ہی آگ کی لپٹیں اپنی زبان کھڑکی سے باہر نکالنے لگتی ہیں سخت گرمی اس کے سامنے کھڑے ہونے پر لگتی ہے۔ مگر فائر مین کی یہ ڈیوٹی ہوتی ہے کہ وہ اس کے سامنے نہ صرف کھڑا رہے بلکہ ایک بھاری بیلچے سے اس کے اندر کوئلہ بھی جھونکتا رہے۔ یہ بیلچہ بھی بڑا ہوتا ہے اس میں ڈھائی سے تین سیر کوئلہ آتا ہے۔ فائر مین یہ کرتا ہے۔ انجن کی حرکت کو قائم رکھنا فائر مین کا ہی کام ہے۔ ریلوے کی تمام ملازمتوں میں یہ بہت محنت طلب اور خطرناک ملازمت ہے۔ ڈرائیور کو تو اپنی مطلوبہ اسٹیم چاہئے وہ صرف اشارہ کرتا ہے اور فائر مین اسٹیم بناتا ہے۔ امام دین جب واپس آتا تھا اس وقت وہ اتنا تھکا ہارا ہوتا تھا کہ آتے ہی لیٹ جاتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے پڑوس میں کون رہتا ہے۔ وہ اتنا تھکا ہوتا تھا کہ بہت سے گھر کے ضروری کام بھی نہیں کر پاتا تھا۔ ایک دفعہ وہ واپس آیا تو پتہ چلا کہ اس کی بیوی سخت بیمار ہے۔ اس کا بیٹا جو کہ دس سال کا تھا۔ کیا کرتا۔ بازار سے حکیم جی سے دوائی وہ لایا تھا۔ حکیم جی نے آ کر دیکھ بھی لیا تھا اس سے آگے وہ اور کیا کرتا۔ امام دین بیوی کو لے کر اسپتال چلا گیا۔ ریلوے ہسپتال میں دوائیں کم اور گھڑکیاں زیادہ تھیں۔

دو دن بیوی زندہ رہی اور پھر مر گئی۔ وہ لاش لے آیا اور قریبی قبرستان میں دفن کر دیا۔ اس سے زیادہ وہ کیا کر سکتا تھا۔ اب گھر میں ایک بیٹا اکیلا رہ گیا۔ اسے تو گاڑی لے کر جانا ہی تھا۔ بیٹے کرم دین کی روٹی پانی کا کیا ہوگا۔ وہ بوا کورا

READING CORNER
http://readingpk.blogspot.com/

مائی کے پاس چلا گیا۔ کورا مائی ایک ہمدرد عورت تھی۔ کرم دین کو جانتی تھی اس نے کرم دین کو روٹی کھلانے اور دیکھ بھال کرنے کی ذمہ داری لے لی۔ امام دین ڈیوٹی پر چلا گیا۔

ایک سال گزر گیا۔ وہ بے پڑھا لکھا آدمی نہ تھا۔ بیوی زندہ تھی تو گھر میں اس کو رونق نظر آتی تھی۔ اس کی بیوی اس کا انتظار کرتی تھی۔ اس کے تھکے ہاتھ پیر دباتی تھی اور چاؤ سے اسے کھانا کھلاتی تھی اور اس کو ہر طرح آرام پہنچانے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر اس کے بعد تو گھر میں چراغ بھی کوئی نہیں جلاتا تھا۔ کوڑا کرکٹ پورے کوارٹر میں بھرا ہوا تھا۔ ریت ہر طرف پھیلی ہوئی تھی کیونکہ یہاں پر ریت بہت اڑتی تھی۔ وہ گھر آکر بڑا اداس ہو جاتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ انجن پر ہی رہتا۔ یہاں کیا رکھا تھا اس کے لئے، ہاں ایک کرم دین تھا جو باپ کا انتظار کرتا تھا وہ اس کے لئے شہر کی اچھی اچھی کھانے کی چیزیں لے آتا کورا مائی کو دے دیتا کہ کرم دین کو کھلا دیا کرو۔ کورا مائی بے ایمانی نہیں کرتی اور سب کچھ کرم دین کو کھلاتی۔ امام دین ہر ماہ اس کو پانچ روپے کرم دین کے رہنے کے کورا مائی کو دے دیا کرتا تھا۔ یہ رقم اتنی تھی کہ کورا مائی خود بھی پورے مہینے اس میں کھاتی تھی۔ اس کے لئے یہ بہت سہارا تھا۔

کورا مائی ایک ہندو عورت تھی۔ امام دین نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس کے پاس کرم دین اس کا بیٹا رہے گا تو آگے چل کر اس کو کیا نقصان ہوگا۔ وہ تو خوش تھا کہ اس کا بچہ ٹھیک رہ رہا ہے۔ اس کو کیا پتہ کہ وہ مسجد جاتا ہے یا کورا مائی اس کو مندر لے جاتی ہے۔ کورا مائی جتنی سیدھی نظر آتی تھی۔ ایسی نہیں تھی۔ وہ اندر سے کٹر ہندو تھی۔ کسی مسلمان کے بچے کو گھر میں رکھنا اس کی کوئی تو وجہ ہوگی۔ اس نے ذہن میں کچھ تو پلان بنایا ہوگا۔

امام دین ضرور سیدھا شریف آدمی تھا وہ تو کورا مائی کا احسان مانتا تھا۔ اس کی ضروریات اپنی اوقات سے بڑھ کر پوری کرتا تھا۔ "ارے اماں تو کب تک اندھیرے گھر میں اکیلا پڑا رہے گا۔" ایک دن کورا مائی نے امام دین سے کہا۔

"تو اور کا کروں مائی، اور ے دھورے نہ کوئی ساتھی سنگی ہے کہ کہاں جاؤں۔ ڈیوٹی سے گھر نہ آؤں تو کیا کروں۔" امام دین نے جواب دیا۔

"تو میری مانے تو بتاؤں۔" کورا مائی نے کہا۔

"مانوں گا کیوں نا مانوں گا بول تو کا بات ہے۔"

"تو ایسا کر دوسری جورو کر لے۔ ارے تو بوڑھا تو نہیں ہو گیا۔ ایک مر گئی تو کیا ہوا۔ میں جانوں ہوں تو رے عورت کی ضرورت ہے اور سن مرد عورت کے بغیر بے کار اونٹ ہے۔ ارے گھر میں چراغ تو جلا ملے گا۔ روٹی پانی تو ملے گا تیرے سو کام وہ کرے گی اب بول کیا ارادہ ہے۔"

امام دین گردن جھکائے سوچتا رہا کورا مائی کی باتوں کی سچائی کو پرکھتا رہا اور پھر بولا۔ "مائی بات تیری درست ہے۔ دل کو لاگے ہے پر میری عمر اب کچھ زیادہ نہیں ہو گئی ہے۔ کون اپنی چھوری دے گا۔"

کورا مائی نے کہا۔ "تو اس کی فکر نہ کر۔ تیری ذات کی بہت سی میری جاننے والی ہیں۔ ایک کیا بہت چھوریاں مل جائیں گی اب یہ کام میرا ہے تو فکر نہ کر۔"

اور پھر یوں ہوا کہ امام دین کا نکاح شریفن سے ہو گیا۔ شریفن ایک بیوہ تھی۔ اس کا پہلا آدمی شنٹنگ پوٹر تھا۔ ڈیوٹی کے دوران ہی گاڑی سے کٹ کر مر گیا تھا۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ شریفن بھی کوئی نوعمر لڑکی نہیں تھی۔ پورے پانچ سال شوہر کے ساتھ رہ چکی تھی۔ زبان کی تیز اور باتونی عورت تھی اور اس کی اماں تو اس سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کرم دین جہاں ہے وہیں رہے گا۔ میرے ساتھ اس کا گزارہ نہیں ہوگا۔ کورا مائی نے امام دین کے آگے شریفن کی جو تعریفیں اور خوبیاں بیان کی تھیں ان سے امام دین بہت متاثر تھا اور کرم دین کا معاملہ تو نکاح کے بعد اٹھایا گیا تھا۔ اس میں بھی کورا مائی کی چالاکی تھی۔

کورا مائی کرم دین کو اپنے ہی پاس رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے امام دین کے گرد ایسا جال پھیلایا کہ وہ اس میں بری طرح پھنس گیا۔ کرم دین کا ٹھکانا صرف کورا مائی کا گھر رہ گیا۔ امام دین اپنے بیٹے کو چاہتا تھا۔ اپنے گھر میں اس کو رکھ نہیں سکتا تھا۔ چند روز ہی میں شریفن

نے وہ کل پرزے نکالے کہ امام دین جو گھر آکر آرام کرنے کا عادی تھا۔ اس کو وہ عادت چھوڑنا پڑی۔ کیونکہ شریفن بازار کے اتنے کام اس کے لئے اٹھا رکھتی تھی کہ وہ بازار کے چکر ہی لگاتا رہتا۔ اخراجات میں اتنا اضافہ ہو گیا تھا کہ اس کے پاس کورا مائی کو دینے کو کچھ نہیں بچتا تھا۔ فائرمین کی کتنی تنخواہ ہوتی ہے۔ شریفن کو پتہ تھا وہ ایک ایک روپے کا حساب امام دین سے لیا کرتی تھی۔ کسی بھی بھول چوک کی گنجائش اس لئے نہیں تھی کہ اس کی ماں اس کی مدد کو موجود رہتی تھی۔ امام دین بڑی پریشانی میں کورا مائی سے ملا اور شرمندگی سے بولا۔ "مائی میں اب تم کو خرچ نہیں دے سکوں گا۔ خرچ بڑھ گئے ہیں۔"

کورا مائی کے پلان میں تو یہ تھا کہ امام دین اس سے ایک نہ ایک دن یہ کہے گا۔ وہ بڑی ہوشیار عورت تھی۔ مسکرا کر بولی۔ "ارے تو کیا ہوا.....؟ جو میں کھاؤں گی وہی کرم دین کھائے گا۔ تو چنتا کاہے کرتا ہے۔"

"چنتا کی تو بات ہے تم تو خود بے سہارا ہو۔" امام دین نے کہا۔

"میں بے سہارا کب ہوں۔ تو نے یہ خوب کہی..... میرا سہارا تو بھگوان ہیں..... وہی سب کچھ بندوبست کرتے ہیں۔" کورا مائی نے جواب دیا۔

"تم نے یہ احسان کم نہیں کیا کہ چھورے کو اپنے پاس رکھ لیا اور اب کھلاؤ گی بھی۔ تم نے دوسری جورو کر کے تو مجھے ایک بہت بڑی بپدا میں ڈال دیا ہے۔" امام دین نے کہا۔

"ارے کیسی وپدا تو نچنت ہو جا۔ تیرا چھورا آرام سے رہے گا۔" کورا مائی نے جواب دیا۔

امام دین کیا کر سکتا تھا۔ شریفن اور اس کی ماں تو کسی حالت میں کرم دین کو رکھنے پر راضی نہیں تھیں۔ اس کے اعصاب میں شدید اضطرابی کیفیت تھی۔ اس کا دل کسی طرف نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اسی کیفیت میں امام صاحب کے پاس چلا گیا۔ یہ بیکانیر کی بڑی مسجد تھی۔ اندر ہی ایک حجرے میں امام صاحب رہتے تھے۔ اس نے جاتے ہی کہا میں ایک کام سے آیا ہوں۔

امام صاحب نے کہا۔ "پہلے دیکھا نہیں کہاں سے آئے ہو؟"

"یہیں ریلوے کالونی میں رہتا ہوں۔ ریلوے میں فائرمین ہوں۔" امام دین نے جواب دیا۔

"کبھی مسجد بھی آجایا کرو جو لوگ آتے رہتے ہیں ان سب کو میں جانتا ہوں۔" امام صاحب نے جواب دیا۔

"بات یہ ہے مولوی صاحب کہ میرا ایک لڑکا ہے۔ اس کی ماں مر گئی ہے۔ میں نے دوسرا نکاح کر لیا ہے۔ وہ عورت اس لڑکے کو اپنے پاس نہیں رکھتی۔ میں نے اس کو ایک عورت کے پاس رکھ دیا ہے۔ نکاح سے پہلے بھی وہ وہیں پر رہتا تھا۔ میں اس عورت کو خرچ دے دیا کرتا تھا۔ مگر اب اخراجات بڑھ گئے ہیں۔ دوسرے میری پوری تنخواہ بیوی رکھ لیتی ہے۔ میں اپنے بیٹے کا خرچ نہیں دے سکتا۔ جس عورت کے پاس لڑکا رہتا ہے وہ ہندو ہے۔ اب میں کیا کروں۔ وہ عورت میرے بغیر خرچ دیئے بھی لڑکے کو رکھنے پر راضی ہے۔" امام دین نے بات پوری کی تو امام صاحب بولے۔

"تو پھر پریشانی کیا ہے..... وہ عورت بغیر پیسے دیئے رکھ تو رہی ہے۔"

"امام صاحب میں تو جاہل آدمی ہوں۔ مذہب سے بھی دور ہوں مگر ہوں تو مسلمان نام کا ہی سہی۔ میرا لڑکا ہندو کا کھا کر بڑا ہوگا، ہندو نہیں ہو جائے گا۔" امام دین نے کہا۔

"تم مسلمان کا کھا کر مسلمان نہیں بن سکے تو پھر لڑکے کی فکر کیوں کرتے ہو۔" امام صاحب نے جواب دیا۔

امام دین نے ان کی بات پر غور کیا اور شرمندہ ہو کر بولا۔ "بے شک آپ کی بات ٹھیک ہے مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ کوئی مسلمان اس کو اپنے پاس رکھ لے چاہے نوکر بنا کر رکھ لے۔"

"انسان اپنی تقدیر اور رزق اوپر سے لاتا ہے اس کو بدلنا ناممکن ہے۔ اس لئے تم اس کی فکر نہ کرو۔ اس کو جن حالات میں پرورش ہونا ہے وہ ہوگا اور اگر تم خود کچھ کر سکو تو کر لو۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔" اور امام صاحب چلے گئے۔ وہ کتنی امیدیں اور آس لے کر ان کے پاس آیا تھا۔ اگر

READING COPIER
http://readingcopier.blogspot.com/

اسے پتہ ہوتا کہ ایسا کورا جواب اس کو ملے گا تو وہ نہ آتا۔ اب رسی کا آخری سرا بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ وہ سخت ناامید ہوا۔

اور کرم دین کورامائی کے پاس ہی رہا۔ کورامائی نے اس کو دھارمک کہانیاں سنانا شروع کردیں۔ اس کے کچے ذہن کو اپنی لائن پر لانے لگی۔ اس نے خدائے واحد کو بھلانے کے لئے برہما، شیوا اور وشنو بھگوان کے قصے سنانا شروع کردیئے۔ من گھڑت دیویوں کے مافوق الفطرت واقعات اور ان کی طاقت کی بابت اس کے کچے ذہن میں ڈالنا شروع کردیا۔ اس نے ہندوؤں کی خرابیوں کو خوبیاں بنا کر پیش کردیا۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کو مندر بھی لے جاتی۔ وہاں کا پنڈت کورامائی کا سارا پلان جانتا تھا۔ پنڈت نے ویدوں کے قصے سنانا شروع کردیئے اور بچے کا ذہن ان کو قبول کرتا گیا اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اس نے اپنا نام وکرم رکھ لیا۔ باپ کی طرف سے تو وہ بہت پہلے ہی منہ موڑ چکا تھا۔ کورامائی نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھائی تھی کہ تو امام دین کے گھر بعد میں پیدا ہوا ہے۔ پہلا جنم تو تیرا میرے گھر ہوا تھا۔ تیرا نام وکرم میں نے رکھا تھا اور پھر تو گاڑی سے کٹ کر مر گیا اور دوبارہ امام دین کے گھر پیدا ہوا۔ تو اصل میں وکرم ہی ہے اور تیرا اصل دھرم ہندو ہی ہے۔ یہ بھگوان کی لیلا ہے کہ تو مجھے پھر مل گیا ہے۔ میں ہی تیری ماں ہوں اور کرم دین نے پوری طرح کورامائی کی اس بات کو تسلیم کرلیا تھا۔ کیونکہ بچہ تو ایک بیل کی مانند ہوتا ہے۔ بیل کے قریب جو ہو وہ اس کے سہارے اوپر چڑھتی ہے۔ اس کا اولین سہارا ہوتا ہے۔ وہی اس کے لئے بڑا اہم ہوتا ہے اور اس پر پجاری بھی پالش کررہا تھا۔ وہ ذہنی طور پر کورامائی کا مذہب قبول کرچکا تھا۔

پٹری پر ریل دوڑتی ہی رہتی ہے۔ اس دوڑتی ریل کے ساتھ امام دین بھی دوڑتا رہا۔ اسی دوڑ بھاگ میں اس کے آنگن میں رونق بڑھتی گئی۔ وہ کئی دفعہ کورامائی کی طرف گیا بھی مگر پھر اتنی بھیڑ ہوگئی کہ شریفن نے اس کو بھلا دیا کہ اس کا کوئی لڑکا بھی تھا۔ شریفن نے اس کو اولاد کی دولت سے مالا مال کردیا۔ وہ اپنے مال پر بہت خوش تھا اور پھر اس کو ریٹائر کردیا گیا۔ وہ بیکار ہو کر گھر بیٹھ گیا۔ ریلوے کا کوارٹر خالی کرکے قریب کے ایک گاؤں میں چلا گیا۔ کرم دین کو وہ بھول گیا اور وکرم کو تو کچھ یاد ہی نہیں تھا۔ کورامائی مرگئی۔ پنڈت نے وکرم کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ مندر میں رہنے لگا۔

یہ تھی وکرم پنڈت کی کہانی۔ وکرم پنڈت راجستھان کا ایک بدنام آدمی تھا۔ بدنام تو اس کو میں کہہ رہا ہوں۔ ہندو اس کو نیک نام ہی کہتے تھے۔ وہ کٹر قسم کا پنڈت تھا۔ رہتا تو وہ مندر میں ہی تھا مگر اس کا واسطہ مندر سے بہت کم تھا۔ پجاری اس سے ڈرتے تھے۔ وہ کسی کو معاف نہیں کرتا تھا۔ مسلمانوں کا تو وہ کٹر دشمن تھا۔ پنڈت نے اس کے ذہن میں مسلمانوں سے نفرت کا جو بیج بویا گیا تھا وہ اب پورا درخت بن گیا تھا۔ دوست تو وہ ہندو کا بھی نہیں تھا کیونکہ اس نے جو راستہ اپنایا تھا وہ شیطان کا تھا۔ سوتیلی ماں کی نفرت اس کو یاد تھی اور باپ کی بے بسی نے باپ سے نفرت کا سبق دیا تھا۔ کورامائی اندرونی طور پر وہ نہیں تھی جو نظر آتی تھی۔ وہ کالی مائی کی پجارن تھی اور پنڈت کی ساتھی..... کورامائی کے بعد کورامائی کا سارا علم وکرم کے حصے میں آگیا تھا۔ چھوٹے برتن میں کڑی پکائی جائے تو وہ ہر ابال کے ساتھ برتن سے باہر نکل جاتی ہے۔ وہی حال وکرم پنڈت کا تھا۔ وہ لوگوں کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچاتا تھا اور جو فائدہ وہ کسی کو پہنچاتا تھا اس کے بدلے وہ اس سے اتنا کچھ وصول کرتا تھا کہ آدمی قلاش ہو جاتا تھا۔

یہ ساری کہانی کسی ایک روای کی بیان کردہ نہیں تھی مگر رولوکا نے جب وکرم پنڈت کے بارے میں معلومات جمع کیں تو سب ہی کچی باتیں تھیں۔ سوائے اس کے کہ وہ معمولی پنڈت ہے۔ وکرم پنڈت ایک بھاری پتھر تھا اور اس کا حجم بڑھتا ہی جارہا تھا۔ وہ بیکانیر سے باہر بھی پھیل رہا تھا۔ وہ شیطانی طاقت کا دل کھول کر استعمال کررہا ہے۔ مجھے یہ جان کر از حد رنج ہوا کہ وہ ایک مسلمان کے گھر پیدا ہوا اور پھر ہندو ہوگیا۔ میں نے رولوکا سے کہا تو رولوکا نے جواب دیا۔

"بے شک وکرم پنڈت مسلمان کے گھر پیدا

ہوا تھا۔ آپ کو یہ تو پتہ ہوگا کہ انسان اپنے ماحول کا اسیر ہوتا ہے۔ اگر اس کا ماحول مسلمان گھرانوں جیسا ہوتا تو وہ اتنی آسانی سے کورامائی کے گھر کے ماحول کو قبول نہ کرتا۔ اس کی تربیت کا جب وقت آیا اس وقت کورامائی ہی اس کے سامنے تھی۔ اس نے جو کچھ اس کو سکھایا، پڑھایا، وہ سیکھتا گیا۔ کیونکہ بچہ جب تک نا سمجھ رہتا ہے وہ کورا کاغذ ہوتا ہے۔ اس کے بڑے اور ماحول اس پر جو تحریر لکھتا ہے وہ پڑھتا جاتا ہے۔ کورامائی نے اس کی پرورش بلاوجہ نہیں کی تھی۔ اس کو بھی اپنا ایک جانشین چاہئے تھا۔ وہ اس کی پرورش کرکے کوئی نیکی نہیں کررہی تھی۔ وہ زمانہ ختم ہوا جب نیکی برائے نیکی کی جاتی تھی۔ اب نیکی اپنے مفاد کی خاطر کی جاتی ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"اس کا تو مطلب ہوا کہ نیکی کوئی کرتا ہی نہیں اس زمانے میں....." میں نے کہا۔

"کرتے ہیں میرا کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ نیکی برائے نیکی کرنے والے کم ہیں۔ ختم نہیں ہوگئے۔ میں نے ایک عام بات کی تھی۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"تو تم بیکانیر جارہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ بیکانیر سے جاچکا ہے اور اس کا رخ بنگال کی طرف ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"وہاں کہاں جائے گا کچھ پتہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چندر گونا ایک جگہ ہے وہ وہاں جائے گا۔" رولوکا نے بتایا۔

"کوئی خاص بات ہے وہاں پر.....؟" میں نے کہا۔

"وہاں پر ایک بہت بڑا کالی کا بھگت رہتا ہے۔ وکرم پنڈت کا جنون اس قدر بڑھ گیا ہے کہ وہ ہر علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے وقت کا سب سے بڑا ساحر بننا چاہتا ہے۔ تم کو سن کر افسوس ہوگا کہ وہ نہ معلوم کتنے زندہ نوجوانوں کی بلی کالی کو چڑھا چکا ہے۔ کتنی کنواری لڑکیاں اس کی ہوس کا شکار ہوچکی ہیں۔ میں نے اس کے بارے میں بڑی بھاگ دوڑ کی ہے۔ وہ اگر اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تو ان گنت لوگوں کو عذاب میں مبتلا کردے گا۔" رولوکا نے کہا۔

"تو تم چندر گونا جاؤ گے؟" میں نے کہا۔

"ہاں یہ ایک خطرناک مہم ہے۔ کیونکہ یہ ایک جنونی شخص ہے۔ انسان عقل مند سے تو بچ سکتا ہے مگر جنونی کو کیا پتہ کہ وہ کیا کررہا ہے۔ پاگل کو کیا پتہ کہ وہ سر پر خاک کیوں ڈال رہا ہے۔ اس لئے اس سے ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ میں اکیلا ہی جاؤں گا۔" اور رولوکا بنگال کے لئے روانہ ہوگیا۔

☆.....☆.....☆

یوں تو سارا بنگال ہی پانی پانی ہے۔ اسی پانی کی برکت ہے کہ ہر طرف ہریالی نظر آتی ہے۔ جنگلات بے شمار ہیں۔ چندر گونا کا علاقہ بھی بوڑھی گنگا کے قریب واقع ہے۔ یہ وہی دریا ہے جو گنگا کہلاتا ہے مگر یہاں پر اس کا نام بوڑھی گنگا ہے۔ اس کے ساحل پر بے شمار دیہات آباد ہیں۔ بہت سا علاقہ دلدلی ہے اور خطرناک جانوروں سے بھرا ہوا ہے۔

مجھے جس کی تلاش تھی وہ دور دور نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے ایک ایک گاؤں دیکھ لیا۔ کنارے پر کشتیوں پر آباد ایک ایک کشتی کو دیکھ لیا مگر وکرم پنڈت کا پتہ نہیں چلا۔ یہ مجھے پتہ تھا کہ وہ آیا یہاں پر ہی تھا۔ میرے ہرکارے بھی کوئی خبر نہیں لارہے تھے۔ میں یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہورہا تھا۔ مگر مجھے تلاش تو جاری رکھنا تھی۔ اس کے نہ پتہ چلنے کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی تھی کہ وہ کنڈل کے اندر بیٹھا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی تھی کہ اس نے روپوشی کا علم سیکھ لیا ہے۔ مگر یہ وجہ اتنی آسان نہ تھی۔ میں نے اب تک ہندوستان میں ایسا کوئی ساحر نہیں دیکھا تھا جو یہ علم جانتا ہو۔ میں چندر گونا کے اردگرد ہی رہا میرے ہرکارے میرے گرد منڈلاتے رہے۔

شام کا وقت تھا۔ پرندے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ رہے تھے۔ یہ علاقہ دلدلی تھا۔ بڑی بڑی گھاس کھڑی تھی اور زمین نرم تھی۔ اسی نرم زمین میں کہاں کہاں خوفناک دلدلیں تھیں کسی کو پتہ نہیں تھا۔ اسی لئے شاید کوئی بڑا جانور ادھر نظر نہیں آتا تھا۔ درختوں پر جنگلی مرغیاں کڑکڑا رہی تھیں۔ یہ علاقہ آبادی کے اتنے قریب تھا کہ مکانوں میں جلتے چراغ نظر آتے تھے۔ وہاں کے لوگ اپنی ضرورت

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

پوری کرنے یہاں پر ہی آتے تھے۔ مگر وہ گھاس کے اندر نہیں آتے تھے۔ ان کا روز کا آنا جانا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ گھاس کے اندر کیا ہو سکتا ہے۔ میں ایک درخت پر بیٹھا تھا۔ مجھے دور دور نظر آ رہا تھا۔ ایک آدمی جو اوپری بدن سے ننگا تھا۔ صرف ایک دھوتی میں ملبوس تھا آتا نظر آیا۔ وہ گھاس کے کنارے بیٹھ گیا اور کچھ ہی دیر میں اپنی ضرورت پوری کر کے واپس جانے کو کھڑا ہو گیا۔ میں جلدی سے درخت سے اتر کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میرے اچانک اس کے سامنے جانے سے وہ چونک گیا اور بنگالی میں بولا۔ ”کون ہے رے۔“

”ڈرمت میں بھی انسان ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

مگر وہ ایک طرف کو بھاگنے لگا۔ میں نے دوڑ کر اس کو پکڑ لیا اور کہا۔ ”تجھے اپنی زندگی پیاری نہیں لگتی شاید۔“

وہ ڈری آواز میں بولا۔ ”بہت پیاری ہے اسی کارن تو بچانے کو بھاگا ہوں۔“

”اور تو بھاگ کر موت کی طرف جا رہا تھا۔ تجھے پتہ ہے ادھر کیا ہے؟“ میں نے کہا۔

”ہے بھگوان تم نے ہم کو بچا لیا۔ تم کون ہے؟ ادھر کیا کرتا ہے؟“

”میں بھی ایک انسان ہوں...... ادھر ایک آدمی کو ڈھونڈتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ادھر تو سانپ بھی نہیں آتا تم آدمی ڈھونڈتا ہے۔“ وہ بولا۔

”ہاں وہ آدمی سانپ سے زیادہ زہریلا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کون ہے وہ......؟“ وہ بولا۔

” پہلے تم یہ بتاؤ تمہارا نام کیا ہے اور کہاں رہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم ادھر سامنے گاؤں کا ہے...... ہمارا نام دھرلی ہے۔“ وہ بولا۔

”اب دھرلی تم یہ بتاؤ۔ ادھر کوئی بڑا یا کالی کا مندر ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مندر تو ہے کالی کا......“ دھرلی نے جواب دیا۔

”ادھر کالی کے مندر میں پجاری کون ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم اس مندر میں نہیں جاتا۔ اس لئے زیادہ ہم کو پتہ نہیں ہے۔ پر یہ پتہ ہے کہ اس کا پجاری گوبند چندر جی ہے۔“ دھرلی نے جواب دیا۔

”تم ادھر کیوں نہیں جاتا؟“ میں نے پوچھا۔

”ادھر چندر جی کالی کا بھینٹ لیتا ہے۔ کب لیتا کچھ پتہ نہیں چلتا، ہم ڈرتا ہے۔“ وہ بولا۔

”سب گاؤں والا اس کو ادھر سے بھگاتا نہیں ہے۔“ میں نے پوچھا۔

دھرلی کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔ ”وہ سب کو مار سکتا ہے، بہت بڑا جادوگر ہے وہ۔“ دھرلی بولا۔

مجھے جو پتہ کرنا تھا وہ میں کر چکا تھا چندر جی کے پاس ہی وکرم پنڈت آیا ہوگا۔ ”اچھا دھرلی اب تم جاؤ تم ہم سے ملا تھا یہ بھول جاؤ۔“ دھرلی نے گردن ہلائی اور چلا گیا۔ ابھی صرف رات کے گیارہ کا وقت تھا مگر ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ درختوں پر پرندے تک سو چکے تھے۔ میں گاؤں کی طرف چل دیا۔ گاؤں کے باہر ہی گاؤں کے کتوں کا ایک غول پہرے پر موجود تھا۔ مگر مجھے وہ نہیں دیکھ پائے منہ اٹھا کر انہوں نے ہوا میں کچھ سونگھا ضرور تھا۔

اندھیرا ہر طرف گہرا تھا۔ میرے سامنے ایک مندر کی عمارت تھی۔ مندر کا عکس زیادہ اونچا نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کلس کے پاس بھی مندر کی چھت تھی۔ اس چھت پر ایک عورت کھڑی تھی وہ عورت اتنی لمبی چوڑی تھی کہ میں نے آج تک اتنی لمبی اور تگڑی عورت نہیں دیکھی تھی۔ اگر اس کے نسوانی اعضا اتنا نمایاں اور واضح نہیں ہوتے تو شاید میں اس کو عورت ہی تسلیم نہ کرتا۔ وہ بڑی ہی بے فکری سے چھت پر ٹہل رہی تھی۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اسے اپنی برہنگی کا ذرا احساس نہیں تھا۔ میں زینے کے بغیر ہی چھت پر چلا گیا۔ وہ اب بھی مجھے نہ دیکھ سکی۔ میں اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اب بھی اسے ذرا احساس نہ ہوا پھر میں ایک دم

نمودار ہو گیا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور چونک کر کئی قدم پیچھے ہو گئی۔ مگر اس نے اپنے جسم کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کوئی کمزور ناتواں عورت نہیں تھی، مگر میرے اس طرح نمودار ہو جانے کی وجہ سے نروس ضرور ہوئی تھی۔

میں نے کہا۔ ”ڈر گئی......“

”ڈر کیا ہوتا ہے رے......“ وہ بولی۔

”ابھی میں تجھے بتاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”تجھے پتا ہے تو کہاں کھڑا ہے۔“ وہ بولی۔

”تیرے سامنے کھڑا ہوں...... تو تو حسن کی ملکہ لگتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں حسن کی ملکہ کم اور ظلم کہ ملکہ زیادہ ہوں سن لیا۔“ وہ بولی۔

”ظلم کی ملکہ یہ تو بتا تیرا نام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نام مت پوچھ یہ بتا تو کون ہے اور کیوں یہاں آیا ہے؟“ وہ بولی۔

”نام تو بتانا ہی پڑے گا......؟ میری ظلم کی ملکہ۔ نہیں بتائے گی تو کپڑے پہنا کر کسی سرکس میں چھوڑ آؤں گا۔ وہاں تجھے بڑے بچے دیکھ کر تالیاں بجائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”ہوش کی بات کر مورکھ تو مجھے نہیں جانتا۔ میں تجھے بھنڈی کے اچار میں ڈال دوں گی۔ گرودیو بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔“ وہ بولی۔

”اچھا تو تیرا بھی کوئی گرو ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں ہے۔ نام بتاؤں گی تو دھوتی خراب ہو جائے گی۔“ وہ بولی۔

”اور تجھے تو کچھ خراب ہونے کا ڈر ہے ہی نہیں کچھ شرم وحیا کر اے ننگی عورت۔ تو نے بہت باتیں کر لیں۔ اب تیری زبان بند ہے اور سن جس طرح زبان بند ہے اسی طرح ہاتھ پیر بھی بند ہو سکتے ہیں...... میں جانتا ہوں تو کالی کی داسی سورن چمارن ہے۔ تیرو گھٹیا انداز اور تیری بے حیائی نے تیری پول کھول دی ہے۔“ میں نے کہا۔

سورن نے منہ کھول کر کچھ کہنا چاہا مگر زبان بند ہی رہی۔ آواز نہیں نکلی تو میں نے کہا۔ ”اپنی مالکن کالی کو آواز دے لے۔“ وہ بے بسی سے کھڑی رہی تو میں نے کہا۔

”تیری سزا یہ ہے کہ اسی جگہ کھڑی رہنا۔ اترنے کی یا بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ اگر نہیں مانے گی تو تیرا بہت برا انجام ہوگا۔“ اور میں زینے سے نیچے آ گیا۔

مندر کی چار دیواری بہت اونچی تھی۔ میں نے پورا مندر چھان مارا۔ پورے مندر میں ایک آدمی بھی نہیں تھا۔ پھر میں نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ مگر ناکام ہوا۔ میں جانتا تھا کہ وہ یہیں پر ہے مگر اس نے کنڈل ایسا سخت قائم کیا ہے کہ اس کا وجود اس میں تحلیل ہو گیا ہے۔ میں پھر اوپر آ گیا سورن چمارن اسی طرح پتھر کی مورت بنی ہوئی تھی۔

”تیرا گورو کہاں ہے...... یہ بتا......؟“

اس کی زبان کھلی تو وہ بولی۔ ”بس ہار گیا...... ڈھونڈ لیا۔“

”ڈھونڈ تو میں لوں گا۔ مگر تیرا کریا کرم پہلے کروں گا۔“ میں نے کہا۔

وہ خاموش رہی۔ میں نے ایک اشارہ کیا۔ سوتے الو نے ایک زوردار پر اس کے گال پر مارا۔ کیونکہ اس کو اتنا ہی کرنے کو کہا گیا تھا۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر ایک غول مکھیوں کا آ کر اس کے ننگے بدن سے لپٹ گیا۔ یہ مکھیاں کوئی عام مکھیاں نہیں تھیں۔ ان پر کوئی منتر جادو اثر نہیں کرتا تھا۔ یہ چند لمحوں میں انسانی وجود کو ہڈیوں کا پنجر بنا دیتی تھیں۔ سورن پر حملہ انہوں نے ضرور کیا تھا مگر ان کے منہ بند تھے۔ سورن کا سارا وجود انہوں نے ڈھانپ لیا تھا۔ وہ حیران نظروں سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے اندر جتنی شکتی تھی۔ وہ استعمال بھی کر رہی تھی۔ مگر مکھیوں پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ کچھ دیر میں اس کا تماشا دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

”اور کوشش کر لے تو نے ایسا بھی کب دیکھا ہوگا کہ تجھے موقعہ دے رہا ہوں...... کر لے اپنا بچاؤ۔ مکھیاں میرے اشارے کی منتظر ہیں۔“

”تو کیا چاہتا ہے؟ میں تیری بات پوری کروں گی، تیرا کام کروں گی۔“ وہ مجبوری میں بولی۔

"تو میرا کیا کام کرے گی تو گندکی پیداوار، گندے کام کرنے والی مادر ذات برہنہ رہنے والی۔ تو صرف گندے کام کرتی ہے۔ میرے پاس تیرا کوئی کام نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں تیرا گرو وکرم پنڈت اسی مندر میں موجود ہے۔ مگر کنڈل کا پردہ اس نے تان رکھا ہے۔ مگر اس کو ظاہر تو ہونا ہے۔ تو بتا یا نہ بتا۔ اس سے میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے کہا۔

"ہاں وہ اسی مندر میں ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔

"یہ تو میں نے پہلے ہی تجھے بتا دیا تھا۔ تو نے نئی بات کیا بتائی؟" میں نے کہا۔

"جس کمرے کی چھت پر ایک چیل بیٹھی ہے وہ اسی میں ہے۔" سورن نے جواب دیا۔

"میں دیکھتا ہوں تو اسی طرح رہنا۔ یہ مت سمجھنا کہ میں نہیں ہوں۔ اگر ذرا بھی ہوشیاری دکھائے گی تو تیرا وجود ان بکھیوں کے پیٹ میں ہوگا اور اب تو اپنا چولا بھی نہیں بدل سکتی۔ جو ہے اسی میں تیرا کلیان ہوگا۔" اور میں پھر چھت سے اتر کر مندر کی طرف چلا۔ مندر میں ایک گول دائرے کی شکل میں کمرے بنے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ اس میدان کے عین درمیان ایک مورتی رکھی تھی۔ اندھیرے میں پتہ نہیں چل رہا تھا کہ یہ مورتی کس کی ہے۔ میں اس مورتی کے پاس کھڑا ہو گیا اور نظریں کمروں کی چھت پر دوڑائیں۔ دائیں ہاتھ پر کونے کے کمرے کے اوپر ایک بہت بڑی چیل بیٹھی پر کھول بند کر رہی تھی۔ وہ چیل نہیں تھی بلکہ ایک نہایت سفاک بیر تھا۔ وہ پہرے پر تھا۔ اس کمرے کے اندر آنے والوں کو روکنا اس کا کام تھا۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ بیر نہایت طاقت اور صرف اپنے گرو کے حکم پر کام کرنے والا ہے۔ پہلے اس کو قابو کرنا ضروری تھا۔ یہ بیر اندھیرے کا بہت طاقتور بیر تھا۔ اس کی کمزوری روشنی اور آگ تھی۔ میں نے اپنے ہرکارے کو اشارہ کیا اور چند منٹ میں ہی میدان میں لکڑیاں آنا شروع ہو گئیں۔ جس جگہ وہ مورتی تھی وہاں پر پرسوکھی لکڑیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ چیل اوپر بیٹھی ہی رہی۔ اس کو کچھ نظر آتا تو وہ کچھ حرکت کرتی۔ سب کچھ اس کی نظر سے اوجھل تھا۔ پھر اچانک ان لکڑیوں میں آگ لگ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ کی لپٹیں کئی فٹ اونچی ہو گئیں۔ چیل نما بیر آگ کی روشنی اور شعلے دیکھ کر اپنی جگہ چھوڑ گیا اور میں اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرہ خالی تھا۔ فرش میں ایک گہرا گڑھا پڑا تھا۔

میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ پتہ چلا کوئی باہر نہیں گیا۔ اطراف میں اور اوپر بھی میرا پہرا تھا مگر وہ بھاگ گیا۔ لکڑیوں میں آگ لگتے ہی وہ زمین کے راستے بھاگا۔ یہ کوئی معمولی کرتب نہیں تھا۔ میرا واسطہ ہندوستان میں جن ساحروں سے پڑا تھا یہ ان میں سب سے الگ تھا۔ حالات اور موقعہ شناسی کا یہ ادراک رکھتا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے دو طاقتور پہرے دار ناکام ہو چکے ہیں۔ دشمن کی کیا طاقت کا اس کو اندازہ نہیں ہے تو راہ فرار ہی بہتر ہے۔ اب وہ نئے سرے سے اپنی پیائش کرے گا۔ دشمن کے بارے میں معلومات کرے گا۔ اپنی صف بندی کرے گا اور نئے آلات جنگ لے کر میدان میں آئے گا۔ اس کی ہوشیاری اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ طاقت کے زعم میں نہیں آیا۔ میں نے اس کی سوچ کا اندازہ لگایا اور چھت پر واپس آ گیا۔

چھت پر صرف کالی ہڈیاں پڑی تھیں۔ سورن کا پتہ نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اب کسی آبادی کو اپنا مسکن نہیں بنائے گا۔ میرا تجربہ کہتا تھا کہ وہ بنگال سے زیادہ دور بھی نہیں جائے گا۔ کیونکہ اس کا دشمن یہاں پر تھا۔ وہ یہ جستجو کرے گا کہ دشمن کون ہے اور کتنے پانی میں ہے۔ اس کی طاقت کا سرچشمہ کیا ہے اور پھر اسی حساب سے تیاری کرے گا۔ میری کامیابی کا راز یہ ہے کہ میں کسی کو نظر نہ آؤں..... بڑے سے بڑا ساحر بھی جب دشمن سے لاعلم رہتا ہے..... تو اس پر گھبراہٹ اور جھنجلاہٹ سوار ہو جاتی ہے اور اسی میں وہ غلطیاں کرتا ہے۔ میدان جنگ میں جس فوج کے جاسوس بروقت دشمن کی فوج کے بارے میں اپنے کمانڈر کو بتا دیتے ہیں وہ فوج کامیاب ہو جاتی ہے اور جو جاسوس خبریں نہیں دیتے وہ ہار جاتی ہے۔ میرے دشمن کو یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس سے لڑ رہا ہے۔ اس لئے میرے وار کارگر ہوتے ہیں

اور جب پتہ چلتا ہے تو اس وقت کام ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ میری پالیسی اس دفعہ بھی یہی تھی۔ میرے ہرکارے اپنا کام کر رہے تھے اور میں ایک مزدور کے روپ میں جنگل کی کٹائی کا کام کر رہا تھا۔ یہ ایک گھنا جنگل تھا۔ یہ ہمالیہ کی ترائی ہندوستان کے آخری ریلوے اسٹیشن ٹنک پور منڈی سے شروع ہوا تھا۔ یہ بیلا کا جنگل کہلاتا تھا اور یہی آگے چل کر سندر بن ہو جاتا تھا۔ اس کے اندر جانے کی جرأت کوئی نہیں کرتا تھا۔ فاریسٹ گارڈ اور جنگل کی حفاظت کرنے والا عملہ بھی صرف اپنی حد تک ہی جاتا تھا۔ جنگل کے اندر جانے کے بعد سمت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ماہرین اس کا اندازہ کر تو لیتے مگر پھر ان کو راستہ نہیں ملتا۔ یہاں پر ایک قسم کا خطرہ نہیں ہوتا لیکن ہر طرف خطرہ ہی خطرہ ہے۔ درندوں کا خطرہ، حشرات الارض کا خطرہ، موسم کا خطرہ اور تو اور معمولی چیونٹیوں کا بھی شدید خطرہ ہوتا ہے۔ درخت بھی آدم خور ہوتے ہیں۔ ان سب کے علاوہ یہاں کے انسانوں سے بھی خطرہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ جنگل سے باہر والوں کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور بہت اندرونی طرف تو انسانوں کا گوشت بڑے شوق سے تبرک کے طور پر کھاتے ہیں۔ جس ٹھیکیدار کے پاس میں کام کر رہا تھا اس نے مزدوروں کی حفاظت کا بڑا اچھا انتظام کر رکھا تھا۔ ایک بڑے میدان میں گول دائرے کی شکل میں موٹے موٹے لکڑی کے لٹھے ایک لائن میں قریب قریب گاڑ دیئے۔ یہ لٹھے اتنے قریب تھے کہ خرگوش بھی اندر نہیں آ سکتا تھا اور ان لٹھوں کو درمیان اور اوپر سے موٹی موٹی میخیں لگا کر ایک ساتھ ملا دیا تھا۔ اس دائرے کے اندر لکڑی کے ہی کمرے تھے کوئی جانور دروازہ بند ہونے کے بعد نہیں آ سکتا تھا اور یہ دروازہ سورج غروب ہوتے ہی بند کر دیا جاتا تھا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد نہ کوئی باہر جا سکتا تھا نہ اندر آ سکتا تھا۔ کھانا پینا سب کچھ اندر ہی ہوتا تھا۔ دن بھر جو لکڑی کاٹی جاتی تھی وہ دوسرے دن ٹرکوں میں لادی جاتی تھی اور روانہ کر دی جاتی تھی۔

اتنے خطرات سے بھرا یہ جنگل میرے لئے گھر کے آنگن جیسا تھا۔ میں خود جنگلوں کا رہنے والا تھا۔ یہ درخت چرندے پرندے میرے دوست تھے۔ میں جب چاہوں ان سے مدد لے سکتا تھا۔ میرا اشارہ یہ جانتے تھے۔ میں ان کی زبان سمجھتا تھا۔ میرا دشمن لاکھ ہوشیار ہو، مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ وہ اپنی بڑھی ہوئی ہوشیاری میں میری پسندیدہ جگہ آ گیا ہے۔ رات کو دروازہ بند ہو جاتا تھا اور تمام مزدور کھانا کھا کر جلدی سو جایا کرتے تھے۔ پورے کیمپ میں سناٹا ہو جاتا تھا اور میں باہر نکل جاتا تھا۔

کیمپ سے دس بارہ میل پر ایک بہت گہرا پانی کا نالہ تھا۔ اس نالے کے ساتھ ہی ایک سرخ پتھر کی پہاڑی تھی۔ نالے کا پانی اس سرخ پہاڑی سے ٹکرا کر بہتا تھا۔ اس نالے کے قریب جانا سخت خطرناک تھا۔ کیونکہ سب ہی جانور پانی پینے اس جگہ آتے تھے اور مگرمچھ اپنی بھوک مٹانے کو کنارے پر تاک لگا کر ان کا انتظار کرتے تھے۔ نالے کی چوڑائی بیس گز تو ضرور تھی مگر گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ میں ایک بار پہلے بھی اس نالے تک آیا تھا۔ مگر اس کے پار نہیں گیا تھا۔ میں نے چاندنی رات میں دیکھا، رات بڑی پرسکون تھی۔ کبھی کبھی مگرمچھ کے اچھل کود کرنے سے پانی میں طلاطم ہوتا تھا۔ میں نے نالہ پار کرنے کا ارادہ کیا اور پار کر گیا۔ اب میں ایک پہاڑی ٹیکری پر کھڑا تھا۔ میرے سامنے ایک چھوٹا سا میدان تھا اور اس کے بعد چھوٹی بڑی چوٹیاں۔ اونٹ کے کوہانوں کی طرح ابھری ہوئی تھیں۔ میں میدان میں آ گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہاں پر کبھی انسانی قدم نہیں آئے۔ نہیں میرا خیال غلط تھا۔ کیونکہ بہت دور مجھے ایک انسانی ہیولا نظر آ گیا تھا۔ میں روپوشی کی حالت میں تھا۔

وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ وہ ہیولا میری طرف ہی آ رہا تھا اور پھر میں نے دیکھا کہ وہ صرف دس پندرہ قدم پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہوا میں انگلیاں گھما تا رہا۔ وہ ایک بالکل برہنہ آدمی تھا۔ اس کے بدن پر کچھ نہیں تھا۔ اس کے سارے جسم پر بالوں کا گھنا جنگل تھا۔ داڑھی اور مونچھ کے بال آپس میں مل چکے تھے۔ اس کا دہانہ نظر نہیں آتا تھا۔ جسم نہ زیادہ فربہ تھا نہ دبلا تھا۔ اس کی آنکھیں ہی اس کے سارے وجود میں قابل ذکر چیز تھی۔ بلی کی طرح گول

READING CORNER
http://readingcorner.blogspot.com/

گول اور اندھیرے میں چمکتی ہوئی آنکھیں۔ مگر اندھیرے میں دیکھنے والی آنکھیں بھی مجھے دیکھنے سے قاصر تھیں۔ وہ وہیں کھڑا رہا۔ کبھی آسمان کی طرف منہ کرتا، کبھی زمین کریدتا، کبھی ہوا میں ہاتھ لہراتا، سر جھٹکتا، داڑھی کے بال نوچتا، ان کو ہوا میں اڑاتا۔ میں اس کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

اور پھر وہ واپس جانے لگا۔ میں تھوڑا فاصلہ دے کر اس کے پیچھے چلا۔ میں یہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ یہ وکرم پنڈت ہی ہے۔ اس کے دھوکے میں کسی اور سے نہ ٹکرا جاؤں۔ میں بلاوجہ کسی سے نہیں لڑتا۔ وہ جس طرف سے آیا تھا اسی طرف چل دیا۔ بار بار رک کر اس نے ہوا میں ہاتھ لہرائے اور پھر چل پڑا اور ایک بہت اونچی چٹان کے دامن میں کھڑا ہو گیا۔ چٹان ایک دیوار کی طرح اس کے سامنے تھی۔ آگے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ زمین پر خودرو گھاس کا بستر تھا۔ چٹان کے قریب کوئی بڑا درخت بھی نہیں تھا۔ جہاں وہ کھڑا تھا اس نے وہیں کھڑے کھڑے کچھ اشارے کئے اور چٹان میں ایک دروازہ نمودار ہو گیا وہ اس میں داخل ہونے لگا۔ میں اس سے پہلے اس میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک اندھیری سرنگ تھی۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ میں اس کے عین پیچھے تھا۔ وہ سرنگ ایک میدان میں ختم ہوئی۔ یہ میدان کانٹے دار جھاڑیوں سے اٹا پڑا تھا۔ ان جھاڑیوں میں گول گول، ہرے اور سرخ رنگ کے بیر کے برابر پھل لگے ہوئے تھے۔ یہ بڑے نایاب پھل تھے۔ یہ جھاڑیاں ہر جگہ نہیں اگتیں۔ میں جانتا تھا کہ یہاں قریب میں ضرور تانبے اور سونے کی کان ہوگی۔ یہ جھاڑیاں ان کی موجودگی ظاہر کرتی ہیں۔ اس جھاڑی کا کانٹا سوئی کی طرح سخت ہوتا ہے اور اس کی شکل شروع کے چاند جیسی ہوتی ہے۔ اس کا زخم بہت گہرا ہوتا ہے اور بڑی شکلوں سے بھرتا ہے۔ وہ ننگا شخص بڑی بے فکری سے ان جھاڑیوں سے گزر رہا تھا یا تو وہ ان جھاڑیوں کے کانٹوں کے اثرات کو جانتا نہیں تھا یا پھر وہ علاج پر قدرت رکھتا تھا۔ میں جھاڑیوں کے اوپر تھا۔ اس میدان کا آخری سرا ایک جھیل پر تھا جھیل کے کناروں پر بڑے قدیم درخت کھڑے تھے۔ ان کے تنے بہت موٹے تھے۔ ان درختوں پر بندر بیٹھے تھے۔ کچھ بہت تیزی سے اچھل کود رہے تھے۔ یہ بندر عام بندر نہیں تھے۔ ان کے منہ سرخ تھے اور قد میں بہت بڑے تھے۔ ان کے چہروں پر ان کا دہانہ سب سے خوف ناک چیز تھا۔ میں جانتا تھا کہ ان کا ایک سردار تو ضرور ہوگا جو کہ سب سے زیادہ بہادر ہوگا اور وہ کسی بہادر کو جنگ میں ہرا کر سردار بنا ہوگا۔ ان کا بھی نظام ہے۔ اس کی یہ پہچان ہے کہ اس کے گرد مادائیں بہت ہوں گی۔

ایک درخت پر مجھے سردار کا دربار نظر آ گیا۔ مگر میں اس طرف نہیں گیا۔ کیونکہ میں اس ننگے کو نظر میں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ جھیل میں اتر گیا۔ جھیل زیادہ گہری نہیں تھی۔ وہ کمر کمر پانی میں گیا اور پھر اچانک غائب ہو گیا۔ میں سمجھ گیا ہے کہ جس جگہ وہ غائب ہوا ہے وہی جگہ ہے جو اس کا ٹھکانا ہے یا وہاں سے کوئی راستہ ہے۔ میں نے وہ جگہ نظر میں رکھ لی اور پھر بندر سردار کے حرم کی طرف چلا...... اس درخت پر بندروں کی بڑی آبادی تھی اور زیادہ تعداد ماداؤں کی تھی۔

میں نے سردار سے ذہنی رابطہ کیا اور پوچھا۔ "تیری راج دھانی کب سے ہے اور کہاں تک ہے؟"

وہ ذرا دیر کو پریشان ہوا۔ جواب نہیں دیا تو میں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ "تو کون ہے کیوں پوچھتا ہے؟" اس کے دماغ نے جواب دیا۔

"میں تیرا دوست ہوں...... تجھے فائدہ پہنچانے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تو کہاں پر ہے نظر تو آتا نہیں۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں میں تجھے نظر نہیں آؤں گا۔ مگر تیرے بہت قریب ہوں۔" میں نے کہا۔

"مجھے کیا فائدہ ملے گا؟" وہ بولا۔

"تیری سرداری ختم ہونے والی ہے...... تجھے کالے جنگل میں جانا ہوگا۔ سرداری ختم ہونے کے بعد ہر سردار کو جانا پڑتا ہے اور تو جانتا ہے کہ کالا جنگل کیسی خوف ناک جگہ ہے۔" میں نے کہا۔

"تو میری مدد کس طرح کرے گا۔" اس نے پوچھا۔

"تجھے اتنا طاقتور بنا کر کہ کوئی تیرے سامنے آ ہی نہ سکے اور اگر آئے تو جیت نہ سکے۔" میں نے کہا۔

"میں کس طرح اتنا طاقتور بنوں گا؟" وہ جلدی سے بولا۔

"وہ میں بتاؤں گا۔ مگر یاد رکھ، کچھ لینے سے پہلے کچھ دینا پڑتا ہے۔ تو میرا کام کر، میں تیرا کام کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"تیرا کیا کام ہے؟" وہ جلدی سے بولا۔

"اس جگہ بلکہ جھیل کے اندر ایک آدمی رہتا ہے، تو نے دیکھا ہے؟"

"ہاں دیکھا ہے۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ وہ ہاتھ نہیں ہلاتا اور میری قوم کو مار دیتا ہے۔ ہم اس سے دور رہتے ہیں۔" سردار نے جواب دیا۔

"وہ پانی کے اندر گیا ہے۔ تم کو پتہ ہے کہ اس کا گھر کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ پانی کے اندر ہی جاتا ہے، اندر کہاں جاتا ہے، ہم نے پتہ نہیں کیا۔ کیونکہ ہم سب اس سے دور رہتے ہیں۔" سردار نے جواب دیا۔

"اس کے علاوہ بھی تم نے کسی کو اس کے ساتھ دیکھا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں صرف ایک دفعہ اس کے ساتھ ایک آدمی دیکھا تھا۔ وہ بھی اسی کی طرح تھا۔ دونوں کے چہرے بالوں میں چھپے ہوئے تھے اور دونوں کے ہاتھ میں ایک ٹیڑھی سی لکڑی تھی۔ مجھے ان سے اس دن بڑی نفرت ہو گئی تھی۔" سردار بولا۔

"کیوں؟ نفرت کیوں ہوئی تھی؟"

"اس حرامی نے میری ایک بڑی حسین رانی کو اپنی ہوس کا شکار بنایا تھا۔ میں کچھ نہ کر سکا۔ سب دیکھتے رہے اور کوئی اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا۔ میں نہیں جانتا تم کون ہو۔ انسان ہو یا اور کچھ۔ اگر انسان ہو تو مجھے بتاؤ کہ کیا کبھی میری قوم نے ایسی حرکت کی ہے۔" سردار نے پوچھا۔

"مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے کہ انسان جب گرتا ہے تو گرتا ہی چلا جاتا ہے وہ جانوروں سے بھی زیادہ وحشی درندہ بن جاتا ہے اور جب وہ درندہ بن جاتا ہے تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں تیری مدد کروں گا۔ مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"تم ان پر نظر رکھنا۔ میں تمہارے اس درخت کو محفوظ بنا دیتا ہوں۔ اگر وہ کچھ کرنا بھی چاہے گا تو بھی کچھ نہیں کر سکے گا۔ میں اس کی تلاش آگے کروں گا تم اس کی ایک ایک حرکت نظر میں رکھو گے۔ مجھے جب ضرورت ہوگی تم سے اسی طرح بات کروں گا۔" اور میں نے رابطہ ختم کر دیا۔ اب میں جھیل کی اسی طرف جا رہا تھا جہاں پر وہ غائب ہوا تھا۔ یہاں پر پانی سینے تک تھا۔ میں عین اس جگہ تھا جہاں پر وہ غائب ہوا تھا۔ میں نے پانی میں آنکھیں کھول کر دیکھا تو ایک کنواں سا نظر آیا۔ میں اس کے اندر چلا گیا مگر حیرت انگیز طور پر یہ جگہ سوکھی تھی۔ اوپر پانی بہہ رہا تھا۔ مگر ایسا لگتا تھا جیسے کانچ کی دیوار ہے جو کنویں کے اندر پانی کو نہیں آنے دیتی مگر میں تو اسی راستے سے اندر آیا تھا۔ کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ پھر پانی کنویں کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ اندر کیوں نہیں گرتا۔ یہ حیرت کی بات تو تھی مگر میرے لئے اتنی زیادہ نہیں تھی۔ میرے سامنے ایسے ہزاروں شعبدے آئے تھے۔ اس نے بے شک پانی پر کنٹرول کر لیا تھا۔ کنویں میں کوئی نہیں تھا۔ میں پھر باہر آ گیا اور جھیل سے نکل آیا۔

بندروں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ یہ بندر لنگور سے بھی بڑے تھے۔ شام ہو رہی تھی۔ وہ غول در غول آ رہے تھے۔ ہر بندر کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے کا سامان تھا۔ کسی کے پاس کوئی شکار نہیں تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ گوشت خور نہیں تھے۔ مگر شکلوں سے بہت خوف ناک تھے۔ ان سب کے ٹھکانے درختوں پر تھے۔ ان کے بچے اور مادائیں ان کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ بچے درختوں پر کھیل رہے تھے اور پھر رات گہری ہوتی گئی۔ جنگل دن میں جتنا خوبصورت نظر آتا ہے، رات کو اتنا ہی خوف ناک ہوتا ہے۔ یہاں پر طاقت کا قانون چلتا ہے۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ میں جھیل کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھا تھا۔ میرے سامنے پانی تھا۔ ایک

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com

مگر مچھ مجھے اپنی طرف آتا نظر آیا۔ وہ میرے سامنے آ کر رک گیا۔ پھر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور بے آواز اور آگے بڑھا اور خشکی پر آ کر رک گیا۔ ایک بار پھر اس نے اچھی طرح سب طرف کا جائزہ لیا اور ایک لوٹ لگائی۔ دو تین دفعہ اس نے یہی کیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب وہ ایک انسانی شکل میں تھا۔ چہرے پر داڑھی مونچھ کے بے ترتیب بڑھے ہوئے بال، سر پر ایک بالوں کا جنگل اور جسم پر بھی ہر جگہ بال۔ وہ دونوں پیروں سے چلتا تھا۔ اگر اس طرح نہ چلتا تو اس کو انسان کہنا مشکل ہوتا۔ میں روپوش تھا۔ وہ کتے کی طرح ہر طرف بو سونگھ رہا تھا۔ اس کا علم اور ودیا بھی اس کو کچھ نہیں بتا رہی تھی۔ مگر پھر بھی اس کو پتہ تھا کہ کوئی ہے۔ شاید اس کی حس بہت طاقتور تھی مگر علم ناکارہ تھا۔ میں اس کی پیمائش کر رہا تھا۔ اس کا اچھی طرح وزن کر رہا تھا۔ اگر میں اس کے سامنے وقت سے پہلے خود کو منکشف کر دیتا تو وہ ہوشیار ہو جاتا۔ اپنے اوزاروں کو ٹھیک جگہ مقرر کر دیتا۔ میرا دادا کہا کرتا تھا کہ کامیاب وہ ہوتا ہے جو غائب ہو۔ لڑائی سے پہلے مورچے اور مچان بنانا ضروری ہے جو کھلی جگہ لڑے گا زیادہ نقصان اس کا ہوگا۔ میرے مورچے اور مچان تیار تھے۔ میں اس کو کھلی جگہ لا رہا تھا اور اس کی کمک کو بھی روکنا تھا۔

وہ کچھ دیر کھڑا رہا اور پھر جھیل میں چلا گیا۔ صبح میں نے بندروں کے سردار سے رابطہ کیا اور کہا۔ ”تم کو دو چار دن کے لئے یہ جگہ خالی کرنا ہوگی۔“

سردار نے جواب دیا۔ ”تم جانتے ہو کہ میرا قبیلہ بڑا ہے کہاں لے جاؤں؟“

”یہ تم جانو میرا کام تم کو بتانا تھا۔ ایک بڑا معرکہ ہونے کو ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارا نقصان ہو، تم جانتے ہو کہ دشمن کتنا بے رحم ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ نہ ہو۔ میری ذمہ داری تم کو بتا کر ختم ہو گئی ہے۔“

”ٹھیک ہے کل سویرے یہاں سے ہم چلے جائیں گے۔“ سردار نے جواب دیا۔

دوسرے دن ایک بندر کا بچہ بھی یہاں نہیں تھا۔ سب جا چکے تھے۔ میں اسی پتھر پر بیٹھا تھا۔ ہر طرف میری بندش تھی میں نے آنے جانے کا راستہ بند کر دیا تھا۔ مگرمچھ پھر نمودار ہوا اور اسی طرح لوٹ پوٹ کے بعد انسانی شکل میں آ گیا۔ انسانی شکل میں آتے ہی میں نمودار ہو گیا۔ اس نے اپنی گول گول چمکدار آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر کھردری آواز میں بولا۔ ”آخر آ گیا نا سامنے کب تک چھپتا......“

”ہاں ایک نہ ایک دن تو سامنے آنا ہی تھا۔ دیکھ لے اچھی طرح دیکھ لے۔ بہت سے تو دیکھنے کی حسرت لے کر ہی چلے گئے۔“

”میری ودیا اور شکتی نے بتا دیا تھا کہ تو آ گیا ہے۔ تو کیا سمجھتا ہے مجھے تیرے بارے میں پتہ نہیں تھا۔ تیری حرکت کا مجھے پتہ ہے۔ میں وکرم پنڈت ہوں۔“ وہ بولا۔

”یہاں پر بھی تو جھوٹ کا سہارا لے رہا ہے تو کرم دین ہے۔“ میں نے کہا۔

”کون کرم دین......“ وہ اچھل کر بولا۔

”وہی کرم دین جو امام دین کا بیٹا ہے جسے کورامائی نے ہندو بنا دیا اور پھر وہ لامذہب ہو گیا۔“ میں نے کہا۔

”تو جھوٹا ہے...... میں کسی امام دین کو نہیں جانتا...... کسی کورامائی کو نہیں جانتا۔“ وہ غصے سے بولا۔

”تو صرف جھوٹ کا سوداگر ہے۔ تیرے پاس کر فریب ملے گا۔ درندگی ملے گی۔ مکاری کی تو اس پر پالش کرے گا اور دھوکے کے کپڑے سے اس کو چمکائے گا۔ تیرے جواب سے مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا۔“

”پھر تو تجھے فرق پتہ ہی ہے تو کیوں آیا ہے میرے پاس۔“ وہ بولا۔

”تجھے یہی فرق بتانے آیا ہوں۔ تو کسی انسان کو نقصان تو پہنچا سکتا ہے مگر فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ فرق تعمیر اور تخریب کا ہے۔ اچھے اور برے کا ہے۔ شیطان کا چیلا بھی کسی کو فائدہ نہیں دے گا۔ جادو اور روحانیت کا یہی فرق ہے جو موسیٰ اور فرعون میں تھا۔ موسیٰ حق پر تھے اور فرعون شر تھا۔ وہیں سے چلا آ رہا ہے۔ دونوں طاقتیں ابتدا سے ساتھ ساتھ چلی آ رہی ہیں۔ تجھے پتہ ہے تو اپنی روح شیطان کو بیچ چکا ہے۔ تو اب اس کا ہی کلمہ پڑھے گا۔ وہی کرے گا جو وہ حکم دے گا۔ اس کے مشن کو آگے بڑھائے گا مگر تو میری نظر میں ایک بے وقوف آدمی ہے۔

تو نے ذرا نہیں سوچا کہ ایک قوت روحانیت کی بھی تو ہے تو نے جتنی محنت شیطان کو منانے میں کی۔ اگر اتنی روحانیت کو پانے میں کرتا تو تیرا مقام کیا ہوتا۔ ذرا غور کر۔ اب تو کیا ہے۔ اب تیرے لئے کوئی برائی، برائی نہیں رہی۔ تم نے کیا کچھ نہیں کیا۔ قتل سے تم نے ابتدا کی اور اس کے بعد تم اپنے گرو کے کہنے پر آگے ہی بڑھتے گئے۔ تم نے اپنی راتوں کو حسن و شباب سے سجایا۔ درندگی میں تم جانوروں سے آگے نکل گئے۔ مگر میں تم کو یاد دلانے آیا ہوں کہ تم ایک مسلمان کی اولاد ہو۔ تمہارے پیدا ہوتے ہی تمہارے کانوں میں ایک صدا دی گئی تھی۔ وہ ویکسین پوری زندگی کے لئے ہوتی ہے۔ غور کرو توبہ کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔ جب تک تمہارا سانس باقی ہے توبہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ کوشش کرو۔ رحم کی کوئی نہ کوئی بنیاد ضرور نکل آئے گی۔ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں ہرگز مت رہنا۔ یاد رکھو اس بار ڈوبو گے تو پھر ابھرو گے نہیں۔“

وکرم پنڈت گردن جھکائے میری بات سنتا رہا اور جب گردن اٹھائی تو وہ وکرم پنڈت نہیں کرم دین ولد امام دین تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک لڑی بہہ رہی تھی۔ اس کی ساری تپسیا اور شکتی اس پانی میں بہتی نظر آ رہی تھی۔ اس کے دماغ کے تاریک گوشے روشن ہو رہے تھے۔ کچھ بھول رہا ہے کچھ پرانا سبق یاد آ رہا ہے۔ پردہ اٹھ رہا ہے۔ اس کو اپنی اصلی شکل نظر آ رہی ہے۔ اس کے ذہن کی موٹی دیواروں میں شگاف پڑ رہے ہیں۔ اس کو اپنی ماں کا چہرہ نظر آ رہا ہے۔ باپ کا تھکا تھکا سا چہرہ یاد آ رہا ہے۔ کبھی گھپ اندھیرا ہو رہا ہے۔ کبھی اجالے کی کرن اس اندھیرے کو چاک کر رہی ہے۔ اجالے اور اندھیرے کا یہ کھیل اور ایک بھونچال اس کے اندر آ گیا ہے۔ اندھیرا اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور روشنی کی کرن اس کی مدد کر رہی ہے اور پھر اچانک بہار آ گئی۔ اس کو ہوش آ گیا اور آنکھوں سے ندامت کا پانی جاری ہو گیا۔ وہ جھکتا چلا گیا اور میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا...... اس کی بے زبانی بڑی معتبر زبان بن گئی۔ وہ کہہ رہا تھا اور میں سن رہا تھا۔

وہ اپنے کئے پر نادم تھا۔ اس کے کانوں میں وہی آواز گونج رہی تھی جو اس نے ماں کی گود میں سنی تھی۔ سب آوازیں بیکار تھیں۔ گرو کی آواز دنیا کی آواز وہ صرف ایک آواز پر دھیان لگائے ہوئے تھا۔ وہ پلٹ آیا تھا۔ وہ پھر اسی راستے پر آ گیا تھا جس کو وہ چھوڑ چکا تھا اور جب انسان ٹھیک راہ پر آ جائے تو پھر اس کو کچھ نہیں کہا جاتا۔ میں نے اس کو گلے لگا لیا۔

☆......☆......☆

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ طلب اور اس کا حصول زندگی کی علامت ہے۔ لیکن طلب صادق ہو، کسی کو کوئی مار کر طلب پوری نہ کی جائے۔ کسی کو روند کر آگے بڑھنے کا جذبہ نہ ہو۔ دنیا میں صرف دولت کما لینا ہی نفع نہیں ہے۔ بے شک دولت سب کو اچھی لگتی ہے۔ کرارے نوٹوں کی گڈیاں آنکھوں کی بینائی کو بڑھاتی ہیں۔ وقتی طور پر یہ بہت اچھی لگتی ہیں۔ لیکن جس کو سکون قلب کہا جاتا ہے وہ ان میں بھی نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا تو کوئی کروڑ پتی پریشان نہ ہوتا۔ جتنی زیادہ دولت اتنی ہی بڑی پریشانی۔ جتنا زیادہ دولت کا پھیلاؤ، اتنا زیادہ اس کا کنٹرول، ہر طرف نظریں، ہر طرف کی فکر، ایک آدمی کہاں کہاں جا سکتا ہے۔ کس کس کو دیکھ سکتا ہے اگر نہ دیکھے تو نقصان کا اندیشہ۔ دولت مند سب باتیں برداشت کر لیتا ہے مگر اپنی دولت کو برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ دولت کو چھوڑ کر وہ مرنے پر بھی راضی نہیں ہوتا۔

میں نے کئی واقعات ایسے سنے ہیں کہ سیٹھ جی بستر پر ایک ماہ سے یا اس سے بھی زیادہ سے بے ہوش پڑے ہیں مگر جان نہیں نکلتی۔ ڈاکٹر بتاتے ہیں کہ یہ ختم ہو چکے مگر سانس کی ڈوری قائم ہے۔ سارے عزیز، رشتہ دار، بیٹے، بیٹیاں مرنے کا انتظار کر رہے ہیں مگر بوڑھا ہے کہ جئے جا رہا ہے۔ وہ کس اذیت میں ہے۔ اس کا دھیان کوئی نہیں کرتا۔ پھر کوئی سیانا کہتا ہے کہ یہ یوں نہیں مرے گا، اس سے ان کہی کہلوائی

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com

جائے پھر کسی ان کہی سنانے والے کو بلایا جاتا ہے اور وہ اس کے کان میں ان کہی کہتا ہے اور اس کے بعد چند لمحوں میں بوڑھے کی روح پرواز کر جاتی ہے۔ آپ کہیں وہ ان کہی کیا تھی جس نے مرنے والے کی مشکل آسان کر دی۔

پربھو پرشاد بڑے اچھے دوکاندار تھے۔ بچے ان کی ہی دوکان میں جاتے تھے۔ سودا چار آنے کا ہو یا چار روپے کا وہ ہر بچے کو کچھ نہ کچھ کھانے کو ضرور دیا کرتے تھے۔ گڑ دھانی اور چنے کی بوریاں وہ سامنے ہی رکھتے تھے۔ کسی بچے کو کبھی نہیں ڈانٹتے تھے۔ ان کا ماہانہ کا ادھار بھی گھروں پر چلتا تھا۔ دام مناسب لگاتے تھے۔ منافع لیتے تھے مگر سودا بھی کھرا دیتے تھے۔ یہ دوسری بات تھی کہ ادھار دینے میں رقم پر بیاج بھی لگا دیتے تھے۔ یہ دوکان ان کے گھر کے باہری حصہ میں تھی۔ پھر ان کو اور جگہ کی ضرورت پڑ گئی اور اندر کا کوٹھا بھی دوکان میں آ گیا۔ ہوتے ہوتے پورا مکان دوکان بن گیا۔ پہلے مال ہاتھ گاڑی یا بیل گاڑی پر آیا کرتا تھا۔ پھر ٹرکوں پر آنے لگا۔ پہلے سب کام خود کرتے تھے۔ اب ان کی دوکان میں دو ملازم آ گئے۔ مگر ان کا برتاؤ اور زبان وہی رہی۔ ان کا لباس جو ایک میلی دھوتی اور میلی پتھوری تھا وہی رہا۔ پیروں میں انہوں نے کبھی چپل جوتا پہنا ہی نہ تھا۔ دوکان میں منوں گھی بھرا رہتا مگر وہ ہمیشہ سوکھی روٹی چباتے۔ ان کی کنجوسی کا یہ عالم تھا کہ دوکان کی جھاڑو دینے کے بعد دال کے اور چاول کے دانے خود کچرے میں سے چنتے۔ کسی نوکر پر ان کو اعتبار نہ تھا۔

ان کے دو لڑکے تھے۔ بڑے کا نام رام پرشاد اور چھوٹے کا گوتم پرشاد تھا۔ وہ بچپن سے باپ کو دیکھ رہے تھے۔ ہولی، دیوالی پر بھی پربھو نے کبھی نیا جوڑا نہیں پہنا تھا۔ لڑکوں کی ضد اور گھر والی کی باتیں پر بھو پرشاد کو دو نئے جوڑے بنانے پر مجبور کر دیتی تھیں۔ دیوالی ہو جاتی مگر وہ کئی دن اداس رہتا۔ بیوی جانتی تھی کہ ایسا کیوں ہے گھر میں اچار اور ہری مرچ یا لہسن کی چٹنی اور بہت خوشی ہوئی تو دال مگر دال میں گھی نہیں ڈالنے دیا گیا۔ وہ کہتا۔ اری نیک بخت اس سے لڑکوں کی عادت بگڑ جائے گی۔ پھر وہ روز روز گھی کھائیں گے اور بنیا گھی بیچتا ہے کھاتا نہیں۔ اگر کھائے گا تو پھر بنیا کب رہے گا۔ یہ اس کا خاندانی فلسفہ تھا جس پر وہ بڑی سختی سے قائم تھا۔

اب اس کا کاروبار بڑھ گیا تھا۔ منڈی میں بھی تھوک کی بہت بڑی دوکان تھی۔ بہت بڑا گودام تھا۔ کام بہت بڑھ گیا تھا۔ لڑکوں کو بھی اس نے ساتھ لگا لیا تھا۔ وہ بھی آخر چوہے کے بچے تھے۔ بل کھودنا تو ان کا کام ہی تھا۔ وہ بھی باپ سے آگے نہیں تو پیچھے بھی نہیں تھے۔ باپ کے نقشِ قدم پر چل رہے تھے۔ مگر پھر بھی پربھو ان پر پوری نظر رکھتا تھا۔ کوڑی کوڑی کا حساب کرتا تھا۔ کیا مجال ہے کہ ایک آنہ بھی حساب سے کھسک جائے۔

وہ آج بھی اپنے اسی لباس میں سب جگہ پھرتا تھا۔ وہ کہتا کپڑوں کو کون دیکھتا ہے۔ ارے جیب کو سب دیکھتے ہیں۔ جیب خالی ہو تو کوئی پوچھتا نہیں۔ بھری ہو تو کپڑوں کے میل کی طرف کون دھیان دیتا ہے۔

پربھو پرشاد دین دھرم کی طرف بھی نہیں تھا۔ مگر سال میں ایک دفعہ لکشمی پوجا صرف اس لئے کرتا تھا کہ کہیں لکشمی دیوی ناراض نہ ہو جائے۔ وہ ایک نہایت سستی سی مورتی خریدتا اور تجوری کے اوپر سجا کر کاغذ کے پھول ڈال دیتا۔ کاغذ کے اس لئے کہ روز روز کون تازہ پھول ڈالے گا۔ رام پرشاد شادی کے قابل ہوا۔ برادری میں کئی لڑکیاں تھیں مگر ان کو تلاش تھی اپنے جوڑ کی۔ ان کا مطالبہ بھی زیادہ تھا۔ لڑکے کو بیس ہزار نقد منہ دکھائی میں اور بیس ہزار کا جہیز دلہن کو اس کے علاوہ کپڑا لتا الگ، کھانا بارہ منڈی کا، سات رنگ کی مٹھائی اور بارات تین دن قیام کرے گی۔ یہ کوئی چھوٹا مطالبہ نہ تھا۔ برادری والے کہتے تھے پربھو نے اتنا بڑا مطالبہ اس لئے رکھا ہے کہ لڑکے کی بارات نہ کرنی پڑے۔ ارے کون اتنی ساری باتیں مانے گا۔ پورے شہر میں کون ہاتھ رکھے گا اور ہوا بھی یہی مگر جوڑ تو اوپر بنا دیا گیا تھا۔ رام پرشاد کا رشتہ آیا تو رام پور سے۔ پورن مل کی لڑکی ساوتری سے بات چلی۔ پورن مل بھی پربھو کی برادری کے تھے۔ کاروبار میں کم نہ تھے اور کنجوسی میں بھی کم درجہ نہ رکھتے تھے۔ بیٹھ کر بات ہوئی۔ پورن مل نے بڑے داؤ پیچ مارے..... مطالبوں پر بحث ہوئی مگر پربھو ایک

کائیاں آدمی تھا۔ نقد رقم اور جہیز پر تو پربھو اٹل ہی رہا۔ بات صرف اس پر ہوئی کہ بارات تین دن کی بجائے دو دن رکے گی۔ مٹھائی سات کی بجائے پانچ قسم کی ہو گی۔ کپڑا لتا لڑکی کا جو پسند ہو دینا مگر لڑکے کا اور اس کے گھر والوں کا قاعدے کا ہو گا۔ بارات میں سو آدمی ہوں گے تم اپنی عزت کو بارہ منڈی کا کھانا کرو یا صرف برادری کو کھلاؤ۔ اس سے ہمیں کوئی مطلب نہیں ہے۔

بارہ منڈی کے کھانے سے مراد یہ ہوتی تھی کہ بارہ گاؤں کے برادری والوں کو دعوت دو اور اگر اور نام کرنا ہے تو بارہ گاؤں کی عام دعوت دو۔ اس زمانے میں یہی دستور تھا۔ لڑکے والوں کا اگر دس ہزار خرچ ہوتا تھا تو لڑکی والوں کا اس سے دس گنا ہو جاتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ لڑکے کو باقاعدہ بولی لگا کر بات پکی کی جاتی تھی۔ لڑکے کا باپ جتنی بڑی آسامی ہوتا تھا یا لڑکا بہت قابل ہوتا تھا، اس کی بولی بھی زیادہ ہوتی تھی۔ نہ لڑکے کی شکل دیکھی جاتی تھی نہ لڑکی کے بارے میں زیادہ کریدا ہوتی تھی۔ اگر دیکھا جاتا تھا تو صرف یہ کہ بولی کتنی ہے اور مطالبات پورے کرتے ہیں یا نہیں۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ لڑکے لڑکی کا جوڑ نہیں بنتا اور شادی ہو جاتی ہے اور زندگی بھر میاں بیوی ایک گھر میں بھی ایک نہیں ہوتے۔

پربھو کیا کرتا وہ جو کر رہا تھا، وہی کر رہا تھا جو ہوتا آیا تھا۔ یہ کوئی نئی ریت نہیں تھی۔ سب برادری کو یہ نسخہ تھا سب یہی کرتے تھے جس کی دو چار بیٹیاں ہو جاتیں وہ مرتے وقت قرض دار ہی مرتا۔ اس کا قرض اس کی اولاد ادا کرتی رہتی۔ پر بھو کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ اب اس کا وقت آیا تھا۔ اس کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ بھگوان نے دو لڑکے دیئے تھے۔ جو اس نے اب تک قرض ادا کیا تھا وہ تو وصول کرنا تھا۔ پربھو کی گھر والی جانتی تھی کہ پربھو نے خود کنواں کھودا ہے خود ڈول ڈال کر پانی کھینچا ہے۔ ایک وقت کھا کر دو وقت کا بچایا ہے۔ اب اس کا تو حق بنتا ہے کہ اپنی محنت کی پائی پائی وصول کرے۔ ماں نے لڑکوں کے ذہنوں میں بھی یہ بات بٹھا دی تھی کہ باپو جو کر رہے ہیں وہی ٹھیک ہے۔ تم صرف دیکھتے جاؤ۔ یہ سب تمہارا ہی ہے۔ تمہارے کارن ہی پربھو کر رہا ہے۔ اس میں ہم سب کا ہی فائدہ ہے۔ آنے والی پیڑی کا فائدہ ہے۔ محنت پربھو نے کی ہے تم فائدہ اٹھاؤ گے۔ اس لئے ان کے کام میں مت بولو اور لڑکے خاموش تھے۔ سب کہتے پربھو کے لڑکے تو گائے ہیں گائے مگر یہ گائے ایک بنئے کی گائے تھی۔ بہت دور تک دیکھتی تھی۔ اب تو جو کچھ ہو گا وہ پربھو کے سر جائے گا۔ وہ کہتے کیا کریں باپو کے سامنے ہم بول تو نہیں سکتے۔ ان کو سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ آئی لکشمی کو کون دھتکارتا ہے۔ سب کچھ پربھو کی مرضی کے مطابق طے ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ بنیا نا اپنے کھانے پر خرچ کرتا ہے نہ کسی کو کھلاتا ہے نہ خود اچھا پہنتا ہے اور نہ کسی کو پہناتا ہے۔ مگر دو جگہ وہ دل کھول کر خرچ کرتا ہے۔ ایک لڑکی لڑکے کی شادی پر..... دوسرا جوئے میں۔ انڈیا میں بڑے تہواروں پر جوا عام کھیلا جاتا ہے اور ہر سڑک پر، گلی میں پولیس کی نگرانی میں یہ ہوتا ہے۔ بڑی رقموں کا جوا ہوتا ہے۔ ان کا یہ بھی لکشمی کو خوش کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ پربھو پرکھوں سے یہ دیکھتا آ رہا تھا۔ وہ بھی اسی اصول پر کاربند تھا۔

پربھو نے اپنے وقت کا سب سے اچھا بینڈ باجا بارات چڑھانے کو بلایا۔ آتش بازی کا بہت بڑھیا انتظام کیا۔ دور قریب کے مشہور آتش بازوں کو منہ مانگے دام دیئے۔ ہر باراتی کو ایک رنگ کی پگڑیاں دیں۔ عورتوں کو بھی سرخ رنگ کے بلاؤز اور پیلی ساڑھیاں دیں۔ رشتے کی لڑکیوں کو چوڑیاں اور سنگار کا سامان دیا اور پندرہ دن پہلے ہی مہمان آ گئے۔ سیٹھ پربھو پرشاد کے لڑکے کی شادی تھی۔

گوالیار اتنا بڑا شہر نہیں تھا۔ پورے شہر میں اس کی دھوم تھی۔ اتنی شاندار شادیاں بہت کم اس شہر میں ہوئی تھیں۔ رام پرشاد کی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد بھی شادی کی دھوم رہی۔ پربھو کے سمدھی نے بھی کوئی کسر نہیں ہونے دی۔ پربھو کا ہر مطالبہ پورا کر دیا۔ لڑکی کو پربھو کی امید سے بڑھ کر جہیز دیا۔ آخر وہ بھی تو رام پور کا مشہور بنیا تھا۔ اس کے ساتھ رام پور کے بنیوں کی پوری برادری تھی۔ اپنی بات کہاں گرنے دیتے۔ پربھو پرشاد اور رام پرشاد بہت خوش تھے۔ دلہن کیسی ہے اس طرف کسی کا دھیان تھا نہیں۔ دولت کی تیز روشنی نے سب کی آنکھیں چکا چوند کر دی تھیں۔ یہ دھیان کسی کو نہیں

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

آیا کہ آخر سمدھی نے اتنی آسانی سے کیسے مان لی اور پورا کر دیا۔

رام پرشاد باپ پر ہی گیا تھا مگر کہتے ہیں جوانی میں تو گدھا بھی اچھا لگتا ہے۔ ناک نقشہ کوئی خاص نہیں تھا۔ رنگ بھی کالا ہی تھا۔ بندو دکان پر بیٹھ بیٹھ کر فربہی مائل تھا۔ چھوٹی سی توند تو اب بھی نظر آتی تھی۔ مگر اس کی دلہن جو آئی وہ تو اس سے سوگنا نچلے درجے پر تھی۔

تھل تھل کرتا بدن، چوڑا چہرہ اس چوڑے چہرے پر چپٹی سی ناک اور پھولے پھولے گال۔ ایسا لگتا تھا جیسے دونوں گالوں میں کچھ دبا رکھا ہے۔ قد رام پرشاد کے برابر ہی تھا مگر جسم کے پھیلاؤ کی وجہ سے ٹھگنی لگتی تھی۔ چلتی تھی تو لگتا تھا جیسے سڑک پر رولر پھیرا جا رہا ہو۔ آواز اتنی باریک تھی کہ سن کر یقین نہیں آتا تھا کہ اتنے بھاری وجود کی یہ آواز ہے۔

رام پرشاد نے اس کو دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ دلہن کے باپ پورن مل نے بھاگنے کا ہر دروازہ بند کر دیا تھا۔ ہر دروازے پر روپے کے پہرے تھے اور کمرے میں وہ ایک مست ہتھنی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے دل میں باپو کو خوب لتاڑا مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ''کیا کھڑے ہی رہو گے۔'' اس کے کانوں میں ایک باریک آواز آئی اور وہ دھپ سے پلنگ پر بیٹھ گیا اور رات گزر گئی۔ ایک مگرمچھ کے ساتھ آدمی کی کیسی رات گزری ہو گی کون سوچے گا۔ سب لوگ چلے گئے۔ ایک نے بھی نہیں پوچھا۔ ''میاں رام پرشاد کیا حال ہے؟'' قبر کا حال تو مردہ ہی جانتا ہے دفنانے والے تو چلے جاتے ہیں۔

پربھو پرشاد کا کاروبار اور چمک اٹھا اور دو گودام اور بنا لئے۔ اناج کی خریداری اور بڑھ گئی۔ آخر جو خرچ کیا تھا وصول تو کرنا تھا۔ سمدھی کی دی ہوئی رقم سے ہی اپنا خرچ پورا کرنا تھا۔ پر بھو پرشاد ٹھہرے پیدائشی کاروباری پیسے سے پیسہ کس طرح بنتا ہے یہ وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ ایک دم چھکا مارنے کے قائل نہ تھے۔ وہ آہستہ روی کے قائل تھے اور مستقل مزاجی سے کام کرتے تھے۔ اسی لئے ہمیشہ کامیاب ہوا کرتے تھے۔

سویرے اٹھ کر سب سے پہلے وہ اپنے گوداموں کا چکر لگاتے۔ وہ اتنی خاموشی اور دبے پاؤں جاتے کہ کسی کو خبر نہ ہوتی اور ایسا اس لئے کرتے کہ دیکھ سکیں کہ ملازمین کیا کر رہے ہیں۔ کوئی چوری چکاری تو نہیں ہو رہی۔ ان کے جانے کا کوئی وقت بھی مقرر نہیں تھا۔ ایک گودام میں نو بجے جاتے تو دوسرے میں گیارہ بجے جاتے۔ وہ کہتے کہ اس طرح سب چوکنے رہتے ہیں۔ ڈر ان کے دل میں رہتا ہے اور کام پورا کرتے ہیں۔

سویرے وہ نئے گودام کی طرف چلے گئے۔ یہ گودام قلعہ کی دیوار کے ساتھ ہی بنا ہوا تھا۔ بڑی اونچی اس کی چھت تھی۔ دروازہ اتنا بڑا تھا کہ مال لانے والی بیل گاڑیاں اندر آ جاتی تھیں۔

جب وہ دروازے میں داخل ہوئے اس وقت دو بیل گاڑیاں مال اتار رہی تھیں۔ یہ قریبی گاؤں سے مال کی بوریاں لائے تھے۔ مزدور اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ وہ ایک آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ ان کو کسی نے نہیں دیکھا۔ مزدوروں نے بوریاں اس طرح لگائی تھیں کہ ایک زینہ بن گیا تھا۔ وہ اس پر ہی چڑھ کر بوریاں اوپر پہنچا رہے تھے۔ وہ جس جگہ کھڑے تھے وہ جگہ وہ تھی جہاں بوریاں پہنچائی جا رہی تھیں۔ مزدور اپنی دھن میں بوریاں کمر پر لاد کر لا رہے تھے اور بارہ تیرہ فٹ اوپر چن رہے تھے۔ اچانک مزدور کے پاؤں کسی وجہ سے لڑکھڑا گئے اور بوری اس کی کمر سے پھسل کر عین اس جگہ گری جہاں پربھو پرشاد کھڑے تھے۔ ڈھائی من کی بوری نے ان کے منہ سے ہائے رام بھی نہیں نکلنے دیا۔ اوپر کا مزدور گھبراہٹ میں اسی بوری پر گرا اور اس کے اوپر بوریاں گرنے لگیں اور اس غریب کا بھی رام رام ست ہو گیا۔ ابھی تک کسی کو پتہ نہیں تھا کہ پربھو پرشاد بھی دبے پڑے ہیں۔ سب مزدور دبے ہوئے مزدو کو نکالنے میں لگ گئے دس بارہ بوریاں اٹھانے کے بعد مزدور مردہ حالت میں مل گیا۔ پھر وہ بوری ہٹائی گئیں جس کے نیچے سیٹھ پربھو پرشاد پڑے بھگوان یاترا کو گئے تھے۔ مزدور مر گیا۔ بس ذرا ''ہائے بچارہ مر گیا'' کہا گیا۔ سیٹھ پربھو پرشاد مر گئے ایک شور مچ

گیا۔ ہاہا کار ہو گئی۔ دوڑ بھاگ شروع ہو گئی۔ رام پرشاد کو خبر کی گئی۔ وہ بھی آ گئے۔ چھوٹا گوتم بھی آ گیا۔ پورے گوالیار کو خبر ہو گئی کہ سیٹھ پربھو پرشاد پرلوک سدھار گئے۔ لاش گھر آ گئی اور انتم سنسکار کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس غریب مزدور کو کسی نے نہیں یاد کیا جو سیٹھ کے ساتھ ہی مر گیا تھا اور پھر رام پرشاد نے جمنا کنارے شمشان گھاٹ پر باپو کی چتا کو اگنی دیوتا کے حوالے کر دیا۔ چند روز گزرے کہ کاروبار زندگی پھر چل نکلا۔ اب پربھو کی جگہ رام پرشاد آ گئے۔ اس کے طریقہ میں اور پربھو کے طریقے میں کوئی فرق نہ تھا۔ لین دین بھی اسی طرح چل رہا تھا۔ گوتم ان کا ہاتھ بٹا رہا تھا اور طریقہ واردات بھی سیکھ رہا تھا۔ رام پرشاد گھر میں کم ہی ٹکتا تھا اور جب تک ٹکتا تھا وہ خود کو بے چین پاتا تھا۔ آخر کون ہو گا جو جوانی کی گھوڑی کے ساتھ خوش ہو گا۔ یہ بات اس کی ماں جانتی تھی بھائی بھی جانتا تھا۔ مگر اس کو تو ایسا کیل دبا گیا تھا کہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی ماں کو بھوجی کہا کرتا تھا۔ ایک دن بھوجی نے کہا۔ ''ارے کا اپنے باپو کی چتا جلائے کے بیٹھے ہو آخری رسوم نہ کرو گے۔''

''کروں گا بھوجی ذرا فرصت تو ملے.....'' وہ بولا۔

''ارے تو تم نے کا کرنا ہے۔ تم حکم کرو..... منشی کو کہہ دو اور ہاں ذرا بھی کمی نہ رہ جائے۔ بارہ منڈی کا معاملہ ہے۔ دوڑاؤ سب کے خبر کرنے کو دن تاریخ پنڈت کو بلاؤ کے مہورت نکلواؤ۔ اصلی گھی کے مال پوئے بنواؤ۔ تیرے پتا کا نام سنڈوبے، کی مت کر یو برادری میں تھوتھو نہ ہوئے اب یہ تیری عزت کا معاملہ آ پڑا ہے۔ تیرے باپو تو رہے نہیں۔ میری بات کی گانٹھ باندھ لے اور رام کا نام لے کر آج سے ہی تیاری شروع کر دے۔''

بھوجی کا حکم تھا۔ رام پرشاد نے تیاری شروع کر دی۔ گھی کے کنستر آنے لگے۔ پکانے والوں کو بیانہ دے دیا اور پورے بارہ گاؤں کے برادری والوں کو دعوت دے دی گئی اور بڑے دھوم سے مال پوئے بنوائے گئے اور برادری اور شہر میں ایک بار پھر پربھو پرشاد کا نام روشن ہو گیا۔

پربھو پرشاد کی کہانی یہاں پر ختم ہو جاتی تو پھر بیان کرنے کی تو کوئی وجہ ہی نہ ہوتی۔ کہانی تو اب شروع ہوتی ہے۔ قلعہ والا گودام پربھو پرشاد کے دیہانت ہونے کے بعد بند کر دیا گیا تھا۔ مگر آخری رسوم کے بعد اس میں پھر مال آنے لگا۔ ایک دن زیادہ گاڑیاں آ گئیں اور مال لگاتے لگاتے رات ہو گئی۔

اسی جگہ مال لگایا جا رہا تھا جہاں سیٹھ بوری سے دب کر مرا تھا۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ ایک گیس کی بتی جل رہی تھی مگر اتنے بڑے گودام میں ایک گیس کی بتی کیا کام کرتی۔ اس کو دروازے پر لٹکا دیا تھا۔ ایک مزدور بوری لے کر اوپر چڑھا تو اس کے کان میں آواز آئی۔

''ذرا دیکھ کر ٹھونک بجا کے رکھیو پھر مت گرا دیو میرے اوپر.....'' مزدور نے اوپر سے ہی جھانک کے نیچے دیکھا اور فوراً پہچان لیا پھر بھو کھڑا تھا۔ وہ اوپر سے گرتا پڑتا نیچے دوڑا اور دروازے سے باہر بھاگتا چلا گیا۔ سب حیران رہ گئے اوروں نے پوچھا ارے کا ہوا تو وہ کیا بتلاتا اس کو تو ہانپی چڑھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر میں بڑی مشکل سے اس نے بتایا کہ سیٹھ پربھو پرشاد کھڑے تھے کوئی نہ مانا مگر وہ یہ کہتا ہی رہا اور پھر کئی دفعہ سیٹھ گودام میں نظر آتا رہا۔ سارے مزدور ڈر کر بھاگ گئے۔ قلعہ کا گودام بدنام ہو گیا۔ وہاں مال اتارنے چڑھانے کوئی مزدور نہ جاتا۔ سارا مال نکال لیا گیا۔ پھر رام پرشاد نے سوچا کیوں نہ اس کو بیچ دے بے کار پڑا ہے۔ مگر کوئی خریدار نہ ملا۔ رات کے وقت اکثر لوگوں نے سیٹھ پربھو پرشاد کو گودام کے اندر اور باہر دیکھا۔ ایک تو یہ جگہ آبادی سے دور ہی تھی۔ اس پر یہ مشہور ہو گیا کہ سیٹھ کی آتما یہاں رہتی ہے۔ لوگوں نے راستہ ہی چھوڑ دیا۔ وقت گزرتا رہا۔ گوتم کی بھی شادی ہو گئی اور اسی بھاگ دوڑ میں رام پرشاد بھی دو بیٹیوں کے پتا بن گئے۔ ماتا جی کا دیہانت ہو گیا۔ دونوں بھائیوں نے الگ الگ کاروبار کر لیا۔ درمیان میں ایک گودام رہ گیا۔ وہ کوئی اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتا تھا مگر وہ دونوں کے پاس ہی رہا۔ دونوں اس طرف نہیں جاتے تھے۔ وہ اپنے باپ کی آتما سے ڈرتے تھے۔ رام پرشاد نے کئی پنڈتوں سے بات کی۔ پربھو سیٹھ کی آتما کی شانتی کے

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

لئے اس کو پرلوک جانے پر مجبور کرنے کو کہا جائے مگر رام پرشاد کا کام نہیں ہوا۔ پھر پنڈت نے اس کو کہا۔

"اس کا پرلوک جانا مشکل ہے کیونکہ سیٹھ کی موت اچانک ہوئی ہے اور اس کی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ ایسے لوگوں کی آتمائیں دنیا میں منڈلاتی رہتی ہیں۔" رام پرشاد کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ ان چکروں میں پڑا رہتا۔ گوتم تو اس گودام کو بھول ہی گیا تھا۔ اس نے باپ کے طریقہ پر کاروبار نہیں کیا تھا۔ اس نے پورے دیش میں اپنا کاروبار پھیلایا تھا۔ وہ بمبئی کی چیزیں یوپی میں اور یوپی کی کسی اور صوبے میں پہنچاتا تھا۔ ہر جگہ اس کے کارندے تھے۔ دفتر تھے گودام تھے۔ اس کا دلی میں ایک بہت بڑا دفتر تھا اور وہ وہیں زیادہ تر رہتا بھی تھا۔ اس کی بیوی ایک پڑھی لکھی عورت تھی۔ اس نے گوتم کو اس طرح کاروبار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ تھا تو بنیا مگر روایتی بنیا گیری اس میں نہیں تھی۔ اچھا کھاتا تھا۔ اچھا پیتا تھا اور اچھے گھر میں رہتا تھا۔ گوالیار وہ کبھی کبھار بھائی کے پاس چلا جاتا تھا اور دوکان سے واپس آجاتا تھا۔ رام پرشاد کے گھر نہیں جاتا تھا۔ کیونکہ وہ بھابی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ دلی میں ہی اس کی بیوی کو ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اچھا تندرست چھ ماہ تک وہ ٹھیک رہا اور پھر بیمار ہوگیا۔ وہ کھاتا پیتا آدمی تھا ہر طرح اس کا علاج کرایا مگر بچہ دن بدن کمزور ہی ہوتا گیا۔

اور پھر ایک دن وہ میرے مطب میں اس کو لے کر آگیا۔ میں نے کیفیت پوچھی تو اس نے بتایا کہ بچہ تندرست پیدا ہوا تھا۔ چھ ماہ بعد بیمار ہوا ہے۔ ہر طرح کے ڈاکٹروں نے علاج کیا ہے۔ ٹھیک ہوتا ہے پھر بیمار ہو جاتا ہے تو میں نے آپ کا نام سنا تھا اس لئے آگیا۔ میں نے اور رولوکا نے بچے کا تفصیلی معائنہ کیا۔ میں نے اس کے جگر میں خرابی کا ذکر رولوکا سے کیا تو اس نے میری بات سے اتفاق کیا اور پھر رولوکا ایک نایاب بوٹی لے آیا اور میں نے علاج شروع کر دیا۔ ایک ماہ کے علاج کے بعد بچہ بالکل ٹھیک ہوگیا۔ گوتم اور اس کی بیوی بڑی شکر گزار ہوئی اور کچھ دینا چاہا تو میں نے کہا۔ "دیکھئے ہم جو فیس ایک عام آدمی سے لیتے ہیں..... وہی لیں گے۔ یہ دواخانہ دولت جمع کرنے کو نہیں کھولا گیا۔ یہ خدمت کرنے کو کھولا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کو ہماری خدمت کی ضرورت ہو تو ہم کریں گے۔"

"اور آپ کس قسم کی خدمت کرتے ہیں.....؟" گوتم نے پوچھا۔

میں نے رولوکا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ میرے دوست حکیم کامل روحانی علاج بھی کرتے ہیں۔"

روحانی علاج پر وہ ذرا چونکا اور بولا۔ "روحانی سے کیا مراد ہے؟"

رولوکا نے جواب دیا۔ "آپ کا دھرم ہندو ہے اس لئے اسی انداز میں آپ کو بتانے کی کوشش کرتا ہوں۔ ہندوؤں کے قدیم ویدوں میں لکھا ہے کہ انسان مرنے کے بعد پھر جنم لیتا ہے اگر کوئی انسان دیوتاؤں کی حکم عدولی کرتا ہے تو اس کا جنم حشرات الارض یعنی کیڑے مکوڑوں میں ہوتا ہے۔"

گوتم رولوکا کی بات سن کر بولا۔ "میں نے بھی یہ کہیں پڑھا ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مرنے کے بعد ساری آتمائیں واپس جاتی ہیں جہاں سے آئی ہیں۔"

"ہاں سب کو واپس جانا ہوتا ہے۔ کچھ فوراً چلی جاتی ہیں اور کچھ دیر میں۔" رولوکا نے بتایا۔

"دیر سے کیوں جاتی ہیں؟" گوتم نے پوچھا۔

"دنیا کی چاہت دولت کی چاہت ادھوری خواہشات اس کے جانے میں رکاوٹ بنتی ہیں مگر پھر بھی جانا پڑتا ہے کیونکہ ان کا جنم پھر ہونا ہے خواہ کسی شکل میں ہو، میں جو بات کر رہا ہوں وہ تمہارے عقیدے اور دھرم سے کر رہا ہوں۔ میں اس کو مانتا ہوں کہ نہیں یہ ایک علیحدہ بات ہے۔ ہمارے پاس بار بار جنم لینے کا فلسفہ نہیں ہے۔" رولوکا نے بتایا۔

"میرے خاندان کے ساتھ ایک مسئلہ ہے۔ آپ اگر اجازت دیں تو آپ کو بتاؤں۔" گوتم نے کہا۔

"ضرور بتاؤ..... اگر ہم کچھ کر سکے تو ضرور کریں گے۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"میرے پتا کی موت اچانک ایک حادثے میں

ہوئی تھی۔ جس جگہ ان کی موت ہوئی تھی اس مقام پر ان کی آتما رہتی ہے۔ اکثر لوگوں نے اس کو دیکھا ہے اور سنا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کچھ میری مدد کریں گے۔" گوتم نے کہا۔

"آپ یہ بتائیں کہ ان کی کوئی تمنا تھی، خواہش تھی جو پوری نہیں ہوئی۔" رولوکا نے پوچھا۔

"وہ ایک کامیاب کاروباری آدمی تھے۔ گوالیار شہر میں ان کا کاروبار تھا۔ بہت پیسہ بھی ان کے پاس تھا۔ اس کے علاوہ اولاد بھی ان کی تھی۔ میں اور میرا بڑا بھائی۔ پھر کیا خواہش تھی میں نہیں سمجھ سکتا۔ ان کی آتما آج بھی اسی گودام میں رہتی ہے۔ اب تو وہ ویران پڑا ہے۔ ڈر کے مارے لوگ ادھر سے گزرتے بھی نہیں۔" گوتم نے جواب دیا۔

"آپ نے اپنے دھرم کے پنڈتوں سے مشورہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے نہیں مگر بڑے بھائی نے مشورہ کیا تھا مگر کوئی کام نہیں بنا۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی آتما کو شانتی مل جائے اور وہ پرلوک سدھار جائیں۔"

"وعدہ نہیں کوشش کریں گے۔ کیونکہ یہ اپنی نوعیت کا نیا کیس سامنے آیا ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"میں آپ کا بہت احسان مند ہوں گا۔" گوتم نے کہا۔

"تو پھر آپ کو ہمارے ساتھ گوالیار چلنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ جب حکم کریں میں چلوں گا۔" گوتم نے جواب دیا۔

"تم یہ بتاؤ پربھو کی آتما کا کیا کرو گے؟" گوتم کے جانے کے بعد میں نے رولوکا سے پوچھا۔

"پربھو زندگی میں بہادر کب تھا جو مرنے کے بعد اس کی آتما بہادر ہوگی۔ اس کی دولت نے اس کو نہیں جانے دیا۔ میرے خیال میں اپنی زندگی میں وہ اپنی کمائی ہوئی دولت کو اپنے اوپر خرچ کرتا تو اس کی آتما آسودہ ہو جاتی۔ مگر وہ اس قدر کنجوس تھا کہ صاف کپڑے تک نہیں پہنتا تھا جو پہنتا تھا، اس کو دھوتا تک نہیں تھا۔ ظاہر ہے اس کی آتما کی خواہشات تو ادھوری ہی رہیں اور وہ اسی لئے زمین سے جڑی ہوئی ہے۔" رولوکا بولا۔

"اب تم کیا پروگرام رکھتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"پربھو کی آتما سے ملاقات کرنا ہوگی۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے کسی زندہ آدمی سے ملاقات کرنے جا رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"بے شک یہ ایک حیرت کی بات ہے۔ آپ کے لئے بھی اور عام آدمی کے لئے بھی اور یہ بھی نہیں کہ ان معاملات کو سمجھنے اور حل کرنے کو فوق البشر ہونا ضروری ہے۔ رب کائنات نے انسان کو اتنی طاقت اور ہمت دی ہے کہ وہ اپنے طور پر یہ سب کر سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ذاتی لالچ یا فائدہ اس میں نہ ہو۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"اچھا ایک بات کا جواب دو۔ یہ سوال بہت دنوں سے میرے ذہن میں تھا۔ کیا تمہارا علم معمولی احاطہ انسانی سے بالاتر ہے یا تمہارے پاس کوئی افریقن جادو ہے۔" میں نے پوچھا۔

"تم نے بہت دیر کی اس سوال کے کرنے میں۔ یہ سوال تو تم کو بہت پہلے کر لینا چاہئے تھا۔ اس سے مجھے آپ کی گہرائی کا اندازہ ہوا۔ اب جواب یہ ہے کہ احاطہ انسانی کی حدود کا تعین کرنا ناممکن ہے۔ انسان آسمانوں میں سیر کرتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں میل کا سفر لمحوں میں کرتا ہے۔ اب رہا جادو تو جس کو لوگ یہاں کا جادو کہتے ہیں، ہم اس کو علم کہتے ہیں۔ اس علم سے انسانوں کی خدمت کرتے ہیں۔ ظلم ختم کرتے ہیں۔ حق دار کو حق دلاتے ہیں۔ اپنی ذاتی ضرورت کے لئے استعمال نہیں کرتے۔ یہی شرط ہے۔ جس دن میں اپنی خواہش پوری کرنے کو اپنا علم استعمال کروں گا، اس دن میرا آخری دن ہوگا۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"بہت اچھا جواب تم نے دیا۔ یہ بتاؤ کب گوالیار جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بس شام کو چلا جاؤں گا۔" رولوکا نے جواب دیا۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

اور رولوکا گوالیار روانہ ہوگیا۔ گوالیار زیادہ بڑا شہر نہیں ہے۔ ایک بہت بڑا کسی راجہ کا بنایا ہوا قلعہ یہاں پر موجود ہے۔ یہ چونکہ ہندو اسٹیٹ ہے، اس لئے آبادی بھی ہندوؤں کی زیادہ ہے۔ ذہنیت کے اعتبار سے جی حضوری کرنے والے زیادہ ہیں۔ یہ کوئی خاص بات نہیں ہے کیونکہ اکثر ریاستی لوگوں کی ذہنیت ایسی ہی ہوجاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ریاست کوئی بھی ہو اس میں راجہ یا نواب کی عملداری ہوتی ہے اور صرف اسی کا حکم چلتا ہے۔ اس کے جو قریبی لوگ ہوتے ہیں۔ وہ نواب یا راجہ کی توجہ اپنی طرف کرنے کو خوشامد کرتے ہیں اور اس کے نورِ نظر ہوجاتے ہیں۔ ان نورِ نظر لوگوں کو بھی خوش کرنے والے مل جاتے ہیں اور یہ سلسلہ لمبا ہوتا جاتا ہے اور لوگوں کا یہ مزاج ہی بن جاتا ہے۔ یہ صرف میرا اندازہ ہے۔ کوئی کلیہ نہیں ہے۔ ایسے بھی ضرور ہوں گے جو اپنا الگ انداز رکھتے ہوں۔ ہر بات پر گردن نہیں ہلاتے ہوں گے۔ مگر بات وہ کی جاتی ہے جو جنرل ہو خاص تو پھر خاص ہوتے ہیں۔

میں گوتم کے ساتھ تھا۔ رام پرشاد گوتم کا بھائی ایک کھاتا پیتا آدمی تھا۔ گوتم نے آنے کی وجہ بھائی کو بتائی تو وہ بھی خوش ہوا بولا۔ "باپو کی آتما کو شانتی مل جائے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہوگی۔"

"مجھے تم یہ بتاؤ تم نے اپنے دھرم کے مطابق ان کا کریا کرم کردیا تھا اور آخری رسومات بھی پوری کردی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں میں نے وہی کیا تھا جو پرکھوں سے ہوتا آیا تھا۔" رام پرشاد نے جواب دیا۔

"تمہارے پتا پر کوئی قرض تھا۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں کوئی قرض نہیں تھا۔ کاروباری لینا دینا سب کھاتوں میں موجود تھا۔ ان پر جو لکھا تھا اس پر میں نے عمل کیا تھا۔" رام پرشاد نے جواب دیا۔

"کوئی ایسی رقم جس کا ذکر کھاتوں میں نہیں ہو اور پربھو سیٹھ نے کسی کو دی ہو۔" میں نے پوچھا۔

"اس کے بارے میں مجھے پتہ نہیں ہے کیونکہ ان کو کچھ بتانے کا موقعہ ہی نہ مل سکا۔" رام پرشاد نے جواب دیا۔

"رات کو میں اس گودام میں رہنا چاہتا ہوں۔ تم دونوں بھی میرے ساتھ رہو گے۔" میں نے کہا۔

"ہمارا ساتھ رہنا کیا ضروری ہے؟" رام پرشاد نے پوچھا۔

"ہاں ضروری ہے، اس لئے کہ معاملہ تمہارا ہے۔ جو کچھ بھی ہوگا وہ تمہارے سامنے ہوگا اور تم اس کے گواہ ہو گے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ ہیں تو ہم ساتھ ہوں گے۔" گوتم نے کہا۔

"یہاں پر کوئی بڑا مندر ہے۔" میں نے پوچھا۔

"بہت بڑا مندر ہے۔" گوتم نے بتایا۔

"تو پھر آؤ میرے ساتھ پہلے ہم اس مندر میں چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہاں جانے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟" رام پرشاد نے پوچھا۔

"تم نے بے شک ساری رسوم جو تمہارے دھرم کی تھیں، پوری کردی تھیں۔ مگر اب پھر دوبارہ سے اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے؟ اور وہ میں نہیں کرسکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک ہوشیار پنڈت ساتھ ہو۔" میں نے جواب دیا۔

اور ہم تینوں شہر کے سب سے بڑے مندر کی طرف چل دیئے۔ یہ مندر شیوا بھگوان کا مندر تھا۔ کچھ تھوڑی سی وضاحت میں پڑھنے والوں کے لئے کردیتا ہوں۔

یوں تو ہندو دھرم میں بے شمار دیوی دیوتا ہیں۔ لیکن برہمنوں نے محسوس کیا کہ دیوی، دیوتاؤں میں بنیادی تبدیلی کرنا چاہئے۔ چنانچہ اس احساس کے نتیجے میں ہندو دھرم میں تین بڑے خدا مقرر کئے گئے۔ ایک نمبر پر برہما، دوسرا شیوا اور تیسرا وشنو۔ ان تینوں کو تری مورتی یعنی تین شکلیں کہتے ہیں۔ ان کے تحت بے شمار دیوتا اور دیویاں مقرر کردی گئی ہیں۔ ان تینوں کے کام اور اختیارات کی ایک الگ تفصیل ہے۔

تو یہ شیو بھگوان کا مندر تھا۔ جتنا بڑا مندر تھا اس کا اتنا ہی بڑا پجاری بھی تھا۔ اس کے اتنے ہی بڑے نخرے بھی تھے۔ اس نے میری پوری بات سنی ہی نہیں اور جانے سے انکار کردیا۔ اکڑ کر بولا۔

"ہم کا اسی کام کے رہ گئے ہیں۔ ہم شیو بھگوان کے بھگت ہیں۔ کوئی ایلے میلے نہیں ہیں۔ جاؤ جاؤ کسی اور مندر میں جاؤ۔"

اس کی بات سن کر دونوں بھائیوں نے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں، اب کیا کریں۔ پنڈت جانے لگا تو میں نے اس کو روک لیا اور کہا۔ "پجاری جی دھرم کے کام کرنا تو پن ہے اور تم پن کے کام کرنے سے جی چرا رہے ہو اور خود کو شیو بھگوان کا بھگت بھی کہتے ہو۔"

"ارے اور بہت ہیں پن کے کام۔ کا یہ آتماؤں سے ملنا ہی رہ گیا ہے۔ ہم نہیں جائیں گے کہہ جو دیا ہے۔" وہ پھر جانے لگا میں نے پھر روک لیا اور کہا۔

"میری ایک بات غور سے سن لو پجاری۔ اگر نہیں جاؤ گے تو سیٹھ پربھو پرشاد سورگباشی کی آتما جو گودام میں اب بھی موجود ہے یہاں مندر میں آجائے گی اور تم سے پوچھے گی۔ پھر بتاؤ کیا کرو گے؟" میں نے کہا۔

"آگئی آتما ارے کیا چلتر چلاتے ہو۔ یہ شیو کا مندر ہے کوئی دھرم شالہ نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"اچھا تو پھر جاؤ، آج رات کو وہ آتما تم سے پوچھے گی، جواب دے دینا۔"

اور میں نے گوتم اور رام پرشاد کو واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ پجاری حیرت سے کھڑا دیکھتا رہا اور ہم مندر سے باہر آگئے۔ باہر آتے ہی گوتم نے حیرت سے کہا۔ "یہ آپ نے پجاری کو کیا کہہ دیا۔ باپو کی آتما پجاری کے پاس کیوں جائے گی؟"

"جائے گی اور کل یہ پجاری خود چل کر ہمارے پاس آئے گا۔" میں نے کہا۔ گوتم اور رام پرشاد کی سمجھ میں بات نہیں آئی مگر خاموش ہوگئے۔

رات کھانا وغیرہ کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور اندر سے دروازہ لاک کرلیا۔ ٹھیک بارہ بجے میں کھڑکی کی راہ سے نکل آیا اور مندر کی طرف چلا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ ایک دو تانگے البتہ نظر آئے۔ مگر میں چونکہ روپوشی کی حالت میں تھا۔ اس لئے وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔

مندر میں پجاری کی رہائش کے لئے ایک مکان بنا ہوا تھا اور پجاری اپنی دھرم پتنی کے ساتھ اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ میں سیدھا اندر چلا گیا اور جاتے ہی اس کی ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لے آیا۔ یہ جگہ شیو بھگوان کی مورتی کے عین سامنے تھی۔ مندر میں اندھیرا تھا۔ پجاری جاگ گیا تھا۔ مگر اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔ گھبراہٹ اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔ اس کے قریب کوئی نہیں تھا اور اس کو گھسیٹا جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ کھڑا ہوا اور بولا۔ "ارے کون ہے سامنے تو آ، کا بات ہے؟"

میں نے کہا۔ "میں پربھو پرشاد..... تو نہیں آیا تو میں چلا آیا۔"

"غلطی ہوگئی سیٹھ جی سر کے بل آؤں گا۔" وہ ہڑبڑا کر بولا۔

"اور اگر نہ آیا تو جمنا میں ڈبو کر تیرا کلیان کردوں گا۔" میں نے کہا۔

"ضرور آؤں گا، شریمان جی مجھے معاف کردو۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے، کل رام پرشاد کے پاس چلے جانا۔" میں نے کہا۔

"ضرور چلا جاؤں گا۔" وہ پھر بولا اور میں اس کو چھوڑ کر واپس آگیا۔ ہم ابھی ناشتہ ہی کر رہے تھے کہ پجاری آگیا۔ گوتم نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "آپ کی بات ٹھیک تھی۔"

میں نے کہا۔ "اس کو اندر بلالو۔" اور پجاری اندر آگیا تو میں نے کہا۔ "تم نے دیکھا۔ پجاری تمہارا شیو بھگوان سامنے تھا اور آتما نے تمہاری کیا درگت بنائی۔ کیسی زبردست آتما ہے، سیٹھ پربھو پرشاد کی۔ میں نا کہتا تھا مگر تمہارے دماغ پر چربی چڑھ گئی ہے۔ ہر کسی سے ایک سا سلوک نہیں کیا جاتا۔ تم انسانوں کی پرکھ بھول گئے ہو۔ کہو تو

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

ابھی اسی جگہ پر بھو سیٹھ کی آتما کو بلالوں۔"

میں نے ذرا غصے سے کہا تو وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"بھول ہوگئی مہاراج، معاف کردو، حکم کرو۔"

"پربھو پرشاد کی آخری رسوم کی تیاری کرو۔ آج رات آخری رسوم ادا کرنی ہیں۔ تم اپنا کام کرو، غلطی مت کرنا نہیں تو آتما تم کو الٹا لٹکا دے گی۔" میں نے کہا۔

"نہیں مہاراج..... بار بار غلطی نہیں ہوتی۔ کچھ سامان کی ضرورت ہوگی۔" وہ بولا۔

"تم بتاؤ سب سامان آجائے گا۔" رام پرشاد نے کہا۔

پنڈت نے کہا۔ "گیندے کے پھول، مولسری کے پھولوں کے دوہار اور ہرمل کے دانے کچھ لوبان بڑھیا والا بس یہی چیزیں منگوادیں۔" پنڈت نے کہا۔

"کام پورا کرنا نہیں تو آتما ناراض ہوجائے گی۔" میں نے کہا۔

"سو بھاگے ہیں میرے کہ میں یہ کام کروں گا۔" وہ بولا۔

"خوشی سے کرتا تو اور زیادہ سو بھاگ ہوتے۔" میں نے کہا۔ پنڈت خاموش ہوگیا۔

رات کو ٹھیک دس بجے ہم چاروں گودام کی طرف جارہے تھے۔ چاروں میں دونوں بھائی گوتم اور رام پرشاد، پنڈت اپنی پوٹلی کے ساتھ اور میں، ہم لوگ پیدل ہی گودام کی طرف جارہے تھے۔ راستہ پورا سنسان تھا۔ گودام کی چابی رام پرشاد کے پاس تھی۔ اس نے جاتے ہی تالا کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی کئی چمگادڑیں پھڑپھڑا کر باہر اڑ گئیں۔ گوتم اور رام پرشاد سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے اور میں نے اندر قدم رکھ دیا۔ گودام بہت دنوں سے بند تھا۔ اس میں گھٹن اور بدبو تھی۔ چوہے بھی مٹر گشت کررہے تھے۔ اندر گہرا اندھیرا تھا۔ ہمارے پاس بھی کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ میں جان بوجھ کر روشنی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے پنڈت کو کہا۔ "تم اپنا کام شروع کردو۔"

پنڈت کے پاس اگر بتیاں تھیں۔ اس نے پیکٹ نکال کر سب میں آگ دکھادی۔ تھوڑی سی روشنی ہوئی۔ میں اس روشنی میں اور اندر چلا گیا اور روپوش ہوگیا۔

"پربھو پرشاد تم کو پرلوک جانا ہے۔ اب دنیا میں تمہارا کام نہیں ہے۔ اگر رہو گے تو اسی آتما کی شکل میں آوارہ پھرتے رہو گے۔ پرلوک چلے جاؤ۔ پھر سے تم دنیا میں آتو جاؤ گے۔"

آتما بولی۔ "میری رقم ماری جائے گی۔"

"کتنی رقم ہے اور کس پر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دوار کا ناتھ لے کر گیا تھا اور اسی دن میرا شریر ختم ہوگیا۔" آتما کی آواز آئی۔

"دوار کا ناتھ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دوار کا ناتھ سیتا پور کا ایک سیٹھ ہے۔ اس کی طرف رقم ہے۔ دس ہزار روپے۔" آواز آئی۔

"وہ رقم تمہارا بیٹا رام پرشاد وصول کرلے گا۔" میں نے کہا۔

"تو پھر میں پرلوک جانے کو تیار ہوں۔" آواز آئی۔

پنڈت اشلوک پڑھ رہا تھا اور پھر کچھ دیر میں پنڈت نے اعلان کیا کہ آتما چلی گئی ہے۔ میں نے ہر طرف گھوم پھر کے تسلی کرلی اور بتایا کہ وہ نہیں ہے۔

"تم سیتا پور کے دوار کا ناتھ سیٹھ سے دس ہزار کی رقم وصول کرلینا۔" میں نے کہا۔

پنڈت نے گیندے کے پھول اور مولسری کے پھول زمین پر بکھیر دیئے۔ لوبان کی جگہ پھر ایک پاکٹ اگر بتیاں جلادیں۔ ہرمل کے دانے سارے گودام میں پھیلا دیئے اور پھر بولا۔ "اور حکم کیا ہے وہ بھی کردوں گا۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "بس اتنے کام سے تھک گئے۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ میں نے تو آتما کو بلانے کو کچھ کیا ہی نہیں اور آتما آگئی اور تم سے مان بھی گئی۔ یہ بات اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے کیسے ہوگئی۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا ہے۔" پنڈت نے حیرت سے کہا۔

"تمہاری سمجھ میں آئے گا بھی نہیں۔ اس لئے کہ تم نے اپنا زیادہ وقت کھانے میں اور عیش میں گزارا ہے۔ اگر تم کچھ محنت کرتے اور علم حاصل کرتے تو یہ سوال نہ کرتے۔" میں نے کہا۔

پنڈت کھسیانا ہوکر خاموش ہوگیا اور ہم واپس آگئے اور کہانی ختم ہوگئی۔ میں نے واپسی کی اجازت لی اور چلا آیا۔

☆.....☆.....☆

نام تو اس کا کلومیاں تھا مگر سب کلو ہی کہتے تھے۔ باپ کا انتقال پیدائش سے پہلے ہوگیا تھا اور اماں کا پیدائش کے وقت ہوگیا نہ کوئی بھائی تھا نہ بہن۔ پیدا ہوتے ہی اماں کو مار دیا اور پہلے باپ پر ہاتھ صاف کردیا۔ پیدا ہوا تو لگتا تھا جیسے پتھر کے کوئلے کا ڈھیلا ہو۔ دائی بھی دیکھ کر چونک گئی۔ اب نام کیا رکھنا تھا۔ پیدا ہوتے ہی کلومیاں مشہور ہوگئے۔

دائی عورت خدا ترس تھی۔ اس نے دیکھا کہ باپ پہلے مرگیا اور ماں کو یہ جنم جلا پیدا ہوتے ہی ڈکار گیا تو منحوس ہونا تو ثابت ہوگیا۔ مگر ہے تو بچہ ہی کوئی اس پر ہاتھ دھرنے پر راضی نہیں تو وہ بلا دائی کبیرن کے سر آگئی۔ وہ تھی بھی بے اولاد۔ بڑھاپے کا دور شروع ہونے کو تھا۔ اگر منحوس ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ مرجاؤں گی تو کیا ہوا۔ کوئی پہلے کوئی بعد میں مرنا تو ہے۔ تو کلومیاں کو دائی کبیرن لے گئی اور جب کلو میاں گیارہ سال کے ہوئے اس وقت دائی کبیرن بھی مرگئی۔

اب کہاں جائیں۔ اب تو خود ہی کمانا ہے اور پیٹ پالنا ہے۔ انسان کا پیٹ بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔ کلومیاں بھی کمانے کو چل دیئے۔

مراد آباد ایک صنعتی شہر ہے۔ یہاں پر گھر گھر نقشین برتن بنائے جاتے ہیں اور پھر ان کو بڑے بیوپاری خرید کر دوسرے شہروں کو روانہ کردیتے ہیں۔ یہاں کا لاری اڈا بہت بڑا ہے۔ یہاں سے سامان بھی دوسرے شہروں کو لوڈ کیا جاتا ہے۔ مسافروں کا بھی ہجوم ہوتا ہے۔ لمبے سفر سے آنے والی لاریاں خالی ہونے کے بعد ایک طرف کھڑی کردی جاتی ہیں۔ ان کی مرمت اور صفائی وغیرہ ہوتی ہے۔ پانی سے دھویا جاتا ہے۔ کلومیاں بھی ان لڑکوں میں شامل ہوگئے جو گاڑیاں دھوتے تھے۔ ابھی تک بے فکری کی زندگی گزاری تھی۔ ہاتھ پیر کے اچھے تھے۔ عمر سے زیادہ لگتے تھے۔ جو کماتے کھاجاتے۔ سونے کی فکر نہ رہنے کی، کسی بھی گاڑی میں سوجاتے اور صبح پھر وہیں سے کام شروع کردیتے۔ کام میں پھرتی اور زبان بازاری تھی۔ اچھے برے سب سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ سڑک کے کالج کے اسٹوڈنٹ تھے جو کچھ اس کالج میں پڑھایا جاتا ہے۔ وہ اچھے نمبروں میں پاس کررہے تھے۔ مارکٹائی، گالم گلوچ کے درجے پاس کرچکے تھے۔ تعلیم کے بعد عملی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ مگر یہ سڑک چھاپ کالج دنیا کا واحد کالج ہوتا ہے۔ جہاں پر تعلیم کے ساتھ ساتھ عملی زندگی میں ملتی ہے اور جو زیادہ ترقی کرتا ہے تو اعلیٰ تعلیم کے لئے دو چار سال جیل کالج میں پڑھتا ہے۔ یہاں پر نہایت اعلیٰ درجے کے استاد کے تجربوں سے وہ فائدہ حاصل کرتا ہے۔ کلومیاں نے بھی پندرہ سال کی عمر میں بہت کچھ سیکھ لیا، پڑھ لیا اور پھر ایک ڈرائیور کو زخمی کرنے کے الزام میں دو سال کا ڈپلومہ کرنے جیل کالج میں داخلہ ہوا۔ یہاں پر اس کو استاد کولی سے تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ استاد کولی جوئے کے اڈے اور شراب کے کاروبار کے ماہر تھے۔ اتفاق سے دونوں کی رہائی بھی ایک ساتھ ہی ہوگئی اور کلومیاں لاری اڈے جانے کے بجائے کولی استاد کے اڈے پر آگئے۔ مارکٹائی گالم گلوچ کے تو وہ ماہر تھے۔ ان کا یہاں پر بھی یہی کام تھا کہ دن بھر نئی سے نئی گالیاں ایجاد کریں اور عام کریں۔

دو سال تک وہ کولی استاد کے فرسٹ اسسٹنٹ بنے رہے اور پھر ترقی کرکے حصہ دار بن گئے۔ ان کا رتبہ بڑھ گیا۔ کولی استاد کے بعد وہی مالک تھے۔

وہ دن بھر شراب بنوانے اور بکوانے میں لگے رہتے۔ رات بھر اڈے پر جوا ہوتا رہتا۔ مگر نہ کبھی کلومیاں نے شراب پی اور نہ تاش کھیلا۔ بات تھی تو حیرت کی۔ کسی نے پوچھا۔ "چھوٹے استاد کبھی تو شغل کرلیا کرو۔ بالکل ہی سنیاسی بنے ہوئے ہو۔" تو جواب ملتا۔

"ابے بھوتنی کے شراب بنانا اور بیچنا ہمارا دھندہ

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

ہے۔ جتنی چاہیں پی لیں مگر تم نے کبھی حلوائی کو مٹھائی کھاتے دیکھا ہے اور رہا جوا تو وہ ہم کمانے کو چلاتے ہیں۔ خود کھیلیں گے تو ہاریں گے بھی۔ اب جب کمائی ہو رہی ہو تو ضرورت کیا ہے کہ خود بھی کھیلیں، لو بتاؤ۔"

کولی استاد ایک مقابلے میں مارے گئے۔ ان کے ساتھ کلومیاں بھی تھے۔ اگر وہ ذرا زور باندھتے تو شاید کولی استاد نہ مارے جاتے مگر کلومیاں زور کیوں باندھتے۔ ان کو تو پورا اڈا نظر آ رہا تھا۔ کسی کو پتہ نہ چلا کہ کولی استاد کیسے مارے گئے۔ اب سارا کاروبار کلومیاں کے پاس تھا۔

اس کاروبار کو چلانے کے لئے ضروری تھا کہ ان کا رابطہ علاقے پولیس اور اعلیٰ آفسران سے ہو۔ اس کے لئے کلو میاں نے تھوڑا تھوڑا کر کے خود کو تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ پولیس کی حد تک تو ان کی تعلیمی زبان چل سکتی تھی۔ مگر اس سے اوپر کے لئے کچھ اور بھی تعلیم کی ضرورت تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنے اندر تبدیلی لانا شروع کر دی اور مزید دو سال گزر گئے۔ اب کلومیاں اڈے والوں کے لئے صرف میاں جی ہو گئے اور سرکاری لوگوں کے لئے منے خان بن گئے۔ روپیہ انسان کا نام پیدا کرتا ہے۔ کبھی گوپی ناتھ گونو بن جاتا ہے اور کبھی گونو گوپی ناتھ۔ انسانی معاشرے میں روپے کی بڑی اہمیت ہے۔ کلومیاں کی تبدیلی کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ ایسا ہوتا ہی آیا ہے۔ ذات برادری کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر جیب میں رقم ہے تو برادری والے بڑے فخر سے کہتے ہیں۔ یہ اپنا ہی بچہ ہے اور اگر کنگال ہے تو کہتے ہیں ہم کیا جانیں ہو گا کوئی۔

کلومیاں نے اپنا ٹھکانا بدل لیا۔ نام بدل لیا مگر اندرونی طور پر کام وہی تھے۔ فرق یہ تھا کہ اب ذرا قاعدے قرینے سے اور بڑے پیمانے پر ان کے کارندے یہ کام کرتے تھے اور وہ صرف ان کی رکھوالی کرتے تھے۔ ان کو ان کی محنت کے مطابق رقم ادا کرتے تھے۔ شہر کے سب ہی اعلیٰ افسران ان کے پاس آیا کرتے تھے اور وہ ان سب کو خوش رکھنے کا گر جانتے تھے۔ اڈے اب بھی چل رہے تھے مگر ان کا نام کہیں نہیں تھا۔ مگر بڑی ایمانداری سے رقم بینک میں پہنچ جاتی تھی۔ ذرا سی بے ایمانی کی سزا کتنی بڑی ہو گی۔ یہ بات سب جانتے تھے کہ منے خان کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ جو کوئی نہ کر سکے، وہ خان صاحب کر دیا کرتے تھے۔ مراد آباد کے سب بڑے کارخانے دار خان صاحب کو جانتے تھے اور خان صاحب کا کہا پتھر کی لکیر ہوا کرتا تھا۔ معاملہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری، سب جگہ خان کا کہا چلتا تھا۔

خان کا بینک بیلنس بڑھتا جا رہا تھا۔ جب انسان پر دولت کا بوجھ بڑھ جاتا ہے تو دماغ نئی نئی راہیں دکھاتا ہے۔ مراد آباد خان کو اپنی حیثیت چھوٹا نظر آنے لگا تھا۔

اب اس نے میرٹھ میں پاؤں پھیلا دیئے اور چند روز میں ہی وہاں کے سرکاری اہلکار اس کی مٹھی میں آ گئے۔ قانونی کم اور غیر قانونی زیادہ کام اس نے ان سے کروائے اور سب کو اپنا دوست بنا لیا۔ وہ دینے میں کبھی کنجوسی نہیں کرتا تھا اور پھر اسی طرح ایک کے دو وصول بھی کر لیا کرتا تھا۔

دولت نے اس کی عقل کے دریچوں کو پوری طرح کھول دیا تھا۔ اپنے کارندوں پر اس کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ شہر کا بڑے سے بڑا غنڈا اس کے سامنے آ کر گردن جھکا کر بات کرتا تھا۔ کوئی بھی غیر قانونی کام اس کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتا تھا۔ بات قتل کی ہو یا ڈاکے کی، کسی کی مجال نہ تھی کہ خان صاحب کو بتائے بغیر کر گزرے۔ سب ہی جانتے تھے کہ خان صاحب کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ پولیس سے بچ جائیں تو بھی منے خان سے بچنا مشکل ہے۔ اس لئے پہلے آشیرباد پھر واردات۔ یہی فارمولا میرٹھ اور مراد آباد میں چل رہا تھا اور اب دلی میں بھی آ گیا تھا۔ دلی میرٹھ اور مراد آباد نہیں تھا۔ یہاں پر بڑے بڑے سرپھرے پڑے تھے۔ خان سے مقابلے ہوئے، کبھی خان کے آدمی بھاگ گئے، کبھی دلی کے دلیر دوڑ گئے۔ مگر اب تک مراد آباد اور میرٹھ والی بات خان کی نہیں تھی۔

یہاں پر اس نے دوسرا کارڈ کھیلا۔ لڑائی جھگڑوں سے وہ چیز حاصل نہیں کر سکا اور نہ سرکاری اہلکاروں سے میرٹھ اور مراد آباد جیسے تعلقات پیدا ہو سکے۔ اس کا دوسرا کارڈ نوٹ تھا۔ ہر کاروبار کرنے کے لئے پہلے لگانا پڑتا ہے اور فوراً ہی کمائی

نہیں ہوتی۔ صبر کرنا پڑتا ہے۔ کتنا عرصہ صبر کرنا پڑے گا۔ یہ تو حالات پر منحصر ہے۔ اس کے بعد کمانے کا وقت آتا ہے۔

دلی شہر میں قدم جمانے کو اس نے یہ کاروبار کرنا تھا۔ اس نے شرافت کا لباس پہن لیا۔ اچھے لوگوں سے ملنا جلنا شروع کر دیا اور ایک بہت بڑی دوکان دلی کے چاندنی چوک میں کھول لی۔ یہ ایک دکھاوے کا کاروبار تھا۔ اس کا اصل کاروبار اب بھی میرٹھ اور مراد آباد میں چل رہا تھا مگر دلی میں اس نے جو نقاب اوڑھا تھا اس کے لئے یہ دکھاوا ضروری تھا۔

وہ دلی کے شرفاء میں شامل ہو گیا۔ اس کے پاس مراد آباد اور میرٹھ کا کوئی کارندہ نہیں آ سکتا تھا۔ وہ خود ان سے ملتا تھا۔ دلی میں اس نے خود کو نیک نام بنانا شروع کر دیا تھا۔ فلاحی اور رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتا تھا۔ چندہ کسی مسجد کا ہو یا مندر کا وہ دل کھول کر دیا کرتا تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ وہ دوکان سجاتا گیا۔ رقم لگاتا گیا اور پھر لوگوں نے مان لیا کہ خان صاحب بے لوث خدمت گار ہے۔ بغیر کسی لالچ کے سب کی خدمت کرتا ہے۔ وہ اپنے چہرے پر یہی چہرہ سجانا چاہتا تھا۔ اب وہ وقت آ گیا تھا کہ وہ دوکان میں جو خرچ کیا وہ سود در سود کے ساتھ وصول کرے۔ زندگی کے ہر شعبے میں دوڑ لگی ہوئی ہے۔ ہر کوئی سب سے آگے نکلنا چاہتا ہے۔

کاروباری لوگ بھی ایک دوسرے سے رقابت رکھتے ہیں۔ سیٹھ نہال چند نے بہت پہلے ایک فیکٹری فرید آباد میں ڈالی تھی۔ یہاں پر وہ سائیکل کے پرزے بناتے تھے۔ مگر اس فیکٹری نے کبھی کما کر نہیں دیا۔ ہر سال ان کو کچھ نہ کچھ نقصان ہی ہوا کرتا تھا۔ ایک شادی میں سیٹھ نہال چند کی ملاقات خان سے ہوئی، بات چھڑی۔

"میں تو فیکٹری بند کر دوں گا۔ ارے میاں ہر سال گھاٹا ہی ہو رہا ہے۔"

"ہوں! گھاٹا ہو رہا ہے۔ کچھ پتہ تو چلے۔" منے خان بولے۔

"بات یہ ہے کہ ہماری کاسٹ روف پروڈکشن زیادہ ہے۔ پنجاب والے کم دام میں مال مارکیٹ میں بیچ رہے ہیں۔ ہمارا مال پڑا رہ جاتا ہے اور ان کا فروخت ہو جاتا ہے۔" نہال چند نے کہا۔

"تم کیا چاہتے ہو۔ ان کا مال کوئی نہ خریدے یا وہ مال ہی نہ بنائیں۔" خان نے پوچھا۔

"میرے خیال میں تو دونوں باتیں ممکن نہیں ہیں۔" نہال چند نے کہا۔

"تم صرف اپنا مقصد بتاؤ، کام کرنا میرا کام ہے۔" خان نے کہا۔

"اگر پنجاب سے مال آنا بند ہو جائے تو لازمی ہمارا ہی مال مارکیٹ میں ہو گا۔ وہی بکے گا۔" نہال نے جواب دیا۔

"اگر بننا بند ہو گیا تو مال نہیں آئے گا۔ اگر صرف آنے سے روکا گیا تو کبھی نہ کبھی آ جائے گا۔ کام وہ کرنا چاہئے کہ ہمیشہ کے لئے ہو۔" خان نے کہا۔

"یہ کس طرح ہو گا، میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔" نہال چند نے کہا۔

"یہ کام میرے کرنے کا ہے۔ میں کیسے کروں گا۔ اس کو تم چھوڑو۔ بات کرو، کاروبار کی۔" خان نے کہا۔

"خان صاحب، صاف بات کرو، میں سمجھا نہیں۔" نہال نے پوچھا۔

"پنجاب کی ساری فیکٹریاں مال نہ بنائیں، تم یہی چاہتے ہو۔" خان نے پوچھا۔

"ارے بھائی وہاں پر صرف دو ہی فیکٹریاں ہیں۔" نہال نے کہا۔

"دونوں بند کروا دی جائیں تو ٹھیک رہے گا۔" خان نے پوچھا۔

"ٹھیک کیا بہت ٹھیک ہو گا۔" نہال نے جواب دیا۔

"تم جتنا مال فروخت کرو گے اس کے منافع میں چونی میرا حصہ ہو گا۔" خان نے کہا۔

"کیا کہا؟ چونی بہت زیادہ ہے۔" نہال نے کہا۔

"تو پھر گھاٹا اٹھاتے رہو یا فیکٹری بند کر دو۔ دونوں طرح تمہارا ہی نقصان ہے۔" خان نے کہا۔

"کچھ کم کر لو، پھر بات کرتے ہیں۔" نہال نے

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

جواب دیا۔

"جب صرف تمہارا مال ہی مارکیٹ میں ہوگا تو تم کچھ دام بڑھا کر بھی نقصان پورا کر سکتے ہو۔" خان نے کہا۔

"ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔" نہال نے کہا۔

"تو پھر کل کاغذات تیار کروالو۔ منافع میں چوتی کا میں حصہ دار ہوا۔" خان نے کہا۔

"تم پھر کیا کرو گے۔" نہال سیٹھ نے پوچھا۔

"میں نے کہا نا کہ یہ میرا کام ہے۔ پنجاب سے مال نہیں آئے گا اور تمہاری طرف کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکے گا۔" خان نے بات ختم کی۔

تین دن کے بعد پنجاب کی سائیکلیں بنانے والی فیکٹری میں ایک زوردار دھماکہ ہوا اور پوری فیکٹری میں آگ لگ گئی۔ اس کے ایک دن بعد دوسری فیکٹری بھی تباہ ہوگئی۔ خان صاحب دلی سے باہر نہیں گئے۔ یہ سب کس نے کیا، کچھ پتہ نہ چلا اور مارکیٹ میں نہال سیٹھ ہی رہ گئے۔

نہال سیٹھ کو اندازہ تو ہوگیا کہ یہ کالیا جو بڑا سیدھا سادھا نظر آتا ہے۔ ایسا ہے نہیں۔ اس نے ڈر کے مارے بڑی ایمانداری سے خان کا حصہ ادا کرنا شروع کر دیا۔ خان پردے میں رہ کر وہ کام کر رہا تھا جو کوئی نہیں کر سکتا۔ بڑے لوگوں میں اس کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ وہ کس سے کام کروانا ہے، یہ بات وہ کسی کو نہیں بتاتا تھا۔ اس کے کارندے بھی سب کی نظروں میں نہیں آتے تھے۔ وہ بھرپور معاوضہ ادا کرتا تھا۔ ہر کارندے پر کارندہ رکھتا تھا۔ صرف چند ہی اس کو جانتے تھے۔ وہ لوگ جو اس کے کام کرتے تھے۔ نہیں جانتے تھے کہ وہ کس کے لئے کام کر رہے ہیں۔ جو کام سے انکار کرتا تھا۔ اس کا بہت برا حشر ہوتا تھا۔ پولیس تھانہ سب کچھ اس کے لئے تیار ہوتا تھا اور جو اس کے کام کرتے ان کو پولیس والے چائے پلاتے اور عزت سے پیش آتے تھے۔ جو کارندہ ایک بار اس کے کام کرتا وہ پھر اسی کا ہو جاتا تھا۔ اس سے بھاگنے کا مطلب موت یا جیل تھا۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ہر کارندے کی ضروریات کا پورا پورا خیال رکھتا تھا۔ ان کو اکیلا نہیں چھوڑتا تھا۔ مگر وہ خود پردے میں رہتا تھا۔ دلی کا ہر بڑا آدمی اور بڑا سرکاری آفیسر اس کو جانتا تھا۔ مگر اس کی اصلیت سے کوئی واقف نہ تھا۔ سب ہی اس کی عزت کرتے تھے کیونکہ وہ ایک خدا ترس اور نیک نام آدمی مشہور تھا۔

میں نے بھی منے خان کا نام سنا تھا۔ مگر میرا واسطہ اس سے کبھی نہیں پڑا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں تو زیادہ تر دلی سے باہر ہی رہا کرتا تھا۔ دوسرے منے خان بڑے اونچے درجے کا آدمی تھا۔ بڑے لوگوں میں ہی اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ لوگ اس کا نام عزت سے لیتے تھے۔ کیونکہ وہ کام آتا تھا۔ لوگوں کی مدد کرتا تھا۔ غریب لڑکیوں کی شادیاں کروا یا کرتا تھا۔ غریب محلوں میں جس چیز کی ضرورت ہو، پہنچا دیا کرتا تھا۔ میرے خیال میں وہ ایک مخیر آدمی تھا۔

رولو کا بھی دلی میں کم ہی رہتا تھا۔ ہم دونوں ہی ساتھ پھرا کرتے تھے۔ ہم اکثر ساتھ ہی ہوتے تھے۔ کوئی دعوت ہو، شادی ہو یا کوئی اور تقریب۔ کھاری باولی ایک بڑا بازار تھا۔ وہ ہر سال ایک دعوت کیا کرتے تھے۔ یہ دعوت کسی ایک دوکاندار کی طرف سے نہیں ہوتی تھی۔ سارا بازار اس میں حصہ لیتا تھا اور شہر کے بڑے لوگوں کو بلایا جاتا تھا۔ کھانے کے بعد محفل میوزک ہوا کرتی تھی اور دور دور سے گانے والے بلائے جاتے تھے۔ بڑا اچھا پروگرام ہوتا تھا مگر میں نے کسی پروگرام میں شرکت نہیں کی تھی۔ وجہ وہی تھی کہ میں دلی سے باہر ہوا کرتا تھا مگر اس دفعہ ہم دونوں ہی موجود تھے۔ دعوت نامہ آیا تھا۔ میں نے رولو کا سے اس کا ذکر کیا تو وہ بولا۔

"آپ جائیں گے تو ساتھ چلوں گا۔ آپ جانتے ہیں، میں گانے بجانے والوں سے دور ہی رہتا ہوں۔"

"ارے تو گانا کون سنے گا۔ ہم کھانا کھائیں گے۔ شہر کے لوگوں سے مل لیں گے اور آجائیں گے۔" میں نے کہا۔

یہ پروگرام ہفتہ کی رات کو تھا۔ ہفتہ کی رات کا پروگرام اس لئے رکھا گیا تھا کہ انگریزی افسران بھی آنے والے تھے۔ تو صاحب ہم دونوں بھی رات ٹھیک نو بجے اسٹیشن کے قریب میدان میں پہنچ گئے۔ سارا میدان

روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ پورا میدان سجا ہوا تھا۔ زمین پر ہرے رنگ کی دریاں پڑی تھیں۔ بڑا سا خوب صورت گیٹ بنا ہوا تھا۔ درمیان میں ایک اونچا پنڈال بنایا گیا تھا۔ اس کے چاروں طرف آرام دہ کرسیاں پڑی تھیں۔ ان کرسیوں پر دلی شہر کے معززین بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ قنات کی دوسری طرف کھانے کا بندوبست تھا۔ کھانے کی خوشبو پورے میدان میں گردش کر رہی تھی۔ سفید اور سرخ وردیوں میں بیرے ہاتھوں میں ٹرے پکڑے آجا رہے تھے۔ ہر قسم کی شراب ان کے پاس تھی جو جس کی خواہش کرتا، وہ دوڑ کر لے آتے تھے۔ انگریز عورتیں کھلے گلے کی نمائش کر رہی تھیں اور انگریز مرد سگار منہ میں لگائے آقا بننے کی کوشش کر رہے تھے۔

رنگ برنگی ساڑیاں اور ماتھے پر سرخ بندیائیں بھی جلوہ افروز تھیں۔ ان کے مرد گوری چمڑی اور کھلے گلے کے پھیر میں تھے۔ خوب نظارہ تھا۔ ہر کوئی اپنا الو سیدھا کرنے میں لگا ہوا تھا کہ اچانک ہمارے درمیان کے منے خان آگئے۔ ان کا قد چھ فٹ سے زیادہ تھا اور رنگ چمکدار کالا سیاہ تھا۔ چہرے کے مقابلے میں آنکھیں سرخی مائل سفید تھیں۔ پہلی نظر میں وہ باکسر یا پہلوان معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے آتے ہی کہا۔

"اخاہ حکیم صاحب۔ بڑی خواہش تھی، آپ سے ملنے کی۔ آپ کا نام سنا تھا۔ مگر ملاقات نہ ہو سکی۔"

"آپ نے درست فرمایا۔ دراصل میں دلی سے باہر زیادہ رہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"کیوں اس کی کیا وجہ ہے؟" وہ بولے۔

"ایک تو دوا دارو کی تلاش اور دوسرے یہ میرے دوست حکیم کامل سیر سپاٹے کے زیادہ شوقین ہیں۔ اس لئے مختلف شہروں میں کام کرتے ہیں۔ دلی بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔"

خان صاحب نے آگے بڑھ کر رولو کا سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ "کبھی غریب خانے پر بھی تشریف لائیں۔"

رولو کا نے جواب دیا۔ "آپ بلائیں گے تو ضرور آئیں گے مگر ہم بلاوجہ نہیں آتے۔ کام ہوگا تو ضرور آئیں گے۔"

"تو پھر آپ کو بلانے کے لئے بیمار ہونا پڑے گا۔" خان صاحب ہنس کر بولے۔

رولو کا نے آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ چہرے کو دیکھا۔ آنکھوں میں دیکھا اور پھر کہا۔ "آپ کا مرض بہت پرانا ہے۔ اس کا علاج چالیس سال کی عمر سے پہلے کرنا ضروری ہے۔ وقت کا خیال رہے۔ اگر آپ چالیس سے اوپر کے ہو گئے تو پھر زیادہ فائدہ علاج سے نہیں ہوگا۔"

خان نے حیرت سے رولو کا کی بات سنی اور بولا۔ "مجھے کوئی مرض نہیں ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔"

"یہ مرض اسی قسم کا ہے کہ مریض خود کو مریض نہیں سمجھتا۔" رولو کا نے کہا۔

"اس کی علامات کیا ہیں۔ مجھ میں تو بیماری کی کوئی علامت ہی نہیں۔" خان نے جواب دیا۔

"ایک علامت تو یہی ہے کہ آپ خود کو تندرست سمجھتے ہیں۔" رولو کا نے جواب دیا۔

"آپ مجھے چکرائے دے رہے ہیں۔ مجھے آخر کیا مرض ہے، کچھ بتائیں تو....." وہ بولا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ آپ کا علاج بھی ہے اور مرض بھی بتاؤں گا مگر یہ مقام مناسب نہیں ہے۔ ویسے فکر کی بات نہیں ہے۔ آپ کبھی ہمارے مطب میں تشریف لائیں گے تو پھر ملاقات ہوگی۔" رولو کا نے بات ختم کرنا چاہی۔

مگر خان کے اندر تو کھل بھلی مچی ہوئی تھی۔ وہ بولا۔ "حکیم صاحب آپ نے میرے دل میں وسوسے ڈال دیئے ہیں، کچھ تو بتائیں۔"

"آپ اپنے دل سے وسوسوں کو نکال دیں اور کسی قسم کی فکر نہ کریں۔" رولو کا نے کہا۔

"آپ نے ہی وسوسہ ڈالا ہے اور آپ ہی کہتے ہیں کہ اس کو میں نکال دوں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ دوا کھاتے وقت بندر کا خیال دل میں نہیں آنا چاہئے۔ اگر دوا کے ساتھ بندر کا ذکر نہ ہوتا تو ہرگز خیال نہ آتا۔ مگر چونکہ اس کے خیال

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

پر پابندی لگادی ہے تو دوا کھاتے وقت اس کا خیال ضرور آئے گا۔ آپ کو بتانا ہوگا کہ مجھے کیا مرض ہے۔'' منے خان بولے۔

''مجھے آپ مجبور نہیں کر سکتے۔ میں نے ایک چیز دیکھی اور از راہ اخلاق بیان کر دی ہیں۔ یہاں پر میں کسی کے علاج کے لئے نہیں آیا ہوں۔ آپ کو میری ضرورت ہو تو مطب میں آجائیں۔'' رولوکا نے اپنی بات ختم کی اور آگے بڑھ گیا۔

منے خان کو ذرا اپنی سبکی کا احساس ہوا۔ چہرے کے تاثرات میں تناؤ پیدا ہوا مگر یہ صرف چند لمحوں کی بات تھی۔ اس نے خود پر قابو کیا۔ چہرے پر مسکراہٹ کی چادر چڑھا کر مجھ سے بولا۔

''خوب آدمی ہیں آپ کے دوست بھی۔ مجھے مل کر بڑی خوشی ہوئی ہے۔''

''بات یہ ہے خان صاحب کہ ان کا طریقہ علاج اور مرض کی تشخیص کرنے کا انداز ان کا اپنا ہے۔ میں بھی کبھی کبھی چکرا جاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''وہ شاید مجھے جانتے نہیں ہیں۔ اگر از راہ مذاق انہوں نے کہا ہے تو یہ بہت خطرناک مذاق ہے اور اگر واقعی میں بیمار ہوں تو وہ بتاتے کیوں نہیں؟'' خان نے پوچھا۔

''آپ کے سوال کا جواب میں کیا دوں۔ آپ خود ہی پوچھ لیں۔'' میں نے جواب دیا۔

کھانے کے بعد ہمارا رکنے کا پروگرام نہیں تھا۔ جبکہ ابھی محفل جوان تھی۔ خان صاحب اور دوسرے شوقین گانے کے پروگرام کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم نے میزبانوں سے اجازت لی اور خاموشی سے واپس آگئے۔ واپس آکر میں نے رولوکا سے پوچھا۔ ''یہ تم کیا شوشہ چھوڑ آئے؟ خان تو پریشان ہو گیا ہے۔''

''اس کو پریشان کرنے کو ہی میں نے شوشہ چھوڑا ہے۔'' رولوکا نے جواب دیا۔

''مگر تم نے ایسا کیوں کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ جو نظر آتا ہے وہ اس کا اصل چہرہ نہیں ہے۔ میں نے میرٹھ میں اس کو دیکھا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ اور زبان ایک سفاک اور ظالم آدمی کی تھی اور اس کے کام سارے ہی غیر قانونی اور انسانیت سوز تھے۔ مجھے اس کی کھوج کرنا پڑی اور پھر میں مراد آباد پہنچ گیا۔ کلومیاں سے منے خان تک کی کہانی مجھے پتہ چل گئی۔ مجھے پتہ تھا کہ یہ دلی میں ہے مگر ملاقات نہیں ہو رہی تھی۔ دعوت میں ملاقات ہو گئی تو میں نے اس کی بیماری کا شوشہ چھوڑ دیا تاکہ یہ خود میرے پاس چل کر آئے۔ اگر وہ کسی اور ڈاکٹر کے پاس جائے گا تو اسے کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ وہ لازمی طور پر ایک نہ ایک دن میرے پاس آئے گا۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ یہ آدمی کتنا ظالم اور خود غرض ہے۔'' رولوکا نے جواب دیا۔

''اس کی تو کھاری باولی میں بہت بڑی دوکان ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ دوکان ایک پردہ ہے۔ اس کا اصل کاروبار تو دلی کے بڑے لوگوں کو بلیک میل کرنا، ان کی کمزوریوں کی قیمت وصول کرنا ہے اور جو اس کے مطالبات پورے نہ کرے، ان کو قتل کرنا ہے۔ یہ خود قتل نہیں کرتا، نہ کسی پارٹی کے سامنے آتا ہے۔ اس کا طریقہ کار ایسا ہے کہ یہ سب کچھ کرتا ہے مگر اس کا نام درمیان میں نہیں آتا۔ اس کے چہرے پر شرافت کا بھاری نقاب پڑا ہوا ہے۔ اس کی پوزیشن دلی شہر میں یہ ہے کہ اگر کوئی رنگے ہاتھوں بھی اس کو پکڑ لے تو کوئی اس کو مجرم نہیں سمجھے گا۔'' رولوکا نے جواب دیا۔

''تو پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اس کے ساتھ ایک نفسیاتی کھیل کھیلنا چاہتا ہوں۔'' رولوکا نے جواب دیا۔

''ذرا وضاحت تو کرو اس کی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ واقعی بیمار نہیں ہے۔ مگر میں اس کو بیمار کروں گا۔ وہ خود محسوس کرے گا اور پھر علاج کرائے گا۔'' رولوکا نے جواب دیا۔

''تو کھیل کب شروع ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

رولوکا زور سے ہنس پڑا اور بولا۔ ''کھیل تو شروع ہو چکا۔''

میری سمجھ میں آگیا۔ ''ہاں کھیل تو شروع ہو چکا۔'' میں نے کہا۔

دو ہی روز گزرے تھے کہ منے خان مطب آگئے۔ رولوکا موجود تھا۔ آپ کی فرمائش پر میں مطب آگیا ہوں۔'' وہ بولے۔

''آپ اپنی ضرورت سے آئے ہیں۔ میری فرمائش پر نہیں آئے۔'' رولوکا نے جواب دیا۔

''چلو ایسا ہی سہی.....'' خان نے جواب دیا۔

''دیکھئے خان صاحب! انسانی زندگی پانی کا بلبلہ ہے۔ ابھی بنا اور غائب ہو گیا۔ اتنی سی زندگی کے لئے انسان کیا کچھ کرتا ہے۔ انسان ایک بے بس وجود ہے۔ وہ آنے والے حوادثات کا تدارک نہیں کرتا۔ اس لئے کہ اس کو پتہ ہی نہیں ہوتا۔ انسان یہ سوچتا ہے کہ اس کی جدوجہد اس کو کامیابیاں دلا رہی ہے۔ مگر وہ یہ نہیں سوچتا کہ یہی کامیابیاں اس کا امتحان بھی ہو سکتی ہیں۔ انسان جو راستہ اپنے چلنے کو بناتا ہے وہ ہی اس کے خیال میں اچھا ہوتا ہے۔ مگر ایک راستہ وقت بھی اس کے لئے بناتا ہے۔ وہ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ جس قدر پاتا جاتا ہے، اسی قدر اس کی خواہش بڑھتی جاتی ہے اور پھر فاصلے کم ہوتے ہیں اور اصلی چہرے نظر آتے ہیں اور کردار ننگے ہو جاتے ہیں۔ میری باتیں آپ کی سمجھ میں آجائیں تو آپ کا مرض آسانی سے ٹھیک ہو جائے گا۔ نہ سمجھ آئیں گی تو یہ مرض بڑھتا جائے گا اور ایک دن ایسا آئے گا کہ آپ خود اپنے چہرے سے نقاب الٹ کر دنیا کو بتائیں گے کہ میں مراد آباد کا کلومیاں ہوں، جس کا باپ پیدائش سے پہلے مر گیا تھا اور ماں پیدائش کے وقت مر گئی تھی اور میری پرورش ایک دایا نے کی تھی۔ لاری اڈے پر پڑا رہتا تھا اور کچھ بتاؤں؟'' رولوکا نے پوچھا۔

خان صاحب منے خان کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ ایک رنگ آرہا تھا، ایک جا رہا تھا۔ کبھی غصہ نظر آتا تھا، کبھی بے بسی کے تاثرات آجاتے تھے۔ ہونٹ ہل رہے تھے۔ ہزاروں سوالات منہ تک آرہے تھے مگر آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ سات پردوں میں پوشیدہ رہنے والا اب برہنہ کھڑا تھا۔ اس کے پاس اپنی برہنگی دور کرنے کو کوئی کپڑا نہیں تھا۔ وہ خود کو چھپانے کو کون سے الفاظ کا پیرہن لائے کہ اس کی پوزیشن برقرار رہ جائے۔ آخر اس کا اصلی روپ سامنے آگیا۔ منے خان پیچھے رہ گیا اور کلومیاں نے آگے آکر کہا۔

''تو یہ بتا یہ ساری کھوج تو نے کیوں کی ہے؟''

رولوکا مسکرا کر بولا۔ ''آخر اتر گیا نقلی چہرہ۔ تیری اصلی حقیقت سامنے آگئی۔''

''ہاں آگئی اور تو بھی یہ سمجھ لے کہ تیری زندگی کے دن گنے گئے۔ میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ اب تو یہ دواخانہ نہیں چلا سکے گا۔ تو نے مجھے نہیں پہچانا۔'' اور کلو اٹھ کھڑا ہوا۔

''جانے سے پہلے اپنی بیماری کے بارے میں تو سن لے۔'' رولوکا نے کہا۔

''تو مجھے بے وقوف بنا رہا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات آگئی ہے۔ میں اپنی انگلیوں پر بڑے بڑے طرم خانوں کو نچاتا ہوں اور جو نہیں ناچتے ان کی کتی کر دیتا ہوں۔ تو دو کوڑی کا حکیم مجھے چکمہ دے رہا ہے۔''

''دیکھو کلو! میری بات غور سے سن لو۔ کیونکہ تم کو پھر اس کا موقعہ نہیں ملے گا۔ انسان کو عقل اس لئے دی گئی ہے کہ وہ انسانیت کے ضابطہ اخلاق کی حفاظت کرے۔ انسانی برائی اور بھلائی میں تمیز کر سکے۔ جو اپنی عقل کو دوسری طرف استعمال کرتا ہے، انسانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے استعمال کرتا ہے، وہ جانوروں سے بدتر ہو جاتا ہے۔ تم خود کو بہت طاقت ور سمجھتے مگر تم ایک بیمار آدمی ہو۔ میں تم کو اب بھی مریض سمجھتا ہوں۔ تم منے خان سے کلومیاں کے روپ میں میرے سامنے ہو۔ یہی تمہارا اصل ہے۔ تم پھر سے منے خان نہیں بن سکو گے۔ اگر بنو گے تو تمہاری بیماری تم کو آدبوچے گی۔ اس سے تم کو کیا تکلیف ہوگی، یہ وقت بتائے گا۔''

کلومیاں نے غصے سے رولوکا کو دیکھا اور تیزی سے واپس چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی رولوکا نے کہا۔ ''یہ اپنی کمینگی سے

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

باز نہیں آئے گا۔ اس کے اندر طوفان سما گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آج رات ہی یہ کچھ کرے مگر آپ فکر نہ کریں۔ یہ لاتوں کے بھوت ہیں، اپنی لائی مصیبت میں خود گرفتار ہوگا۔"

کلومیاں بہت بڑے بدمعاش تھے۔ ان کو آدمیوں کی کیا کمی، ایک سے ایک بڑا غنڈہ ان کے زیر اثر تھا۔ مراد آباد اور میرٹھ سے بھی آدمی بلائے تھے۔ ایک پوری فوج تیار کرلی گئی۔ کس کو آگے جانا ہے، کس کو کیا کیا کام کرنا ہے، تیل کون چھڑکے گا، آگ کون لگائے گا اور پھر بجھانے آنے والوں کو کون روکے گا۔ پورا دواخانہ اور مکان جب تک نہ جل جائے، بھاگتے ہوئے لوگوں کو پھر آگ میں ڈالنا، پوری تنظیم بندی کی گئی تھی۔ کسی کے بچنے کی کوئی راہ نہ چھوڑی گئی تھی۔ ہر گلی کے موڑ پر پہرے موجود تھے۔

یہ تیاریاں معمولی نہیں تھیں۔ آٹھ روز اس تیاری میں صرف ہوئے اور آٹھ روز کے بعد جب پوری طرح ٹھوک بجالیا کہ سب لوگ گھر میں ہیں تو رات بارہ بجے کلومیاں کے پچاس جوان آگئے۔ ساری گلی اور مکان کی دیواروں، دروازوں پر اچھی طرح مٹی کا تیل ڈالا گیا۔ یہ کام کرنے والے اپنا کام کرکے گلیوں میں چلے گئے۔ ہر طرف رات کا اندھیرا تھا۔ سب سو رہے تھے مگر رولوکا اپنا کام کر رہا تھا۔ آگ لگانے والا آدمی آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک چیل اس پر جھپٹ پڑی اور اس کے ہاتھ سے ماچس لے گئی۔ وہ پھر دوسری ماچس لینے کو واپس آہی رہا تھا کہ چیل اندھیرے کی چادر سے نکل کر اس پر حملہ آور ہوئی اور ٹھیک اس کی آنکھوں پر آگئی اور پھر اس شخص نے ایک زوردار چیخ ماری۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ وہ ایک طرف کو اندھیرے میں دوڑتا چلا گیا۔ کسی نے پوچھا کیا ہوا۔ مگر وہ کیا جواب دیتا۔ اس کی جگہ دوسرا آگیا۔ اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ آسمان پر اب بہت چیلیں نظر آرہی تھیں اور وہ پچاس جوان اندھیرے میں گرتے پڑتے بھاگے چلے جارہے تھے۔ ہر طرف مٹی کے تیل کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ کھیل صرف دس منٹ میں ختم ہوگیا۔ کلومیاں کے نامی گرامی بدمعاش سب اندھے ہوگئے۔ یہ کھیل ختم کرکے رولوکا کلو کی رہائش گاہ پر چلا گیا۔ کلو اپنے کمرے میں کسی اچھی خبر کا منتظر تھا۔ مگر اس کے سامنے خبر لانے والا رولوکا تھا۔ کلو نے حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کے اس کو دیکھا اور بولا۔ "تو کیوں آیا ہے۔ بھاگ کے کہاں جائے گا بچے گا یہاں پر بھی نہیں۔"

رولوکا نے اس کو رحم کی نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔ "تو بڑا بدبخت ہے۔ تو نے اپنی انا کی خاطر پچاس آدمیوں کو اندھا کروادیا۔"

کلو نے غصے سے جواب دیا۔ "کیا بکواس کرتا ہے۔ ارے تیرا گھر اور مطب سب راکھ ہوچکا ہوگا۔"

"یہ تیری بھول ہے۔ تیرے سب آدمی اندھے ہوچکے ہیں۔ تجھے پتہ نہیں ہے شاید۔ بچانے والا مارنے والے سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے تو دولت کے نشے میں یہ بات بھول گیا ہے۔ میں جارہا ہوں۔ تجھے بتانے ہی آیا تھا۔" اور رولوکا پلٹ گیا۔

خان نے حیرت سے رولوکا کو دیکھا ضرور..... مگر وہ اس کو روک نہ سکا۔ رات ختم نہیں ہوئی تھی کہ اس کو سب پتہ چل گیا۔ یہ کیا ہوا، یہ اتنی ساری چیلیں کہاں سے آگئیں اور وہ بھی رات میں۔ یہ ضرور کچھ اور ہی چکر ہے۔ یہ حکیم جو نظر آتا ہے وہ ہے نہیں۔ میرے متعلق سب کچھ جانتا ہے۔ یہ بھیدی تو میری پوری لنکا کو ڈھا دے گا۔ اس کو ڈھیل دینا تو بہت خطرناک ہوگا۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ مگر کیا کروں، اتنا بھاری پتھر اس نے کتنی آسانی سے جھیل لیا اور اٹھا کر میرے منہ پر ہی پلٹ دیا۔ شاید میرے طریقہ کار میں کچھ غلطی ہوگئی تھی۔ میرے اندازے درست نہ تھے۔ میں نے اس کی باتوں سے اس کا وزن کم لگایا تھا۔ مگر بیٹا حکیم اب کے غلطی نہیں کروں گا۔ تو نے میرے سارے ہتھیار تو کند نہیں کردیئے ہیں۔ ابھی اور بہت کچھ میرے پاس ہے۔ میں بھی مراد آبادی ہوں، بھاگوں گا نہیں۔

اور منے خان نے نیا پینترا بدلہ۔

دو دن کے بعد وہ مطب آگیا اور بڑے ادب سے بولا۔ "حکیم کامل سے ملنا ضروری ہوگیا ہے، ملاقات ہوسکتی ہے؟"

"آج تو شاید نہ ہوسکے۔ کیونکہ وہ دلی میں نہیں ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"مگر میری معلومات کے مطابق صبح تک وہ دلی میں تھے۔" وہ بولا۔

"آپ اپنی معلومات پر بھروسہ کرتے ہیں تو پھر انتظار کریں۔ میری بات پر کرتے ہیں تو دو دن کے بعد تشریف لائیں۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے آپ کی بات پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ میں پرسوں اسی وقت آؤں گا۔" اور خان چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی رولوکا نمودار ہوگیا اور بولا۔ "یہ پرسوں تک آپ نے کیوں ٹال دیا۔"

"میرے خیال میں وہ کوئی دوسرا حربہ استعمال کرنا چاہ رہا ہے۔ دو دن ہم کو بھی مل جائیں گے اور ہم بھی کچھ غور و فکر کرلیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ نے ٹھیک سوچا۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ دو دن تک اس کی نگرانی کرتا ہوں۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"جو کچھ کرنا ہے تم نے ہی کرنا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

شام کو رولوکا نے بتایا کہ خان یہاں سے اٹھ کر سیدھا کالکا گیا تھا۔ یہاں پر ایک بہت قدیم مندر ہے۔ اس کے چاروں طرف آبادی نہیں ہے۔ یہ مندر پاربتی دیوی کا ہے۔ ہندی دیومالاؤں میں پاربتی کیلاش پربت کی بیٹی ہے۔ اس کا نام پاربتی یعنی پربت کی بیٹی اسی لئے رکھا گیا ہے اور یہ شیو بھگوان کی بیوی ہے۔ اس قدیم مندر میں پاربتی کی ایک بہت بڑی مورتی بنی ہوئی ہے۔ یہ مورتی سرخ پتھر کی ہے۔

مندر ویران ہے اور یہ جس مقام پر ہے وہاں پر دور دور آبادی بھی نہیں ہے۔ مگر ایک شخص اس مندر میں رہتا ہے، وہ بھی بہت قدیم معلوم ہوتا ہے۔ اس کا جھریوں سے بھرا چہرہ جس کا رنگ چھپکلی کے پیٹ جیسا ہے اور ہاتھ پیر لکڑی کے ڈنڈے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کو بہت کم لوگوں نے دیکھا ہے۔ وہ کیا کھاتا ہے اور کہاں سے کھاتا ہے، کچھ پتہ نہیں چلتا۔ یہ پجاری کب سے یہاں پر ہے۔ کسی کو پتہ نہیں ہے۔ اگر اتفاق سے کوئی ادھر آجائے تو وہ کسی سے بات نہیں کرتا۔ صرف اشارے سے واپس جانے کو کہتا ہے۔ اس کی شکل اور ماحول آنے والے کو خوف زدہ کردیتے ہیں اور دلیر سے دلیر بھی اس ویران مندر کے قریب رہنا پسند نہیں کرتا۔ اب آپ خود اندازہ کریں کہ خان کا اس مقام پر جانا کیا معنی رکھتا ہے۔"

"اس نے وہاں جاکر کیا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں کیا۔ وہ شاید پجاری کی تلاش میں ہی گیا تھا۔ کھنڈرات میں بھٹکتا رہا۔ مندر کے اندر جانے کی کوشش اس نے نہیں کی۔ ایک بات اور آپ کو بتادوں کہ ان کھنڈرات میں حشرات الارض بے شمار ہیں اور سانپ تو قدم قدم پر پائے جاتے ہیں۔ دلی سے گھوڑے پر سفر کریں تو دو ڈھائی گھنٹے کا سفر جنوب کی طرف ہے۔ دور دور تک کسی آبادی کا نشان نہیں۔ علاقہ پتھریلا ہے، کاشت کے لائق نہیں ہے۔ رات ہونے سے پہلے یہ واپس آگیا تھا۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہوا کہ گوہر مقصود نہیں ملا۔" میں نے کہا۔

"مگر اس سے یہ اندازہ تو ہوا کہ وہ کس لائن پر سوچ رہا ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"ہاں یہ بات تو ہے۔ دوسرے آدمی جاہل ہے مگر حالات کی نزاکت اور اندازے درست سمت میں لگاتا ہے۔ اس کے اتنے آدمی اندھے ہوگئے، ایک رات میں۔ یہ واقعہ ہوا اتنی ساری چیلیں رات کے وقت کہاں سے آگئیں۔ اس نے درست اندازے لگائے ہیں اور وہ اب ان اندازوں کی بنیاد پر توڑ کرنا چاہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"بالکل درست یہی بات ہے۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"تم نے اس پجاری کو دیکھا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں میں نے صرف ایک جھلک اس کی دیکھی تھی۔ میں خان کے ساتھ نہیں تھا۔ خان کھنڈرات میں پھر رہا تھا اور میں مندر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔"

READING CORNER
http://readingcornerblogspot.com/

پجاری مورتی کے پیروں میں بیٹھا تھا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ اس کی کھوپڑی پر کوئی بال نہیں تھا۔ چوٹی تک نہیں تھی۔ بدن پر صرف ایک لنگوٹی نما دھجی تھی۔ اس نے صرف ایک دفعہ دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کو پتہ چل گیا تھا کہ دروازے پر کوئی ہے۔ مگر وہ مجھے دیکھ نہیں سکا۔ میں نے ایک نظر خان کی طرف کھنڈرات میں کی تھی اور پھر پلٹ کر پجاری کی طرف دیکھا تھا مگر وہ اس مقام پر نہیں تھا۔ مورتی کے سامنے بہت بڑا ہال تھا جو کہ آدھا گر چکا تھا۔ دیواروں پر درخت اور گھاس اگی ہوئی تھی۔ سورج کی روشنی میں دور دور تک صاف نظر آ رہا تھا۔ مگر پجاری کا پتہ نہ تھا۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہاں پر ضرور کوئی تہہ خانہ بھی ہے یا پجاری اپنے کسی کرتب سے روپوش ہو گیا ہے۔ میں نے اس کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ میرا اس سے کوئی ٹکراؤ نہیں تھا۔"

"اب تم کیا کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

"خان پر کڑی نظر رکھنا ہے۔ اس کی سوچ اس کو کہاں لے جا رہی ہے، یہ اندازہ تو ہو ہی گیا ہے۔ آپ میرا انتظار نہ کرنا۔ کام ذرا ٹیڑھا ہے، غفلت نہیں کر سکتا۔" اور رولو کا چلا گیا۔

خان کی بے چینی کا اندازہ اس کی چلت پھرت سے ہوتا تھا۔ خان کے پاس ایک بہت بڑے مندر کا پجاری بیٹھا تھا اور وہ اس سے بات کر رہا تھا۔ "میں نے تو کوشش کر لی، وہ مندر تو بڑا بھیانک ہے اور وہاں پر کوئی نہیں ہے۔ تم کو کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے۔" خان نے کہا۔

"ارے مہاشے جی تم نے ایک دفعہ جا کر ہی اندازہ کر لیا۔ میں نے نہ جانے کتنے چکروں کے بعد اس مہان پرش کے درشن کئے تھے اور پھر دوبارہ نہ کر سکا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ اب نہ آنا، آئے گا تو نقصان اٹھائے گا۔ تم ایک پھیرے میں ہی ہار گئے۔ ارے اتنی آسانی سے کوئی کچھ پاتا ہے۔" پجاری نے کہا۔

"تو پھر تم ہی کچھ کرو۔ یہ تو تم کو پتہ ہے کہ میرے ساتھ ہوا کیا تھا۔ آخر وہ حکیم ہے کیا بلا۔" خان نے پوچھا۔

"لگتا ہے تم اس حکیم سے ڈرتے بہت ہو۔" پجاری نے کہا۔

"میں لڑائی بھڑائی سے نہیں ڈرتا۔ میں کسی اور لائن کا آدمی ہوں۔ سامنے بہادر سے بہادر آ جائے، میں بھڑ جاؤں گا مگر بتاؤ چیل کووں سے کون لڑے گا؟" خان نے کہا۔

"تیری دبدا اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ مگر بھیا بات یہ ہے کہ ہم تو صرف پنڈت پجاری ہیں۔ کسی کی جنم کنڈلی بنا دی۔ دان دکھشنا مل گئی۔ بھجن کرتن ہوا تو بلائے گئے۔ بڑی بڑی لیلاؤں میں تو مہان سادھوؤں کو ہی بلایا جاتا ہے۔ تم نے اپنی منو کامنا بتائی، ہم نے رستہ بتا دیا۔ اس سے زیادہ کی امید نہ کرنا۔" پجاری نے کہا۔

"تم سے بڑی امید تھی۔ اتنے بڑے مندر کے پجاری ہو کچھ تو کرو۔"

"تم کہو تو ست نارائن برت کتھا سنا دیں۔ مگر طاغوتی شکتی سے لڑنا ہمارا کام نہیں ہے۔ پرنتو ہم نے تجھے ایک منتش بتا تو دیا۔ کوشش کر اور اپنی گھٹنائی اس کو بتا۔ وہ راضی ہو گیا تو تیرا بیڑا پار ہو جائے گا اور جو نہ ہوا تو کوئی چیل آ کر تیرا بھی صفایا کر جائے گی۔"

خان پجاری کی باتیں سن کر بڑا پریشان ہوا۔ اب کیا کرے۔ وہ پھر دوڑا اکا لکا کی طرف۔ دن کا وقت تھا۔ وہ گھوڑا دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ مندر سے کچھ فاصلے پر اس نے گھوڑا روک لیا اور ایک کیکر کے درخت سے گھوڑے کی لگامیں باندھ دیں اور چلا مندر کی طرف۔ مندر پر آج بھی ویسی ہی وحشت برس رہی تھی۔ ٹوٹی دیواروں کے پتھر ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ زمین پر گھاس اور دوسرے پودے بکثرت تھے۔ وہ پتھروں پر پیر رکھتا، مندر کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ مندر کی عمارت بھی کوئی رنگ رکھتی ہوگی مگر اب تو کالی تھی۔ کائی جمی ہوئی دیواروں پر پودے اگے ہوئے۔ دروازہ بہت بڑا اور بہت اونچا تھا۔ شاید کبھی کواڑ بھی لگے ہوں گر اب تو ان کا نام و نشان تک بھی نہیں تھا۔ خان ایک نڈر آدمی تھا۔ اس لئے بڑھا چلا جا رہا تھا مگر خوف تو انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ کیسا ہی بہادر آدمی ہو، ان دیکھی راہوں پر اندر سے خوف زدہ تو ہوتا ہی ہے۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ وہ دروازے تک پہنچ گیا مگر اندر قدم نہ رکھ سکا۔ اس کے سامنے ایک ہڈیوں کا پنجر کھڑا تھا۔ ہڈیوں کا پنجر میں نے اس لئے کہا کہ اس کے بدن پر گوشت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ہڈیوں پر کھال چڑھی ہوئی تھی۔ آنکھوں کی جگہ دو گہرے گڑھے تھے اور آنکھیں نظر نہیں آتی تھیں۔ وہ تن کر کھڑا تھا۔

خان اس کو دیکھ کر ایک دم سہم گیا۔ اٹک اٹک کر بولا۔ "باباجی! ملاقات کرنے آیا ہوں، پریشان ہوں۔"

"مورکھ ہے تو۔ تیرا کیا تیرے سامنے آنے کو ہے۔ اب سب دوڑ بھاگ بیکار ہے۔ جا چلا جا واپس۔"

مگر خان ایک ڈھیٹ، دروازے پر ہی بیٹھ گیا اور گڑگڑا کر بولا۔ "اب تو تمہارے شرن میں آ گیا ہوں۔ اب کہاں جاؤں گا، یہیں مر جاؤں گا۔"

ڈھانچے میں تھرتھری سی ہوئی اور غصے سے کہا۔ "اب سر پر پڑی ہے تو شرن میں آ رہا ہے۔ اپنے کرتوت تو یاد کر، اب تک کیا کرتا رہا ہے؟"

خان گردن جھکائے اس کے قدموں میں بیٹھا رہا۔ ڈھانچے کی لکڑی نما ٹانگوں میں حرکت ہوئی اور اس نے ایک لات خان کی کمر پر لگا دی اور بولا۔ "تجھے سزا نہ ملی تو تیرے جیسے اور بن جائیں گے۔ اپنی مصیبت ساتھ لئے پھرتا ہے اور کہتا ہے شرن میں آ گیا ہوں۔ تیرے جیسے میری شرن میں آ گئے تو دیوی کو کیا جواب دوں گا۔ چل اٹھ، اپنی مصیبت کو بھی لے جا۔"

خان اس کی زبان کیا سمجھتا، میں پوری طرح سمجھ رہا تھا۔ اس کو میرے وہاں ہونے کا احساس تھا۔ وہ بلاوجہ کسی معاملے میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا تھا اور خان کے کردار کے بارے میں بھی اس کا قیاس درست تھا۔ خان کمزور قدموں سے اٹھ کر واپس چل دیا اور گھر آ گیا۔ وہ ہار ماننے والا آدمی نہ تھا مگر اس کو کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ ڈھانچہ کوئی بھی ہو، ماننا پڑتا ہے کہ اس کی نظریں بہت دور تک دیکھتی تھیں۔ خان کی اس نے پذیرائی نہیں کی اور دھتکار کر بھگا دیا۔ مجھ سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں اس کا اندازہ تو کر سکتا ہوں کہ وہ اگر دیکھ نہیں رہا تھا تو محسوس ضرور کر رہا تھا۔ اس نے اس پر بھی میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ نہ صرف خان کے بارے میں جانتا تھا بلکہ میرے بارے میں بھی اس کے سوچنے کی سمت درست تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ خان سے پہلے ہی میرا احوال ضرور پوچھتا۔

ایک دن کے بعد خان میرے پاس آ گیا اور بولا۔

"میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور کرو۔" میں نے جواب دیا۔

"حکیم صاحب میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دیں۔"

"شرمندہ! تم شرمندگی کے معنی بھی نہیں جانتے۔" میں نے کہا۔

"آپ جتنا چاہیں، مجھے ذلیل کر لیں۔" وہ بولا۔

"تم شرمندہ نہیں ہو۔ مجبور ہو اور دو چار سو بدمعاش پورے ہندوستان سے جمع کر لو اور کر دو حملہ۔ مگر یاد رکھو! آسمان پر ہزاروں پرندے موجود ہیں۔ کسی اور مہان پرش کے پاس جاؤ، اپنی دکھ بھری داستان سناؤ۔ اگر وہ تم جیسا ہی ہوا تو ضرور تمہاری مدد کرے گا۔ اگر آنکھ والا ہوا تو دھتکار کر بھگا دے گا۔ تم جس طاقت کے نشے میں بدمست ہو، وہ طاقت ہر جگہ اور ہر کسی کے ساتھ نہیں چلتی۔ تم بذات خود اتنی گہرائی میں گر چکے ہو کہ تم کو اٹھانا بھی آسان نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں میں بے شک گردن تک کیچڑ میں دھنسا ہوا ہوں۔ میری مدد کریں۔" خان نے جواب دیا۔

"ایک تم ہی نہیں بہت لوگوں کو بعض اوقات بڑے سخت مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اسی کا نام زندگی ہے۔ ذرا خود پر نظر ڈالو تم نے گناہ یوں کئے ہیں جیسے وہ گناہ نہ ہوں۔ تمہارا حق ہو۔ تم دوسروں کے مال پر اتراتے رہے۔ دوسروں کے حق مارتے رہے۔ تم پر کتنا قرض ہے، تم کتنوں کا کھائے بیٹھے ہو۔ پہلے اس کی ادائیگی تو کرو، یاد رکھو بغیر

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

ادائیگی کے معافی نہیں ملے گی۔ یہ ادائیگی تم کس طرح کرو گے۔ یہ سوال تم مجھ سے نہیں، اپنے اندر خود سے کرو۔ یقین رکھو کہ بتانے والا اندر ہے۔ پوچھو گے تو جواب ضرور ملے گا۔ مجھ سے یا کسی سے بھی معافی طلب نہ کرو۔ خود سے معافی طلب کرو، تمہارے ہر سوال کا جواب تمہارے اندر موجود ہے اور جب تم کو جواب مل جائے تو وہ کرو جو اندر سے حکم ملے۔ تم کو کسی حکیم کی ضرورت ہے نہ کسی مہمان پرش کی ضرورت ہے۔ اپنی خواہشوں کے جال کو اپنے اوپر سے اتار کر پھینک دو، بس اب جاؤ۔"

خان کے چہرے پر ندامت کے بادل چھارہے تھے اور آنکھوں سے جھڑی لگی ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک حسین اور دراز قد عورت تھی۔ اس کا سراپا بہت دلکش تھا۔ دور سے وہ بہت حسین لگتی تھی۔ اس کے حسین چہرے پر شگفتگی اور ملامت قریب آنے پر نظر نہیں آتی تھی۔ خشونت اور کرختگی محسوس ہوتی تھی۔ لوگ بتاتے تھے کہ اس کا چہرہ رات کے وقت انتہائی سفاک نظر آتا تھا۔ اس کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کسی پتھر کی مورتی کو دیکھ رہے ہیں۔ ہر قسم کے جذبات سے عاری..... اس کی آواز عجیب تاثر پیدا کرتی تھی اور سننے والے پر کپکپی طاری کر دیتی تھی۔ وہ کون تھی۔ کہاں سے آئی تھی۔ اس کا نام کیا تھا؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ جس مکان میں کرائے پر آئی تھی۔ اس کا مالک خورشید علی تھا۔ یہ مکان ایک عرصہ سے بند پڑا تھا۔ اس مکان کو کرائے پر کوئی نہیں لیتا تھا۔ خورشید نے کئی دفعہ اس کو فروخت کرنے کی کوشش کی مگر خریدار مکان دیکھنے کے بعد پلٹ کر نہ آیا اور یہ مکان خالی ہی رہا۔ خورشید کے پاس یہ مکان ورثے میں آیا تھا۔ اس کے باپ نے اس کو ایک قصائی سے خریدا تھا مگر سنا ہے وہ بھی اس میں رہا نہیں تھا۔ اس قصائی نے کسی نائی سے خریدا تھا، وہ نائی ہندو تھا۔ مگر اس مکان کی قسمت میں آباد ہونا لکھا ہی نہ تھا۔ سب لوگ جانتے تھے اور پھر اچانک کئی سال کے بعد یہ عورت خورشید سے ملی اور مکان کرائے پر لینے کی خواہش کا اظہار کیا تو ظاہر ہے وہ تو حیران ہوا، مگر چونکہ آدمی ایماندار تھا اور اس مکان کے بارے میں جانتا تھا تو اس نے کہا۔

"مکان تو خالی پڑا ہے اور ایک زمانے سے خالی ہے۔ خالی مکان میں تو آپ کو پتہ ہے کہ خود بخود گندگی کے ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اس مکان کی شہرت بھی اچھی نہیں ہے۔ اس مکان کو کوئی آباد نہیں کر سکا ہے۔ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ آپ کسی پریشانی میں مبتلا ہوں، اس لئے کوئی اور مکان تلاش کر لیں۔"

عورت نے یہ سن کر اپنی سرد آواز میں فیصلہ سنا دیا۔

"میں یہی مکان لوں گی..... تم منع کرو گے تو بھی۔"

"میں منع کب کر رہا ہوں۔ آپ کے علاوہ اور کتنے لوگ آپ کے خاندان میں ہیں۔" خورشید نے پوچھا۔

"میں اکیلی ہوں۔" وہ بولی۔

"پھر تو اور مشکل ہوگی۔ کیونکہ اس مکان کی صفائی کرانا ہوگی۔ سفیدی چونا بھی ضروری ہے۔ پانی کا کنواں تو ہے مگر ایک زمانے سے استعمال نہیں ہوا۔ اس کی بھی صفائی ضروری ہے۔ یہ سب آپ تو نہیں کر سکیں گی۔"

"یہ سب تمہاری دردسری نہیں ہے۔ میں مکان میں کس طرح رہوں گی۔ یہ میرا معاملہ ہے۔ تم چابی میرے حوالے کرو اور کرایہ بتاؤ۔"

خورشید نے حیرت سے کہا۔ "ضروریات زندگی بھی تو ضروری ہیں، آپ کس طرح رہیں گی؟"

"تم بار بار ایک بات کو مت دہراؤ، صاف بتاؤ، چابی دے رہے ہو کہ نہیں۔" اس کا چہرہ کسی بھی تاثر سے خالی تھا۔ خورشید پر تو کپکپی طاری ہو رہی تھی۔ وہ بولا۔ "ٹھیک ہے، لائے دیتا ہوں، آپ اپنی ذمہ داری پر اس مکان میں رہیں۔"

"اور کرایہ کیا لو گے؟" وہ بولی۔

"جو مناسب خیال کریں، ادا کر دیا کریں۔ میرا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔" خورشید نے جواب دیا۔

اور جو مکان آسیب زدہ مشہور تھا اور ایک زمانے سے بند پڑا تھا، اس کو ایک عورت نے آباد کر دیا۔ اس نے کس

طرح اس کی صفائی کی، کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ دراصل یہ مکان تھا بھی ایسی جگہ پر کہ لوگوں کی یہاں پر زیادہ آمد و رفت نہیں تھی۔ یہ مچھلی شہر کی آبادی تھی۔

مچھلی شہر ایک قصبہ ہے۔ اس کی آبادی ایک گھوڑے کے نال کی طرز پر ہے۔ ساری ہی آبادی مسلمانوں کی ہے۔ اس میں شیعہ اور سنی دونوں ہیں۔ آبادی کے بعد کھیت ہیں۔ یہ مکان آخری نکڑ پر تھا۔ کھیتوں میں جانے والے کسان ہی اس کے سامنے سے گزرتے تھے۔ اور وہ بھی ذرا فاصلہ رکھ کر گزرتے تھے۔ اس مکان کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور تھیں۔ مگر اس عورت نے اس مکان کو آباد کر کے ساری کہانیوں کا دم نکال دیا تھا۔

"بڑی دلیر عورت ہے بھئی، اکیلی رہتی ہے کوئی کہتا۔"

سب اس کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ "ہاں بھیا لاگت تو ایسی ہی ہے۔"

رات کے وقت مکان کے ایک کمرے میں روشنی نظر آتی تھی۔ باقی پورا مکان اندھیرے میں ڈوبا رہتا۔ وہ عورت کب اپنی ضرورت کی چیزیں خریدتی تھی، کہاں سے خریدتی تھی، کسی کو پتہ نہیں تھا۔ اس نے کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔ دن اور رات لوگوں نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی کہ اس کے پاس کون آتا ہے، کون جاتا ہے، مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ سب کو ہی حیرت تھی۔ ایک اکیلی عورت اس آسیب زدہ مکان میں رہتی ہے، کیا کھاتی ہے، پانی کہاں سے لاتی ہے۔ خوراک کیا کھاتی ہے نہ اس کا کسی سے واسطہ تھا نہ کسی سے لینا دینا تھا۔ آخر وہ کس طرح زندگی گزارتی ہے۔ کھوج سب کو تھی مگر پتہ کون کرے، ایک مہینہ گزر گیا، کسی کو کچھ پتہ نہ چلا۔ خورشید علی کہیں جانے کی تیاری میں تھے کہ دروازہ پر دستک ہوئی۔ خورشید نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ سامنے وہی عورت کھڑی تھی۔ وہ ایک طرف ہو گئے اور بولے۔ "آئیے اندر آجائیے۔"

مگر اس عورت نے اندر قدم نہ رکھا۔ اپنی سپاٹ آواز میں کہا۔ "میں کرایہ ادا کرنے آئی ہوں۔ بتاؤ کیا دوں؟"

اس کی آواز سن کر خورشید کو گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ جلدی سے بولے۔ "میں نے تو آپ کو کہہ دیا تھا کہ جو مناسب ہو، آپ دے دیں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اس مکان کو آباد کر لیا ہے۔"

"خوشی اور غم کی بات نہ کرو، کرایہ بتاؤ۔" وہ بے تاثر آواز میں بولی۔

"آپ اصرار کرتی ہیں تو پانچ روپے دے دیں۔" خورشید نے جواب دیا۔ عورت نے پانچ کا نوٹ خورشید کے ہاتھ پر رکھا اور چلی گئی۔

خورشید علی اس کو جاتا دیکھتے رہے۔ مگر حیرت سے ان کا چہرہ رنگ بدلنے لگا۔

وہ عورت جتنی جسامت کی نظر آتی تھی۔ اس حساب سے اس کے کولہے بھی ہونا چاہئیں تھے۔ مگر یہ کیا۔ وہ تصویر کی طرح تھی۔ پلٹ کر دیکھو تو سیدھی سپاٹ کوئی خم، کوئی دراڑ کچھ نہیں اور سامنے سے رنگین تصویر۔ "یہ کیسی عورت ہے؟" خورشید نے سوچا۔

"کون آیا تھا؟" خورشید کے کان میں اس کی بیوی کی آواز آئی۔

"وہ کرایہ ادا کرنے آئی تھی۔" خورشید نے جواب دیا۔

"یہ کون عورت ہے، سنا ہے اکیلی رہتی ہے۔ میں کہتی ہوں، تمہاری عقل پر کیا پتھر پڑ گئے ہیں کہ تم نے اکیلی عورت کو وہ آسیب زدہ مکان دے دیا۔ اگر کچھ اونچ نیچ ہو گئی تو بدنامی اس کے ساتھ ساتھ تمہاری بھی ہوگی۔ دنیا ہزاروں باتیں بنائے گی۔" بیگم خورشید نے کہا۔

"بات تمہاری اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ مگر اس نے زبردستی مجھ سے یہ مکان لیا ہے۔ میں نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ مگر اس کا اصرار تھا کہ وہ یہ مکان ضرور کرائے پر لے گی مگر اب مجھے اس پر شک ہونے لگا ہے۔" خورشید نے کہا۔

"کیسا شک، ذرا مجھے بھی تو بتاؤ۔" بیگم نے کہا۔

"سامنے سے وہ عام عورتوں جیسی ہی ہے۔ بس ذرا آواز عجیب سی ہے۔ مگر آج میں نے دیکھا کہ وہ پیچھے سے تو ایک تصویر ہی لگتی ہے۔" خورشید نے کہا۔

READING CORNER http://readingcornerpk.blogspot.com/

"ارے ذرا صاف صاف بتاؤ، میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔" بیگم نے الجھ کر کہا۔

"تم نے کوئی بڑی سی تصویر دیکھی ہے، جیسی کہ کینوس پر بنائی جاتی ہے۔ لال پیلی اور خوبصورت مگر اس کینوس کو پلٹ کر دیکھو تو کچھ نہیں ہوتا، نہ کوئی خم نظر آتا ہے، نہ رنگ وہ بالکل ایسی ہے۔ وہ جتنی جان دار عورت نظر آتی ہے۔ اسی حساب سے اس کے کولہے اور کاندھے ہونا چاہئیں۔ مگر پیچھے تو کچھ نہیں ہے۔ ایک دیوار سی لگتی ہے۔ یہ کیا بات ہے؟"

"یہ تو تم نے خوب کہی۔ تم عورتوں کو اتنی گہری نظروں سے دیکھتے ہو۔ اب پتہ چلا مجھے۔" بیگم بات کو کہیں اور لے گئیں۔

خورشید سٹ پٹا گئے اور بولے۔ "بتاؤ تو مصیبت، نہ بتاؤ تو پریشانی بیگم تم تو ہر بات کو گھما پھرا کر وہیں لے جاتی ہو۔ تم کو کچھ بتانا ہی مشکل ہے۔" خورشید نرمی سے بولے۔

"اچھا اب چڑی چڑی باتیں نہ کرو۔ میں سب جانتی ہوں، مردوں کے کرتوت اور سن لو اچھی طرح، اب اگر آئے تو میں کرایہ لوں گی۔ تم نہ دوڑ کے آجانا۔ میں بھی دیکھوں، ذرا تصویر کا دوسرا رخ۔"

تو جی خورشید صاحب بچارے بیگم کی نظر میں مشکوک ہو گئے۔ مگر ان کی بے چینی کم نہ ہوئی۔ ان کے ایک ہی دوست تھے۔ نبو میاں۔ نام تو ان کا نواب علی تھا مگر سب نبو میاں پکارتے تھے۔ خورشید دوڑے ان کے پاس، ڈیوڑھی میں وہ بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ بولے۔

"کہو میاں دو دن کے بعد شکل دکھا رہے ہو اور وہ بھی اتنی بری بنا کے ہوائیاں اڑ رہی ہیں ایمان سے۔"

"ہوائیاں تو اڑیں گی، بات ہی کچھ ایسی ہے۔" خورشید نے جواب دیا۔

"کیوں کیا آفت ٹوٹ پڑی؟" نبو بولے۔

اور خورشید نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ آخر میں بولے۔ "یار میں تو ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ شاید میں نے مکان کرائے پر دے کر کوئی مصیبت کھڑی کر لی ہے اور اب بیگم کی طرف سے یہ حکم ملا ہے کہ کرایہ وہ وصول کریں گی، اب بتاؤ میں کیا کروں؟"

"میاں بات یہ ہے کہ تم کون سے عورت شناس ہو۔ میاں ایک عورت قسمت سے تم کو مل گئی ہے۔ تم نے تو وہی دیکھی ہے۔ ارے دنیا میں ہزاروں قسم کی عورتیں بھری پڑی ہیں۔ امریکہ کی عورت الگ ہے تو چین، جاپان کی الگ ہے۔ ان سب کے بدن اور حسن کے پیمانے بھی الگ الگ ہیں۔ کیا پتہ وہ کہاں کی عورت ہے۔ تم کو چاہئے تھا کہ پہلے اس کے بارے میں معلومات کرتے اور ٹھوک بجا کر مکان دیتے۔ وہ تو تم نے کیا نہیں۔ اب ہوتے رہو پریشان۔" نبو میاں خاموش ہوئے تو خورشید نے کہا۔

"یار تم بھی بیگم کی طرح مجھے ہی مورد الزام ٹھہرا رہے ہو۔ میری جگہ تم ہوتے تو تم بھی وہی کرتے جو میں نے کیا ہے۔" خورشید نے بھنا کر کہا۔

"ہم کیوں کرتے ارے اللہ نے عقل دی ہے۔ اچھے برے کو پرکھ سکتے ہیں۔" نبو میاں بولے۔

"تم نے اس آفت کی پرکالہ کو دیکھا جو نہیں ہے۔" خورشید نے کہا۔

"اچھا تو کیا وہ بہت حسین ہے۔ اپنے حسن سے متاثر کرتی ہے یا اس کے ماتھے پر سینگ ہیں، عجیب اخلاقت ہے۔ کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو، میاں۔ ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے۔" نبو میاں نے جواب دیا۔

"یار میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ شکل سے تو وہ بہت اچھی لگتی ہے مگر پہلی نظر کے بعد دوسری نظر میں وہ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک بھی لگتی ہے اور جو کسر رہ جاتی ہے۔ وہ اس کی آواز پوری کر دیتی ہے۔ کیا بتاؤں اس کی آواز کے صوتی اثرات کیسے ہوتے ہیں۔ بس انہی کا کہا ہی کرنا پڑتا ہے۔" خورشید نے کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ تمہارا ہاضمہ کچھ گڑبڑ ہے۔ مجھے چورن لیتے جانا، خواب بھی ڈراؤنے آتے ہوں گے۔ میاں ذرا دیکھ بھال کے کھایا کرو۔ کھانے کے معاملے میں تم سدا کے ندیدے واقع ہوئے ہو۔" نبو میاں نے ہنس کر کہا۔

"اچھا بھئی نہ مانو میری بات میں نے جو کچھ کہا۔ وہ نری بکواس تھی۔" خورشید جھنجلا کر بولے۔

"ارے ارے تم تو بالکل ہی سنجیدہ ہو گئے۔" نبو میاں نے کہا۔

"ایک بات ہم بتائے دیتے ہیں۔ آگے کچھ بھی ہو، ہم تم سے آ کر نہیں کہوں گا بلکہ کسی سے نہیں کہوں گا۔ ارے جب تم دوست ہو کر مذاق اڑا رہے ہو تو دوسرے تو نہ جانے کیا کہیں اس لئے اب چلتے ہیں۔" نبو میاں آوازیں دیتے رہ گئے مگر خورشید غصے میں تھے رکے نہیں۔

پورے محلے کو تشویش تھی۔ آخر یہ عورت کیا کھاتی ہے۔ بازار میں کبھی نظر نہیں آتی۔ خرید و فروخت کرتی نہیں۔ کسی سے آج تک اس نے رابطہ نہیں کیا۔ صرف خورشید علی کے پاس کرایہ دینے ایک دفعہ آئی تھی۔ اب لوگوں کو لگ گئی دھن۔ ہر جگہ کچھ منچلے تو ہوتے ہیں۔ یہاں مچھلی شہر میں بھی ایک ٹولہ ایسا تھا۔ ہر کسی کے پھڈے میں ٹانگ اڑانا ان کا مشغلہ تھا۔ بات ان تک پہنچ گئی۔ باقر علی اس ٹولے کے سرغنہ تھے۔ چار چھ سر پھرے ان کے ارد گرد ہر وقت موجود رہتے تھے۔ مگر رات عشاء کے بعد تو باقاعدہ ان کا اجلاس ہوتا تھا۔ اس اجلاس میں دوسرے دن کے پروگرام بنائے جاتے۔ کس باغ کے آم تیار ہیں۔ کس طرح دھاوا مارنا ہے۔ کبڈی کے میچ کی تیاریوں پر بحث ہوتی۔ کھلاڑی تیار کئے جاتے اور ایک سے ایک بڑی شرارت کی پلاننگ کی جاتی۔ اس چھوٹے سے قصبے میں اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ بزرگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر یہ لوگ شرارت کرتے تھے۔ ان میں یہ خوبی ضرور تھی کہ حد ادب کو پار نہیں کرتے تھے۔ سب لڑکے نوجوان تھے۔ زیادہ تر تو مسلمان لڑکے تھے مگر چند ایک اس ٹولی میں ہندو بھی تھے۔ جن میں ماسٹر دھنی رام کا لڑکا منی چند بھی تھا۔ دھنی چند چونکہ اسکول میں ماسٹر تھے۔ اس لئے سب لڑکے ان سے ڈرتے تھے اور ادب بھی کرتے تھے۔

آج کے اجلاس میں ایجنڈہ وہ عورت تھی۔ باقر علی نے بات کا آغاز کیا بولے۔ "تو دیکھو ایک عورت وہ بھی اکیلی۔ خورشید ماموں کے آسیب زدہ مکان میں کرائے پر آ گئی اور ہم کو پتہ ہی نہ چلا۔"

سالار خان نے جواب دیا۔ "ارے اکیلی نہیں ہو گی کوئی تو ساتھ ضرور ہو گا....."

"میاں ہماری معلومات کے مطابق اب تک اکیلی ہی ہے۔" باقر علی نے جواب دیا۔

شوکت علی کہاں چپ رہنے والے تھے، بولے۔ "یہ بات سمجھ میں آنے والی ہرگز نہیں ہے۔ وہ مکان تو ایک زمانے سے بند پڑا ہے۔ دنیا جہان کا کوڑا کچرا بھرا ہو گا، رہتی کہاں ہو گی؟"

"تم کو پتہ نہیں ہے، رہتی ہے، ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا۔" باقر علی نے جواب دیا۔

"تم نے یا زار میں کبھی اس کو دیکھا ہے؟" شوکت علی نے سوال جڑ دیا۔

"میں نے کیا کسی نے نہیں دیکھا۔ صرف ماموں خورشید نے دیکھا ہے۔" باقر علی نے جواب دیا۔

"اچھا یہ تو بتاؤ کیسی ہے؟" اچھن میاں بھی بولے۔

"یار تم ہو ایک نمبر کے ندیدے۔ کیا بتاؤں، میں نے دیکھا تھوڑی ہے۔" باقر علی نے جھنجلا کر کہا۔

"تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ پہلے اس کو دیکھا جائے۔" آخر منی چند سے خاموش نہیں رہا گیا۔

"تو جاؤ، دروازہ پیٹ ڈالو، اکیلی ہی رہتی ہے۔ وہی دروازہ کھولے گی۔ دیکھ لینا اور اگر وہ پوچھے کہ کیوں آئے ہو تو کہہ دینا، دیکھنے آیا تھا۔ پھر وہ سویرے یہ خبر ماسٹر صاحب کو پہنچا دے گی اور پھر تیرے ساتھ ہم سب کی چندیا کے بال گنتی ہو جائیں گے۔ ابے جب کرے گا، گھامڑوں جیسی بات کرے گا، کوئی اور ترکیب نکالو۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلے اور ہم لوگ اس کو دیکھ بھی لیں۔" باقر علی نے منی چند کا مذاق اڑا دیا۔ وہ بچارہ دبک کر خاموش بیٹھ گیا۔

شوکت علی بولے۔ "ایسا نہ کریں کہ دن میں پانی پینے کے بہانے دروازہ کھٹکھٹا دیں۔ گھر میں اکیلی ہے تو ظاہر ہے، وہی دروازے پر آئے گی، چاچی، پھوپی کچھ بھی

READING CORNER
http://readingcornerblogspot.com/

کہہ دیں گے اور پانی مانگیں گے۔"

سالار خان نے گردن ہلا کر کہا۔ "یار تیری کھوپڑی خوب چلتی ہے۔ ترکیب تو قابل عمل ہے۔"

باقر علی نے بھی اس کو قابل عمل قرار دیا اور متفقہ طور پر یہ طے ہو گیا کہ باقر علی، سالار خان اور شوکت تینوں کل دوپہر کھانے کے بعد اس آسیب زدہ مکان کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے..... دوسرے دن بارہ بجے ہی تینوں دوست جمع ہو گئے۔ ابھی وقت تھا وہ مکان کے سامنے سے گزرتے آگے کھیتوں کی طرف چلے گئے۔ کچھ ہی دور آموں کا باغ تھا۔ وہ اس میں داخل ہو گئے۔ باغ کے رکھوالے رحیمو چچا کی نظر جوان پر پڑی تو وہ ان کے پاس آ گئے، بولے۔ "یہ آج چنڈال چوکڑی اس طرف کیسے آ گئی، ابھی تو بور بھی نہیں آیا۔"

باقر علی بولے۔ "ہم کو پتہ ہے چچا ہم تو ایسے ہی سیر کرنے آئے ہیں۔"

"یہ دوپہر میں سیر کرنے کی کیا سوجھی۔ اب سیدھے گھر چلے جاؤ۔ نہیں تو پھر میں شام کو خود ہی تمہارے گھر سیر کرنے آ جاؤں گا۔" رحیمو نے لتاڑا۔

"ٹھیک ہے چاچا۔ چلے جاتے ہیں۔ تم کہاں ہمارے گھر جانے کی تکلیف کرو گے۔" شوکت علی نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔" سالار خان بولے۔ "مگر چند منٹ تو ذرا پانی پتہ کر لیں، دھوپ سے آئے ہیں۔ پھر چلے جائیں گے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ پی لو پانی کوٹھریا کے اندر گھڑے میں بھرا ہے اور ہاں اب دوپہر میں تم کو اس طرف کبھی نہ دیکھوں۔" یہ کہہ کر رحیمو باغ میں چلے گئے تو باقر علی نے کہا۔

"یار یہ بہت برا ہوا۔ اگر چچا نے گھر بتا دیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ کیا جواب دیں گے آموں کا موسم ہوتا تو ایک بہانہ بھی تھا۔"

"شوکت نے ہمارے پلان میں رحیمو چچا کا کہیں ذکر ہی نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو ادھر آتے ہی نہیں جو ہوا سو ہوا۔ آگے کی سوچو۔" سالار خان بولے۔

"پروگرام تو وہی چلے گا۔" باقر علی نے کہا۔

"تو پھر آؤ اب چلتے ہیں کچھ پہلے پہنچ جائیں گے اور کیا ہو گا۔" شوکت نے جواب دیا۔ اور تینوں باغ سے نکل آئے۔ باغ کے ختم ہوتے ہی کھیت تھے اور ان کھیتوں کو پار کر و تو مکان سامنے تھا، وہ تینوں دروازے پر پہنچ گئے۔

دور دور کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ دروازے کے باہر بھی جھاڑ جھنکار اگا ہوا تھا۔ دروازہ بند تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے مدت سے بند پڑا ہے۔ تینوں دروازے کے عین سامنے کھڑے تھے۔ باقر نے اشارہ کیا اور سالار نے دروازے پر ہاتھ مارا پھر اور زور سے ہاتھ مارا مگر کچھ نہ ہوا۔ باقر نے بھی دروازہ بجانا شروع کر دیا۔ مگر کچھ نہ ہوا۔ بہت کوشش کر لی مگر جواب ندارد۔ باقر نے کہا۔ "یار لگتا ہے اس وقت گھر میں کوئی نہیں ہے۔"

"اگر کوئی نہیں تو تالہ وغیرہ تو لگا ہو، وہ بھی نہیں ہے۔" شوکت نے کہا۔

"ارے یار، ادھر کون آتا ہے۔ سوچا ہو گا کہ ضرورت کیا ہے تالے کی۔" سالار نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ واپس چلتے ہیں۔ خالی گھر میں جانا مناسب بات نہیں ہے۔" باقر نے کہا۔

"تو پھر آؤ۔" اور تینوں پلٹ پڑے۔ دو قدم ہی چلے تھے کہ دروازے کی چرچراہٹ کی آواز پر پلٹ کر دیکھنے لگے۔ دروازہ پورا کھلا ہوا تھا۔ مگر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ پلٹ کر پھر دروازے کے قریب آ گئے تو اندر سے آواز آئی۔ "اندر آ جاؤ، باہر کیوں کھڑے ہو۔"

تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سب سے پہلے باقر نے قدم دروازے کے اندر رکھ دیے۔ باہر سے یہ مکان جتنا گندا اور کوڑے کرکٹ سے بھرا نظر آتا تھا۔ کمرہ ایسا نہ تھا۔ یہ ایک بہت کشادہ کمرہ تھا۔ کمرے میں قالین پڑا تھا اور قدیم زمانے کے اسٹائل کا فرنیچر بڑے قرینے سے رکھا ہوا تھا۔ کھڑکیوں پر باریک جالی کے سفید پردے پڑے ہوئے تھے۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں سے ہوا اندر آ رہی تھی۔ دیواروں پر بڑی بڑی تصویریں

لگی ہوئی تھیں۔ یہ تصویریں کسی ماہر مصور کی بنائی ہوئی لگتی تھیں۔ نہایت صاف اور واضح نقوش بنائے گئے تھے۔ خاص طور سے ہر تصویر کی آنکھیں تو زندہ آنکھیں لگتی تھیں۔ تینوں حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ دروازہ خود بخود بند ہو گیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" ایک نسوانی آواز سب کے کانوں میں آئی۔ مگر وہ حیرت کی تصویر بنے کھڑے ہی رہے تو پھر حکم ہوا۔

"سنا نہیں بیٹھ جاؤ۔" تینوں نے جلدی سے اس حکم پر عمل کیا اور بیٹھ گئے۔ پھر نسوانی آواز نے کہا۔ "بہت عرصہ کے بعد اس گھر میں کوئی مہمان آیا ہے۔ بولو تمہاری کیا خاطر کی جائے۔" مگر ان کی زبان تو تالو سے چپک گئی تھی۔ کہتے کیا خاموش تھے۔ "ملاقات کرنے آئے تھے بولو۔" پھر آواز آئی۔

باقر علی ہکلا کر بولے۔ "جی جی جی ہاں۔"

"ملاقات کے بعد تم کیا کرو گے۔ سب کو جا کر بتاؤ گے اعلان کرو گے۔" آواز آئی۔

"نہیں آپ منع کریں گی تو نہیں بتائیں گے۔" سالار نے ہمت کر کے جواب دیا۔

"تم بتا کر بھی کچھ نہیں کر سکو گے۔ یہ بات سمجھ لو کہ مجھے تمہاری ضرورت تو تھی مگر تم خود آ جاؤ گے، اس کا پتہ نہیں تھا۔ میں کون ہوں، تم یہی کھوج کرنے آئے ہو۔ تم کو پتہ نہیں کہ اس گھر میں آنے کا تو راستہ ہے مگر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اب تم یہاں پر ہی رہو گے..... تمہاری بھی ایک تصویر لگ جائے گی۔ تم بھی سب کو دیکھ سکو گے مگر رہو گے فریم کے اندر ہی۔"

تینوں نے ڈرتے ڈرتے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہمت کر کے باقر نے کہا۔ "ہمیں معاف کر دو، غلطی ہو گئی۔ پھر کبھی ادھر نہیں آئیں گے۔ کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔"

"ایسا تو آج تک ہوا نہیں۔ کھڑے ہو جاؤ اور دوسرے کمرے میں چلو۔" یہ سنتے ہی وہ غنودگی کی سی حالت میں کھڑے ہو کر دوسرے کمرے کی طرف چلے۔ دروازہ خود بخود کھل گیا اور وہ اس میں داخل ہو گئے۔ ان کے اندر آتے ہی دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ یہ کمرہ بھی صاف ستھرا تھا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں اور ہوا آ رہی تھی۔ اس کمرے میں تین پلنگ اور ایک بڑی سی میز پڑی تھی۔ تینوں پلنگوں پر صاف بستر لگے تھے اور میز پر کھانا چنا ہوا تھا اور کھانے کی خوشبو کمرے میں پھیل رہی تھی۔ آواز کس طرف سے آئی، یہ پتہ نہیں چلتا تھا۔

"کھانا کھاؤ اور آرام کرو۔ اب تمہارا یہی کام ہے۔"

"ہمیں جانے دو۔ پھر نہیں آئیں گے۔" شوکت نے گڑگڑا کر کہا۔

"جانے والی بات بھول جاؤ۔ تم کو بتایا تھا کہ آنے کا راستہ ہے جانے کا نہیں ہے۔"

باقر نے ہمت کر کے کہا۔ "تم کہاں ہو، سامنے تو آؤ۔"

"یہ خواہش بھی پوری کر دوں گی۔ جلدی کیوں ہے۔ اب تو تم کو رہنا ہی یہاں پر ہے۔" آواز آئی۔

کوئی کچھ نہ بولا تو پھر آواز آئی۔ "کھانا اگر نہ کھایا تو پھر کبھی کھانا تمہارے سامنے نہیں آئے گا۔ میں تم کو بھوکا نہیں رکھنا چاہتی۔ اس لئے کھا لو۔"

تینوں یہ سن کر میز پر آ گئے اور کھانا کھانے لگے۔ کھانا تازہ تھا اور نہایت لذیذ تھا۔ خاص طور سے گوشت سے بنی ہر چیز بے حد لذیذ تھی۔ تینوں نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ کھانا ختم ہوتے ہی ایک مشروب سرخ رنگ کا جگ بھر کر میز پر آ گیا۔ پہلے تو وہ اس بات سے حیران تھے کہ مشروب میز پر کس طرح آیا۔ دوسرے مشروب بھی اتنا خوش ذائقہ تھا کہ تینوں نے خوب پیا۔ اس کے پیتے ہی ان پر غنودگی سی سوار ہو گئی اور وہ بستروں پر لیٹ گئے اور چند منٹوں میں ہی وہ بے خبر پڑے سو رہے تھے۔ کب رات ہوئی اور ختم ہو گئی۔ ان کو پتہ نہ چلا۔

صبح پھر ان کو بہترین کھانا کھلایا گیا۔ اتنا مرغن اور اچھا کھانا کھا کر بھی ان کی صحت اچھی نہ تھی۔ ان میں دن بدن تبدیلی ہو رہی تھی۔ ان کے قد کم ہو رہے اور جسم چپٹا ہوتا جا رہا تھا اور وہ گھٹتے گھٹتے اتنا ہو گیا کہ ایک فریم میں آ جائے۔ پھر ان کو ایک فریم میں دیوار پر آویزاں کر دیا گیا۔ اب ان کے جسم کی حرکت بند ہو گئی اور وہ ایک تصویر کی مانند دیوار پر لٹک گئے۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

صرف آنکھیں ہی تھیں جو صرف سامنے کے رخ پر دیکھ سکتی تھیں۔ ان کو بھی حرکت کرنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ سارا کام پورے ایک ماہ میں ہوا۔

ان تینوں کے غائب ہونے پر بڑا ہنگامہ مچا رہا۔ ان تینوں کو آخری دفعہ رحیمو نے دیکھا تھا اور اس نے جو دیکھا تھا سب کو بتا دیا۔ مگر فائدہ کچھ نہ ہوا۔ ہر ماہ وہ عورت خورشید علی کو کرایہ ادا کرنے آتی رہی مگر ہر دفعہ ایسا ہوا کہ اس کی بیوی گھر پر نہ ہوئی۔ اس عورت کو صرف خورشید نے دیکھا۔ نبو میاں بھی عورت کو دیکھنے کے مشتاق تھے مگر وہ جب بھی آئی، صرف خورشید ہی اکیلے ہوتے تھے۔ خورشید کی زبانی جو کچھ لوگوں کو پتہ چلا وہ وہی جانتے تھے۔ آخر پولیس کو تو پوری تحقیقات کرنا تھی۔ تین جوان لڑکے اچانک غائب ہوئے تھے۔ ہوتے ہوتے بات خورشید تک آ گئی اور اس نے کرائے پر مکان اٹھانے کے بارے میں جو حقائق تھے، پولیس کو بتا دیئے۔ الہ آباد کا SP انگریز تھا۔ وہ خود کیس کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے اس مکان پر چھاپہ مارنے کا پروگرام بنا لیا۔ اور ایک رات اچانک وہ پورے ساز و سامان کے ساتھ اس مکان کے سامنے کھڑا تھا۔ مکان کے چاروں طرف پولیس کے چوکس جوان بمعہ اپنے ہتھیاروں کے ہر صورت حال کا مقابلہ کرنے کو تیار کھڑے تھے۔ مکان کا دروازہ بند تھا۔ SP کے اشارے پر دروازے پر دستک دی گئی۔ مکان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر کوئی سانس روکے خاموش تھا۔ دروازہ بند تھا۔ پھر زور سے بجایا گیا۔ جواب نہ ملا اور پھر چار جوانوں نے زوردار دھکا دیا۔ دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ وہ ایک چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے مدت کے بعد اس کو کھولا گیا ہے۔ دروازہ کھلتے ہی ایک چمگادڑوں کا جتھا بھرا مار کر باہر نکلا اور باہر پرواز کر گیا۔ اندر روشنی ڈالی گئی۔ کمرے کے اندر کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا اور اس میں کیڑے مکوڑے مٹرگشت کر رہے تھے۔ اس مکان میں چار کمرے نیچے تھے اور چار اوپر ہر کمرے کی حالت خراب تھی۔ کوئی یہاں رہ سکتا ہے۔ ایسی کوئی علامت نہیں تھی۔ سارے کمروں کی اچھی طرح تلاشی لی گئی۔ مگر کچھ سراغ نہ ملا۔

پولیس واپس آ گئی۔ تینوں گمشدہ لڑکوں کا کوئی سراغ نہ ملا۔ بات خورشید کے اوپر آ گئی۔ اس عورت کا پورا حلیہ خورشید نے پولیس کو بتا دیا۔ SP نے خورشید کو پابند کر دیا گیا کہ وہ عورت اب آئے تو وہ اس کو روک لے مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ وہ حسب دستور آئی اور کرایہ ادا کر کے چلی گئی۔ خورشید نے یہ بھی پولیس کو بتا دیا۔ اب صرف ایک صورت رہ گئی تھی کہ اس کی آمد کے دنوں میں خورشید کے گھر خفیہ طور پر کچھ آدمی مقرر کر دیئے جائیں۔ وہ عورت آئے تو اس کو چھاپ لیں۔ مگر اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ وہ دن کے وقت آئی اور چلی گئی جو آدمی مقرر تھے وہ سوتے رہ گئے۔ اب ذرا SP پریشان ہوا۔ وہ آتی ہے کوئی نہیں دیکھتا اور چلی جاتی ہے، کوئی نہیں روکتا۔ SP کے سامنے ایسا عجیب و غریب کیس پہلی بار آیا تھا۔ وہ ان باتوں کو نہیں مانتا تھا مگر اب سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ واقعات جس غیر متوقع طریقہ پر پیش آ رہے تھے اس نے اس کا دماغ چکرا کر رکھ دیا تھا۔ وہ ایک دلیر آفیسر تھا مگر دلیری اپنی جگہ الگ حیثیت رکھتی ہے۔ یہ پراسرار واقعات اور اس عورت کا کردار کس خانے میں رکھا جائے۔ وہ اب اس لائن پر سوچ رہا تھا جس پر اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ قائل ہوتا جا رہا تھا۔ دنیا میں طاغوتی قوتیں بھی ہوتی ہیں۔ ان سے دست گریبان ہونا مشکل ہوتا ہے۔ وہ ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ یہ اس کے لئے ایک بدنما دھبہ تھا۔ اس نے جس کیس میں ہاتھ ڈالا تھا، اس کو کامیابی سے ختم کیا تھا اور یہاں پر وہ اب تک اندھیرے میں کھڑا تھا۔ اس نے اس مکان کی نگرانی ختم نہیں کی تھی اور خورشید کے ساتھ بھی آدمی لگائے ہوئے تھے۔ مگر کسی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آ رہی تھی۔ اوپر سے دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ SP کو ہر حال میں مجرموں کو پکڑنا تھا۔ وہ جادو یا سحر کو نہیں مانتا تھا کیونکہ اس کی پرورش اور تعلیم جس ماحول میں ہوئی تھی وہ مادہ پرست ماحول تھا۔ اس نے ان لوگوں سے رابطے کرنے کی کوششیں شروع کر دیں جو جادو یا سحر کے جاننے والے تھے۔ پنڈت شکلا پروفیسر تھے۔ کالج

میں پڑھاتے تھے مگر شوقیہ طور پر وہ جادوگر بھی تھے۔ وہ بہت کم اپنے بارے میں بتاتے تھے۔ ان کی رہائش الہ آباد میں تھی۔ SP نے ان کے بارے میں کسی سے سنا تو خود ان سے ملاقات کرنے ان کے مکان پر گیا۔ اپنا تعارف کرایا اور پھر آنے کا مقصد بیان کیا۔ اپنی پریشانی بتائی تو پروفیسر شکلا نے جواب دیا۔

"جادو کیا ہے۔ یہ سوال بہت پرانا ہے۔ اس کا جواب ہر کوئی اپنے انداز میں دیتا ہے۔ میں بھی اپنے انداز میں اس کا جواب دیتا ہوں۔ جادو ایک علم ہے۔ یہ علم ارادے کی قوت کو ظاہر کرتا ہے۔ اپنی منشاء کے مطابق کسی بھی چیز میں تبدیلی ہوتی ہے۔ وہ کس طرح ہوتی ہے۔ یہ بے شک پراسرار ہے۔ اس کی مناسب اور ضرورت کے مطابق مقدار کو مناسب ذریعہ سے استعمال کرنا ہوتا ہے۔ پھر مطلوبہ تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ عامل اس قابلیت اور صلاحیت کا ہو جو ضروری قوتوں کو استعمال کرنا جانتا ہو۔ دوسری صورت میں خود عامل نشانہ بن سکتا ہے۔ دوسرے عامل کو جن حالات اور ماحول میں کام کرنا ہے، اس کا بھی پورا پورا اندازہ ہو۔ اگر نئی جگہ، نئے ماحول میں ہے تو ناکام بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ایک دماغی کاوش ہے۔"

"یہ واقعات جو اس مکان میں ہوئے، ان کا تعلق کسی جادو یا سحر سے ہے۔" ایس پی نے پوچھا۔

"قدرت کے ہزارہا انوکھے عجوبوں کی طرح جو ازل سے آج تک ہیں۔ انسانی سمجھ میں یہ اب تک نہیں آئے ہیں اور سمجھ میں آئیں گے بھی نہیں۔ اس نے کوئی ایسی مخلوق بھی پیدا کی ہو اور اس کو کچھ مخصوص قوتیں بھی دی ہوں۔ میری عقل اور علم یہاں آ کر خاموش ہو جاتی ہے۔ نہ صرف میں بلکہ دنیا کا کوئی آدمی اس کا تجزیہ نہیں کر سکتا۔ بہرحال میں وعدہ نہیں کرتا۔ کوشش ضرور کروں گا کہ کچھ کھوج لگا سکوں۔" پروفیسر شکلا نے جواب دیا۔

"اس کے لئے آپ کو کتنی مدت درکار ہوگی؟" SP نے پوچھا۔

"صرف آج کی رات، صبح میں آ کر آپ کو بتا دوں گا۔"

مگر پروفیسر نہ آ سکا۔ وہ رات کو ہی مچھلی شہر چلا گیا تھا اور آدھی رات کے بعد وہ اس مکان کے دروازے پر تھا اور وہ بھی دروازے کے اندر چلا گیا اور پھر واپس نہ آ سکا۔ پروفیسر جانے سے پہلے اپنے پروگرام کی تفصیل تحریر کر گیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ پروفیسر بھی اسی مکان کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔

SP کی پریشانیاں اور بڑھ گئیں۔

یہ واقعات اخبارات میں آ رہے تھے۔ مگر میری نظر سے صرف پروفیسر کی خبر گزری اور جو تفصیل لکھی تھی، وہ میں نے رولوکا کو بتائی تو اس نے کہا۔ "اس کا مطلب ہوا یہ سلسلہ ابھی آگے بھی چلے گا۔"

"کیا خیال ہے، ایس پی اینڈرسن سے رابطہ کیا جائے۔ معاملہ بہت خطرناک لگتا ہے۔"

"تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ الہ آباد چلتے ہیں۔ وہیں پر ملاقات کریں گے۔"

اور پھر ہم دونوں الہ آباد کی طرف چل دیئے۔ SP اینڈرسن نے فوراً ہم کو بلا لیا اور پوچھا۔ "آپ کو کس طرح پتہ چلا کہ مچھلی شہر میں یہ انوکھے واقعات پیش آ رہے ہیں۔"

"مجھے گزشتہ واقعات کا تو علم نہیں ہے مگر پروفیسر شکلا والا کیس میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔" میں نے جواب دیا تو SP نے پوچھا۔ "آپ کچھ ضرور میری مدد کر سکتے ہیں اسی لئے آپ نے رابطہ کیا ہے۔"

"میں تو صرف حکیم ہوں۔ یہ میرے دوست حکیم کامل ہیں۔ ان کو پوری تفصیل آپ بتائیں۔" میں نے رولوکا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ویل حکیم کامل میں بتاتا ہوں۔" اور پھر اس نے پوری کہانی بیان کر دی۔ "خورشید ہی ایک آدمی ہے جس نے اس عورت کو کئی بار دیکھا ہے۔ آپ اس سے ملنا چاہیں تو اس کو بھی بلایا جا سکتا ہے اور جو ضروری مدد میں کر سکتا ہوں، کروں گا۔ آدمیوں کی ضرورت ہوگی تو وہ بھی دوں گا۔" SP نے تفصیل بتا دی۔

"میں صرف خورشید سے ملاقات کرنا چاہوں گا۔"

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

رولوکا نے جواب دیا۔

"اس کو میں ابھی بلوائے لیتا ہوں۔اس کے علاوہ آپ کو کس چیز کی ضرورت ہوگی؟" SP نے پوچھا۔

"میرا کام کرنے کا الگ انداز ہے۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"بات یہ ہے حکیم کامل کہ میں اب کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔ پروفیسر کی گمشدگی میرے کھاتے میں ڈالی جا رہی ہے میرے اوپر بھی بہت دباؤ ہے۔ آپ کو میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ میں آپ کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں۔" SP نے جواب دیا۔

"میں اکیلا کام کرنے کا عادی ہوں۔ میں جس انداز میں کام کروں گا۔ آپ میرا ساتھ نہیں دے سکیں گے۔ آپ اطمینان رکھیں اور خورشید کو بلوائیں۔" رولوکا نے کہا۔

کچھ دیر میں خورشید علی بھی آ گئے۔ رولوکا نے اس عورت کا چلنے پھرنے کا انداز اور حلیہ سب پوچھ لیا اور خورشید کو واپس کر دیا۔ "اب آپ آرام کریں۔ میں کل صبح ملاقات کروں گا۔" رولوکا نے کہا۔

"کیا آپ کا ارادہ آج اس مکان میں جانے کا ہے؟" SP نے پوچھا۔

"ہوسکتا ہے چلا جاؤں۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"میرا مطلب تھا کچھ آپ کی مدد کا بندوبست کر دیا جائے۔" SP نے کہا۔

"اس کی ضرورت ہوگی تو بتاؤں گا۔" رولوکا نے جواب دیا۔

ہمارے رہنے کا بندوبست سرکاری سطح پر SP نے کر دیا تھا۔ کھانے کے بعد رولوکا نے کہا۔ "اچھا حکیم صاحب میں تو چلتا ہوں ڈیوٹی پر۔ آپ آرام کریں۔" اور رولوکا روپوش ہو گیا۔

مچھلی شہر زیادہ بڑا قصبہ نہیں ہے مگر ضروریات زندگی کی ہر چیز یہاں پر ہے۔ بازار بھی اچھا ہے مگر آٹھ بجے ہی سب دوکانیں بند ہو جاتی ہیں۔ دوسرے ان تین لڑکوں کی گمشدگی نے لوگوں کو اور ڈرا دیا ہے۔ اس لئے اور جلدی گھروں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

میں اس گھر کے قریب آموں کے باغ میں کھڑا تھا۔ نظریں البتہ اس مکان پر جمی ہوئی تھیں۔ میں پوری طرح دروازے کو دیکھ سکتا تھا میں اس کے کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ دروازہ کھلا۔ میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ ایک عورت سیاہ لباس میں دروازے پر کھڑی تھی۔ میں اس کے بالکل سامنے تھا مگر وہ مجھے نہیں دیکھ پا رہی تھی۔ اب وہ دروازے سے چند قدم آگے آ گئی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ پھونک پھونک کر کیوں قدم آگے بڑھا رہی ہے۔ وہ اور چند قدم آگے آ گئی۔ اب اس کو پکڑنا آسان تھا۔ میں نے جاگتے الو کو اشارہ کیا۔ اور وہ ہوا کی طرح اس پر آیا، مگر وہ بھی لحہ بھر میں زمین پر لیٹ گئی اور الو اس کے اوپر سے گزر گیا۔ وہ لیٹے لیٹے تیزی کے ساتھ لوٹ لگاتی دروازے کے اندر چلی گئی اور دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے گھر کا چاروں طرف سے اچھی طرح معائنہ کیا۔ کمروں کے درمیانی حصہ پر چھت نہیں تھی۔ رات اس قدر سیاہ تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ اپنی کمین گاہ میں بند ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے وہاں پر اس کی طاقت زیادہ ہوگی۔ میں کھلے میدان میں تھا۔ اس کی طاقت کا اندازہ بھی نہیں تھا۔ مجھے پھر اس کو باہر لانا تھا۔ مگر اب وہ ہوشیار تھی۔ آسانی سے تو باہر نہیں آئے گی۔ میں نے سوچا۔ میں نے اپنے کارندے چاروں طرف لگا دیئے۔ کوئی بھی نکلے، اس کو گرفتار کرنا ہے۔ یہ ہدایت کر دی اور میں وہاں سے چلا گیا۔ میرا سفر بہت لمبا تھا۔ اگر کسی سواری پر کریں تو مہینہ لگ جائے۔ میری واپسی بھی دوسری رات ہوئی۔ اس دوران کوئی باہر نہیں آیا۔

میں ایک بوٹی لینے گیا تھا۔ اس بوٹی میں یہ خاصیت ہے کہ جہاں اس کو پھیلا دیا جائے وہاں پر کوئی بد روح اور جنات نہیں رہتے۔ کیونکہ اس میں اس قسم کی بو ہے جو آدمی کو تو محسوس نہیں ہوتی مگر ماورائی قوتوں کو محسوس ہوتی ہے۔ میں نے مکان کے ہر سمت اس کو پھیلا دیا۔

دن میں بھی میرا قیام وہیں پر رہا۔ دوسری رات دس بجے آسمان پر کچھ ہلچل معلوم ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ کچھ

لوگ آموں کے باغ کے پاس اترے ہیں وہ زیادہ بڑے نہ تھے۔ ان کے قد چھوٹے اور چپٹے چپٹے تھے۔ ان کی چال ایسی تھی جیسے وہ سائیکل پر ہوں۔ میں نے اپنی فوج کو اشارہ کر دیا۔ الو نے ان کو اندھا کرنا شروع کر دیا اور ایک خونخوار بڑی دل ان پر ٹوٹ پڑا۔ ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ چند منٹوں میں ہی ان کا صفایا ہو گیا۔ ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ حملہ کس نے کیا۔ ان کی نظریں میرے حملہ آوروں کو نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ باہر کی کمک تو ختم ہو گئی۔

میں مکان کے اس حصہ کی طرف چلا۔ جدھر چھت نہیں تھی۔ میرے ساتھ دونوں الو دائیں بائیں موجود تھے۔ میں اس کھلے حصے کی طرف سے مکان کے اندر کود گیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ میں نے ایک کمرے کا دروازہ دھکیلا تو وہ کھلا ہوا تھا۔ میں اس کے اندر چلا گیا۔ اندر سخت بدبو تھی۔ گوشت کے سڑنے کی بدبو، ہر طرف کوڑا کرکٹ نظر آتا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ایسی جگہوں پر چمگادڑیں اپنا بسیرا کرتی ہیں وہ بھی نہیں تھیں۔ پھر میں نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھول لیا۔ یہاں پر بھی یہی حال تھا۔ سارے کمروں میں کوئی نہیں تھا۔ ایک دروازہ اور نظر آیا۔ اس میں کواڑ نہیں تھا۔ میں اس میں داخل ہو گیا۔ وہ زینہ تھا اور سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ ہر سیڑھی ایک فٹ سے زیادہ کی تھی اور میرے اندازے کے مطابق پچیس تیس سیڑھیاں تھیں۔ اس کا مطلب تھا میں زمین کے اندر تیس فٹ نیچے تھا۔ یہ مکان جس نے بھی بنایا تھا، حیرت انگیز تھا۔ زمین میں اس قدر نیچے ایک بہت بڑا ہال تھا۔ اس ہال میں ایک بڑی سی موم بتی جل رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف دیوار کے ساتھ ساتھ کرسیاں پڑی تھیں جن پر وہی چھوٹے چھوٹے اور چپٹے چپٹے لوگ بیٹھے تھے۔ ان کی شکلیں انسانوں جیسی ہی تھیں مگر دہانے ضرورت سے زیادہ بڑے تھے اور ماتھے ابھرے ہوئے تھے۔ وہ سب خاموش تھے جیسے کسی سوگ میں بیٹھے ہوں۔ میں بھی ایک کونے میں کھڑا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ایک لحیم شحیم قد آور عورت اندر آ گئی اور بولی۔

"ساری محنت ضائع گئی۔ سب مارے گئے۔ کون ہے جو وار کر رہا ہے۔ تم اندر کیا کر رہے ہو۔ جاؤ لڑو اس سے۔"

ان میں سے ایک بولا۔ "کس سے لڑیں، سامنے کوئی ہو تو لڑیں۔ نظر تو آتا نہیں۔"

وہ بولی۔ "ہاں یہی تو خرابی ہے وہ ہم کو دیکھ رہا ہے اور ہم اندھے ہیں۔"

"تو کیا ہمیں پھر زمین کے اندر جانا ہوگا۔" ایک پھر بولا۔

"اتنی آسانی سے تو میں ہار نہیں مانوں گی۔" وہ بولی۔

"تو پھر ہم مرتے رہیں گے۔ اب ہمارا پروگرام تو آگے نہیں چلے گا۔" پھر کوئی بولا۔

"صبر کرو، کوئی راستہ میں نکالوں گی۔ کون ہے؟ میں پتہ چلاتی ہوں۔" وہ بولی۔

اس نے میز کے اوپر آسن جما لیا اور جسم کے سارے کپڑے اتار دیئے۔ سامنے کے رخ سے وہ ایک بھرپور عورت نظر آتی تھی۔ مگر پیٹھ کی طرف سے وہ ایک کینوس کی طرح سیدھی اور سپاٹ تھی۔ ان سب میں وہی قد آور تھی۔ باقی سب کے قد بہت چھوٹے تھے۔ اس نے اپنے لباس میں سے ایک دیا نکالا اور میز پر رکھ دیا۔ اس دیئے میں اپنے بالوں کی ایک لٹ لگا دی اور اپنی انگلی کو دانتوں سے چبا کر زخمی کیا اور خون دیئے میں بھرنے لگی۔ جب دیا پورا بھر گیا تو اس نے انگلی منہ میں دبا لی۔ پھر ایک بونا موم بتی لے کر آگے بڑھا اور اس عورت کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

"تم سب دیکھو گے کون ہے جو وار کر رہا ہے۔ اس دیئے کے روشن ہوتے ہی سب کچھ سامنے آ جائے گا۔ میں زمین کی ساتویں تہہ کی شہزادی ہوں۔ یہ زمین کے اوپر بسنے والی کمزور مخلوق میرا پروگرام کیا بگاڑے گی۔ میں اس زمین پر راج کرنے آئی ہوں۔ ابھی تو میں نے آغاز کیا ہے۔" اور وہ موم بتی کو چراغ کے قریب لے گئی مگر وہ اس چراغ کو جلا نہ سکی کیونکہ ہوا کا ایک تیز جھونکا ایسا آیا کہ چراغ الٹ گیا۔ اس پر پڑی بالوں کی لٹ اڑ گئی اور خون میز پر پھیل گیا۔ موم بتی اس کے ہاتھ میں البتہ جلتی رہی۔ وہ غصے سے میز پر کھڑی تھی۔ اس کا سارا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کو اپنی برہنگی کا ذرا

READINGCORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

احساس نہیں تھا۔ وہ دھاڑ کر بولی۔ ”کون ہے، چھپ کر وار کرتا ہے، سامنے تو آ.....“

ہر طرف خاموشی رہی تو وہ پھر بولی۔ ”کمانی سامنے آ“، مگر کسی طرف سے حرکت نہیں ہوئی تو وہ پھر زور سے دھاڑی۔ ”کمانی کیا سنتا نہیں سامنے آ“ مگر ہر طرف خاموشی رہی۔

وہ میز سے اتر آئی اور ایک بونے کے پاس جا کر اس کو ہلایا۔ وہ ایک طرف گر گیا۔ پھر دوسرے کو ہلایا۔ وہ بھی ایک طرف گر گیا۔ وہ دیوانوں کی طرح چیخی۔ ایک وار اور وہ لمحہ بھر میں سیڑھیاں پھلانگتی اوپر دوڑ گئی۔ میں بھی تیزی سے اوپر آیا مگر وہ غائب ہو چکی تھی۔ سارے گھر میں اس کو تلاش کیا گیا مگر اس کا پتہ نہ تھا۔ صبح تک میں وہیں رہا۔ سورج کی روشنی میں گھر کی تلاشی لی مگر کوئی نہیں تھا۔ رات کو جو بونے مارے گئے تھے وہ بھی نہیں تھے۔ ان کی جگہ پر تازہ مٹی جیسی کہ زمین کھودنے پر نکلتی ہے، پڑی تھی۔ سارے کمروں میں کچھ نہیں تھا۔ صرف تہہ خانے کے ایک طرف کچھ فریم پڑے تھے۔ سالخوردہ۔ تصویر کسی میں نہیں تھی۔“

ساری روداد سننے کے بعد میں نے پوچھا۔ ”وہ تو زندہ ہے۔ کسی اور صورت میں پھر نمودار ہو سکتی ہے۔“

”یہ بات تو خطرناک ہے۔“ SP نے بھی کہا۔

”ابھی کام ختم نہیں ہوا۔ مجھے اس کو تلاش کرنا ہے۔ دوسرے ان کے آنے کے راستے کو بھی بند کرنا ہے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”ایک بات اور تم نے بتایا کہ وہ ہوا میں اڑ کر بھی آئے تھے وہ کیا تھا۔“

”ان کے پاس ایسا کوئی علم ہے کہ وہ آسمانوں میں پرواز کر لیتے ہیں مگر میرا خیال ہے، وہ زمین کے اندر سے ہی آتے ہیں۔ سراغ صرف یہ لگانا ہے کہ یہ آتے کہاں سے ہیں۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

”اب کیا پروگرام ہے؟“ SP نے پوچھا۔

”آپ مالک مکان خورشید سے وہ مکان حاصل کر لیں۔ گڑبڑ مجھے اسی مقام پر لگتی ہے۔“ رولوکا نے جواب دیا۔

خورشید علی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ مکان سرکار کی تحویل میں آ گیا اور رولوکا نے اپنا کام شروع کر دیا۔ سب سے پہلے اس مکان کو ڈھانے کا بندوبست کیا۔ یہ کام چند روز میں ہو گیا۔ ملبہ وغیرہ ہٹا دیا گیا۔ پھر کھدائی کروائی گئی اور پورے تہہ خانے کو ختم کر دیا گیا اور پھر اس میں مٹی بھروا دی گئی اور پانی چھوڑ دیا گیا۔ اب مکان کی جگہ میدان تھا مگر ایک کنواں اب بھی باقی تھا۔ کنواں اچھا بڑا تھا، مگر پانی وغیرہ کچھ نیچے نظر نہیں آتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی دیواروں پر خودرو جھاڑیاں بے تحاشا اگی ہوئی تھیں۔ ہر روز رسوں کی مدد سے لوگ لٹکتے اور جھاڑیاں کاٹتے۔ کام کے دوران ہر وقت رولوکا وہاں موجود رہتا۔ پچاس فٹ تک جھاڑیاں صاف ہو گئیں۔ مگر اب بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کام جاری رہا۔ پچاس فٹ اور جھاڑیاں صاف کر دی گئیں۔ کنویں کے اندر ہوا کا دباؤ کم ہو گیا اور بڑے بڑے پنکھے اوپر لگا کر کام جاری رکھا گیا۔ کچھ سب حیران تھے کہ یہ کنواں تو شیطان کی آنت کی مانند تھا کہ گہرائی کہیں ختم ہی نہیں ہوتی تھی۔ پچاس فٹ اور کوشش کی گئی مگر کنویں کا آخر نہیں ملا۔ اندر کام کرنا دشوار ہوتا گیا۔ مزدور بے ہوش ہونے لگے تو کام بند کرنا پڑا۔ رولوکا اور سب کو یقین آ گیا کہ یہی وہ راستہ ہے جہاں سے یہ چپٹے لوگ زمین کے اوپر آتے ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ راستہ زمین کے سات پرتوں تک جاتا ہے اور ابھی کتنی گہرائی باقی ہے اس کا بھی اندازہ نہیں تھا۔ اس کے اندر کون کام کرے گا۔ سب مزدوروں کو فارغ کر دیا گیا۔ اس میدان میں جہاں اب گھر تھا، پولیس کے جوان مورچہ لگائے تھے اور کنویں کے گرد رولوکا کے اپنے کارندے موجود تھے۔

رولوکا اس راستے کو بند کرنے سے پہلے دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ کتنا لمبا راستہ ہے۔ اس نے سب کو رات میں رخصت کر دیا۔ پولیس کے کسی جوان کو میدان میں نہیں رہنے دیا اور کنویں کے اندر اتر گیا۔ وہ روپوشی میں تھا۔ اس حالت میں وہ بے وزن اور تیز رفتار بھی ہو جاتا تھا۔ وہ ہوا کی طرح نیچے جا رہا تھا۔ وہ جتنا اترتا جاتا تھا، جھاڑیاں گھنی ہوتی جاتی تھیں۔ ان جھاڑیوں میں ایک بیر کی شکل کا پھل بھی

تھا۔ رولوکا نے پہچان لیا کہ یہ پھل پہاڑوں کی چوٹیوں پر جو جھاڑیاں ہوتی ہیں۔ ان میں لگتا ہے۔ یہ زمین کی اتنی زیادہ گہرائی میں بھی لگتا ہے۔ یہ اس کے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ پہاڑ کی چوٹیوں پر جو پھل لگتا ہے اس کو کھانے سے بھوک اور پیاس دونوں ختم ہو جاتے ہیں اور توانائی بڑھتی ہے۔ یہ خاصیت زمین کے اندر پیدا ہونے والے پھل میں ہے کہ نہیں یہ دیکھنا ضروری تھا اور رولوکا کو رکنے کی فرصت نہیں تھی، وہ برق رفتاری سے زمین کے اندر سفر کر رہا تھا۔

آخر یہ سفر ختم تو ہونا تھا۔ کنواں نما سرنگ کے ختم ہوتے ہی وہ ایک میدانی علاقے میں کھڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف پرت دار چٹانیں نظر آ رہی تھیں۔ ان کی پرتوں کے رنگ الگ الگ تھے۔ کوئی پیلی چمکیلی پرت تھی، کوئی سرخ اور کوئی پرت ہری تھی۔ ہر پرت اپنی جگہ چمکدار تھی۔ یہاں نہ رات تھی نہ دن۔ سورج کی روشنی نہیں تھی۔ مگر اندھیرا بھی نہیں تھا۔ اس کو نہ دن کہہ سکتے ہیں نہ رات۔ دور دور کوئی نظر نہ آتا تھا۔

وہ اپنی روپوشی قائم رکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہ نئی دنیا تھی۔ اس کو سمجھنا ضروری تھا۔ دیکھنا ضروری تھا۔

ان کا علم کیا ہے، ان کی طاقت کتنی ہے۔ ان کے پاس کیا ہتھیار ہیں۔ یہ کیا کر سکتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ ان سب چیزوں کو دیکھنا اور سمجھنا ضروری تھا۔ یہاں اس کا کوئی کارندہ نہیں تھا۔ سب کچھ اس نے اکیلے کرنا تھا، ضروری تھا کہ خود کو چھپا کے رکھے۔

وہ چٹانوں کی طرف چلنے لگا۔ یہ قریب نظر آنے والی چٹانیں اتنی قریب نہ تھیں۔ اس نے دیکھا۔ چٹانوں کے اندر گول گول سوراخ بنے ہوئے تھے۔ وہ ان کے اور قریب چلا گیا۔ اب اسے ان سوراخوں میں زندگی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ ہر سوراخ میں عورتیں اور مرد چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ کچھ سوراخ زمین سے زیادہ اونچے نہ تھے۔ مگر ایسے بھی تھے جو زمین سے بہت اوپر تھے مگر نہ کوئی سیڑھی تھی نہ کوئی زینہ تھا۔ یہ لوگ اتنی اونچائی پر کس طرح جاتے ہیں۔ ابھی رولوکا یہی سوچ رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ بہت اوپر

واے سوراخ سے ایک چپٹا بونا نکلا اور اس نے اپنی پیٹھ دیوار پر لگا دی اور چٹان کی دیوار کے ساتھ پھسلتا ہوا بڑے آرام سے زمین پر آ گیا۔ ان کی سپاٹ پشت کی افادیت اس کی سمجھ میں آ گئی۔ یہ ایک نئی دنیا تھی۔ نرالی دنیا تھی۔ وہ گھومتا رہا۔ عورتیں سب عورتیں تھیں۔ نہ ان میں کوئی بوڑھی تھی نہ جوان۔ سب ایک جیسی تھیں۔ مرد سب مرد تھے۔ ان میں بھی عمروں کا فرق نہ تھا۔ بچے ضرور بچے نظر آتے تھے۔ ان سب کے رنگ ایک جیسے تھے۔ سب مٹیالے رنگ کے تھے اور سب ایک ہی قد کے تھے۔

رولوکا ایک نہ تھکنے والا انسان تھا۔ وہ ان کے مکانوں کے اندر بھی گیا۔ ہر سوراخ میں کئی کئی مرد اور کئی کئی عورتیں موجود تھیں۔ ان کے بچے بھی تھے۔ مرد ایک طرف چٹانوں کے پار جاتے تھے۔ وہ وہاں سے کھانے کو کچھ لاتے تھے۔ پانی کی وہاں کمی نہیں تھی۔ ایک فٹ گڑھا بنا لیا اور پانی نکال لیا۔ مرد جو جڑ نما کوئی چیز لاتے تھے۔ وہ سب مل کر اس کو کھاتے تھے۔ یہ سب ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے نہیں تھے۔

ان کا معاشرہ دنیا سے نرالا تھا۔ یہاں پر سونا ایک بہت معمولی چیز تھا۔ وہ لوہا تلاش کرتے تھے۔ یہ ان کے لئے بہت قیمتی دھات تھی۔ اس سے یہ لوگ ہتھیار بناتے تھے۔ زمین کھودنے کے اوزار بناتے تھے۔ آگ ان کے نزدیک بہت اہمیت رکھتی تھی۔ ہر کوئی آگ نہیں جلاتا تھا۔ آگ سے یہ لوگ بہت ڈرتے تھے۔ یہاں پر کسی لباس کا تصور نہیں تھا۔ عورتیں اور مرد سب قدرتی لباس میں رہتے تھے۔

رولوکا کو تلاش تھی یہاں کے سردار کی، مگر سب ہی ایک جیسے تھے۔ وہ کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ان کی زبان نہیں جانتا تھا۔ ہاں اپنے علم اور چہرے کے تاثرات سے بہت حد تک بات سمجھ جاتا تھا مگر اپنی بات ان تک پہنچانے کو اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ان کے چہروں اور جسم کی طرح ان کی زبان بھی چپٹی اور ٹیڑھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ان کی زبان میں بہت کم الفاظ تھے اور وہ زیادہ تر کام اشاروں کی زبان سے لیا کرتے

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

تھے۔ یہاں پر سب کا صرف یہ کام تھا کہ غذا لانا۔ اس کو دھونا اور کھالینا اور آپس میں کھیلنا۔ شرم وحیا، رشتے ناطے کا یہاں پر کوئی تصور نہیں تھا۔ مرد صرف مرد تھے اور عورتیں صرف عورتیں تھیں۔

رولوکا کو اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ اس کو یہاں آئے، کتنا عرصہ گزرا ہے۔ واپس تو وہ کسی وقت بھی جا سکتا تھا مگر ابھی کام پورا نہیں ہوا تھا۔ اپنی دنیا سے رابطہ کرنے کا اس کے پاس ایک ذریعہ تھا۔ اس نے اپنا علم ٹیلی پیتھی استعمال کیا اور حکیم وقار کے ذہن تک پہنچ گیا۔

"میں رولوکا ہوں۔ آپ پریشان نہیں ہونا، میں آپ کے دماغ میں ہوں۔"

حکیم وقار چونک پڑے۔ "تم واقعی رولوکا ہو....." انہوں نے پوچھا۔

"ہاں میں رولوکا ہوں، میری بات سنئے میں زمین کے ساتویں پرت کے نیچے ہوں، یہاں پر ایک دنیا آباد ہے مگر ہماری دنیا کی طرح مہذب اور ترقی یافتہ نہیں ہے۔ پوری تفصیل تو آ کر بتاؤں گا آپ یہ بتائیں، وہاں کے کیا حال ہیں، وہ عورت دوبارہ اپنی جگہ نمودار ہوئی۔"

حکیم وقار نے بتایا۔ "نہیں اس عورت کا کوئی پتہ نہیں ہے، یہاں پر امن چین ہے۔"

"میں پھر ضرورت پڑی تو رابطہ کروں گا۔" رولوکا نے کہا۔

میں پھر اسی مقام پر آیا، جہاں پر کنواں ختم ہوتا تھا، یہاں پر میں نے ایک پکی نشانی لگائی یہ نشانی ایسی تھی کہ کوئی اس راستے کو بند کرنا چاہے تو بھی بند نہیں کر سکتا۔ یہاں پر میں نے ہر آدمی کو چیک کیا، وہ سادہ لوگ تھے، ان میں کوئی ماورائی طاقت نہیں تھی تو پھر وہ کون لوگ تھے جو ہماری دنیا میں آئے تھے، وہ تو اڑ بھی رہے تھے اور وہ عورت تو کوئی جادوگرنی لگتی تھی۔ اب میرا ارادہ اور آگے بڑھنے کا تھا۔ میں چٹانوں کے اوپر چلا گیا۔ یہاں پر بھی دور دور اسی قسم کے سوراخ تھے اور ان میں لوگ آباد تھے۔ میں اور آگے چلا چٹانیں متواتر تھیں مگر ایسا لگتا تھا کہ میں اوپر کی بجائے اور نیچے جا رہا ہوں۔ ہر جگہ چٹانوں پر ایک بیل نما پودا کثرت سے اگا ہوا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ یہاں پر میں نے اب تک کوئی پرندہ نہیں دیکھا تھا۔ جانوروں میں صرف بکری نما ایک جانور تھا جس کی دم بہت موٹی تھی اور اس میں سے ایک رس جیسا نکلتا تھا اور اس کو یہ لوگ پیتے تھے۔ اس بکری نما جانور کی چھ ٹانگیں تھیں۔ چار پر یہ چلتا تھا اور دو کو ہاتھوں کی طرح استعمال کرتا تھا۔ چٹانوں میں میں نے ایک بہت بڑی مکڑی جیسا جانور بھی دیکھا جس کے لاتعداد پیر ہاتھ تھے اور یہ لوگ اس کا شکار کرتے تھے۔ یہ بڑا خطرناک اور طاقتور جانور ہوتا ہے۔ بڑی مشکل سے قابو آتا ہے، میں آگے بڑھتا گیا۔ اب میں ایک وادی نما جگہ پر تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں ایک کٹورے میں آ گیا ہوں۔ میرے چاروں طرف چٹانیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ چٹانوں میں بڑے چھوٹے سوراخ نظر آ رہے تھے۔ درمیان میں بہت بڑا میدان تھا اور اس سبز زار میدان کے درمیان ایک کول اور زمین سے دس بارہ فٹ بلند گیند نما ٹیکری ہے۔ میدان خالی پڑا ہے، میں اس ٹیکری پر چڑھ جاتا ہوں اور آرام کرنے کو آنکھیں بند کر لیتا ہوں اور پھر میری آنکھ جب کھلتی تو دیکھتا ہوں۔ سارا میدان یہاں کی مخلوق سے بھرا ہوا ہے۔ ان لوگوں میں صرف مرد اور عورتیں ہیں۔ کوئی بچہ نظر نہیں آیا۔ حیرت اس پر ہے کہ اتنے لوگ جمع ہیں اور کوئی شور نہیں ہے۔ سب لوگ آرام سے اپنی اپنی عورتوں کے ساتھ موجود ہیں۔ یہاں کی عورت ہماری دنیا کی عورت کی طرح نہیں ہے۔ یہ بہت کم بولتی ہے اور مرد کی خوشنودی حاصل کرنے کو ہر وقت تیار رہتی ہے۔ اس کے لئے ہر مرد ایک جیسا ہے یہ کسی کو ناراض نہیں کرتی اور مرد بھی اس پر اعتراض نہیں کرتا۔ اس سے یہاں پر لڑائی جھگڑے نہیں ہوتے۔ زر، زن، زمین کے جھگڑے کو کوئی نہیں جانتا۔

ہماری دنیا میں صرف ان باتوں پر جھگڑے ہوتے ہیں۔ میں نے اب تک کسی کو آپس میں لڑتے نہیں دیکھا۔ کچھ ہی دیر میں ایک طرف سے ایک شخص آتا نظر آیا وہ قد میں ان سے ذرا بڑا تھا۔ اس کے ساتھ جو عورت تھی، اس کے

بالوں میں کچھ چمکدار چیز لگی ہوئی تھی، وہ بھی عام عورتوں سے زیادہ لمبی تھی۔ اب میں ان کی زبان پوری طرح سمجھ لیتا تھا۔ تھوڑی بولنے کی خود سے مشق کرتا تھا تاکہ کبھی ضرورت پڑے تو کام چلا سکوں۔ میں ایک طرف ہو گیا۔ وہ ٹیکری پر آ گیا اور آتے ہی اس نے اپنے ساتھ آئی۔ عورت کو اپنے کندھے پر اٹھا لیا۔ وہ عورت بھی برہنہ تھی۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ سب لوگ خوشی سے تالیاں بجانے لگے اور سب نے اپنی اپنی عورتوں کو کاندھوں پر اٹھا لیا اور جب اوپر والے مرد نے اپنی عورت کو کاندھے سے اتار دیا تو سب نے اس کی تقلید کی اور خاموشی سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ اوپر والا مرد کھڑا رہا اور بولا.....

"اے دھرتی کے اندر بسنے والی مخلوق خوش ہو جاؤ کہ اب ہم دھرتی کے اوپر جانے والے ہیں۔ وہاں پر وہ عیش و آرام ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہاں کھانے کو بہت اچھی اچھی چیزیں ہیں۔ طرح طرح کے جانور ہیں۔ ان کا نرم اور ذائقہ دار گوشت ہے۔ زمین کے اوپر بہت درخت ہیں۔ ان میں بڑے اچھے پھل ہوتے ہیں۔ ہماری دنیا میں کیا رکھا ہے۔ وہاں سورج ہے، گرمی ہے اور سمندر کا پانی ہے۔ وہاں جو کچھ ہے وہ تمہارے خواب ہیں۔ میں نے وہ دنیا نہیں دیکھی مگر میری بیٹی وہاں پر ہے۔ وہ وہاں کام کر رہی ہے۔ میں نے اپنی ساری طاقت اس کے اندر ڈال دی ہے۔ وہ ایک پل میں میرے پاس آ سکتی ہے۔ وہ زمین کے اوپر راج قائم کر رہی ہے۔ تم زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرو، کیونکہ ہمیں ان کی ضرورت پڑے گی۔ ہمارے اوپر جانے کے راستے بنائے جا رہے ہیں۔ کئی موجود ہیں اور کئی عنقریب بن جائیں گے۔ میرے ساتھیو! میں اب جا رہا ہوں۔ زمین کے بارویں پرت کی طرف کیونکہ میری ساری طاقت تو میری بیٹی لے گئی ہے۔ میں اور نئی اور نرالی طاقت اندر سے نکال کر لاؤں گا اور پھر زمین کے اوپر راج بناؤں گا....." اب مجھے اندازہ ہوا کہ ان لوگوں کے کیا پروگرام ہیں۔ صرف چند کے پاس ساحرانہ طاقت تھی۔ باقی لوگ تو عام سے لوگ تھے۔ مجھے اس کو روکنا ضروری تھا۔ نہ معلوم زمین کے اور اندر سے یہ کیا لے آئے اور دنیا کے لئے نئی مصیبت کھڑی کر دے۔ میں نے کھڑے ہو کر ایک بیل سے اس کے دونوں پیر جلدی سے باندھ دیئے اور اتنی ہی پھرتی سے اس کے ہاتھ بھی باندھ دیئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بیلیں اس سے کیوں لپٹی جا رہی تھیں۔ کیونکہ مجھے تو وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس کی عورت حیرت سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ پھر میری آواز ان تک پہنچی۔

"اے زمین کے اندر کے باسیو میری بات غور سے سنو۔ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ مگر سن سکتے ہو۔ یہ جو تمہارا سردار ہے، یہ تم سب کو فریب دے رہا ہے۔ تم امن اور چین سے زندگی گزار رہے ہو زمین کے اوپر تمہارا گزارہ نہیں ہوگا۔ وہ دنیا تم سے بالکل الگ دنیا ہے۔ اس دنیا کے پاس جو کچھ ہے تم ان کی طاقت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ وہ آگ کا گولا چھوڑیں گے اور تم ختم ہو جاؤ گے۔

تم ان کی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکو گے۔ یہ اور اس کی لڑکی تم لوگوں سے دھوکا کر رہی ہے۔ تم سب ختم ہو جاؤ گے۔ اس کا اندازہ یوں کرو کہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ تم میری آواز سن رہے ہو مگر تمہاری آنکھیں اس قابل نہیں کہ دیکھ سکیں۔ میں تم سب کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں اور یہ شخص تم کو ختم کرنا چاہتا ہے۔

یہ وہاں راج قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کو پتا نہیں کہ اوپر کی دنیا کتنی بڑی ہے۔ وہاں بے حساب انسان رہتے ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک ترقی یافتہ ہے۔ وہ آسمانوں میں اڑتے ہیں۔ پانی کے اندر سفر کرتے ہیں۔ ہزاروں میل دور باتیں کرتے ہیں تم نے تو ابھی کچھ دیکھا ہی نہیں ہے۔ ذرا سی ساحری وہاں کچھ کام نہیں آئے گی۔ یہ تمہارے سامنے بے بس پڑا ہے۔ میں چاہوں تو اس کو مار دوں مگر میں یہ نہیں کرتا میں تم کو بتا رہا ہوں۔ اس کی باتوں پر اعتبار نہ کرنا اور اس کی بیٹی بھی اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔ تم صرف یہ کرو کہ یہ جو رستے اوپر جانے کے بنا رہا تھا۔ ان کو ختم کر دو، ورنہ یاد رکھو، اگر اوپر کی مخلوق یہاں آ گئی تو تم سب مارے جاؤ گے۔ بولو تم کیا کہتے ہو، اس کی بات مانو گے یا میری

READING CORNER http://readingcornerpk.blogspot.com/

بات پر اعتبار کرو گے۔"

یکا یک سب کھڑے ہو گئے اور ہاتھ اٹھا کر کہنے لگے۔ "ہمیں تم پر اعتبار ہے۔ یہ سردار غدار ہے۔ یہ ہم کو ختم کرنا چاہتا ہے۔" اور میں خاموشی سے ٹیکری سے اتر کر واپس اس طرف چل دیا۔ جدھر میرا واپسی کا راستہ تھا۔ میں اس میں داخل ہوا اور اوپر جانے لگا۔ میں نے اوپر آتے ہی سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اپنے کارندوں کو طلب کیا اور اس کنویں کو بھرنا شروع کر دیا۔ چونے کی پہاڑی سے چونا منگوایا اور وہ ڈالنا شروع کر دیا۔ راتوں رات یہ کام پورا ہو گیا۔ "اگر یہ کام عام مزدور کرتے تو مہینوں کا کام تھا۔ رولوکا کی روداد ختم ہو گئی تو میں نے کہا۔

"اب اس عورت کی تلاش کرنا ہو گی....."

"یہ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ اوپر آنے کے جو راستے بنائے جا رہے تھے۔ وہ تو اب بند ہو ہی جائیں گے۔ ایک بنا بنایا راستہ یہی رہ جاتا ہے۔ وہ کبھی نہ کبھی یہاں ضرور آئے گی۔ کیونکہ اس کو آخر اپنوں سے رابطہ بھی تو کرنا ہو گا اور میں یہاں پر اس سے ملاقات کروں گا....."

"تو اس کا مطلب ہوا تم یہیں پر ڈیرہ ڈالو گے۔" میں نے مذاق کیا۔

"کام تو پورا کرنا ہے۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، میں بھی رکتا ہوں۔ واپس تو ساتھ ہی چلیں گے۔" میں واپس ٹھکانے پر چلا آیا۔

☆.....☆.....☆

تین دن کے بعد میرے کارندے نے بتایا وہ ادھر ہی آ رہی ہے۔ آج بھی اماوس کی کالی رات تھی۔ پوری آبادی سوئی ہوئی تھی۔ باغ اور کھیت کی طرف ہو کا عالم تھا۔ میں کنویں کی منڈیر پر بیٹھا تھا۔ میرے سامنے وہ میدان تھا۔ جس میں کبھی ایک بھیانک مکان ہوا کرتا تھا۔ میں روپوشی کی حالت میں تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اتنی بڑی ساحرہ نہیں کہ مجھے دیکھ سکے۔ وہ باغ کی طرف سے آ رہی تھی۔ اس کے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا۔ اس کی دنیا کا یہ قومی لباس تھا۔ اندھیرے میں بھی وہ دور سے بڑی پرکشش نظر آتی تھی۔ اس کی چال میں لہراہٹ تھی۔ اس کا سینہ ہر قدم پر رزش کرتا تھا۔ ہماری دنیا کا مرد اس کو دیکھ کر دیوانہ ہو سکتا تھا۔ وہ سیدھی چلی آ رہی تھی۔ اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بے خوف ہے۔ پہلے وہ حسب عادت مکان کی طرف مڑ گئی۔ مگر مکان نہ پا کر ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی اور حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اور پھر پالتی مار کر زمین پر بیٹھ گئی۔ زمین پر اس نے اپنی انگلی سے کچھ بنایا اور ایک باریک آواز حلق سے نکالی۔ اس کے آواز نکالنے کے چند لمحوں میں اس کے سامنے کئی بونے اور چھٹے آدمی نظر آنے لگے۔

اس نے اپنی زبان میں ان سے کچھ باتیں کیں اور وہ بونے میدان میں پھیل گئے۔ وہ عورت اسی انداز میں زمین پر بیٹھی رہی۔ کچھ ہی دیر میں سارے بونے واپس آ گئے اور کچھ بتانے لگے، میں اتنی دور تھا کہ ان کی آواز نہیں سن سکتا تھا۔

اب عورت کھڑی ہو گئی اور زمین کھودنے لگی۔ میں کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے بونے بھی ہاتھوں سے زمین کھود رہے تھے۔ میں چاہتا تو اس کو روک بھی دیتا مگر میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ لوگ کرتے کیا ہیں۔ وہ ساری رات یہ کام کرتے رہے، صبح کے آثار نظر آتے ہی وہ عورت باغ کی طرف چلی گئی اور وہ بونے ہوا میں تحلیل ہو گئے۔

سورج نکل آیا تھا۔ میں میدان کے اس طرف گیا جہاں پر یہ لوگ کھدائی کر رہے تھے۔ میں نے جھانک کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ بغیر کسی اوزار کے اور صرف ایک رات میں صرف ہاتھوں سے میرے اندازے کے مطابق چالیس پچاس فٹ کنواں وہ کھود چکے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ واپس جانے کا راستہ بنا رہی تھی۔ اس کو پتا تھا کہ پرانا راستہ بند ہو چکا ہے اور اس میں چونا بھرا ہوا ہے۔

SP صاحب کو بلا کر میں نے دکھایا۔ وہ بھی یہ سن کر حیران رہ گئے کہ یہ کنواں صرف ہاتھوں کی مدد سے ایک رات میں بنایا گیا ہے۔

دن میں میں نے یہ کام کیا کہ مزدور لگا کر اس کو بند

کروانا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ کالا تیل منگوایا اور مٹی کے ساتھ ساتھ وہ بھی ڈلوایا۔ جب کنواں بند ہو گیا تو پسا ہوا چونا ایک ایک فٹ میدان میں پھیلا دیا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ باغ میں موجود ہے اور ساری کارروائی ضرور دیکھ رہی ہے۔ مگر شاید اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ اگر دیکھا ہوتا تو دوبارہ نہ آتی مگر رات میں وہ پھر آئی۔ آج اس کے ساتھ زیادہ بونے تھے۔ یہ بونے کہاں سے آ گئے، کچھ پتا نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کے پاس ایسی طاقت تھی جو بونے لے آتی تھی۔ اس نے آتے ہی سارے میدان کا چکر لگایا۔ زمین کو کھود کر دیکھا۔ چونا اس کے ہاتھوں پر لگ گیا۔ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ سارے بونے میدان کے باہر چلے گئے۔ وہ بھی جانے لگی تو میں نے زوردار آواز میں کہا۔ "پھر کوشش کر لے، پھر نہ کہنا موقع نہ دیا۔"

"تو کون ہے سامنے آ۔" وہ غصے سے بولی۔

"ہماری دنیا کا یہ دستور ہے کہ ہم کسی ننگی عورت کے سامنے نہیں آتے، سخت بے حیائی سمجھی جاتی ہے۔ تو اور تیری قوم تو ننگی پیدا ہوتی ہے اور ننگی مر جاتی ہے۔ تیرا باپ بھی ننگا تھا۔ اور تیری قوم کو بھی میں نے دیکھا ہے تو خود کو بڑا ہوشیار اور چالاک سمجھتی ہے۔ تو نے یہ دنیا ابھی پوری کہاں دیکھی ہے۔ تیرا علم اور چالاکی ایک مینڈک کی طرح ہے جو چند فٹ کے جوہڑ میں رہ کر اس کو بہت بڑا خیال کرتی ہے۔ بے وقوف اس روشن دنیا میں ایک سے ایک عقل مند رہتا ہے۔ زمین کا سینہ چیر کر غذا پیدا کرتا ہے تو نے وہ کچھ کھایا ہو گا، یہاں جس کا تصور تیری قوم نہیں کر سکتی۔ اگر تو اور تیرا بے وقوف باپ اچھی اور نیک نیت سے آئے ہوتے تو ہم تجھے سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ تجھ کو علم و ہنر سکھاتے، اپنا مہمان بناتے، مگر تو تو راج کرنے آئی ہے۔ کتنے حیرت کی بات ہے کہ چند بونے اس ترقی یافتہ زمین پر حکومت کرنے آئے ہیں۔ تیرا علم صرف اتنا ہے کہ یہاں کے بچے بھی تجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ یہ بونے اور تو سب ہی اپنی جان سے جائیں گے۔ اب بول کیا کہتی ہے۔"

"میرا اور میرے باپ کا اندازہ غلط تھا۔ یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔" وہ بولی۔

"تو نے صرف اس چھوٹے سے قصبے کو ہی دنیا سمجھ لیا تھا۔"

"شروع میں ایسا ہی تھا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ مجھے اندازہ ہوتا گیا۔ مگر میرا باپ یہی کہتا تھا کہ میرا علم میری مدد کرے گا۔ میں کامیاب ہو جاؤں گی۔" وہ بولی۔

"تو تو اپنی علم اور طاقت کو استعمال کر لے۔" میں نے کہا۔

"نہیں سب بے کار ہے۔ یہاں کا آدمی صرف ہاتھ ہی نہیں رکھتا۔ عقل بھی رکھتا ہے۔ یہاں وہ ہے جو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اب میں لڑ نہیں سکتی، میں واپس جانا چاہتی ہوں۔" وہ بولی۔

"واپسی کے سارے دروازے بند ہیں تو نے کچھ انسانوں کی جان لی ہے۔ یہاں پر جان لینا جرم ہے جو جان لیتا ہے، اس کو سزا ملتی ہے۔ تو خود کو میرے حوالے کر دے اور یاد رکھ، تیرا جو علم تو لے کر آئی تھی، وہ سب ختم ہو چکا ہے تو ایک عورت ہے اور ہر عورت کے لئے لباس ضروری ہے۔" اور پھر اس عورت کا وجود ختم ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

ہر تصور کا ایک وجود ہے لیکن انسانی دماغ محدود ہے۔ ہر چیز کی حقیقت کو نہیں سمجھ پاتا۔ بے شک وہ اپنے طور پر معروف عمل رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ سب کچھ سمجھ گیا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ اس کائنات میں کروڑوں پراسرار کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ ہر کہانی کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔ مگر انسانی دماغ نہ تو ہر کہانیوں کو سمجھ سکتا ہے نا وجہ اس کی سمجھ میں آتی ہے۔ رب کائنات نے انسان کے لئے ہر چیز مسخر کر دی ہے، علم کا خزانہ انسان کو دیا ہے مگر قدرت نے کچھ باتیں صرف اپنے ہاتھ میں رکھی ہیں۔ جو علم انسانوں کی بھلائی کے لئے ہیں وہ سب دیئے ہیں۔ مگر ساتھ ساتھ کچھ بندشیں، کچھ پابندیاں بھی رکھی ہیں، کہاں تک جانا ہے۔ جو لوگ بتائے گئے طریقوں اور راستوں پر چلتے ہیں، وہ منزل پا لیتے ہیں اور جو اپنا عقلی گھوڑا استعمال کرتے ہیں وہ بھٹک جاتے ہیں

READING CORNER
http://readingcorner.blogspot.com/

اور اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ مہاراج کرشن گوپال کا بڑا نام تھا۔ بات کاروباری ہو، سیاست کی ہو، معاملہ شادی بیاہ کا ہو یا عدالت کچہری کا چکر آپس کا دنگا فساد ہو، سب کے بارے میں مہاراج کرشن گوپال پیش گوئیاں کر دیا کرتے تھے اور اپنے علم کے زور پر عدالت کے فیصلے بدل دیا کرتے تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ جو کام نہ ہونے کا ہو، وہ مہاراج کر دیا کرتے ہیں۔ پورے انبالہ شہر میں کون تھا جو ان کو نہیں جانتا۔ یوپی اور پنجاب کے علاوہ ان کو دلی اور اس کے اطراف میں بھی لوگ جانتے تھے، ان کا کام پکا ہوتا تھا۔

ان کے پاس جو آتا تھا وہ اس کو پہلے بتا دیا کرتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس کو بدلنا ہے تو یہ شرطیں ہوں گی، وہ پارٹی دیکھ کر بات کرتے تھے۔ کوئی معمولی آدمی ان کے در تک جانے کی کوشش نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ ان کی طلب پوری نہیں کر سکتا تھا۔

حکیم خان یوں تو خاندانی آدمی تھے۔ کچھ زمینداری بھی تھی اور انبالے میں کاروبار بھی تھا۔ اس شہر کے پرانے شرفاء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ بڑے سکون اور آرام کی زندگی انہوں نے گزاری تھی۔ بزرگوں کے بتائے راستے پر چل کر وہ بڑھاپے کی منزل پر آ چکے تھے۔ ان کی چار لڑکیاں بڑی تھیں۔ ان کی بڑی دھوم سے شادیاں کر چکے تھے۔ لڑکیوں کے بعد دو لڑکے تھے۔ بڑے کی شادی ہو چکی تھی اور وہ صاحب اولاد تھا۔ چھوٹا ذرا کھلنڈرا واقع ہوا تھا۔ شادی کے نام سے بدکتا تھا۔ اس کے تصور میں بیوی کا جو خاکہ تھا، ویسی لڑکی اس کو اب تک نظر نہیں آئی تھی۔ سب بھائی بہنوں نے کوشش کر لی مگر وہ راضی نہ ہوا۔ اس کا ایک ہی جواب تھا کہ جب میرا آئیڈیل مل جائے گا میں سب کو بتا دوں گا۔ حکیم خان گو کہ روایتی باپ تھے۔ انہوں نے اپنے باپ کے حکم کے آگے سر جھکایا تھا۔ ان کی ساری اولادوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ مگر سخت گیری حکیم خان کے مزاج میں نہیں تھی۔ ان کو یہ تو بہت اچھا لگتا تھا کہ ان کی سب اولادیں ان کے کہنے کو حرف آخر مانتی ہیں۔ وہ اسی لئے اپنی سب اولادوں سے محبت کرتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے اب تک اپنے چھوٹے بیٹے اجمل خان سے براہِ راست گفتگو نہیں کی تھی۔ ان کے دل میں یہ خوف تھا کہ کہیں میری بات کو وہ ٹھکرا نہ دے۔ پھر میں کیا کروں گا۔

اس پر کوئی بڑی ذمہ داری بھی نہ تھی۔ سیر و تفریح اور تقریبات میں شرکت اس کو اپنی آئیڈیل کی تلاش تھی۔ شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے۔ آخر اس کو بھی ایک حسین صورت لڑکی اس کے تصور کے عین مطابق نظر آ گئی۔ وہ اس کی طرف اس طرح چلا جیسے وہ ایک چھوٹی سی کیل ہو اور وہ لڑکی بڑا سا مقناطیس۔ وہ اس کے قریب جا کر سٹپٹا سا گیا۔ کیا بات کرے، سلسلہ کلام کہاں سے شروع کرے۔ ایک تر کیب اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ جاتے ہی بولا۔

"تم یہاں ہو، جمیلہ! میں تم کو وہاں تلاش کر رہا تھا۔"

لڑکی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ "میں جمیلہ نہیں ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔"

اب باتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "آپ مذاق اچھا کرتی ہیں۔"

لڑکی کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ غصے سے بولی۔ "میرا ہاتھ بھی بہت بھاری ہے۔"

"آپ تو ناراض ہو رہی ہیں۔ میں تو آپ کو اپنی جمیلہ ہی سمجھا تھا۔"

"تو اب آپ یہ بھی سمجھ لیں کہ میں جمیلہ نہیں ہوں۔" وہ بولی۔

"اگر آپ جمیلہ نہیں تو پھر کون ہیں؟" اجمل نے موقع کے اعتبار سے سوال کر دیا۔

"میں کون ہوں؟ اس سے آپ کو غرض نہیں ہونی چاہئے۔ آپ کے لئے میرا پہلا جواب ہی کافی ہونا چاہئے اور ہاں اس طرح کسی سے راہ و رسم نہیں بڑھائی جاتی۔ یہ نہایت چھچھورا اور گھٹیا طریقہ ہے۔" اور وہ لڑکی ایک طرف چلی گئی۔ اجمل کی آواز ایک دم بند ہو گئی۔ منزل نظر تو آئی مگر پھر اور دور ہو گئی۔ اتنے بڑے شہر میں اس کو تلاش کرنا ہی مشکل کام ہے۔

اب اجمل کو صرف اس لڑکی کی تلاش تھی۔ وہ دن بھر

شہر کے چکر کاٹتا رہتا۔ ہر اس مقام پر جاتا، جہاں پر عورتیں جانا پسند کرتی ہیں۔ مگر گوہر مقصود اس کو پھر بھی نظر نہیں آیا۔ دن بدن اس کی حالت بدلتی گئی۔ بڑے بھائی نے اس کے بدلتے رنگ ڈھنگ باپ کو بتائے پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو بھائی نے پوچھا۔

"کیا بات ہے اجمل تم آج کل بہت پریشان پریشان رہتے ہو؟" وہ خاموش رہا، بھائی کا اصرار بڑھا تو وہ بولا۔

"بھائی جان مجھے میرا آئیڈیل نظر آ گیا تھا مگر پھر چند منٹوں میں اس شہر نے اس کو نگل لیا۔ میں اس کو تلاش کر رہا ہوں۔"

"اچھا وہ کون تھی؟ اس کا نام پتا کچھ ہو تو بتاؤ، بات ہم آگے چلاتے ہیں۔"

"مجھے یہی پتا ہوتا تو پھر تلاش کی ضرورت کیا تھی۔" اجمل نے جواب دیا۔

"اس طرح تو تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔" بھائی نے کہا۔

"ہاں ہے تو مگر میری طلب صادق ہوئی تو میں ضرور تلاش کر لوں گا۔"

"عقل کی بات کرو اجمل۔ یہ شہر ہے اور کیا پتا وہ شہر میں کسی سے ملنے آئی ہو، واپس چلی گئی ہو۔ ذرا ہوش کرو، ایک سے ایک اچھی لڑکی تم کو مل جائے گی۔ تمہاری بھابی تمہاری پسند کی لڑکی تلاش کرے گی۔ تم ان چکروں کو چھوڑو اور اپنا گھر بساؤ۔ ابا بھی تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ کچھ ان کا ہی خیال کرو۔" بھائی نے سمجھایا۔ مگر اجمل کی سمجھ میں خاک نہیں آیا۔ وہ بولا۔

"اب تو میں اسی سے شادی کروں گا، وہ کون ہے ایک نہ ایک دن تو ملے گی میں ساری عمر اس کو تلاش کروں گا۔ اس نے مجھے ضدی بنایا ہے۔ میں اس کی دی ہوئی چیز کو ٹھکراؤں نہیں۔" وہ بولا۔

"تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" بھائی بولا اور اس نے اجمل کی پوری کیفیت باپ کو بتا دی۔ اب تو حکیم خان کے طوطے اڑ گئے۔ یہ کیا ہوا۔ بیٹا عشق کا روگ لگا بیٹھا ہے۔ جس لڑکی کا اتا پتا نہیں۔ اس کو تلاش کر رہا ہے۔ وہ بیٹے کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ مگر کس طرح مدد کریں گے۔ یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے بہت غور کیا۔ بہت سوچا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

آخر انہوں نے اجمل سے بات کرنے کی ٹھان لی۔ ایک دن صبح ہی صبح وہ اس کے کمرے میں چلے گئے۔ اجمل موجود تھا۔ وہ بولے۔ "بیٹا تمہاری پریشانی اور تلاش کا مجھے پتا ہے۔ میں تمہاری مدد کرنا بھی چاہتا ہوں۔ بتاؤ تمہارے لئے میں کیا کروں۔" اجمل کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ خاموش رہا۔

"دیکھو بیٹا انسان اس دنیا میں آتا ہے وہ اپنی مرضی سے نہیں آتا۔ مگر جب وہ آ جاتا ہے تو اس کو زندگی تو گزارنی ہوتی ہے۔ زندگی گزارنے کے کچھ اصول اور قاعدے اللہ نے بنائے ہیں اور کچھ ہمارا معاشرہ ہم کو سکھاتا ہے۔ ہم ہر معاملے میں خود مختار نہیں ہوتے۔ ان اصولوں اور قاعدوں پر چلنا پڑتا ہے۔ جو ان سے انحراف کرتے ہیں۔ ان کا مقام کچھ نہیں ہوتا۔ انسان اس دنیا میں آ کر تکلیفیں برداشت کرتا ہے۔ کچھ تکلیف اس کی اپنی غلطی کی وجہ سے وارد ہوتی ہے اور کچھ تکلیف قدرت کی طرف سے آتی ہے۔ ان تکلیفوں کو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ انسانی زندگی میں نکھار پیدا کرتی ہیں۔ مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان توکل کا دامن نہ چھوڑے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک انعام اور ہے۔ وہ ہے صبر کا دامن نہ چھوڑنے کا اپنی عقل کو استعمال کر کے بے وجہ اور بے قاعدہ کسی سمت دوڑ نہ لگائے۔ پہلے نشانہ درست کر لے اور پھر کوشش کرے۔ تمہارے پاس نہ منزل کا نشان ہے اور نہ نام ہے تم خود غور کرو۔ اس صورت میں تمہاری مدد کرنے والے بھی کیا کریں گے۔ دیوانہ ہی بننے کا شوق ہے تو کسی عورت کا دیوانہ نہ بنو۔ رب کا دیوانہ بنو۔ اتنی چاہت اور لگن رب کے پانے میں صرف کرتے تو شاید کچھ نہ کچھ پا لیتے۔ رب کا کچھ نشان تو تمہارے پاس ہے بے نشان تم کب تک بھاگو گے۔ فضول کی دوڑ بھاگ سے کچھ ملنے والا نہیں ہے۔ میرے بڑھاپے کا خیال نہیں کرتے تو نہ کرو مگر اپنی جوانی کا تو خیال کرو۔" اجمل باپ کی

READING CORNER
http://readingcornerblogspot.com/

سچی کھری باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

مگر یہ بھوت اترنے والا نہ تھا۔ وہ جتنی کوشش اس کے بھولنے کو کرتا تھا۔ وہ ظالم اتنی ہی اس کے قریب آتی تھی۔ اجمل دن بدن گرتا ہی جا رہا تھا۔ اس کی وجہ سے پورا گھرانہ پریشان تھا کہ اچانک حکیم خان کے ذہن میں مہاراج کرشن گوپال کا خیال آ گیا۔ بے شک ان کا علاج بہت مہنگا تھا۔ مگر بیٹے کی زندگی سے زیادہ نہیں تھا اور وہ ان کے پاس چلے گئے۔ مہاراج نے پوری روداد سننے کے بعد کہا۔

"تم کیا چاہتے ہو، لڑکا اس لڑکی کو بھول جائے یا لڑکی کو تلاش کیا جائے۔"

"دونوں صورتیں مجھے منظور ہیں۔" حکیم خان نے جواب دیا۔

"پہلی صورت ذرا خطرناک ہے۔ کیونکہ لڑکا عشق کے موذی مرض میں مبتلا ہے۔ اس کو اس کا ماضی بھلایا جا سکتا ہے مگر زندگی کے کسی بھی دور میں اس کو پھر کبھی بھی یاد آ سکتا ہے۔ اس وقت بڑی خطرناک صورت حال ہوگی۔ شعور سے تو اس کے ماضی کو مٹایا جا سکتا ہے مگر لاشعور میں تو رہے گا اور کبھی نہ کبھی پھر شعور میں پلٹ سکتا ہے۔"

"اور دوسری صورت بھی بتائیں۔" حکیم خان نے پوچھا۔

"لڑکی کو تلاش کرنا ہوگا۔" مہاراج نے جواب دیا۔

"اس کو کس طرح تلاش کریں گے۔" حکیم خان بولے۔

"یہ کام تم خود کرو گے۔" مہاراج بولے۔

"اگر ہم کر سکتے تو ہم کرا چکے ہوتے۔" حکیم خان بولے۔

"دیکھو یہاں سے لڑکی کا کوئی لباس یا اس کے استعمال کی کوئی چیز آپ کے پاس ہوتی تو میں کچھ کر سکتا تھا۔ اب تو بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے والی بات ہے۔" مہاراج بولے۔

حکیم خان نا امید ہو کر واپس آ گئے اور اجمل کی حالت گرتی گئی اور وہ اس کو لے کر دلی آ گئے اور مجھ سے ملاقات کی۔ عجیب کیس تھا۔ نہ نام نہ پتا اور عشق انتہائی درجے پر آ گیا تھا۔ رولو کا نے اجمل کو دیکھا تو فوراً کہا۔

"اجمل مرد بنو! وہ لڑکی ضرور ملے گی مگر شرط یہ ہے کہ تم اس کے قابل تو بنو۔"

اجمل نے آہستہ سے کہا۔ "میں کیا کروں۔"

"تم یہ کرو کہ خود کو صحت مند کرو۔ جیسے تھے ویسے بنو اور پھر میں تلاش کرتا ہوں۔ انبالہ تو کیا پورے ہندوستان میں دیکھا جا سکتا ہے۔"

اور اجمل کی آس کی ڈوری جو ٹوٹنے کے قریب تھی۔ پھر جڑ گئی اور وہ تیزی سے صحت مند ہوتا گیا اور پھر وہ پہلے والا اجمل تھا۔ رولو کا اس کو لے کر انبالہ آ گیا اور بولا۔

"اب بتاؤ وہ لڑکی کس تقریب میں ملی تھی اور وہ تقریب کس کے گھر ہوئی تھی۔"

اجمل نے بتایا۔ "وہ ایک شادی کی تقریب تھی اور سیٹھ پنالال سائیکل والے کے گھر پر تھی۔" اور رولو کا اس کو ساتھ لے کر پنالال کے خوبصورت بنگلے میں پہنچ گیا۔ اس گھر کے لوگوں کے لئے وہ دونوں ہی اجنبی تھے۔ رولو کا نے کہنا شروع کیا۔

"ہم لوگ جس غرض سے آئے ہیں آپ ضرور اس کو سن کر حیران ہوں گے مگر ہماری مجبوری سمجھ کر آپ ہمیں معاف کر دینا۔ بعض اوقات انسان اس مقام پر آ جاتا ہے کہ نہ بولے تو زندہ نہیں رہتا اور بولتا ہے تو بے عزتی کا ڈر رہتا ہے۔ آپ اگر ہماری مدد کر دیں گے تو اس سے ایک زندگی بچ جائے گی۔ آپ نے سنا ہوگا، بعض بیماریوں کے جراثیم اتنی تیزی سے اثر کرتے ہیں کہ انسان دیکھتے ہی دیکھتے مرنے کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ یہ لڑکا بھی اسی قسم کے ایک جراثیم کا شکار ہوا ہے۔ اس کا علاج جاری ہے مگر اس بیماری کا تریاق نہیں ملا ہے۔" رولو کا آگے کچھ اور کہتا کہ صاحب خانہ بنا لال کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ بولا۔ "میری سمجھ میں اب تک آپ کی بات نہیں آئی، صاف صاف بات کریں تاکہ میں کچھ سمجھ سکوں۔"

"آپ کے گھر ایک تقریب ہوئی تھی۔" رولو کا نے پوچھا۔

"ہاں ہوئی تھی۔" پنالال نے جواب دیا۔

وہ تقریب سات ماہ پہلے ہوئی تھی۔ اس میں حکیم خان اور یہ ان کا لڑکا بھی شریک تھے۔" رولو کا نے کہا۔

"ہاں میں حکیم خان کو جانتا ہوں۔ ضرور شریک ہوں گے۔" پنالال نے کہا۔

"اس تقریب میں کچھ خواتین لڑکیاں بھی تھیں۔ یہ لڑکا کسی لڑکی کو دیکھ کر پاگل ہو گیا ہے۔ وہ کون تھی، کیا نام تھا، کچھ پتا نہیں ہے۔ چند جملوں کی ان کی بات چیت ہے۔ میں نے عرض کیا تھا۔ وہ عشق کا جراثیم اثر کر گیا ہے۔ یہ موت کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ایک امید کی ڈوری نے اس کو پھر ٹھیک کر دیا ہے آپ ایک زندگی بچانا چاہتے ہیں تو جو کچھ مدد کر سکتے ہیں، کر دیں۔ اس کا اجر ہم تو کیا دیں گے مگر آپ کو ملے گا ضرور....." رولو کا نے کہا۔

"آپ ذرا انتظار کریں۔ میری لڑکی نے مہمانوں کی لسٹ بنائی تھی، اگر وہ لسٹ مل گئی تو شاید آپ کے کچھ کام آ جائے۔ اور ان کی لڑکی ایک ڈائری اٹھا لائی اور بولی۔

"پاپو ان کی قسمت اچھی ہے۔ میں نے سب کے نام اس ڈائری میں لکھے تھے۔" وہ کوئی ایک سو نام تھے اور سب ہی انبالہ شہر کے معزز شہری تھے۔ رولو کا نے وہ سب نام لے لئے۔

پنالال کا شکریہ ادا کیا اور چلے آئے۔ اب نمبر وار سب کو چیک کرنا تھا۔ رولو کا کے کام کرنے کے انداز کو حکیم خان نے بھی سراہا اور کہا۔ "کمال ہے، یہ طریقہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔"

نمبر ایک پر ایک ریٹائرڈ کرنل اور ان کی دھرم پتنی تھی۔ دونوں اس کے مکان پر چلے گئے۔ رولو کا نے کہا کہ سات مہینے پہلے آپ ایک تقریب میں گئے تھے۔ وہ تقریب سیٹھ پنالال کے گھر پر ہوئی تھی۔ رولو کا نے بات شروع کی۔

کرنل کردار سنگھ فوجی آدمی ہتھے سے اکھڑ گئے، غصے سے بولے۔

"پھر اسیں کی گناہ کر لیا۔ دعوت آئی سی تاں اسیں گئے ساں۔"

"آپ ناراض نہ ہوں صرف یہ بتا دیں، آپ اپنی بیگم کے ساتھ گئے تھے یا آپ کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔"

رولو کا نے بات مختصر کرنے کی کوشش کی۔

"ہور کون ہوگا ساڈی تو کوئی اولاد ہی نہیں، کلے ہی ہیں۔" کرنل صاحب اداسی سے بولے۔

اور رولو کا اٹھ کھڑا ہوا۔

پچاس لوگوں کو چیک کر لیا۔ جن کے ساتھ عورتیں لڑکیاں ساتھ گئی تھیں۔ ان سے بھی کسی نہ کسی طرح ملاقات کر لی مگر ابھی منزل دور تھی۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، ہر روز وہ دونوں لوگوں کے گھروں پر جاتے رہے۔ آخر نوے کے بعد بشیر کے گھر پر تھے۔ رولو کا نے اپنی پرانی تقریر دہرائی تو بشیر خان نے کہا۔ "میاں ہمارے گھر پٹنہ سے کچھ مہمان آئے تھے، وہ بھی ہمارے ساتھ گئے تھے، ہم سب تو تمہارے سامنے ہیں، ان کو تو پیش نہیں کر سکتے۔"

"آپ ان کا پٹنہ کا پتہ بتا دیں تو ہم ان سے خود ہی رابطہ کر لیں گے۔" رولو کا بولا۔

اور پٹنہ کا پتہ رولو کا کو مل گیا اور وہ دونوں پہلی فرصت میں پٹنہ روانہ ہو گئے۔ آدم پور ایک اچھی اور پڑھے لکھے لوگوں کی آبادی ہے۔ یہاں اختر حسین بزاز کا مکان تلاش کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ اختر حسین خود گھر پر تھے۔ رولو کا نے بتایا کہ ہم انبالے سے آئے ہیں۔ اختر حسین نے ان کو عزت سے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور پوچھا۔ "اب بتائیں کیسے آنا ہوا۔"

رولو کا نے کہا۔ "بات بڑی سنجیدہ ہے۔ یہ نوجوان جو میرے ساتھ ہے، اس کا نام اجمل ہے اور اس کے باپ کا نام حکیم خان ہے۔ انبالے کے کھاتے پیتے گھرانے سے اس کا تعلق ہے۔ سلسلہ اس کی زندگی اور موت کا آن پڑا ہے۔ سات مہینے پہلے یہ ایک تقریب میں گیا تھا۔ آپ کا خاندان بھی اس تقریب میں گیا تھا۔ آپ لوگ پنالال کے مہمان تھے۔"

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

"ٹھیک کہا آپ نے، وہ میرے کاروباری ساتھی ہیں۔ میں اکثر ان کے گھر جاتا رہتا ہوں۔ آگے فرمایئے۔" اختر حسین نے جواب دیا۔

"آپ بھی نوجوانی کے دور سے گزرے ہیں، جانتے ہوں گے۔ اس دور میں نوجوان اپنی شریک حیات کا ایک خاکہ اپنے ذہن میں بنا لیتے ہیں۔ یہ سب نہیں کرتے مگر جو ذرا آرٹسٹک ذہن رکھتے ہیں وہ تو ضرور ایسا کرتے ہیں کہ ان میں سے بہت سے تو وقت کے ساتھ ساتھ ڈھل جاتے ہیں اور وہ خیالی خاکہ یاد پارینہ بن جاتا ہے مگر کچھ اس کو پانے کے لئے سالوں بلکہ زندگی بھر انتظار کرتے ہیں۔ یہ نوجوان بھی ان میں شامل ہوتا ہے۔ بڑی مشکل سے اس کو اپنا خیالی آئیڈیل نظر آیا اور صرف چند منٹ کے لئے کچھ جملوں کا تبادلہ بھی ہوا۔ اس کو نہیں پتا وہ کون تھی، کیا نام تھا، کہاں سے آئی تھی اور اس نے اس کی تلاش شروع کر دی مگر کچھ پتا نہ چلا، جس کا کچھ اتا پتا ہی نہ ہو۔ اس کو تلاش کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ یہ تھک گیا اور بیمار پڑ گیا۔ اس کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ اس کا علاج صرف اس کا آئیڈیل تھا۔

یہ مریض کی شکل میں میرے پاس آیا۔ میں دلی میں مطب کرتا ہوں۔ مریض کا اگر مرض ختم کر دیا جائے تو وہ ٹھیک ہوتا ہے۔ مرض برقرار رہے تو صحت وقتی ہوتی۔ اس کا مرض مجھے پتا چل گیا اور میں اس کی دوائی کی تلاش میں پھرتا رہا۔ انبالے کے نوے گھروں کے چکر لگانے کے بعد آپ کا پتا ملا اور ہم دوڑے آپ کی طرف۔ بات ذرا لمبی ضرور ہو گئی ہے۔ مگر یہ سب آپ کو بتانا بھی ضروری تھا۔ آپ صرف یہ سمجھ لیں کہ یہ لڑکا عشق کا مریض ہے اور اس کا مرض بہت خطرناک منزل پر ہے۔" رولو کا نے بات ختم کی تو اختر حسین نے ایک گہری اور لمبی سانس لی۔ چند منٹ خاموشی رہی اور پھر بولے۔

"میری بیوی کے علاوہ میرے ساتھ دو لڑکیاں تھیں۔ ایک میری لڑکی تھی جس کی شادی ہو چکی ہے اور ایک میرے بھائی کی لڑکی تھی۔ ان کی ملاقات کس لڑکی سے ہوئی، پتا نہیں مگر میں دونوں کو ان کے سامنے لے آتا ہوں۔ شرط یہ ہوگی کہ یہ خود پر قابو رکھیں اور آداب کا خیال کریں۔" اختر حسین نے کہا۔

"میں اس بات کی گارنٹی لیتا ہوں، نہ ہم تماشا بنیں گے نہ آپ کو پچھتانا پڑے گا۔" رولو کا نے کہا۔

"آپ ذرا انتظار کریں، چائے وغیرہ سے شوق کریں۔" اور وہ اندر چلے گئے اور اس کے بعد ایک نوکر نما عورت بڑے قرینے سے چائے اور کچھ کھانے کی اشیاء رکھ گئی۔ ایک گھنٹے کے بعد اختر حسین آ گئے، آتے ہی بولے۔

"معافی چاہتا ہوں، میری لڑکی جس کا نام رونق ہے، اس کو سسرال سے لانا تھا اور بھائی کی لڑکی جس کا نام امینہ ہے۔ اس کو بھی لانا تھا۔ اس لئے آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ میں ان دونوں کو بلاتا ہوں۔ برائے مہربانی میری بات کا خیال رکھئے۔" اور اختر حسین نے آواز دی۔ "بیٹی رونق آ جاؤ۔" پہلے جو لڑکی کمرے میں داخل ہوئی، وہ رونق تھی۔ اس کے آنے سے اجمل کے چہرے پر کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہ لڑکی نہیں ہے۔ اس کے بعد جو لڑکی کمرے میں آئی۔ اس کو دیکھ کر اجمل بے چین ہو گیا۔ وہ ایک نازک سی لڑکی تھی، جیسے موم کی گڑیا۔ میرے ساتھ ساتھ اختر حسین بھی اجمل کے تاثرات کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ اجمل نے خود کو کس طرح کنٹرول کیا۔ اس کی ذہنی کش مکش اور بے چینی اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر پاس ادب اس کو روکے ہوئے تھا۔ چند منٹ یہ کیفیت رہی۔ دونوں لڑکیوں کی بھی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ امینہ بھی حیرت سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کو کیا پتا تھا کہ اس کی تلاش میں ہم نے کتنی پریشانیاں اٹھائی ہیں۔ اس تک آنے میں کہاں کہاں کی دھول جھونکی ہے۔ وہ معصومیت سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس سکوت کے پردے کو اختر حسین نے چاک کیا اور کہا۔ "اچھا بیٹا تم جاؤ اور امینہ بیٹا تم بھی کھانا کھا کر جانا۔" وہ دونوں چلی گئیں تو اختر حسین نے ایک لمبی سانس لی اور بولے۔

"آپ شاید اندازہ نہ کر سکیں کہ میں پل صراط سے گزرا ہوں۔ امینہ کی جگہ رونق ہوتی تو میرا کیا حشر ہوتا۔ میں

کیا کرتا، یہ سوچ کر ہی دماغ بھک سے اڑ جاتا ہے۔" اختر حسین نے کہا۔

"میں آپ کی پوزیشن کو سمجھ رہا تھا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میری وجہ سے آپ اتنی ذہنی پریشانی میں مبتلا ہوئے۔" رولو کا نے جواب دیا۔

اب تک اجمل خاموش تھا۔ لڑکیوں کے جاتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہو گئے تھے۔ مگر چہرے پر رونق سی آ گئی تھی۔ آخر وہ منزل پر آ پہنچا تھا۔ اس کی آنکھوں نے دوبارہ اس کو دیکھا تھا۔ وہ حسرتوں کا شکار اب بھی تھا۔ اس کے جذبے کی گہرائی شاید کوئی نہ سمجھ سکے۔ بس اب اس کی ذات کی تسکین کے لئے اتنا بھی کافی تھا۔ اس کی مرکز نگاہ کا کچھ تو پتا چلا۔ آگے کیا ہونے والا ہے۔ یہ اس کی قسمت پر ہے۔ اس کے لئے صرف اتنا سہارا ہی کافی تھا کہ اس کا نام امینہ ہے اور وہ پٹنہ شہر میں رہتی ہے۔ وہ اتنے پر ہی صبر کر سکتا تھا۔

"اب بتاؤ تم نے کس کو دیکھا تھا۔" اختر حسین نے جانتے بوجھتے یہ سوال اجمل سے کر دیا۔

اجمل خاموش رہا تو وہ پھر بولے۔ "زبان سے کچھ تو بولو۔"

"میں نے امینہ کو دیکھا تھا۔" اجمل نے جواب دیا۔

"مگر اس نے تو تم کو نہیں پہچانا۔" وہ بولے۔

"چند منٹ کی ملاقات کو وہ کیونکر یاد رکھیں گی۔" اجمل نے کہا۔

"مگر تم نے تو چند منٹ کی ملاقات کے بعد زندگی تک ہارنے کا ارادہ کر لیا۔" اجمل خاموش رہا تو میں نے کہا۔

"کسی کو چاہنا گناہ نہیں ہے مگر ذہن آلودہ نہ ہو۔ خیال کی پاکیزگی بہت ضروری ہے۔"

"بے شک آپ نے درست کہا۔" اختر حسین نے جواب دیا۔

"اختر صاحب یہ ایک خاندانی لڑکا ہے۔ اگر اس کو اس کا مرکز نگاہ آئیڈیل نہ ملا تو یہ کچھ نہیں کرے گا۔ کسی کی بربادی کا باعث نہیں بنے گا۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ اس بات کے گواہ آپ اور میں ہی ہوں گے۔ اختر صاحب کوئی دیوانہ اپنی دیوانگی کو نہیں سمجھ سکتا۔ کوئی سمجھائے تو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اس کی زندگی اور موت کے درمیان آپ کی ذات ہے۔ آپ اگر چاہیں تو اس کو گوہر مقصود مل سکتا ہے۔ میں نے شاید اچھے الفاظ میں اپنا مدعا بیان نہیں کیا مگر الفاظ کے الٹ پھیر سے بھی مطلب یہی نکلتا۔"

"جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ ابھی تک امینہ کا رشتہ نہیں ہوا ہے۔ میں بھائی صاحب سے ذکر کروں گا مگر اس میں دو چار روز لگ سکتے ہیں۔ آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔" اختر حسین نے جواب دیا۔

"ہم دو چار کیا۔ جب تک آپ فرمائیں گے، انتظار کریں گے۔" رولو کا نے جواب دیا۔

"تو پھر آپ غریب خانے پر آرام کریں۔ ہمارا شہر پٹنا دیکھیں۔"

اختر حسین شام کو ہی اپنے بڑے بھائی انور حسین کے پاس چلے گئے اور سلام دعا کے بعد بولے۔ "بھائی صاحب آپ نے امینہ کا رشتہ تو کسی کو نہیں دیا۔"

"نہیں ابھی تو نہیں دیا کیوں؟" انور حسین نے پوچھا۔

"ایک نہایت اچھا رشتہ آیا ہے۔ لڑکا انبالے کا ہے۔ گھرانہ کھاتا پیتا ہے۔ لڑکا پڑھا لکھا ہے۔ میں نے لڑکے کو دیکھا ہے۔ اچھی جوڑی بنتی ہے۔ عمر کا بھی میل ہے۔" اختر حسین نے ایک ہی سانس میں سب کچھ بتا دیا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم اس کے چچا ہو۔ اچھا ہی سوچا ہوگا مگر انسان کے ساتھ کچھ نہ کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ تم کیا، کوئی میری مجبوری نہیں جانتا۔ بات کچھ ایسی ہے کہ کسی کو بتائی بھی نہیں جا سکتی اور وہ بات میں تم کو بھی بتانے سے قاصر ہوں۔ تم صرف یہ سمجھ لو کہ اگر وہ مجبوری میرے ساتھ نہ ہوتی تو امینہ کی شادی رونق سے پہلے ہی ہو جاتی۔ میں نے اپنے تئیں کوشش بھی کی تھی۔ مگر وہ مجبوری آڑے آ گئی اور اچھا رشتہ ہاتھ سے نکل گیا۔" انور حسین نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

"بھائی صاحب! آپ نے بھی کچھ بتایا نہیں، کچھ تو

READING CORNER
http://readingcornerblogspot.com/

بتائیں میرے ذہن میں تو آندھیاں اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔" اختر حسین نے بے چینی سے کہا۔

"تم میری پوزیشن کا خیال کرو۔ میں کس کرب میں مبتلا ہوں۔ یہ کرب دوہرہ اس لئے ہے کہ کسی کو بتا ہی نہیں سکتا۔ بتانے پر جو مجھے جھیلنا ہوگا۔ اس کا سوچ کر ہی میں بے حال ہو جاتا ہوں۔" انور حسین نے جواب دیا۔

"بھائی صاحب، یہ سن کر میرا تو برا حال ہے۔ آپ اتنے بڑے کرب میں مبتلا ہیں اور آپ اکیلے ہی یہ مصیبت اٹھا رہے ہیں۔ میں کتنا بدنصیب ہوں کہ آپ کے کام نہیں آسکتا۔" اختر حسین نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"میاں تم صرف میرے حق میں دعا کرلیا کرو۔"

اختر حسین نے ہر طرح کوشش کرلی کہ انور حسین کچھ تو بتائیں مگر انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ آگے بات کرنے کی کوئی گنجائش نہ پاکر اختر حسین مایوس واپس آگئے اور پوری روداد رولوکا کو بتائی تو رولوکا نے کہا۔

"انسان پر مصیبتیں آتی رہتی ہیں۔ اکثر حالات میں انسان خود مصیبتوں کو دعوت دیتا ہے۔ اور بعض دفعہ حالات ایسے ہوتے ہیں کہ اس کو اپنی جنگ خود لڑنا پڑتی ہے۔ کسی کی بھی شرکت یا مدد اس کی انا کو مجروح کرتی ہے یا اس کو اور زیادہ حالات خراب ہونے کا ڈر ہوتا ہے۔ آپ میری ملاقات انور حسین صاحب سے کرادیں۔" رولوکا نے کہا۔

"میرے خیال میں تو بے کار ہی ہوگی۔ میں ان کا بھائی ہوں اور وہ نہ جانے کب سے یہ مصیبت جھیل رہے ہیں اور انہوں نے اس کا ذکر اب تک کسی سے نہیں کیا ہے۔ آپ کے سامنے وہ کیا بتائیں گے۔" اختر حسین بولے۔

"آپ کے اندازے درست ہیں مگر بعض اوقات اپنوں سے زیادہ غیروں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ کچھ بھی ہو، مگر ایسا ہوتا ہے۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، آپ کل میرے ساتھ چلیں۔" اختر حسین بولے اور دوسرے دن وہ دونوں انور حسین کے سامنے بیٹھے تھے۔

"انور صاحب آپ جس کرب میں مبتلا ہیں، میں اس کا اندازہ کرسکتا ہوں۔ وقت اور حالات گھٹن محرومیاں اندر ہی اندر پکنے والا آتش گیر مادہ جب انسان کے ذہن اور دماغ کی طرف بڑھتا ہے تو وہ بے قابو ہو جاتا ہے اور انسان اپنی سدھ بدھ کھو دیتا ہے۔ تمام دور اندیشیاں اور سود زیاں کا حساب کتاب دھرا رہ جاتا ہے۔ اگر اس پکتے لاوے کا رخ موڑ دیا جائے اور کسی پر بھروسہ کرلیا جائے تو پھر حالات یہ نہیں ہوتے۔ بے شک اور خطرناک حالات سامنے آجائیں۔ پھر لڑائی آمنے سامنے کی ہوتی ہے۔ اس میں فتح اور شکست دونوں کے مواقع ہوتے ہیں۔ آپ شاید میرے کہنے کا مطلب پوری طرح نہ سمجھ سکے ہوں تو عرض ہے کہ آپ کا جو بھی مسئلہ ہے، آپ مجھے بتائیں جو ڈر و خوف آپ کے ذہن میں ڈالا گیا ہے، اس کو بھول جائیں۔ دنیا میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کا حل نہ ہو۔ دنیا میں ایک ایسی قوت بھی ہے جو دنیاوی ہر قوت سے زیادہ قوی ہے۔ ساری کائنات اس کے اشارے پر چلتی ہے۔" رولوکا خاموش ہوگیا۔

کچھ دیر کمرے میں سکوت رہا۔ پھر انور حسین کی آواز آئی۔ "ہاں میں ڈر اور خوف میں مبتلا تھا۔ آپ کی باتیں میری سمجھ میں آرہی ہیں۔ ایسا کب تک چلے گا۔ میں کب تک کرب برداشت کروں۔ اس کا کچھ تو فیصلہ ہونا چاہئے۔

یہ دو سال پہلے کی بات ہے۔ کالج کی بہت سی لڑکیوں کے ساتھ امینہ بھی سیر کو گئی تھی۔ شام کو وہ واپس آگئی تھی۔ اس کے آنے کے بعد ایک آدمی میرے پاس آیا تھا۔ اس نے اپنا نام جمنا داس بتایا تھا۔ وہ پٹنہ کا نہیں تھا۔ زبان سے وہ گجرات کا لگتا تھا۔ اس نے آکے کہا تھا کہ میں سیٹھ جمنا داس ہوں۔ آج میں نے اپنی شادی کا فیصلہ کیا ہے۔" وہ بولا۔

"تو پھر مجھے بتانے کیوں آئے ہو، کرلو شادی سب کرتے ہیں۔" میں نے کہا تھا۔

"میں جس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا وہ نہیں ملتی تھی، اب ملی ہے اور وہ تیرے گھر میں رہتی ہے۔" وہ بولا۔

مجھے غصہ آگیا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر ایک زوردار تمانچہ لگا دیا تھا اور کہا تھا۔ تیری یہ جرأت کیونکر ہوئی تو ہندو ہے، میں مسلمان تیرا میرا کیا جوڑ۔"

وہ تمانچہ کھا کر بھی پرسکون تھا، بولا۔ "جوڑا تو اوپر بنتا ہے اور اپنے دین دھرم یہ سب بے کار چیزیں ہیں۔ انسان پیدائشی کچھ نہیں ہوتا۔ زمین پر آکر دھرم کے بھید بھاؤ پیدا کرتے ہیں۔"

"چل اٹھ اور بھاگ یہاں سے، میں مسلمان ہوں اور میری لڑکی بھی مسلمان ہے۔ میں کسی ہندو کو کیوں لڑکی دوں گا۔" یہ سن کر وہ کھڑا ہوگیا اور بولا۔

"دے گا تو ضرور میں پھر آؤں گا۔" اور اس وقت وہ چلا گیا تھا۔

تین دن کے بعد وہ پھر آگیا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی اور تھا۔ آتے ہی بولا۔ "آج یہ فیصلہ ہوگا کہ تو لڑکی دیتا ہے کہ نہیں۔"

"میرا فیصلہ تو سن چکا ہے، غیرت مند ہوتا تو نہ آتا۔" میں نے کہا۔

اس کے ساتھ جو آیا تھا وہ بولا۔ "زیادہ اونچا مت بول۔ تو لڑکی والا ہے، تیری لڑکی اسی کے گھر جائے گی اور اگر تو نے کسی اور سے اس کی شادی کرنے کی کوشش کی تو لڑکی پہلی رات ہی بیوہ ہو جائے گی۔ سوچ لے میں وقت دے رہا ہوں اور ہاں یہ بات کسی کو پتا نہ چلے، کسی کو تو نہیں بتائے گا۔ اگر بتایا تو پھر میں جلدی آجاؤں گا اور لڑکی کو لے کر ہی جاؤں گا۔ یہ میرا چیلا ہے۔ اس کا من تیری لڑکی پر آگیا ہے۔ شادی صرف اس سے ہوگی۔ سوچ لے راضی یا غیر راضی۔" اور وہ دونوں چلے گئے تھے۔

میں سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا کہ کس سے کہتا اور کہتا تو ڈر تھا وہ شیطان آجائے گا۔ کیا بتاؤں، وہ دونوں مجھے کتنے خطرناک لگتے تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں ملاقاتوں میں ان دونوں کو کسی نے نہیں دیکھا۔" انور حسین خاموش ہوگئے۔ "اس کا مطلب ہوا کہ وہ اب تمہارے پاس آئے گا۔" میں نے کہا۔

"اس نے یہی کہا تھا۔" انور حسین نے جواب دیا۔

میں نے اختر حسین سے کہا۔ "آپ واپس جائیں، عمل آپ کے پاس ہے۔ میں انور صاحب کے ساتھ رہوں گا۔" اور وہ واپس چلے گئے تو میں نے کہا۔

"انور صاحب میں اسی جگہ رات گزاروں گا۔ آپ لوگ آرام سے سو جائیں۔ اب یہاں پر کوئی نہیں آئے گا۔"

میرا کھانا انور صاحب نے بھیج دیا۔ میں کمرے سے نکل کر باہر آگیا۔ مگر اب میں روپوشی کی حالت میں تھا۔ میں نے دیکھا کہ رات کے پچھلے پہر ایک سایہ باہر نظر آیا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ وہ سایہ گھر کے اندر داخل ہوگیا اور انور حسین کے کمرے کی طرف چلا۔ مگر دروازے تک ہی پہنچا تھا کہ میں نے چھاپ لیا۔ اس کی کمزور جگہ پر میرا ہاتھ گیا تھا اور وہ بے بسی سے ہاتھ پیر چلا رہا تھا۔ میں اس کو اسی کمزور جگہ سے ناکارہ کرسکتا تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں اپنے کمرے میں اس کو لے آیا اور زمین پر پھینک دیا۔

"اب بتا تو کون ہے اور کیوں آیا تھا۔" وہ گرنے کے بعد پھر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی ڈراؤنی آواز میں اس نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا اور بولا۔

"ارے ہم سے پوچھتا ہے کہ کون ہے۔ ارے ہم ہیں تیرے باپ۔ ذرا سا پکڑ کیا لیا کہ شکتی دان بن گیا۔ اب کے تو پکڑ پھر بتائیں۔"

"زیادہ لمبی مت سنا۔ یہ بتا تو کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم پورن بھگت کے غلام ہیں۔ ایک سو اکہتر ہیں ہم، کس کس سے لڑے گا مورکھ، جو کرتے ہیں، کرنے دے نہیں تو بوٹی بوٹی ہو جائے گا۔" وہ غرور سے بولا۔

"اور پورن بھگت کس کے کہنے میں ہے۔ ذرا یہ بھی بتا دے۔" میں نے پوچھا۔

"ہم تیرے غلام ہیں کہ سب کچھ بتاتے رہیں۔" وہ بولا۔

"نہیں بتائے گا تو جائے گا سمندر کے بیچ۔" میں نے کہا۔

"کتنوں کو ڈالے گا۔" وہ بولا۔

"سب کو ڈال دوں گا۔" میں نے کہا۔

"بڑا آیا ڈالنے والا، تو ہمارے گورو کو نہیں جانتا۔"

وہ بولا۔

"بتا تو جانیں گے۔" میں نے کہا۔

"مہارج کرشن گوپال کو تو نہیں جانتا، تو جان لے اور ہمیں جانے دے۔"

انبالے کا کرشن گوپال اس کا مطلب تھا کہ اس کو سب پتا تھا۔ کتنا گھناؤنا کام وہ کر رہا تھا۔ دونوں پارٹیوں سے دولت کمانا چاہتا تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ "ٹھیک ہے کرشن گوپال میں انبالہ آ رہا ہوں۔" میں نے ایک کارندہ انور حسین کے گھر چھوڑا اور میں انبالے روانہ ہو گیا۔ میری جیب میں پورن بھگت کا چیلا بھی تھا۔

میں کرشن گوپال کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ وہ ایک بہت بڑے بنگلے میں رہتا تھا۔ بنگلے کا احاطہ بہت بڑا تھا اور بنگلے کے چاروں طرف باغ لگا ہوا تھا۔ میں نے دروازے پر کھڑے ایک آدمی سے کرشن گوپال کا پتا کیا تو وہ بولا۔

"مہاراج ابھی نہیں ملیں گے۔ ان کی ملاقات کا وقت شام چھ بجے شروع ہوتا ہے۔ اگر ان سے ملنا ہے تو اپنا نام پتہ اور کام لکھوا دو۔ ان کی آگیا ہو گی تو ملاقات ہو جائے گی۔"

"میرا کام ارجنٹ ہے، مجھے ابھی اسی وقت ملنا ہے۔" میں نے کہا تو وہ بولا۔

"ارے کیا دیوانہ ہوا ہے۔ ایسا آج تک نہیں ہوا کہ مہاراج کی آگیا کے بغیر کوئی ان سے ملا ہو۔"

میں اندر جانے لگا تو وہ بولا۔ "وہ سامنے جو آدمی گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھا ہے، اسی کو راضی کر لے، وہ اگر چاہے گا تو جلدی ملوا دے گا۔ میں نے یہ سن کر گردن ہلائی اور اس دھوتی پوش کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ماتھے پر تین پیلی لکیریں پڑی تھیں۔ دونوں کانوں میں سونے کی بندیاں پڑی تھیں اور جسمانی طور پر مضبوط تھا۔ چہرہ خون کی زیادتی سے سرخ ہو رہا تھا۔ میں اس کی صحت اور حالت سے اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کی کتنی آمدنی ہو گی۔ جب اس کا یہ حال ہے تو کرشن گوپال کا تو کیا کہنا۔ وہ اکڑ کر بولا۔ "کیا کام ہے کیوں آئے ہو؟" وہ بولا۔

"مہاراج سے ارجنٹ ملنا ہے۔" میں نے کہا۔

"مشکل ہے وہ جاپ میں ہیں۔ رات آٹھ بجے جاپ ختم ہو گا۔ اس کے بعد چار آدمیوں کو وقت دے چکا ہوں۔ آج اور کل تو ملاقات مشکل ہے۔ پرسوں رات آٹھ بجے کا وقت دے سکتا ہوں۔ ملاقات کی فیس جمع کرا دو۔"

"فیس کیا ہو گی؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"500 پانچ سو روپے اور سو روپے میرے۔" وہ بولا۔

"اگر میرے پاس نہ ہوں تو پھر کیا کروں۔" میں نے پوچھا۔

"تو پھر چلتے پھرتے نظر آؤ۔" وہ حقارت سے بولا۔

"دیکھو بھائی! اپن کا اور دھرم کا کام ہے۔ کچھ تو خیال کرو۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"ہم دھرم کا کام کرنے بیٹھے ہیں! اپن کا کام ہے تو کسی آشرم میں جاؤ۔ وہاں پر بہت دیوانے بیٹھے ہیں۔ کوئی تو تمہارا کام کر دے گا۔ چلو ہوا آنے دو۔" وہ نفرت سے بولا۔

میں جو پرکھ سکتا تھا، پرکھ چکا تھا۔ کرشن گوپال کا کاروبار سمجھ میں آگیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "تیرا نام کیا ہے؟"

اس سرخے کی تیوریوں پر ایک دم کئی بل پڑ گئے۔ وہ غصے سے بولا۔ "ابے تو جانتا ہے کہ کروں تیرا بندوبست۔"

"بندوبست تو میں کروں گا تو جس طرح ہے، اسی طرح میرے آنے تک رہے گا۔"

اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی اور میں اندر کی طرف چلا۔ میں سیدھا کرشن کے پاس بھی جا سکتا تھا مگر میں پہلے یہاں کے ماحول کو فضاء کو جانچنا چاہتا تھا۔

ایک بہت بڑے کمرے میں میں جا پہنچا۔ اس کمرے کی کھڑکیاں بند تھیں اور کالے پردے پڑے تھے۔ ان کالے پردوں پر ڈراؤنی شکلیں بنی ہوتی تھیں۔ کمرے میں رنگ بھی کالا کیا ہوا تھا۔ لوبان کی خوشبو سارے کمرے میں پھیلی ہوئی اور پورا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ گویا اس کمرے کا ماحول اس طرح بنا ہوا تھا کہ کوئی بھی سائل اندر

آ کر ڈر جائے۔ مجھے اندر آنے کو دروازے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اندھیرے میں دیکھا تو ایک چوکی درمیان میں پڑی ہے اور اس پر ایک آدمی آسن جمائے بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے لوبان جل رہا ہے اور ایک مٹی کا چراغ جل رہا ہے۔ کچھ پھول گیندے کے اس کے سامنے پڑے ہیں اور ایک پھولوں کا ہار اس کے گلے میں پڑا ہے۔ بدن سے وہ ننگا ہے اور زیر جامے کے طور پر صرف لنگوٹی باندھے ہوئے ہے۔ جسم سے وہ سانڈ کی طرح تگڑا ہے۔ اس کی نگاہیں مٹی کے چراغ پر ہیں۔

میں خاموشی سے اس کے سامنے چلا گیا۔ دیکھنا چاہتا تھا وہ مجھے دیکھ سکتا ہے کہ نہیں۔ مگر وہ میری آمد سے بے خبر تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر چراغ اٹھا لیا اور پھر پھونک مار کر بجھا دیا۔ چراغ کے بجھتے ہی وہ زور سے ڈکرایا۔ "ارے مار ڈالا...... کون ہے رے تو۔"

میں خاموش رہا اور سب کھڑکیاں کھول دیں اور پردے سرکا دیئے۔ چاند کی روشنی اندر آنے لگی تو ماحول تبدیل ہو گیا۔ ہر چیز صاف نظر آنے لگی۔ وہ منہ اوندھا کیے چوکی پر پڑا تھا۔

میں اس کے قریب چلا گیا اور بولا۔ "زیادہ فریب نہ کر تو مرے گا نہیں۔"

اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھنے کی کوشش کی اور کمزور آواز میں بولا۔ "سامنے تو آ! تو کون ہے چھپ کر وار کر گیا۔"

"میں نے وار کب کیا ہے، صرف تجھے جاپ سے روکا ہے۔" میں نے کہا۔

"اس دنیا کے ریت رواج نہیں جانتا۔ جاپ ادھورا رہ جائے تو سزا بھی ملتی ہے۔ تو نے مجھے نئی دبدا میں ڈال دیا ہے۔ اس جاپ کا بیر میرا دشمن ہو جائے گا۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ تو نے بہت مایا جمع کر لی ہے۔ تیرے نوکر کھا کھا کر سانڈ ہو رہے ہیں۔ کیا کرے گا، اس مایا کا۔ تیری ارتھی کے ساتھ جائے گی۔ تو نے جو راستہ اپنایا ہے وہ غلط ہے۔ اس راستے پر انسان، انسان نہیں رہتا۔ نفس کا غلام بن جاتا ہے۔ راہ سے بھٹک جاتا ہے۔ ماورائی قوت حاصل کرنا جتنا مشکل ہے۔ اس سے زیادہ مشکل ان کا استعمال ہے۔ یاد رکھ اندھیرے زیادہ پائیدار نہیں ہوتے۔ صبح ضرور ہوتی ہے۔ تجھے ابھی سے یہ ڈر لگتا ہے کہ قوت چھن نہ جائے۔ یاد رکھ یہ ڈر دن بدن بڑھتا جائے گا اور تیری غلامی کی زنجیریں مضبوط ہوتی جائیں گی۔ تیری واپسی کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔ تیرے پاس آخری موقعہ ہے۔ اپنے من کو اجلا کر لے، مایا کے پھیر سے نکل آ اور منش کی سیوا کو اپنا دھرم بنا لے۔ تیری منو کامنائیں، خود بخود پوری ہو جائیں گی۔ یاد رکھ تیرے ارد گرد ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ تجھے اس جال کو توڑنا ہو گا۔"

اس نے گردن سیدھی کر لی۔ اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں نفرت اور حقارت کے سوا کچھ نہ تھا۔ چند منٹ اس نے خود کو سنبھالا اور پھر بولا۔

"چھپ کر اپدیش دیتا ہے۔ مجھے انگلی پکڑ کر چلنا سکھاتا ہے تو اگر بکٹ ہے تو یاد رکھ میرا نام بھی مہارج کرشن ہے۔" وہ غصہ بھری آواز میں بولا۔

"مجھے تجھ پر رحم آتا ہے۔ کیا کرے گا اتنی مایا کا، تیرے آگے ناتھ نہ پیچھے پگہا۔ سب بیکار جائے گی۔" میں نے کہا۔

"تو اس کی فکر نہ کر تو اپنی فکر کر اس کمرے میں آ تو گیا ہے، جائے گا کیسے۔" وہ بولا۔

"میں جس طرح آیا تھا، چلا جاؤں گا تو کیا روکے گا۔" میں نے کہا۔

"میری شکتی کا اندازہ تو نے غلط لگایا ہے۔ میری شکتی اپرم پار ہے۔" وہ بولا۔

"تو اب بھی نادانی کی باتیں کرتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ بڑھی خود اعتمادی اکثر انسان کو لے ڈوبتی ہے۔ تیرا بھی یہی حال ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"جس کی جیب میں رقم ہو گی تو بولے گی بھی۔ خالی جیب کیا بولے گی۔" وہ غرور سے بولا۔

"تیری آدھی رقم تو خرچ ہو گئی۔ تو نے کالی کا جاپ

READING CORNER
http://readingcorner-pk.blogspot.com/

پورا نہیں کیا۔ وہ تو گئی اب چالیس دن تیرے قریب نہیں آئے گی اور تیرا ایک بیر میری جیب میں پڑا ہے۔"

میں نے آٹے کی گولی اس کی طرف اچھال دی۔ اس کے باقی ساتھی بھی اس جیسے بودے اور کمزور ہیں۔ "تو اب کیا کرے گا؟"

"میرے پاس اور بہت کچھ ہے۔ دیوانے میں ایک دو پر بھروسہ نہیں کرتا۔" وہ بولا۔

"اور اسی لئے تو کمزور ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ میری باتوں کو غور کرنا۔ پھر آؤں گا تو جواب تیار کر لینا، روک سکتا ہے تو روک لے۔"

اور میں کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر آتے ہی میرے سامنے ایک بہت بڑا بچھو آ گیا اور تیزی سے وہ بڑھنا شروع ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ راستہ بند ہوتا، الو نے اس کا ڈنک توڑ دیا۔ ڈنک توڑتے ہی وہ دھواں بن گیا اور میں واپس آ گیا اور راتوں رات واپس انور حسین کے پاس پہنچا اور میں نے اس سے کہا۔

"آپ یہ بتائیں کہ اگر میں اجمل کی شادی امینہ سے کرنا چاہوں تو آپ راضی ہیں؟"

انور حسین نے جواب دیا۔ "میں نے اب تک لڑکے کو دیکھا تک نہیں، ہاں کس طرح کر دوں۔"

"آپ کی بات مناسب ہے۔ لڑکا اسی شہر میں موجود ہے۔ میں آپ کے پاس لے آؤں گا۔" میں نے کہا۔ اور شام کو اختر حسین کے ساتھ اجمل آ گیا اور انور حسین نے لڑکے کو پسند کر لیا۔

"پھر آپ شادی کی تیاری کریں۔" میں نے کہا۔

"مجھے کیا تیاری کرنا ہے مگر اس سانپ کا کیا کریں۔" وہ بولے۔

"اس کا میں انتظام کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔

اختر حسین اور اجمل چلے گئے، میں وہیں پر تھا۔ آدھی رات گزری تھی کہ ایک آدمی دروازے پر آ گیا اور بولا۔ "میرا نام جمنا داس ہے۔ میں گجرات سے آیا ہوں۔ میری منگیتر یہاں رہتی ہے۔ اس سے ملنا ہے۔ اندر آنے دو۔"

میں سب سے پہلے دروازے پر پہنچا اور میں نے کہا۔

"تم ہندو ہو، کس ذات کے ہو؟" بتاؤ۔

"میں کھتری ہوں کھرا۔" وہ اکڑ کر بولا۔

"مگر یہاں آ کر کھوٹے ہو گئے، کیونکہ یہ گھر ایک مسلمان کا ہے، تم غلط گھر آ گئے ہو، واپس جاؤ۔" میں نے کہا۔

"تم کون ہو، لڑکی کے پتا کو بلاؤ۔ اس نے وعدہ خلافی کی ہے۔" وہ بولا۔

"کیا وعدہ خلافی کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا اور اب لگن کسی اور کے ساتھ کر رہا ہے۔" وہ بولا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ اس نے کسی سے کوئی وعدہ نہیں کیا، تم سے وعدہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ اس کی لڑکی ہے، وہ جس سے چاہے شادی کر دے، تم کون ہو روکنے ٹوکنے والے۔" میں نے کہا تو وہ غصے میں بولا۔

"میرے گرو سے اس نے وعدہ کیا تھا اور وقت مانگا تھا۔"

"تو اور تیرا گرو کون ہوتے ہیں، اس کے گھر کے معاملات میں دخل دینے والے۔" میں نے کہا۔

"تو کون ہے اس کے پتا کو بلا، اس سے بات کروں گا۔ وہ لڑکی میری پسند ہے، ہم کو جو پسند آ جائے، وہ ہماری ہو جاتی ہے۔ گرو کی کرپا سے تو بھی سمجھ لے کہ ہمارا گرو مہاراج کرشن ہے۔ اب بول کیا بولتا ہے؟"

"ارے ہم کیا بولیں تم نے تو نام لے کر ڈرا دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"بس کھسک گئی پھونک، لڑکی کے پتا کو بلا کے لا، جلدی کر۔" وہ غرور سے بولا۔

"لاتے ہیں تم اندر تو آ جاؤ۔" میں نے کہا۔

وہ اکڑتا ہوا کمرے کے اندر آ گیا۔ اندر اس کا استقبال ایک تیز ہوا نے کیا۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ وہ کھڑا نہیں ہو پا رہا تھا۔ وہ ہوا صرف اس کو لگ رہی تھی اور پھر وہ ہوا ایک

بگولے کی شکل اختیار کر گئی اور اس کو اڑا کر باہر لے آئی اور پھر بگولے کے چکر میں آ گئی اور چکر نے اس کو اوپر لے جانا شروع کر دیا۔ وہ ہاتھ پیر چلاتا رہا۔ بگولے کے چاروں طرف پھلجھڑیاں اڑ رہی تھیں۔ کوئی کوئی پھلجھڑی اس کے قریب بھی آئی مگر بگولے کا چکر اتنا تیز تھا کہ کوئی اس کو چھو نہیں سکتا تھا اور پھر کچھ ہی دیر میں وہاں کچھ نہیں تھا۔ کسی کو پتہ نہ چلا کہ ابھی کیا ڈرامہ ہوا۔ مہاراج کالا ڈلا کہاں چلا گیا۔

اجمل کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مہاراج کی طرف سے بھی خاموشی تھی۔ میں جانتا تھا کہ جمنا داس کی گمشدگی کرشن گوپال سے پوشیدہ نہیں ہوگی۔ وہ اس کی شہہ پر ہی آیا تھا۔ اس کی حفاظت کا بھی انتظام کیا گیا تھا مگر وہ غائب ہو گیا۔ مہاراج تاؤ کھا رہا ہوگا۔ وہ اچھی طرح سمجھ چکا ہے کہ انور حسین کا گھر خطرناک ہو گیا ہے۔ وہ نئے سرے سے نئی تیاریوں کے ساتھ وار کرنا چاہے گا۔ جنگ کا میدان کہاں ہوگا۔ اس کا بھی اس کو اندازہ نہیں تھا۔ ساتویں روز میں روپوشی کی حالت میں کرشن گوپال کے بنگلے میں گیا۔

ماحول وہی تھا۔ صرف پہرے سخت تھے مگر پہرے دار اندھے تھے۔ وہ میرا راستہ نہیں روک سکتے تھے۔ میں ایک کے بعد ایک کو سلاتا ہوا اس کے کمرہ میں تھا۔ اس کا کالا کمرہ حسب معمول اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور کرشن ایک دیا جلائے آسن جمائے ہوئے تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ آج پھر وہ کوئی جاپ کر رہا ہے۔ میں نے اچھی طرح چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ اپنے کارندوں کو ہوشیار کیا۔ حالانکہ وہ کبھی غافل نہیں ہوتے تھے اور میں اس کے سامنے چلا گیا۔ میرے جاتے ہی دیئے کی لو تھرائی اور کرشن نے آنکھیں چاروں طرف گھمائیں مگر وہ کچھ بھی نہ دیکھ سکا اور پھر منہ ہی منہ میں بدبدانے لگا۔ میں نے اچانک اپنا ہاتھ دیئے کی لو پر رکھ دیا۔ دیا بڑی زور سے بھڑکا ضرور مگر بجھ گیا اور میں نے دیا جیب میں رکھ لیا۔ اندھیرا ہوتے ہی کرشن کی آواز آئی۔ "ہائے مار ڈالا، ارے چھوڑ دے۔" چشم زدن میں کرشن گوپال اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا۔ اس کا غلام ہونے والا بیر اس پر سوار تھا اور اس کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ ہر منتر کا ایک بیر ہوتا ہے۔ کالا علم حاصل کرنا نہایت خطرناک کام ہے۔ بیرا گر الٹ جائے تو عامل بڑی مشکل میں پھنس جاتا ہے اور اگر قابو آ جائے تو بھینٹ مانگتا ہے۔ اس کو خوش کرنا پڑتا ہے، جب وہ کام کرتا ہے۔ جو جو کام کرتا ہے، وہ بدی کے ہوتے ہیں۔ نیکی کے کام اس کو بتا نہیں سکتے۔ اول تو وہ کرے گا نہیں اور اگر کر دیا تو جس کا کام ہوگا، اس کو نہیں چھوڑے گا۔ ہر صورت خراب ہوتی ہے۔ مگر یہ دولت اور طاقت کے لالچی پھر بھی باز نہیں آتے اور ان کا انجام بھی بہت بھیانک ہوتا ہے۔

وہ بیر ایک بندر کی شکل کا تھا۔ اس کی طاقت کا سر چشمہ وہ چراغ میری جیب میں تھا۔ وہ اس کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کو بھی پتہ نہیں تھا کہ ان دونوں کے علاوہ بھی کوئی ہے۔ وہ ضرور کرشن گوپال کا کام تمام کر دیتا مگر میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ میرا اصول ہے کہ میں کسی کو بھی مارنا نہیں چاہتا۔ پانی سر سے اونچا ہو جائے اور کوئی صورت باقی نہ رہ جائے تو دوسری بات ہے مگر یہاں ایسی صورت حال نہیں تھی۔

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ بندر نما بیر کرشن سے کیا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ میں نے جیب سے چراغ نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔ وہ چراغ دیکھ کر چراغ پر جھپٹا۔ مگر میں نے ہاتھ اوپر کر لیا۔ چراغ اس کو نظر آ رہا تھا مگر وہ چراغ ہوا میں معلق کس طرح تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ وہ ڈکراتا ہوا اچھل کود کر رہا تھا۔ کرشن نے بھی آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ بھی بندر کی اچھل کود دیکھ رہا تھا۔

"ٹھہر جا، زیادہ نہ اچھل کود کر، یہ تیرا ہے، تجھے مل جائے گا، تیری شکتی اس میں ہے۔ مجھے خبر ہے۔" بندر کھوں کھوں کرنے لگا۔ وہ ایک بہت بڑا بندر تھا۔ کھڑا ہو تو آدمی کے قد کے برابر ہو جائے۔ اس کا دہانہ خوفناک حد تک چوڑا تھا۔ شکل بھی بھیانک تھی اور رنگ سیاہ کالا تھا۔ چہرے کے اطراف سفید بالوں کی جھالر سی تھی۔ میرے کہنے سے وہ ایک جگہ ساکت ہو گیا۔

"دیکھ لے، کرشن گوپال تیرا بندر میرے اشارے پر ناچتا ہے تو اپنی جھوٹی شکتی پر کب تک گھمنڈ کرے گا۔ تیرے

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

سارے بندر میرے اشارے پر ناچیں گے اور جو بودے رکھوالے تو نے کھڑے کیے تھے، وہ سب آرام سے سو رہے ہیں۔ میں اگر چاہوں تو تیرا یہ بندر ہی تیرا کام تمام کردے، میں تیرے اس بندر کو آزاد کر رہا ہوں۔" اور پھر میں نے کہا۔

"سن رے ہنومان کی قوم کے جیالے، کہنا ہنومان سے کہ آئندہ دیکھ بھال کر کسی کی سہائتا کیا کرے۔ یہ لے چراغ اور بھاگ جا۔" اور میں نے اس کے اوپر چراغ ڈال دیا اور بندر نظروں سے غائب ہوگیا۔ اس دوران مہاراج کرشن نے یہ کام دکھایا کہ وہ ایک چیل کی شکل میں آسمان پر اڑ گیا۔ مگر پھر اسی کمرے سے ایک بگولا اٹھا اور آسمان تک اوپر چلا گیا اور کرشن گوپال جو چیل بنا ہوا تھا، اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اب وہ چیل بگولے میں اتنی تیزی سے چکر کھا رہی تھی کہ ایک نقطہ نظر آتی تھی اور پھر بگولے کی اونچائی کم ہونے لگی اور کم ہوتے ہوتے پندرہ بیس فٹ رہ گئی اور اچانک وہ بگولا ختم ہوگیا اور کرشن مہاراج زمین پر دھم سے گر پڑا۔ اس کا حال خراب تھا۔ اس نے آسمانوں میں اتنی تیزی سے گردش کی تھی کہ اس سے کھڑا تک نہیں ہوا جا رہا تھا۔ وہ زمین پر ایک مردے کی طرح پڑا تھا۔ میرے اشارے پر ایک کارندے نے اس پر پانی ڈالا تو اس نے کروٹ لی اور آنکھیں کھول پھر میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔

"تو نے دیکھ لی اپنی شکتی، اسی پر اترا تا تھا۔ جب برا وقت آتا ہے تو سایہ بھی ساتھ نہیں دیتا تو ہوائی شکتی پر ناز کرتا تھا۔ اس کے بل پر دولت کے ڈھیر لگا رہا تھا۔ وہ دولت تیرے کچھ کام آئی۔ اب بول۔" میں نے کہا۔

"میں ہار گیا تو کیا ہے، کون ہے میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میں کس سے مقابلہ کروں، کس پر وار کروں، میرے بیر اندھے ہوگئے ہیں۔ میں اندھا ہوگیا۔ میں ہار گیا۔" وہ بولا۔

"دنیا میں ایک سے ایک بڑی شکتی موجود ہے۔ سب نے بڑی شکتی اس کی ہے جس نے اس کائنات کو بنایا ہے، سجایا ہے، کوئی بھی اس کی بنائی کائنات کو ہزاروں، لاکھوں سال سے بگاڑ نہیں سکا۔ تیرے جیسے نہ جانے کتنے آئے اور چلے گئے اور ہاں تیرا وہ چیلا بھی اپنے گھر آ گیا ہے اس کا دماغ بھی اب ٹھیک ہے تو بھی اپنا چلن ٹھیک کر لے۔" میں نے کہا۔

"میں اب کچھ نہیں کروں گا۔ میں نے سبق پڑھ لیا ہے۔" وہ بولا۔

اور کچھ کرنے کے تو اب لائق بھی نہیں ہے۔ کیونکہ تیرے سارے کبوتر بگولا اڑا کر لے گیا ہے۔ انسانوں میں رہو اور انسانوں کی زندگی گزارو۔"

اور پھر چند دن بعد اینہ اور اجمل کی شادی سادگی سے ہوگئی۔ سارے لوگ خوش تھے اور خاص طور سے انور حسین جن کی جان عذاب سے چھوٹ گئی تھی۔ وہ میرے بڑے شکر گزار تھے۔

☆.....☆.....☆

دنیا میں انسان کا آنا اور رہنا ایک دلکش اور پرفریب خواب ہے۔ صرف ایک لمحے کا خواب مگر انسان اس کو سمجھ نہیں پایا۔ وہ اس لمحے کو ابدی سمجھنے لگتا ہے اور وہ کچھ کرنے لگتا ہے جو کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس کی سمجھ میں اتنی موٹی بات نہیں آتی کہ وہ کتنا محدود ہے نظر محدود ہے، دماغ محدود ہے، سماعت محدود کہاں پر لامحدود ہے۔ ہر مقام پر پابندی ہے۔ انسان ایک چار دیواری کے اندر ہے۔ اس کے باہر جانے پر پابندی ہے مگر انسان یہ نہیں سمجھتا، اس کی خواہشات لامحدود ہیں۔ وہ کسی مقام پر رکتا نہیں آگے اور آگے بڑھتا ہی رہتا ہے۔ آگے دیوار ہے وہ اس کو بھی پھلانگنا چاہتا ہے اور پھر منہ کے بل زمین پر گرتا ہے اور لمحہ ختم ہو جاتا ہے۔ خواب ٹوٹ جاتا ہے۔ شاید تب وہ سوچتا ہے کہ جواب تک تھا وہ تو خواب تھا۔ کاش پھر میں وہی خواب دیکھ سکوں۔ وہ لمحہ پھر مجھے مل جائے۔

جو لوگ عقل و دانش والے ہیں وہ یہ سب جانتے ہیں۔ ان کے طور طریقے زندگی کی آخری سانس تک مسافرانہ ہوتے ہیں۔ وہ خود کو دوران سفر ہی خیال کرتے ہیں اور وہی لوگ فائدے میں ہوتے ہیں۔

دنیا میں دولت کا حصول ایک بنیادی خرابی ہے۔

دولت کو صرف ایک مقام پر ایک کے پاس محدود کر دینا خرابی کی جڑ ہے۔ پھر اس کو حاصل کرنے والے پیدا ہو جاتے ہیں اور ایک سلسلہ جرائم کا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر طاقت کا زور چلتا ہے۔ ناتواں ہارتا ہے اور طاقتور جیتتا ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ کسی بھی چیز سے محرومی اس چیز کی طلب بڑھاتی ہے اور شدت بڑھاتی ہے اور پھر یہ ایک ضد بن جاتی ہے۔

نام تو ان کا رستم خان تھا مگر وہ ایسے نظر نہیں آئے تھے۔ ان کے باپ دادا نے زندگی بھر کمر پر مشک لاد کر لوگوں کے گھروں پر پانی بھرا تھا۔ اپنا رشتہ نظام سقہ سے جوڑتے تھے۔ وہی نظام سقہ جس نے ڈوبنے سے ہمایوں کی جان بچائی تھی اور پھر ڈھائی دن کو بادشاہ بنا دیا گیا تھا اور اس نے چمڑے کا سلسلہ جاری کر دیا تھا۔

وہ خود بھی لوگوں کے گھروں میں پانی بھرا کرتے تھے۔ مشک لے کر دروازے پر جاتے۔ آواز لگاتے بی بی پانی اور پھر ان کو اندر آنے دیا جاتا۔ وہ شرفاؤں کے گھروں کے اندر جانے والے آدمی تھے۔ ان کے رہن سہن اور گھروں کی سجاوٹ اور طور طریقوں کو دیکھتے تو دل پر سانپ لوٹ جاتے۔ سارے دن کمر پر مشک لادے گھروں میں پانی ڈالتے تو شام کو دو چار آنے ملتے۔ گھر آتے تو بیوی بھری بیٹھی ہوتی۔ وہ دن بھر بنی سنوری ناک نقشہ سے اچھی عورتوں کو دیکھ دیکھ کر خواب دیکھتے، گھر آتے تو میلی بدبودار کپڑے پہنے بیوی سے سامنا ہوتا، ان کا مزاج ہی بدل جاتا، وہ برا سا منہ بنا کر دن بھر کی پانی کی کمائی بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیتے اور بیوی روز ہی کہتی۔

"بس سارے دن میں تین آنے اس میں کیا تم کو کھلاؤں اور کیا لونڈیا اور لونڈے کو کھلاؤں۔ میں تو کچھ کھاتی ہی نہیں ہوں۔" رستم خان جل کر کہتے۔

"پہلے کے جھوٹے مرجاتے تھے، اب تو بخار بھی نہیں آتا۔"

"اے لو! میں نے کیا جھوٹ بول دیا۔" بیوی کہتی۔

"نہیں کھاتی تو سانڈ کیسے ہو رہی ہے، نیک بخت۔" رستم خان جواب دیتے۔

"ارے یہ تو میری کاٹھی ہی ایسی ہے۔ باپ کے گھر کی کھائی آئی ہوں۔ تم کیا کھلاؤ گے۔ تین آنے روز کماتے ہو اور باتیں نظام سقہ والی کرتے ہو۔"

"سن لے اچھی طرح یوں ہمارے بزرگوں کو بیچ میں نہ لانا۔ ورنہ خون خرابہ ہو جاوے گا۔" رستم خان پھن پھنا کر بولتے۔

"ارے مجھے کیا پڑی ہے کہ نام لوں ان کمبختوں کا۔" بیوی جواب دیتی۔

"کم بخت ہوگی تو اور تیرا خاندان۔" رستم خاں جواب دیتے۔

یہ سلسلہ روز کا تھا۔ رستم خاں کمائی کے نئے سے نئے طریقوں پر غور کرتے مگر قابل عمل کسی کو نہ پا کر شک اٹھا لیتے۔ مگر جس قدر کمزور مسکین سے نظر آتے تھے، اندر سے ایسے نہ تھے۔ ہر وقت ان کی کھوپڑی میں کچھ نہ کچھ پروگرام بنتا رہتا۔

انسان کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو سوچوں کا رخ بدل جاتا ہے۔ وہ ہر اس طریقہ پر غور کرنے لگتا ہے جس سے اس کی ضرورت پوری ہو سکتی ہو۔ اگر رستم خان پڑھا ہوتا تو اس کے سوچنے کا انداز بھی تعلیم کے مطابق ہوتا مگر یہ بچارہ ایک جاہل آدمی تھا۔ اس کی سوچ محدود تھی۔ وہ اگر جرائم پیشہ ہوتا تو کسی کے بھی گھر سے کچھ چرا لیتا۔

مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ روز روز کی درنا کل کل نے اس کو بہت سے راستے بتائے مگر اس کی ہمت ساتھ چھوڑ گئی۔ گوالیار میں راجہ کا راج چلتا ہے۔ یہاں پر زیادہ تر آبادی کسانوں اور دربار کے ملازم اور فوج کی ہے۔ ہندو ریاست میں مسلمانوں کی کون سنتا ہے۔ ان کی معاشی حالت یوں بھی خراب رہتی ہے مگر جو مسلمان پشت ہا پشت سے یہاں رہتے ہیں وہ کہاں جائیں۔ یوں تو ہر ماہ ہندوؤں کا کوئی نہ کوئی تہوار ہوتا ہے مگر ان تہواروں پر میلے بھی لگتے ہیں۔ موسم بہار کی آمد پر ان کا ایک تہوار ہوتا ہے اور اس خوشی میں ایک بڑا میلا بھی لگتا ہے گو کہ یہ علاقائی تہوار ہے اور علاقائی میلا ہوتا ہے۔ یہ میلا گوالیار شہر اور آگرہ کے درمیان

READING CORNER
http://readingcornerblogspot.com/

گوپی کشن نامی گاؤں کے قریب لگتا ہے۔ اس میں غریب امیر ہندو مسلمان سکھ عیسائی کسی پر پابندی نہیں ہوتی۔ سب لوگ شرکت کرتے ہیں۔ تفریح کے دن سب سامان ہوتے ہیں جو کہ میلوں میں ہوتا ہے۔

غریب لوگوں کے لئے یہ مفت کی تفریح ہوتی ہے۔ دو چار دن پہلے ہی تیاری شروع کر دیتے ہیں۔ کپڑے پرانے بھی ہوں تو بھی ان کو صابن سے دھولیا جاتا ہے۔ پھٹوں کو مرمت کرلیا جاتا ہے۔ اگر حجامت بڑھ گئی ہے تو بنا لیتے ہیں۔ میلے والے روز نہا دھو کر صاف کپڑے پہن لئے۔ سر میں اور ہاتھ پیروں پر خوب تیل لگالیا۔ کاجل بھر پور طریقوں پر آنکھوں میں بھر لیا اور چھیلا بن کر ٹولیوں کی شکل میں مذاق دل لگی کرتے چلے، میلے کو کوئی دس میل پیدل چل کر آیا کوئی پندرہ میل، میلا گاہ آنے سے پہلے پھر اپنی جھاڑ پونچھ کی اور چھیل چھبیلے بن گئے۔

اب ہنسی مذاق اور مٹر گشتی شروع ہوگئی۔ نہ اتنی دور آنے کی تھکن نہ واپس جانے کی تھکن کا احساس..... نیلی پیلی پگڑیاں اور رنگین ساڑیوں کی بہار کوئی پکوڑے کھا رہی ہے تو کوئی کنگھی چوٹی کا سودا کر رہی ہے۔ دو کانداروں کی دو کانوں پر مردوں سے زیادہ عورتوں کی بھیڑ ہے۔

مرد خریداری کم اور نظارہ بازی زیادہ کر رہے ہیں۔ لڑکوں کے وعدے پورے ہو رہے ہیں۔ لڑکیاں گھونگھٹ کی اوٹ سے حرکات اور سکنات سے اپنا مدعا بیان کر رہی ہیں۔ میلے کا مصرف بہت ہے۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ ایک طرف سادھو اپنا دھندا کر رہے ہیں۔ نجومی اور فال نکالنے والے خوب بے وقوف بنا رہے ہیں۔ کوئی اپنی جادوگری دکھا رہا ہے اور دیہاتی حیرت کی تصویر بنے دیکھ رہے ہیں۔

رستم خاں بھی میلے کے شوقین تھے۔ ان کی جیب میں ایک آنا تھا۔ ایک آنا پہلے ہی خرچ کر چکے تھے۔ اس ایک آنے میں میلا بھی دیکھنا تھا اور واپسی پر کچھ سوغات بیوی بچوں کے لئے بھی لے کر جانا تھا۔ اگر دوستوں کے ساتھ ہوتے تو وہ فلاش ہو چکے ہوتے۔

ہر چیز کو دیکھ کر دل للچا رہا تھا۔ کھانے کی چیزوں کی خوشبو اڑ رہی تھی۔ ان کا دل مچلا جا رہا تھا۔ اس لئے وہ اس طرف چل دیئے۔ جدھر رونق کم تھی اور بازار سے دور جگہ تھی۔ یہاں پر کچھ چھولداریاں پڑی تھیں۔ زمین پر آگ جل رہی تھی اور آگ کے پاس دو چار سادھو ٹائپ کے لوگ جسم پر دھول بھبوت ملے ننگے بیٹھے تھے۔ وہ ان کے پاس سے گزرنے لگا تو کسی نے اس کو آواز دی۔

"ٹھہر جا بچہ بڑا اکڑا پڑ رہا ہے۔ جیب میں ایک آنا لے کر اتنی اکڑ ٹھیک نہیں ہے۔"

رستم خاں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ تو پھر آواز آئی۔ "کھڑا کیا ہے ہمارے پاس تیرا ہی فائدہ ہے۔" رستم خاں تو پہلے ہی ایک آنے والی بات پر حیران تھا، کھڑا رہا تو پھر کہا گیا۔

"ارے ہم لینے نہیں، دینے کو بلاتے ہیں۔"

اب رستم سے کھڑا نہ رہا گیا اور وہ چھولداری کی طرف چلا گیا۔ درمیان میں آگ جل رہی تھی اور اس کے گرد پانچ بھبوت ملے سادھو ننگے بیٹھے تھے۔ اس کو پتہ نہیں تھا کہ اس کو کس نے بلایا تھا۔ وہ ان کے سامنے خاموش کھڑا ہو گیا۔ تو ان میں سے ایک کھڑا ہو گیا۔ اس کی داڑھی سب سے لمبی تھی اور ان میں عمر رسیدہ بھی معلوم ہوتا تھا۔ وہ چاروں آگ کے گرد بیٹھے رہے۔ لمبی داڑھی والے نے رستم کو چھولداری کے اندر آنے کا اشارہ کیا اور پہلے خود اندر چلا گیا۔ رستم خاں ذرا سا جھجکا مگر پھر چھولداری کا پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا۔ اندر ایک چٹائی پڑی تھی۔ اس پر وہ سادھو بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے سامنے رستم کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تو رستم بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر سادھو کی آواز آئی۔

"تیرے برے دن جانے کو ہیں اور مایا تیرے پاس آنے کو ہے۔ بول تجھے مایا کی ضرورت ہے۔"

رستم تو یہ سن کر نہال ہو گیا۔ سادھو کے پیر پکڑ کر بولا۔

"ہاں مہاراج ضرورت تو بہت ہے۔"

"تو پھر تو وہ کرے گا جو ہم بتلائیں گے۔" سادھو نے کہا۔

"میں تیار ہوں، آپ حکم کرو۔"

"ہم کچھ شبد بتاتے ہیں۔ ان کو یاد کر لینا۔ یاد کر لیگا تو آگے بتائیں گے۔" سادھو نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔" رستم نے کہا۔

اور سادھو مہاراج نے ایک ایک لفظ بتانا شروع کر دیا۔ رستم کے لئے یہ انوکھی زبان تھی۔ نرالے الفاظ تھے، اس کی زبان سے بڑی مشکلوں سے ادا ہو رہے تھے۔ یہ صرف سات لفظ تھے۔ مگر بڑی مشکلوں سے رستم کی زبان پر چڑھے اور پھر آہستہ آہستہ روانی آتی گئی۔ سادھو نے بڑی آہستگی سے اور بڑے صبر سکون کے ساتھ رستم کو یہ الفاظ یاد کرا دیئے اور بار بار ان کو سن لیا۔

"تجھے پہلا سبق یاد ہوا۔ کل میلا ختم ہو جائے گا۔ سب چلے جائیں گے مگر ہم تجھے یہیں پر ملیں گے۔ تیرا دوسرا سبق بتایا جائے گا۔ مگر ایک بات ہماری یاد رکھنا، ہمارے بارے میں یا اس سبق کے بارے میں کسی سے ذکر مت کرنا اور اگر تو نے ذکر کیا تو بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جائے گا اور اگر نہ کیا تو مایا تیری ہوگی تو اس دھرتی کا دھنوان ہوگا۔ میرے کہے کو پتھر کی لکیر سمجھنا، اب جا۔"

شام تو ہو ہی رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ ایک آنا خرچ کر کے کچھ سوغات خرید لوں اور اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو پورا ایک روپیہ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس روپے کو دیکھا۔ ایک تو ایک زمانے کے بعد پورے روپے کو دیکھ رہا تھا۔ دوسرے آنے کے بدلے پورا روپیہ اس کے پاس تھا۔ وہ تو آج کا امیر آدمی تھا۔ اس نے گھر کے لئے خوب خریداری کی۔ اس نے وہ کچھ خرید لیا جو کبھی نہیں خریدا تھا اور پیدل کی بجائے تانگے میں گھر آیا۔

بیوی تو دیکھ کر خوش ہوئی۔ آج پہلی بار اس نے رستم کو کچھ نہیں کہا۔ واری صدقے جاتی رہی۔ رستم نے دل میں سوچا کہ مایا تیرے تین نام، پرسا، پرسو، پرس رام۔ ابھی تو ابتدا ہے۔ آگے تو یہ عورت نہ جانے کیا کرے گی۔

بیوی کی مارے خوشی کے ساری بتیسی نظر آ رہی تھی۔ وہ بولی۔ "اے تم تو پورا میلا لوٹ کے آ گئے۔ اتنی رقم کہاں سے ملی، یہ تو بتاؤ۔"

رستم کو بیوی پر رعب جھاڑنے کا موقعہ چاہئے تھا۔ اکڑ کر کہا۔ "تو آم کھا، پیڑوں سے کیا لینا ہے۔"

"تم تو ناراض ہونے لگے۔ پوچھ لیا تو کیا گناہ کر دیا۔" وہ ناک سکوڑ کر بولی۔

"تو بھی سن لے اچھی طرح میں کسی طرح کماؤں، یہ مت پوچھنا، میرا کام ہے کمانا اور تیرا کام ہے کھانا، تو اپنا کام کر، میں اپنا کروں گا۔ ہرگز مت پوچھنا۔" رستم خان اکڑ گئے۔

"اچھا ٹھیک ہے، نہیں پوچھوں گی۔ آج تو تم کچھ نئے سے لگ رہے ہو۔" وہ بولی۔

"ہاں تو گھر میں رہنے والی عورت ذات بس اپنی حد میں رہنا۔ مجھ سے سوال جواب مت کرنا۔ تیرا کھانا پینا میں پورا کرتا آیا ہوں اور آگے بھی پورا کروں گا۔"

ابھی ایک روپے نے ہی بیوی پر رعب جما دیا۔ رستم خاں کی جیب میں اب بھی تین آنے پڑے تھے اور وہ خود کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے۔ آخر تین آنے کی رقم کے مالک تھے۔ دوسرے دن انہوں نے تین آنے بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور چل دیئے۔ گوپی کشن گاؤں کی طرف جہاں پر کل میلا اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ آج یہاں پر میلے کے بچے کھچے کچرے کے سوا کچھ نہ تھا۔ مگر ایک چھولداری اسی جگہ لگی ہوئی تھی اور اس کے دروازے پر آگ جل رہی تھی اور آگ کے اطراف پانچ سادھو کل کی طرح بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ سردی زیادہ نہیں تھی اور دھوپ بھی پھیل چکی تھی مگر یہ لوگ شاید رات سے اسی طرح بیٹھے تھے۔

رستم ان کے قریب چلا گیا تو وہی بوڑھا لمبی داڑھی والا اٹھ کر چھولداری کی طرف چلا اور اپنے ساتھ رستم کو آنے کا اشارہ کیا۔ پہلے بوڑھا اندر گیا۔ اس کے بعد رستم بھی اندر چلا گیا۔ اندر وہی چٹائی اسی طرح پڑی تھی۔ سادھو بیٹھ گیا تو وہ بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر سادھو نے اپنی کپکپاتی آواز میں کہا۔

"کل کا سبق سنا۔" رستم کو ساتوں لفظ اچھی طرح یاد تھے۔ اس نے فر فر سنا دیئے۔

READING CORNER http://readingcorner.blogspot.com

"شاباش۔" سادھو نے کہا۔ "ان سات شبد کو تو معمولی نہ سمجھنا، ان میں بہت بڑی شکتی چھپی ہے۔ وہ شکتی دھرتی کے اندر کی ہے۔ دھرتی کے اندر بے شمار خزانے دبے پڑے ہیں۔ جن کے بارے میں اب کوئی نہیں جانتا۔ مگر اس کے اندر رہنے والا ایک بیر جانتا ہے۔ وہی ان خزانوں کو نکال سکتا ہے۔ تیری کایا پلٹ جائے گی۔ تو نگری کا راجہ بن جائے گا۔ ہزاروں تیرے نوکر چاکر اور غلام ہوں گے تو سونے چاندی کے بستر پر سوئے گا اور من چاہا کھائے گا۔ من چاہا پہنے گا۔ باندیاں ہاتھ باندھے تیرے چاروں طرف کھڑی ہوں گی اور تو اپنی من چاہی کے ساتھ عیش کرے گا۔ تیری ہر خواہش پوری ہو جائے گی۔ مایا ہی ایک چیز ہے جس کے سب غلام ہیں۔"

مگر ہر چیز کا ایک مول ہوتا ہے۔ قیمت ہوتی ہے۔ کوئی چیز مفت میں نہیں ملتی۔ کچھ نہ کچھ تو دینا پڑتا ہے۔ تجھے یہ سب ملنے والا ہے۔ اتنا بھاری خزانہ لونڈی، باندیاں، نوکر چاکر، عیش و آرام مفت تو نہیں ملے گا۔ میں کچھ نہیں مانگتا، تیرا نام بدلنا چاہتا ہوں، بول راضی ہے۔" سادھو نے بات ختم کی۔

"کیا میرا نام اچھا نہیں ہے۔" رستم نے معصومیت سے پوچھا۔

"اچھا برا میں نہیں جانتا تو بتا بدل دوں۔" سادھو نے کہا۔

"مگر سب تو مجھے اسی نام سے جانتے ہیں۔" رستم نے جواب دیا۔

"میں زیادہ نہیں بدلوں گا تیرا نام رستم خاں سے رستم لال کر دیتا ہوں تو خود کو رستم لال کہے گا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ رستم تو اپنی جگہ برقرار ہے تجھے کیا فرق پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے سادھو مہاراج، رستم تو ہوں نا۔" وہ بولا۔

"تو بہت کامیاب ہوگا، بہت فرماں بردار آدمی ہے۔"

اب میں دوسرا سبق بتاتا ہوں، غور سے سن اور اچھی طرح سمجھ لے، بار بار پوچھ لے۔ جب اچھی طرح سمجھ جائے تو آگے قدم بڑھانا۔ تو نے جو شبد یاد کئے ہیں، وہی خزانے کی کنجی ہیں۔ ان شبدوں کو کسی پرانے مرگھٹ میں دریا کے کنارے بیٹھ کر پڑھنا ہے اور اماوس کی رات سے شروع کرنا ہے اور چالیس رات پڑھنا ہے۔ دن میں بھی مرگھٹ سے باہر نہیں آنا ہے۔ تیرے کھانے کا بندوبست ہم کریں گے۔ جسم کے کسی جگہ کے بال نہیں کاٹنے اور کوشش یہ کرنی ہے کہ تیرے اوپر کسی کی نظر نہ پڑے۔ اگر مردے جلانے والے آ جائیں تو چھپ جانا کسی کی نظر تجھ پر پڑے تو آنکھیں بند کر کے یہی شبد دل میں یاد کر لینا اور رات ہوتے ہی پھر پڑھنا شروع کر دینا۔ کتنی دفعہ پڑھے گا اس کی پابندی نہیں، جتنا زیادہ پڑھے گا، اتنا ہی جلدی تیرا کام ہوگا۔ تین راتیں کچھ نہ ہوگا۔ اس کے بعد تجھے بھلاوے میں ڈالنے کو تجھے ڈرایا جائے گا۔ تیری عورت کے روپ میں کوئی آئے گا، کوئی تیرے بچے کے روپ میں آئے گا مگر یہ سب صرف تجھے بھٹکانے کو ہوگا۔ ہر طرح تیری توجہ ہٹانے کو بہروپ بدل بدل کر تیرے سامنے تماشے ہوں گے مگر تجھے ہمت سے بیٹھے رہنا ہے اور شبد بولتے رہنا ہے۔ تیرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ جہاں پر تو آسن جمائے گا، وہیں پر میں کنڈل قائم کر دوں گا۔ بڑی سے بڑی شکتی بھی اس کنڈل کے اندر نہیں آ سکتی۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔ خوب اچھی طرح سمجھ لے، پوچھ لے۔ صرف ایک بات بہت ضروری ہے۔ وہ ہے کنڈل کے اندر رہنا اور شبد پڑھتے رہنا۔ کنڈل کے باہر کچھ ہو تو اس کی پروا نہیں کرے گا اور کنڈل کے اندر رہے گا۔ جب سورج نکل آئے تو کنڈل سے باہر آ سکتا ہے۔"

یہ سبق رستم کے لئے ذرا بڑا تھا۔ مگر اس نے سادھو کی باتوں کو غور سے سنا تھا۔ اس کے سامنے خزانہ پڑا تھا۔ وہ اس کو حاصل بھی کرنا چاہتا تھا۔ پھر سادھو کی بات کیوں نہ غور سے سنتا۔ اس نے ایک ایک بات کو گرہ میں باندھ لیا تھا۔

کئی دن وہ سادھو کے پاس جاتا رہا۔ سادھو الٹ پھیر کر کے سوالات کرتا رہا اور وہ ٹھیک ٹھیک جواب دیتا رہا۔ جب پکا ہو گیا تو پھر سادھو نے کہا۔

"بس اب تیری گانٹھ پکی ہے۔ اماوس کی رات کل ہے تو تیاری کر۔"

اور پھر رستم مرگھٹ کی طرف چل دیا۔ اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ دریائے جمنا کے کنارے گوالیار شہر سے باہر ایک قدیم مرگھٹ تھا۔ یہاں پر صرف ضرورت کے لئے ہی لوگ جاتے تھے۔ ایک تو یہ عام گزرگاہ سے ہٹ کر تھا۔ دوسرے اس مرگھٹ کی ہیبت بہت تھی۔ بہت بڑے کچھوے دریا کے کنارے پڑے رہتے تھے۔ وہ مردوں کو منٹوں میں کھا جاتا تھے۔ وہ اس قدر بے باک اور بے دھڑک ہو گئے تھے کہ زندوں پر بھی حملہ کر دیا کرتے تھے۔ بڑی ذات کے ہندو اور کھاتے پیتے لوگ تو مردے جلا دیا کرتے تھے مگر عام طور پر اتنا خرچ نہ اٹھانے والے مردے کو دریا میں بہاتے تھے اور یہ کچھوے ایسے مردوں کی تلاش میں کنارے پر بیٹھے رہتے تھے۔

رستم کو یہ سب پتہ تھا۔ سب سے پہلے تو دریا کنارے ایسی جگہ تلاش کرنا تھی، جہاں پر یہ کچھوے نہ ہوں اور پھر کام کرنا تھا۔ اسی لئے وہ دن کے وقت ہی مرگھٹ پر چلا گیا تھا۔

مرگھٹ میں دن کے وقت بھی ویرانی تھی۔ دریا کنارہ بھی بھیانک نظر آتا تھا۔ ویرانی اور نحوست برس رہی تھی۔ آسمان پر چیلیں اڑ رہی تھیں اور ایک طرف دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی مردہ جلایا جا رہا تھا۔ مگر کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ دریا کے کنارے کنارے ہوشیاری سے چل رہا تھا۔ کنارے پر ہی اس کو ایک چبوترا سا بنا نظر آ گیا۔ یہ ذرا زمین سے اونچا تھا اور سوکھا ہوا تھا۔ یہ جگہ اس کو پسند آ گئی۔ وہ وہیں پر بیٹھ گیا اور رات کا انتظار کرنے لگا..... اور اماوس کی بھیانک رات آ گئی۔ راتیں تو اندھیری ہی ہوتی ہیں مگر اماوس کی رات تو ایسی ہوتی ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ مرگھٹ میں دور دور روشنی کا نشان نہیں تھا۔ پانی بھی بے آواز بہہ رہا تھا۔ ہر طرف تنہائی اور ہیبت طاری تھی۔ ایک لامحدود خاموشی نے پورے مرگھٹ کو بہت پراسرار بنا دیا تھا۔ یہ رستم کی پہلی رات تھی۔ اس لئے اس پر کچھ زیادہ ہی اثر تھا۔ مگر سادھو کے بتائے طریقوں پر اس کو چلنا تھا۔ اس نے وہیں بیٹھ کر ساتوں الفاظ کی گردان شروع کر دی۔ اس کی نظر دریا پر تھی اور زبان پر سادھو کا بتایا ہوا منتر وہ اسی مقام پر بیٹھا رہا اور رات گزر گئی، کچھ نہ ہوا۔ سورج نکل آیا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مرگھٹ سے باہر جانے پر پابندی تھی۔ وہ سائے کی تلاش میں چل پڑا۔ یہ مرگھٹ بہت بڑا تھا۔ وہ چلتا گیا۔ ایک جگہ اسے چار دیواری نظر آ گئی۔ یہ چار دیواری نہایت بوسیدہ حالت میں تھی۔ اس کو کیوں بنایا گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ اس کے قریب چلا گیا۔ دیوار نے سایہ کر دیا تھا۔ پہلے وہ چار دیواری کے اندر گیا مگر وہاں پر کچھ نہیں تھا۔ وہ دیوار کے سائے میں بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اسے ایک آدمی اپنی طرف آتا نظر آیا۔ رستم اپنی جگہ بیٹھا رہا، وہ آدمی اس کے قریب آ گیا اور ایک پوٹلی اس کی طرف بڑھا دی۔ رستم نے اس سے کچھ نہیں پوچھا نہ آنے والے نے کچھ بتایا۔ رستم نے پوٹلی کھول لی، پوٹلی کے اندر ایک مٹی کا کٹورہ نما برتن رکھا تھا اور اس کے اندر کچھ تھا۔ رستم نے انگلی ڈال کر تھوڑا سا زبان پر رکھا نہ وہ نمکین تھا نہ میٹھا تھا۔ بھوک تو رستم کو لگ رہی تھی۔ وہ کھانے لگا۔ تھوڑا سا کھانے کے بعد وہ اس کو ٹھیک معلوم ہونے لگا اور وہ سب کھا گیا۔ اس نے کھایا کیا تھا، یہ پتہ نہیں تھا۔ وہ اسی دیوار کے کنارے لیٹ گیا اور شام تک سوتا رہا۔ رات ہوتے ہی وہ پھر اسی چبوترے پر چلا گیا اور منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ اس رات بھی کچھ نہ ہوا، رات سکون سے گزر گئی۔ حیرت کی بات یہ بھی تھی کہ کچھوے دور دور منڈلاتے رہے، اس کے قریب کوئی نہ آیا۔

چوتھی رات رستم نے منتر شروع ہی کیا تھا کہ دریا کی طرف سے ایک مگرمچھ آتا نظر آیا۔ وہ سیدھا اس کی طرف ہی آ رہا تھا۔ رستم اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ وہ بہت تیزی سے رستم کی طرف آیا تھا مگر چبوترے کے قریب آ کر رک گیا۔ رستم نے توجہ نہ دی اور منتر کا جاپ کرتا رہا۔ وہ مگرمچھ صبح تک اس کے قریب ہی پھرتا رہا اور صبح ہوتے ہی غائب ہو گیا۔ رستم سمجھ گیا کہ یہ مجھے صرف ڈرانے آیا تھا۔ سورج چڑھتے ہی وہ دیوار کے سائے میں چلا گیا۔ وہ پراسرار آدمی جو اس کا کھانا لاتا تھا،

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

وہیں پر تھا۔ رستم نے پوٹلی کھولی اور کھانے لگا۔ وہ چار روز سے کھار ہا تھا مگر اب تک اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا کھار ہا تھا۔ کھانے کا مزا بھی نرالا سا تھا۔ کبھی وہ نمکین لگتا، کبھی کچھ میٹھا، کبھی پھیکا، کبھی کبھی سخت بدبو محسوس ہوتی، کبھی زعفران کی تیز خوشبو آنے لگتی، وہ صرف صبح کھاتا تھا۔ سارے دن اس کو بھوک نہیں لگتی تھی اور رات کو بھی کھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی اور کسی قسم کی کمزوری بھی نہیں تھی۔ اب مرگھٹ کو دیکھ کر اسے خوف نہیں آتا تھا۔ وہ دن میں چاروں طرف گھومتا پھرتا تھا۔ اس کی توانائی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جسم فربہ ہو رہا تھا جو کپڑے وہ پہن کر آیا تھا، وہ اس کے جسم پر چپک گئے تھے۔ یہ صرف چند دن میں ہوا تھا۔ جسم کی رنگت میں بھی فرق پڑ رہا تھا۔ وہ صاف کلر کا تھا مگر اب کالا ہوتا جا رہا تھا۔ چہرہ بھی ہیئت بدل رہا تھا۔ گال پھول رہے تھے، سر کے بال اڑ رہے تھے۔ مگر جسم پر بال بڑھ رہے تھے۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ رستم اس ایک ماہ میں بالکل بدل گیا۔ بہت قریب کے لوگ بھی اس کو بہت غور سے دیکھنے پر ہی پہچان سکتے تھے۔ اس ایک ماہ میں رات میں اس پر کیا گزری وہی جانتا تھا۔ اب خزانہ صرف دس راتوں کی دوری پر تھا۔ رستم خاں جو اب رستم لال تھا، بڑی ثابت قدمی سے اپنا جاپ پورا کر رہا تھا۔ اس کے جسم پر اب صرف ایک جانگیہ رہ گیا تھا۔ یہ جانگیہ کبھی پاجامہ ہوا کرتا تھا۔ جوں جوں دن گزرتے گئے، جاپ مشکل ہوگیا۔ جسمانی ساخت کے فرق کے ساتھ ساتھ رستم خاں، رستم لال بنتا گیا اور پھر جاپ کی آخری رات آگئی۔ وہ ایک ایک رات کا حساب رکھ رہا تھا۔ وہ اس آخری رات میں سورج غروب ہوتے ہی چبوترے پر آگیا اور وقت سے پہلے ہی جاپ کرنا شروع کر دیا۔ جاپ شروع کرتے ہی اس کے چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ”ارے ہم بھی چلیں گے، دوسرا بولا۔ میں جاؤں گا۔“ پھر عورتوں کی آوازیں، بچوں کی آوازیں ایک شور برپا تھا۔ ہر طرف مگر رستم اپنے کام میں مصروف تھا۔ رات بارہ بجے ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ پھر ایک طرف سے کچھ لوگ آتے نظر آئے، وہ ایک لاش اٹھائے ہوئے تھے۔ آنے والوں نے وہ لاش چبوترے کے قریب رکھ دی۔ پھر کسی نے کہا۔ ”میاں اپنی بیوی کا آخری دیدار کر لو۔“ اور اس نے لاش پر سے کفن ہٹا دیا۔ یہ کون عورت ہے، رستم نے سوچا، دیکھا تو ہے کہیں، وہ خاموشی سے دیکھتا رہا اور منہ سے جاپ کرتا رہا۔ دوسرا آدمی بولا۔

”بڑا بے غیرت ہے، اپنی بیوی کو نہیں جانتا۔“ تو رستم کو یاد آگیا۔ ارے ہاں یہ تو میری بیوی ہے مگر پھر ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی اور وہ زور زور سے جاپ کے الفاظ بولنے لگا۔ ایک منٹ کے بعد ہی چبوترے کے پاس کچھ نہ تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد پھر لوگ آگئے۔ ان کے ساتھ دو بچے تھے۔ رستم نے ان کو دیکھا اور پہچان لیا۔ یہ تو میرے ہی بچے ہیں مگر فوراً ہی وہ سمجھ گیا کہ ابھی کچھ ڈرامہ یہ لوگ کریں گے، یہ سب مجھے روکنا چاہتے ہیں۔ وہ متواتر جاپ کرتا رہا۔

وہ لوگ چبوترے کے قریب آکر کھڑے ہوگئے۔ ایک بولا۔ ”دیکھ لو یہ ہے وہ بے غیرت تمہارا باپ، یہ تم کو نہیں بچائے گا۔“ دوسرا آگے بڑھا اور اس نے ایک تیز دھار چھری نکالی اور بولا۔ ”اس کی کلیجی میں کھاؤں گا۔“ دوسرا بولا۔ ”لڑکی کی کلیجی میں کھاؤں گا۔“ تیسرا بولا۔ ”بس اب تیاری کرو، یہ بے غیرت باپ جو خزانے کے لالچ میں بیٹھا ہے، ان دونوں کو نہیں بچائے گا۔ ہم کیوں اپنی دعوت خراب کریں۔“ اور ان لوگوں نے دونوں بچوں کو زمین پر لٹا دیا اور دونوں کے گلے پر چھری پھیر دی۔ رستم نے سب کچھ سمجھ کر بھی ایک جھٹکا کھایا مگر اپنی عادت کے مطابق اس کی زبان پر جاپ کے شبد ہی آتے رہے۔ اس کا چہرہ سرخ انگارہ ہوگیا۔ جسم میں تھرتھراہٹ پیدا ہوگئی۔ وہ پھر بھی اپنی جگہ جما رہا اور پھر زور سے ایک طرف سے کسی نے کہا۔ ”بھاگو!“ اور وہ سب بھاگے اور دونوں بچے جن کے گلے کٹ چکے تھے، وہ بھی اپنے اپنے سر اٹھا کر بھاگ گئے۔ رستم کے چہرے پر کامیابی کی مسکراہٹ آگئی۔ رات کا آخری پہر ہوگیا۔ آوازیں آنے لگیں۔ گانے کی آوازیں، ڈھول اور نفیری کی آوازیں، خوشی کے شادیانے بجائے جانے لگے۔ ہر طرف سے مبارک

مبارک ہونے لگی اور پھر سورج کی آمد کے ساتھ ہی رات کے سارے راہی غائب ہوگئے اور رستم چبوترے سے اتر کر دیوار کی طرف چل دیا۔

آج اس کا جاپ پورا ہوا۔ اب اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اب ہندوستان کے بادشاہوں کے پوشیدہ خزانوں کا وہ اکیلا مالک ہے۔ وہ خوشی میں سرشار دیوار کے سائے میں بیٹھا تھا۔ آج کھانا لانے والا آدمی ابھی تک نہیں آیا تھا۔

چند منٹ گزرے تھے کہ سامنے سے سادھو آتا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔ وہ رستم کے قریب آگیا اور بولا۔ ”مبارک ہو، رستم لال تو کامیاب ہوگیا ہے۔“

تیرا غلام بیرات کو تیری خدمت میں آجائے گا۔ یہ تیرا آخری بھوجن ہے جو تو یہاں کھائے گا، آج کے بعد تو اپنا بندوبست خود کرے گا۔ میں نے اپنا کام پورا کر دیا۔ تیرے پاس اب کسی چیز کی کمی نہیں رہے گی۔ پر تنو میری یہ بات ضرور یاد رکھنا کہ تیرا بیر تیرا ہر کام کرے گا مگر اس کو کسی مسجد میں، مندر میں یا کسی بھی دھرم کی جگہ ہرگز نہ بھیجنا، وہ نہیں جائے گا۔ تجھے دولت چاہئے، یہ تجھے مالا مال کر دے گا۔ اب میں نہیں ملوں گا۔“

اور سادھو چلا گیا۔ وہ دیوار کے زیر سایہ اکیلا بیٹھا رہا۔ کھانے کی پوٹلی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اپنی رانوں پر رکھ کر اس نے اس کو کھولا اور کھانے لگا۔ اب وہ اس مزے کا عادی ہوگیا تھا۔ مٹی کے کٹورے سے وہ انگلیوں کے ذریعہ یہ حلوہ نما چیز کھا رہا تھا۔ اب شاید پھر یہ چیز اسے کھانے کو نہیں ملے گی۔ پورے چالیس کٹورے اس نے اس انمول اور انوکھی چیز کو کھایا۔ اس میں گوشت کا مزا بھی تھا اور اناج کا بھی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سادھو سے پوچھا بھی نہیں کہ یہ کیا چیز ہے؟ یہ کتنی حیرت انگیز چیز ہے۔ میں واقعی رستم پہلوان بن گیا ہوں۔ رستم آنے والے دنوں کے پلان بناتا رہا۔ اس کو نہ بیوی یاد آرہی تھی نہ بچوں کا خیال تھا۔ شام ہوگئی۔ وہ چبوترے کی طرف چلا۔ مگر یہ کیا چبوترے پر پہلے سے کوئی موجود تھا۔ وہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ کون ہے، جس کا جسم ایک گینڈے کی طرح مضبوط ہے مگر کھوپڑی بہت چھوٹی ہے۔ وہ رستم کو دیکھ کر چبوترے سے اتر آیا اور گردن جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ رستم نے اس کو تعظیم کرتے دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ یہی ہے جس کے کارن چالیس راتیں میں نے یہاں گزاری ہیں۔ پھر بھی اس نے رعب سے کہا۔ ”تو کون ہے رے۔“

اس نے گردن اٹھائے بغیر جواب دیا۔ ”ہوں گے کون وہی ہیں جس کو تم نے یاد کیا ہے۔“

”کوئی تو تیرا نام ہوگا۔“ رستم نے پوچھا۔

”ہاں نام ہے ہمار، بھرت بھنڈاری۔“ وہ بولا۔

”بھرت بھنڈاری، اب تیرا میرا تو ساتھ رہے گا، اپنے بارے میں سب کچھ بتا دے تاکہ بار بار پوچھنا پڑے۔“ رستم نے کہا۔

”ہم بھرت بھنڈاری ہیں۔ دھرتی کے بھنڈار میں جو کچھ چھپا ہے، او کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں۔ کون بادشاہ کہاں مایا گاڑا ہے۔ ہم کا پتہ ہے۔ دو سو سال کے بعد ہم دھرتی سے باہر آئے ہیں۔ کوئی بلایا ہی نہیں۔ اب تو ہم تیرا غلام ہیں تو جو بولے گا کریں گے۔“ وہ بولا۔

”اچھا بھنڈاری تجھے سارے خزانوں کا پتا ہے۔“ رستم نے پوچھا۔

”ہاں جی سب پتا ہے۔ تم حکم کرو تو رانی جودھا بائی کے گہنے نکال کر لے آؤں۔ کہو تو شکنتلا کا پارہ نکال لاؤں۔ جھانسی کی رانی کا سارا زیور میری نظر میں ہے اور جس کا ہو، لے آؤں گا..... سب کچھ تیرا ہے۔ ایک بات یاد رکھنا، سب کچھ تیرا تو ہوگا مگر کسی پن کے کام میں ایک دمڑی خرچ مت کرنا، کرے گا تو سب پانی بن جائے گا اور تو پھر کنگال بن جائے گا اور میں پھر دھرتی کے اندر چلا جاؤں گا۔ تو راجہ ہے، عیش کر سب کو عیش کرا۔ ایک سے ایک ناری دھرتی پر موجود ہے تو جس کو چاہے گا، تیرے بستر پر آجائے گی، سونے کی چمک ان سب کو اندھا کر دے گی۔ سارے بھارت پر تیرا سکہ چلے گا۔ مگر میری بات کو گرہ میں باندھ لے۔ کرنا تجھے وہ پڑے گا جو میں کہوں گا..... اور میرا پیٹ بھرنا ہوگا۔“ وہ بولا۔

”تو پھر تو میرا غلام تو نہیں ہوا، میں تیرا غلام بن گیا۔“

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

رستم نے کہا۔

"یہ تو للو پہلے سوچنا تھا۔ اب تو تو ہماری دنیا میں آچکا ہے۔ یہاں کے چلن پر ہی چلنا ہوگا اور پریشان کیوں ہوتا ہے۔ ارے آدھا تو ہمارے رنگ میں رنگ ہی چکا ہے۔ تو نے اب تک جو کھایا ہے وہ انسانوں کا کھاجا کب تھا۔ تو نے ہمارا کھاجا کھایا ہے۔ تیرا وجود اب انسانوں کا وجود نہیں رہا۔ تجھے خود وہی کھاجا کھانا ہوگا، نہیں تو بھوکا مر جائے گا......" بھرت بھنڈاری نے جواب دیا۔

"میں نے کیا کھایا ہے؟" رستم نے پوچھا۔

"تو نے انسانوں کا ماس کھایا ہے۔ اگر نہ کھاتا تو ایک دن میں یہاں سے اٹھ کر بھاگ نہ جاتا۔"

"اوہو یہ تو بہت برا ہوا۔" رستم کے منہ سے نکل گیا۔

بھرت بھنڈاری اچھل کر دور چلا گیا اور بولا۔ "بول اچھا ہوا، نہیں تو تیری سب آشائیں ختم ہو جائیں گی۔ پھر کبھی ایسا شبد زبان پر مت لانا۔" جلدی بول۔

رستم نے ڈر کر کہا۔ "اچھا ہوا، میں نے انسانوں کا ماس کھایا، اسی لئے میں بلوان ہوں۔"

"ہاں اب ٹھیک ہے، تیری اور میری من بھاتی غذا ایک ہی ہے جو تو کھائے گا، میں بھی وہی کھاؤں گا۔ تو اور میں ساتھ ساتھ ہیں۔ میں تیرے ساتھ ہوں، پرنتو مجھے صرف تو ہی دیکھے گا۔

تو نے تو روز کلیوا (ناشتہ) کیا ہے اور میں دو سو سال کا بھوکا ہوں۔ پہلے میرا پیٹ پوجا کرا۔ پھر کام، پیٹ پوجا کے بعد کریں گے۔" بھرت پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

رستم کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "پھر اب مرگھٹ میں رکنا بے کار ہے۔" اور وہ دریا کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ دور ایک کشتی جا رہی تھی، بہت چھوٹی سی ناؤ تھی۔ اس میں ایک عورت چپو پکڑے بیٹھی تھی اور ایک ننگا آدمی جال ڈال رہا تھا۔ رستم وہیں کھڑا ہو گیا اور اس نے کشتی والے کو اشارہ کیا۔ وہ مرگھٹ سے آگے آچکا تھا۔ کشتی والا شاید سمجھا کہ کوئی تازہ مچھلی کھانے کا شوقین ہے۔ اس نے جورو کو اشارہ کیا اور کشتی کنارے کی طرف آنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں کشتی کنارے پر لگ گئی۔ دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ دور دور کسی انسان کا وجود نہ تھا۔ کشتی والے نے جال ایک طرف رکھ دیا اور بولا۔ "کاہے بھیا کا مچھلی لو گے...... ابھی آئے ہیں، زیادہ نہیں ہے۔"

رستم اس کے قریب چلا گیا اور اچانک اس نے کشتی والے کا گلہ دبوچ لیا۔ عورت چلائی۔ "ارے کا کرت ہو ہمارے مرد کے ساتھ۔" مگر پھر دوسری آواز کچھ نہ آئی۔ پوری کشتی خون سے بھر گئی۔ دونوں میاں بیوی کے اندرونی اعضاء دونوں نے مل کر ایک منٹ میں کھائے اور پھر پیٹ بھر کر گوشت کھایا۔ پیٹ بھرنے کے بعد رستم نے دریا میں خود کو صاف کیا اور چل دیا۔ سب کے لئے وہ اکیلا تھا مگر بھرت اس کے ساتھ تھا۔ بھرت کا پیٹ بھر چکا تھا اور رستم کو بھی کئی روز تک کچھ کھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ آج اس کو دگنی توانائی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خود کو بہت چاک و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ اس کے قدم بہت تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ گوالیار شہر میں آتے ہی اس کا رخ ایک دھرم شالہ کی طرف ہو گیا۔ اس دھرم شالہ کو سوامی شردھانند چلاتے تھے۔ لوگوں کی دان پن سے یہ کام کرتے تھے۔ رستم سیدھا ان کے پاس گیا اور جاتے ہی بولا۔

"سوامی شردھانند تم ہی ہو۔"

سوامی نے حیرت سے اس کالے بھجنگ ننگے کو دیکھا اور کہا۔ "ہاں جی میں ہی ہوں۔"

"تو پھر سن رکھ، اب کوئی دان پن کسی سے نہیں لے گا۔ تیرا سارا خرچ ہم دیں گے۔" رستم نے کہا۔

آپ مہاشے سوامی حیرت سے بولا۔

"ہاں ہم اب حیرت کیا کرتا ہے، بول کتنا چاہئے۔"

"چاہئے تو بہت پاٹ شالہ چلانا بہت خرچ ہوتا ہے۔ شکشا کو کتابیں اور کھانا پینا بہت خرچ ہے۔ دھرم کے کام اتنے آسان نہیں ہیں۔" سوامی نے جواب دیا۔

"تو پھر سن لے، تجھے یہاں سے جانا ہوگا، آج سے یہ سب بند، کوئی شکشا یہاں پر نہیں ہوگی۔ کسی دھرم کی بات نہیں ہوگی۔ یہاں پر صرف کھانا پینا ہوگا۔ تجھے جو ضرورت

ہے، پوری کریں گے مگر دھرم کی بات تیری زبان پر نہ آئے۔ غور سے سن رکھ۔" رستم نے کہا۔

"دھرم کے بنا یہ سب تو بے کار ہے، کچھ کرنے کی ضرورت کیا ہے۔" سوامی نے جواب دیا۔

رستم نے ہاتھ بڑھا کر سوامی کا گلہ پکڑ لیا اور بولا۔

"پھر تیری زبان پر دھرم آیا۔"

سوامی تھر تھر کانپ رہا تھا۔ سارے بدن پر پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ زبان پر کانٹے اگ آئے تھے، وہ کیا کہتا۔ رستم نے کہا۔ "زندگی پیاری ہے تو ایک طرف کو بیٹھ جا اور تماشا دیکھ۔ زبان کو تالو میں چپکا لے۔"

جو لوگ دھرم شالہ میں ٹھہرے ہوئے تھے، اس نے سب کو نکال دیا۔ سوامی کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور بھرت سے بولا۔ "یہ ٹھکانا ایک عارضی ٹھکانا ہے۔ اب تو جا اور دس بیس ہزار کا بندوبست کر اور بھرت یہ سن کر ہوا ہو گیا۔

شام کو بھرت نوٹوں کی گڈیاں لے کر حاضر ہو گیا اور بولا۔ "ایک سیٹھ کی تجوری سے لایا ہوں۔ بڑا کام پھر کروں گا اور حکم کرو۔" رستم نے جواب نہیں دیا اور وہ سوامی کے پاس چلا گیا۔ اس کے سامنے نوٹوں کی گڈیاں ڈال کر بولا۔ "یہ لے اور کام کر، ہر کام کرنا، کسی بھوکے کو روٹی مت کھلانا، شراب پلا دینا، عورت دے دینا، جوا کھیلنے کو رقم دے دینا۔ یہ سب تو ہی خرچ کرے گا، زندگی عیش کا نام ہے، خود عیش کر اور مجھے بھی عیش کروا۔ مگر دان پن کی بات نہ کرنا۔ کرے گا تو الٹا لٹکا دوں گا اور سن میرے لئے کپڑوں کا انتظام کر خود بھی چھیلا بن جا۔ یہی زندگی ہے۔"

سوامی شردھانند نے آنکھ کھولتے ہی دھارمک ماحول دیکھا تھا۔ ماتا پتا دونوں مندروں میں جاتے تھے۔ اس کی ساری تعلیم دھارمک تھی۔ زندگی میں پہلی بار یہ نئی آفت اس پر پڑی، اندر سے وہ کٹر دھرمی تھا مگر زندگی کے خوف سے خاموش تھا۔ اب جو آزادی ملی تو اس نے سوچا نہ معلوم یہ کون شیطان ہے۔ میرا تو دھرم ہی نشٹ کرے ڈال رہا ہے۔ آگے اور نہ جانے کیا کیا حکم دے گا۔ بھاگ چلو اور وہ سیدھا اسٹیشن چلا گیا۔ وہاں سے اس نے دلی کا ٹکٹ لیا اور روانہ ہو گیا۔ اس نے دلی جانے کا اس لئے سوچا کہ بڑا شہر ہے۔ کہیں بھی چھپ جائے گا۔ روپے اس کے پاس بہت تھے۔

"بھاگ گیا، اب نہیں آئے گا۔" بھرت بھنڈاری نے کہا۔

"جانے دے ہمارا کیا لے گیا ہے۔" رستم نے جواب دیا۔

"بول تو پکڑ لاؤں سسرے کو۔" بھرت بولا۔

"کیا کریں گے اس کا یہ...... آشرم تو ہمارے لئے چھوڑ گیا ہے۔" رستم نے جواب دیا۔

"ایک بات بتاؤں تیری ودیا ادھوری ہے، کوئی تیری اس کمزوری کا فائدہ اٹھا لے گا اور ہم تو ہیں، اڑتے پنچھی جو دانہ ڈالے گا، اس ڈال پر چلے جائیں گے۔ تیرے بھلے کی کہتا ہوں، مان نہ مان۔"

"میرے گورو نے جو بتایا تھا وہی ہے میرے پاس اور کہاں سے لاؤں۔" رستم نے کہا۔

"راستہ میں بتاؤں گا، کرنا تجھے پڑے گا۔" بھرت بولا۔

"اچھا تو پھر بتا تو ہی بتا۔" رستم نے پوچھا۔

"بدری ناتھ جانا ہوگا۔ وہاں پر ایک دنیا سے الگ تھلگ ایک پہاڑ کے اوپر پیڑ کے سائے میں ایک منش پڑا ہے۔ وہ بہت گہرے گھاؤ کھا کے پڑا ہے۔ بہت بڑا شکتی دان ہے وہ مگر اس کو کسی نے باندھ دیا ہے۔ وہ زندہ ہے مگر کچھ کرنے کے قابل نہیں ہے۔ کیونکہ وہ باندھ دیا گیا ہے۔ مگر مجھے یہ پتا ہے کہ اس کی ودیا اب تک اس کے پاس ہے، وہ خود سے استعمال نہیں کر سکتا۔ کیوں یہ راز میں ہے۔ میں تجھے دولت دے سکتا ہوں مگر ودیا تو نہیں دے سکتا۔ وہ تو تجھے خود حاصل کرنا ہوگی۔ وہ آدمی تیرے پاس نہیں آئے گا، خود جانا ہوگا۔" بھرت نے کہا۔

"میں جانے کو تیار ہوں۔" رستم نے جواب دیا۔

"میں تیرے ساتھ جاؤں گا مگر اس کے سامنے نہیں جاؤں گا۔" بھرت نے جواب دیا۔

"کیوں سامنے کیوں نہیں جائے گا۔" رستم نے

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

پوچھا۔

"ایک تو یہ کہ میں خزانوں کا راز دار ہوں۔ سب شکتی دان یہ جانتے ہیں۔ کسی کے دل میں بھی لالچ آسکتا ہے۔ میں تیرے پاس ہوں، تیرا وفادار ہی رہوں گا۔ تیرا نقصان نہیں کرنا چاہوں گا۔ دوسری بات یہ کہ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں۔ اس نے جس سے ٹکر لی تھی، اس کے سامنے دھرتی کا کوئی منش رک نہیں سکتا تھا۔ اب وہ اس کی سزا بھگت رہا ہے مگر زندہ تو ہے، یہ کتنی بڑی اس کی کامیابی ہے۔ میں اس سے ڈرتا ہوں، سامنے نہیں جاؤں گا۔" بھرت نے کہا۔

"اچھا تو مجھے اس تک پہنچا دینا، پھر میں جانوں اور وہ۔" رستم نے جواب دیا۔

اور وہ دونوں بدری ناتھ روانہ ہوگئے۔ یہ ایک بہت بڑا تیرتھ استھان ہے۔ مگر ان کو تو اس پہاڑی پر جانا تھا۔ یہاں پر وہ آدمی مل سکتا تھا۔

"اب میں اس پہاڑی کے اوپر نہیں جاؤں گا۔ اوپر تجھے اکیلے جانا ہوگا۔" بھرت نے کہا۔

"ہاں میں اکیلا چلا جاؤں گا۔ مجھے اس شکتی دان کا نام تو بتا دے۔" رستم نے پوچھا۔

"میں کیا کوئی اس کا نام نہیں جانتا۔" بھرت نے جواب دیا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" اور رستم نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔ یہ کوئی معمولی چڑھائی نہیں تھی مگر رستم بھی معمولی آدمی نہیں تھا۔ اس میں بھی کسی گینڈے کی طاقت تھی۔

ساری رات وہ بغیر رکے اوپر چڑھتا رہا۔ یہ ایک عجیب پہاڑ تھا۔ جتنا چڑھتے جاؤ، نظر اٹھا کر دیکھو تو اتنا ہی نظر آتا تھا۔ اس پر سیدھا چڑھنا تو ناممکن تھا۔ چکر دے کر ہی اوپر جانا ہوتا تھا۔ ہریالی کا نام نہیں تھا۔ رات میں بھی سخت گرمی تھی۔ بھر دن بھر کی دھوپ سے گرم ہو رہے تھے۔ صبح ہوگئی، سورج نکل آیا۔ گرمی میں اور اضافہ ہوگیا مگر رستم رکا نہیں چلتا رہا۔ دن بھر اس کا یہ سفر جاری رہا۔ پھر رات آگئی مگر رستم پھر بھی نہیں رکا۔ وہ بھی انسان کب تھا۔ اس کی غذا انسانوں والی کب تھی۔ اس کا ساتھی بھی تو شیطان تھا۔ وہ اس کو آگے لا رہا تھا۔ اس کو ڈھارس دے رہا تھا۔ طاقت دے رہا تھا اور رستم چلتا جا رہا تھا۔ صبح ہونے سے پہلے وہ ایک کشادہ میدان میں کھڑا تھا۔ اس نے نشیب کی طرف دیکھا، زمین نظر نہیں آتی تھی۔ سورج کے نکلنے کی تیاری تھی۔ صبح کی سفیدی نمایاں ہو رہی تھی۔

اور پھر ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ اس میدان میں زمین پر گھاس تھی اور کچھ درخت بھی نظر آ رہے تھے۔ اس کو پتا تھا کہ وہ کسی درخت کے نیچے پڑا ہے۔ اس لئے رستم درختوں کی طرف چلا۔ جو درخت قریب نظر آتے تھے وہ اتنے قریب نہ تھے۔ وہ ان کی طرف چلتا گیا اور پھر درختوں کے نیچے پہنچ گیا۔ ان درختوں پر کوئی پرندہ نہیں تھا۔ ان درختوں کے پتے بہت چوڑے اور پانچ کونوں والے تھے اور ان درختوں پر ہرے اور گلابی رنگ کے سیب کے برابر پھل لگے ہوئے تھے۔ پکے پھل زمین پر بھی پڑے تھے اور بھینی بھینی خوشبو ان پھلوں سے اٹھ رہی تھی۔ ایسی خوشبو اس نے کبھی نہیں سونگھی تھی۔ رستم کو بھوک نہیں تھی مگر اس خوشبو نے اس کو مجبور کر دیا کہ وہ پھل کھا کر دیکھے۔

اس نے جھک کر زمین پر گرا ہوا ایک پھل اٹھا لیا۔ مگر وہ اس کو منہ میں نہیں ڈال سکا۔ ایک طرف سے ایک پرندہ اڑتا ہوا آیا اور جھپٹ کر وہ پھل لے گیا۔ اس نے حیرت سے اس پرندے کو دیکھا مگر نہیں دیکھ سکا کیونکہ وہ غائب ہو چکا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ پیڑ کی جڑ کے پاس بیٹھ گیا۔ درخت بہت بڑا تھا۔ اس کا تنا بہت موٹا تھا۔ وہ جڑ کے ایک موٹے حصے کو تکیہ بنا کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ چند منٹ کے بعد بڑے زور سے بادل گرجا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ درخت کی موٹی ٹہنی پر کوئی بیٹھا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔

ایک بہت چھوٹا سا بچہ بیٹھا پھل کھا رہا تھا۔ وہ اس کو بچہ ہی سمجھا تھا کیونکہ اس آدمی کا قد اور ڈیل ڈول ایک پانچ سالہ بچے جتنا تھا۔ اس نے رستم کی طرف دیکھا اور پھر کھانے لگا۔ رستم اس کو دیکھتا رہا۔ بولا کچھ نہیں۔

"کھائے گا۔" اس نے پوچھا۔ رستم نے گردن ہلا کر ہاں کیا تو پھر بولا۔

"ایک منٹ میں مر جائے گا تجھے پتہ ہے۔"

رستم نے انکار میں گردن ہلا دی۔ اس آدمی کی آواز بھی بچوں کی طرح ہی تھی۔ گو کہ بات کرنے کا انداز بچکانہ نہیں تھا۔

"طوطے کی طرح گردن ہلاتا ہے، زبان نہیں ہے۔ مرگھٹ میں تو فرفر زبان چلاتا تھا۔"

رستم کو حیرت ہوئی۔ اس کو یہ بھی پتہ ہے۔ مگر وہ خاموش ہی رہا۔ "زیادہ چھپانے کی کوشش مت کر، وہ کہاں ہے جس نے یہاں آنے کا راستہ بتایا ہے۔ جواب دے۔"

اب رستم کو بولنا ہی پڑا۔ "وہ تیرے ڈر سے نہیں آیا۔"

"میرا ڈر وہ پاگل ہے میرے ہاتھ میں ڈور کا سرا ہی نہیں رہا۔ ڈرنا کس بات سے ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "پتہ نہیں کہتا وہ یہی تھا۔" رستم نے جواب دیا۔

"تو کیوں آیا ہے اپنا مطلب تو بتا۔" اس نے پوچھا۔

"میں ادھورا ہوں ایک جاپ کے لئے گرو نے بتایا تھا پھر گرو چلے گئے۔ اب میں اپنی اور بھنڈاری کی حفاظت کیسے کروں۔ کچھ تو پلے ہو، بھنڈاری تو مایا لا سکتا ہے۔ لیکن نہ اپنی دیکھ بھال کر سکتا ہے نہ میری کوئی بھی جاپ کر کے اپنے پاس بلائے گا۔ پھر میں کیا کروں گا۔ اس لئے میں تمہارے چرنوں میں آیا ہوں، چاہو تو میری غلطی پر سزا دے دو، میں نے اپنا گرو تم کو مان لیا ہے۔" رستم نے کہا۔

"ارے نادان غلطی پر غلطی کر رہا ہے اور اب بھنڈار ی کی باتوں میں آ گیا ہے۔ ارے گدھے میں خود سزا کاٹ رہا ہوں۔ میرے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہیں۔ اس میدان کے باہر نہیں جا سکتا اور تو کہتا ہے مجھے گرو بناتا ہے۔ ارے گرو تو وہ ہوتا ہے جو اپنی مرضی کا مالک ہو، خود مختار ہو، میری دیا میرے کام نہ آئی تو تیرے کس کام آئے گی۔ واپس چلا جا اور تیرے پاس بھنڈاری ہے۔ اس کو بہت سمجھ، زیادہ پیر پھیلانے کی کوشش کرے گا تو چادر پھٹ جائے گی، میرا حشر یاد رکھ۔" وہ بولا۔

رستم نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "کہاں جاؤ گرو، مجھے کچھ نشان تو بتاؤ میری آشانہ توڑو۔"

"تو نیا کھلاڑی ہے۔ میرے مہرے پٹ چکے، دنیا کی بساط پر جس کے مہرے پٹ جاتے ہیں وہ ہار جاتا ہے۔ یہاں پر صرف ایک بازی کھیلنے کو ملتی ہے۔ میری بازی ختم ہو چکی، تیری اب شروع ہوئی ہے۔ جتنی کھیل سکتا ہے، کھیل لے مجھ سے کوئی امید نہ رکھنا۔ اچھا کھلاڑی کسی دوسرے کے کھیل میں مداخلت نہیں کرتا۔ اتنی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی۔ اب اٹھ اور واپس چلا جا یہاں کی آب و ہوا تجھے راس نہیں آئے گی تو بھوکا مر جائے گا اور وہ بھنڈاری بھی کسی کی گود میں بیٹھ جائے گا، تیری چالیس راتیں بے کار چلی جائیں گی۔"

رستم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کو اپنی پونجی کی فکر پڑ گئی۔ واپس چل پڑا اور چکر کاٹتا ہوا پہاڑی سے اترنے لگا اور پھر پہاڑی ختم ہوگئی۔ چڑھنے میں جتنا وقت اور محنت لگی تھی اس سے بہت کم وقت میں وہ اتر آیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا، ناامیدی اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

اس کے اترتے ہی بھنڈاری اس کے قریب آ گیا اور بولا۔ "بڑی جلدی آ گئے، کام بنا۔"

"تو نے ایک ہارے ہوئے جواری کے پاس مجھے بھیج دیا تھا۔ ارے وہ تو خود پھنسا ہوا ہے، تجھے پتہ نہیں تھا، اس نے مجھے نراش کر دیا۔" رستم نے کہا۔

"میں نے تو تیری مدد کرنا چاہی تھی۔ وہ نہ مانا تو میں کیا کر سکتا ہوں۔" بھنڈاری نے کہا۔

"اب بتا کیا کروں۔" رستم نے پوچھا۔

"اب میں کوئی راستہ نہیں بتا سکتا۔ یہ میرا طریقہ ہے۔ اب تجھے ہی کرنا ہے جو کرنا ہے۔" اس نے کہا۔

"تو اب ایسا کر، کسی کنجوس سیٹھ کا دبا یا روپیہ نکال لا، پھر آگے کی سوچیں گے۔" رستم نے کہا۔

"یہ تو میرا کام ہی ہے۔ شام کو تو لکھ پتی ہو جائے

READING CORNER
http://readingcornerblogspot.com

گا۔" بھنڈاری بولا۔

☆.....☆.....☆

موہن لال کروڑوں کا مالک ہے۔ اس کا کاروبار پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے۔ اس نے جس کام میں ہاتھ ڈالا، اس میں کامیاب ہوگیا۔ ہر جگہ دولت کے ڈھیر اس نے لگا دیئے۔ اس کے مقابلے پر جو آیا، اس کا دھڑن تختہ ہوگیا۔

اس کو نقصان تو ہوتا ہی نہیں اور جو نقصان کرنے کی سوچتا ہے وہ خود ہی پھنس جاتا ہے۔ موہن ہر آدمی کی خبر رکھتا ہے۔ موہن لال ہر اس آدمی کا دشمن تھا جو ایمانداری اور دیانت سے کاروبار کرتا تھا۔ اس نے اپنے جیسوں کی مدد کی۔ کاروبار اور معاشرے میں جتنی برائیاں وہ پیدا کرسکتا تھا، کر رہا تھا۔ اس کی روک ٹوک کرنے والا کوئی نہ تھا جو اس کے سامنے آیا۔ اس نے اپنی مایا کے زور پر اس کو اپنے قابو میں کرلیا۔ کچھ ایماندار تباہ ہوکر گھر بیٹھ رہے مگر زیادہ تر اس کی برائی میں شامل ہوگئے۔ وعدہ خلافی اور جھوٹ اس کے کاروبار کا بنیادی اصول تھا۔ کسی مزدوری کی مزدوری وہ پوری نہیں دیتا تھا۔ کسی کا مال پورا نہیں دیتا تھا۔ کسی سے سچ بات نہیں کرتا تھا۔ اس کی شکل پر پھٹکار برستی تھی۔ لوگ اس کو دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتے تھے مگر وہ اس کا انتقام بھی لے لیتا تھا۔ وہ کسی پارٹی میں دعوت میں نہیں جاتا تھا۔ وہ بہت کم لوگوں سے ملتا تھا۔ اس نے جو لوگ رکھے تھے ان کو سخت تاکید تھی کہ وہ کسی خیراتی ادارے والوں سے نہیں ملیں گے۔ انسانوں کو پریشان کرنے کی فضا، اس نے اپنے گرد بنا دی تھی۔

دلی میں بھی اس کا دفتر تھا مگر لوگ اس کے ساتھ کاروبار کرنے سے کتراتے تھے۔ کیونکہ جس نے اس کے ساتھ لین دین کیا، وہ ہمیشہ نقصان میں ہی رہا۔ موہن کے نام سے لوگ ڈرتے تھے۔ موہن لال کا ڈسا ایک آدمی میرے پاس آگیا۔

اس نے بتایا۔ ''میرا نام کشوری لال ہے۔ میری چاندنی چوک میں کپڑے کی دوکان ہے۔ موہن سیٹھ سے میرا لین دین تھا۔ ہزاروں کا مال میں خریدتا تھا اور اس کی ادائیگی بھی کرتا تھا۔ سال کے بعد موہن کے بمبئی کے دفتر کا مجھے ایک خط ملا۔ اس میں مجھے اس نے لکھا کہ میری طرف اس کے پانچ لاکھ روپے نکلتے ہیں۔ میں بہت حیران ہوا۔

کاروبار میں تو ادھار نقد سب چلتا ہی ہے اور ایک دوسرے کے بھروسے پر یہ سب ہوتا ہے۔ میں نے بمبئی جاکر پتہ کیا میرا دیا روپیہ وہاں کچھ نہ تھا اور میری طرف تمام مال ادھار دکھایا گیا تھا۔ میں بھنڈاری سیٹھ سے ملا۔ اس نے نگاہیں بدل کر بات کی اور دھمکی دی کہ اگر ایک ماہ میں تمام روپیہ ادا نہ کیا گیا تو دوکان مکان سب بیچ کر وصول کرلوں گا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ رقم معمولی نہیں تھی۔ دوسرے میں ہر ماہ جو رقم دیتا رہا وہ کہاں گئی۔"

"تم رقم کس طرح ادا کرتے تھے۔" میں نے پوچھا۔

"موہن کا ایک آدمی رقمیں وصول کرتا ہے۔ رسیدیں بھی دیتا ہے۔ میں نے وہ سب رسیدیں موہن کو دکھائیں تو وہ بولا۔"

"ارے تم ہم کو چونا لگاتا ہے۔ یہ تو سب جعلی ہیں۔ وہ آدمی کون تھا جو تم سے وصولی کرتا تھا۔ وہ ہمارا آدمی نہیں ہے۔ تم کسی کو رقم دے دو۔ اس کے ہم تو ذمہ دار نہیں ہیں۔ حالانکہ وہ آدمی انہوں نے خود لگایا تھا۔ وہ صاف مکر گیا۔" کشوری لال نے بتایا۔

"یہ سن کر میری حالت خراب ہوگئی۔ بڑی مشکل سے دلی آیا ہوں۔ یہاں آکر میری حالت اور خراب ہوگئی۔ سارا سرمایہ ڈوب گیا۔ اب دوکان اور مکان بھی جاتا نظر آرہا ہے۔" وہ بولا۔

موہن کے بارے میں اس قسم کی باتیں مشہور تھیں مگر کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا تھا۔ وہ لوگوں کو دل کھول قرض دے دیا کرتا تھا۔ لوگوں کی زبانیں بند ہوجاتی تھیں اور وہ لوگ اس کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس جاتے تھے اور پھڑپھڑاتے رہتے تھے۔

میں نے کشوری لال کا پتہ لیا اور کہا۔ "میں تمہارے گھر آؤں گا فکر نہ کرو تمہارا کچھ نہیں ہوگا۔" دوسرے دن میں

رولوکا کے ساتھ اس کے مکان اچھی قبر چلا گیا۔

اور پھر ایک خط موہن کے نام لکھا گیا۔ اس میں لکھا کہ "تیری کوئی رقم میری طرف نہیں ہے اگر تو وصول کرسکتا ہے تو دلی آکر وصول کرلے۔"

کشوری لال بہت ڈرا ہوا تھا مگر رولوکا نے کہا۔

"آنے تو دو اگر وہ خود آئے گا تو اور بھی اچھا ہوگا۔"

مگر وہ نہیں آیا۔ اس کا ایک آدمی آیا اور بڑے غصے سے دوکان میں آگیا۔ رولوکا وہیں پر موجود تھا۔ وہ آتے ہی بولا۔ "کشوری لال کدھر ہے۔ اس کو بلاؤ۔"

رولوکا نے آگے بڑھ کر کہا۔ "تم کون ہو اور کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

وہ بولا۔ "ہم چندولال ہے۔ موہن سیٹھ کا آدمی وصولی کے لئے آیا ہے۔"

"سن بھئی چندولال تو بھی جعلی ہوا تو ہماری رقم تو گئی۔" رولوکا نے کہا۔

"ارے ہم رسید دے گا۔" وہ بولا۔

"اور وہ بھی نقلی ہوئی تو پھر۔" رولوکا نے کہا۔

"تم ہوش کا بات کرو موہن سیٹھ کا نام چلتا ہے۔" وہ بولا۔

"ادھر دلی میں نہیں چلے گا اس کا دفتر بھی ہے ہم اس کو بھی بھروسہ نہیں کریں گے۔ موہن کو جا کر بولو کہ وہ خود آئے اور رقم وصول کرے۔ اس کا پورا رقم اس کے ہاتھ میں دیں گے اور اس کے ہاتھ کا رسید لیں گے۔ ایک دفعہ تم لوگ بے ایمانی کرچکا ہے۔ دوبارہ نہیں چلے گی اب بے ایمانی۔" رولوکا نے رعب سے کہا۔

چندو بگڑ کر بولا۔ "تم ہم کو بے ایمان بولا۔ تم موہن کو نہیں جانتا، وہ تم سب کو برباد کردے گا۔"

"اب زیادہ ہمارا وقت نہ خراب کرو اور چلا جا۔" رولوکا نے کہا۔

وہ غصے میں چلا گیا مگر دوسرے روز دلی دفتر کے دو تین آدمیوں کے ساتھ پھر آگیا۔ مگر رولوکا نے ان کو بھی بھگا دیا۔

ایک ہفتہ تک کوئی نہیں آیا اور پھر موہن خود آگیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ بمبئی شہر کے نامی گرامی بدمعاش تھے۔ وہ ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا دوکان میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ وہ چاروں بدمعاش بھی اندر آگئے۔ پھر اس نے دیکھا کہ ایک سایہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ رولوکا نے سمجھ لیا کہ موہن لال خالی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ ماورائی شکتی بھی ہے۔ رولوکا اپنی جگہ ہوشیار ہوگیا۔ موہن اندر آکر چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور بولا۔ "کون ہے رے وہ سور ما جو ہمارے منہ آرہا ہے۔"

دو سیلز مین اور رولوکا ہی دوکان میں تھے۔ رولوکا نے آگے بڑھ کر کہا۔ "تم کون ہو جو اونٹ کی طرح گردن اٹھائے اندر آگئے ہو۔"

"بتادیں گے رقم ڈکار کے بیٹھا ہے کشوری لال، اس کو تو بلا اور تو کون ہے بڑی بڑی باتیں کررہا ہے۔ ایک منٹ میں سارا بخار اتار دیں گے۔" وہ غرور سے بولا۔

"تم موہن ہو۔" رولوکا نے پوچھا۔

"ہاں اور کون ہیں۔" وہ بولا۔

"شکل سے بھی یہی پتہ چل رہا تھا۔ پوچھ تو ایسے ہی لیا ہے۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"ارے یہ تو کوئی پورا ہی سور کا جنا ہے۔ ذرا سنبھال تو اسے۔" اس نے ایک کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بھی کھڑا رہا۔ اس نے دوسرے کی طرف اشارہ کیا لیکن یہ کیا وہ بھی نہ ہلا اور پھر اس نے باقی دو کو بھی رولوکا پر حملہ کرنے کا کہا مگر کوئی اپنی جگہ نہ چھوڑ سکا تو وہ گالی دے کر بولا۔

"مٹی کے مادھو بنے کھڑے ہو، یہ سسرا ہماری بے عزتی کرے جارہا ہے، پھٹکار ہے تم پر۔"

رولوکا آگے آکر بولا۔ "غبارہ بہت بڑا لگتا ہے مگر بہت ہلکا ہوتا ہے۔ تیرے اندر بھی صرف ہوا بھری ہے۔ ذرا سی سوئی لگاؤں گا تو ساری ہوا نکل جائے گی۔"

"یہ تو سب نمک حرام ہیں، میں تجھے اور کشوری کو دیکھ لوں گا۔" وہ غصے سے بولا۔

"یہاں سے جائے گا تو دیکھے گا اور سن وہ جو تیرے

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com

ساتھ آیا ہے اور چھپا کھڑا ہے۔ اس کا پرپیچ تو کرادے۔ اور اگر نہ کرایا تو اس کو پکڑ کر باندھ دوں گا۔ پھر تو اکیلا رہ جائے گا۔"

رولو کا نے کہا تو وہ بولا۔

"میں تو اکیلا ہوں۔ میرے ساتھ کوئی نہیں ہے۔"

"میں اندھا نہیں ہوں۔ سب دیکھ رہا ہوں۔" رولو کا نے کہا۔

"تو کون سی باتیں لے کر بیٹھ گیا۔ کشوری کو بلا۔ رقم کی بات کر۔" وہ بولا۔

"ٹالنے کی کوشش مت کر۔ موہن لال یہ بتا تیرے ساتھ کون ہے؟" رولو کا بولا۔

"ارے نہ جانے کیا بکواس کئے جا رہا ہے۔" وہ بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں خود ہی پتہ کرتا ہوں۔" اور رولو کا نے اپنے کارندے کو اشارہ کر دیا۔

ایک لمحے میں بھرت بھنڈاری اس کی گرفت میں تھا۔ "اب تو خود اپنا پرپیچ کرادے۔" رولو کا نے کہا۔

"میں بھرت بھنڈاری ہوں۔ میرا کام تو یہ ہے کہ میں جس کے بس میں ہوں، اس کو مایا دیتا رہوں بس۔" بھرت نے جواب دیا۔

"اچھا موہن تو اسی لئے اس کو چھپا رہا تھا۔ یہ تیری مایا لانے کا ذمہ دار ہے۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ تو ایک بکری سے نہیں لڑ سکتا۔ موہن لال یہ تیری بدنصیبی ہے کہ تو دلی آ گیا۔ تیرا وقت ختم ہوا۔ اب تو اپنی پرانی جگہ جائے گا۔" موہن حیران کھڑا تھا۔ اسی دن سے بچنے کو وہ گروتلاش کر رہا تھا۔ کچھ جنتر منتر سیکھنا چاہتا تھا۔ مگر مایا کے جال میں پڑ کر وہ کچھ نہ کر سکا۔

"تیرے بدن سے یہ بدبو کیوں آ رہی ہے۔" رولو کا نے بھرت سے پوچھا۔

"میرا کھاجا انسانی ماس ہے اور یہ موہن لال بھی یہی کھاجا کھاتا ہے تو مجھے جانے دے۔ میرا کوئی دوش نہیں ہے۔ میں تیری غلامی کرنے کو تیار ہوں۔"

رولو کا نے غصے سے کہا۔ "لعنت ہے تجھ پر اور اس مردود پر تم لوگ آدم خور ہو۔"

"میں کیا کروں۔ میں تو زمین کے اندر کا ہوں، بلاتے ہیں تو آتا ہوں۔" بھرت نے کہا۔

"مگر اب تو زمین کے اندر نہیں جائے گا۔" اور رولو کا کے اشارے پر کارندہ اس کو اٹھا کر لے گیا۔

"موہن تو اس لائق بھی نہیں کہ تیرا یہ گندہ گوشت کوئی جانور کھائے۔ اس لئے اسی مرگھٹ میں تجھے جلایا جائے گا جہاں تو نے چالیس راتیں گزاری ہیں۔" اور اس طرح موہن لال کا قصہ تمام ہوا۔

☆.....☆.....☆

کہلاتے تو وہ سردار سلامت علی تھے مگر وہ کسی جگہ کے قبیلے کے سردار نہ تھے۔ سرداری تو ان کے دادا تک رہی اور پھر ختم ہو گئی اور وہ اپنا آبائی علاقہ جو کہ اتر پردیش میں تھا۔ چھوڑ کر لکھنو میں آ گئے۔ یہاں پر آ کر ہی ان کی شادی ہوئی اور چار لڑکوں اور دو لڑکیوں کے وہ باپ بنے۔ لڑکیوں کی شادی کر دی اور ان کو روانہ کر دیا۔ لڑکے سب پڑھے لکھے تھے۔ وہ سرکاری ملازمتوں میں چلے گئے۔ سب سے چھوٹا ذرا شاعرانہ مزاج رکھتا تھا۔ اس لئے اس کو ملازمت کرنا پسند نہ تھا۔

کچھ سرداری کے زمانے کی نشانیاں ابھی باقی تھیں۔ دادا کا اثر پوتے پر آ گیا تھا۔ وہ آزاد رہنا چاہتا تھا۔ سلامت علی نے بہت کوشش کی کہ وہ شادی کر لے اور جس طرح تین بھائی رہتے ہیں۔ وہ بھی رہے مگر وہ راضی نہ ہوا۔ لکھنو کا ماحول بڑا شاعرانہ تھا۔ ہر روز مشاعرے اور ادبی محفلیں برپا ہوا کرتی تھیں اور انور میاں روز ہی ان محفلوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔

یوں تو وہ جس مکان میں رہتے تھے، وہ بہت بڑا تھا۔ سب بڑے آرام سے اس میں گزارہ کرتے تھے مگر باپ کی یہ خواہش تھی کہ ایک ایسا مکان بنایا جائے جو چاروں لڑکوں کے لئے ہو سب ایک چھت کے نیچے رہیں اور سب الگ الگ بھی ہوں۔ سب کے آنے جانے کے راستے الگ ہوں مگر ہوں سب ایک ہی چھت تلے۔ کیونکہ میرے مرنے

کے بعد اگر بھائیوں میں اختلافات ہو گئے تو سب الگ الگ ہو جائیں گے۔ ساتھ رہنے میں اختلافات ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔ بھائی نہیں، لڑیں گے مگر عورتیں اور ان کے بچے ضرور یہ صورت حال پیدا کر سکتے ہیں۔ الگ الگ اپنے اپنے حصے میں رہیں گے تو ان میں بھائی چارہ قائم رہے گا۔ محبت رہے گی۔ ایک دوسرے کے کام آئیں گے۔ سلامت علی بڑے دور اندیش تھے۔ بہت دور کی سوچ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی ایک چھوٹی سی سلطنت ہو۔ اس پر اس کی حکمرانی ہو۔ اس پر صرف اس کا حکم چلتا ہو۔ عورت کیسی ہی نیک سیدھی ہو۔ وہ اس خواہش کو دبا نہیں سکتی۔ یہ اس کا قدرتی حق ہے اور وہ اس حق کو ہر حال میں حاصل کرنا چاہتی ہے۔

ایک مکان میں سب کی سلطنت تو قائم نہیں ہو سکتی۔ سب کے الگ الگ حصے ہوں گے تو سب اپنی اپنی جگہ خوش رہیں گے۔ کسی کی مداخلت نہیں ہو گی۔

سلامت علی نے فیصلہ کر لیا کہ ایک ایسا آشیانہ وہ بنائیں گے جو سب کا ہو گا اور سب الگ الگ بھی رہیں گے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ ایک کم از کم دو ڈھائی ہزار گز کا پلاٹ حاصل کیا جائے اور پھر ایسا نقشہ بنایا جائے جو ان کے خواب کے مطابق ہو۔ اس سلسلے میں انہوں نے کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے کہ لڑکوں سے مشورہ کرنے میں یہ خرابی ہو گی کہ سب اپنا اپنا مفاد اور فائدہ رکھ کر بات کریں گے جبکہ ان کے لئے سب برابر تھے۔ وہ سب کو برابر رکھنا چاہتے تھے۔ نئی نئی باتیں سامنے آئیں گی اور ان کے کام میں رکاوٹ کھڑی ہو گی۔ وہ وقت برباد کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے پاس اتنا روپیہ تھا کہ وہ پلاٹ خرید سکیں، بنوانے کے لئے ان کے پاس باپ دادا کی زمینیں موجود تھیں۔ خود مختار تھے جو چاہیں کریں۔

شہر کے باہر امین آباد کی ایک بستی بن رہی تھی۔ پلاٹ فروخت ہو رہے تھے اور یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ جب وہ پلاٹ خریدنے پہنچے تو سارے پلاٹ بک چکے تھے۔ صرف ایک پلاٹ ڈھائی ہزار گز کا باقی تھا۔ وہ بھی شاید ان کو نہیں ملتا کیونکہ یہاں پر بہت گہرا ایک تالاب بنا ہوا تھا۔ برساتی پانی سال بھر اس میں بھرا رہتا تھا۔

اس پلاٹ کے چاروں طرف بڑی اونچی اونچی جھاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ اس کو خریدنا نہیں چاہتے تھے مگر دلال بہت ہوشیار تھا، بولا۔ "میاں جی خرید لو یہ سونا ہے سونا، چاروں طرف سڑک ہے۔ اس پانی کا کیا ہے بھرت بھروا دینا۔ بہت ہی بڑھیا مکان بنے گا اور اب اتنے بڑے پلاٹ ختم ہو گئے ہیں۔ میرے پاس کئی گاہک موجود ہیں اور شاید زیادہ ہی میں سودا ہو جائے۔"

سلامت علی نے اس کی بات پر غور کیا۔ واقعی ہر طرف دروازہ بن سکتا ہے۔ ہر گھر کا الگ الگ سمت میں دروازہ بن جائے گا اور پانی کا کیا ہے۔ مٹی بھروا دی جائے گی۔ اور پھر یہ پلاٹ سلامت علی کے نام ہو گیا۔

اس کے بعد انہوں نے گدھے والوں سے بات کی اور گدھے والے مٹی لا کر اس میں ڈالنے لگے اور پانی خشک ہوتا گیا اور پھر ایک وقت آیا کہ پورا گڑھا مٹی سے بھر گیا اور زمین خشک ہو گئی۔ جھاڑیاں صاف کر دی گئیں تو وہ ایک اچھا پلاٹ نظر آنے لگا۔ یہ سب کام انہوں نے نہایت خفیہ طریقہ پر کئے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ پھر انہوں نے مکان کا نقشہ اس طرح بنوایا کہ چار کشادہ ایک ہی طرز کے مکان بنائے جائیں اور سب کے دروازے الگ الگ ہوں۔ مگر درمیان میں بھی ایک دروازہ ایسا ہو کہ اندر سے اندر کسی کے مکان میں بھی جایا جا سکے۔ نقشہ نویس نے بہت اچھا نقشہ بنا کر دے دیا اور پھر وہ اس کو بنوانے کے لئے دوڑ دھوپ میں لگ گئے اور زمینوں کا سودا کر دیا اور مکان کی تعمیر شروع ہو گئی۔

زمین کے اندر بہت بڑا ایک حوض بنوایا گیا۔ یہ پانی جمع کرنے کے لئے تھا۔ یہ ان کے ذہن کی پیداوار تھی۔ پہلے اس زمانے میں اس کا رواج نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ کنواں بنا لیا جاتا تھا۔ مگر انہوں نے کنواں کے ساتھ زمین کے اندر حوض بھی بنوایا۔ دیواروں کی چنائی دو فٹ اور ضرورت کے تحت ڈھائی فٹ رکھی گئی۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر ڈاٹ لگا کر محراب دار چنائی کی گئی۔ بھٹے پر خاص طور سے اینٹیں

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

بنوائی گئیں اور اچھے کاریگر لگائے گئے۔ بہت قاعدے اور قرینے سے مکان بنتا گیا۔ گو کہ ان کی مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ مگر انہوں نے کسی لڑکے کو پتہ نہیں چلنے دیا۔ ویسے تو کسی لڑکے کو غرض نہیں تھی۔ وہ کہاں جاتے ہیں اور دن بھر کیا کرتے ہیں۔

گھر آتے تو کھانا وقت پر ان کو مل جاتا۔ بہویں ان کو کھانا دیتیں۔ اگر کوئی لڑکا ہوتا تو ملاقات ہو جاتی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ زمینوں کی آمدنی بند ہوئی تو انہوں نے گھر میں خرچ دینا بھی بند کر دیا۔ خرچ بند ہوا تو بہوؤں کو احساس ہوا۔ بڑی بہو نے ایک دن کہا۔

"ابا مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے۔ اخراجات بھی بڑھ رہے ہیں۔ آپ کے بیٹے جو دیتے ہیں، وہ اب کم پڑ رہا ہے۔ آپ نے بھی ہاتھ روک لیا ہے۔ گزارہ مشکل ہے۔ آخر سب کے بچے ہیں۔ ان کے اخراجات بھی ہیں۔ کچھ ہمارا بھی خیال کریں۔"

سلامت علی نے بڑے سکون سے بڑی بہو کی بات سنی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ بات صرف بڑی بہو نہیں کہہ رہی۔ سب کی طرف سے کہہ رہی ہے۔ اس بات کو مجھ تک پہنچانے سے پہلے ان سب کی ایک میٹنگ ہوئی ہوگی اور پھر فیصلہ ہوا ہوگا اور پیغامبر بڑی بہو کو بنایا گیا ہوگا۔

وہ اس سوال کا جواب بہت پہلے تیار کر چکے تھے۔ ان کو پتہ تھا۔ یہ سوال کسی نہ کسی روز ان کے سامنے آئے گا..... پھر بھی انہوں نے پوچھا۔

"بیٹا تم یہ بتاؤ تم خود سے یہ سوال کر رہی ہو تو میرا جواب یہ ہے کہ میری وجہ سے اگر اخراجات بڑھ رہے ہیں تو میں اپنا انتظام کر لوں گا..... اور اگر یہ سوال سب کی طرف سے ہے تو جواب یہ ہے کہ میں نے اپنا ذریعۂ آمدنی خود بند کر دیا ہے، زمین فروخت کر دی ہے۔

تم سب کو اس لائق میں نے بنانے کی کوشش کی ہے کہ تم سب اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکتے ہو۔ میری بیساکھی کی ضرورت کسی کو نہیں ہے۔ زمین اور روپیہ ایسی چیز ہے کہ آپس میں لڑائی اور نفرت پیدا کرتی ہے۔ میں نے دونوں کو ختم کر دیا ہے۔ تاکہ میرے بعد تم آپس میں اس کی خاطر نہ لڑو۔ مگر میں نے ناانصافی نہیں کی، تم سب کا حق نہیں مارا۔ وہ سب کو مل جائے گا۔ یہ میرا پیغام تم سب کو بتا دینا۔ کچھ عرصہ صبر کرو۔"

یہ پیغام سب لڑکوں کو مل گیا۔ کسی نے کچھ نہ کہا۔ اخراجات والی بات بھی ان کے سامنے نہیں آئی۔ مکان بنتا چلا گیا اور پھر بہت خوبصورت مکان تیار ہو گیا۔ مکان کے چاروں طرف روڈ تھا۔ اس کو بھی سلامت علی نے بنوا دیا اور درخت بھی لگوا دیئے۔

"سلامت منزل۔" ایک بہت بڑے سنگ مرمر کی سل پر کھود کر نمایاں جگہ آویزاں کر دیا گیا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ اپنا کارنامہ لڑکوں کے سامنے پیش کریں۔

عید کا دن تھا۔ سب نماز ادا کرنے ساتھ جاتے تھے۔ جانے سے پہلے انہوں نے کہا۔

"آج میرے لئے بہت خوشی کا دن ہے۔ ایک تو عید کا دن ہے۔ دوسرے میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ آج مجھے اس کی تعبیر مل گئی ہے۔ دوگانہ نماز کے بعد میں تم سب کو ایک تحفہ دوں گا۔ وہ تحفہ میرا خواب بھی ہے اور تم سب کی ضرورت بھی۔" اور سب لوگ نماز کو روانہ ہو گئے۔ سب کے دل میں کھلبلی سی ہو رہی تھی۔ "آخر ابا کیا کرنے والے ہیں۔ کیا تحفہ دینے والے ہیں۔"

سب واپس آ گئے اور بڑے کمرے میں سب بیٹھ گئے۔ بہویں بھی آ گئیں۔ انور میاں کو بھی آنا پڑا۔ حالانکہ ان کا انتظار ان کے دوست کر رہے تھے۔

سب کے آنے کے بعد سلامت علی نے اپنی دلی تمنا اور خواب کے بارے میں بتایا۔ "سب ایک چھت تلے رہیں اور الگ الگ بھی رہیں تاکہ آئندہ بھی تم سب میں محبت اور بھائی چارہ رہے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ کوئی مکان ایسا بنایا جائے جو اس مقصد کو پورا کر سکے اور پھر میں نے ایک ایسا مکان بنا لیا تم سب اپنی اپنی فیملی کے ساتھ الگ الگ رہ سکتے ہو۔ سب کے دروازے بھی الگ الگ ہوں گے اور آنا جانا بھی الگ الگ ہوگا۔

تم سب سمجھ رہے ہو گے کہ میں نے زمین فروخت کر کے نہ معلوم روپیہ کہاں برباد کر دیا۔ مگر میں نے اپنا خواب پورا کیا ہے۔ تم سب قریب قریب رہو، ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں ساتھ رہو۔ اپنی رشتہ داریاں آپس میں کرو، محبت بڑھے گی، دوریاں محبت کم کر دیتی ہیں۔ بتاؤ میں نے یہ غلط کیا ہے۔ اگر یہ غلط ہے تو تم جہاں دل کرے رہنا۔"

سلامت علی خاموش ہوئے تو بڑے بیٹے منور علی نے اٹھ کر باپ کو گلے لگا لیا اور بولا۔ "ابا مجھے معاف کر دینا، بہت پہلے مجھے ایک لمحے کو آپ کے متعلق ایک خیال آیا تھا۔ وہ خیال میں نہیں بتاؤں گا، مجھے معاف کر دینا بس۔"

سلامت علی نے بیٹے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ "میں نے تمہیں معاف کیا۔" اور پھر سب نے باپ سے معافی مانگی۔ پھر سب نئے مکان کی طرف چلے گئے۔ چوکیدار نے ایک طرف کا دروازہ کھول دیا۔ اندر آنے کے بعد سلامت علی بولے۔ "اس مکان کو دیکھ لو، چاروں اسی طرح کے ہیں۔ کسی میں ذرا فرق نہیں ہے۔ چاروں طرف روڈ ہے۔ ہر مکان ایک ہی طرز پر بنایا گیا ہے۔ تم سب پسند کر لو اور یہاں آنے کی تیاری کرو۔"

"ابا آپ کس مکان میں رہنا پسند کریں گے۔" انور نے پوچھا۔

"میں اپنے پرانے مکان کو ہی آباد رکھوں گا۔" وہ بولے۔

"نہیں ابا آپ میرے ساتھ رہیں گے۔" انور نے کہا۔

"تمہارے ساتھ رہ کر میں سب کو ناراض نہیں کر سکتا۔ تمہارا جتنا حق ہے، اتنا ہی سب کا ہے۔"

یہ آبادی جہاں یہ مکان اور بہت سے مکان بنائے گئے تھے، کسی زمانے میں ایک بہت بڑا میدان ہوا کرتا تھا۔ اس میدان میں بہت سی لڑائیاں بھی لڑی گئی تھیں۔ ہزاروں لوگ اس میدان میں قتل بھی ہوئے تھے اور ان کی لاشیں اسی میدان میں بے گور و کفن مٹی میں دبا دی گئی تھیں۔ ان میں کس کس مذہب کے لوگ مارے گئے تھے، کیا کہا جا سکتا ہے۔

کس کس نواب کے عتاب سے یہ زمین لاشوں سے پُر تھی۔ کتنے بے قصور اس مٹی میں تھے۔ زمین کھودنے پر ایسے آثار نظر تو آتے تھے مگر ان پر کسی نے غور نہیں کیا تھا۔ آبادی اتنی تیزی سے بڑھی تھی کہ ہر طرف مکانات نظر آتے تھے۔ زین آباد ایک اچھی بستی بن گئی تھی۔

سلامت علی کے چاروں مکان آباد ہو گئے تھے۔ اس مکان میں آ کر ان کو احساس ہوا کہ ہم پہلے کہاں پڑے تھے۔ ابا نے ہمیں کتنا بڑا تحفہ دیا ہے۔

انور میاں نے شادی نہیں کی تھی مگر وہ کسی بھائی کے ساتھ نہیں رہے انہوں نے اپنا مکان ہی آباد کیا۔ سلامت علی تو کہہ ہی چکے تھے کہ وہ اپنے پرانے مکان میں رہیں گے۔

انور میاں کا کہنا یہ تھا کہ وہ جس بھابی کو کہہ دیتے، ان کو مل جاتا تھا۔ ان کے مکان میں ان کے یار دوستوں کا میلا لگا رہتا۔ کوئی نہ کوئی محفل جمی رہتی۔ شہر کے لوگ محفلوں میں شرکت کرتے۔ سلامت منزل پورے شہر میں ادبی محفلوں اور مشاعروں کے لئے مشہور ہو گئی۔

مشاعرہ ایک رات دو بجے ختم ہوا اور سب شاعر اور سامعین چلے گئے۔ انور میاں بھی اپنے کمرے میں آ گئے۔ آنکھ لگتے ہی انہوں نے محسوس کیا جیسے کوئی ان کو جگا رہا ہے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ مگر کمرے میں بلب روشن تھا اور کمرہ خالی تھا۔ وہ پھر لیٹ گئے۔ مگر آنکھ لگتے ہی پھر دوبارہ ان کو اٹھا دیا گیا۔ وہ بڑے حیران ہوئے، کمرہ خالی ہے اور بار بار ان کو اٹھایا جا رہا ہے۔ وہ ڈرپوک نہیں تھے۔ مگر ان حالات میں کوئی بھی حیران تو ہوتا ہی ہے۔ وہ پھر لیٹ گئے مگر آنکھیں کھلی رکھیں۔ کچھ نہ ہوا مگر کب تک پھر نیند کا جھونکا آ گیا۔

اور پھر کسی نازک ہاتھ نے ان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ پوری طرح نیند میں نہیں تھے۔ اس لئے محسوس کر لیا کہ اٹھانے والی کوئی عورت تھی۔ اب وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور دروازہ کھول کر صحن میں آ گئے۔ دور دور کسی کا نام و نشان نہیں تھا۔ انور میاں کی زندگی میں کبھی ایسا پراسرار اور عجیب واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ ان کے چہرے پر حیرت برس رہی تھی۔ کچھ دیر وہ وہیں پر جمے کھڑے رہے اور پھر مڑ کر کمرے کی طرف

READING CORNER
http://readingcornerurdu.blogspot.com/

چلے کہ ان کے کانوں میں کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔ جل ترنگ کی طرح کھنکتی آواز جیسے کسی نے تنے تار پر انگلی سے چھیڑ خانی کی ہو۔ وہ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ آواز بند ہوگئی۔ اب تو وہ حیرتوں کے نیچے گویا دب گئے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ آخر کب تک کھڑے رہتے۔ پھر کمرے کی طرف کا رخ کیا۔ مگر وہی ہنسی پھر سنائی دی۔ اب تو انور میاں کا دل گھبراہٹ سے بیٹھنے لگا۔ ان کو ایسا لگا جیسے وقت کی نبض تھم گئی ہو۔ اس اکیلے مکان میں وہ بالکل تنہا تھے۔ کس کو آواز دیں کس کو پکاریں۔ آدھی رات ہر کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا۔ کوئی نظر نہیں آتا کیا کروں، کس سے مدد لوں۔ وہ پھر کمرے کی طرف چلے مگر پھر آواز آئی۔ ایک گھنٹی کی سی آواز "ڈرتے ہو، میں اتنی ڈراؤنی تو نہیں۔" انور میاں نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک اندھیرے کمرے کے دروازے پر ایک ہیولا سا کھڑا تھا۔ اس کا باریک لبادہ ہوا سے اڑ رہا تھا۔ وہ باد و بہار کے جھونکوں کی طرح قریب رک گئی۔ اس کی آنکھیں انور میاں کے حواس پر چھائی جا رہی تھیں۔ اس کے گداز بدن کی تپش جھلسائے دے رہی تھی۔ انور میاں ایک سنگی بت کی مانند خاموش کھڑے اس کو دیکھ رہے تھے۔ اتنا حسین پیکر انہوں نے پہلے کب دیکھا تھا۔ ان کی شاعری کی محبوبہ بھی اتنی حسین نہ تھی۔ ان کے تصور سے بڑھ کر یہ حسن تھا۔ ان کا مبہوت ہو جانا تو قدرتی بات تھی۔

وہ نازنین بھی بڑے غور سے ان کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی زبان بند تھی۔ مگر آنکھیں بات کر رہی تھیں۔ بہت سے سوال انور کی آنکھوں نے کر دیئے اور بہت سے جواب معلوم کر لئے۔ مگر ایک سوال کا جواب انور کو اب تک نہیں ملا تھا۔ بڑی دیر کے بعد ان کے لب ہلے اور وہ بولے۔

"تم کون ہو؟"

نازنین کے لب ہلے اور جواب ملا۔ "ابھی یہ سوال مت کرو، میری پیاس بجھ جائے گی تو میں جواب دوں گی۔"

"مگر میری بے چینی اور بڑھ جائے گی....." وہ بولے۔

"مدتوں سے جو بھٹکتی رہی ہوں۔ اس کا تو تم احساس کرو۔" وہ بولی۔

"میں تم کو کس نام سے یاد کروں گا، یہ تو بتاؤ۔" انور نے کہا۔

"میرا نام شبنم ہے۔ یہ تو یاد رہے گا۔"

"شبنم کی زندگی تو بہت کم ہوتی ہے۔ پتوں پر پڑی شبنم دھوپ نکلتے ہی پگھل جاتی ہے۔ کچھ دیر پا نام بتاؤ۔" انور نے کہا۔

"تم شاعر ہو، ہر بات میں بات پیدا کر لیتے ہو۔ شبنم پاک بھی تو ہوتی ہے۔ یہ تو سوچا ہوتا۔"

"تم نے یہ نام خود اپنا رکھا ہے۔" انور نے پوچھا۔

"یہ نام زمانے نے رکھا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"زمانے نے ٹھیک نام رکھا ہے۔ تم زندہ ہو، تم کس طرح اس بند مکان میں آئیں۔ یہ تو بتاؤ۔" انور نے پوچھا۔

"ابھی بہت کچھ بتانا باقی ہے۔ میں صرف یہ دیکھنے آئی تھی کہ تمہاری آنکھوں میں میرے لئے کیا ہے۔ اور میں نے دیکھ لیا کیونکہ عورت مرد کی آنکھوں میں سب کچھ دیکھ لیتی ہے۔ میں پھر آؤں گی، کب یہ نہیں بتا سکتی۔ مگر تم سے ملے بنا میں رہ نہیں سکتی۔ تم میرے جنم جنم کے ساتھی ہو۔" اور پھر وہ ہوا میں تحلیل ہوگئی۔

انور ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ "یہ خواب تھا مگر میں تو کھڑا ہوں، جاگ رہا ہوں، پھر خواب کیا معنی۔ اگر یہ حقیقت تھی تو یہ کیسی حقیقت تھی۔ وہ حسینہ کون تھی۔ جس کا نام شبنم تھا۔ کون بتلائے گا، کس سے پتہ کروں، کیا کوئی میری بات سمجھ پائے گا۔ کیا میں مذاق نہ بن جاؤں گا۔ بہتر یہی ہے کہ خاموش رہوں۔" اور انور نے اس بات کا ذکر کسی سے نہ کیا۔ دماغ میں البتہ اس کے وہ حسینہ موجود رہی۔ دوبارہ اس کو دیکھنے کی خواہش بڑھتی رہی۔ وہ ہر رات بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا اور ایک ہفتہ گزر گیا۔ ہفتہ کی رات وہ کسی محفل سے رات بارہ بجے واپس آیا۔ اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ آج بھی اس کے تصور میں شبنم تھی۔ اس نے سوچا، کاش وہ آجائے۔ اچانک اس کے کانوں میں جل ترنگ کی طرح کھنکتی آواز آئی۔ "تم نے یاد کیا اور میں آگئی۔" وہ بستر

سے تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

دروازے پر سفید لبادے میں ملبوس شبنم کھڑی تھی۔ سفید لبادے میں اس کا بدن دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ وہ بے چین ہوگیا اور اس کی طرف بڑھا۔ شبنم نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو روک دیا۔ اور بولی۔ "ابھی صبر کرو، میں تمہاری ہوں۔ میں نے تمہارا انتظار کیا ہے۔ تم بھی ذرا صبر کرو۔ تمہاری جلد بازی پھر ہماری جدائی کا باعث بن جائے گی۔"

"تم نے مجھے پاگل بنا دیا ہے، جادو کر دیا ہے، میں کیا کروں۔" وہ بولا۔

"عشق تو جادو ہی ہوتا ہے۔ یہ سر چڑھ کر تو بولتا ہی ہے۔ مگر جنم جنم تک بولتا ہے۔ یہ تم کو نہیں پتا ہوگا۔ میں تمہارے ہر جنم میں تمہارے پاس آئی ہوں مگر ہر جنم میں ناکام ہوئی، اس دفعہ ناکام ہونا نہیں چاہتی۔"

"تم کب سے ہو اور میرا یہ کون سا جنم ہے۔" انور نے پوچھا۔

"تم نے یہ ساتواں جنم لیا ہے اور ہر جنم میں تم نے پوری زندگی گزاری ہے تو اندازہ کر لو، میں کب سے ہوں۔"

"تم مجھے چکر میں ڈال رہی ہو۔ میں مسلمان ہوں۔ بار بار جنم لینا ہمارے مذہب میں نہیں ہے۔ میں اس کو نہیں مانتا۔ میں حیات بعد الموت پر یقین رکھتا ہوں۔ مرنے کے بعد ایک بار پھر ہمیں زندگی ملے گی اور وہ دن ہوگا حشر کا اور اس روز ہم اپنی زندگی کا اپنے اعمالوں کا حساب دیں گے۔" انور نے جواب دیا۔

"میں تم کو مجبور نہیں کرتی۔ تم نہ مانو مگر میں صرف یہ جانتی ہوں کہ میں تمہارا انتظار کرتی رہی ہوں۔ مجھے اس کتھا سے سروکار نہیں، بس تم صرف میرے من کے مندر کے دیوتا ہو۔ ایک طویل مدت کے بعد تم مجھے مل جاتے ہو۔ بہت سی باتیں انسان نہیں مانتا مگر ان کا وجود تو ہوتا ہے۔ میں تمہارے سامنے ہوں۔ اسی مقام پر جہاں یہ گھر بنایا گیا ہے، میں موجود ہوں کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ میری منزل یہی مقام ہے۔ تم جس مقام پر جنم لینے والے ہوتے تھے، میں اس مقام پر آجاتی تھی۔ تم نے ہی یہ مکان کیوں لیا۔ کوئی اور بھی تو لے سکتا تھا۔ مگر نہیں لیا کسی نے۔ تمہارے باپ نے یہ جگہ خریدی اور میں مکان بنتے اور آبادی ہوتے دیکھتی رہی۔ کیونکہ تم کو یہاں آنا تھا اور تم آئے۔ کیا تم اس حقیقت کو جھٹلاؤ گے۔"

ایک تو حسن کا جادو اور پھر بیان کا جادو، انور کے سر پر چڑھ رہا تھا۔ باریک لبادے میں شبنم کا جھانکتا بدن اتنا سڈول کہ سنگ مرمر کے مجسمے اس کی چکناہٹ اور تراش کے آگے سر جھکا دیں۔ اس کی حسن اور جوانی ایسی تھی کہ انسان اپنی سدھ بدھ بھول جائے۔ انور تو ایک شاعرانہ مزاج کا نوجوان تھا۔ اس کا بہکنا کون سا مشکل تھا۔

"تم مجھے ہر جنم میں ملے مگر میں تم کو اپنا نہ سکی۔ کبھی تم مجبور تھے۔ کبھی میں مجبور تھی۔ میری تمام حسرتیں کبھی پوری نہیں ہوئیں۔ تم ہر جنم میں مجھے بھول گئے۔ میں نے ہر دفعہ تم کو یاد دلایا۔ مگر سب بیکار گیا اور اس طرح چھ جنم بیت گئے۔ دیکھ لو میں ویسی کی ویسی ہوں۔ اس لئے کہ مجھ پر گزرتے وقت نے اپنا اثر نہیں ڈالا۔ وقت شریر پر اثر ڈالتا ہے۔ روح پر اس کا زور نہیں چلتا۔ میں ایک ترسی ہوئی آتما ہوں۔ میرا صرف ایک جنم ہوا ہے اور میں اسی جنم سے اس دنیا میں موجود ہوں۔"

انور علی حیران اس کی باتیں سن رہا تھا۔ خاموش تھا۔

"کیا تم مجھے حاصل کرنا نہیں چاہتے؟" شبنم نے پوچھا۔

"ہاں میں تم کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تم میرے تخیل سے زیادہ حسین ہو۔" انور نے کہا۔

"اور میں بھی تم کو پانے کے لئے بے چین ہوں۔" شبنم نے جواب دیا۔

"مگر ہمارا ملاپ کس طرح ہوگا۔" انور نے پوچھا۔

"میں تم کو بتاؤں گی، تم راضی ہو، میرے لئے یہی بڑی بات ہے۔ میں اس جنم میں تم کو ضرور پالوں گی۔ تم کو ذرا صبر کرنا ہوگا۔ وقت آنے پر میں تم کو ہمیشہ کے لئے اپنا لوں گی..... میری آتما تمہاری روح میں ضم ہو چکی ہے۔ میری بے چینی کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں جنم جنم کی پیاسی ہوں۔"

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

انور علی کی دنیا ہی بدل گئی۔ اس کے خیالات میں ہر وقت وہ پری پیکر رہنے لگی نہ اس کو کھانے کا ہوش رہا نہ کسی اور کام کا۔ صحت دن بدن گرتی گئی۔ اس نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔

یار دوستوں نے محفلوں میں لے جانے کی کوششیں کرلیں۔ سارے بھائی پریشان، باپ کی حالت خراب مگر وہ اپنے کمرے سے باہر جانے پر راضی نہ ہوتا، سب نے پوچھا مگر وہ کچھ نہ بتاتا۔

آخر تمام کوششوں کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ضرور کچھ اور چکر ہے۔ کسی سیانے کو بلایا جائے۔

ایک پنڈت آئے۔ انہوں نے کچھ کرنا چاہا مگر وہ پہلی رات ہی ایسے بھاگے کہ پلٹ کر خبر نہ لی۔

کئی آئے اور ان کو بھی الٹا لٹکا دیا گیا۔ اب کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ انور میاں پر کوئی سایہ ہے۔ بڑوں نے مشورہ کیا کہ ان کی جگہ بدل دی جائے مگر وہ کہیں جانے پر تیار ہی نہیں ہوتے تھے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ خاموشی سے ان کو پرانے مکان میں پہنچا دیا جائے۔ بڑی دقتوں کے بعد ان کو گاڑی میں ڈال کر پرانے مکان پر پہنچایا گیا۔ مگر ان کی حالت میں تبدیلی نہیں آئی۔ وہ رات بھر نہ معلوم کس سے باتیں کرتے۔ کمزوری اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ کھڑے نہیں ہوسکتے تھے۔ لکھنو میں کالے بابا بہت مشہور آدمی تھے۔ وہ ہر قسم کا اتارا کرتے تھے۔ بھوت پریت کے ماہر تھے۔ ان کو بلایا گیا۔

کالے بابا نے تین دن رات، پڑھت کی مگر پھر یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ یہ میرے بس کا کام نہیں ہے۔ کالے بابا کی ناکامی نے سب کو اداس کردیا۔ سب پریشان ہوگئے۔

انور میاں کا جسم سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا۔ چہرہ پر صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ ہر قسم کے علاج ہورہے تھے مگر انور میاں کی حالت گرتی جارہی تھی۔ حکیم اور ڈاکٹر نے بتادیا تھا کہ جسم میں پانی کم ہورہا ہے۔ ان کے جسم میں زیادہ سے زیادہ پانی پہنچانے کی ہر کوشش ناکام ہورہی تھی۔ جب بھی یہ کوشش ہوتی، ان کو جلاب یا قے ہونے لگتی اور سب کچھ نکل جاتا۔ ہر طبیب اپنی سی کررہا تھا مگر حالت گرتی ہی جاتی تھی۔

میرے پاس ایک ارجنٹ پیغام آیا۔ مریض کی حالت بتائی گئی اور آنے کی درخواست کی گئی تھی۔ میں نے رولوکا کو بتایا اور ہم دونوں فوراً لکھنو روانہ ہوگئے۔ ہم دونوں پیغام ملنے کے تین روز کے بعد وہاں پہنچے۔ سلامت علی کا یہ مکان ایک حویلی کی شکل کا تھا۔ بہت بڑے کشادہ کمرے اور اونچی اونچی چھتیں اور بہت بڑا صحن، برآمدہ یہ مکان اتنا بڑا تھا کہ سلامت کا پورا خاندان رہ سکتا تھا۔

مگر سب کو ایک ساتھ ہی رہنا پڑتا۔ سلامت علی دور اندیش آدمی تھے۔ آنے والے وقت کے تقاضوں کو خوب سمجھ رہے تھے۔ اس لئے انہوں نے سب کے لئے الگ الگ بندوبست کردیا تھا۔ مریض کو ایک بہت صاف ستھرے کمرے میں رکھا گیا تھا۔

ہم نے جاتے ہی اپنا کام شروع کردیا تھا۔ رولوکا نے کہا کہ آپ اپنی حکمت کا کام کریں۔ میں ذرا کچھ اور دیکھ لوں اور رولوکا چلا گیا۔ میں نے مریض کی طرف توجہ کی۔ ایک نظر میں ہی اندازہ ہوگیا کہ جسم کا پانی ختم ہونے کو ہے۔ میں نے ایک آزمودہ مشروب مریض کو پلایا۔ مگر چند منٹ میں ہی وہ منہ سے باہر آگیا۔ اتنی دیر میں رولوکا بھی آگیا اور بولا۔

"معاملہ کچھ اور ہے۔ ابھی کچھ نہ کریں۔ میں ذرا راستے بند کردوں۔" اور رولوکا پھر چلا گیا۔

چند منٹ کے ہی بعد وہ آگیا اور بولا۔ "اب علاج شروع کردیں۔ اس کا جسم پانی سے خالی ہورہا ہے۔ پہلے پانی اندر پہنچائیں اور پھر ہم دونوں نے اس کے حلق میں پانی اور ایک مجرب نسخہ پہنچانا شروع کردیا اور ایک گھنٹے تک ہم یہی کرتے رہے اور اب پانی باہر نہیں نکلا اور نبض بھی کچھ بہتر ہوگئی۔

ہم نے اپنا کام جاری رکھا اور مریض کی حالت پہلے سے اچھی نظر آنے لگی۔ مگر وہ اب تک آنکھیں بند کئے بے ہوش تھا۔ سانس ٹھیک آرہی تھی اور دوران خون بھی ہونے

لگا تھا۔

ہم متواتر کام کررہے تھے۔ نہ کھانے کا ہوش تھا نہ آرام کا۔ رولوکا نے اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد رات کو کہا۔

"میں نے یہ اندازہ کیا ہے کہ اس کے جوڑ سوکھ گئے ہیں۔ یہ تندرست ہونے کے بعد بھی جوڑوں کی تکلیف میں مبتلا رہے گا۔ ہڈیوں کا لعاب جو جوڑوں کو چکناہٹ دیتا ہے، ختم ہوگیا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جوڑوں کو چکناہٹ پہنچائی جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ چلنے پھرنے سے معذور ہوسکتا ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"تمہارے پاس اس کا کیا علاج ہے۔" میں نے پوچھا۔

"میں اس کی دوائی جانتا ہوں مگر اس کا یہاں ملنا دشوار ہے۔ اگر جنگلات میں ہوگی تو تلاش کرنا ہوگا۔ اور تلاش کرنے میں وقت زیادہ لگے گا۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ افریقہ کے جنگلات سے اس کو منگواتا ہوں۔ وقت تو اس میں بھی لگے گا مگر پھر بھی تلاش کرنے سے کم ہی ہوگا۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تم جو کروگے ٹھیک ہی ہوگا۔" میں نے کہا۔

رولوکا نے ایک طرف اشارہ کیا اور پھر نہ معلوم کون سی زبان میں باتیں کرنے لگا اور ہاتھ کے اشارے بھی کرتا گیا اور پھر میری طرف مخاطب ہوا۔ "میں نے ہرکارے کو روانہ کردیا ہے۔ وہ بہت تیز رفتار ہے۔ زیادہ سے زیادہ تین دن میں دوائی آجائے گی......" رولوکا باہر چلا گیا اور میں اپنے کام میں لگ گیا۔

ہمارے اشارے کے منتظر کئی لوگ تھے۔ سلامت علی بھی ہمارے قریب رہے۔ مگر ہم نے کسی سے ابھی تک کچھ نہیں پوچھا تھا۔ وہ لوگ حیران تھے کہ ہم آتے ہی علاج میں لگ گئے۔ ہم نے ان سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ میں ضرور ان سے پوچھتا مگر مریض کی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ چند گھڑیوں کا مہمان نظر آتا تھا۔ ہم پوچھ گچھ میں اپنا وقت برباد نہیں کرسکتے تھے۔ مریض کی جان بچانے میں ہم لگ گئے تھے اور اب کچھ بہتری نظر آرہی تھی۔

تین روز کے بعد شام کو رولوکا ایک گٹھری اٹھالایا اور بولا۔ "لو حکیم صاحب دوا آگئی۔"

یہ دوا تین کونے کے پان کے برابر پتے تھے۔ یہ موٹے موٹے تھے اور ہر پتہ وزن رکھتا تھا۔ اس کو اگر موڑ کر دبایا جائے تو ٹوٹ جاتا تھا اور ٹوٹنے پر سفید لعاب بہتا تھا اور اس میں بہت چکناہٹ محسوس ہوتی تھی۔

رولوکا نے بتایا۔ "اور اس کا استعمال یہ ہے کہ یہ پتے جسم کے ہر جوڑ پر باندھ دیئے جائیں گے۔ اس کی یہ خاصیت ہے کہ پتے کی چکناہٹ خود بخود اندر چلی جائے گی اور پتہ سوکھ جائے گا۔ جب سوکھ جائے تو دوسرا باندھنا ہے۔"

"یہ تو حیرت انگیز پتہ ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں یہ حیرت انگیز پتہ ہے۔ آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ یہ درخت زیادہ اونچا نہیں ہوتا۔ مگر ہوتا بڑی خطرناک جگہ پر ہے۔ کیونکہ یہ آدم خور درخت یا گوشت کھانے والے درختوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اس تک پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ اس کے پتے انسانوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور اس کے پڑوسی درخت انسانوں اور جانوروں کو ہڑپ کرتے ہیں۔ آپ اس دوا کا اثر بہت جلد دیکھیں گے۔ یہ مریض جو بے حس پڑا ہے۔ اس کے ہاتھ پیروں میں کتنی جلدی توانائی آتی ہے۔ یہ کوئی جادو ٹونہ نہیں ہے۔ یہ دوائی ہے جو قدرت نے پیدا کی ہے۔" رولوکا نے بتایا۔

"میری زندگی کا یہ انوکھا تجربہ ہوگا۔ میں نے آج تک ایسی دوا استعمال نہیں کی اور نہ اس کی بابت جانتا ہوں۔" میں نے اعتراف کیا۔

"یہ پتے سایہ میں ایک ماہ تک ہرے رہیں گے اور ان کو استعمال کیا جاسکے گا۔ اس کے بعد ان کا رنگ بدل کر مٹیالہ ہوجائے گا مگر پھر بھی بیکار نہیں ہوں گے۔ ان کا سفوف بنایا جاسکتا ہے اور جوڑوں کے درد کے لئے اکسیر ہوتا ہے مگر اس کو حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ اپنی جان ہتھیلی پر رکھنا

READING CORNER

پڑتی ہے۔" رولوکا نے بتایا۔

تین دن کے بعد مریض نے آنکھیں کھول دیں اور ہاتھ پیر بھی ہلائے۔ رولوکا نے سلامت علی سے پہلی دفعہ بات کی۔ "مبارک ہو، آپ کا بیٹا اب ٹھیک ہے۔"

سلامت علی جو ناامید ہو چکے تھے۔ ممنونیت بھری آواز میں بولے۔ "آپ دونوں نے جتنی محنت اور لگن سے میرے بیٹے کی جان بچائی ہے۔ میں اس کا احسان تو کیا اتار سکوں گا، ہاں جب تک زندہ رہوں گا، آپ کے حق میں دعائیں ہی کروں گا....."

"اور ہم صرف محتاج ہی دعاؤں کے ہیں۔ ہمارا معاوضہ ہی یہ ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے کسی نے آپ کے متعلق بتایا تھا۔ میں نے آپ دونوں کو اس کے بتائے سے بھی بہت زیادہ پایا ہے۔ آپ نے اپنا کھانا پینا اور آرام سب کچھ چھوڑ دیا۔" سلامت علی سر جھکا کر بولے۔

"آپ خود پر کوئی بوجھ نہ لیں۔ یہ ہماری ڈیوٹی ہے۔" میں نے کہا۔

"میری سمجھ میں اب تک مرض نہیں آیا۔" وہ بولے۔

"مرض کچھ نہیں تھا اور ابھی وہ مرض گیا بھی نہیں ہے۔ صرف اتنا ہوا ہے کہ مریض کے قریب وہ نہیں آ پا رہا۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"آخر وہ کیا ہے۔" وہ پھر بولے۔

"ابھی میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ پہلے مریض اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔ اس کے بعد مرض کا بندوبست ہوگا۔ مگر آپ بے فکر ہو جائیں آپ کا بیٹا عنقریب اٹھ کر چلے گا۔" رولوکا نے تسلی دی۔ اور پھر جلد ہی انور میاں پہلے جیسے ہو گئے۔ ان کی بیماری ایک بھیانک خواب سب کے لئے بن گئی۔ ان کا جشن صحت بھی منایا گیا۔ اس کے بعد رولوکا نے کہا۔

"سلامت صاحب اب ہم بیماری کو پکڑتے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ وہ گئی نہیں۔ انور میاں کے ارد گرد رہتی ہے۔ اگر اس کا پکا انتظام نہ کیا تو پھر حملہ آور ہو سکتی ہے۔"

"آپ بہتر جانتے ہیں۔" سلامت علی نے جواب دیا۔

"آج رات میں یہ کام کروں گا۔ آپ ایک کورا مٹکا چھت پر اوندھا کر کے رکھوا دیں۔ یاد رہے کہ یہ کورا ہو اور کہیں سے ٹوٹا پھوٹا نہ ہو۔ اس کے چاروں طرف گیندے کے تازہ پھول ڈلوا دیں۔ اگربتیوں کے دو چار پاکٹ اور رتن جوت کے پھول اور پتے بھی منگوا لیں اور اگر کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو میں لے آؤں گا۔ آپ یہاں رہیں تو بہتر ہے۔ مریض کے پاس ایک آدمی رہے گا۔ آپ میرے ساتھ رہیں گے۔ جو کچھ ہوگا وہ آپ کے سامنے ہوگا۔ اوپر چھت پر ہم صرف تین آدمی جائیں گے۔ میں آپ اور حکیم صاحب۔ یہ کام رات بارہ کے بعد ہوگا۔"

رولوکا تو اپنا پورا انتظام پہلے ہی کر چکا تھا اور پھر ہم سب ٹھیک بارہ بجے چھت پر چلے گئے۔ بہت بڑی چھت تھی۔ درمیان میں ایک گھڑا اوندھا رکھا تھا۔ اس کے اطراف میں پھول پڑے تھے اور اگربتی کے پاکٹ اور ماچس بھی پڑا تھا۔ رولوکا نے سب چیزوں کا معائنہ کیا اور بولا۔

"نیچے ایک آدمی آنے والا ہے، آپ لوگ جائیں اور اس کو اوپر لے آئیں۔" میں اور سلامت علی نیچے آئے تو دیکھا کہ ایک پنڈت نما آدمی کھڑا تھا۔ میں پوچھا کہ آپ کون ہیں تو وہ بولا۔

"میں پنڈت ہوں، قریبی مندر میں رہتا ہوں۔ مجھے بلایا گیا ہے کہ کسی کا اتم سنسکار کرنا ہے۔ ارتھی کہاں ہے۔" میں نے کہا کہ آؤ ہمارے ساتھ اور ہم اوپر آ گئے۔ اوپر رولوکا نے پنڈت سے کہا۔

"جو کچھ یہاں تم دیکھو اور سنو۔ وہ یہیں پر بھول جانا۔ ہرگز یاد نہ رکھنا اور تم کو جو کہا جائے وہ کرنا۔"

چھت کی مغربی دیوار کے ساتھ ہم سب بیٹھ گئے۔ کچھ دیر رولوکا بھی ہمارے ساتھ بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر اوندھے رکھے مٹکے کی طرف چلا۔ چند منٹ خاموشی رہی۔ پھر رولوکا کی آواز آئی۔

"اس چھت کی چار دیواری تیری حد ہے۔ اس سے

باہر جانے کی کوشش مت کرنا۔ تو میری نظروں کے سامنے ہے اور تیرے چاروں طرف سخت پہرہ ہے۔ مجھے تجھ سے کچھ بات کرنی ہے، اس میں تیرا فائدہ ہی ہے۔ اس لئے تو اس مٹکے میں آجا اور بات کر۔"

مگر رولوکا کی بات کا جواب نہیں آیا تو وہ پھر بولا۔

"میں بار بار ایک بات کو نہیں کہتا۔ اگر تو مٹکے میں نہ آئی تو میں پکڑ کر تجھے اس میں بند کر دوں گا اور پھر تیرا ٹھکانا سمندر کی تہہ میں ہوگا، وہاں تو قید رہے گی....."

پھر ہم نے دیکھا کہ مٹکا جو اوندھا رکھا تھا، سیدھا ہو گیا اور پھر اس کے اندر سے باریک مگر صاف آواز آئی۔ "اب بول میں نے تیرا کہا مان لیا ہے۔"

"اب تو بتا کون ہے اور تو نے انور کی جان لینے کی کوشش کیوں کی تھی۔"

چند منٹ خاموشی رہی۔ پھر آواز آئی۔ "یہ بہت لمبی کہانی ہے۔ کہاں سے بتاؤں۔"

"ساری رات پڑی ہے میں سن رہا ہوں تو بول۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"میں قنوج کے راجہ جے چندر راٹھور کی بڑی بیٹی کماری رکمنی ہوں۔ میری ماں ایک داسی تھی۔ اس لئے میرا نام تم نے نہیں سنا ہوگا۔ میری بہن کا نام سنجوگتا تھا۔ یہ راجہ کی رانی کی اولاد تھی۔ یہ وہی سنجوگتا ہے جو پرتھوی راج پر مرمٹی تھی۔ پرتھوری راج کی حکومت۔ اندر پت (دہلی) میں تھی۔ اور اس کو شہاب الدین غوری نے شکست فاش دی تھی۔

میں باندی زادی تھی۔ اس لئے میرے لئے کوئی موئبر نہیں ہوا۔ حالانکہ میں سنجوگتا سے زیادہ حسین تھی۔

مگر شہرہ سنجوگتا کا زیادہ تھا۔ اس کا سوئمبر ہوا اور اس نے برمالا پرتھوی کے پتلے کے گلے میں ڈال دی جو کہ پرتھوی کی بے عزتی کرنے کو بنایا گیا تھا اور پھر وہ اس کے ساتھ ہی بھاگ گئی۔ اور پھر راجہ جے چندر راٹھور اور پرتھوی راج کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہیں۔

میں جب پیدا ہوئی تھی تو پنڈت نے میری جنم پتری بنائی تھی۔ اس میں مجھے سخت منحوس قرار دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ راجہ اور رعایا دونوں کے لئے سخت منحوس ہے۔

سنجوگتا کے بارے میں پنڈت نے کہا تھا کہ یہ بدنامی کرے گی۔ لڑائیاں کرائے گی۔ پرنتو اس کا نام بہت دور تک مشہور ہوگا۔ میں تو منحوس ٹھہرائی جا چکی تھی۔ مجھ سے تو جان چھڑانی تھی۔ اس لئے میری لگن ایک سپاہی سے کر دی اور وہ بھی صرف ایک رات میرے پاس رہا اور پھر پرتھوی راج سے لڑائیوں میں زخمی ہو کر بھاگا اور بھاگتے بھاگتے اس میدان تک آ گیا۔ یہاں پر پہلے ایک دریا ہوا کرتا تھا۔ قنوج میں ایسی بھگدڑ مچی کہ جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔ پرتھوی راج نے راجہ جے چند کو دوڑا لیا۔

میں بھی کچھ لوگوں کے ساتھ بھاگی مگر پھر اکیلی رہ گئی اور اس جگہ تک آ گئی۔ یہ ایک جنگل سا تھا۔ اس مقام پر جہاں یہ مکان بنایا گیا ہے۔ مجھے ایک گھوڑے اور ایک آدمی کی سوکھی لاش ملی۔ میں نے گھوڑے کی زین اور ساز و سامان اور اپنے پتی کی انگوٹھی سے پہچان لیا کہ میں ودوا ہو چکی ہوں۔

میں صرف ایک رات کی دلہن ودوا ہو گئی۔ پھر میں نے اپنے پتی کی انگوٹھی چاٹ کر آتما ہتھیا کر لی۔ اور اپنے پتی کی آتما کی تلاش شروع کر دی۔ مگر وہ مجھے نہ ملی۔ میں پورے بھارت میں تلاش کرتی رہی اور لوٹ کر اسی مقام پر آتی رہی۔ چھ دفعہ میں نے دھوکا کھایا، میرا پتی نہ ملا۔

پھر میں یہیں پر بیٹھ گئی۔ مجھے وشواس تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن مجھے ملے گا اور اسی مقام پر ملے گا اور پھر ایک مکان اس جگہ بننا شروع ہوا۔ میں دیکھتی رہی، میں نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ اور پھر یہ آباد ہوا اور مجھے میرا پتی نظر آ گیا۔ میں نے چھ بار دھوکا کھایا تھا۔ اس بار میں ہوشیار تھی۔ میں نے اپنے بارے میں سب کچھ چھپایا اور پتی کو رجھانا شروع کر دیا۔ وہ بھی میری طرف مائل ہو گیا۔ میرے ساتھ جانے پر راضی ہو گیا۔ ہمارا ملاپ مشکل تھا۔ میں ایک آتما اور وہ ایک جیتا جاگتا انسان۔ میری سمجھ میں ملاپ کی صرف یہ صورت تھی کہ وہ بھی شریر کی قید سے آزادی پا لے اور پھر دونوں آتماؤں کا ملاپ ہو سکتا تھا۔ مگر شاید میں واقعی منحوس تھی۔ میں کسی کی نہ ہو سکی، کوئی میرا نہ ہو سکا۔ اب میں تیری

READING CORNER
http://readingcornerbook.blogspot.com/

قید میں ہوں۔ میں کتنی دکھی تھی، مرنے کے بعد دکھی رہی۔ تم خود اندازہ کرو۔" آواز بند ہوگئی تو رولو کانے کہا۔

"میرے پاس دو صورتیں ہیں۔ ایک تو تجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قید کردوں اور یہ میں نہیں کرنا چاہتا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تیری آتما جس کا کہ آتم سنسکار نہیں ہوا، کر کے تیری آتما کو وہیں روانہ کردوں، جہاں سے آئی تھی تو منحوس نہیں ہے بلکہ خوش قسمت ہے۔ کیونکہ سینکڑوں سال تو اس دنیا میں بھٹکتی رہی ہے مگر کسی نے تجھ پر قابو نہیں پایا۔ کسی کی نظر تجھ پر نہیں پڑی۔ اگر کوئی دیکھ پاتا تو تو اس کی غلامی میں ہوتی اور اس کے کام کرتی۔ اب بتا تو واپس جانا چاہتی ہے؟" رولو کانے پوچھا۔

آواز آئی۔ "پہلی صورت تو بہت بھیانک ہے۔ دوسری مجھے منظور ہے۔"

اور پھر رولو کانے پنڈت کو اشارہ کیا۔ وہ قریب آ گیا تو رولو کانے کہا۔ "یہ آتما تیرے دھرم کی ہے۔ دنیا میں بھٹک رہی ہے۔ اپنے عقیدے اور دھرم سے اس کا آتم سنسکار کردے اور اس کو عزت سے روانہ کردے۔ اب تیرا کام شروع ہوتا ہے۔"

اور پنڈت نے اشلوک پڑھنا شروع کردیئے۔ اگر بتیاں جلالیں اور مٹکے پر پھول ڈالنے لگا۔ پندرہ منٹ تک وہ یہ کرتا رہا اور پھر مٹکا اوندھا کر کے بولا۔

"کام ختم ہوا، آتما پرلوک سدھار گئی۔"

اس کے ساتھ ہی ہمارا کام بھی ختم ہوا۔ ہم نے واپسی کی تیاریاں شروع کردیں۔ مگر انور کی شادی میں روک لئے گے۔ بڑے دھوم دھام سے انور میاں کی شادی ہوگئی اور ہم پورے چھ ماہ بعد دلی روانہ ہوئے۔

☆.....☆.....☆

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ انسانی قرابت انسان کو کس قدر عزیز ہوتی ہے۔ اسی لئے آدمی کو مجلسی جانور بھی کہا جاتا ہے۔ تنہائی پسند کوئی کتنا ہی ہو، وہ بھی قرابت چاہتا ہے۔ بعض لوگ آدم بیزار لگتے ہیں مگر ہوتے نہیں۔ ان کے بھی کچھ دوست ہوتے ہیں۔ وہ ان سے ہنسی مذاق بھی کرتے ہیں اور ان سے مل کر خوش بھی ہوتے ہیں۔ وہ بھی کسی نہ کسی سے متاثر ہوتے ہیں۔ اکثر تو دیکھا گیا ہے کہ کوئی پتھر سے پتھر دل بھی ایک منٹ میں کسی کی قرابت سے متاثر ہو جاتا ہے۔

زندگی کی بساط پر ہر قسم کے مہرے موجود ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ مہرے اپنی مرضی سے حرکت کرتے ہیں۔ شطرنج کی بساط کے مہرے پابند ہیں۔ کھلاڑی کے ہاتھ کے اسی لئے وہ ذمہ داری سے بچ جاتے ہیں۔ اچھائی برائی کھلاڑی پر ہی آتی ہے مگر زندگی کی بساط پر ایسا نہیں ہے۔ ہر مہرہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ اس کا ہر فعل اس کی مرضی سے ہوتا ہے اور وہی اس کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ قدرت نے انسان کو عقل سے نوازا ہے۔ اس سے یہ اپنے لئے راستہ چنتا ہے۔ جبکہ حیوانات میں یہ بات نہیں۔ انسان صرف اپنی عقل کی وجہ سے تمام حیوانات سے ممتاز ہے۔ کیونکہ فطری میلان کو پورا کرنے میں عقل اس کی معاون و مددگار ہوتی ہے۔ انسان کی فطرت میں برائی نہیں ہے مگر اپنے عمل سے خیر یا شر کماتا ہے۔ عمل یہ اپنی عقل سے کرتا ہے اور یہ عقل ہی اس کا نفس بھی ہے۔ یہ اگر قابو میں رہے تو ولی اور بے قابو ہو جائے تو ابلیس کا چیلا بن جاتا ہے۔

بے شک عقل میزان عدل ہے۔ جب پلڑا برائی کی طرف جھکتا جاتا ہے تو انسان گناہوں کے دلدل میں ڈوبتا جاتا ہے اور جب اچھائیوں کی طرف جھکتا ہے تو انسان عرفان آگہی کی منزل پالیتا ہے۔

نام تو ان کا فضل خان تھا مگر محلے کے سب لوگ ان کو فجو میاں کہتے تھے۔ ان کے ابا ہارمونیم بجانے کے استاد تھے۔ یہی پیٹی ان کا روزی روزگار تھا۔ بڑے مندروں میں خاص موقعوں پر بلائے جاتے تھے۔ بڑی محفلوں میں گانے والوں کی سنگت کے لئے ان کو بلایا جاتا تھا۔ بہت اچھے فن کار تھے۔ مگر جتنے اچھے فن کار تھے۔ اتنی ہی خراب لت ان کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ وہ کوئی محفل بوتل کے بغیر نہیں کرتے تھے۔ سب جانتے تھے کہ استاد فخر الدین پہلے بوتل طلب کرتے ہیں۔ لوگ ان کے فن کے قدر دان تھے۔ ان کی

فرمائش پہلے پوری کرتے تھے۔ فجو میاں کی پیدائش کے بعد بھی ان کا طریقہ کار نہ بدلا۔ بہت کمایا اور بوتل پی گئے۔

فجو میاں چار سال کے ہوئے تو ان کی تعلیم شروع ہوگئی اور دس سال کی عمر میں وہ محفلوں میں جانے لگے۔ استاد فخر الدین کا بہت نام تھا۔ ان کا بیٹا ان سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہ تھا۔

اس دور میں پیٹی ماسٹر کی قدر طوائف کے کوٹھے پر سب سے زیادہ ہوتی تھی۔ مگر استاد فخر الدین نے کبھی کسی کوٹھے پر پیٹی نہیں بجائی۔ ان میں لاکھ برائیاں تھیں مگر اپنے فن کو وہ طوائف کے کوٹھے پر لے کر نہیں گئے۔ بڑے بڑے گانے والوں کی سنگت میں زندگی گزار دی۔ اب ان کا بیٹا اسی لائن پر چل رہا تھا۔

بڑی بڑی نامی گرامی گانے والیوں نے استاد فضل خان کو اپنے پاس بلایا مگر باپ کا کہا اور ان کے اصولوں کو اس نے پہلے باندھ رکھا تھا۔ اچھا برا وقت گزارا مگر کسی بائی کی قدم بوسی نہیں کی۔

استاد فضل خان وضعدار باپ کے بیٹے تھے۔ اس پر وہ ایک فن کار، ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ باپ کے انتقال کے بعد بھی ان کا چلن وہی رہا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ کوئی شوق نہیں کرتے تھے۔ بہت سادا زندگی گزارتے تھے۔ اسی لئے کم کما کر بھی محلے میں عزت سے زندگی گزار رہے تھے۔

فجو میاں کی سب ہی عزت کرتے تھے۔ موسیقی کے شوقین لڑکے لڑکیاں ان کے پاس شام کو آجاتے اور وہ بڑی لگن اور ایمانداری سے ان کو پیٹی بجانے اور راگ راگنی اور الاپ کے رموز بتایا کرتے۔ حالانکہ وہ گائیک نہیں تھے مگر رموز موسیقی اور گانے دونوں میں عبور رکھتے تھے۔ بہت بڑے گانے والوں سے ان کا واسطہ اور تعلق رہتا تھا۔ اچھے اور برے سب سے واسطہ تھا۔ وہ ہلکے گانے والوں سے دور رہا کرتے تھے۔ کیونکہ ان کی عادت ٹوک دینے کی تھی اور کم ظرف لوگ برا مان جاتے تھے۔ مگر ان کی عادت اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ وہ باز نہیں آتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ سچا فنکار وہی ہوتا ہے جو اپنی غلطی مان کر درست کرلے اور نہیں مانے گا تو وہ غلطیاں کرتا رہے گا جو متواتر غلطیاں کرتا ہے وہ بھلا فنکار کہاں ہوا۔ ان کے قدر دان بہت تھے۔ جو ان کو اور ان کے فن کو سمجھتے تھے وہ ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ ان کی سادگی میں بھی ایک بانکا پن تھا۔ محفل چاہے جتنی بڑی ہو گانے والا چاہے کوئی ہو، وہ سفید کرتا اور علی گڑھ پاجامے میں اپنی پیٹی کے ساتھ شرکت کرتے۔

شیریں بائی انبالے والی اپنے زمانے کی بڑی گانے والی تھی۔ ہر کسی محفل میں نہیں جاتی تھی۔ راجے مہاراجے اس کو بلاتے تھے۔ وہ ہر جگہ گاتی نہیں تھی اور منہ مانگی قیمت رات بھر کے گانے کی وصول کرتی تھی۔ بہت نک چڑی عورت تھی۔ مگر گانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔

دولت رام کڑا اچھے والے سہارن پور کے بہت بڑے بیوپاری تھے۔ جس زمانے میں روپے کا بیس سیر گندم بکا کرتا تھا۔ اس وقت وہ لکھ پتی کہلاتے تھے۔ ان کے ناز اور نخرے بھی کم نہ تھے۔ جس پر انگلی رکھ دیتے وہ چیز ہر قیمت پر خرید لیا کرتے۔

یہ تین کردار تھے جو اس کہانی کے لکھنے کا موجب بنے ہیں۔ ایک طرف سچے فن کار ہونے کا غرور تھا۔ ایک طرف اپنی آواز اور گائیکی ناز و ادا کا غرور تھا۔ تو ایک طرف دولت کا غرور تھا۔

دولت رام کڑا اچھے کی لڑکی کی بارات آنے والی تھی۔ اس زمانے میں باراتیں تین دن اور اس سے بھی زیادہ رکا کرتی تھیں۔ دولہا کی فرمائش تھی کہ شیریں بائی انبالے والی کا گانا پہلی رات ہوگا۔ دولت رام کے آدمی شیریں بائی کے پاس دوڑے۔ مگر اس نے انکار کردیا۔

مگر دولت رام ایک ضدی آدمی خود انبالہ چلے گئے۔ شیریں سے بولے۔ "بائی جی آنا تو آپ کو پڑے گا۔ میری عزت کا معاملہ ہے۔ میرا نام دولت رام ہے۔ تم یہ بتاؤ کیا لوگی۔"

شیریں بائی خوب زمانے کی ہوا دیکھ چکی تھی۔ بڑوں سے اس کا واسطہ رہا تھا اور بڑوں کی انا اور ضرورت سب کو

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

جانتی تھی۔ اس نے مسکرا کر دولت رام کو دیکھا اور بولی۔

"اللہ کا دیا سب کچھ ہے میرے پاس سیٹھ جی۔ بات رقم کی نہیں ہے۔"

"میرے خیال میں تو ساری بات رقم کی ہی ہوتی ہے۔" دولت رام بولے۔

"آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ ہم فنکار لوگ ہیں۔ ہمارے بھی کچھ اصول اور قاعدے ہوتے ہیں۔ آپ ٹھہرے بڑے آدمی۔ ان اصولوں اور قاعدوں پر آپ کو چلنا نہیں آتا۔" شیریں بائی نے کہا۔

دولت رام کو ذرا یہ بات ناگوار گزری بولے۔

"تو پھر تم گانے کیوں جاتی ہو ہر جگہ۔"

"میں راجے مہاراجوں کے دربار میں گاتی ہوں، ہر شخص سے اگاری نہیں کرتی۔ میرے گال پر اور سر پر نوٹ نہیں رکھے جاتے، شادی بیاہ محفلوں میں یہ سب خرافات ہوتی ہیں۔ آپ کس کس کو روکو گے اور میں یہ برداشت نہیں کروں گی۔ پھر بتاؤ میں نہ جاؤں یہی بہتر نہیں ہے۔" شیریں بائی نے کہا۔

"میں یہ پابندی لگا دوں گا کہ کوئی گانے کے دوران تم کو کچھ نہیں دے گا۔" دولت رام نے کہا۔

"یہ بہت مشکل کام ہے..... یہ نہیں ہو سکے گا۔" شیریں بائی نے جواب دیا۔

اب دولت رام کے پاس ایک ہی راستہ تھا۔ وہ یہ کب برداشت کر سکتے تھے کہ وہ خود آئیں اور یہ دو ٹکے کی گانے والی ان کی بات نہ مانے۔ ان کے سر پر تو دولت کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ ان کے نزدیک تو ہر چیز کی ایک قیمت تھی، کم یا زیادہ، وہ خرید نے پر آتے تو یہ کب دیکھتے تھے۔

غصے میں بولے۔ "دیکھو بائی جی۔ آنا تو تم کو پڑے گا۔ راضی سے آجاؤ تو اچھا ہے۔ میں قدر کروں گا۔ رہا روپے پیسے کا معاملہ تو اتنا دوں گا کہ راجے مہاراجے شرما جائیں گے۔"

"آپ پھر درمیان میں رقم کو لے آئے۔ بات ہے قدر دانی کی۔ میں طوائف ضرور ہوں۔ مگر ایک فنکارہ بھی ہوں۔ فنکار رقم کی طرف نہیں دیکھتا ہے۔ استاد فضل خان فنکار ہے۔ میں اس کو لاکھ روپے بھی دوں اور کہوں کہ میری سنگت کریں تو وہ لاکھ روپے ٹھکرا دے گا۔ یہ ہے فنکار۔ آپ ہیں کہ بار بار اپنی دولت کا رعب مجھ پر ڈال رہے ہیں۔ سیٹھ صاحب دولت ہر چیز نہیں خرید سکتی۔ آپ بھی اپنے دماغ سے یہ بات نکال دیں۔"

دولت رام کے لئے یہ بات نئی تھی۔ اس نے تو اب تک اپنی دولت سے جو چاہا خرید لیا تھا۔ مگر یہ کیا ایک ناچ گانا کرنے والی طوائف قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ اب وہ ذرا سوچ میں پڑ گئے۔ ذرا دیر خاموش رہے۔ پھر بولے۔ "میں تمہارا ہر مطالبہ پورا کروں گا۔ جس طرح کہو گی، انتظام کرا دوں گا۔ کوئی باراتی یا کوئی آدمی تمہارے قریب نہیں آئے گا۔ جس طرح درباروں میں گاتی ہو، اسی طرح گانا۔ اب بولو۔"

شیریں بائی بھی ایک کائیاں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ساری باتیں لے جانے کی ہیں۔ بارات کا ماحول وہ جانتی تھی۔ اب اس کے پاس منع کرنے کا صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔ اس طرح اس کی دیرینہ خواہش کی بھی تکمیل ہوتی تھی۔ وہ بولی۔

"آپ میرا صرف ایک مطالبہ پورا کر دیں، میں بارات میں گاؤں گی۔"

"بولو کتنی رقم تم کو درکار ہے؟" دولت رام جلدی سے بولے۔

"آپ پھر درمیان میں روپے کو لے آئے۔" شیریں بولی۔

"اچھا چھوڑو روپے کو تم مطالبہ بتاؤ۔"

"استاد فضل خان میرٹھ والے کو آپ جانتے ہیں۔"

دولت رام دو کے چار کرنے والے ان کا ان فنکاروں سے کیا واسطہ بولے۔ "میں نے تو نام ہی تم سے سنا ہے، میں کیا جانوں۔"

"یہ میرٹھ کے مشہور آدمی ہیں۔ فنکار برادری ان کو سب جانتی ہے۔ خاندانی فنکار ہیں۔ یہ ہر کسی کے ساتھ

سنگت نہیں کرتے۔ تم ان کو میری سنگت پر راضی کر لو۔ میں آجاؤں گی۔" شیریں بائی نے کہا۔

"لگتا ہے کہ ان کا معاوضہ کچھ بہت زیادہ ہے۔ خیر کوئی بات نہیں، میں لے آؤں گا۔" دولت رام بولے۔

"بات پھر رقم کی آپ لے آئے، آپ ان کو لے آئیں، میں گانے کا کچھ نہیں لوں گی۔ آنے جانے کا خرچ بھی خود کر لوں گی۔ آپ کی بارات سج جائے گی۔" شیریں نے کہا۔

"بس ٹھیک ہے تم تیاری کرو۔" دولت رام نے کہا۔

"تیاری تو میں جب کروں جب آپ مجھے بتائیں گے کہ استاد آنے پر تیار ہیں۔ اگر وہ نہ آئے تو میں نہیں آؤں گی۔ آپ نے میرا مطالبہ ماننے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ پہلے پورا کر دیں۔ میں سر کے بل چل کر آؤں گی۔" شیریں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں یہاں سے میرٹھ جاتا ہوں اور واپسی میں تم کو بتاتا جاؤں گا۔" اور دولت رام میرٹھ روانہ ہو گئے۔ شیریں نے دل میں کہا۔

"استاد بہت ٹیڑھی کھیر ہیں۔ وہ میرا نام سن کر ہی منع کر دیں گے۔"

میرٹھ کی پرانی آبادی میں استاد کا مکان تھا۔ دولت رام کے ساتھ ان کا ایک منشی ٹائپ آدمی بھی تھا۔ مکان ایسی جگہ تھا۔ جہاں تانگا بھی نہیں جا سکتا۔ پتلی پتلی گلیاں اور ان کے درمیان پانی کی نالی وہ ناک پر رومال رکھے جا رہے تھے اور پھر کسی نے بتایا کہ وہ سامنے جو کھپریل پڑی ہے۔ وہی استاد کا مکان ہے۔ منشی نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی تو ایک ادھیڑ عمر آدمی نے دروازہ کھول کر پوچھا، کس سے ملنا ہے۔

دولت رام تو شکل اور کپڑوں سے ہی دولت مند معلوم ہوتے تھے، آگے بڑھ کر بولے۔ "استاد فضل خان سے ملنا تھا۔"

اس ادھیڑ عمر آدمی نے ذرا غور سے دولت رام کو دیکھا اور بولا۔ "اچھا اندر آجاؤ۔" اور ان دونوں کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔

یہ ایک بہت بڑا سا کمرہ تھا۔ چھت کھپریل کی تھی اور وہ بھی کئی جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ سورج کی روشنی کمرے میں پھیل رہی تھی۔ زمین پر ایک دری پڑی تھی اور ایک چھلنگا چارپائی ایک طرف پڑی تھی۔ ایک جوڑی طبلے کی اور ایک پرانا ہارمونیم دری پر رکھا تھا۔ وہ ادھیڑ آدمی دری پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"ہاں جی اب بتاؤ کس سے ملنا ہے۔"

"استاد فضل خان سے ملنا ہے۔" منشی نے کہا۔

"تو پھر..... ہم ہی ہیں۔" وہ بولا۔

"آپ یہاں اس طرح رہتے ہیں۔ اتنے نام ور آدمی اور اس طرح حیرت ہو رہی ہے۔" دولت رام نے کہا۔

"حیرت کیوں ہو رہی ہے۔ ہیرا تو کوئلے کی کان میں ہی ملتا ہے۔" استاد نے جواب دیا۔

دولت رام کیا جواب دیتے بولے۔ "میرا مطلب تھا آپ اتنے بڑے فنکار جس کا نام دور دور لوگ جانتے ہیں۔ کچھ تو بہتر جگہ اور بہتر طریقہ پر آپ ہوتے۔"

"آپ کے خیال میں یہ جگہ اچھی نہیں ہے۔ مگر میں اسی گھر میں پیدا ہوا تھا، اسی گھر میں پلا ہوں، اسی گھر سے مجھے عزت ملی ہے، یہ گھر میری جنت ہے، آپ کو اگر پسند نہیں تو آنے کی زحمت کیوں آپ نے اٹھائی۔" استاد نے کہا۔

"آپ ناراض ہو گئے شاید۔" دولت رام نے نرمی سے کہا۔ "میں تو آپ کا نام سن کر آیا تھا۔ بڑی قدر میرے دل میں آپ کے لئے ہے۔ میں کچھ آپ کے لئے کرنا چاہتا تھا۔ آپ مجھے نہیں جانتے میرا نام دولت رام ہے۔ میرا سہارن پور میں بہت بڑا کاروبار ہے۔" دولت رام نے کہا۔

"دولت کے بیوپاری ہو مگر میں فن کا بیوپاری ہوں۔ فنکار کی اور دولت کی تو کبھی بنی ہی نہیں۔

دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، دونوں ہٹ دھرم ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی نہیں مانتے اور میں کیا کہوں۔" استاد نے کہا۔

"آپ تجربہ کار ہیں۔ ٹھیک ہی کہتے ہوں گے، میں

READING CORNER http://readingcornerpk.blogspot.com/

تو خدمت کرنے حاضر ہوا تھا۔" دولت رام نے کہا۔

"ہاں آپ نے بتایا نہیں کہ آنا کیوں ہوا؟" استاد نے پوچھا۔

"آپ کی ضرورت پڑ گئی ہے....." دولت رام بولے۔

"کیا ضرورت پڑ گئی، اس فقیر کی۔" استاد نے پوچھا۔

"ایک گانے والی ہے، کہتی ہے کہ میں استاد کی سنگت کے بنا نہیں گاؤں گی۔" دولت رام نے بتایا۔

"میاں فنکار کی تو ایک کل زیادہ ہوتی ہے۔ اگر نہ کرو ے تو ہاں مشکل ہوتی ہے۔ اگر وہ نہیں گاتی تو نہ گائے آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔ گانا سننا ہے تو کسی اور کا سن لو۔" استاد بولے۔

"استاد آپ بات کو نہیں سمجھے۔ بات آن کی اور عزت کی پوری بات آپ کو بتانا ہی پڑے گی۔ میری لڑکی کی بارات آنے والی ہے۔ داماد کی فرمائش ہے کہ پہلی رات شیریں بائی انبالے والی کا گانا ہوگا۔ بڑی مشکلوں سے وہ اس شرط پر مانی ہے کہ اگر میری سنگت استاد فضل خان میرٹھ والے کریں تو گاؤں گی..... بات یہ ہے۔" دولت رام بولے۔

"اور تم منہ اٹھا کر چلے آئے۔ ہم کیا سڑک پر پڑے ڈھیلے ہیں کہ اٹھایا اور دے مارا کسی کے منہ پر۔ میاں آپ دولت رام ہیں تو جائیں اپنی دولت کے ڈھیر پر بیٹھ کر چین کی بانسری بجائیں۔ اس طوائف سے کہہ دیں کہ ہم خاندانی لوگ ہیں۔ کسی طوائف کی سنگت نہیں کرتے اور آپ بھی سن لیں، ہم کوئی بکاؤ چیز نہ سمجھیں۔ یہ پیٹی لکڑی کی ہے۔ مگر اس پر ایک فنکار اپنا سبق یاد کرتا ہے۔ اس لئے یہ انمول ہے۔

آپ شاید مجھے خریدنے آئے ہیں۔ آپ اس لکڑی کی پیٹی کو بھی نہیں خرید سکتے۔ اس لئے کہ میں اس کو فروخت کروں گا ہی نہیں۔ آپ میرے گھر آئے ہیں، اس لئے میں آپ کو معاف کرتا ہوں۔ آپ شاید میری باتوں کو دیوانہ پن خیال کریں۔ مگر یہ صرف اور صرف احساس کی بات ہے۔ آپ میرے احساسات کو نہیں سمجھ سکتے۔ آپ جا سکتے ہیں۔" اور استاد اٹھ کھڑے ہوئے۔

دولت رام کو امید نہیں تھی کہ بات اتنی جلدی بگڑ جائے گی۔ ابھی تو اس نے لین دین کی بات کی ہی نہیں تھی۔ یہ کیسے بے وقوف لوگ ہیں جو آتی مایا کو ٹھکراتے ہیں۔ ٹوٹے گھر میں رہتے ہیں۔

اس نے اب تک اپنی زندگی میں ایسا آدمی نہیں دیکھا تھا۔ دولت رام کو غصہ تو بہت آیا مگر پھر خود کو قابو کر کے بولا۔ "استاد جی آپ کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوگا کہ میں آپ کو نہال کر دوں گا....."

"دولت رام جی نہال تو میں پہلے سے ہی ہوں۔ آپ مجھے کیا نہال کریں گے۔ میں دولت کا پجاری فنکار نہیں ہوں۔ آپ کو بہت مل جائیں گے، کوئی اور دروازہ کھٹ کھٹاؤ۔"

دولت رام جو بہت دیر سے خود کو قابو کئے ہوئے تھے، پھٹ پڑے۔ "میاں اپنی حالت تو دیکھو۔ پھر بات کرو۔"

"میری حالت کو کیا ہوا ہے۔ اگر زیادہ کی تمنا کرتا تو اپنی حالت پر دکھ ہوتا۔ میں تو اسی حالت میں خوش ہوں۔ پھر مجھے کچھ دیکھنے کی ضرورت کیا ہے؟"

"میں تمہیں زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچانا چاہتا تھا مگر تم گندگی کے پیداوار ہو۔" دولت رام نے غصے سے کہا۔

"میں جہاں ہوں، خوش ہوں۔ میاں تم اپنا کام کرو، تم کیا جانو، فن کو اور فنکار کو۔" استاد نے کہا۔

اور دولت رام بھی بھنا کے چل دیئے۔

یہ ان کی زندگی کا انوکھا تجربہ تھا۔ پہلے ان کو شیریں بائی نے حیران کیا اور اس سے زیادہ اس سنکی آدمی نے حیران کر دیا۔ کیا دولت اتنی بے کار چیز ہے کہ اس سے یہ دو کوڑی کا استاد قابو نہیں ہو سکتا اور ایک بازار میں بیٹھنے والی طوائف اس کو ٹھکرا دیتی ہے۔ "مگر میں ہار ماننے والا نہیں ہوں۔ اب یہ میری ضد ہے میری آن ہے۔ میں ان دونوں کو جھکا کر رہوں گا۔"

وہ واپس سہارنپور چلا گیا اور بارات ایک سال آگے بڑھا دی۔ اس نے کسی کو نہیں بتایا کہ یہ اس نے کیوں کیا۔ شیریں بائی پر اس نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنا چاہا۔

مگر وہ اپنی جگہ چٹان کی مانند مضبوط رہی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ دولت رام استاد کے پاس ناکام ہوا ہے۔ اس نے صاف جواب دے دیا کہ تم نے وعدہ کیا تھا، میرا مطالبہ پورا کرو گے نہ کر سکے تو میں کیا کروں۔"

دولت رام دولت کے نشے میں دھت تھے۔ اگر ذرا بھی ان کا نشہ کمزور ہوتا تو وہ استاد کی بات سمجھ جاتے مگر ان کو پورا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ سمجھتے تو کس طرح بہت سوچ بچار کے بعد وہ اپنے دوست کھرام شرما سے ملے اور بولے۔

"یار بڑی سبکی ہو رہی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔"

"کیوں کیا ہوا؟" شرما نے پوچھا۔

"یار ایک دو کوڑی کی گانے والی قابو نہیں آ رہی ہے۔" وہ بولے۔

"شرم کرو یار اس عمر میں طوائف بازی کرتے ہو۔" شرما نے کہا۔

"پوری بات سن لو، پھر بتاؤ۔" اور پھر دولت رام نے پوری کتھا سنا دی اور بولے۔ "اب بتاؤ۔"

"طوائف تو خیر ضدی ہوتی ہی ہے۔ ان کو صرف اپنا ہی فائدہ نظر آتا ہے مگر یہ دو ٹکے کا استاد کس پر پھول رہا ہے۔ ارے باجہ ہی تو بجانا ہے۔ بجا دے تم اس کو راضی نہ کر سکے۔" شرما نے کہا۔

"یار وہ بڑا ٹیڑھا آدمی لگتا ہے۔" دولت رام نے جواب دیا۔

"گھی اگر سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو ٹیڑھی کرنا پڑتی ہے۔" شرما نے کہا۔

"تو پھر تم ٹیڑھی انگلی سے ہی نکال دو۔" دولت رام بولے۔

"ٹھیک میں چلتا ہوں، تمہارے ساتھ۔" شرما نے کہا۔ اور دونوں پھر استاد فضل خان کے گھر پہنچ گئے۔

دروازہ پھر استاد نے ہی کھولا۔ دولت رام کو دوبارہ دیکھ کر استاد نے ناگواری سے کہا۔ "میاں تم پھر آ گئے۔ ایک دفعہ کا کہا کیا نہ کافی تھا۔" شرما جی آگے بڑھے اور بولے۔

"استاد آپ خفا نہ ہوں۔ یہ ذرا اناڑی ہیں، میری درخواست سن لیں۔"

"اچھا تم بھی اپنی سنا لو۔" استاد نے یہ کہا اور کہا۔ "آؤ اندر آ جاؤ۔"

اندر آ کر شرما نے اندر کا جائزہ لیا اور بولے۔ "استاد یہ جگہ آپ کے شان کی نہیں ہے۔ کچھ تو اپنا خیال کریں۔ پورے میرٹھ کیا پورے بھارت میں آپ کا ایک مقام ہے۔ مجھے بڑا دکھ ہو رہا ہے۔"

استاد نے بڑے تحمل سے ان کی بات سنی اور بولے۔ "میاں اگر آپ ہم کو کوئی سبز باغ دکھانے آئے ہیں تو پھر یہ کوشش نہ کریں۔ ہم تو ملنگ طبیعت کے آدمی ہیں۔ جس حال میں اللہ نے رکھا ہے، خوش ہیں۔ اب کوئی دوسری بات کرو، ہمارے سامنے کسی قسم کے لالچ کی بات نہ کرنا۔ یہ سب چیزیں اصولوں سے زیادہ قیمتی نہیں ہیں اور ہم ہیں اصولوں کے غلام۔" استاد نے جواب دیا۔

"ہماری تمنا تھی مگر آپ نے آگے بات کرنے کی گنجائش ہی ختم کر دی تو دوسری بات کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ اگر طوائف کی سنگت نہیں کرتے تو نہ کریں مگر یہ بات یاد رکھیں کہ آپ کسی کی بھی سنگت کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اسی گندی جگہ سڑ سڑ کر مر جائیں گے۔ کوئی بچانے نہیں آئے گا۔ ہم یہ طے کر کے آئے ہیں اور اس طوائف کا حشر بھی کم برا نہ ہوگا۔"

"ہم جانتے ہیں کہ آپ سرمایہ دار لوگ ہیں۔ کھاتے نہیں تو کڑھا دیتے ہیں۔ مگر تم کو اب تک ایسا کوئی پاگل نہیں ٹکرایا ہوگا جو سب کچھ جانتے بوجھتے بھی آپ کی بات ٹھکرا رہا ہے۔ ہم خدا پر شاکر رہنے والے آدمی ہیں۔ تم جو کر سکتے ہو وہ کر لینا۔ اب آپ تشریف لے جائیں۔"

شرما جی غصے سے بولے۔ "ہاں چلے جاتے ہیں مگر تو یاد رکھنا۔ میرا نام مکھ رام شرما ہے۔ میں دولت رام نہیں ہوں جو تم پر دیا کروں گا۔ میں پھر آؤں گا، آؤ دولت رام۔" اور دونوں غصے میں منہ سے جھاگ اڑاتے دروازے کے باہر آ گئے۔

باہر آ کر دولت رام نے کہا۔ "میں نا کہتا تھا بہت

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

ٹیڑھا آدمی ہے۔"

"تو پھر ہم بھی کم ٹیڑھے نہیں ہیں۔ اس کا تو میں ایسا حشر کروں گا کہ مرنے کی دعائیں مانگے گا اور مرے گا نہیں۔ اس کو اب تک کوئی ڈھنگ کا آدمی ٹکرایا نہیں ہے۔" اور دونوں سیدھے شیریں بائی کے پاس پہنچے اور تو جاتے ہی دولت رام نے کہا۔

"وہ تیرا استاد تو پاگل ہوگیا ہے۔ پوری بات سنتا ہی نہیں اور جواب دے دیتا ہے۔ اب تو بتا تیرا کیا ارادہ ہے تو اس کے بنا گائے گی کہ نہیں۔"

شیریں بائی اس کے انداز گفتگو سن کر ہنسا گئی اور بولی۔ "آپ نے تو ادب و آداب بھی کنارے کر دیا۔ میں ایسے لوگوں سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی جن کو گفتگو کا سلیقہ بھی نہ آتا ہو۔"

"تو دو کوڑی کی گانے والی عورت ہم کو سلیقہ سکھائے گی۔" شرما نے غصے سے کہا۔

"اپنی جگہ پتھر بھی بھاری ہوتا ہے۔ میں تو پھر ایک انسان ہوں۔ اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ آپ مجھے زبردستی کسی کام کو نہیں کہہ سکتے۔ میں ہرگز نہیں گاؤں گی۔ آپ جا سکتے ہیں۔ اگر آگے کچھ بات کی تو یہ نہ سمجھنا کہ میں عورت ہوں۔ ہمارے بھی ہاتھ پیر ہیں۔" شیریں بائی نے جواب دیا۔

"اور وہی ہاتھ پیر ہم باندھ دیں گے۔ آؤ دولت رام یہ دوسری ہی زبان سمجھتے ہیں۔"

باہر آکر شرما جی بولے۔ "دولت رام تم گھر جاؤ میں ان دونوں کا بندوبست کرنے کاشی جاؤں گا۔ وہاں پر میرے ایک متر ہیں۔ ان کے بہت بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں۔ وہی ان کا علاج کریں گے۔"

اور شرما جی کاشی روانہ ہوگئے۔

نریش کمار ان کے دوست تھے۔ وہ ان سے ملے اور پوری کہانی ان کو سنادی اور پھر نریش کمار ان کو لے کر ایک بہت بڑے آشرم میں گئے اور یہاں پر وہ دونوں جس آدمی سے ملے۔ اس کا نام پنڈت گوکل ناتھ تیواڑی تھا۔ تیواڑی نے پوری بات سن کر کہا۔

"یہ تو کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ دونوں کو دیکھ لیں گے۔ تم گھر جاؤ۔ چنتا کی ضرورت نہیں ہے۔"

اور شرما جی خوشی خوشی واپسی دولت رام کے پاس آگئے اور خوش خبری سنادی۔ ایک ہفتہ کے بعد خبر آگئی۔ شیریں بائی کی آواز بند ہوگئی ہے۔ اور استاد فضل خان پر فالج کا اٹیک ہوگیا ہے۔

شرما جی نے یہ خوش خبری دولت رام کو سنائی تو وہ بولے۔ "اس کا مطلب ہے کہ گوکل ناتھ تیواڑی نے کام دکھادیا۔"

"ارے وہ بہت کرو ہے۔ چھوڑے گا نہیں۔" شرما نے کہا۔

"مال بھی بھر پور لیا ہے اس نے۔ کام تو کرے گا ہی۔" دولت رام بولے۔

"اب تماشہ دیکھو ناک رگڑتے آئیں گے دونوں۔" شرما نے کہا۔

"تم نے تیواڑی کو بتا تو دیا تھا کہ مارنا کسی کو نہیں ہے، ہماری ضد تو یہ ہے کہ یہ گانا آکر گائیں گے۔" دولت رام نے کہا۔

"ہاں ہاں خوب اچھی طرح بتادیا تھا۔" شرما نے جواب دیا۔

شیریں بائی نے اپنا علاج کرانا شروع کر دیا تھا۔ مگر کچھ فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ ابھی تک کوئی ڈاکٹر، حکیم یہ پتہ ہی نہیں کر سکے تھے کہ آواز بند ہونے کی وجہ کیا ہے۔ مگر شیریں بائی کے پاس پیسہ تھا تو وہ اپنی بیماری پر خوب خرچ کر رہی تھی۔

ادھر میرٹھ میں استاد اکڑے ہوئے بدن کے ساتھ اکیلے ٹھہرے پڑے تھے۔ ان کے شاگرد ان کی دیکھ بھال کر رہے تھے اور علاج بھی کر رہے تھے۔ مگر حالات جوں کے توں تھے۔

اور پھر ایک آدمی انبالے سے میرے پاس آیا۔ اس کے پاس شیریں بائی کا خط تھا۔ اس خط میں شیریں بائی نے اپنی حیرت انگیز بیماری کے ساتھ ساتھ شرما اور دولت رام کے جھگڑے کا بھی ذکر کیا تھا اور ساتھ ساتھ میرٹھ میں استاد کی

خیریت بھی پتہ کرنے کو کہا تھا۔ عورت بہت دور اندیش تھی۔ اس نے جو اندازہ کیا تھا، لکھ دیا تھا۔

میں نے رولو کا سے مشورہ کیا تو وہ بولا۔ "تو پھر آپ ایسا کریں، میرٹھ چلے جائیں اور استاد کو دیکھیں۔ میں شیریں بائی کی طرف جاتا ہوں۔ اگر حالات آپ کے قابو سے باہر ہوں تو آپ استاد کو لے کر انبالہ آجائیں شیریں بائی کے پاس۔" اور میں میرٹھ روانہ ہوگیا۔

رولو کا انبالہ شیریں بائی کی طرف روانہ ہوا۔ شیریں بائی کا مکان تلاش کرنے میں پریشانی نہیں ہوئی۔ سات آٹھ دنوں میں ہی شیریں بائی مرجھا گئی تھی۔ کونپل کی طرح کوئی شیریں بائی خاموش تھی۔ رولو کا اس کے قریب گیا تو اس نے اشارے سے بتایا کہ میں بول نہیں سکتی۔

رولو کا نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اس کے بدن میں ایک جھٹکا لگا۔ رولو کا نے کہا۔ "خود سے باہر آئے گایا پکڑ کر باہر کروں۔"

شیریں بائی نے حیرت سے رولو کا کی طرف دیکھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ رولو کا پھر بولا۔ "میں باہر کروں گا تو مارا جائے گا۔ جواب دے۔"

مگر خاموشی رہی تو رولو کا نے کہا۔ "کوئی ایک آٹے کی روٹی لے آئے، آٹا بس ایک روٹی کا ہو۔"

کچھ ہی دیر میں ایک عورت نے ایک گول گیند کی شکل کی روٹی آٹا رولو کا کو پکڑا دی۔ اور رولو کا نے وہ روٹی لے کر گولائی میں پھیلائی، جس طرح روٹی پکانے کو پھیلاتے ہیں اور اس کو شیریں بائی کے منہ اور ناک پر رکھ دیا۔ جس وقت اس کو رکھا گیا تھا۔ آٹا سفید تھا۔ رولو کا نے سختی کے ساتھ آٹے کو دبائے رکھا اور پھر سب نے دیکھا کہ آٹے کا رنگ بدلنا شروع ہوگیا۔ آٹا پہلے پیلا ہوا۔ پھر نیلا نظر آنے لگا اور پھر کالا ہونے لگا۔

اور پھر سب نے حیرت سے دیکھا کہ آٹا کوئلے کی طرح کالا ہوگیا اور اس کالے آٹے کو رولو کا نے منہ اور ناک پر سے ہٹا کر اپنی ایڑی کے نیچے دبالیا اور پھر شیریں بائی کو مخاطب کر کے کہا۔

"بیچارا میرے پیروں کے نیچے دبا ہوا ہے۔ تم ٹھیک ہو، بولو۔" شیریں بائی نے منہ کھولا اور اپنی آواز سن کر خوشی کے مارے وہ اچھل پڑی۔

"تم اب ٹھیک ہو اور اس نے جھک کر وہ کالا آٹا ہاتھ میں اٹھالیا۔ اس کو گول گیند نما بنادیا اور کہا۔ "تمہارا چولہا جل رہا ہے۔"

ایک نوکرانی نما عورت نے آگے بڑھ کر کہا۔ "جل رہا ہے، حضور کیا حکم ہے۔"

"مجھے وہاں لے چلو۔" اور رولو کا اس کے ساتھ باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔ چند منٹ کے بعد ہی۔ "بچاؤ، ارے جل گیا۔ ارے گورو بچاؤ۔" کی آوازیں آنے لگیں اور ایک کالے دھوئیں کا بادل آسمان کی طرف اڑ گیا اور رولو کا واپس آگیا اور بولا۔

"بائی جی آپ اب ٹھیک ہیں۔ کسی نے جادو سے آپ کی آواز پکڑ لی تھی۔ میں نے اس پکڑنے والے کو جلا دیا ہے۔ اب آپ یہ بتائیں استاد کا آپ نے ذکر کیا تھا، وہ کیا تھا۔" شیریں بائی بولی۔

"میرا اور استاد کا دشمن ایک ہی ہے۔ میری آواز بند ہوئی تو مجھے یہ خیال آیا کہ شاید استاد پر بھی کوئی آفت نہ ٹوٹی ہو، اس لئے میں نے خط میں لکھ دیا تھا۔"

"حکیم صاحب میرٹھ گئے ہیں۔ اگر حالات ایسے ہی ہوئے جیسے یہاں پر تھے تو وہ استاد کو لے کر یہاں آئیں گے۔" اور واقعی یہ ہوا کہ شام کو ہی میں استاد کو لے کر شیریں بائی کے گھر پہنچ گیا۔ استاد کی حالت اچھی نہیں تھی۔ میں ہر قسم کا علاج کر چکا تھا مگر فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔

رولو کا نے استاد کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ "اب تو بھی باہر آجا تیرا یار کالے بندو کا بیڑہ غرق ہوگیا، باہر نہیں آئے گی تو تو بھی جلادی جائے گی۔" مگر کچھ نہ ہوا تو پھر رولو کا نے کہا۔ "آخری بار پوچھتا ہوں۔"

اور پھر سب نے دیکھا کہ استاد کے بدن سے دھواں اٹھنا شروع ہوگیا۔ وہ دھواں پیلے رنگ کا تھا۔ وہ سارا دھواں ایک کونے میں جمع ہوگیا۔ استاد نے آنکھیں کھول دیں۔

READING CORNER http://readingcornerblogspot.com/

"اب تو بتا کس کے کہنے پر آئی تھی اور تو کون ہے۔"

کونے سے آواز آئی۔ "میں پہلی بندنی ہوں میرا گھر والا کالے بندو شیریں بائی کے اوپر تھا۔ اور ہم کو گرو تیواڑی نے لگایا تھا۔"

"تو تم ان کو مارنا چاہتے تھے۔" رولوکا نے پوچھا۔

"نہیں یہ حکم نہیں تھا۔" آواز آئی۔

"تیواڑی کہاں ہے۔ کیا اس کو پتہ ہے کہ تم دونوں پکڑے گئے ہو۔" رولوکا نے پوچھا۔

"میں بتاؤں گی جا کر تو پتہ چلے گا میں نے وہی کیا ہے جتنا حکم تھا۔ مجھے جانے دے۔"

"تیرا گھر والا مر گیا تو جی کر کیا کرے گی۔" رولوکا نے کہا۔

"میرا قصور کیا ہے یہ تو بتا۔" وہ بولی۔

"تو نے اس آدمی کو اتنے دن مفلوج کر کے رکھا۔ اندرونی طور پر یہ کس قدر کمزور ہو گیا۔ ذہنی طور پر برباد ہو گیا اور تو کہتی ہے کہ میں نردوش ہوں۔ میں تیرے ناک کان کاٹ کر تیرے گرو کے پاس پہنچاؤں گا اور گرو کو بتا دینا میں یہاں پر اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ اگر کچھ پلے ہے تو آ جائے۔"

اور پھر کسی عورت کے بین کرنے کی آوازیں آئی۔ رولوکا کے کسی ہرکارے نے رولوکا کا کہا پورا کر دیا تھا اور عورت کی آوازیں دور ہوتی گئیں۔

استاد فضل آنکھیں کھولے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ شیریں بائی نے کہا۔ "استاد نئی زندگی مبارک ہو۔ یہ سب ان دونوں مہربانوں کا کیا ہوا ہے۔"

"مگر میں یہاں کس طرح آ گیا۔" وہ بولے۔

"قبلہ آپ گاڑی سے آئے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ ہوش میں نہیں تھے۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ میں طویل نیند سے بیدار ہوا ہوں۔" استاد نے کہا۔

"اور میں بھی پورے پندرہ دن کے بعد بات کر رہی ہوں، میری تو آواز ہی بند تھی۔" شیریں بائی نے کہا۔

"اور ہمارا دشمن ایک ہی تھا یا ہے۔ اس نے ہی یہ کام دکھایا ہوگا۔" استاد نے کہا۔

رولوکا نے کہا۔ "ابھی دشمن موجود ہے اور گھاؤ کھایا ہوا ہے۔ وہ کسی وقت بھی انبالہ آ سکتا ہے۔ اس لئے میں آپ لوگوں سے کہوں گا کہ آپ سب کچھ عرصہ کے لئے کسی اور جگہ چلے جائیں کیونکہ یہ جگہ گھنی آبادی میں ہے۔ وہ تو دشمن ہے اور گھائل ہے۔ وہ کسی بات کا خیال نہیں کرے گا۔ کوئی بھی لپیٹ میں آ سکتا ہے۔ میں اکیلا ہوں گا تو مجھے کسی طرف کی فکر نہیں ہوگی۔"

اور سب لوگ شام سے پہلے ہی دوسرے مکان میں چلے گئے۔ شیریں بائی کے مکان پر صرف اکیلا رولوکا رہ گیا۔ رولوکا کسی کو بھی خطرے میں نہیں ڈالتا تھا۔

رولوکا مکان میں اکیلا تھا۔ دروازے پر تالہ پڑا ہوا تھا اور رولوکا کے ہرکارے مکان کے چاروں طرف گردش میں تھے۔ باہر کی پوری خبر رولوکا کو تھی۔ تیسری رات تیواڑی آ گیا۔ دروازے پر تالہ پڑا تھا۔ اس کے اشارے پر اس کے کسی بیرنے تالے پر زور آزمائی کرنا چاہی، تالا ایک دھماکہ سے پھٹ گیا۔ یہ واقعہ اتنا اچانک اور اتنا زوردار ہوا کہ تیواڑی بھی حیران رہ گیا اور وہ بیر جس نے زور آزمائی کی تھی۔ ایسا بھاگا کہ پلٹ کر نہ دیکھا۔ رولوکا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ اندر نہیں تھا۔ وہ باہر ہی موجود تھا۔

تیواڑی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا استقبال اس طرح ہوگا۔ وہ اپنی طاقت کے نشے میں دوڑا چلا آیا تھا۔ پھر اس نے دیکھا، دروازہ کھلا پڑا تھا اور اندر ناچ گانا ہو رہا تھا۔

شیریں بائی گا رہی تھی اور تماشائی بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ حیرت سے دیکھتا ہوا اندر داخل ہو گیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی سامنے کا منظر بھی بدل گیا اور کمرہ خالی نظر آنے لگا۔ تیواڑی نے آنکھ مل کر پھر دیکھا مگر کچھ نظر نہیں آیا۔ تو وہ زور سے بولا۔ "چوٹ کر گیا، دھوکا دے گیا۔ ارے یہ کون کمال دکھایا۔ یہ تو سڑک کے کنارے تماشے دکھانے والے بھی کر لیتے ہیں۔"

"اچھا تو نے اچھی بات بتائی۔" رولوکا نے کہا تو وہ

حیران ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

رولوکا پھر بولا۔ "سڑک چھاپ تماشے والے یہ بھی کرتے ہیں کیا۔"

"سامنے آ بچو تو پھر پوچھوں۔" تیواڑی غصے سے بولا۔

"تیری ودیا کہاں گئی۔ کیا آدمیوں کو کشٹ دینے کی ہے۔ اب تجھے کشٹ بھوگنا ہے اس کا تجھے پتہ ہے۔"

"مر گئے مجھے کشٹ دینے والے۔ تو نے اب تک تیواڑی کو نہیں پہچانا۔ جادوگری میں گیارہویں درجے کا ہوں میں۔ میرے پاس بڑی شکتی ہے۔ ایک اوپر ستر بلی دے چکا ہوں۔ تو میرا کیا بگاڑے گا تو میری گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔" تیواڑی غرور سے بولا۔

"تو نے اپنی شکتی کے زور میں ایک غلطی کر ڈالی ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"شکتی کے آگے کیا ہے وہ سب دھان بائیس سیر ہیں۔ تو میرا کیا بگاڑ لے گا۔" وہ بولا۔

"بتلائے دیتا ہوں تیری غلطی، تو نے بہت کم دیکھے ہوں گے میرے جیسے کہ تو دشمن بن کر آیا ہے اور میں تجھے تیری کمزوری بتا رہا ہوں۔ اس دروازے کے اندر آتے ہی، تیرے سارے بیر باہر رہ گئے کیونکہ وہ اندر آ ہی نہیں سکتے تھے۔ صرف تجھے اندر آنے کی اجازت تھی۔ اب تو ان کو بلائے گا تو بھی وہ نہیں آئیں گے۔ کیونکہ میں قلعہ بند ہوں اور تو کھلی جگہ پر کھڑا ہے۔ یہ تو جانتا ہی ہوگا کہ کھلے میدان میں جنگ کرنے والا زیادہ نقصان اٹھاتا ہے۔ بات تیری سمجھ میں آ گئی ہے تو بول اگر کچھ کرتب دکھانا چاہتا ہے تو وہ بھی دکھا دے۔"

"میں اتنا کمزور نہیں ہوں۔ میرے بیر ہر جگہ آ جاتے ہیں۔" وہ بولا۔

"تو پھر دیر مت کر۔ تیرا وقت ختم ہونے کو ہے۔" رولوکا نے نفسیاتی داؤ مارا۔

اور تیواڑی نے منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ پھر اس نے بہت ہاتھ پیروں کو جھٹکا منہ سے بھیانک آوازیں بھی نکالیں مگر کچھ نہ ہوا۔ تو وہ بولا۔ "تو پھر تو یوں بول کہ مجھے تو نے قید کر لیا ہے اور سب راستے بند کر دیئے ہیں۔ یہ تو کوئی بہادری نہیں ہے۔"

"تیرے دھرم میں بہادری دھوکے اور فریب کا نام ہے۔ میں نے تو تجھے سب پہلے ہی بتا دیا ہے۔"

"پھر بھی میں تو دھوکے میں پھنس گیا ہوں۔" وہ بولا۔

"یہ دھوکا میں نے نہیں تیرے اعتماد نے دیا ہے۔ تیری شکتی نے دیا ہے۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"تو پھر اب بتا تو نے مجھے کیوں باندھا ہے۔" تیواڑی نے پوچھا۔

"پہلے تو بتا تو نے استاد پر حملہ کیوں کیا تھا اور شیریں بائی کو کیوں پریشان کیا۔" رولوکا نے پوچھا۔

"مجھے یہ کام کرنے کا کہا گیا تھا اور میں نے اس کام کے بدلے رقم لی تھی۔" تیواڑی نے جواب دیا۔

"تو نے چند روپوں کے بدلے دو بے گناہ انسانوں کو عذاب میں ڈال دیا۔ تجھے ذرا ان کی تکلیف کا خیال نہیں آیا۔ کمزوروں پر تجھے ایسا ظلم کرتے ذرا شرم نہیں آئی۔ اب تو خالی ڈھول میرے سامنے کھڑا ہے۔ تو کمزور ہے تیرے سارے کبوتر باہر کھڑے پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ بول تو میں تجھ پر وہی ڈال کر کتوں کو چھوڑ دوں۔ بول تو تجھ پر آدم خور چیونٹیاں دوڑا دوں۔ تیری گیارہویں درجے کی رام لیلا سب دھری کی دھری رہ جائے گی..... تو نے آخر یہ کیوں کیا۔"

رولوکا نے پھر پوچھا۔

"دولت رام کڑا اچھے والے جو سہارنپور کے ہیں اور ان کے ایک منتر نے یہ کام کرنے کو کہا تھا اور رقم دی تھی۔"

"دولت رام اور اس کے منتر ٹھیک ہے تو اسی کمرے میں قید ہے۔ میں ان کو بلاتا ہوں۔ ایک بات یاد رکھنا، میں نے تجھے کچھ وقت کچھ کرنے کو دیا تھا۔ وہ وقت ختم ہو گیا ہے۔ اب تو کسی قسم کی کوئی کوشش مت کرنا۔ اگر کرے گا تو سخت نقصان اٹھانا پڑے گا۔ میں تجھے ابھی کوئی نقصان

READING CORNER
http://readingcornerurdu.blogspot.com/

پہنچانا نہیں چاہتا۔ زیادہ ہوشیاری کبھی کبھی گلے میں پھانسی بن جاتی ہے۔ تیرے چاروں طرف پہرے ہیں۔ تیری ایک ایک حرکت ریکارڈ پر آ رہی ہے۔" اور رولوکا سہارنپور روانہ ہو گیا۔

وہ سیدھا دولت رام کے بنگلے میں پہنچا اور دولت رام سے بولا۔ "تمہارا ایک دوست مکھ رام شرما ہے وہ کہاں ہے۔"

"تم کون ہو اور منہ اٹھا کر اندر آ گئے۔ ارے میں کوئی شرما کا سکریٹری ہوں کہ بتاؤں وہ کہاں ہے۔ پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو۔" دولت رام بگڑ کر بولا۔

"زیادہ گرمی اچھی نہیں ہوتی دولت رام، مانا کہ دولت میں بہت گرمی ہے مگر ایسا نہ ہو کہ وہی گرمی تم کو جلا ڈالے۔ شرما کو بلا لو نہیں تو میں بلا لوں گا۔" رولوکا نے کہا۔

"ارے کیا ہوائی باتیں کرتے ہو، کیا بھنگ پی کے آئے ہو۔" وہ بولا۔

رولوکا نے اس سے کہا۔ "کھڑے ہو جاؤ۔" رولوکا کا انداز ہی اور تھا۔ وہ یہ حکم سنتے ہی خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔

پھر رولوکا نے کہا۔ "شرما کے پاس چلو۔ وہ چل پڑا۔"

اب وہ رولوکا کے اشارے پر چل رہا تھا۔ شرما گھر پر تھا۔ اس نے دولت رام اور اس کے ساتھ کسی اجنبی کو دیکھا تو بولا۔

"ارے سیٹھ کیا بات ہے، خیر تو ہے۔"

دولت رام بولا۔ "مجھے کیا پتہ میں تو اس کے حکم پر آیا ہوں۔"

"اور یہ کون لاٹھ صاحب ہیں جو تم پر حکم چلا رہے ہیں۔" شرما نے کہا۔

"اپنی بے ہودہ زبان کو قابو کر اور میرے ساتھ چل۔" رولوکا نے کہا۔

"واہ بھئی واہ۔ یہ خوب رہی کیوں تمہارے ساتھ چلوں۔" وہ تنک کر بولا۔

"عزت کی زبان تم کو پسند نہیں ہے شاید۔ تو پھر سن خاموشی سے میرے ساتھ چل۔ تجھے انبالہ جانا ہے۔ وہاں پر تیرا ایک رشتہ دار تیرا انتظار کر رہا ہے ساری تیزی ختم۔" رولوکا نے کہا۔ اور دونوں پالتو کتے کی طرح ساتھ ہو لئے۔ انبالہ آتے آتے شام ہو گئی۔

شیریں بائی کا بالا خانہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ رولوکا نے دیکھا۔ اس کے ہرکارے اپنی اپنی جگہ موجود تھے اور دروازہ بند تھا۔ وہ جیسے ہی دروازے پر پہنچا تو دروازہ کھل گیا اور وہ ان دونوں کو لے کر اندر داخل ہو گیا۔ دونوں نے دیکھا تو تیواڑی زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر وہ کسی کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ خلاؤں میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اندر آتے ہی رولوکا روپوش ہو گیا تھا۔ اب صرف وہ تین ہی نظر آتے تھے۔ دونوں کے حواس بھی واپس آ چکے تھے۔

شرما نے حیرت سے تیواڑی کو دیکھا۔ اس کمرے کو دیکھا اور بولا۔ "دولت رام ہم کہاں ہیں اور یہ سامنے تیواڑی جی بیٹھے ہیں کیا۔ ان کو کیا ہوا ہے؟"

دولت رام بھی ہوش میں آ گیا تھا بولا۔ "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، یہ کیا ہو رہا ہے اور یہ تیواڑی جی ہی لگتے ہیں۔" وہ ان کے قریب چلا گیا اور بولا۔

"گرو جی کچھ ہماری طرف بھی نظر کرو۔"

تیواڑی نے دولت رام کو دیکھا اور غصے سے بولا۔ "ارے تم دونوں نے مروا دیا میرے ساتھ دھوکا کر دیا، تم دونوں نے مجھے پتھر سے ٹکرا دیا۔ میں تم دونوں کو نہیں چھوڑوں گا۔"

"ہم نے کیا دھوکا کیا ہے۔" شرما نے پوچھا۔

"تم نے کہا تھا کہ دونوں کو باندھو۔ میں نے کر دیا۔ ارے ان کی پیٹھ کتنی مضبوط تھی۔ تم نے نہیں بتایا میں بھی دھوکے میں مارا گیا۔ میری ساری محنت ساری شکتی دروازے کے باہر رہ گئی اور میں اکیلا یہاں قید ہوں۔ ارے بتا دیتے تو اس بکٹ سے کیوں ٹکراتا اور اگر ٹکراتا تو بندوبست کرتا میں تو فریب میں آ گیا اور تم نے وہ فریب کیا ہے میرے ساتھ۔ تم دونوں بھی اسی کے آدمی ہو۔" تیواڑی نے کہا۔

"وہ کون ہے تم اس سے ملے ہو۔" شرما نے پوچھا۔

"آواز سنی ہے بس۔" تیواڑی نے کہا۔

"جو ہم کو لایا ہے۔ کہیں وہی نا ہو۔ مگر آتے ہی وہ غائب ہو گیا ہے۔"

میں ساری باتیں سن رہا تھا۔ اب بولنا ضروری تھا۔

"لانے والے کا کام ختم ہو گیا، وہ چلا گیا۔ تم تینوں نے بے گناہ لوگوں کو عذاب میں ڈالا تھا۔ صرف اپنی خوشی کی خاطر، صرف اپنی ضد پوری کرنے کی خاطر، تمہارے دماغ پر دولت کا نشہ چڑھا ہوا ہے۔ تم انسان کو انسان نہیں سمجھتے۔ تم کو احساس نہیں ہے۔ اب تم تینوں احساس کرو گے تم تینوں زندہ رہو گے مگر جانوروں کی طرح تم نے استاد کو اپاہج کر دیا تھا۔ تم بھی فالج کے مریض ہو، تم نے شیریں بائی کو گونگا کر دیا تھا۔ تم بھی گونگے ہو۔" اور پھر رولوکا کے کارندے ان کو اٹھا کر ان کے گھر چھوڑ آئے۔

☆......☆......☆

انسان کمزوریوں کا پتلا ہے۔ اس میں ہر طرح کی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کبھی کبھی اس کے اندر خود غرضی کا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کو صرف اپنا ہی فائدہ نظر آتا ہے۔ وہ اپنے فائدے کے لئے سب کا نقصان کرنے پر تیار نظر آتا ہے۔ اور کبھی کبھی ایک اور جذبہ غالب آ جاتا ہے اور اس کو اپنی ذات سے کچھ غرض ہی نہیں رہتی اور یہی جذبہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ وہ ڈرتا ہے کہ کوئی اس کو غرض مند نہ سمجھ لے۔ یہاں سے خدمت کا آغاز ہوتا ہے اور انسان کا گراف اوپر ہوتا جاتا ہے۔ اگر کسی کی رہبری مل جائے تو یہ سونے پر سہاگے والی بات ہوتی ہے۔ ہر برائی کو ہلاک کرنے کے لئے سچ کا زہر پینا لازمی ہوتا ہے۔

سچائی دکھ تو دیتی ہے۔ آگ کے دریاؤں سے گزارتی ہے۔ مگر ایک دائمی مسرت بھی اس سے ہی ملتی ہے اور پھر معراج انسانیت اسی راہ میں ملتی ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"تمہارا تجربہ مجھ سے بہت زیادہ ہے۔ یہ بتاؤ کہ ہر برائی اتنی آسان کیوں ہوتی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"برائی آسان بھی ہوتی ہے اور پھلتی پھولتی بھی نظر آتی ہے۔ انسان اس کی طرف بڑی آسانی سے راغب ہو جاتا ہے اور اس کو وہ حاصل بھی کر لیتا ہے۔ کیونکہ اس کے لئے آسانیاں پیدا کرنے والی ایک بڑی طاقتور ہستی دنیا میں موجود ہے اور وہ ہے شیطان۔ انسان اگر اچھائیوں کی طرف سفر کرتا ہے تو یہ روڑے اٹکاتا ہے۔ اس کو راہ سے بھٹکا کر اپنی طرف لانا چاہتا ہے۔ پھر وہ مراعات دیتا ہے اور اپنی راہ پر لگا لیتا ہے۔ مگر پھر بھی ناکام رہتا ہے۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"یہ تو درست ہے کہ شیطان کامیاب کبھی نہیں ہوتا تو ہر دفعہ ناکامی اس کو ملتی ہے مگر پھر بھی لاکھوں سال سے وہ اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ اس کی سزا ہی ہے۔ وہ انسانوں کو بھٹکانے کی کوشش کرتا رہے اور منہ کی کھاتا رہے۔" رولوکا نے جواب دیا۔

اچانک ایک مریض کے آنے سے ہماری گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ مریض کے ساتھ دو آدمی تھے اور مریض ایک عورت تھی نوجوان عورت۔

ساتھ آنے والوں نے بتایا۔ "یہ ایک ہفتہ سے بے ہوش ہے۔" ان دو میں ایک اس کا بھائی تھا اور اس کا نام گوہر لال تھا۔ دوسرا او کرم ملہوترا تھا۔ یہ اس کا شوہر تھا۔ یہ لوگ ریواڑی سے آئے تھے۔ ملہوترا نے بتایا۔ "ایک ہفتہ پہلے ہم لوگ ایک تقریب میں گئے تھے۔ وہاں پر رات ہو گئی۔ ہم دونوں میاں بیوی کے علاوہ ہمارے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ ہمارا ذاتی تانگہ ہے۔

رات ساڑھے گیارہ بجے ہم لوگ روانہ ہوئے۔ یہ جگہ ریواڑی سے پانچ کوس پر ہے۔ اس کا نام ہنومان تلیہ ہے۔ سڑک خراب ہے۔ زیادہ تیز یہاں گھوڑا دوڑ نہیں سکتا۔

ہم دونوں باتیں کرتے، سفر کر رہے تھے۔ گھوڑا بھی اسی سڑک پر جتنی تیز چل سکتا تھا، چل رہا تھا۔ اندھیری رات نہیں تھی، ہر طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ سڑک دور تک نظر آ رہی تھی۔

اچانک گھوڑے کی چال میں فرق آیا اور گھوڑا ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ میں بڑا حیران ہوا۔ یہ گھوڑا میرے بچپن کا ساتھی تھا۔ میری آواز پر چلتا تھا۔ اس طرح

READING CORNER http://readingcornerpk.blogspot.com/

کیوں کھڑا ہوگیا۔ میں نے تو رکنے کا اشارہ نہیں کیا تھا۔ سامنے سڑک پر نظر ڈالی مگر کچھ نظر نہیں آیا۔ میں نے پھر گھوڑے کو چلنے کا اشارہ کیا مگر اس نے آگے جانے سے انکار کردیا۔ میں سمجھ گیا کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ گھوڑا خطروں کو پہچان لیتا ہے۔

دور دور کسی آبادی کا پتہ نہ تھا۔ رات کا وقت سڑک سنسان پڑی تھی۔ جھینگروں کے بولنے کی آواز ڈرائے دے رہی تھی۔ گھوڑا ایک قدم بھی آگے بڑھانے پر تیار نہ تھا۔ سڑک کے کنارے لگے درخت اور ان کے سائے ڈراؤنی شکلیں بنا رہے تھے۔ میری بیوی ساوتری کی خوف کے مارے آواز بند ہوگئی تھی اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میری بھی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ میرے پاس بچاؤ کے لئے کچھ نہیں تھا۔ چند ہی منٹ گزرے تھے کہ سڑک پر ایک سایہ نظر آیا۔ گھوڑا گھبرا کر دو پیروں پر کھڑا ہوگیا اور پھر پلٹ کر دوبارہ اس کا رخ منہ ہنومان تلیہ گاؤں کی طرف ہوگیا اور ایسا سرپٹ دوڑا کہ تانگہ اچھلنے لگا۔ ہم لوگ بڑی مشکل سے اس پر بیٹھ پائے۔ گھوڑا، ہنومان تلیہ کی آبادی میں آکر ہی رکا..... ہم نے رات وہاں گزاری اور سویرے گھر آئے۔ اسی راستے سے مگر دن میں سواریاں چل رہی تھیں۔ اس لئے کچھ نہ ہوا۔ ساوتری اسی رات سے ایسی ڈری ہے کہ آواز بند ہوگئی ہے۔ خاموش گم صم ڈری ڈری رہتی ہے۔ ریواڑی میں علاج کروایا، کسی نے آپ کا پتہ دیا تو آپ کے پاس آئے ہیں۔"

"حد سے زیادہ بڑھا ہوا خوف انسان کے جسم کو متاثر کرتا ہے اور بعض اوقات یہی حد سے زیادہ بڑھا ہوا خوف انسان کی موت کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ مگر تم فکر نہ کرو ان کا خوف تو ختم ہوجائے گا۔"

پھر رولوکا ساوتری سے مخاطب ہوا اور بولا۔ "تم نے جو کچھ دیکھا وہ ایک ہوا تھی وہ خود اتنی کمزور اور بے آسرا تھی کہ اگر تم لوگ وہیں پر کھڑے رہتے تو وہ خود بخود بھاگ جاتی۔ انسان سے زیادہ طاقتور اور عقل مند کوئی مخلوق نہیں ہے۔ میں اس کو تمہارے سامنے پیش کردوں گا تو تم اس کو دیکھ کر ہنسو گی۔ یہ صرف دھوکا ہے۔ حیات انسانی کا دھوکا۔ تم ایک انسان ہو، انسان اپنے احساسات اور اپنی سرگرمیوں میں خودمختار ہوتا ہے تم بھی خودمختار ہو۔ تم کو کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔ تم ایک نارمل جسم اور دماغ کی مالک ہو۔ تمہارے جسم کے ہر اعضاء اپنا کام پوری طرح انجام دے رہے ہیں۔ میں تم دیتا ہوں کہ بات کرو۔ کیونکہ تم بات کرسکتی ہو۔"

اور پھر سب نے حیرت سے سنا کہ اس نے اپنے پتی کو پکارا۔ "وکرم میں بول سکتی ہوں۔"

وکرم آگے بڑھا اور خوشی سے بولا۔ "تم اب ٹھیک ہو۔"

"ہاں اب میں ٹھیک ہوں۔ میرے اندر ایک شکتی سی آگئی ہے۔" ساوتری نے جواب دیا۔

"ان کو صرف اتنے ہی علاج کی ضرورت تھی۔ یہ اب ٹھیک ہیں۔"

"میں آپ کی کیا خدمت کروں۔ آپ نے تو نہ دوا دی، نہ کچھ اور کیا اور یہ بول پڑیں۔ چمتکار کا تو کوئی مول نہیں ہوتا۔" ملہوترا ممنونیت بھری آواز میں بولا۔

"میں اس کو اپنے الفاظ میں یوں کہوں گا کہ خدمت صرف خدمت ہوتی ہے۔ معاوضہ نہیں ہوتا۔ مگر ابھی کام ختم نہیں ہوا ہے۔ میں آپ کے پاس آؤں گا، پھر کام پورا ہوگا۔"

"میری سمجھ میں کچھ آیا نہیں۔" وکرم نے کہا۔

"ریواڑی آنے پر بتاؤں گا۔ آپ بے فکر ہو کر گھر جائیں۔" رولوکا نے کہا۔

ان کے جانے کے بعد میں نے رولوکا سے پوچھا۔

"معاملہ کیا ہے؟" رولوکا نے مسکرا کر کہا۔

"وہی پرانا چکر ہے۔ کبھی کبھی پراسرار روحیں اور خاص طور پر گندی اور بھٹکی ہوئی روحیں اپنا سحر سمیٹے فضاؤں میں گردش کرتی ہیں اور بعض تو اپنا ایک مقام بنا لیتی ہیں اور وہاں پر ہی گردش کرتی ہیں۔ اس مقام کے بنانے کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ یہ تو آپ مانتے ہیں کہ جن بھوت پریت کا وجود ہے۔ لیکن ان کا وجود ایک دائرے کے اندر رہتا ہے۔ مگر میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کوئی روح بھولوں کو

راہ دکھاتی ہے۔ انسانوں کی مدد کرتی، میرے خیال میں ایسی روح اپنی زندگی کے گناہوں کا اچھائیوں کے ذریعہ بدلہ پورا کرتی ہے اور کچھ ناپاک روحیں زندہ انسانوں کو پریشان کرتی ہیں۔ ان کو ڈراتی ہیں، ان کو راہ سے بھٹکاتی ہیں۔ اس سے ان کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مسکن کو ویران رکھنے کو ایسا کرتی ہیں۔" رولوکا نے کہا۔

"یہ چھلاوہ بھی اسی قسم کی روح ہوتی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں یہ بھی بھٹکتی روح ہے۔ یہ رات میں لوگوں کو بھی آتی ہے اور ان کو غلط راستوں پر ڈال دیتی ہے۔ یہ صرف یہی کرسکتی ہے۔ زندہ انسانوں سے زیادہ یہ طاقتور نہیں ہیں۔ مگر چونکہ یہ اپنا چولہ بدلنے پر قادر ہیں۔ اس لئے انسان ان سے خوف زدہ ہوجاتا ہے۔ حالانکہ ان سے ڈرنے کی تو بات کچھ ہے ہی نہیں۔ ڈر اور خوف انسان کے اندر ہوتا ہے اور وہی اس کو متاثر کرتا ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"مگر اکثر حالات میں لوگ ڈر جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ڈر اس لئے جاتے ہیں کہ عالم ارواح کا ایک الگ مزاج ہے۔ یہاں جاگنے والے سو جاتے ہیں اور سونے والے جاگ جاتے ہیں۔ اس کا تجزیہ کرنا اور بیان کرنا بہت مشکل ہے۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"اس کے بارے میں تم نے کچھ تو اندازے لگائے ہوں گے۔" میں نے پوچھا۔

"ہماری بہادری اور قوت ارادی یہی ہے کہ اپنے رازوں کو سینے میں چھپا کر رکھیں۔ ہر بات کا جواب دیا جاسکتا ہے مگر ہم اس لکیر کے آگے نہیں جاتے۔ یہ لکیر ہی ہماری بندش ہے۔" رولوکا نے جواب دیا۔

اب اس کے بعد کسی سوال کی گنجائش نہیں تھی۔ "تو اب تم ریواڑی جاؤ گے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں جانا ضروری ہوگیا ہے۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"میں بھی ساتھ چلوں۔" میں نے پوچھا۔

"آپ چلیں گے تو اور اچھا ہوگا۔ آپ کے تجربے میں اضافہ ہوگا۔" رولوکا بولا۔ اور تین دن کے بعد ہم ریواڑی روانہ ہوگئے۔

یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ وکرم نے فوراً ہمارے رہنے کا بندوبست کردیا۔ صبح اس نے ہمارے ناشتہ کا بندوبست ایک مسلمان گھرانے سے کرادیا۔ آدمی سمجھدار تھا۔ کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔

ناشتہ کے بعد رولوکا نے کہا۔ "اگر آپ کو فرصت ہو تو ہمیں وہ جگہ دکھائیں جہاں پر یہ واقعہ ہوا تھا۔" اور وکرم نے فوراً تانگہ تیار کروایا اور ہم تینوں ہنومان تلیہ گاؤں کی طرف روانہ ہوگئے۔

دن کا وقت تھا۔ سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی اس سڑک پر زیادہ تر بیل گاڑیاں چلتی تھیں۔ ایک دو تانگے بھی نظر آگئے۔ کوئی کوئی سائیکل سوار بھی جاتا نظر آجاتا تھا۔ سڑک کے کنارے دور دور جامن اور نیم کے درخت کھڑے تھے۔ گھوڑا بڑے سکون سے ست چال چلتا آگے بڑھ رہا تھا۔ کوئی تین کوس کے بعد وکرم نے کہا۔ "ہاں یہی وہ جگہ ہے۔ جہاں تانگہ کھڑا ہوگیا۔"

سڑک سے ذرا فاصلے پر ایک بہت پرانا املی کا درخت کھڑا تھا۔ یہاں پر بھی سڑک نہایت خستہ حالت میں تھی۔ رولوکا تانگے سے اتر گیا اور املی کے درخت کی طرف چلا گیا اور پھر املی کے درخت کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے اس درخت کے تین چکر لگائے اور واپس ہماری طرف آگیا۔ اور بولا۔ "واپس چلو۔" واپس آنے کے بعد رولوکا نے کہا۔

"گیارہ بجے میں اکیلا جاؤں گا اور پیدل جاؤں گا۔ مجھے سواری کی ضرورت نہیں ہے۔"

وکرم نے تعجب سے کہا۔ "بہت دور ہے آپ تانگہ لے جائیں۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔" رولوکا نے جواب دیا۔

میں تو سمجھ چکا تھا کہ رولوکا سواری کا محتاج نہیں

READING CORNER http://readingcornerpk.blogspot.com/

ہے۔

ٹھیک گیارہ بجے رولوکا ہنومان تلیہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ مجھے پتہ تھا کہ صبح ہی اس کی واپسی ہوگی۔ اس لئے میں سوگیا۔ سویرے رولوکا آگیا۔ میں نے پوچھا: "کام ہوا۔"

"نہیں۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"ہوا کیا یہ تو بتاؤ۔" میں نے پوچھا۔

"مجھے پورا یقین تھا کہ وہ املی کا درخت اس کا مسکن ہے۔ میں نے اس کو باندھ دیا تھا۔ وہ اس پر نہیں آیا۔ دور سے بندش کو تاڑ کے فرار ہوگیا۔ وہ اب اس طرف تو آئے گا نہیں مگر کسی بھی جگہ پریشانی کا باعث تو ہوگا۔ اب اس کو تلاش کرنا ضروری ہوگیا ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"وہ ہے کون؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ایک چھلاوہ ہے۔ یہ صرف چھل کپٹ یعنی دھوکا فریب کرتا ہے، ڈراتا ہے۔"

رولوکا نے جواب دیا۔

"بھاگ گیا تو جانے دو تلاش کرنے کی ضرورت کیوں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چور، چوری سے جاتا ہے، ہیرا پھیری سے باز نہیں آتا۔ وہ باز نہیں آئے گا جہاں جائے گا، لوگوں کو ڈرائے گا۔ ان کے ساتھ فریب کرے گا اور لوگوں کے لئے پریشانی کا باعث ہوگا۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"تو پھر تم اس کو تلاش ضرور کروگے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"یہ تو میری ڈیوٹی ہے، پوری تو کرنا ہے۔" رولوکا بولا۔ میں دلی روانہ ہوگیا اور رولوکا آگے چل پڑا۔

❁......❁......❁

"میں کئی شہروں اور دیہاتوں میں چلتا گیا۔ مگر ایسا کوئی واقعہ سامنے نہیں آیا۔

علی گڑھ میں، میں تین دن رکا۔ خواجہ میں قیام کیا اور پھر بلند شہر پہنچا۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ کہاں تک جاسکتا ہے۔ بلند شہر کے بعد اس کو لوٹنا تھا کیونکہ یہی اس کی حد تھی۔ اس کے آگے اگر وہ جاسکتا تھا تو پھر ضرور وہ کسی کا آلہ کار تھا۔ بلند شہر بھی ایک زیادہ بڑا شہر نہیں ہے۔ میرے جاتے ہی ایک حادثہ ہوگیا تھا۔ یہ ٹریفک کا حادثہ تھا۔ بلند شہر اور خواجہ کے درمیان ایک پل ہے۔ دریائے جمنا پر درمیان میں ریل چلتی ہے اور پٹری کے دونوں طرف سڑک ہے۔ ایک آنے کو ایک جانے کو بلند شہر کو آنے والی سڑک پر یہ حادثہ ہوا تھا۔ ایک ٹرک جس پر بوریاں لوڈ تھیں۔ عین دریا کے درمیان گر پڑا تھا۔ ڈرائیور اور اس کا ہیلپر زخمی حالت میں اسپتال میں تھے۔ میں فوراً اسپتال پہنچا تو پتہ چلا کہ ہیلپر مر چکا ہے اور ڈرائیور بے ہوش ہے۔

میں نے اپنا بہروپ دلی کے ایک اخباری رپورٹر کا بنایا ہوا تھا۔ میں ڈاکٹروں سے بھی ملا مگر انہوں نے مریض کی خستہ حالت کی وجہ سے ملانے سے انکار کردیا۔ تین دن کے بعد ڈرائیور کچھ ہوش میں آیا تو میں پھر اسپتال گیا۔ بڑی مشکلوں سے ڈاکٹروں نے مجھے چند منٹ بات کرنے کی اجازت دی۔

ڈرائیور ایک پختہ عمر کا سکھ تھا۔ خیریت پتہ کرنے کے بعد میں نے اس سے کہا۔ "سردار جی یہ حادثہ کیسے ہوا؟"

اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے میں نے لہراتے دیکھے تو پھر کہا۔ "سردار جی ڈرنے کی اب کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ تم نے کیا دیکھا تھا اور پھر تم نے کیا کیا۔ ہمت کرو، ڈرو نہیں، نہیں بتاؤ گے تو دوسرے بھی مارے جائیں گے۔"

خبر نہیں جی وہ کی شے سی۔ بونٹ پر بیٹھی سی۔ اس دی شکل انی گندی سی کہ بندہ ویکھ سکتا ہی نہیں۔ پورا شیشہ دھندلا گیا سی۔ میری رفتار زیادہ نہیں سی۔ میں بریک ماریا اور گڈی آپ ہی آپ ایک پاسے مڑ گئی اور دریا کے اندر گر گئی۔ مینوں تو اب پتہ چلا ہے کہ میرا کلینر مارا گیا ہے۔ گڈی دریا میں پئی ہے۔ بس جی بس انی سی بات ہے وہ کون سی مینوں کوئی پتہ نہیں۔" مجھے تو صرف یہی پتہ کرنا تھا۔ میں اسپتال سے واپس آگیا۔ دوسری رات میں نے پل پر گزاری مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

ٹریفک بحال کردیا گیا تھا۔ رات میں ویسے بھی بہت آہستہ اور ہوشیاری سے پل سے لوگ گاڑیاں گزارتے ہیں۔ اب تو اور زیادہ احتیاط کررہے تھے۔ میں پوری طرح چوکس تھا۔ تین راتیں گزر گئیں، شکار گھاٹ پر نہیں آیا۔ میں بھی ڈورڈالے موجود ہی رہا۔

چوتھی رات میں نو بجے ہی پل کے کنارے موجود تھا۔ دریا پوری رفتار سے بہہ رہا تھا۔ بارشوں کا موسم تھا۔ دریا کا پانی پل پر چھلانگیں مار رہا تھا۔ میں نے دیکھا، کوئی پل کی ریلنگ پر بیٹھا ہے۔ اول تو وہاں پر بیٹھنا ہی آسان نہ تھا۔ دوسرے کون بے وقوف ہوگا جو چڑھے دریا پر اس طرح کی بے وقوفی کرے گا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ میرا شکار ہے۔ میں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتا گیا اور اس کے اتنے قریب پہنچ گیا کہ وہ اگر بھاگنا بھی چاہے تو نہ بھاگ سکے۔

پھر میں بھی اس کے برابر ریلنگ پر بیٹھ گیا اور اس کے کان کے پاس منہ کرکے کہا۔ "بس اب تیرا کھیل ختم ہوا۔" وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ مگر میں نے اس کو گرنے نہیں دیا۔ اس کے سر پر بڑے بڑے بال تھے۔ میں نے وہ پکڑ لئے اور ریلنگ سے اتر آیا۔ اس نے اب تک کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں اس کو لے کر پل سے بہت دور خواجہ کی طرف آگیا اور پوچھا۔ "ہاں بتا تو کون ہے؟"

وہ خاموش تھا۔ میں نے پھر کہا۔ "جلدی بتا تو کون ہے۔ نہیں بتائے گا تو اسی جمنا میں دفن کردوں گا۔"

"میرا نام پدمنی ہے۔"

میں نے پھر اس کو غور سے دیکھا۔ "اچھا تو ہی ہے جس نے گاڑی دریا میں گرائی تھی۔"

"وہ تو خود ہی گر پڑا تھا۔" وہ بولی۔

"تو نے اس کو ڈرایا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ اتنا کمزور، ڈرپوک تھا، میں کیا کروں، میرے بال تو چھوڑ۔" وہ بولی۔

"چھوڑ دوں گا، مر کیوں رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"کچھ اور پکڑ لے، بال چھوڑ دے، مجھے تکلیف ہورہی ہے۔"

"تو کیا جانے درد تکلیف کیا ہوتی ہے۔ تو تو بے شریر ہے، تیری پکڑ صرف یہی ہے۔"

"مجھے جانے دے تیری بنتی کرتی ہوں۔ اب کبھی نہیں آؤں گی۔" وہ بولی۔

"یہاں نہیں آئے گی کسی اور جگہ چھل کپٹ کرے گی۔" میں نے کہا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟" وہ بولی۔

"ریواڑی روڈ پر تانگہ کس نے روکا تھا۔ کس نے ڈرایا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"وہ خود ہی ڈر گئے۔ میرا گھر بھی چھین لیا۔ میں یہاں آگئی۔" وہ بولی۔

"اور تو نے وہی کام یہاں کیا۔ ایک آدمی مارا گیا۔ گاڑی دریا میں گر گئی۔ یہ الگ نقصان ہوا، تو کہتی ہے۔ میں نے کیا کیا۔" میں نے کہا۔

"اچھا اب کسی کو پریشان نہیں کروں گی۔ مجھے چھوڑ دے۔"

"تیرا شریر تو ختم ہوچکا اور آتما کیوں بھٹک رہی ہے تو آخر کیوں اوپر نہیں گئی۔ کچھ نہ کچھ گانٹھ ہے ضرور تو میری بات اچھی طرح سمجھ لے۔ تجھے اب اس دنیا سے جانا ہے۔ اگر نہ گئی تو تیرے ساتھ بہت بری ہوگی۔ تو کیوں نہیں گئی، کیوں رک گئی، مجھے یہ بتا، شاید میں تیرے کچھ کام آجاؤں۔"

"میں گوبندہ کے کارن نہیں گئی۔ گوبندہ میرا گھر والا تھا۔ ہم ریواڑی میں پرتاب نگر میں رہتے تھے۔ گوبندہ بڑا بڑھیا کاریگر تھا۔ بہت اچھی مورتیاں بناتا تھا۔ دور دور سے لوگ اس کے پاس آتے تھے۔ میں مٹی تیار کرتی اور گوبندہ اس مٹی کو مورتی بنا کر رکھ دیتا۔ پھر وہ ان میں رنگ کرتا اور قدردان ہاتھوں ہاتھ خرید لیتے۔ مورتی کا ایک خریدار آیا۔ وہ کوئی ٹھاکر تھا۔ ہم کمہار اس کے سامنے کیا حیثیت رکھتے تھے۔ آتے ہی گوبندہ سے بولا۔

"میں مٹی کی مورتی کا خریدار نہیں ہوں۔ میں تو اس مورت کا خریدار ہوں۔" اس نے میری طرف اشارہ کرکے کہا۔ بول کیا لے گا۔" یہ سن کر گوبندہ سناٹے میں آگیا اور

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

غصے سے چیخ کر بولا۔

"ہوش میں بات کر، ٹھاکر یہ میری عزت ہے، تو ٹھاکر ہے تو ہوا کرے۔"

"اور تو بھی ذرا دیکھ بھال کر بول، میں ٹھاکر پردیپ سنگھ ہوں۔ جس چیز پر انگلی رکھ دیتا ہوں، وہ میری ہوتی ہے۔" ٹھاکر پردیپ نے گرج کر کہا۔

مگر گوبندہ بھی غصے میں تھا بولا۔ "یہ کوئی مورتی نہیں، زندہ عورت ہے اور میری گھر والی ہے۔ میرے جیتے جی تو اس کو ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔" ٹھاکر یہ سن کر آگے بڑھا، مگر گوبندہ ہوشیار تھا۔ اس نے زمین پڑی چٹائی ایک جھٹکے سے کھینچ لی، ٹھاکر اس پر ہی تھا۔ ٹھاکر ایک زوردار دھماکہ سے زمین پر گرا، وہاں پر گیلی مٹی کا ڈھیر تھا، وہ اس میں لپٹ گیا۔ اوپر سے گوبندہ نے اس پر لکڑی سے حملہ کر دیا۔

ٹھاکر بری طرح پٹ گیا۔ کپڑے خراب ہو گئے۔ سر سے خون بہنے لگا۔ بڑی مشکل سے وہ اٹھا، اس کی حالت خراب تھی مگر اکڑ وہی تھی، بولا۔ "تو نے اپنی سی کر لی، اب میں اپنی سی کروں گا۔ تیری جورو کو میں لے جاؤں گا اور تیرا حشر میں ایسا کروں گا کہ کسی کمہار میں پھر ہمت نہیں ہوگی، کسی ٹھاکر پر ہاتھ اٹھانے کی۔"

اور ٹھیک ایک مہینے کے بعد وہ اپنے چھ سات ساتھیوں کے ساتھ آ گیا اور دن دہاڑے ہم دونوں کو باندھ کر اپنے گاؤں چنوٹی لے گیا۔ چنوٹی ریواڑی سے دس کوس پر ہے۔ یہ ٹھاکروں کا گاؤں ہے۔ دوسرے ذات کے ہندو تو وہاں جاتے ہی نہیں۔

گوبندہ اس گاؤں میں کہاں تھا۔ مجھے نہیں پتہ، میرا یہ حال ہوا کہ شاید کسی ویشیا کا بھی نہیں ہوا ہوگا۔ میں نے پھر اپنے پتی کو نہیں دیکھا۔ میرا شریر کب تک ساتھ دیتا، آخر ظلم کا انت یہ ہوا کہ میری آتما نے شریر کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ میں گوبندہ کو ڈھونڈتی رہی مگر وہ مجھے نہیں ملا۔ گوبندہ مر گیا، زندہ ہے کچھ تو پتہ چلے، میں کب یہاں رہنا چاہتی ہوں۔ بھٹکتی پھرتی ہوں، مجھ سے ضرور کچھ ہوا ہے۔ میں نادم بھی ہوں، پر میں کیا کروں، گوبندہ کا پتہ چل جائے، میں خود چلی جاؤں گی۔"

"میں اگر پتہ کر لوں کہ گوبندہ کے ساتھ کیا ہوا تو تو چلی جائے گی۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں پھر میرا یہاں کیا کام رہ جائے گا۔" وہ بولی۔

"میں تجھے اسی وعدے پر چھوڑ رہا ہوں۔ تو میرے ساتھ ساتھ رہے گی۔ دونوں چنوٹی گاؤں جائیں گے اور تیرے سامنے ہی سب کچھ ہوگا، اپنا وعدہ یاد رکھنا۔" میں نے کہا۔

"یہ ایک آتما کا وعدہ ہے۔" وہ بولی۔

چنوٹی گاؤں بہت بڑا گاؤں تھا۔ گلیاں بڑی بڑی اور مکانات بھی پکے زیادہ تھے۔ خوش حالی ہر طرف نظر آتی تھی۔ جگہ جگہ کنویں موجود تھے اور ہر گھر کے اندر جانور نظر آتے تھے۔ گاؤں کے چاروں طرف کھیت تھے۔ گاؤں کے اندر میں اکیلا گیا۔ پدمنی کی آتما کو میں نے ایک درخت پر چڑھا دیا۔ گاؤں کے اندر جاتے ہی میں ایک دیہاتی کے روپ میں آ گیا اور ایک آدمی سے پوچھا۔

"بھیا ٹھاکر پردیپ سنگھ کا گھر کون سا ہے؟"

اس آدمی نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بولا۔ "ارے کا باؤلا ہوا ہے جو سب سے بڑھیا گھر دیکھے وہی ہے۔ ٹھاکر کا گھر، ارے مورکھ وہ ہی اس گاؤں کے سرپنچ ہیں۔"

میں نے معصومیت سے گردن ہلا کر اقرار کیا۔ "معاف کرنا بھیا نیا آدمی ہوں، پتہ نہیں تھا۔"

وہ آدمی چلا گیا اور میں سب سے اونچا اور اچھا مکان تلاش کرنے لگا..... یہ کوئی زیادہ مشکل کام ثابت نہیں ہوا۔ میں ایک عالیشان حویلی کے سامنے کھڑا تھا۔

میرے کھڑے ہوتے ہی ایک آدمی جس کے سر پر بڑی سی پیلی پگڑی تھی، آ گیا اور بولا۔ "یہاں کیوں کھڑا ہے؟"

میں نے ہندوؤں کے رسم کے مطابق ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "ٹھاکر سے بھینٹ کرنا تھی۔"

"کون ٹھاکر نام تو بتا۔" وہ بولا۔

"ٹھاکر پردیپ سنگھ سے جی۔" میں نے کہا۔

"اچھا ٹھہر بتاتا ہوں۔" اور وہ اندر چلا گیا۔ کچھ دیر میں آ کر بولا۔ "آ جا میرے ساتھ۔" اور میں اس کے ساتھ بڑے سے دروازے سے اندر چلا گیا۔

اندر بہت رونق تھی۔ ہر طرف پھول پھلواری لگی تھی اور بہت صاف ستھری اور ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہاں پر جشن ہوتا رہتا ہے۔ در و دیوار پر نیا چونا اور رنگ کیا ہوا تھا۔ وہ مجھے ایک بڑے سے کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے میں بہت ساری کرسیاں پڑی تھیں اور ایک تخت بھی پڑا تھا۔ تخت پر سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی اور کئی موٹے موٹے گاؤ تکیے رکھے تھے۔ ان ہی کے سہارے ایک شخص بیٹھا اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ کرسیوں پر بھی چھ سات بہت تگڑے اور مونچھوں والے آدمی بیٹھے تھے۔ میں اس کے سامنے کھڑا ہی ہوا تھا کہ وہ بولا۔ "کون ہے کیوں آیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "ٹھاکر صاحب کچھ اکیلے کی بات ہے۔"

وہ بولا۔ "سب اپنے ہیں بول۔"

"میں دلی سے آیا ہوں۔ سب کے سامنے بات کرنا اچھا نہیں لگتا....." میں نے کہا۔

"ارے جب میں کہہ رہا ہوں تو اچھا ہی ہوگا۔" وہ بولا۔

"میں گوبندہ کا پتہ کرنے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"گوبندہ، کون گوبندہ میں کسی گوبندہ کو نہیں جانتا۔" وہ بولا۔

"ریواڑی کے پرتاب نگر محلے کا کمہار جس کی عورت کو آپ اور آپ کے آدمی اٹھا کر لے آئے تھے اور پھر آپ نے اس کی عورت کو خراب کر کے مار ڈالا تھا۔ اس عورت کی آتما اپنے پتی کو تلاش کر رہی ہے اور وہ نہیں ملتا۔ وہی گوبندہ ہے۔" میں نے کہا۔

"اور تو کون ہے اس کی کھوج کرنے والا۔ منہ اٹھا کے چلا آیا۔ ارے یہ ہمارا گاؤں ہے۔ ہماری حکومت ہے یہاں، اپنی خیر منانا اور چپکے سے چلا جا اور پھر کبھی گوبندہ یا اس کی جورو کا نام مت لینا۔" ٹھاکر نے کہا۔

"تم نے ایک بے گناہ عورت پر اتنا ظلم کیا کہ وہ مر گئی۔ اس کے آدمی کو قید کر رکھا ہے۔ تم انسان ہو، تم کو کون انسان کہے گا۔" میں نے کہا۔

ٹھاکر تلملا کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اشارہ کیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے پھر کہا۔ "اب تو اپنی زبان بند رکھنا، یہ تیرے بدمعاش جو تیرے غلام ہیں، تیرا دیا کھاتے ہیں۔ تیرے خلاف بولیں گے اور حقیقت بتائیں گے تو خاموش رہے گا اور اسی طرح بیٹھا رہے گا۔ تیرے ظلم کا وقت ختم ہو گیا ہے۔" کرسیوں پر سب خاموش بیٹھے تھے۔ میں نے ان سب کو مخاطب کر کے کہا۔ "تم میں سے کس کو پتہ ہے، گوبندہ کہاں ہے۔ جس کو پتہ ہے وہ بتائے۔" ایک لمبا تڑنگا جوان اٹھا اور بولا۔

"وہ حویلی کے تہہ خانے میں قید ہے۔"

میں نے پھر پوچھا۔ "وہ زندہ ہے؟"

جواب ملا۔ "ہاں زندہ ہے، بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ کمزور ہے۔"

"اس کی عورت کے ساتھ کس کس نے منہ کالا کیا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"ہم سب نے ٹھاکر کے حکم پر کیا تھا۔" وہ بولا۔

"اور ٹھاکر نے کیا کیا تھا؟"

"سب سے پہلے ٹھاکر نے ساری رات اپنے پاس رکھا تھا اور پھر سب کو حکم دیا تھا۔" وہ بولا۔

"سن لیا ٹھاکر! یہ کتنی صفائی سے سچی بات بتا رہا ہے۔ تو بھی اپنی صفائی میں کچھ بولنا چاہے تو بول۔" میں نے کہا۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ کچھ کیا ہے تو ان سب نے اپنی مرضی سے کیا ہوگا۔" ٹھاکر بولا۔

"ٹھاکر مرنے سے پہلے اپنے گناہوں کا بوجھ لوگ ہلکا کرتے ہیں، جھوٹ نہیں بولتے اور تو ہے کہ اور بوجھ بڑھا رہا ہے۔ یہ تیرا گاؤں ہے۔ ہر طرف تیرے آدمی ہیں۔ اس لئے ایسا کر رہا ہے۔ یہ تیری بھول ہے۔ اس کمرے کے اندر بھی تیرے ہی آدمی ہیں۔ یہ کیوں سچ بول رہے ہیں تو

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

نے ذرا سوچا نہیں میں بتاتا ہوں۔ ان سب کو اپنی موت نظر آرہی ہے۔ یہ اپنے گناہوں کا مداوا کررہے ہیں تجھے ابھی تک کچھ نظر نہیں آیا۔ اس لئے تو ابھی تک غرور اور طاقت کے نشے میں ہے۔ اب دیکھ تیرے سامنے کون کھڑا ہے۔" اس نے سامنے دیکھا اور اچھل پڑا۔

"یہ تو مر گئی تھی، یہ کہاں سے آ گئی؟" وہ بولا۔

"ہاں یہ مر گئی تھی۔ یہ گوبندہ کی گھر والی نہیں، یہ اس کی تڑپتی ہوئی آتما ہے۔ تم نے اس کے شریر پر ستم توڑا تھا۔ مگر آتما کا تم کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ تم سب سے انتقام لینے کو بے چین ہے۔"

"مجھے معاف کردو، میں گناہ گار ہوں۔ معاف کر دو۔" ٹھاکر بولا۔

"کس کس سے معافی طلب کرو گے تمہارے کارناموں کی بہت لمبی فہرست ہے۔" اور پھر میرے کارندوں نے کام شروع کر دیا۔ کسی کو جان سے نہیں مارا گیا۔ مگر سب کو ناکارہ کر دیا گیا۔ ٹھاکر دونوں آنکھوں اور ہاتھوں سے بے کار ہوا۔

تہہ خانے میں گوبندہ موجود تھا۔ مگر وہ بھی بہت کمزور اور بیمار تھا۔ اس کا علاج کیا گیا۔ مگر اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ دونوں کی آتمائیں آسمانوں کی طرف پرواز کر گئیں۔ ظلم کی ایک اور داستان اس طرح ختم ہوئی۔

❁.....❁.....❁

عقیدت اچھی چیز ہے۔ مگر انسان کو اس کی غلط سوچ بھٹکا دیتی ہے۔ سوچ کو بھٹکانے میں کچھ مطلب پرست انسانوں نے بھی کردار ادا کیا اور اپنی وحشیانہ فطرت کی تکمیل کے لئے فرضی دیوی، دیوتاؤں کا سہارا لیا اور عام انسانوں کو پھانسنے کی خاطر سخت رسومات رائج کر دیں اور اپنی ہیبت کو برقرار رکھا۔ میں کسی مذہب کے خلاف نہیں ہوں مگر جن باتوں کو عقل تسلیم ہی نہ کرتی ہو، ان کو کس طرح مان لوں۔

کچھ دیو مالائی کردار اور ان کے نام میں آپ کو بتاؤں تو آپ بھی حیران رہ جائیں گے۔ مگر میرا مقصد کسی مذہبی بحث میں پڑنا نہیں ہے۔ اس ترقی یافتہ دور میں انسان خود اتنی سمجھ بوجھ کا مالک ہے کہ وہ سب کچھ سمجھ جاتا ہے کہ اس کو کہاں بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ مگر حیرت صرف اس بات پر ہے سمجھتے ہوئے بھی اسی پر قائم رہتا ہے۔ اس کی وجہ صرف جو میں سمجھتا ہوں یہ ہے کہ اس کی جڑیں ہزاروں سال سے اس معاشرے میں ہیں۔ وہ کس کس کو جواب دے، رشتہ داریاں دوستیاں۔ سب کچھ سمجھ کر بھی وہی کر رہا ہے جو اس کے بزرگ کرتے آئے ہیں۔ میرے خیال میں یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ انسان اپنے دور جہالت کی اساسی باتوں کو فراموش نہ کر سکے۔

ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ کراچی سے کنیا کماری تک پھیلا ہوا ہے۔ ہزاروں شہر اور گاؤں ہیں اور کروڑوں کی آبادی ہے۔ پرتھوی راج چوہان کے بعد یہاں پر مسلمانوں کی حکومت رہی اور مغلیہ دور تک اس ملک پر مسلمان حکومت کرتے رہے۔ پھر انگریز آ گئے۔ کئی سو سال وہ حکومت کرتے رہے۔ یوپی ایک زرخیز علاقہ ہے۔ یہاں پر شہروں سے زیادہ گاؤں میں آبادی ہے اور ان کا ذریعہ معاش زراعت ہے۔

شہر آگرہ اور دلی کے درمیان بہت گاؤں ہیں۔ دلی سے آگرہ کی طرف سڑک پر سفر کریں تو آگرہ سے چالیس یا کچھ زیادہ پر سڑک سے صرف چند فرلانگ پر ایک گاؤں آتا ہے۔ اچھا بڑا گاؤں ہے۔ مین روڈ سے اندر گاؤں کی طرف پکی سڑک ہے۔ اس پر آموں کے باغات ہیں۔

ساری آبادی اہیر قوم اور جاٹوں کی ہے۔ پورے گاؤں میں صرف دو گھرانے مسلمانوں کے ہیں۔ ایک گھرانا اچھا کھاتا پیتا گھرانا ہے۔ زمینداری کرتا ہے، بہت زمینیں ان کے پاس ہیں۔

دوسرا گھرانا ان کی خدمت کرنے کو ہے۔ اس گھرانے کا پورا خرچ پہلا گھرانا پورا کرتا ہے۔ اس گاؤں کا نام شام نگر ہے۔ اسی شام نگر میں ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے۔

اس کا باپ زمیندار اکبر خاں کا ہاری ہے۔ وہ اچھا کسان ہے۔ اکبر خان بھی اس سے خوش ہے۔ اکبر خان نے کبھی اس کو اپنا نوکر یا ہاری نہیں سمجھا۔ اس کی ہر ضرورت د

پوری کرتا ہے۔ اکبر خان اور اس کے بزرگ بھی یہی کرتے آئے تھے۔ اس سے بھی زیادہ زمینیں دوسروں کے پاس تھیں اور وہ ہندو بھی تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ پنچایت کا سرپنچ تھا۔ اس کی بات انگریز سرکار بھی غور سے سنتی تھی۔ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا تھا۔

اور اپنا فیصلہ بہت غور و فکر اور مشورے سے کیا کرتا تھا۔ اپنی پسند ناپسند کو درمیان میں نہیں آنے دیتا تھا۔ یہ سب جانتے تھے اور اس کے فیصلوں کو تسلیم کرتے تھے۔

اس لڑکی کے باپ کا نام باس دیو ہے اور ماں کا نام سنتی ہے۔ یہ لڑکی ان کی دوسری اولاد ہے۔ اس سے پہلے ایک لڑکا ہے۔ اس لڑکی کا نام وہ شکلا رکھتے ہیں۔ وہ لڑکی سات سال کی ہو جاتی ہے۔ گاؤں کے بچوں کے ساتھ کھیلتی ہوتی ہے پھر اس کو گاؤں کے پنڈت کے پاس جہاں پر گاؤں کے اور بچے بھی پڑھتے ہیں، بٹھا دیا جاتا ہے۔ یہ پنڈت گاؤں کے مندر کا پجاری بھی ہے۔ اس کا نام پنڈت دیا ناتھ ہے۔ پنڈت دیا ناتھ پختہ طور پر کٹر ہندو ہے۔ بظاہر وہ بڑا سیدھا سادھا نظر آتا ہے۔ مگر اندر سے وہ خود کے علاوہ سب کو حقیر اور کمتر خیال کرتا ہے۔ شکلا اس کے پاس روز پڑھنے جاتی ہے۔ ایک سال گزر جاتا ہے۔ دوسرا سال شروع ہو جاتا ہے اور پھر عجیب واقعہ پیش آتا ہے۔

لڑکی اپنی ماں سے کہتی ہے۔ "تم میری ماں نہیں ہو، پھر میرا نہیں ہے، میرا گھر تو بہت بڑا ہے اور میں متھرا کی رہنے والی ہوں۔ میرے پتی کا نام دھرم داس ہے اور متھرا کے قریب گاؤں اجودا میں میرا گھر ہے۔" سب یہ سن کر حیران ہوتے ہیں۔ سارے ہندو فوراً تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ اپنے پچھلے جنم کی بات بتا رہی ہے۔ اس نے تو متھرا کو دیکھا کہیں اور دھرم داس کے بارے میں یہ کیا جانے، اس سے لگے اس نے بتایا کہ میرے دو لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں۔ کیا بیمار ہو گئی تھی، پھر مجھے نہیں پتہ کیا ہوا۔

اب اس کی کہی باتوں کے بارے میں ایک تحقیقاتی کمیٹی بنا دی گئی۔ اکبر خان اور پنڈت کو اس میں رکھا گیا۔ کچھ مسلمان اور ہندوؤں کو اس میں شامل کیا گیا۔ یہ لوگ متھرا چلے گئے۔ متھرا کے اجودا گاؤں گئے اور دھرم داس کے بارے میں پتہ کیا۔ تو پتہ چلا کہ دھرم داس کا دس سال پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ اس کی چاروں لڑکیاں اپنے اپنے گھروں میں ہیں۔ بڑے لڑکے کا بھی دیہانت ہو گیا ہے۔ ایک لڑکا زندہ ہے۔ یہ خاندان وہیں پر آباد ہے۔ اس کی ماں کا نام شکلا دیوی تھا جو کہ مر چکی ہے۔

اب تو شکلا کی ساری باتوں کی تصدیق ہو گئی۔ اس کی شہرت گاؤں گاؤں پھیلتی گئی اور شکلا دیوی بن گئی۔ دور دور سے عورتیں اور مرد اس کے درشن کو آنے لگے۔

پنڈت اس کا نمائندہ بن گیا اور سب کو بتانے لگا۔ اس نے بہت سی باتیں اپنی طرف سے بیان کرنا شروع کر دیں۔ پنڈت دیا ناتھ کے اور باس دیو کے وارے نیارے ہو گئے۔ جو آتا دیوی کی نظر کچھ نہ کچھ ضرور کرتا۔ اب یہ شہرت شہروں تک پھیل گئی تھی۔ پنڈت لوگوں نے اس واقعہ کو خوب اچھالا۔

انگریز سرکار اور اکبر خان کیا کرتے، وہ ان باتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے مگر جھٹلاتے کیسے لڑکی کی ہر بات درست نکلی تھی۔ شام نگر گاؤں بڑی اہمیت اختیار کر گیا۔ آگرہ اور اس کے قرب و جوار کے شہروں سے لوگ جوق در جوق دیوی کے درشن کو آنے لگے۔ پنڈت آسن جما کر باس دیو کے گھر بیٹھ گیا اور خوب کمائی کرنے لگا۔ جب بھیڑ زیادہ ہونے لگی تو پنڈت نے وقت مقرر کر دیا کہ دیوی کو زیادہ تنگ نہ کیا جائے، اب لوگ آتے اور گاؤں میں ڈیرہ لگا دیتے۔ کسی کو دو روز میں کسی کو تین روز میں دیوی کے درشن ہو جاتے۔ اب شکلا دیوی بھی اتنی ہوشیار ہو گئی تھی کہ لوگوں کے سوالوں کا جواب فر فر دیا کرتی تھی۔ اس کے چہرے پر بزرگوں کی سی سنجیدگی طاری رہتی تھی۔ پنڈت اس کے پاس ہر وقت تھا۔ اس دیوی کے لئے پنڈت کا بہت بڑا سہارا تھا۔ ساری اونچ نیچ وہی سنبھالتا تھا۔ اگر اس کے بدلے وہ کچھ لے رہا تھا تو باس دیو کا کیا جاتا تھا۔ ہاتھ تو اس کے بھی رنگے جا رہے تھے۔ اس نے زندگی میں اتنا روپیہ پیسہ کب دیکھا تھا۔ گاؤں میں ایک میلا لگا ہوا تھا۔ دھرم کا معاملہ تھا۔ سارا گاؤں اس پر

READING CORNER http://readingcornerpk.blogspot.com/

فخر کرتا تھا کہ یہ چمتکار ہمارے گاؤں میں ہوا۔

اکبر خان لاکھ اثر رسوخ والے تھے مگر دھرم کے سامنے وہ کیا کہتے اور اگر ایسی غلطی کرتے تو کون ان کی سنتا۔ بنی بنائی عزت پر آجاتی۔ ان کی کوئی دلیل، کوئی نہیں سنتا۔ سب اس کو ہندو دھرم اور اس کی پرم پرا کا دشمن سمجھتے، اس لئے وہ خاموشی اختیار کر گئے۔

پورے ڈیڑھ سال یہ ڈرامہ ہوا۔ اس کے بعد شکلا دیوی پھر سے شکلا بن گئی۔ مگر اس دوران یہ ضرور ہوا کہ باس دیو، شری باس دیو بن گئے۔ ان کا مکان اچھا بن گیا اور انہوں نے کاشت کاری چھوڑ کر آڑھت شروع کر دی۔ پنڈت نے بھی لب سڑک ایک بہت بڑا پلاٹ خرید کر گورکھشا آشرم بنالیا اور ایک بہت بڑا مندر بنالیا۔ اس سے ان کی آمدنی بہت بڑھ گئی۔

اس واقعہ کی اتنی شہرت ہوئی تھی کہ دلی میں، میں نے بھی سنی تھی۔ مگر اس کو نہ میں نے اہمیت دی اور نہ رولو کا نے۔ پھر یہ معاملہ ختم ہو گیا تو میں نے رولو کا سے کہا۔

"تم نے شام نگر گاؤں کا واقعہ سنا تو ہوگا، اس پر روشنی ڈالو۔"

"میں کیا روشنی ڈالوں۔ مجھے تو یہ سب بہت بڑا ڈرامہ لگتا ہے۔" رولو کا نے کہا۔

"مگر لڑکی کی بتائی سب باتیں ہو بہو درست ثابت ہوئی ہیں۔ یہ کس طرح ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اسی لئے تو میں اس کو ڈرامہ کہہ رہا ہوں۔" رولو کا نے جواب دیا۔

"وضاحت کرو ذرا۔" میں نے کہا۔

"لڑکی کے ذہن میں یہ بات بٹھائی گئی، اس کو پوری تیاری کرائی گئی اور پھر منظر عام پر لایا گیا ہے۔ ابھی میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ آپ نے سوال کر دیا ہے۔ اس کا جواب مجھے تلاش کرنا ہے۔" رولو کا نے جواب دیا۔

"چھوڑو۔ میں نے تو ایسے ہی اپنی تسلی کے لئے پوچھ لیا تھا۔" میں نے کہا۔

"مگر ایک گرہ تو آپ کے دماغ میں رہے گی۔ آخر اس لڑکی نے اپنے گذشتہ جنم کے حالات کس طرح بتائے۔ کیا واقعی یہ اس کا دوسرا جنم تھا۔" رولو کا نے کہا۔

"تم نے اسے ڈرامہ کیوں کہا؟" میں نے پوچھا۔

"دیو مالائی باتوں میں بے بنیاد اور بہکانے والی باتیں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ اس لئے میں نے اسے ڈرامہ کہا ہے اور جواب نہیں دیا۔ میں خود اس کی تحقیقات کروں گا۔ پھر جواب دوں گا۔ اگر ہر معاملے کو عقل کی کسوٹی پر رگڑ لیا جائے تو بھٹکنے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ انسان افضل ترین مخلوق صرف اپنی عقل کی وجہ سے ہے۔ کسی بھی پاگل سے کوئی رابطہ نہیں کرتا۔ اس کو کسی قابل نہیں سمجھا جاتا۔ صرف اس لئے کہ اس کی عقل اس کا ساتھ چھوڑ چکی ہوتی ہے۔" رولو کا نے کہا۔

"تم نے درست کہا مگر کچھ باتیں ایسی سامنے آتی ضرور ہیں کہ انسانی عقل چکرا کر رہ جاتی ہے۔ اب تازہ واقعہ ہی دیکھ لو۔" میں نے کہا۔

"ہاں کچھ چیزیں دیکھ کر انسان کا حیرت زدہ ہونا فطری عمل ہے۔ انسان ایک جانب تو عقل کے بل پر مادہ کی ہیئت پر غور و فکر کرتا ہے مگر دوسری طرف یہ نہیں دیکھتا کہ اس کا موجد کون ہے۔ اس کا خالق اس کا موجد وہی ہے جس نے اتنی بڑی کائنات کو ایک پل میں بنا ڈالا اور جو اصول و قاعدے کروڑوں سال پہلے بنائے تھے۔ وہ آج تک نہیں بدلے۔ کروڑوں سال سے سورج چاند موسم ہر چیز اپنی جگہ قائم ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔"

"تمہاری بات میں وزن ہے۔" میں نے کہا۔

"ارے حکیم صاحب۔ آپ ترازو بانٹ کے چکر میں کہاں پھنس گئے۔" رولو کا ہنس کر بولا۔

"اب کیا ارادہ ہے، یہ بتاؤ۔" میں نے پوچھا۔

"اب میں شام نگر گاؤں جاؤں گا اور حقیقت جاننے کی کوشش کروں گا۔" رولو کا نے جواب دیا۔

"میرے خیال میں تو تمہاری یہ کاوش بے کار ہی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں بظاہر تو ایسا ہی ہے مگر ایک گانٹھ تو آپ کے اندر پڑی ہوئی ہے۔ دوسرے میں خود آواگون کی حقیقت جاننے کا شوقین ہوں۔ ہمیشہ دوسروں کے لئے بھاگ دوڑ کرتا رہا ہوں۔ اب کے اپنے جذبہ تحسین کی تسکین کی خاطر کچھ کر لوں۔" رولو کا نے جواب دیا۔

اور رولو کا شام نگر روانہ ہو گیا۔

کہنے کو صرف دو گھرانے مسلمانوں کے اس گاؤں میں تھے۔ مگر کسی قسم کا تعصب ان کے ساتھ نہیں ہوتا ہے۔ ایک تو وجہ یہ تھی کہ اکبر خان کا گھرانہ زمینداری کرتا تھا اور گاؤں کا کھاتا پیتا گھرانا تھا۔

دوسرا گھرانا اس کے خدمت گار کا تھا۔ اکبر خان گوشت خور آدمی تھے۔ ان کی حویلی میں ہر دوسرے دن بکرا، بکری ذبح ہوتے تھے۔ یہ بات سب ہی جانتے تھے مگر اس پر اعتراض کوئی نہیں کرتا تھا۔

گاؤں کے بڑے اکبر خان کی حویلی میں روز ہی آتے تھے اور اکثر رات کا کھانا بھی کھاتے تھے۔ اکبر خان کے پاس گوشت کی اسپیشل ڈش ضرور ہوتی تھی۔ کبھی کبھی ہرن کے کباب، نیل گائے کی بریانی یا پلاؤ بھی ہوتا تھا۔ گاؤں کے بڑے آتے تو تھے ملاقات کو مگر اصل مقصد ان کا کچھ اور ہوتا تھا۔

میں ایک جانوروں کے ڈاکٹر کے روپ میں گاؤں گیا اور اپنا نام ڈاکٹر موسیٰ خان بتایا۔ میں نے اکبر خان سے اور دوسروں سے درخواست کی کہ میں کچھ عرصہ رکنا چاہتا ہوں اور جانوروں کا علاج کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سن کر سب خوش ہوئے اور اکبر خان نے میرے رہنے اور کھانے کا بندوبست کر دیا۔

میں روزانہ گاؤں کی گلیوں میں چکر لگاتا اور کسانوں کے جانوروں کو دیکھتا، ان کا علاج بتاتا، دوا بتاتا۔ چند ہی روز میں مجھے سب جاننے لگے اور خود بھی میرے پاس آنے لگے۔ گاؤں میں زیادہ عرصہ آدمی اجنبی نہیں رہتا۔ یہاں پر چوپال پر سب ایک دوسرے کا پوچھتے ہیں۔ مزاج پرسی کرتے ہیں۔ دکھ سکھ بانٹتے ہیں۔ شہروں کی طرح نفسا نفسی کا عالم نہیں ہوتا۔ دن بھر محنت کرنے والے کسانوں کی واحد تفریح چوپال پر گپ شپ اور قصہ کہانیاں سننا ہے۔ سورج غروب ہوتے ہی یہ لوگ آنا شروع ہو جاتے ہیں اور پھر گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ رات نو بجے پورا گاؤں اندھیرے کی چادر میں چھپ جاتا ہے۔ کیوں کہ ایک ہل چلانے والا کسان صبح صادق بیدار ہو کر ہل کاندھے پر رکھ کر کھیت پر جاتا ہے اور اپنا کام ختم کرتا ہے اور آتے وقت سر پر چارے کا گٹھا کاندھے پر ہل لے کر گھر واپس آتا ہے۔ پھر اس چارے کو کٹی کرتا ہے اور بیلوں کو ڈالتا ہے رات کو جلدی سونا اس کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ شہری لوگ، دیہاتی زندگی کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو شہروں کو کھانا دیتے ہیں۔ شہروں کو روشن رکھتے ہیں۔ میں زندگی میں پہلی دفعہ کسی ہندوستانی گاؤں میں تھا۔ میں فوراً باس دیو کی طرف نہیں جانا چاہتا تھا۔

اور نہ اس لڑکی شکلا سے ملنا چاہتا تھا اور جو میری نظر میں سب سے اہم کردار پنڈت کا تھا، میں اب تک اس سے بھی نہیں ملا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ باس دیو کسی کام سے خود مجھے ملے اور یہ موقعہ آخر آ ہی گیا۔ اس کی بھینس بیمار ہو گئی۔ وہ مجھے بلا کر گھر لے گیا۔

اس نے نیا گھر بنوایا تھا۔ ایک طرف باڑہ تھا۔ جہاں تین گائیں اور دو بھینس بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے بھینس کا علاج بتا دیا۔ اس نے مجھے کچھ دینا چاہا تو میں نے انکار کر دیا اور پوچھا۔ "نیا گھر بنوایا ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔

"بس بھگوان کی کرپا ہے۔ میں مزدور آدمی ہوں۔"

"مگر اب تو تم مزدور نہیں لگتے۔" میں نے کہا۔

"بس کا بتائیں ایسا ہے کہ بھگوان کی نظر ہو گئی۔ ایک چمتکار میرے گھر ہو گیا اور وارے نیارے ہو گئے۔" وہ بولا۔

"کیا چمتکار ہوا، ذرا بتاؤ تو بھیا۔" میں نے پوچھا۔

"میری ایک چھوری ہے، بڑی کرموالی ہے۔ یہ سب اس کے کارن ہوا۔" وہ بولا۔

"اچھا مگر کس طرح؟" میں نے پوچھا۔

"اس کو اپنا پچھلا جنم یاد آ گیا۔ لو جی اس نے فر فر اپنے پتی اور پچھلے جنم کے خاندان کے حالات بتانے شروع

READING CORNER http://readingcornerpk.blogspot.com/

کر دیئے۔ میں کیا، پورا گاؤں یہ سن کر حیران رہ گیا اور پھر اس کی بتائی باتوں کی تصدیق کرنے گاؤں کے کچھ بڑے متھرا گئے۔ پتہ نشان اس نے سب بتایا تھا اور بھیا وہ سب باتیں ہو بہو ٹھیک نکلیں۔ پس پھر کیا تھا، لوگ جوق در جوق درشن کو آنے لگے۔ میری بٹیا دیوی سمان ہوگئی اور بن برسنے لگا۔ بھگوان بھلا کرے پنڈت کا۔ اس نے اس سے میری بڑی مدد کری۔ سارا کام وہی کرتا تھا۔ میں بھلا یہ سب کیسے کرتا، تو بھیا یہ کہانی ہے۔" باس دیو خاموش ہوگیا۔

"تو اب کا وہ بھول گئی سب۔" میں نے پوچھا۔

ہاں پنڈت کہتا تھا کہ یہ صرف کچھ عرصہ یاد رہتا ہے۔ پھر آدمی بھول جاتا ہے اور ایسا واقعہ ہزاروں سال میں ہوتا ہے۔ اگر بھول نہ جائے تو پھر اس جنم میں زندگی کیسے گزارے گا۔" وہ بولا۔

"وہ پنڈت بھی بڑا جانکار آدمی لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں بھیا بہت جانکار ہے۔" وہ بولا۔

"اب کیا یہاں نہیں رہتا۔" میں نے پوچھا۔

"گاؤں کے اندر نہیں ہے۔ گاؤں کے باہر سڑک کے کنارے جو گئو شالہ بنی ہے وہ اس نے ہی بنائی ہے۔ بہت بھلا آدمی ہے۔ ایک مندر بھی اس نے بنالیا ہے۔ بس وہیں رہتا ہے۔" وہ بولا۔

"میری ایک بنتی ہے۔ پوری کرو گے؟" میں نے کہا۔

"ہاں..... ہاں..... بولو۔" اس نے پوچھا۔

"ایسی دیوی سمان چھوری ہے تمہاری۔ ذرا درشن تو کرادو چار بات کرلیں گے۔" میں نے کہا۔

"ارے تو یہ کون سا مشکل کام ہے۔ ابھی بلائے دیتے ہیں۔"

اور وہ گھر کے اندر چلا گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک بارہ تیرا سال کی گوری سی لڑکی تھی۔ اس نے ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ حالانکہ اس عمر میں لڑکیاں یہاں ساڑھی نہیں باندھتی ہیں۔ وہ گھاگرا اور چولی استعمال کرتی ہیں۔ اس کے چہرے پر بھی عمر سے زیادہ سنجیدگی تھی۔ وہ خاموشی سے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ باس دیو بھی اس کے قریب ہی تھا۔ میں نے کہا۔ "بھیا ذرا دو گھونٹ پانی تو پلائے دو، پیاس لگی ہے۔"

وہ چلا گیا تو میں نے لڑکی سے کہا۔ "میں تمہارا پچھلے جنم کا رشتہ دار ہوں۔"

"کون مجھے کیا خبر۔" وہ بولی۔

"تمہاری لڑکی کا بیٹا ہوں۔ تم میری نانی ہو۔" میں نے کہا۔

"تم کا کہہ رہے ہو، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" وہ بولی۔

"سمجھ میں اس لئے نہیں آرہا کہ اب پنڈت تمہارے پاس نہیں ہے۔ اس نے تم کو جتنا پڑھایا تھا، تم نے اتنا کام خوب اچھی طرح کردیا۔ اب اس کی ضرورت نہ تم کو ہے، نہ تمہارے پتا کو نہ پنڈت کو۔"

میں نے کہا۔ لڑکی کم عمر تھی اور گاؤں کی سیدھی سادھی گھبرا گئی۔ اتنے میں باس دیو آگیا۔ لڑکی کو دیکھا تو بولا۔ "کا ہوا بیٹا؟" مگر اس نے جواب نہیں دیا اور اندر چلی گئی۔

میں نے باس دیو سے کہا۔ "خوب رنگ جمایا تم نے۔ سارے گاؤں کو بے وقوف بناڈالا۔ تم تو بڑے گرو ہو بھائی۔"

"کا ہوا ڈاکٹر کیسی بہکی بہکی باتیں کررہے ہو؟" وہ بولا۔

"باس دیو تمہاری لڑکی کو کوئی جنم یاد نہیں آیا تھا۔ اس کو یہ سب سبق پڑھایا گیا تھا اور اس نے وہ سبق سب کے سامنے پڑھ دیا ہے۔ سمجھ دار ہے، گھبرائی نہیں اور دیوی بن گئی۔ بڑا بن اس پر برسا، تم نہال ہوئے سو ہوئے وہ پنڈت بھی نہال ہوگیا۔ خوب ڈرامہ رچایا تم نے۔" میں نے کہا۔

"میں نے کیا کیا ہے ارے چھوری نے خود سب کچھ بتایا تھا اور سچ بتایا تھا۔ سب نے جا کر پتہ کیا، سب سچ تھا، پھر اس میں کیا کھوٹ رہ گیا۔" باس دیو بولا۔

"تم بہت سی باتوں سے ناواقف ہو۔ سارا کیا دھرا

پنڈت کا لگتا ہے۔ مگر تم بے فکر رہو۔ یہ بات میں کسی کو بتاؤں گا نہیں۔ کیونکہ اب بتا کر اس کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہوگا۔ جو مقصد پنڈت کا تھا وہ اس نے پورا کرلیا ہے۔" میں نے کہا۔

"پنڈت نے اگر کچھ کیا ہے تو کیوں؟" وہ بولا۔

"بہت بھولے ہو، سمجھ نہیں رہے ارے بھولے ناتھ۔ اس کو روپے کی ضرورت تھی۔ وہ کسی طرح روپے کمانا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ آسان ترکیب آگئی اور اس نے تمہاری لڑکی کے ذہن کو پلٹنا شروع کردیا۔

اور اس کے ذہن میں لڑکی کے پچھلے جنم کی باتیں اتارنے لگا۔ متھرا میں جس خاندان کا اس نے لڑکی کے ذہن میں ڈالا، وہ ضرور اس خاندان کے بارے میں خوب جانتا تھا۔ وہی باتیں اس نے لڑکی کو خوب یاد کرادیں اور ڈرامہ شروع کردیا۔ تم کو اس نے کچھ نہیں بتایا۔ اس لئے کہ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔"

"پھر بھلا بتاؤ، میرا کیا قصور ہے؟" وہ فوراً بولا۔

"میں بھی تم کو کب قصوروار کہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اب کیا ہوگا؟" وہ فکرمندی سے بولا۔

"کچھ نہیں ہوگا، بھگوان نے تم پر کرپا کردی ہے موج کرو۔" اور میں واپس چل دیا۔

مجھے جو شبہ تھا وہ میں نے بیان کردیا تھا۔ اب اصل اور ہدایت کار جس کا یہ ڈرامہ تھا، اس سے ملاقات کرنا تھی۔ دوسرے ہی دن میں صبح ہی گئو شالہ کی طرف چلا گیا۔ یہ گئو شالہ اور مندر چار پانچ ایکڑ زمین پر بنا ہوا تھا۔ بڑے دروازے کے بعد ایک کھلا میدان اور درمیان میں ایک مندر بنا ہوا تھا۔ اور اس میں گنیش جی پالکی میں بیٹھے تھے۔ میں مندر کے قریب چلا گیا۔ مندر کے دونوں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک آدمی میرے قریب آگیا اور بولا۔

"کس سے ملنا ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "پنڈت جی سے ملاقات کرنی ہے۔"

"اچھا دیانا تھ جی سے ملنا ہے۔ آؤ وہ اندر ہیں۔" میں اس کے ساتھ چلا، وہ ایک کمرے کے اندر چلا اور بولا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" میں بھی اندر چلا گیا۔ اندر ایک ساٹھ سال سے اوپر کا آدمی ایک دھوتی اور بنڈی میں ملبوس تخت پر بیٹھا تھا۔ وہ بولا۔ "کیا بات ہے (چندن) کیا بات ہے؟"

میرے ساتھ جو آیا تھا وہ چندن تھا، بولا۔ "یہ آدمی آپ کو تلاش کررہا تھا۔ میں لے آیا ہوں۔ یہی ہیں پنڈت جی۔" وہ بولا۔

میں نے اس سے کہا۔ "اچھا بھائی تم جاؤ۔" اور میں پنڈت سے مخاطب ہوا۔ "شام نگر کے تم وہی پنڈت ہو جو پچھلا جنم بتانے والی لڑکی کے ساتھ تھے۔"

"ہاں جی بھگوان کا یہ چمتکار میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔" وہ بولا۔

"تم کچھ غلط کہہ گئے ہو پنڈت۔" میں نے کہا۔

"کیا غلط کہا میں نے سارے ہندوستان نے یہ چمتکار دیکھا ہے۔" وہ بولا۔

"غلط یہ کہا کہ تم نے خود یہ چمتکار دکھایا ہے۔ بھگوان کو درمیان میں کیوں لاتے ہو۔ بھگوان کا نام لے کر تم جو کرتے ہو۔ وہ سب کون سا بھگوان تم سے کرنے کو کہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ارے تو کون ہے اناپ شناپ بکے جارہا ہے۔ میں کہتا ہوں چلا جا یہاں سے۔" وہ غصے میں بولا۔

"چلا جاؤں گا، فکر کیوں کرتے ہو۔ میرے ساتھ متھرا کے کچھ لوگ بھی آئے ہیں۔ وہ تم کو جانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تم متھرا کے رہنے والے ہو اور گاؤں اجودا کے دھرم داس کے بارے میں سب کچھ جانتے ہو، اس کی اولادوں کے بارے میں گھر بار اور اس کی دھرم پتنی شکلا کے بارے میں تم کو سب کچھ پتہ ہے۔ دھرم کے مرنے کے بعد سے شکلا کے مرنے تک تم وہیں پر تھے اور پھر تم شام نگر آگئے۔ یہاں آکر تم نے ایک بہت کامیاب اور اچھا ڈرامہ کھیلا اور وہ سب کچھ پالیا، جس کی تم نے تمنا کی تھی۔ جو لوگ میرے ساتھ ہیں۔ وہ تم کو پھر متھرا لے جائیں گے اور

READING CORNER
http://readingcorner.blogspot.com/

تمہارے پورے ڈرامے کی قلعی کھل جائے گی..... جو کچھ کمایا ہے ناک کے رستے نکل جائے گا۔ صرف میری تصدیق کی ضرورت ہے۔ میں شام نگر میں آیا۔ تیری وجہ سے تھا، اب بول کیا کہتا ہے۔ جو سچ ہے قبول دے ورنہ تیرے ساتھ بہت بری ہوگی۔'' میں نے کہا۔

پنڈت کا سارا کلف اتر گیا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''میں کیا کرتا، زندگی دان دکھشنا میں گزر گئی۔ بھجن کیرتن کی آمدنی پیٹ نہیں بھرتی۔ میں بھی آخر انسان ہوں، کچھ تو کرنا تھا۔ تم نے جو کہا وہ سب ٹھیک ہے۔'' وہ بولا۔

''تجھے یہ خیال نہیں آیا کہ کبھی لڑکی کوئی بات کم زیادہ کردے گی تو بات بگڑ جائے گی۔'' میں نے پوچھا۔

''میں نے ڈیڑھ سال تک اس کو ایک ہی بات بتائی تھی اور وہ یہ تھی کہ تو شکلا ہے اور تو متھرا کی ہے۔ تیرے پتی کا نام یہ ہے۔ اتنی بیٹیاں ہیں، اتنے بیٹے ہیں۔ بار بار میں نے الٹ پلٹ کر یہ سبق یاد کرادیا تھا۔ باقی سب کام تو مجھے کرنا تھا اور میں اس میں کامیاب ہوگیا۔ اب میری لاج تمہارے ہاتھ میں ہے۔''

''دل تو نہیں کرتا مگر میں کچھ نہیں کروں گا۔'' اور میں واپس چل دیا۔

اب میرا گاؤں میں کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے پوری کہانی سننے کے بعد کہا۔ ''تو اس طرح آواگون تسلیم کروایا گیا ہے۔''

''اس کا فیصلہ تو آپ کریں۔ میں نے جو دیکھا بیان کردیا ہے۔''

❄.....❄.....❄

انسان بڑا سنگدل اور سفاک بھی ہے۔ طاقت کی فراوانی رحم کے جذبے کو ختم کرتی ہے۔ چاہے یہ لمحاتی عمل ہو مگر کبھی کبھی یہ دور انسان پر آتا ہے۔ اس دور کے گزرنے کے بعد پچھتاوے کا دور شروع ہوتا ہے۔ آدمی اپنی غلطیوں کو محسوس تو کرتا ہے۔ مگر اکثریت اپنی غلطیوں کو محسوس ہی نہیں کرتی اور اگر کرتی ہے تو ان کی کچھ نہ کچھ توجیہات پیش کر کے خود کو برحق سمجھتی ہے۔ جو لوگ اپنی غلط روش کو دیانت

داری سے محسوس کر لیتے ہیں، وہ دوبارہ غلطی نہ کرنے کا عہد کرتے ہیں اور آنکھیں کھول کر چلتے ہیں۔

مکرم علی اچھا کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ہے۔ اس کا باپ ایک دفتر میں کلرک ہے۔ پرانے زمانے کا مڈل پاس ہے۔ باپ دادا کے زمانے کا مکان ہے۔ گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ مکرم علی کے باپ مقدم علی کو بنا بنایا گھر ملا تھا۔ باپ نے بڑی کوشش کے بعد مکرم علی کو سرکاری دفتر میں نوکر کرا دیا تھا۔ مقدم بھی بہت نیک اور شریف آدمی تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ دفتر سے آنے کے بعد صرف نماز پڑھنے کو مسجد کے لئے نکلتا تھا۔ محلے میں کسی سے زیادہ راہ رسم نہیں رکھتا تھا۔ کسی کو اس کی ذات سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ صرف اس کی بیوی سے اس کی نہیں بنتی تھی۔ وجہ صرف پیسہ ہوا کرتا تھا۔ وہ پورا خرچ بیوی کو نہیں دیتا تھا۔ اسی بات پر روزانہ ان کے درمیان جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ یہ بات اپنی جگہ درست تھی کہ مقدم بھی بلا کا کنجوس آدمی تھا۔ وہ اپنا پیسہ خرچ کرنا جانتا ہی نہ تھا۔ ہر چیز مفت کی حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ دعوت شام کی کہیں سے آجائے تو وہ دوپہر کو بھی نہ کھاتا تھا اور نہ کسی کو کھانے دیتا تھا۔ خود بھی مختصر سا آدمی تھا۔ تین لڑکیاں تھیں۔ وہ بھی نہایت چھوٹے قد کاٹھ کی تھیں۔ ایک لڑکا تھا وہ بھی باپ کی طرح چار فٹ سے کچھ ہی زیادہ کا تھا۔ اماں پر کوئی بچہ نہیں گیا تھا۔ مقدم علی ہر دس تاریخ کو بڑے بھائی کے دروازے پر کھڑا ہو جاتا تھا۔ یہ بڑے بھائی ان کے تایا زاد تھے۔ مقدم علی کے حالات جانتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مقدم علی کا گزارہ اس کی آمدنی میں آسانی سے ہو سکتا ہے۔ مگر وہ پھر بھی ہر ماہ اس کی مدد کیا کرتے تھے۔ عید پر سب کو کپڑے بنا دیا کرتے۔ رمضان میں پورا خرچ ادا کرتے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ رشتے دار بڑی خاموشی سے مقدم علی کی مدد کر دیا کرتے تھے۔ اس سے مقدم علی گھر کا خرچ چلاتے۔ بیوی کے ہاتھ پر انہوں نے کبھی اپنی آمدنی نہیں رکھی تھی جو خرچ ہوتا خود کرتے۔ بیوی آدھا سیر گوشت منگواتی تو یہ پاؤ لاتے۔ ایک پاؤ دودھ صبح وہ لیتے تھے۔ اس میں سے ایک کپ خود پی جاتے۔ باقی کی چائے بنتی تھی۔

سبزی فروشوں سے خوب سودا کرتے اور پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کو سہلاتے اور آگے بڑھ جاتے۔ اسی طرح فروٹ والوں کے ساتھ کرتے۔ پورے محلے میں ان کی شہرت ہوگئی تھی۔ کوئی دوکاندار ان کو بھاؤ نہیں بتاتا تھا۔ جانتے تھے یہ خریدیں گے۔ کچھ نہیں اور بحث کریں گے۔ دعوت میں جانے کے بہت شوقین تھے اور حیرت انگیز طور پر اپنے قد کاٹھ سے زیادہ کھا جاتے تھے۔ کسی نے مذاق میں پوچھ لیا۔ مقدم بھائی یہ بھری بھری ڈشیں کہاں جا رہی ہیں تو جل کر جواب دیتے۔ میاں دعوت میں آئے ہیں۔ اگر دو وقت کا کوٹا نہ کھائیں تو پھر کیا فائدہ ہوا دعوت کا۔ اسی لئے تو دوپہر کو بھی یہیں کھانا تھا کہ شام کو دعوت میں کھانا ہے۔ ویسے آدمی شریف تھے۔ کمزوریاں تو ہر شخص میں ہوتی ہیں۔ اس کمزوری کو معاف کر دیا جائے تو ان کے گھر کے روز روز کے جھگڑے ختم ہو جائیں۔

لڑکیاں بڑی تھیں۔ قد کاٹھ کم سہی مگر جوانی تو آخر آتی ہی ہے۔

انہوں نے کچھ نہ کچھ جوڑ توڑ کر کے ان کی شادیاں کرنا شروع کر دیں اور تین کو فارغ کر دیا۔ اس سے ان کی جیب سے کچھ نہیں گیا اور کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوا۔ کسی سے جہیز لیا، کسی نے زیور دیا، کوئی کپڑے لے آیا اور کسی نے دو تین دیگ کھانا فراہم کر دیا۔ لو جی لڑکی کی شادی ہوگئی۔ ان کا طریقہ کار یہی تھا کہ خود کو نہایت مسکین اور غریب ظاہر کر کے وہ اپنا کام چلا لیتے تھے۔ ان کی ان باتوں سے بیوی کتراتی تھی۔ مگر کیا کرتی، رہنا تو ان کے پاس ہی تھا۔ اب رہ گئی ایک لڑکی اور ایک لڑکا اور مقدم میاں بیمار پڑ گئے۔ اپنی خود ساختہ دواؤں سے علاج کرتے رہے۔ پھر کسی نے اسپتال میں داخل کرا دیا۔ اپنے علاج پر بھی کبھی پیسہ خرچ نہ کیا اور پھر اپنی کنجوسی کی نظر ہو گئے۔ مگر مرنے سے پہلے ایک کام وہ کر گئے۔

لڑکا ان کی کنجوسی کی وجہ سے پڑھ نہ سکا تھا۔ اس کو اپنے دفتر میں چپراسی کی ملازمت دلا گئے اور میاں مکرم چپراسی ہو گئے۔ باپ کی طرح یہ چھوٹے سے تھے مگر دنیا کے الگ ڈھنگ دیکھ کر اور باپ کی شہرت سے ڈر کر باپ کے نقش قدم پر نہیں چلے۔ وہ اپنی تنخواہ ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتے اور وہ اپنی مرضی سے خرچ کرتی۔ تین فرد گھر میں تھے۔ خرچ ہی کتنا تھا۔ بڑے آرام سے گزارہ ہوتا تھا۔ مکرم کے ساتھ کے لڑکوں کی شادیاں ہو گئیں۔ مکرم کی اماں کو بھی بہو لانے کا شوق ہوا اور انہوں نے لڑکیاں دیکھنا شروع کر دیں۔

مکرم علی کی ماں کی خواہش تھی۔ بہو چاند کا ٹکڑا ہو۔ یہ خواہش تو ہر ماں کی ہوتی ہے۔ یہ قدرتی بات تھی، وہ یہ بھول جاتی ہے کہ بیٹا کیسا ہے، گھر کیسا ہے اور پھر مقدم علی کی شہرت مگر مکرم علی کو بھی سب جانتے تھے۔ باپ کی اس میں کوئی بات نظر نہیں آتی تھی۔ وہ نوکری کے علاوہ بھی کام کرتا تھا۔ محنت سے نہیں گھبراتا تھا۔ چال چلن بھی اچھا محلے میں نظریں نیچی کر کے چلتا تھا۔ لڑکے میں کوئی خرابی نہیں تھی اور رہے اس کے قد کاٹھ تو وہ پیدائشی ایسا تھا۔ اس میں تو وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مکرم علی پیسے سے بھی کمزور نہیں تھا۔ سب جانتے تھے کہ مقدم علی نے زندگی بھر پیسہ جمع کیا ہے۔ پھر اس کی ریٹائرمنٹ کا پیسہ بھی ملا ہے۔ سب ہی مکرم علی کے پاس محفوظ ہے۔ وہ اپنا گزارہ اپنی کمائی سے کرتا ہے۔ ایک بہن رہ گئی ہے۔ اس کا بھی اس نے انتظام کر رکھا ہے۔ تلاش کرنے سے تو ہر چیز مل ہی جاتی ہے اور مکرم کی اماں کو لڑکی پسند آگئی۔ نین نقش درست گوری چٹی عمر کا بھی میل اور گھرانہ بھی ٹھیک۔ ذات برادری کے نہ لڑکی والے قائل تھے نہ یہ لوگ۔ ذات برادری کا کیا ہے، آدمی شریف ہو، مسلمان ہو اور کیا دیکھنا۔ لو جی بات پکی ہوگئی۔ اور شادی ہوگئی۔ مگر یہ کیا ہوا۔ دلہن کے آتے ہی جھگڑا شروع ہو گیا۔

مکرم کی ماں کا کہنا تھا کہ یہ لڑکی وہ نہیں جو دکھائی گئی تھی۔ سب عورتوں نے پوچھا۔ یہ لڑکی نہیں دکھائی تو بھی اس میں کیا خرابی ہے۔ اچھی گوری چٹی لڑکی ہے۔ اب جو ہوا اس پر صبر کرو۔ مگر اس کی عمر تو دیکھو۔ میرے مکرم سے دس سال بڑی لگتی ہے۔ اماں نے جواب دیا۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

"ارے بہن۔ اب کیڑے نکالنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اب اس کو ہی اپنی بہو مان لو۔" کوئی عورت بولی۔

"یہ دھوکا ہوا ہے اور تم کہہ رہی ہو، اسی کو بہو مان لوں، میرا دل تو نہیں مانتا۔"

"تو پھر ایسا کرو رات زیادہ نہ کرو، اس کو ابھی واپس کردو۔" ایک بولی۔

اور رائے مشورے سے دلہن واپس چلی گئی۔ دلہن کے واپس جاتے ہی لڑکی والوں میں کھلبلی مچ گئی۔ سارا گھر مہمان عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ واپس کرنے کی وجہ پوچھی گئی تو ان کو بتایا گیا کہ دکھایا جس لڑکی کو تھا یہ لڑکی وہ نہیں ہے۔ اس لئے یہ ہم کو قبول نہیں۔

دونوں طرف کے بڑوں کی ہنگامی میٹنگ رات بھر ہوتی رہی اور پھر فیصلہ ہوا کہ لڑکی شوہر کے گھر جائے گی۔ مکرم میاں کو سمجھایا گیا۔ بے شک ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے مگر اب لڑکی کی زندگی کا معاملہ ہے۔ تم کو یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑے گا۔ اماں راضی نہیں تھی مگر بڑوں کی بات ان کو بھی رکھنا پڑی اور بہو پھر آ گئی۔

مکرم علی کو رات کو بیوی کے پاس تو جانا تھا جو فرض بڑوں نے اس کو سونپا تھا، اس کو تو پورا کرنا تھا۔ دلہن کمرے میں پلنگ پر بیٹھی تھی۔ گھونگٹ اس کے چہرے پر پڑا تھا۔ مکرم اس کے قریب بیٹھ گیا اور بولا۔ "میں نے تم کو بیوی کے طور پر بڑوں کی مرضی سے قبول کرلیا ہے۔ میں اپنے فرائض پورے کروں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ اب تم بتاؤ، تمہاری کیا مرضی ہے۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر دلہن نے جواب دیا۔ "میری شادی تم سے دھوکے سے کی گئی ہے۔ میں اس پر تیار نہیں تھی، میری بہن کو دکھایا گیا تھا۔ کیا تم اب بھی مجھے قبول کرتے ہو؟"

مکرم نے جواب دیا۔ "میں نے بزرگوں کا کہا مان لیا ہے اور تم کو بیوی تسلیم کرتا ہوں۔"

دلہن نے گھونگٹ اٹھا دیا۔ وہ ایک قبول صورت عورت تھی۔ اس کے چہرے پر کنواری لڑکیوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ عمر بھی مکرم سے زیادہ تھی۔

"اچھی طرح دیکھ لو۔ پھر فیصلہ کرو اور یہ بھی سن لو کہ میں کنواری لڑکی نہیں ہوں۔ تم نے اپنے بزرگوں کا کہا مان کر عقل مندی کا ثبوت نہیں دیا۔ یہ گنڈا جو میرے گلے میں پڑا ہے۔ اس کی وجہ سے میرا نکاح تم سے ہوگیا ہے۔ میری ماں نے کہا تھا کہ اگر تو نے یہ گنڈا اتارا تو میں زہر کھا کر مرجاؤں گی اور میرا خون تیری گردن پر ہوگا۔ اس نے مجھے پابند کردیا ہے۔ اگر میں گنڈا اتار دوں تو تم ایک منٹ میرے پاس نہ ٹھہرنا۔ مگر تم شریف آدمی لگتا ہے۔ تمہیں بتائے دیتی ہوں کہ میری شادی ہوچکی ہے اور وہ ایک دوسری مخلوق ہے، وہ تم کو نظر نہیں آئے گی۔ مگر میں اس کی بیوی ہوں، وہ ہر رات میرے پاس آتا ہے۔

مگر یہ گنڈا جب سے میرے گلے میں آیا ہے وہ نہیں آرہا۔ مجھے اس کی فکر ہے وہ بھی بے چین ہوگا۔ میں اپنے پیارے سے دور کردی گئی ہوں۔ ایک طرف ماں کی زندگی ہے، دوسری طرف میرا پیار ہے اور اب تم بھی اس میں شامل ہوگئے ہو۔ مگر یاد رکھنا میرے قریب آنے کی کوشش مت کرنا۔ میں تمہارے ساتھ رہنے پر تیار ہوں مگر بیوی بن کر نہیں رہوں گی اور اگر تم نے بیوی بنانے کی کوشش کی تو تم نقصان اٹھاؤ گے....." مکرم علی کی تو سٹی گم تھی، کیا جواب دیتا۔

"دنیا کے سامنے میں تمہاری بیوی رہوں گی مگر ہوں گی نہیں۔ یہ بات اپنے تک رکھنا، کسی کو بتانا مت۔ اگر بتاؤ گے تو تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ میرا شوہر بہت طاقتور ہے۔ چیونٹی کی طرح تمہیں مسل ڈالے گا۔ اپنی اماں اور بہن کو بھی سمجھا دینا۔ کوئی بات گھر سے باہر نہ جائے۔"

مکرم کی تو آواز بند ہوگئی۔ مارے ڈر کے اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ "اگر تم نے میرے کہنے کے مطابق عمل کیا تو میں تم کو مالا مال کردوں گی۔" دلہن نے کہا۔

"میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔" مکرم بڑی مشکل سے بولا۔

"اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔ اب تم جا کر آرام کرو۔"

میں بھی سوؤں گی۔" وہ بولی۔ اور مکرم خاموشی سے چھت پر چلا گیا۔

دن میں وہ دلہن سے بات بھی کرتا۔ اماں بھی اور بہن بھی سب دلہن کے کمرے میں جاتی آتیں۔ رات کو وہ خاموشی سے چھت پر چلا جاتا۔ یہ بات ایک گھر میں آخر کب تک چھپتی۔ ایک دن اماں نے پوچھا۔ "تم چھت پر کیوں سوتے ہو؟"

وہ ذرا سا گھبرایا، پھر بات بنا کے بولا۔ "ہاں گرمی زیادہ تھی، اس لئے چلا گیا تھا۔"

"جھوٹ مت بولو، مکرم تم روزانہ وہیں سوتے ہو، کیا وجہ ہے؟" ماں نے کہا۔

"وجہ کیا ہوگی، بتا تو دیا۔" مکرم نے کہا۔

"مجھ سے اڑنے کی کوشش نہ کرو۔ میں مانتی ہوں کہ وہ تم کو پسند نہیں۔ مگر اب کیا ہوسکتا ہے۔ تم نے بزرگوں کا کہنا مان لیا ہے۔ پھر تم اپنے فرض سے فرار کیوں ہو رہے ہو؟" اماں بولیں۔

"کچھ نہیں ہے اماں خاموش رہیں جو کچھ ہوا ٹھیک ہوا ہے تم بھی سکون سے رہو، تمہاری دلہن تمہارے گھر میں ہے اور کیا چاہئے آپ کو؟" مکرم نے جواب دیا۔

"اچھا تم نہ بتاؤ، میں ساجدہ سے خود پتہ کروں گی۔" اماں نے کہا۔

"اماں تم کو خدا کا واسطہ خاموش رہو، تم کسی سے کچھ نہیں پوچھو گی؟" مکرم نے کہا۔

"ارے واہ! یہ خوب رہی۔ کیوں نا پوچھوں کچھ پتہ تو چلے؟" اماں بولیں۔

"اماں ایک بات بتائیں تم کو میری زندگی عزیز ہے؟" مکرم نے کہا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی ضرورت ہے۔ تو تو میرا ایک ہی بیٹا ہے۔" اماں نے کہا۔

"تو پھر زیادہ کریدنہ کرو، خاموش رہو، کسی سے کبھی اس کا تذکرہ نہ کرنا۔ یہ کھیل بہت خطرناک ہے تم نہیں سمجھو گی میں تم کو زیادہ بتا بھی نہیں سکتا جو بتا دیا وہ بہت زیادہ ہے، اپنی زبان پر تالے ڈال لو....."

اماں کی سمجھ میں کچھ آیا، کچھ نہیں آیا مگر خوف زدہ ضرور ہوگئیں، بولیں۔ "اچھا بیٹا! ٹھیک ہے میں اپنی زبان پر تالے ڈال لیتی ہوں۔"

دلہن ساجدہ دن بھر ٹھیک رہتی۔ شام ہوتے ہی اس پر اداسی کے سائے آجاتے۔ صرف مکرم جانتا تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ وہ تڑپ رہی ہے اپنے شوہر کے لئے۔ اس کے گلے میں پڑا گنڈا اس کا دشمن ہے مگر وہ اس کو جدا بھی نہیں کرسکتی اور پھر ایک رات وہ گنڈا اس نے اتار دیا۔ اس کی خوشیاں اس کو حاصل ہوگئیں اور صبح کو پتہ چلا کہ اس کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ یہ سب کس طرح ہوا، کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ مگر مکرم نے کچھ اندازے ضرور لگا لئے تھے۔ اب شام ہوتے ہی اس پر بہار آجاتی تھی۔ مایوسی کے سائے دور دور نظر نہیں آتے تھے۔ مکرم کی ڈیوٹی یہ تھی کہ تازہ جلیبی اور دودھ ساجدہ کو دے دے۔ وہ جلتا رہتا، کڑھتا رہتا۔ اس کی مردانگی اس کو بہت کچھ کرنے پر ابھارتی مگر وہ کس سے لڑے، کس سے مقابلہ کرے، کوئی تو نظر آئے۔ ایک دن بے چینی حد سے بڑھ گئی تو وہ اپنے پرانے بچپن کے دوست اجمل کے پاس چلا گیا۔ اس کا چہرہ ہی بتا رہا تھا کہ وہ اندرونی طور پر کس کرب سے گزر رہا ہے۔

اجمل نے پوچھا۔ "کیا بات ہے، تیرے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟"

"بتاؤں گا تو تیرے چہرے پر اٹھارہ بج جائیں گے۔" مکرم نے جواب دیا۔

"اچھا پھر جلدی سے بتا۔" اجمل نے پوچھا۔

"یار میں بتانے ہی آیا ہوں مگر اب سوچتا ہوں، میرے ساتھ تو بھی کسی آفت میں نہ پھنس جائے۔" مکرم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"بے فکر ہو کر بتا۔ میں کسی آفت سے نہیں ڈرتا۔" اجمل بولا۔

"دیکھو دوست مانا کہ تم نڈر آدمی ہو مگر آدمی ہوائی چیزوں سے کس طرح لڑ سکتا ہے؟" مکرم نے کہا۔

READING CORNER
http://readingcorner.blogspot.com/

"میں نہیں لڑسکتا تو کیا ہوا، کوئی تو لڑسکتا ہے۔ ہم دونوں مل کر مقابلہ کریں گے۔" اجمل نے کہا۔

"یہ تو تم کو پتہ ہے کہ میرے ساتھ سسرال والوں نے دھوکا کیا تھا جو لڑکی دکھائی گئی تھی، اس سے شادی نہیں ہوئی۔ اس سے دس سال بڑی سے میرا نکاح کردیا۔ چلو یہاں تک ہی بات ہوتی تو میں برداشت کرلیتا۔" مکرم نے کہا۔

"اس لڑکی کی شادی کیوں نہیں ہوئی تھی؟" اجمل نے پوچھا۔

"اس لڑکی نے اپنی شادی کسی ہوائی مخلوق سے کرلی تھی اور وہ روز رات کو اس کے پاس آتی تھی۔ اس کی ماں نے کسی سے ایک گنڈا بنوالیا اور اس کے گلے میں ڈال دیا۔ اس سے وہ ہوائی مخلوق اس کے پاس آنے سے رک گئی۔

ماں نے کہہ دیا تھا کہ تو نے اگر یہ گنڈا اتارا تو میں زہر کھا کر مرجاؤں گی اور اس نے اسی دوران اس کا نکاح دھوکے سے میرے ساتھ کردیا۔ مگر دلہن نے مجھے ساری بات بتادی اور دور رہنے کا کہا۔ مگر اب وہ گنڈا اس نے اتار دیا ہے۔ اس کی ماں کا انتقال ہوچکا ہے۔ وہ مخلوق روز آتی ہے۔ میں بے غیرتی سے اس کے کام کرتا ہوں۔ مگر اب میری ہمت جواب دے چکی ہے۔ میں کیا کروں، کس سے لڑوں، کون ہے سامنے، میری بساط کیا ہے، میں ذہنی اور جسمانی دونوں طرح کمزور آدمی ہوں۔" مکرم نے کہا۔

"تو ایسا کرتے ہیں، کسی سیانے سے ملتے ہیں۔" اجمل نے کہا۔

"یار میں تو کسی سیانے کو جانتا نہیں، تم ہی کچھ کرو۔"

"یہاں فرخ آباد میں تو ایسا کوئی آدمی نہیں ہے۔ اس کے لئے بلیا چلنا ہوگا۔"

"تو پھر دیر نہ کرو چلو۔" مکرم نے کہا۔

دونوں نے بلیا کی بس پکڑی اور روانہ ہوئے۔ بس کا چار گھنٹے کا سفر پورا ہوا۔ مکرم نے پوچھا۔ "تم اس آدمی سے ملے ہو کبھی۔"

"ایک دو دفعہ کسی دوست کے ساتھ ملا ہوں۔ وہ کشن گنج میں ایک مندر ہے۔ اس میں رہتا ہے۔ جادو ٹونے کا ماہر ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ آدمی کام کردے گا....."

باتیں کرتے کرتے کشن گنج آگیا۔ یہاں پر کارتیکا مندر کے دروازے پر اجمل نے پوچھا۔ "گوکل کارتک مہاراج اندر ہیں۔" جواب ملا، اپنی کٹیا میں موجود ہیں۔

وہ دونوں وہاں چلے گئے۔ اندر دو تین عورتیں کٹیا کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ ایک ایک کرکے اندر جارہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں ان کا نمبر آگیا۔ وہ اس بوڑھے کے سامنے بیٹھ گئے تو وہ بولا۔ "کیسے آئے، کیا کام ہے؟"

اجمل نے کہا۔ "مہاراج میں پہلے بھی آپ کے پاس آچکا ہوں۔ اب کے اپنے دوست کے کام سے آیا ہوں، یہ خود اپنی کہانی سنائے گا۔"

اور مکرم نے کم سے کم الفاظ میں اپنی کہانی بیان کردی۔ پوری کہانی سننے کے بعد ایک لمبی ہوں کی اور بولے۔ "صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک جن ہے جو اس عورت پر قابض ہے مگر چنتا کی کوئی بات نہیں بھگادیں گے۔ پرنتو عورت کو یہاں لانا ہوگا۔" وہ بولا۔

"اور اگر وہ آنے پر راضی نہ ہوئی تو پھر کیا کریں؟" مکرم نے پوچھا۔

"آئے گی تو نہیں لگتا ایسا ہی ہے۔" گوکل کارتک نے کہا۔ "تو پھر گاڑی کا بندوبست کرو، ہم خود چلتے ہیں۔"

"آپ کب چلیں گے۔" اجمل نے پوچھا۔

"کل صبح جائیں گے، شام کو آئیں گے....."

مکرم حیرت سے بولا۔ "اتنی دیر میں کام ہوجائے گا، مہاراج۔"

"تو ہمیں جانتا نہیں بچہ۔ جانتا تو یہ بات نہ کرتا۔ ہم کارتیکا دیوتا کے پجاری ہیں۔ وہ کارتیکا جو گنیش جی کا بھائی ہے اور جنگ کا دیوتا کہلاتا ہے۔ ہم کسی سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ ایک بات کا خیال رکھنا ہوگا بچہ....." کارتک مہاراج نے کہا۔

"حکم کرو مہاراج۔" اجمل نے پوچھا۔

"ہم کارتک لوگ عورتوں سے دور رہتے ہیں۔ گھر میں زیادہ عورتیں ہوں تو ان کو الگ کرنا ہوگا۔ ہم صرف

مریض سے بات کریں گے۔"

"مگر آپ کے پاس تو عورتیں آتی ہیں۔" مکرم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"یہ ضرورت مند ہوتی ہیں۔ ان کو واپس کرنا گھور پاپ ہے۔ تو نہیں جانتا کارتیکا دیوتا بہت غصہ ور دیوتا ہے، وہ کمار بن میں رہتا ہے۔ اگر کوئی بھولی بھٹکی ہوئی اپسرا بھی اس طرف جانکلتی ہے تو وہ طیش میں آجاتا ہے اور اسے کسی نباتات میں منقلب کردیتا ہے، کوئی آم کا درخت بن جاتی ہے، کوئی نیم کا، اسی لئے پورے بھارت میں کارتیکا کی پوجا کے لئے جو خاص مقامات ہیں، وہاں پر صرف پرش جاتے ہیں، عورتوں کا داخلہ ممنوع ہے۔"

"ٹھیک ہے مہاراج ہم سویرے گاڑی لے کر آجائیں گے۔"

پورے پچاس روپے میں گاڑی ہوئی اور تینوں فرخ آباد روانہ ہوگئے۔ دس بجے یہ گھر پہنچ گئے۔ پہلے مکرم گھر میں گیا اور اماں کو پڑوس میں بھیج دیا۔ اور پھر اجمل اور مہاراج کارتک گھر میں آئے۔ مہاراج نے آتے ہی چاروں طرف دیکھنا شروع کردیا۔ اس نے ساجدہ کے کمرے کے علاوہ پورا گھر گھوم پھر کر دیکھ لیا اور بولا۔ "خالی ہے، کچھ نہیں ہے۔ مریض دکھا تو پتہ چلے۔"

اجمل کمرے سے باہر رک گیا اور پنڈت مکرم کے ساتھ کمرے کے اندر چلا گیا۔ کمرے میں جاتے ہی مہاراج کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ پڑا کہ آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ وہ ذرا سا گھبرائے مگر پھر قدم جما کر کھڑے ہوگئے بولے۔ "دیکھ بھال کے ہم ملاقات کو آئے ہیں اور تو مارتا ہے۔ کچھ تو خیال کر۔"

ساجدہ کے منہ سے ایک مردانہ آواز آئی۔ "سب جانتا ہوں تجھے اور تیری ملاقات کو۔ تو نے خوب ڈھنگ بنایا ہوا ہے، روٹی کمانے کا۔ اپنی خیر چاہتا ہے تو چلا جا اور پھر کبھی نہ آنا اس طرف، ورنہ الٹا لٹکا دوں گا کسی درخت پر۔"

"میری بات تو سن، میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" کارتک بولا۔

"زیادہ مت بن، تیری بات میں سمجھ گیا ہوں۔ چلا جا اسی میں تیری سلامتی ہے، فریب کرے گا تو نقصان ہوگا۔" کارتک فوراً پلٹ کر دروازے سے نکل گیا۔ اب اکیلا مکرم کمرے میں تھا۔ وہ واپس پلٹا تو آواز آئی۔ "اور تو بھی ہوش کر۔ تجھے اس لئے چھوڑا ہوا ہے کہ تو بے ضرر ہے۔ اگر پرنکالنے کی کوشش کرے گا تو سارے پر نوچ کر کبوتر کا بچہ بنادوں گا، جا بھاگ جا....."

مکرم جلدی سے کمرے سے باہر آگیا اور دروازہ بند ہوگیا۔ اجمل نے دونوں کو حیرت سے دیکھا اور بولا۔ "ارے کیا ہوا مہاراج، اتنی جلدی کام ہوگیا کیا؟"

"ارے تجھے کام کی پڑی ہے، اپنی تو جان پر بن گئی۔ گاڑی کا بندوبست کرو، ہم واپس جائیں گے۔"

مکرم نے آگے بڑھ کر کہا۔ "مہاراج کچھ تو کرو، وہ تمہارا کارتیکا دیوتا کس کام آئے گا، کچھ اس سے کام لو۔"

"ارے تو کیا کارتیکا میری جیب میں رکھا ہے کہ نکال کے لگادوں کام میں۔ اس کو منانا پڑتا ہے، بتانا پڑتا ہے، پھر بھی اس کی مرضی ہے کہ آئے نہ آئے۔" مہاراج نے کہا۔

"واہ مہاراج واہ! تم نے پورے پچاس روپے خرچ کروادیئے اور کام کچھ ہوا نہیں۔ اب پھر پچاس کیوں خرچ کریں۔" اجمل نے جواب دیا۔

"ارے بچہ میں جاکر کچھ جاپ کارتیکا کے لئے کروں گا۔ تمہارا کام ذرا کٹھن ہے، ہوگا تو مگر دیوتا کو راضی کرنا ہوگا۔ اس میں ذرا وقت لگے گا۔" مہاراج بولے۔

"تو پھر کیوں آگئے تھے ہمارے ساتھ۔" مکرم نے کہا۔

"دیکھنا بھی تو ضروری تھا۔ اب آکے اندازہ ہوا کہ پانی کتنا گہرا ہے۔" کارتک بولا۔

"پانی اتنا گہرا ہے کہ تم ڈوب جاؤ گے۔ اب تم واپس خود چلے جاؤ۔ ہمارے پاس کرایہ نہیں ہے۔" مکرم نے جواب دیا۔

"چلے جاتے ہیں بچہ پرنتو تم نے ہمارے ساتھ اچھا

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

سلوک نہیں کیا ہے۔" اور کارتک مہاراج منہ پر ایک تھپڑ کھا کر چلے گئے۔ اور مکرم بھی اجمل کے ساتھ گھر سے باہر آ گیا اور بولا۔

"یار حیرت ہے ساجدہ کے منہ سے مردانہ اور بڑی رعب دار آواز آرہی تھی اور کارتک کو تو اندر جاتے ہی بہت زوردار تھپڑ بھی پڑا تھا۔ اس تھپڑ نے اس کی ساری ہیکڑی نکال دی اور وہ بلی کے بچے کی طرح میاؤں میاؤں کرنے لگا تھا۔ یہ تو کچھ بہت ہی خطرناک جن معلوم ہوتا ہے۔"

"اور تجھے اس نے کچھ نہیں کہا۔" اجمل نے پوچھا۔

"ہاں کہا۔ بولا تو بے ضرر ہے، اس لئے چھوڑ دیا ہے۔ زیادہ پر نکالے گا تو پر کاٹ دوں گا۔" مکرم نے جواب دیا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ وہ ہماری کارروائیوں کو جانتا ہے۔ پھر تو میری بھی خیر نہیں۔" اجمل نے ڈر کر کہا۔

"ابے تو کیوں ڈرتا ہے، معاملہ تو میرا ہے۔" مکرم نے کہا۔

"تیری مدد کرنے میں، میں بھی مارا جاؤں گا۔ تجھے تو پتہ ہے کہ میرے سر پر تو کوئی ہاتھ رکھنے والا بڑا بھی نہیں ہے۔ اس لئے بھیا تم اس معاملے میں میرے پاس نہ آنا۔ معاف کرنا یار میں مجبور ہوں۔" اور اجمل فوراً اپنے گھر چلا گیا۔ مکرم کو بہت رنج ہوا۔ بڑا دوستی کا دم بھرتا تھا۔ ذرا برا وقت آیا کہ ساتھ چھوڑ گیا۔

دنیا اسی کا نام ہے۔ بنی کے سب ساتھی ہوتے ہیں، بنی بگڑتی ہے تو کوئی ساتھ نہیں دیتا۔

اماں عورت ذات اگر کوئی راز کی بات عورت کو پتہ چل جائے تو وہ اس کے پیٹ میں کہاں رکتی ہے۔ جب تک وہ کسی کے کان میں اس کو قے نہ کردے وہ بے چین رہتی ہے۔ "شبراتی کی اماں میں تم سے ایک بات پوچھوں، کسی کو بتاؤ گی تو نہیں۔" مکرم کی ماں نے اپنی پڑوسن شبراتی کی اماں سے کہا۔

"اے لو! میں نے کبھی کسی کو کچھ بتایا ہے کہ اب بتاؤں گی۔" شبراتی کی اماں ناک پر انگلی رکھ کر بولیں۔

"دیکھ بات ذرا پردے کی ہے۔ میں تجھ پر بھروسہ کر کے مشورہ کر رہی ہوں۔" مکرم کی ماں نے کہا۔

"ارے تو بے فکر ہو کر بول، یہ دل سمندر ہے جو بات گئی، ڈوب گئی۔" شبراتی کی اماں سینے پر انگلی رکھ کر بولیں۔

"بات یہ ہے کہ مکرم رات کو دلہن کے پاس نہیں سوتا، چھت پر چلا جاتا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ساجدہ کی باتیں کرنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ میں نے پوری پوری رات چوکیداری کی ہے۔ اس کے کمرے سے کوئی آتے جاتے میں نے نہیں دیکھا۔ ساجدہ روز شام کو خوب بناؤ سنگھار کرتی ہے۔ مگر کھاتی کچھ نہیں اور بہت خوش نظر آتی ہے۔ میں تو دیکھ دیکھ کر اور سوچ سوچ کر بے حال ہوگئی ہوں۔" مکرم کی اماں نے ایک ہی سانس میں اپنا پیٹ ہلکا کر لیا اور سکون کی سانس لی۔

"ہائے ہائے یہ تو تو نے نئی بات بتا دی۔ میں تو جانوں یہ کچھ اوپر کا چکر لگتا ہے۔"

"اری صاف بات کر، اوپر نیچے کا کیا چکر ہے۔" مکرم کی ماں الجھ کر بولیں۔

"ارے بے وقوف یہ کوئی سایہ ہے جو اس کے پاس آتا ہے، وہ باتیں کرتی ہے، تم کو نظر نہیں آتا۔ اس سے باتیں کرتا ہے اور اسی کے ڈر سے مکرم چھت پر بھاگ جاتا ہے۔ میری مانو تو کسی سیانے کو دکھاؤ، یہ بڑی خطرے والی بات نظر آوے ہے۔" شبراتی کی اماں نے مشورہ دیا۔

"تیری نظر میں کوئی ایسا سیانا ہے، میں کسی کو جانے نہیں ہوں۔" مکرم کی اماں بولیں۔

"سنا ہے کہ امام باڑے والی گلی میں کوئی رہتا ہے۔" شبراتی کی اماں بولیں۔

"تو پھر چل میرے ساتھ۔" مکرم کی اماں نے کہا۔

"آج تو مشکل ہے، کل سویرے میں چلوں گی۔" شبراتی کی اماں نے جواب دیا۔

دوسرے دن دونوں خاموشی سے نکل گئیں۔ پوچھتے پوچھتے پتہ چل گیا کہ بابا سرمے والے یہ کام کرتے ہیں۔ وہ ایک سرمے کی سلائی مریض کی آنکھوں میں

لگاتے ہیں اور مریض بولنا شروع ہو جاتا ہے۔ جن بھوت پریت کا اتارا کرتے ہیں۔ مکرم کی اماں نے پورا احوال ان کے گوش گزار کر دیا۔

انہوں نے اپنی سرمہ بھری آنکھیں کھول کر کہا۔ "تم فکر نہ کرو، اس لڑکی کو ہمارے پاس لے آؤ، بس اتنا کام تمہارا ہے۔"

"اور اگر وہ نہ آئی تو پھر بابا جی، ہم کیا کریں؟"

"تو پھر ہم خود تمہارے گھر آجائیں گے۔" وہ بولے۔

"مجھے تو جی اس سے ڈر لگتا ہے، میں اس کو نہیں لا سکتی، آپ ہی آجاؤ تو اچھا ہے۔" مکرم کی ماں نے کہا۔

"اس کی ڈبل فیس ہوتی ہے۔" وہ بولے۔

"ڈبل کتنی ہوگی؟" مکرم کی ماں نے پوچھا۔

"صرف ساڑھے دس روپے۔" بابا نے جواب دیا۔

"یہ تو بہت زیادہ ہیں بابا کچھ کم کردو۔" وہ بولیں۔

"اچھا تم ضرورت مند ہو تو پھر تم مجھے سنگل فیس سوا پانچ روپے دے دینا۔" بابا نے کہا۔

جس زمانے کا یہ ذکر ہے، اس زمانے میں یہ بھی بہت تھے مگر مجبوری تھی، وہ راضی ہوگئیں۔ بابا نے کہا۔ "ٹھیک ہے کل کسی وقت تانگہ لے کر آجانا، ہم چلیں گے....."

دوسرے دن ساڑھے گیارہ بجے سرمے والے بابا آگئے۔ گھر میں مکرم نہیں تھا۔ صرف ساجدہ اپنے کمرے میں تھی اور اماں بابا کے ساتھ ہی آئی تھیں۔ اماں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی تو ساجدہ کی آواز آئی۔ "اندر آجاؤ۔"

اماں اندر چلی گئیں اور بولیں۔ "بیٹا ایک سرمے والا آیا ہے۔ بہت بڑھیا سرمہ اس کا ہوتا ہے۔ میں نے سوچا تمہاری آنکھ میں بھی ایک سلائی ڈلوا دوں، فائدہ کرے گا....."

"مجھے سرمے لگانے کا شوق نہیں ہے منع کردو۔" ساجدہ نے کہا۔

"حرج ہی کیا ہے بیٹا۔ اچھی چیز ہے اس لئے کہتی ہوں۔" وہ بولیں۔

"اچھا ٹھیک ہے، بلا لو۔" ساجدہ نے کہا۔

اور بابا سرمے والے کمرے کے اندر آگئے۔ اندر تو آگئے مگر اب واپس جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ کیونکہ دروازے پر ایک بہت بڑا سانپ پھنکاریں مار رہا تھا۔

بابا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہے تھے مگر ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ مکرم کی اماں کی حالت ان سے بھی زیادہ خراب تھی۔ گھر میں کبھی چوہے کا بچہ نظر نہیں آیا اور آج اتنا بڑا سانپ کہاں سے آگیا۔ ساجدہ اطمینان سے بیٹھی تھی۔ دروازہ تیز آواز کے ساتھ بند ہوگیا اور ساجدہ کے منہ سے ایک مردانہ آواز ابھری۔

"سرمہ لگائے گا۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھ، دنیا کو بے وقوف بنا کر روٹی کماتا ہے۔ تیرے اندر کیا ہے، صرف جھوٹ اور فریب۔ تجھے دیکھ کر رحم آتا ہے اور تم بوڑھی عورت ہو، تم کو بہت خیال ہے اپنے بیٹے کا، میں نے اس کو چھوڑ رکھا ہے۔ اس لئے کہ وہ بے ضرر سا آدمی ہے۔ تمہارے بڑھاپے کا میں نے خیال کیا ہے۔ اس کے بدلے میں تم لوگ میرے ہی خلاف کام کر رہے ہو۔ کان کھول کے سن لے بڑھیا کہ یہ میری بیوی ہے۔ میں نے اس سے شادی کی ہے۔ تم نے اس کے خلاف یا میرے بھگانے کو کچھ کیا تو اب کے معاف نہیں کروں گا۔ آخری موقعہ میں دے رہا ہوں۔ تو بڈھے اپنی سرمہ دانی اٹھا اور بھاگ جا اور دیکھ بھال کر سرمہ لگایا کر۔ اب میرے سامنے آیا ہے، دوبارہ نہ آنا۔ ورنہ آنکھیں پھوڑ دوں گا۔ پھر سرمہ کس میں ڈالے گا تو اندھوں کی آنکھ میں سرمہ ڈالتا ہے۔ میں تیری آنکھ پھوڑ دوں گا۔"

شبراتی کی اماں کو تو پسینے لگے ہوئے تھے۔ آگے کا احوال جاننے کو بے چین تھیں۔ دوسرے دن سویرے ہی آگئیں۔ آتے ہی بولیں۔ "ارے بہن کیا ہوا تم نے کچھ بتایا نہیں۔"

مکرم کی اماں کا خوف کے مارے اب تک بدن کانپ رہا تھا۔ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آہستہ سے بولیں۔ "تم گھر جاؤ، میں وہیں آتی ہوں۔"

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

شبراتی کی اماں کو مکرم کی ماں کا چہرہ دیکھ کر کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔ اس لئے کچھ نہ بولیں اور خاموشی سے پلٹ کر گھر آ گئیں اور بے چینی سے مکرم کی اماں کا انتظار کرنے لگیں۔

دوپہر میں مکرم کی اماں آئیں تو وہ بولیں۔ ”اے تم نے کچھ بتایا نہیں، سرمے والے بابا نے کیا کیا؟“

”بہت مشکل ہے، ارے یہ کوئی بہت طاقتور جن لگتا ہے، سرمہ والا تو بھیگی بلی بن گیا، اس کے سامنے۔ لو بتاؤ میرے گھر میں سانپ کہاں سے آ گیا۔ یہ بڑا خوفناک اور پھر خود بخود غائب اور پھر ساجدہ کے منہ سے مردانہ آواز ایسی رعب دار کہ کیا بتاؤں۔ اب میں تو اس کے خلاف کچھ نہیں کروں گی، آخری موقعہ دیا ہے اس نے۔ کہہ دیا ہے کہ اب کچھ کیا تو سزا دوں گا۔“ مکرم کی اماں نے تفصیل بتا دی۔

”یہ تو بہت خطرناک بات ہو گئی۔ تم ایسا کرو، کسی مولوی سیانے سے رابطہ کرو۔ وہ کچھ جھاڑ پھونک دے گا۔ سنا ہے کہ کیل دینے سے بھی مکان میں کوئی بلا داخل نہیں ہوتی۔“ شبراتی کی اماں نے مشورہ دیا۔

”نہیں اب میں کچھ نہیں کروں گی اس نے کہہ دیا ہے کہ سزا دوں گا۔“ مکرم کی اماں ڈرتے ڈرتے بات کر رہی تھیں۔

”ڈروگی تو کام نہیں چلے گا۔ میں کسی حاضرات کرنے والے کو تلاش کرتی ہوں۔“

”کر لے بڑھیا تو بھی حاضرات کرا لے اور کسی سیانے کو تلاش کر لے۔ تیرا بھی حشر خراب کر دوں گا.....“

دونوں نے یہ سن کر دروازے پر دیکھا تو ساجدہ غصے میں کھڑی تھی اور مردانہ آواز میں بات کر رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر دونوں تھر تھر کانپنے لگیں۔ شبراتی کی اماں کے ہاتھ کا سروٹا کب زمین پر گر گیا، ان کو خبر نہ ہوئی۔

دن کا وقت تھا مگر دونوں کا دہشت زدگی کے مارے برا حال تھا۔ زبان پر کانٹے پڑ گئے تھے۔

”تو ہی ہے جو روز نئے نئے طریقے بتاتی ہے، اب تجھے بھی دیکھنا ہوگا۔“ اور ساجدہ پلٹ گئی۔ اس کے جانے کے بعد بھی دونوں کی حالت خراب رہی۔ کافی دیر کے بعد شبراتی کی اماں اپنی جگہ سے اٹھیں۔ گھڑونچی سے ایک گلاس پانی بھرا اور غٹا غٹ پی گئیں۔ پھر ایک گلاس لا کر مکرم کی اماں کو دیا۔ وہ بھی ایک ہی سانس میں پی گئیں۔ ذرا اوسان بحال ہوئے تو مکرم کی اماں نے کہا۔ ”میں اسی لئے ڈرتی تھی۔ ارے اس کو سب پتہ چل جاتا ہے۔ وہ کمرے میں بند رہتی ہے مگر سب طرف دیکھتی ہے۔ ہم بھلا اس کا کیا مقابلہ کریں گے، میری تو توبہ ہے۔“ مکرم کی اماں نے کہا۔

”ہاں بہن تم نے ٹھیک کہا۔ بتاؤ! میں تو تمہاری ہمدردی میں ماری گئی۔ پتہ نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہوگا۔“ شبراتی کی اماں نے کہا۔

”ارے کچھ نہیں ہوگا تم آ کے اس سے معافی مانگ لینا۔ اتنا ظالم مجھے وہ لگتا نہیں ہے۔“ مکرم کی اماں نے حوصلہ دیا۔

”میری تو حالت خراب ہے، اب اس کے سامنے کیسے جاؤں گی؟“ وہ بولیں۔

”نہ جاؤ پھر سزا کو تیار رہو۔“ مکرم کی اماں نے کہا۔

”ہائے میں تو بری پھنس گئی، اب کیا کروں۔“ وہ روہانسی ہو کر بولیں۔

”میں نے جو کہا ہے وہ کرنا ہی پڑے گا۔“ مکرم کی اماں نے کہا۔

”ٹھیک ہے میں شبراتی کے ابا سے مشورہ کروں گی۔“ وہ بولیں۔

”یہ تو تم اور ایک غلطی کرو گی۔ مردوں میں بات پھیل جائے گی، پھر تو وہ نہ معلوم کتنا ناراض ہو جائے۔“ مکرم کی اماں نے فکرمندی سے کہا۔

”اچھا تو پھر ان سے مشورہ نہیں کروں گی۔ میں ذرا ہمت جمع کروں۔ پھر تمہارے گھر آؤں گی۔“

وہ رات بھر ہمت جمع کرتی رہیں اور کوئی ان کی دونوں بکریاں کاٹ کے چلا گیا۔ صبح دیکھا تو ہائے میری بکریاں کہہ کر شبراتی کی اماں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ سب نے تسلی دی۔

شبراتی نے اور اس کے ابا نے یہ کارروائی کسی دشمن

کی قرار دے دی اور پورے محلے نے ان کا ساتھ دیا۔ دوسری رات سب ہوشیار تھے مگر شبراتی کی ساری مرغیاں کٹ گئیں۔ لو جی اب تو سب ہی فکر میں پڑ گئے۔ ایسا کون تھا جو ڈربے میں گھس گیا اور ایک ایک کو کاٹ ڈالا۔

شبراتی کی اماں کے اوسان بگڑے ہوئے تھے۔ نقصان پر نقصان ہو رہا تھا۔ کوئی نہیں سمجھا تھا مگر وہ سمجھ چکی تھیں کہ یہ اسی جن کی کارستانی ہے۔ اب تو انہیں معافی مانگنے کی اور جلدی ہو گئی اور شام کو ہی مکرم کی اماں کے پاس پہنچ گئیں۔

مکرم کی اماں نے دیکھتے ہی کہا۔ ”اب آئی ہو نقصان کروا کر۔“

”ارے بہن کیا کرتی میری حالت خراب تھی، اس ڈر سے نہیں آئی کہ پریشانی میں آدمی کا دماغ تو اپنے ٹھکانے ہوتا نہیں، منہ سے کوئی غلط بات نکل گئی تو اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے.....“

”جاؤ معافی مانگ لو۔ ابھی نہا کر اندر گئی ہے تیاری کر رہی ہے رات کے لئے.....“

”تم بھی بوا ذرا اپنی زبان کو قابو کرو، ہلکی بات زبان پر مت لاؤ۔“ شبراتی کی اماں نے کہا۔

”بس کیا کروں، دل جلتا ہے تو منہ سے دھواں نکل ہی جاتا ہے۔“ مکرم کی اماں بولیں۔

”اچھا میں اندر جاتی ہوں۔“ شبراتی کی اماں نے کہا۔

”دروازے سے پہلے اجازت ضرور لے لینا۔“ مکرم کی اماں بولیں۔

شبراتی کی اماں نے دروازے پر دستک دی تو ساجدہ کی آواز آئی۔ ”کون ہے؟“

شبراتی کی اماں بولیں۔ ”ارے میں ہوں شبراتی کی اماں۔“

”ابھی میں مصروف ہوں، رات کے نو بجے آنا پھر ملوں گی۔“ ساجدہ کی آواز آئی۔

”اچھا ٹھیک ہے، بیٹا پھر آ جاؤں گی۔“ اور وہ واپس گھر آ گئیں۔

مگر ٹھیک نو بجے پھر انہوں نے دروازے پر دستک دی تو ساجدہ نے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

شبراتی کی اماں نے جواب دیا۔ ”میں ہوں تم نے تو بجے بلایا تھا تو آئی ہوں۔“

دروازہ کھل گیا۔ ساجدہ کے بڑے بڑے بال کاندھے پر پڑے تھے۔ دوپٹہ غائب تھا۔ اس کے منہ سے مردانہ آواز برآمد ہوئی۔ ”کیا بات ہے بڑھیا کیوں آئی ہے۔“

”مجھے معاف کر دو، بڑی بھول ہو گئی مجھ سے، اب میں اپنی زبان بند کر لوں گی۔“ وہ بولیں۔

”بکریاں اور مرغیاں مر گئیں۔ اس لئے معافی مانگ رہی ہو۔“ پوچھا گیا۔

”ہاں یہ بات بھی ہے۔ دوسرے مجھے پتہ نہیں تھا۔ عورتیں ایسے ڈھونگ رچاتی رہتی ہیں۔ میں بھی جوانی میں کبھی کبھی کوئی ڈرامہ کرتی تھی، سب ڈر جاتے تھے اور میں خوش ہوتی تھی۔ مگر اب مجھے پتہ چل گیا ہے۔ مجھے معاف کر دو۔“ شبراتی کی اماں نے منت کی۔

”جلدی عقل آ گئی تجھے اب تیرے مردوں کا نمبر تھا۔ اچھا جا اور خاموشی سے رہ کسی سے ساجدہ اور میرے بارے میں ذکر مت کرنا۔ دوسرا کوئی کرے گا تو وہ بھی نقصان اٹھائے گا۔“

شبراتی کی اماں نے شکریہ ادا کیا اور جلدی سے کمرے سے نکل آئیں۔ ان کے چہرے پر خوشی کے آثار دیکھے تو مکرم کی اماں نے اشارے سے پوچھا۔ سب ٹھیک ہے اشارے سے ہی جواب ملا۔ ہاں سب ٹھیک ہے۔ اب میں گھر جا رہی ہوں۔

عورت ذات بھی عجیب چیز ہے۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ عورت کو سمجھنا ناممکن ہے۔ یہ پل میں تولہ تو دوسرے پل سیر ہو جاتی ہے۔ یہ اپنی دوسری عورت سے بھی خلوص نہیں رکھتی۔ ایک عورت، دوسری عورت کے سامنے اگر ذرا بھی پر اسرار بن جائے تو دوسری عورت کا سکون ختم ہو جاتا ہے۔ وہ عورت کے اسرار جاننے کے لئے بے چین ہو جاتی ہے۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

اس کا کھانا پینا، سونا سب حرام ہو جاتا ہے۔ ہر وقت بے چینی اس پر سوار رہتی ہے اور جب تک وہ سب کچھ جان نہیں لیتی۔ بے چین ہی رہتی ہے۔ یہاں پر ہی بات ختم نہیں ہوتی۔ جاننے کے بعد اس کے پیٹ میں مروڑ ہو جاتی ہے اور پھر وہ جب تک سارے اسرار کی قے کسی کے سامنے نہ کرے، مروڑ ہوتی رہتی ہے۔

مکرم کی اماں کو زندگی نے ایک سخت سبق پڑھا دیا تھا۔ مگر وہ کیا کرتیں، اپنی عورت پن سے مجبور تھیں۔ شبراتی کی اماں نے تو ڈر کے مارے آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ ان کے پیٹ میں بھی بڑی سخت مروڑ اٹھتی تھی مگر مرغیوں کے خالی ڈربے اور خالی کھونٹوں کو دیکھ کر ڈر جاتی تھیں۔ کئی دفعہ بات زبان پر آتے آتے رہ جاتی تھی۔ شہر سے باہر گاؤں میں مکرم کی اماں کی ایک بچپن کی سہیلی رہتی تھی۔ ایک دن وہ اس کے پاس چلی گئیں۔ شاکرہ نے پوچھا۔ "آج تم کیسے بھول پڑیں۔ بغیر بتائے خیریت تو ہے نا۔"

"ارے کیا خیریت، بڑے جنجال میں پڑی ہوں۔" وہ بولیں۔

"کچھ بتاؤ تو کیا بات ہے؟" شاکرہ نے پوچھا۔

"تم کو پتہ ہے کہ مکرم کی شادی کی تھی۔ ایک تو یہ دھوکا ہوا کہ لڑکی چھوٹی دکھائی اور بھیڑ دی بڑی۔ چلو ہم نے اس پر بھی صبر کر لیا۔ مگر وہ جس دن سے آئی ہے نئی مصیبت آ گئی ہے۔" مکرم کی اماں نے کہا۔

"اچھا آگے بتاؤ۔" شاکرہ بولی۔

مکرم کی اماں نے چاروں طرف دیکھا اور آہستہ سے ڈرتے ڈرتے کہنے لگیں..... "اس پر ایک جن کا سایہ ہے۔ ارے سایہ کیا ہے وہ اس کی بیوی ہے۔ وہ رات کو آتا ہے۔ اس کے پاس سوتا ہے۔ میں نے خود دونوں کو باتیں کرتے سنا ہے۔"

"ارے یہ لڑکیاں فراڈ کرتی ہیں۔ مکرم سے اس کا دل نہیں ملا ہوگا، اس لئے جان چھڑانے کو وہ کرتی ہوگی۔" شاکرہ نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"نہیں شاکرہ واقعی جن ہے۔ اس نے مجھ سے بھی بات کی ہے اور دھمکی دی ہے کہ کسی کو بتایا تو سزا دوں گا۔"

"اور تم نے مجھے بتا بھی دیا۔" شاکرہ نے کہا۔

"ہاں تو تو دور کی ہے، اس لئے بتا رہی ہوں۔ تجھ سے پہلے شبراتی کی اماں پڑوس میں رہتی ہے۔ اس کو بتایا تھا وہ مجھے ایک سیانے کے پاس بھی لے کر گئی تھی۔ وہ سیانا بھی بھاگ کھڑا ہوا اور اس کی مرغیاں اور بکریاں بھی مر گئیں۔ اس نے معافی مانگ کر اپنی جان چھڑائی، بہت خطرناک ہے۔" وہ بولیں۔

"اب تم نے مجھے بتا دیا ہے۔ میرا بھی کیا وہ وہی حشر کرے گا۔" شاکرہ نے ڈر کر پوچھا۔

"پتہ نہیں مگر تو تو بہت دور ہے اس کو کیا پتہ چلے گا......" مکرم کی اماں بولیں۔

"اگر وہ واقعی جن ہے تو پتہ چلانا اس کے لئے کون سا مشکل کام ہے۔" شاکرہ بولی۔

"پتہ ہی تو چلا ہے تو نے کون سا اس کے خلاف کچھ کیا ہے۔" مکرم کی اماں نے تسلی دی۔

"ارے یہ بات راز کی تھی تم نے اس کا راز مجھے بتا دیا۔ یہ بات بھی تو ہے۔" شاکرہ بولی۔

"ہاں یہ غلطی تو ہو ہی گئی مجھ سے۔" مکرم کی اماں نے قبول کیا۔

"اچھا اب تم جلدی گھر واپس چلی جاؤ۔ دیر کرو گی تو شاید وہ تم پر شک کرے۔" شاکرہ نے کہا۔

"اری سن تو ذرا دھیان رکھنا۔ کوئی ایسا آدمی جو یہ کام کر سکتا ہو بتانا۔" مکرم کی اماں بولیں۔

"میں کچھ نہیں کروں گی۔ میرے پاس تو میری دولت جانور ہی ہیں۔ مر گئے تو میں کیا کروں گی۔ اب تم جاؤ۔"

دوسرے دن ساجدہ نے مکرم کی اماں سے کہا۔

"تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی ہو۔ تم میرے شوہر کے خلاف جا کر باتیں کرتی ہو۔ ارے یہ اس کی مہربانی ہے کہ تم اور تمہارا بیٹا اس گھر میں موجود ہو۔ یہ بھی میری سفارش پر ہے۔ وہ اگر چاہے تو تم کو ریل کی پٹری پر باندھ

کر ڈال آئے اور تم دونوں ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤ۔ اب تم اکیلی اس گھر میں رہو۔ میں نے اپنا انتظام کر لیا ہے۔ مکرم میرے ساتھ جائے گا۔ آخر مجھے کسی ملازم کی بھی ضرورت ہے۔ دوسرے مجھے اس کی آڑ بھی چاہئے۔ میرا شوہر تو وہ نہیں مگر نوکر تو ہے۔ گھر کا سودا سلف لانے والا۔

تم اسی گھر میں رہو اور اپنی زبان بند رکھو۔ اگر زبان کھولی تو سب سے پہلے مکرم کی جان جائے گی۔ اس کے بعد تمہارا کچھ ہوگا۔" اور پھر مکرم اپنی بیوی کو لے کر نہر والے بنگلے میں چلا گیا۔ یہ بنگلہ شہر کی نکال پر نہر کے کنارے بنا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کو کسی انگریز کرنل نے بنوایا تھا مگر زیادہ نہ رہ سکا۔ اس کو اس کے بیرے نے قتل کر دیا تھا۔ بیرے کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کرنل کی بیوی کا منہ چڑھا تھا۔ کرنل کے قتل کے بعد کرنل کی روح رات بارہ بجے کے بعد چائے ڈبل روٹی مانگتی پھرتی تھی اور یہ بنگلہ ویران ہو گیا تھا۔ مکرم نے ساجدہ کے حکم پر اس بنگلے کی صفائی کروالی اور رہنے کے قابل بنا لیا اور دونوں یہاں آ گئے۔ مکرم نے بھی چائے ڈبل روٹی کی آوازیں سنی تھیں۔ ڈر بھی لگا تھا۔ مگر اس کے کمرے میں کرنل کی روح نہیں آئی، باہر سے آوازیں دیتی گزر گئی۔

دنیا کی نظر میں مکرم ساجدہ کا شوہر تھا اور جب سے اس بنگلے میں آیا تھا۔ لوگ اس کو بہت بہادر سمجھنے لگے تھے مگر وہ نہ بہادر تھا نہ ساجدہ کا شوہر۔ وہ اندر ہی اندر کڑھتا رہتا، پلان بناتا رہتا۔ اس کے اندر آگ سی جلتی رہتی۔ لاوا ابلتا رہتا مگر جب خود پر نظر پڑتی تو وہ رو پڑتا۔ "میں کتنا مجبور ہوں، میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں بے غیرتی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ اس لئے کہ میں کمزور ہوں۔"

آخر وہ انسان تھا۔ روز اپنی بیوی کو بناؤ سنگھار کرتے دیکھتا تھا۔ اس کی آنکھیں روز دیکھتی تھیں اور دل حسرتوں کا شکار بن جاتا تھا۔ اس کی ذات کے لئے جلنا اور کڑھنا رہ گیا تھا۔ وہ روز اپنے جذبات کی قبر کھودتا اور ان کو اس میں دفن کر دیتا۔ مگر کب تک وہ یہ کرتا۔ انسان نادانی کرتا ہے کبھی جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر کبھی حالات اس سے نادانی کراتے ہیں۔ وقت اور حالات گھٹن محرومیاں اور اندر ہی اندر پکنے والا آتش گیر مادہ اس سے نادانی کرواتا ہے اور وہ پھر جو کرتا ہے۔ پھر اچھے برے نتائج کی اس کو فکر نہیں ہوتی۔ بس حالت جنوں میں وہ کر گزرتا ہے۔ مکرم علی اسی حالت جنوں میں صبح ہی صبح سودا سلف خریدنے کے بہانے نکل گیا اور کالے حافظ جی کے پاس چلا گیا اور ان سے اپنی پوری کہانی بیان کر دی۔

کالے حافظ جی نے کہا۔ "میاں تم واقعی ایک مصیبت میں گرفتار ہو مگر میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ وجہ یہ ہے کہ میں نے زندگی میں کبھی یہ کام نہیں کیا۔ تم ایسا کرو، گورے گاؤں چلے جاؤ۔ وہاں پر میاں شرف الدین ہوتے ہیں۔ وہ یہ کام کرتے ہیں۔ شاید تمہارا کام ہو جائے۔" اور مکرم علی وہاں کے لئے روانہ ہو گیا۔ میاں شرف الدین کو بھی اس نے پوری کہانی بیان کر دی۔

شرف الدین سن کر بولے۔ "بھائی میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ کوشش کروں گا، وعدہ نہیں کرتا، کیونکہ مجھے یہ معاملہ ذرا ٹیڑھا نظر آ رہا ہے۔"

"آپ کوشش تو کریں۔" مکرم نے کہا۔

اور وہ میاں شریف الدین کو لے کر فرخ آباد آ گیا۔ شام ہو گئی تھی۔ اس نے میاں جی کو اپنے کمرے میں ٹھہرا لیا تھا۔ میاں جی نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ مکرم علی بھی کمرے میں موجود تھا۔ رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔ دروازہ بند تھا۔ مکرم اور میاں جی دونوں اندر تھے۔ دروازہ دھڑام کر کے کھلا اور ساجدہ دندناتی اندر آ گئی اور بولی۔ "کیوں اپنی زندگی کے پیچھے پڑا ہے بڈھے۔ یہ تو زا گدھا ہے، اس کی باتوں میں آ گیا ہے۔ چل اٹھ اور بھاگ جا۔ میں بلاوجہ کسی پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔" مگر میاں شرف الدین اپنی جگہ جمے بیٹھے رہے تو وہ پھر بولی۔ "تو جو پڑھ رہا ہے وہ میں بھی پڑھ سکتا ہوں۔" اور اس نے میاں جی کو ایک ہاتھ میں اٹھا لیا اور سر سے اوپر کر کے زمین پر دے مارا۔ زمین پر گرتے ہی ان کے سر سے خون جاری ہو گیا۔

ساجدہ نے پھر ان کو اٹھا لیا اور دیوار پر دے مارا۔ اب میاں جی کے سارے ہاتھ پیر ٹوٹ گئے اور وہ آخری ہچکی لے

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com

کرساکت ہو گئے۔ پھر ساجدہ مکرم کی طرف مڑی اور بولی۔

"میں اچھوں کے ساتھ برا نہیں ہوں، اس بوڑھے کی جان تیری وجہ سے گئی ہے۔ تجھے زندہ رکھنا میری مجبوری ہے۔ ورنہ تو اس لائق نہیں ہے۔ اب کے اگر تو نے کوئی حرکت کی تو ہاتھ پیر توڑ کر چوراہے پر بٹھادوں گا۔ بھیک مانگتے رہنا۔" اور ساجدہ چلی گئی۔ کمرے میں میاں جی کی لاش پڑی تھی۔ مگر مکرم کو سخت نیند آرہی تھی اور پھر وہ فرش پر ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ فرش صاف تھا۔ لاش تو کیا کسی قسم کے آثار نہیں تھے۔ مکرم بڑا حیران ہوا۔ یااللہ یہ کیا میرا خواب تھا۔ میرے سامنے یہ واقعہ ہوا میں سو گیا اور لاش اور سب نشانات ختم ہو گئے۔

شام کو اس کو کسی نے بازار میں بتایا کہ گورے گاؤں کے میاں شرف الدین کو کسی نے ان کے گھر میں قتل کر دیا ہے اور ان کا قتل کسی بھی ہتھیار سے نہیں ہوا ہے۔ ان کو زمین پر اور دیوار سے ٹکرا کر مارا گیا ہے۔ ایک روز پہلے ان کے پاس ایک آدمی آیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ گئے بھی تھے۔ مگر واپس کب آئے، کسی کو پتہ نہیں ہے، پورا شبہ اُسی آدمی پر ہے۔ وہ گھبرا کر فوراً بنگلے پر آگیا۔ ساجدہ نے اپنی آواز میں کہا۔

"ذرا بھی گڑبڑ کرو گے تو تمہارا نام پولیس کو بتادیا جائے گا......"

اب تو یہاں مکرم کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔ ایک طرف جیل کی کوٹھری اور ایک طرف اذیت ناک زندگی جہاں روز مرنا اور روز جینا پڑتا ہے۔ مگر زندگی بہت پیاری چیز ہے۔ حالات لگام کھینچ کر طیش دلاتے ہیں اور بات انسان کے بس سے باہر ہو جاتی ہے اور وہ حالت جنوں میں وہ کر گزرتا ہے جو اس کے بس سے باہر ہوتا ہے اور نقصان اپنا ہی کرتا ہے۔ اشتعال اور بارود میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ دونوں میں دھماکے ہوتے ہیں۔ دونوں تباہی پھیلاتے ہیں۔ دونوں ہی نقصان پہنچاتے ہیں۔

مجبوری انسان سے وہ کراتی ہے جو انسان کرنا نہیں چاہتا۔ مکرم پھر ساجدہ کی غلامی کرنے لگا۔ روز اپنے جذبات کی قبر بناتا رہا۔ قبریں بڑھتی گئیں اور مکرم ایک ویران قبرستان بنتا گیا اور پھر اس کو قبرستان اچھا لگنے لگا۔ شہر کے آخری سرے پر پرانا قبرستان تھا۔ وہ اس میں جانے لگا۔ آج بھی وہ بے وجہ قبرستان کا چکر لگا کر سڑک پر آیا ہی تھا کہ اس کو ایک شخص نظر آیا۔ اس کے جسم پر صرف ایک دھوتی تھی۔ سینے پر بڑے بڑے سیاہ بالوں کا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ سر گُٹھا ہوا تھا۔ کشادہ پیشانی پر صندل اور سندور کی آڑی ترچھی اور بل کھاتی لکیریں نظر آرہی تھیں۔ گلے میں موٹے دانوں کی مالائیں پڑی تھیں اور کچھ خشک پھولوں کے ہار گلے میں جھول رہے تھے۔ وہ اچھا بھاری بھرکم شخص تھا۔ وہ اچانک مکرم کے سامنے آگیا اور بولا۔ "یہاں کیا ملے گا، بار بار آتا ہے۔"

"مجھے پتہ ہے مردے کسی کو کیا دیں گے۔" مکرم نے جواب دیا۔

"پھر کیوں وقت برباد کرتا ہے۔ مجھے بتا جو تیرے من میں ہے، کھل کر بتادے۔ مجھ سے پردہ مت کر، شاید تیری قسمت کا لکھا پورا نہ ہو۔" بیراگی نے کہا۔

"میری قسمت میں کیا لکھا ہے؟" مکرم نے پوچھا۔

"ایسے سوال مت کر، جس کے جواب دیئے نہ جائیں۔ میں تیرے چہرے پر گھٹاؤں کے بادل دیکھ رہا ہوں، دین دھرم سب بعد کی باتیں ہیں تو ایک انسان ہے۔ میری طرح شاید میں تیری کچھ مدد کر سکوں۔ بتادے۔" بیراگی نے کہا۔

"کیا بتاؤں، بتاؤں گا تو مارا جاؤں گا، نہ بتاؤں تو بھی زندگی کے آثار نہیں ہیں۔ میرے چاروں طرف اندھیرا ہے۔ موت ہے، ذلت ہے، میں کیسے بتاؤں۔" مکرم نے رو کر کہا۔

"جب ہر طرف موت کا اندھیرا ہے تو پھر اس طرف چل، جدھر کچھ زندگی کے آثار نظر آئیں۔ میں تیرے ساتھ ہوں، میں تیرے ساتھ موت کی طرف جاؤں گا۔ میری زندگی بھی اسی مقام پر ہے کہ جہاں میرا مرنا جینا برابر ہے۔ کوئی میرے لئے رونے والا نہیں، دنیا کے کوئی کام میرے

نہ ہونے سے بند نہیں ہوں گے۔" بیراگی بولا۔

اور مکرم نے پوری کہانی بیراگی کو سنادی۔ بیراگی نے پوری بات سکون سے سنی اور پھر بولا۔ "زندگی بہت پیاری چیز ہے۔ اس کی اہمیت یوں اور بڑھ جاتی ہے کہ یہ صرف ایک بار ملتی ہے۔ موت کا تصور ہی بڑا اذیت ناک ہوتا ہے۔ مگر کچھ لوگ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی زندگی کسی کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ اب تو گھر جا، میں دیکھ رہا ہوں، کچھ نگاہیں اٹھ رہی ہیں۔ میں آؤں گا تیرے پاس۔" اور بیراگی قبرستان کے اندر چلا گیا۔

تین دن گزر گئے بیراگی بابا نہیں آیا تو وہ پھر قبرستان کی طرف چلا گیا۔ بیراگی ایک پرانی قبر پر خاموش بیٹھا تھا۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا خاموش۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر بیراگی نے اس کی طرف دیکھا، مسکرایا اور بولا۔

"بہت بے چینی ہے۔" مکرم خاموش رہا تو وہ پھر بولا۔

"تیاری کرنا ہوتی ہے۔ وزن کرنا پڑتا ہے۔ حساب کتاب کی ذرا سی غلطی پچھتاوے کو جنم دیتی ہے۔"

"میں کچھ اور بتانا چاہتا تھا۔" مکرم نے کہا۔ "دو سیانے اس سے ڈر کر بھاگ گئے۔ ایک میرے سامنے مارا گیا۔ وہ سب جانتا ہے، وہ اس کا توڑ کر لیتا ہے۔ جس بنگلے میں رہتا ہے، وہاں پر ایک انگریز کرنل کی روح رہتی ہے۔ اس کی آواز میں نے بھی سنی ہے مگر وہ روح اس کے قریب نہیں جاتی۔ میں وہاں رہتا ہوں۔ میرے قریب بھی اس کے ڈر سے نہیں آتی۔ اندھیرے میں آپ کا کچھ نقصان نہ ہو، میں یہ چاہتا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں، وہ لادین نہیں ہے۔ طاقت بھی رکھتا ہے۔ مگر بھٹکا ہوا ہے۔ اگر دھرم پر ہوتا تو وہ یہ حرکت نہ کرتا۔ دنیا کا ہر مذہب طاقت ور ہوتا ہے۔ ہر مذہب عبادت کی تلقین کرتا ہے اور ارتکاز سے انسان کی خفیہ و پوشیدہ قوتوں کو جلا ملتی ہے۔ انسان بہت طاقتور ہے۔ انسانی طاقت کے مظاہرے جو غیر انسانی نظر آتے ہیں، وہ غیر انسانی نہیں ہوتے۔ وہ طاقت جسے ماورائی طاقت کہتے ہیں۔ ہر انسان کے اندر قدرتی طور پر ہوتی ہے۔

بس طاقت کو جگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے نفس کشی لازمی ہے۔ اپنے نفس کو خود آزمائش میں ڈالنا پڑتا ہے اور پھر اس آزمائش پر پورا اترنا پڑتا ہے۔ اس طرح انسان کی پوشیدہ طاقتیں ابھر کر سامنے آتی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ عبادت کے ارتکاز سے ان طاقتوں کو جلا بخشی جاتی ہے۔ تب جا کے انسان اس قابل ہوتا ہے کہ کسی ہوائی مخلوق کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو سکے۔ دوسری بات اور میری یاد رکھنا، کسی کی ظاہری حالت پر کبھی نہ جانا، پاگل نظر آنے والا پاگل نہیں ہوتا۔ وہ بڑے بڑے کو پاگل کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ کسی دیوانے سودائی کو پتھر نہ مارنا کہ وہ پتھر پلٹ کر تیری نکسیر پھوڑ سکتا ہے۔ اب تو جا بے فکر ہو جا میں خود آؤں گا۔"

اور مکرم واپس چلا آیا۔ دو دن گزر گئے۔ رات کو ساجدہ نے مکرم کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ "میں جا رہا ہوں، تو اپنے گھر جا۔" اور اسی رات ساجدہ وہاں سے چلی گئی۔

سویرے بیراگی بابا آگئے۔ آتے ہی بولے۔

"بھاگ گیا۔ جائے گا کہاں؟" پھر مکرم سے بولے۔

"تو گھر جا، تیری ماں تیرا انتظار کر رہی ہے۔" اور مکرم گھر چلا گیا۔

بیراگی پھر قبرستان میں اسی قبر پر آگئے۔ "بتا تو وہ کہاں بھاگا ہے؟" انہوں نے کسی سے پوچھا۔ ان کے نزدیک کوئی نہیں تھا۔ کچھ دیر سنتے رہے، پھر بولے۔

"دھند کے پار نظر نہیں آیا۔ خیر کوئی بات نہیں، میں پتہ کرتا ہوں۔" اور وہ اٹھ کر ایک بہت پرانے برگد کے درخت کے نیچے چلے گئے۔ یہاں پر بھی قدیم قبریں بنی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر وہ ایک قبر کے کنارے کھڑے رہے اور پھر قبرستان سے باہر نکل گئے۔

اب ان کا رخ جھانسی روڈ کی طرف تھا۔ ان کی چال عجیب تھی۔ زمین پر چلتے تو وہ نظر نہیں آتے تھے اور حیرت انگیز طور پر وہ کچھ ہی دیر میں جھانسی شہر میں داخل ہو رہے

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com

تھے۔ اتنا زیادہ فاصلہ اتنی جلدی اور بغیر کسی سواری کے انہوں نے طے کرلیا۔ یہاں پر بھی رکے نہیں۔

اب ان کا رخ جھانسی کے قلعہ کی طرف تھا۔ اب شام ہورہی تھی۔ قلعہ کے دروازے بند تھے۔ مگر بند دروازے ان کو روک نہ سکے اور وہ اندر آگئے۔ قلعہ کے اندر آکر انہوں نے کہا۔

"معاف کرنا دوستو! ضرورت سے آیا ہوں۔ زیادہ نہیں رکوں گا۔" اور وہ سرنگ کی طرف چلے۔ مگر سرنگ کے اندر جانے سے پہلے ہی پلٹ گئے۔ بولے۔ "بھاگ لے، کتنا بھاگے گا۔"

اور وہ قلعہ سے باہر آگئے۔ اب ان کا رخ جھانسی کے قدیم قبرستان کی طرف تھا۔ رات میں قبرستان پر سناٹے کا راج تھا۔ دور دور کسی انسان کا وجود نظر نہیں آتا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے ایک قبر کے کنارے بیٹھ گئے۔ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ایک بھاری پتھر آسمان کی طرف سے ان کے سر کی طرف آیا۔ وہ ایک طرف تیزی سے سرک گئے اور وہ پتھر زمین سے ٹکرا کر مٹی کی طرح بکھر گیا۔

"چھپ کر وار کرتا ہے مردود۔" وہ بولے۔

"تو نے بھی تو ایسا کیا تھا۔" اندھیرے میں آواز آئی۔

"میں نے تیری جان لینے کی کوشش نہیں کی ہے۔" بیراگی نے جواب دیا۔

"تو کیا سمجھتا ہے میں تیرا علم نہیں جانتا۔ تو جو پڑھتا ہے وہ مجھے بھی آتا ہے۔ تیرے پاس جو کچھ ہے، وہ میں سینکڑوں سال سے پڑھتا آرہا ہوں۔ تو میرا کچھ نہیں کر پائے گا۔" آواز آئی۔

"تو بھٹک گیا ہے۔ ذرا سوچ، غور کر، تو نے کسی کی بیوی پر ناجائز قبضہ کیا ہوا ہے۔" بیراگی نے کہا۔

"تو جھوٹ بولتا ہے۔ میں نے اس عورت سے پہلے شادی کی تھی۔ پھر ایک ملنگ نے مجھے باندھ دیا اور اس دوران اس آدمی نے اس عورت سے شادی کرلی۔ میری تو وہ بیوی پہلے بنی تھی۔ اس آدمی نے اس عورت سے بعد میں کیوں شادی کی۔ وہ عورت صرف میری بیوی ہے۔ مجھ سے خوش ہے۔ میری وفادار ہے۔" آواز آئی۔

بیراگی بولا۔ "تیری بات اگر میں مان لوں تو بھی تو غلطی پر ہے۔"

"میں نے کیا غلطی کی ہے؟" آواز آئی۔

"وہ عورت ایک انسان ہے۔ اس پر کوئی انسان ہی اپنا حق جتا سکتا ہے تو قوم جنات ہے۔ کیا تیری قوم میں تیرا جوڑ نہیں ہے تو پھر کیوں کسی کے حق پر ڈاکہ ڈال رہا ہے۔" بیراگی نے پوچھا۔

"وہ میری محبت ہے۔ میں اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔" آواز آئی۔

"تو کلمہ گو ہے۔ اس لئے میں وہ نہیں کرنا چاہتا جو میں کرسکتا ہوں۔" بیراگی نے جواب دیا۔

مگر پھر کچھ جواب نہیں آیا۔ بیراگی نے آسمان کی طرف دیکھا اور بولا۔ "اب تو بھاگتا ہی رہے گا۔"

رات کو ہی بیراگی پھر روانہ ہوگئے۔ اب ان کا رخ گوالیار کی طرف تھا۔ یہاں پر بھی ایک پرانا قلعہ ہے۔ وہ سیدھے ادھر ہی چلے گئے۔ اندر آتے ہی وہ بولے۔ "کچھ بات کرنا ہے۔ اجازت دو تو بات کروں اندر آکر۔" اور پھر وہ اندر چلے گئے۔ گری ہوئی برجی پر بیٹھ کر بولے۔ "ایک میرا چور ہے، وہ کچھ چرا کر بھاگا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تمہارے پاس آئے، تم لوگوں کی قوم کا ہے کیا تم اس کو پناہ دو گے۔" اچانک ان کے سامنے ایک سفید ریش بزرگ نمودار ہوگئے اور بولے۔ "اگر وہ چور ہے تو ہم اس کو گرفتار کر کے آپ کے حوالے کردیں گے....."

"بس مجھے یہی پتہ کرنا تھا۔ آپ نے میری امید کے مطابق جواب دے کر میرا حوصلہ بڑھا دیا ہے۔ میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔" اور وہ باہر آگئے۔ وہ ہر شہر میں اس کا راستہ روکتے گئے۔ مگر پھر اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ دلی، آگرہ میں بڑی آبادی جنات کی ہے مگر وہ وہاں پر نہیں تھا۔ ساجدہ اس کے ساتھ تھی۔ وہ بیراگی کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ بیراگی کی علمیت اور قابلیت کو وہ سمجھ گیا تھا اور اسی انداز

میں توڑ کر رہا تھا۔ مقابلہ کرنے سے کترا رہا تھا مگر اپنا بچاؤ خوب کر رہا تھا۔

دلی میں بیراگی سے میری ملاقات اچانک ہوگئی۔ میں بڑے مزار پر حاضری دینے کے بعد مقبرہ ہمایوں پر بھی جاتا ہوں۔ مقبرے کے دروازے پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ جسم سے ننگا تھا۔ صرف ایک دھوتی اس کا لباس تھا۔ میں اس کے قریب گیا تو مجھے اندازہ ہوا وہ شخص بیمار ہے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور سخت بخار اس کو چڑھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی اور ایک تانگے میں ڈال کر دواخانے لے آیا اور اس کا علاج شروع کردیا۔ وہ اب تک خاموش تھا۔ میں نے جو دوائیں اس کو دیں، اس سے شام تک اس کا بخار اتر گیا۔ کمزوری البتہ بہت تھی مگر بیماری اب زیادہ نہیں تھی۔ میں نے معائنہ کرنے کے بعد کہا۔

"بابا آپ آرام کرو۔ میں پرہیزی کھانا آپ کو دیتا ہوں۔ ایک دو روز میں آپ ٹھیک ہوجاؤ گے۔"

"بہت مہربان ہے تو میری جسمانی بیماری تو ٹھیک کردے گا۔ مگر میرے اندر جو آگ ہے وہ کس طرح ٹھنڈی ہوگی؟" وہ بولا۔

"آپ پہلے جسمانی بیماری سے نجات پالیں۔ پھر دوسری کو دیکھیں گے۔" میں نے کہا۔

"اس بیماری کا علاج تو مجھے خود کرنا ہوگا۔ بیرونی بیماری اندر کی بیماری کا پرتو ہے۔" وہ بولا۔

"ابھی آپ آرام کریں۔ آپ کے جسم کو اس کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

"ضرورت تو ہے مگر ضرورت پوری کب ہوتی ہے۔ ایک کے بعد دوسری سر ابھار دیتی ہے، کرتے رہو پوری۔"

"یہ بات تو آپ کی درست ہے، مجھے ذرا خدمت کا موقعہ تو دیں۔" میں نے کہا۔

"میں جانتا ہوں تو خدمت گار ہے۔ خدمت تو کرے گا ہی۔" وہ بولے۔

صبح میرے ساتھ رولوکا بھی تھا۔ رولوکا کو دیکھ کر وہ بولے۔ "میری حالت دیکھ رہے ہو۔ بہت دوڑایا ہے اس نے، پردہ کر کے بیٹھ گیا ہے۔ میرے علم کی کاٹ کرلیتا ہے۔ اب میں اندھیرے میں کھڑا ہوں۔ یہ انسانوں کی توہین ہے۔ میں اپنی آگ میں خود جل رہا ہوں۔ ایک دفعہ پکڑ لیتا تو کچھ بات ہوتی مگر میں پکڑ ہی نہیں پایا۔"

"بابا تم یہ بتاؤ، کون ہو اور کس کے پکڑنے کے چکر میں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تو حکیم ہے، جسمانی بیماری کو سمجھتا ہے، میں بیراگی ہوں، پھرنا میرا کام ہے۔ کسی کی بگڑی، کسی کی مصیبت اپنے سر لینا میرا پیشہ ہے۔ مگر اس دفعہ بری طرح خود سے ناامید ہوا ہوں۔ وہ ایک نہایت ہوشیار جن ہے۔ اس نے ایک عورت پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ اس کو لے کر فرار ہے۔ وہ کلمہ گو ہے، میرا توڑ کرلیتا ہے اور اپنا دفاع بھی خوب کرتا ہے۔ اب میں اندھیرے میں کھڑا ہوں۔ کیا پتہ وہ میرے قریب ہی ہو اور میری بے بسی کا تماشا دیکھ رہا ہو۔"

رولوکا نے آگے بڑھ کر کہا۔ "آپ ناامید نہ ہوں، برے کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ آپ دلی میں آرام کریں۔ میں آپ کو مایوس نہیں ہونے دوں گا۔ انسان سے بڑھ کر کوئی طاقتور نہیں ہے۔" پھر ذرا رک کر رولوکا نے کہا۔

"میری ایک درخواست ہے، اجازت ہو تو کہوں؟"

"ہاں ضرور کہو۔" بیراگی نے کہا۔

"میرا کام کرنے کا انداز ذرا الگ ہے۔ جیسا دشمن ہو، ویسا ہی وار کرتا ہوں۔ میرے کام میں مداخلت نہ کرنا۔ ہوسکتا ہے کہ میرا طریقہ آپ کے طریقے سے الگ ہو مگر آپ صرف دیکھنا۔" رولوکا نے کہا۔

"میں تیری باتیں سمجھ رہا ہوں۔ تو کسی راستے سے چل، سمت تو ایک ہی ہے۔ منزل تو ایک ہی ہے۔ پھر بھلا مجھے کیا پڑی ہے کہ تجھے روکوں، ٹوکوں۔ میرے نصیب مجھے دلی لائے ہیں۔ یہ بات اب میری سمجھ میں آگئی ہے۔"

رات کھانے کے دوران میں نے رولوکا سے پوچھا۔ "یہ بابا کس کو تلاش کر رہا ہے؟"

"یہ تو آپ نے سنا ہے کہ وہ ایک جن ہے اور کسی عورت کو لے کر فرار ہوا ہے۔ اس قسم کی حرکتیں عموماً بے دین

READING CORNER http://readingcornerblogspot.com/

جنات کرتے ہیں اور بڑی آسانی سے پکڑے جاتے ہیں۔ مگر بیراگی بابا بتاتے ہیں کہ وہ نہیں پکڑا گیا اور بیراگی بابا کو تھکا دیا اس نے۔" رولو کا نے جواب دیا۔

"جنات کے وجود کے بارے میں کچھ بتاؤ؟" میں نے پوچھا۔

"جنات کا وجود کوئی قصہ کہانی نہیں ہے۔ مذہبی کتب میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ یہ انسانوں کی طرح صاحب ایمان اور کافر بھی ہوتے ہیں اور بے دین بھی۔ آج بھی ان کے بارے میں مشہور ہے اور کل بھی تھا۔

انسان اپنی کمزوریوں اور خود میں روحانی طاقتوں کی کمی کی وجہ سے ان کو دیکھ نہیں سکتا۔ اگر انسان اپنے حواسوں کو مضبوط کر لے اور دلوں کو گناہوں کی آلودگی سے پاک کر لے، احساسات کو پاک اور خواہشات کو مار دے نفس پر کنٹرول کر لے تو دیکھنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ نفس کو مارنے کے لئے عبادت و ریاضت ضروری ہے۔" رولو کا نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہوا کہ تمہاری ڈیوٹی شروع ہو گئی۔" میں نے کہا۔

"میں تو مزدور ہوں۔ مزدوری کروں گا تو مزدوری ملے گی۔" رولو کا نے جواب دیا۔

"تمہاری ہر بات میں رمز ہوتا ہے۔ اب میں کچھ تمہاری زبان سمجھنے لگا ہوں۔" میں نے کہا۔

"دوستوں کی باتیں دوست ہی سمجھا کرتے ہیں۔" رولو کا بولا۔

"اچھا اب کیا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اب میں فرخ آباد جاؤں گا۔ ابتدا جہاں سے ہوئی ہے۔" رولو کا نے بتایا۔

"اور اب پھر کب ملاقات ہو گی۔" میں نے پوچھا۔

"میں آپ سے رابطہ کروں گا۔" رولو کا نے جواب دیا۔ اور رولو کا فرخ آباد روانہ ہو گیا۔

❁.....❁.....❁

فرخ آباد میں، میں مکرم کے گھر چلا گیا۔ میرا لباس اور بول چال ایک عام دلی والے کی تھی۔ "میاں تم ہی ہو مکرم۔" میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ "ہاں جی میں ہی ہوں۔"

"تو بھائی میاں میں دلی سے آیا ہوں۔ تم مجھے نہیں جانتے مگر میں جانتا ہوں۔ بیراگی بابا نے بتایا تھا۔ بیراگی بابا تو بیمار ہیں۔ میں یہ پتہ کرنے آیا ہوں، تم یہ بتاؤ کہ تمہاری جورو کا کچھ پتہ چلا۔" رولو کا بولا۔

"نہیں کچھ پتہ نہیں چلا۔ البتہ ایک رات وہ جن آ گیا تھا میرے پاس۔" مکرم نے کہا۔

"تم سے بات کی اس نے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں بڑے رعب سے اس نے کہا۔ ساجدہ کے بارے میں کسی کو کچھ نہ کہنا، کوئی پوچھے تو کہنا میکے گئی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ کہا تو ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھلا دوں گا....." مکرم نے کہا۔

"تو پھر کسی نے تم سے پوچھا، ساجدہ کے بارے میں؟"

"عورتوں کو تو کریہ ہوتی ہی ہے، پوچھا تھا اور میری سسرال جا کر ساجدہ سے وہ مل بھی آئی تھیں۔" مکرم نے جواب دیا۔

"کیا وہ وہاں تھی؟" رولو کا نے کہا۔

"ہاں جی عورتیں بتاتی تھیں، وہ وہیں پر تھی اور خوش نظر آتی تھی۔" مکرم نے کہا۔

"تم تو کہتے تھے اس کو جن لے گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"مجھے تو یہی پتہ تھا۔" مکرم بولا۔

"تم نے جا کر خود اس کو نہیں دیکھا۔" میں نے کہا۔

"ڈر کے مارے نہیں گیا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ جن بھی وہیں ہو گا۔"

"تمہاری سسرال کتنی دور ہے۔ میرے ساتھ چلو، پتہ کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

مکرم ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے معاف کر دو۔ تم خود اگر پتہ کرنا چاہتے ہو تو کر لو۔" اور میں اس کی سسرال چلا گیا۔ انہوں نے بتایا کہ مکرم خود ساجدہ کو

لے کر آیا تھا۔ دو روز وہ لوگ رہے اور پھر چلے گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ جن مکرم کے بھیس میں گیا تھا۔

میں واپس آ گیا یہ تو پتہ چل گیا کہ وہ فرخ آباد سے جا چکا تھا۔ اب میرا رخ ہاتھرس کی طرف تھا۔ کیونکہ ایک مکرم کے جاننے والے نے بتایا تھا کہ مکرم اپنی جورو کے ساتھ ہاتھرس کی گاڑی میں سوار ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مکرم کا بہروپ اختیار کئے ہوئے ہے۔

گاڑی رات کو ہاتھرس میں پہنچی تھی۔ میں اپنے ذریعہ سے ہاتھرس روانہ ہوا اور گاڑی اسٹیشن پر پہنچنے سے کچھ پہلے پہنچ گیا اور روپوشی کی حالت میں ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا، جہاں سے مسافر باہر جاتے ہیں۔

میں نے دیکھا، ایک برقعہ پوش عورت کے ساتھ مکرم گیٹ کی طرف چلا آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ ہی گیٹ سے باہر آ گیا۔ وہ دونوں مجھے نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ میں بھی اسی تانگے میں سوار ہو گیا۔ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر تھے اور خاموش تھے۔ تانگہ ایک بہت بڑی حویلی کے سامنے انہوں نے رکوایا تو تانگے والے نے حیرت سے کہا۔ "یہاں اترو گے یہ تو ویران حویلی ہے۔"

مکرم نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "تم اپنے کام سے کام رکھو۔"

اور کرایہ دے کر وہ دونوں اتر گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ اتر گیا۔ حویلی واقعی ویران تھی مگر جو آبادی اس میں تھی وہ تو ویرانہ ہی پسند کرتی ہے۔

حویلی کے اندر جاتے ہی اس کو پکڑ لیا گیا۔ اس کے چاروں طرف جنات تھے۔ مجھے انسانوں جیسے ہی نظر آ رہے تھے۔ شاید وہ ایک انسان کے سامنے اپنی اصلی صورت میں نہیں آئے تھے۔

ساجدہ گھبرا گئی تو وہ بولا۔ "تم گھبراؤ نہیں، یہ میری قوم کے لوگ ہیں۔"

"تیرا نام کیا ہے اور کیوں آیا ہے؟" ایک نے آگے بڑھ کر کہا۔

"میں شاکی ماہوں..... یہ میرے ساتھ میری بیوی ہے۔" شاکی ماہو لا۔

"ہم تم کو اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔" سردار سے پوچھنا ہو گا۔

"پوچھ لو، میں انتظار کرتا ہوں۔"

"تم اسی جگہ انتظار کرو، سردار ایک میلے میں گیا ہوا ہے۔ رات کو آئے گا۔"

"میں تھکا ہوا ہوں، آرام کرنا چاہتا ہوں۔" شاکی مانے کہا۔

"اسی جگہ رکنا ہو گا تم کو۔ اگر اکیلے ہوتے تو اندر آ جاتے، تمہارے ساتھ یہ آدم زاد عورت ہے۔ ہم اندر آنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ سردار ہی یہ کام کر سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے میں یہیں پر بیٹھ جاتا ہوں۔" اور شاکی ماہو وہیں پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ساجدہ بھی بیٹھ گئی۔ اس کے اردگرد اور جن بھی بیٹھ گئے۔ شاکی مانے ساجدہ سے کہا۔

"ہمارے یہاں سردار کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ سردار کا حکم سب مانتے ہیں۔ ان کو جو حکم ملا ہے، یہ وہ کر رہے ہیں تم فکر نہ کرو، سردار کے آنے کے بعد میں سردار کو منا لوں گا۔"

آدھی رات کے بعد سردار آ گیا اور شاکی ماہو کو دیکھ کر بولا۔ "تو کون ہے اور یہ عورت تیرے ساتھ کون ہے؟"

"سردار میں شاکی ماہو۔ دین دار ہوں۔ بے دین نہیں ہوں اور مدد کے لئے تمہارے پاس آیا ہوں۔" شاکی مانے جواب دیا۔

"اچھا بول کیا بات ہے؟" سردار نے پوچھا۔

"یہ عورت میری بیوی ہے۔ میرا قبیلہ شاہی قلعہ لاہور میں آباد ہے۔ میرے دشمن بہت ہیں۔ اتنی دور اس کو لے کر جانا مشکل ہو رہا ہے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

سردار نے غور سے اس کی بات سنی اور کہا۔ "یہ آدم زاد عورت، تو آگ یہ خاک، تیرا اور اس کا ملن تو ہو ہی نہیں سکتا تو اگر اس کو اپنے قبیلے تک لے کر چلا بھی گیا تو بھی وہ لوگ اس عورت کو ہرگز قبول نہیں کریں گے تو نے اپنی زندگی تو خراب کی ہی ہے۔ اس عورت کی زندگی بھی خطرے میں

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

ڈال دی ہے۔ اگر تو کافر ہوتا تو میں تجھے اسی وقت سخت سزا دیتا۔ تجھے تیرا قبیلہ ہی سزا دے گا۔ میں صرف یہ کروں گا کہ تجھے ان کے حوالے کردوں گا اور اس عورت کو اس کے گھر پہنچادوں گا۔ تم جیسے جنوں نے ہم سب کو بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔" اور شاکی ماکو باندھ لیا گیا۔

پھر ساجدہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں نہیں جانتا کہ تو اس کے ساتھ خوشی سے ہے یا اس نے زبردستی تجھ پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ مجھے یہ سب جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تم دونوں کا ملاپ ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ ہمارے قانون سے نہ انسانوں کے قانون سے اس لیے تجھے میں تیرے گھر پہنچا دیتا ہوں۔" سردار نے کسی کو اشارہ کیا اور دو جن ساجدہ کو لے کر گیٹ سے باہر چلے گئے۔ شاکی ماکو باندھ کر ایک کوٹھری میں ڈال دیا گیا اور سردار نے حکم دیا۔ "کل صبح اس کو لاہور روانہ کر دیا جائے۔"

اور میری واپسی ہوگئی۔ مجھے کچھ نہیں کرنا پڑا، رولو کا نے روداد سنادی۔

☆.....☆.....☆

کائنات کی وسعت کا اندازہ کوئی نہیں کر سکا۔ تو پھر اس کے لاکھ رازوں کے بارے میں کوئی کیا جان سکتا ہے۔ انسان کا ذہن کائنات کی وسعت کے مقابلے میں بہت چھوٹا ہے۔

کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ وقت کی کیا کہانی ہے۔ وقت کیا کیا تماشے دکھا سکتا ہے۔ ہزاروں طلسمات اس کائنات میں بھرے پڑے ہیں۔ سب کچھ رب کائنات کی کاریگری ہے۔ ہماری جیسی نہ جانے کتنی پوشیدہ دنیائیں اس کائنات کے اندر ہیں۔ ان میں بسنے والے کس قسم کے ہیں۔ ان کے چہرے کیسے ہیں۔ ہم اپنے تصور سے ان کی خیالی تصویریں بناتے ہیں اور اس پوشیدہ دنیا کے اسرار و رموز ہمارے ذہن میں نہیں آتے۔

پیشے کے لحاظ سے وہ ایک سپاہی تھا۔ مگر وہ جنگلات کا سپاہی تھا۔ رہتا بھی جنگل کے کنارے تھا۔ اس نے جس لڑکی سے شادی کی وہ بھی جنگلی زندگی پسند کرتی تھی۔ اس کا گاؤں بھی جنگل کے کنارے واقع تھا۔ جنگل کے قریب رہنے والے جنگلی جانور سے نہیں ڈرتے، وہاں کی عورتیں بھی بہادر ہوتی ہیں۔ وہ رہنے والا تو کرنال کے ایک گاؤں کا تھا مگر محکمہ جنگلات میں فاریسٹ گارڈ کی نوکری کے لئے یہاں آ گیا تھا۔ وہ مسلمان تھا اس کا نام اختر خان تھا۔ یہاں آنے کے بعد اس کو ٹنک پور کے قریب گاؤں بھیساول کی ایک لڑکی اچھی لگی۔ وہ مسلمان تھا، اس کو مسلمان لڑکی مل گئی اور دونوں کی شادی ہوگئی۔

مریم اور اختر دونوں ایک مزاج کے مالک تھے اختر تو شکاری تھا ہی اور اسی شوق کی بدولت وہ گارڈ بنا تھا۔ بیوی ملی، وہ بھی شکاری دونوں کی خوب جوڑی تھی۔ نوکری تو صرف اختر کی تھی کہ جنگلات میں چکر لگائے غیر قانونی شکار اور غیر قانونی درختوں کی کٹائی پر نظر رکھے مگر مریم ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ مریم بہت اچھی نشانہ باز اور بہترین تیراک بھی تھی۔ وہ اختر کی بہت اچھی رفیق تھی۔ دونوں دن بھر جنگل میں پھرتے پرندوں کا شکار کرتے اور بھون کر کھاتے۔ اختر کے پاس سرکاری بندوق تھی مگر کارتوس گنتی کے ہوتے تھے۔ اس لئے مریم نے ضرورت کے لئے تیر کمان رکھ لیا تھا۔ وہ کسی بھی درخت پر بیٹھے پرندے کو شکار کر لیتی تھی۔ اس سے یہ فائدہ بھی تھا کہ جنگل میں گولی چلنے کا شور نہیں ہوتا تھا۔ وہ روز شام کو ہی گھر آتے تھے۔ رات کو کھانے کے لیے ان کے تھیلے میں کوئی نا کوئی پرندہ یا خرگوش ضرور ہوتا تھا۔ وہ دونوں اس قدر گوشت خور تھے کہ ہفتوں اناج کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔

یوں تو جنگل میں بہت سے برساتی نالے تھے مگر یہ نالے صرف برسات میں پانی سے بھرے نظر آتے تھے۔ صرف ایک بڑا نالہ ایسا تھا کہ اس میں ہمیشہ پانی رہتا تھا۔ وہ بہت دور تھا۔ اس لئے کبھی کبھی ہی یہ لوگ وہاں تک جاتے تھے۔

اس نالے پر جنگل کے جانور پانی پینے آتے تھے۔ مریم نے دیکھا کہ ایک ہرنی کے ساتھ اس کے دو بچے بھی پانی کے کنارے کھڑے تھے۔ اس نے اپنی کمان کاندھے

سے اتاری اور ہرن کے ایک بچے کا نشانہ لیا اور تیر چھوڑ دیا۔ مگر بچے نے فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ دی اور تیر پانی میں چلا گیا اور ہرنی اپنے بچوں کو لے کر فرار ہوگئی۔ ایسا بہت کم ہوا تھا کہ مریم کا نشانہ خالی گیا ہو۔ واپس آتے وقت کچھ مرغیاں شکار کر کے وہ لے آئے۔

رات کو اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اختر نے دروازہ کھولا تو ایک آدمی کھڑا تھا۔ وہ دھوتی اور کرتا پہنے تھا۔ اس کا چہرہ داڑھی مونچھ سے بے نیاز تھا۔ قد لمبا تھا اور پیروں سے ننگا تھا۔ "مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" وہ بولا۔ اس کی آواز بڑی بھاری تھی۔

اختر نے کہا۔ "اندر آجاؤ۔" وہ اندر آ گیا تو اختر نے مریم کو آواز دی۔ "دیکھو ایک مہمان آیا ہے۔ ذرا دو کپ چائے تو بنا دو۔"

وہ آنے والا جلدی سے بولا۔ "میں چائے نہیں پیتا۔"

"کوئی بات نہیں آج پی لو۔ شہر سے منگوائی ہے۔" اختر نے کہا۔

"تم پیو میں پیتا نہیں ہوں۔" وہ بولا۔

"اچھا خیر یہ بتاؤ کہاں سے آئے ہو اور کیوں آئے ہو؟" اختر نے پوچھا۔

اس نے جنگل کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "میں وہاں سے آیا ہوں اور یہ بتانے آیا ہوں کہ بڑے نالے پر تم یا تمہاری جورو کبھی شکار نہ کرنا۔" وہ بولا۔

"میں اس علاقے کا سرکاری گارڈ ہوں۔ مجھے ضرورت کی لکڑی اور گوشت حاصل کرنے کی اجازت ہے۔ تم منع کرنے والے کون ہوتے ہو؟" اختر نے کہا۔

"مجھے پتہ ہے..... جنگل میں صرف جانور ہی نہیں رہتے۔ تم کو کہہ دیا ہے۔" وہ بولا۔

"میں جنگل کا گارڈ ہوں، تم مجھے دھمکا رہے ہو، میں سرکاری آدمی ہوں۔ تم کو پتہ ہے۔" اختر نے غصہ دباتے ہوئے کہا۔

"سب پتہ ہے مگر تم میری بات یاد رکھنا۔ ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے سے باہر چلا گیا۔ مریم کمرے میں آئی اور پوچھا۔ "کون تھا؟"

"پتہ نہیں کون تھا، کہتا تھا بڑے نالے پر مت آنا اور شکار بھی نہ کرنا۔"

"ارے چھوڑو ہوگا کوئی، ہم تو جائیں گے اور ہرن کا گوشت بہت دن ہوئے نہیں کھایا وہیں پر شکار کریں گے۔" مریم نے کہا۔

ایک ہفتہ کے بعد دونوں پھر بڑے نالے پر کھڑے تھے۔ مریم اپنی کمان کاندھے سے اتار رہی تھی کہ ان کے چاروں طرف سے لوگ آ گئے اور ان کو گھیر لیا اور دونوں کو پکڑ کر لے گئے۔ وہ ان دونوں کو لے کر جنگل کے اندرونی حصے کی طرف چلے، اس علاقے میں مریم اور اختر کبھی نہیں آئے تھے۔ یہاں پر درخت اور جھاڑیاں اتنے قریب قریب تھے کہ پیدل چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ دلدلیں تھیں مگر یہ لوگ بڑی بے فکری سے چلے جا رہے تھے۔ یہ لوگ آپس میں بھی بات نہیں کر رہے تھے۔ اختر نے کئی دفعہ ان سے پوچھا مگر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ معلوم کتنی دور جانا تھا۔ سارا دن وہ چلتے رہے۔ پھر درختوں کے درمیان ایک بہت بڑا ہرا میدان آ گیا اور کچھ اور لوگ بھی نظر آنے لگے۔ ان میں وہ آدمی بھی تھا جو اختر کے گھر آیا تھا۔

اس نے آتے ہی حکم دیا، ان کو بند کر دو اور پھر ان کو زمین کے اندر ایک کھوہ میں بند کر دیا گیا۔ کھوہ کے اندر گھپ اندھیرا تھا مگر ہوا آ رہی تھی۔ رات کا پتہ نہیں، کون سا پہر تھا کہ اس آدمی کی آواز اختر کے کانوں میں آئی۔

"بھوک لگی ہوگی لے کھانا کھالے۔ میں تیرے گھر گیا تھا تو مجھے چائے پلانا چاہی تھی۔ میں بھی تجھے بھوکا نہیں رکھوں گا۔" اختر نے دیکھا وہ ایک مشعل جلائے اس کے سامنے بیٹھا ہے اور کھانا زمین پر رکھا ہے۔ اختر نے مریم کو اٹھایا اور کہا۔ "کھانا کھالو۔"

دونوں کھانا کھانے لگے۔ کھانا صرف گوشت تھا اور یہ گوشت ہرن کا تھا۔ کھانے کے بعد وہ بولا۔

"تیری زندگی اس لئے باقی ہے کہ تو نے میرے

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

ساتھ اچھا سلوک کیا تھا۔ تیری بیوی کی زندگی اس لئے باقی ہے کہ یہ حمل سے ہے۔ اب تم دونوں یہاں رہو گے جہاں چاہو گھومو۔ پھر تم پر کوئی پابندی نہیں ہوگی اور اگر تم لوگ بھاگنا بھی چاہو گے تو بھی بھاگ نہیں سکو گے، تمہارا فیصلہ تمہارا بچہ پیدا ہونے کے بعد ہوگا۔" اور وہ چلا گیا۔

ادھر جنگل میں اختر اور اس کی بیوی کی گمشدگی کی اطلاع محکمے کو ہوگئی مگر ہزار کوشش کے بعد بھی اختر اور اس کی بیوی کا پتہ نہیں چلا۔

دونوں میاں بیوی پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی۔ وہ دور دور تک جاتے تھے۔ وقت پر ان کا کھانا آجاتا تھا۔ کھانا لانے والے ان سے کوئی بات نہیں کرتے تھے اور اس طرح آٹھ ماہ گزر گئے اور مریم کے ہاں ولادت کا وقت قریب آگیا تو انہوں نے پہلی بار کسی عورت کی شکل دیکھی۔ وہ عورت بھی بے زبان تھی۔ وہ مریم کے پاس کھوہ میں آگئی۔ جب ولادت کا وقت قریب آیا تو وہ مریم کو کھلے میدان میں لے آئی۔ رات کا وقت تھا اور پورا چاند آسمان پر موجود تھا۔ چاند کی سنہری روشنی اس ہرے بھرے میدان کو روشن کئے ہوئے تھی۔ میدان میں جہاں پر مریم تھی۔ اس سے تقریباً سو گز دور ایک گول دائرے میں لوگ کھڑے تھے اور وہ جس کا حکم ان پر چلتا تھا۔ چاند کی طرف منہ کر کے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ دائرہ بنائے جو کھڑے تھے ان کے چہرے بھی آسمان کی طرف تھے۔ اختر کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا مگر وہ کیا کرتا اور پھر اس نے بچے کے رونے کی آواز سنی۔ اس کو ایک سکون سا ملا۔ اس عورت نے بچے کو دونوں ہاتھ پر اٹھا کر سر سے اونچا کر دیا اور سردار کی آواز آئی۔

"تیرے سائے میں تیرے سامنے تیری مہربانی سے یہ بچہ دنیا میں آیا ہے۔ اس پر اپنی نظر کرم کر، اس کو وہ سب عطا کر جو تیرے پاس ہے۔ آج مقدس رات ہے، اس رات میں بہت عرصہ کے بعد اس زمین پر تیرا ظہور ہوا ہے۔ یہ ان سب امانتوں کا حق دار ہے جو تیرا وعدہ ہے۔" اور سارے دائرے میں کھڑے لوگ آگے بڑھتے گئے اور ہر فرد اس بچے کے آگے گردن جھکا کر آگے بڑھ گیا۔ سب سے آخر میں بچے کے سامنے سردار آیا اور بولا۔

"تیری امانت میرے پاس ہے۔ میں تجھے سونپ دوں گا۔" اور گردن جھکا کر آگے بڑھ کر اختر کے پاس آیا اور بولا۔ "تیری بیوی کے بطن سے یہ چاند کا نور نظر پیدا ہوا، تو کتنا خوش نصیب ہے۔ تجھے آج تک زندہ صرف اس لئے رکھا گیا کہ تو اس کا باپ ہے مگر یہ چاند کا نور نظر ہے۔ اگر یہ آج نہ پیدا ہوتا تو پیدا ہوتے ہی مر جاتا۔ مگر یہ ہر امتحان میں پورا اترا ہے۔ عین اسی گھڑی دنیا میں آیا ہے جو گھڑی ایک لمبے کو آتی ہے۔ اس کی پرورش مقدس بیٹیاں کریں گی۔ یہ مقدس بیٹیوں کا دودھ پیئے گا۔ تیری عورت اس کو پیدا کرتے ہی مر چکی ہے۔ یہ بھی ایک علامت ہے۔ اس کے چاند ہونے کی۔"

اختر نے یہ سنا تو سناٹے میں رہ گیا۔ "اب آخری علامت بارہ سال کے بعد سامنے آئے گی۔ یہ بارہ سال کا ہوگا اور تو مر جائیگا....." سردار نے کہا۔

"میں تمہاری اس بکواس کو نہیں مانتا۔" اختر چیخ کر بولا۔

"تو نہ مان! میں منوانے کو نہیں بتا رہا۔ بتانا میری ڈیوٹی ہے۔ چاند کے نور نظر کا حکم ہے۔ اس نے آتے ہی مجھے کچھ حکم دیئے ہیں۔ ان میں یہ بھی ہے کہ تجھ کو بتا دیا جائے کہ تیری زندگی صرف بارہ سال رہ گئی ہے۔ ان بارہ سالوں میں تو جو کرنا چاہے وہ کر سکتا ہے، جہاں رہنا چاہے جا سکتا ہے۔" سردار نے کہا۔

"میں تمہاری بے سروپا باتوں کو نہیں مانتا۔ تم نے میری بیوی کو مار دیا۔ اب الٹی سیدھی بکواس کر رہے ہو۔" اختر نے غصے سے کہا۔

سردار نے نہایت سکون سے اختر کی بات سنی اور بولا۔ "تم حکم کرو، میں تم کو تمہاری جگہ پر پہنچا دیتا ہوں۔"

"اچھا تم مجھے پیلی بھیت میرے ہیڈ کوارٹر پہنچا دو۔" اختر نے کہا۔

سردار نے یہ سن کر گردن جھکا دی اور چلا گیا۔ دوسری صبح اختر کی آنکھ کھلی تو وہ پیلی بھیت ریلوے اسٹیشن پر ایک بنچ پر لیٹا تھا۔ اس کے کانوں میں گاڑیوں کی آواز آئی تو

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سامنے ہی بورڈ پر لکھا تھا، پیلی بھیت جنکشن اور وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے کپڑے صاف ستھرے تھے۔

اس نے اپنی روداد سب کو سنائی مگر کوئی اس پر اعتبار کرنے پر راضی نہ ہوا اور اس کو نوکری سے نکال دیا گیا۔ وہ ناامید ہو کر دلی کی طرف جانے کی سوچنے لگا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو انگلیاں کرارے نوٹوں سے ٹکرائیں اور اس نے دلی کا ٹکٹ خرید لیا اور ٹرین میں سوار ہو گیا۔ مگر اس کا دل یہاں نہ لگا وہ کھلے علاقے کا رہنے والا آدمی تھا۔ دلی تو انسانوں کا جنگل تھا۔ یہاں کے شور وغل نے اس کو بیزار کر دیا۔ وہ اور آگے بڑھ گیا۔ متھرا میں رک گیا۔ یہاں پر دلی والا شور نہیں تھا۔ وہ ایک سرائے میں ٹھہر گیا۔ یہ سرائے ایک ہندو کی تھی اور یہاں پر گوشت نام کی کوئی چیز نہیں ملتی تھی۔ متھرا میں مسلمانوں کی آبادی کم ہے۔ یہ ہندوؤں کا شہر ہے۔ مندر بے حساب ہیں۔ گھنٹیوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ وہ بہت جلد اس شہر سے اکتا گیا اور آگے بڑھ گیا۔ آگرہ پورا تر گیا۔ یہ بھی ہندو اسٹیٹ تھی۔ یہاں پر مسلمانوں کی حالت بہت خراب تھی۔ اس کو یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ راجہ ہندو تھا اور صرف ہندوؤں کی سنتا تھا۔ مسلمان بے چارے تیسرے درجے کے باشندے خیال کئے جاتے تھے۔ وہ اور آگے بڑھ گیا۔ آگرہ آگیا۔ یہاں پر مسلمان کثیر تعداد میں تھے اور برابری کی بنیاد پر ہر معاملہ تھا۔ کوئی ان کو ستا نہیں سکتا تھا۔ بکرے کا اور بھینس کا گوشت عام بکتا تھا۔ گائے بھی کٹتی تھی مگر وہ مسلمانوں کا پوشیدہ طریقہ تھا۔ یہاں آکر وہ پیٹ بھر کر کھانا کھانے لگا تھا۔ آگرہ شہر قدیم شہر ہے۔ مسلمان بادشاہوں کی عظیم الشان عمارتیں آج بھی موجود ہیں۔ قدیم بادشاہوں کی بنائی ہزاروں عمارتیں ویران پڑی ہیں اور جو مشہور ہیں، وہ سیاحوں سے دن بھر بھری رہتی ہیں۔ اختر کے پاس کچھ کام نہیں تھا۔ وہ دن بھر گھومتا رہتا۔ اس نے ایک تانگہ کرائے پر لے لیا تھا۔ سارے دن وہ اس کو شہر بھر میں لئے پھرتا تھا۔ وہ روز اس کو کرایہ ادا کر دیا کرتا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ کتنا بھی خرچ کرے اس کی جیب میں روپے کم نہیں ہوتے تھے۔

تانگے والا بڑا ہوشیار تھا۔ اس کی لگی بندھی آمدنی ہو رہی تھی۔ وہ ہر روز اختر کو کسی نہ کسی نئی جگہ لے جاتا تھا۔ اختر نے بھی اپنی لگام اس کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ آگرہ شہر کے باہر اتونی گاؤں ہے۔ اس گاؤں سے سات آٹھ کوس پر ایک گول برجی بنی ہوئی ہے اور اس کے چاروں طرف کھیت ہیں۔ یہ سفید برجی کہلاتی ہے کیونکہ اس میں جو پتھر استعمال ہوا ہے وہ سفید ہے، اندھیری رات میں بھی یہ صاف نظر آتی ہے۔ اس برجی کے چاروں طرف دور دور تک کوئی آبادی نہیں ہے۔ کسان اس برجی سے دور رہتے ہیں۔ اس کے قریب جانے پر خوف سا محسوس ہوتا ہے۔ مگر کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس کے قریب جانے والا ڈر کر دور ہو جاتا ہے۔

یہ دور سے صرف ایک برجی نظر آتی ہے مگر اندر سے بہت کشادہ ہے۔ اس کے چاروں طرف محلات کا ایک سلسلہ ہے۔ اس کے بنانے والے کے بارے میں کوئی نہیں جانتا، کب کس نے بنایا، کسی کو پتہ نہیں ہے۔ طرز تعمیر مسلمانی ہے۔ اس لئے خیال ہے کہ یہ کسی مسلمان بادشاہ نے بنائی ہے۔ جس زمانے میں اس کو بنایا گیا ہوگا۔ اس وقت تو یہ بیابان جنگل ہوگا۔ پھر اس کو کیوں بنایا گیا تھا۔ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ سفید برجی کے بارے میں آثار قدیمہ والے بھی کچھ نہیں جانتے۔

تانگے والا اتونی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کو سفید برجی کی بابت پتہ تھا۔ اس کے رشتہ دار بھی اتونی میں رہتے تھے۔ وہ بہت دن سے اتونی نہیں آیا تھا۔ اس نے ایک ساتھ دو کام کئے۔ اتونی آنے کے بعد وہ بولا۔ "صاب یہاں پر ایک برجی ہے۔ بہت اچھی عمارت ہے۔ میں آپ کو اس کے قریب چھوڑ دوں گا۔ آپ تفریح کریں، میں اتونی میں آپ کا انتظار کرلوں گا۔"

"تم میرے ساتھ نہیں چلو گے۔" اختر نے پوچھا۔

"نہیں صاب میرے اتونی میں رشتہ دار ہیں۔ میں ان سے ملاقات کروں گا۔"

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

اور وہ دونوں سفید برجی کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ کچی سڑک تھی اور تانگہ بہت آہستہ چل رہا تھا۔ دور سے سفید برجی نظر آ رہی تھی۔ دن کے گیارہ بجے تھے۔ پھر وہ کچی سڑک بھی آگے سے بند ہو گئی اور تانگے والے نے کہا۔ "اب آگے راستہ نہیں ہے، آپ سیر کریں، میں اتونی میں آپ کو لے جاؤں گا۔"

اختر تانگے سے اتر گیا اور سفید برجی کی طرف چلنے لگا۔ دور دور کسان کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ اس کا رخ برجی کی طرف تھا۔ ایک کسان دوڑتا ہوا اس کے قریب آیا اور اپنی سانسوں پر قابو پا کر بولا۔

"کاں جات رہے ہو۔"

اختر نے برجی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "برجی دیکھنے جا رہا ہوں۔"

کسان نے اس کے شہری لباس پر نظر ڈالی اور بولا۔ "بے خبر لاگے ہے ارے کا نیا آوا ہے تو کے کچھ خبر نا ہے۔"

اختر نے پوچھا۔ "تم کیا بتانا چاہتے ہو؟"

"ارے باولے برجی کے دھورے کون ناہی جا سکت بہوت خطرہ ہے وہن۔" کسان بولا۔

"یہی تو پوچھ رہا ہوں خطرہ کیا ہے؟" اختر نے پوچھا۔

"اہی ہم کا کا خبر ہے جو جاوت ہے۔ نقصان اٹھاوت ہے ہم تو امی جانت ہیں بس۔" وہ بولا۔

"تم لوگ ڈرتے ہو، میں جنگل کا باشندہ ہوں۔ ڈر وخوف نہیں جانتا۔ جاؤ تم اپنا کام کرو۔" اور وہ آگے بڑھ گیا۔ کسان حیرت سے اس کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

سفید برجی کے اطراف کی جگہ بالکل صاف تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ جگہ روز صاف کی جاتی ہو۔

برجی کے مین دروازے سے دو ڈھائی سو گز دور وہ کھڑا تھا۔ سامنے جو میدان تھا، وہ صاف ستھرا تھا۔ عمارت بھی صاف نظر آتی تھی۔ وہ میدان سے گزرنے لگا اور میں دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک محراب دار دروازہ تھا۔ دور سے اس کی اونچائی اور چوڑائی کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ اس دروازے سے بڑے سے بڑا ٹرک اندر آ سکتا تھا۔

اس میں کواڑ نہیں تھے۔ داخل ہوتے ہی بہت بڑا ہال کمرہ تھا اور وہ کمرہ برجی کے نیچے تھا۔ اس کی چھت گول تھی۔ پتھر سفید ہونے کی وجہ سے یہ کمرہ روشن تھا۔ جھروکوں سے روشنی اندر آ رہی تھی۔

کمرہ صاف تھا مگر پورا کمرہ خالی تھا۔ پھر اس کے کانوں میں کسی کے سیڑھیاں اتر کر آنے کی آواز آئی..... دروازے کے ساتھ ہی زینہ تھا۔ وہاں سے کوئی آ رہا تھا اور پھر وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ ایک خوبصورت مرد تھا۔ اس کے بال بھورے تھے۔ نیلی آنکھیں تھیں اور رنگ سرخ و سفید تھا۔ اس کے خدوخال مردانہ تھے اور قد سرحد کے پٹھانوں جیسا تھا۔ چہرہ اتنا رعب دار کہ نظر ملانا دشوار تھا۔

"ہمارے مقام پر آنے کا شکریہ۔ تم پہلے آدمی ہو جو اس برجی کے اندر آئے ہو۔" اس نے اپنی بھاری رعب دار آواز میں کہا۔

"میں اس لئے آ گیا کہ میں جنگل کا آدمی ہوں۔ خوف مجھ سے دور رہتا ہے۔" وہ بولا۔

"یہ بات نہیں ہے کہ تم اس لئے آ گئے کہ تم کو کچھ مہلت ملی ہوئی ہے۔ میں بڑوں کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کر سکتا۔" وہ بولا۔

"تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔" اختر نے پوچھا۔

"میرا نام جاننا تمہارے لئے بیکار ہے۔ پھر میں تم کو کیا بتاؤں۔" وہ بولا۔

"اچھا یہی بتا دو کہ تم کون ہو اور اس ویران برجی میں کیوں رہتے ہو؟" اختر نے پوچھا۔

"اس سوال کا بھی میں جواب نہیں دوں گا، آدمی کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ وہ کرید بہت کرتا ہے۔ سوال پر سوال کرتا چلا جاتا ہے اور پھر بھی جب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تو اپنی مرضی سے تاویلات گھڑ لیتا ہے۔" وہ بولا۔

"میں صرف سیر کی غرض سے آیا ہوں۔ مجھے پتہ ہوتا کہ اس میں رہائش ہے تو نہ آتا۔" اختر نے کہا۔

"تم آئے ہو تو میرے مہمان ہو تم قابل احترام اس لئے بھی ہو کہ تم چاند کے نور نظر کے باپ ہو۔" وہ بولا۔

اختر نے چونک کر پوچھا۔ "اچھا تم کون ہو؟"

"میں اسی مقام سے آیا ہوں، جہاں پر تمہاری بیوی نے چاند کے نور نظر کو جنم دیا تھا۔" وہ بولا۔

"وہ مقام تو بہت دور ہے۔ تم کو یہ سب کیسے پتہ چلا۔" اختر نے پوچھا۔

"دنیا کے دور دراز مقامات پر روز جاتے ہیں اور پھر آ جاتے ہیں۔ تم ہمارے ذرائع کو نہیں سمجھ سکتے، تم چند روزہ زندگی لے کر آئے ہو، انسان کی زندگی زیادہ سے زیادہ سو سال ہوتی ہے۔ تم میری عمر کا کیا اندازہ لگاتے ہو۔" اس نے پوچھا۔

"زیادہ سے زیادہ چالیس سال ....." اختر نے جواب دیا۔

وہ مسکرا کر بولا۔ "اس میں پانچ سو سال اور جمع کر لو۔"

اختر نے حیرت سے اس کو دیکھا اور بے یقینی سی کیفیت میں بولا۔ "اگر یہ حقیقت ہے تو پھر تم انسان نہیں ہو۔"

"میں نے کب کہا ہے کہ میں انسان ہوں۔ تمہارے لئے یہ انوکھی حقیقت ضرور ہے مگر تم نے ابھی کچھ نہیں دیکھا ہے۔ تم اپنی مختصر سی عمر میں دیکھ بھی کیا سکتے ہو۔ دنیا میں بڑی بڑی فکر انگیز حقیقتیں موجود ہیں۔ میں نے دنیا میں جو کچھ دیکھا ہے، بیان کروں گا تو تم یقین نہیں کرو گے۔ تم میرے سامنے صرف اس لئے کھڑے ہو کہ تم کو مہلت دی گئی ہے۔ مہلت کے ختم ہوتے ہی تم دنیا میں مزید نہیں رہو گے۔ تم کو اتنی مدت دنیا میں رہنا ہوگا۔ ہمارے مہمان کی طرح ہم تمہارا خیال رکھیں گے۔ یہی حکم ہم کو ملا ہے۔" وہ بولا۔

"تم اگر فوق البشر ہو تو سن لو کہ میں دنیا کے ایک سب سے اعلیٰ مذہب سے تعلق رکھتا ہوں گو کہ بہت گناہ گار ہوں مگر پھر بھی دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے خدا سے مدد مانگنے سے روک نہیں سکتی۔ زندگی اور موت کا ایک فاصلہ ہوتا ہے۔ موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ وہ اپنے وقت پر ہی آتی ہے۔ تم یا کوئی اس کو نہیں بلا سکتا۔ تم مجھے بار بار موت سے نہ ڈراؤ، میں موت سے آنکھ ملا کر بات کر سکتا ہوں۔ اگر میری موت آنے میں بارہ سال ہیں تو بھی مجھے موت کا خوف نہیں ہے اور اگر اس سے کم وقت ہے تو بھی فکر نہیں ہے اور اگر زیادہ وقت موت کے آنے میں ہے تو تم اور تمہارا کوئی بھی ساتھی میرا کچھ نہیں کر سکتا۔ تم نے بہت زمانہ دیکھا ہے مگر تم نہیں جانتے کہ موت تو قرض ہے۔ یہ تو ادا کرنا ہی پڑتا ہے۔ قرض بوجھ ہوتا ہے۔ بوجھ کون اپنے اوپر رکھنا چاہتا ہے۔ تم ہزار سال بوجھ اٹھاؤ گے اور میں چند سال بوجھ برداشت کروں گا۔ اب بتاؤ، بہتر کون رہا۔" اختر نے کہا۔

"تم انسان ہو اور انسان تاویلات بہت کرتا ہے۔ اپنی ہر خرابی کا جواز پیدا کر لیتا ہے۔ تم جس کو مانتے ہو، اس کی عبادت کتنی مدت کرو گے اور میں کتنے طویل عرصے تک کروں گا۔ تم کو اس کا اندازہ ہے۔" وہ بولا۔

"تم صاحب علم ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ انسان کو رب کائنات نے اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ ہماری مقدس کتاب کے مطابق اس نے اپنے خلیفہ کو شمس و قمر ارض و سما کا حاکم بنا دیا ہے۔ رب کائنات وسائل کے بغیر حاکم ہے تو اس کا خلیفہ بھی وسائل کا محتاج نہیں ہے۔"

"تم کچھ کہو مگر یاد رکھو، چاند کے نور نظر کا حکم آخری ہوتا ہے۔" وہ بولا۔

"چاند کو پیدا کرنے والے کو چھوڑ کر تم چاند کی بات کرتے ہو، تم جس چاند کو طاقت کا سرچشمہ خیال کرتے ہو، اس کو زمین اور آسمان کے درمیان کس نے روک رکھا ہے۔ چاند سے زیادہ توانائی اور روشنی سورج دیتا ہے۔ تم اس کو کیوں اہمیت نہیں دیتے۔ اگر فطرت نے تم کو انسان سے زیادہ اختیارات اور طاقت دی ہے تو تم اس دینے والے کو فراموش کر رہے ہو۔ کیا تم دنیا کے مالک کو ناخوش نہیں کر رہے۔ یہ اس کی رحمت ہے کہ وہ تمہاری رسی دراز کر رہا ہے۔ موقعہ دے رہا ہے، تم کو پلٹ کر جانا تو ہے، دنیا میں تم کو زیادہ وقت دے دیا ہے۔ انسان کو کم وقت دیا ہے تم کو سمجھنے کا زیادہ وقت ملا ہے مگر تم بے فکر ہو کر بیٹھے ہو، چاند پر نگاہیں لگائے ہو، یہ عقل مندی نہیں ہے۔" اختر نے کہا۔

"تم کو وقت بتائے گا کہ میں نے درست کہا تھا۔"

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

وہ بولا۔

"میں بے چینی سے اس وقت کا انتظار کروں گا۔"

اختر نے کہا۔

"میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔ میں حکم پورا کروں گا۔" وہ بولا۔

"تم میرا حکم نہیں پورا کرو گے بلکہ کسی اور کو خوش کرنا چاہتے ہو۔" اختر نے کہا۔

"ہاں یہ درست ہے مگر خواہش تو تمہاری پوری ہو گی۔" وہ بولا۔

اختر دروازے کی طرف چل دیا۔ تو وہ بولا۔ "مجھ سے ناراض ہو۔"

"تم آسمان کی طرف دیکھو، میری طرف مت دیکھو، بارہ سال کے بعد مجھ سے ملاقات ضرور کرنا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔" اختر نے کہا۔

"بارہ سال کے بعد میں تمہاری قبر پر آؤں گا۔" وہ بولا۔

"وقت جواب دے گا۔" اور اختر تیزی سے باہر آ گیا اور پھر اتونی گاؤں کی طرف روانہ ہوا۔

وہ میدان پار کر کے کھیت کی پگڈنڈی پر آ گیا اور کچی سڑک کی طرف چلا۔ ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ وہی کسان دوڑ کر اس کے قریب آ گیا اور بولا۔

"آج تو گجب ہو گیا۔ بھگوان کی سوگند کوئی مانس واپس نہیں آیا، تو کیسے لوٹ آیا۔"

اختر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "مارنے والا کمزور ہوتا ہے، بچانے والا طاقت ور ہوتا ہے، میری موت کا وقت نہیں تھا، تو میں کیسے مرتا۔"

"پن ہم نے یہی دیکھا ہے اب تک جو گیا وہ گیا، لوٹا نا ہی۔" کسان بولا۔

"تمہارے پاس پانی ہو گا۔" اختر نے پوچھا۔

"ارے بھیا! پانی کا روئی کھاؤ، گھر والی نے بھجوائی ہے، لسی بھی بھر کر رکھی ہے۔" کسان بولا۔

"نہیں میں روٹی نہیں کھاؤں گا، پھر تم کو بھوکا رہنا پڑے گا۔" اختر نے جواب دیا۔

"تو پھر ایسا کرو، دونوں ساتھ کھاتے ہیں۔" کسان بولا۔

"مجھے تم صرف پانی پلا دو، سمجھ لو میں نے روٹی کھالی۔" اختر نے کہا۔

"ہاں بھیا ہم غریب آدمی ہیں۔ کوئی اور کی چاکری کرت ہیں۔ تم کا ہے ہماری روٹی کھاؤ گے۔" کسان غمگین لہجے میں بولا۔

اختر نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آؤ روٹی کھاتے ہیں۔"

کسان کے چہرے پر رونق آ گئی، جلدی سے بولا۔

"آؤ بھیا پیڑ تلے بڑی ٹھنڈی ہوا آوت ہے۔"

کسان نے پیڑ کی جڑ کے پاس سے ایک پوٹلی اٹھائی۔ وہیں پر ایک مٹکی رکھی تھی، اس میں لسی بھری تھی۔ باجرے کی دو موٹی موٹی روٹیاں اس پوٹلی میں تھیں اور بہت سا اچار اس کے اوپر رکھا تھا۔ کسان نے آدھا اچار دوسری روٹی پر رکھا اور اختر کے ہاتھ پر رکھ دیا اور دونوں روٹی اچار کھانے لگے۔ اختر نے پوچھا۔ "یہ اچار تمہاری گھر والی نے ڈالا ہو گا۔"

"ہاں بھیا ہماری گھر والی بڑی سگھڑ ہے۔ بہوت بڑھیا اچار بناوت ہے۔" کسان بولا۔

اختر کو باجرے کی روٹی اور اچار میں بڑا مزا آیا، روٹی اتنی موٹی تھی کہ اس کا پیٹ بھر گیا۔ کسان نے لسی کی مٹکی پر سے کپڑا ہٹایا اور کہا۔ "لو پیو۔"

اختر نے کہا۔ "پہلے تم پی لو۔ میں بعد میں پی لوں گا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے، ارے ہم تو روز پیت ہیں۔ گنگا کی سوگند آج جو مزا روٹی میں آیا ہے، ایسا تو کبھی نہیں آیا، پہلے تم جی بھر کر پی لو۔" کسان جھوم کر بولا۔

اختر نے مٹکی منہ سے لگائی اور غٹا غٹ لسی پی لی، اس لسی کا بھی الگ ہی مزا تھا۔ باقی بچی لسی کسان نے پی لی اور بولا۔ "آج بڑا آنند ملا ہے کھا کے۔"

"تم کو پتہ ہے تم کو آنند کیوں ملا ہے۔" اختر نے

پوچھا۔

"ارے ہم کا جانیں ہم تو نرے دیہاتی آدمی ہیں۔ کھوپڑیا چھوٹی سی ہے۔ صاف اور کھری بات سمجھ آوت ہے۔ باقی سمجھ نا ہی آتی ہے، لوگ ہمکا للو چرن کہت ہیں۔ پر ہمارا نام تو چرن سنگھ ہے۔ سب جو کہت ہیں تو ہم روکا برا نا ہی مانت ہیں۔ سب ہم کو للو کہہ کے خوش ہیں تو ہم بھی خوش ہیں۔ بھگوان نے روزی دے رکھی ہے۔ سو عزت سے کمات ہیں تم نے کچھ بتایا نہیں۔"

"ہم تو مسافر ہیں بھائی۔" اختر نے کہا۔

"تم نے ہماری جو خدمت کی، اس کا بدلہ تو ہم تم کو کیا دیں گے۔ تمہارے بھگوان نے تم کو جو آنند دیا ہے، وہ خدمت کے بدلے دیا ہے۔ انسان جب بے لوث کسی کی خدمت کرتا ہے تو اس کو خوشی ہوتی ہے۔ آنند ملتا ہے یہ خوشی اتنی انمول ہوتی ہے کہ اس کا کچھ بدل نہیں ہوتا۔ تم نے تو ایسی خوشی پالی ہے۔ میں بھی اگر ایسی خوشی لینا چاہوں تو تم میری بات مانو گے۔" اختر نے پوچھا۔

"کا ہے نا ہی مانیں گے ضرور مانیں گے۔" کسان نے جواب دیا۔

اختر نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔" اور بولا۔ "یہ ہے میری خوشی کچھ بولنا نہیں، تم نے وعدہ کیا ہے۔" اور اٹھ کھڑا ہوا اور پکی سڑک کی طرف چل دیا۔ کسان خاموش کھڑا اس کو حیرت سے دیکھتا رہا۔

اختر آگرہ آ کر سرائے کے اندر جانے سے پہلے تانگے والے کو روزانہ کرایہ ادا کر دیا کرتا تھا۔ اس نے عادت کے مطابق جیب میں ہاتھ ڈالا تو اسے یاد آیا کہ سب روپے تو وہ کسان کو دے آیا ہے مگر اس کی جیب پھر بھی بھری ہوئی تھی۔ اس کی ضروریات کا خیال رکھا جا رہا تھا۔

دوسرے دن اس نے ٹرین پکڑی، رتلام چلا گیا۔ یہاں پر شاہی عمارتیں تو نہیں ہیں۔ یہ ریلوے کا بڑا جنکشن ہے۔ زیادہ بڑا شہر بھی نہیں، اس کے چاروں طرف پتھریلی زمین ہے۔ آبادی ملی جلی ہے۔

پیلے پتھر کی پہاڑیوں میں دن بھر سائیں سائیں کی آوازیں آتی ہیں۔ ہوا جب ان پہاڑی دروں سے گزرتی ہے تو آواز پیدا کرتی ہے۔ اختر کسی خاص ارادے سے نہیں آیا تھا۔ بس دل نے کہا اور وہ چل پڑا، وہاں سے کوٹہ بوندی آ گیا اور پھر اجین کی ایک سرائے میں رک گیا۔

اجین ایک تیرتھ ہے۔ ہندوؤں کا ایک فرقہ ہے، وہ جینی کہلاتا ہے، اس کے بانی کا نام مہاویر ہے۔ اجین میں مہاویر کا مکھڑ مندر ہے۔ ان کا ایک سالانہ بہت بڑا میلا بھی ہوتا ہے۔ ہندوستان بھر کے جینی فرقے کے لوگ یہاں آتے ہیں۔ اس فرقے کے سادھو ننگے رہتے ہیں۔ یہ پورے ہندوستان سے قافلوں کی شکل میں اجین آتے ہیں۔ ان کے پاس کاندھے پر صرف ایک پینگی رکھی ہوتی ہے۔ یہ ایک بانس ہوتا ہے۔ اس کے دونوں سروں پر ترازو کی طرح پلڑا ہوتا ہے۔ یہ تمام راستے مانگتے کھاتے اجین آتے ہیں۔ مندر کے باہر جو سڑک ہے، اس کے کنارے بڑے موٹے اور بہت بڑے پیٹ والے پنڈت تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ بالکل برہنہ ہوتے ہیں۔ عورتوں کو اولاد کی دعا دیتے ہیں اور دکھشنا لیتے ہیں۔ یہ پنڈت بے تحاشا کھاتے ہیں۔ لوگ ان کو شرط لگا کر مٹھائی کھلاتے ہیں اور یہ سب کو ہرا دیتے ہیں، نہ معلوم اتنی مٹھائی وہ کس طرح کھاتے ہیں۔

اجین کا میلا ختم ہو گیا تھا۔ قافلے واپس جا رہے تھے۔ دوکانیں بند ہو گئی تھیں۔ بڑی بڑی توند والے پنڈت بیل گاڑیوں میں چڑھائے جا رہے تھے۔ بیلوں کے گلے میں پڑی گھنٹیاں گونج رہی تھیں۔ مہاویر کے جے جے کار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اختر ایک جگہ کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے سے لوگ گزر رہے تھے۔ ایک ننگا سادھو پینگی کاندھے پر لئے اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ چند منٹ اس کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "آجا میرے ساتھ۔" اختر نے اس کو دیکھا اور جواب دیا۔

"تیرا میرا ساتھ کیسے ہو گا تو جا اپنا کام کر....."

"میں اپنا کام ہی کر رہا ہوں۔ میں تیری تلاش میں تو آیا ہوں۔" وہ بولا۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

"تو میلے میں آیا ہے، میلا ختم ہوا گھر جا۔" اختر نے جواب دیا۔

"تو ابھی بالک ہے، سب میلے میں نہیں آتے، ہر کوئی اپنے اپنے مطلب سے آتا ہے۔ آجا میرے ساتھ۔" وہ بولا۔

"تو کیوں مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے کچھ بتا تو.....؟" اختر نے پوچھا۔

"میرا کام صرف یہ ہے کہ تجھے گرو کے پاس پہنچا دوں۔" وہ بولا۔

"تیرا گورو کون ہے اور کہاں ہے؟" اختر نے پوچھا۔

"وہ کون ہے یہ تو وہی بتائے گا، کہاں ہے، اس کی تو فکر نہ کر، تجھے جانے میں کوئی کشٹ نہیں اٹھانا پڑے گا۔ ذرا اس بھیڑ سے تو نکل۔" سادھو بولا۔

"اور اگر میں تیرے ساتھ نہ جانا چاہوں پھر....." اختر نے پوچھا۔

"پھر بھی جانا تو ہوگا، لکھی کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔" وہ بولا۔

"تو میرے ساتھ زبردستی کرے گا۔" اختر نے پوچھا۔

"ہر بات یہاں کھڑے کھڑے مت پوچھ، کچھ باتیں بتانے کی نہیں ہوتیں۔" سادھو بولا۔

"میرے سوال کا یہ جواب نہیں ہے۔" اختر نے کہا۔

"نہیں مانے گا تو سن میں چاند کے نور نظر کے باپ کے ساتھ کوئی بے ادبی کیسے کروں گا۔" سادھو بولا۔

"تو بھی وہی ہے۔" اختر نے تعجب سے کہا۔

"ہاں تیری خاطر کرنا خدمت کرنا ہم پر فرض ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو چاند کا نور نظر ہم سے ناراض ہو جائے گا۔ پھر ہمارا ٹھکانا کہاں ہوگا۔ ہم نے صدیوں اس کے آنے کا انتظار کیا ہے۔" سادھو بولا۔

"ٹھیک ہے چل میں تیرے ساتھ چلتا ہوں۔"

اس کا یہ کہنا تھا کہ اس کو ایسا لگا جیسے وہ ہوا میں پرواز کر رہا ہو۔ وہ اڑتا ہوا چلا جا رہا ہو۔ کچھ دیر یہی کیفیت رہی۔ پھر اس کے پیر زمین پر ٹک گئے۔ اس کے سامنے سفید سفید پہاڑ تھے۔ ٹھنڈی ہوائیں تھیں اور دور دور کسی انسان کا وجود نظر نہیں آتا تھا۔ سادھو اس کے سامنے ننگا کھڑا تھا۔ اس کو سردی کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔ سادھو بولا۔ "وہ دیکھ سامنے جو غار نظر آتا ہے، یہی تیری منزل ہے۔ جا اندر جا، گرو تیرا انتظار کر رہا ہے۔"

اختر غار کی طرف چلا، غار کا دروازہ بہت کشادہ تھا۔ وہ اس کے اندر چلا گیا۔ باہر سے غار نظر آنے والا اندر سے کسی محل سے کم نہیں تھا۔ بہت اونچی چھت تھی۔ ایک بہت بڑا گول کمرہ تھا۔ اس گول کمرے کے اطراف میں کئی دروازے نظر آتے تھے۔ ان دروازوں پر بڑے خوبصورت نقش و نگار والے کواڑ لگے ہوئے تھے اور ہر دروازے پر بڑا شوخ رنگ کیا ہوا تھا۔ چھت میں بہت بڑا فانوس لٹک رہا تھا۔ درمیان میں سرخ رنگ کا قالین پڑا تھا، اس قالین پر گول تکیے رکھے تھے۔ ان تکیوں پر بڑے خوبصورت پھول کاڑھے ہوئے تھے۔ سرخ قالین پر پیلے تکیے بہت اچھے لگ رہے تھے۔ ابھی اس نے پوری طرح جائزہ بھی نہیں لیا تھا کہ ایک دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک حسین لڑکی باہر آ گئی۔

اس لڑکی کے لباس کا رنگ نیلا تھا اور جس کمرے سے وہ آئی تھی اس کے کواڑوں کا رنگ بھی نیلا تھا۔ وہ لہراتی چال سے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کا لباس صرف ایک چولی اور پاجامہ تھا۔ پاجامہ اس کے جسم پر چپک رہا تھا اور چولی ضرورت سے کم تھی۔ اس کے حسین ماتھے پر بڑی چمکدار بندیا چپکی ہوئی تھی۔ اختر نے دیکھتے ہی اندازہ کر لیا کہ یہ ضرور کوئی نئی چال ہے۔ اس نے لڑکی پر سے نگاہیں ہٹا لیں اور لڑکی سے کہا۔ "میں تجھ سے ملاقات کرنے نہیں آیا۔ پھر تو کیوں آئی ہے؟"

لڑکی نے اپنی کمر کو خم دیا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ آئی اور کہا۔

"میرا کام سواگت کرنا ہے۔ آرام پہنچانا ہے، مجھے اپنا کام کرنے دو۔" اس کی آواز بڑی مترنم تھی بالکل اپنی شکل کی طرح اور اس نے آگے بڑھ کر اختر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں

پکڑ لیا۔ لڑکی کا ہاتھ بہت ملائم تھا۔ اختر کو ایسا لگا جیسے ریشمی فلالین کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں آ گیا ہو۔

وہ اس کو لے کر اندر کی طرف چلی گئی۔ اس طرف کوئی بند دروازہ نہیں تھا۔ بلکہ دروازہ جتنی چوڑائی کی گلی تھی۔ یہ گلی بیس بائیس گز تو ضرور تھی۔ گلی ختم ہوئی اور ایک چوکور کمرہ نظر آیا۔ اس کے بھی چاروں طرف دروازے نظر آتے تھے۔ یہ ایک وسیع و عریض ڈرائنگ روم تھا۔ اس کی ہر شے سے امارت کی بو آتی تھی۔

دیواروں پر قد آدم تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ان تصویروں میں جمالیات کی تسکین کا تمام تر سامان موجود تھا۔ فرش پر دبیز قالین پڑا تھا۔ ایک بڑی گول میز قالین پر رکھی تھی۔ میز پر رنگ برنگے شیشے تھے اور بڑے بڑے گلدستے رکھے تھے۔ ان میں تازہ پھول موجود تھے مگر یہ پھول اختر نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ میز کے اطراف میں بڑے بڑے نہایت قدیم طرز کے صوفے رکھے تھے۔ لڑکی نے اختر کو ایک صوفے پر بٹھا دیا تو اس کو پتہ چلا کہ یہ صوفے صرف قدیم نظر آتے ہیں، بہت آرام دہ ہیں۔ ان پر بیٹھتے ہی آدمی کی تھکن اتر جاتی ہے۔ لڑکی نے اپنی مترنم آواز میں کہا۔ "گرو آتے ہیں۔" اور وہ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ اختر کی ذہنی کیفیت من و عن بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ وہ بہت بہادر اور نڈر آدمی تھا۔ برف پوش پہاڑ کے اس غار میں اس کو ذرا سا بھی سردی کا احساس نہ تھا جس کو غار کہا گیا تھا۔ وہ تو ایک محل تھا۔ وہ اندر سے خوف اور حیرت کا شکار تو تھا۔ انسان کوئی بھی ہو، ان باتوں سے بچ تو نہیں سکتا۔ بے شک وہ بڑے مضبوط اعصاب کا مالک تھا مگر جو واقعات اس کے سامنے آ رہے تھے، اس کی عقل کوئی توجیہہ نہیں کر پا رہی تھی۔

نہ معلوم میں دنیا کے کس خطے میں ہوں۔ میں ایک غار میں ہوں، یقین نہیں آتا۔ ایسا تو نہیں کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں، اس نے اپنی انگلی منہ میں ڈال کر زور سے دبائی تو اسے تکلیف کا احساس ہوا۔ اس کا ذہن کام کر رہا تھا، ہر بات اس کے ذہن میں آ رہی تھی، ہر تصور، ہر احساس اس کے ذہن میں تھا، اپنی ذہنی کیفیت کو بھی وہ سمجھ رہا تھا۔

مگر اس کے لئے یہ احساس بڑا اذیت ناک تھا کہ اس کا وجود ان کے سامنے معمول بنا ہوا تھا۔ ان کے حکم پر چلنا پڑ رہا تھا۔ کئی اندازے قائم کر چکا تھا مگر ان کا رویہ اس کی سوچوں کو بکھیر دیتا تھا۔ کہیں پر کسی مقام پر اس کے ساتھ کوئی ناز یبا بات اب تک نہیں ہوئی تھی۔ اس کو بالکل اس طرح رکھا جا رہا تھا جس طرح قربانی کے بکرے کو رکھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں جہاں خوف کی انتہا ہوتی ہے، وہیں سے دلیری کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس وقت انسان جو کرتا ہے، وہ دماغ کے زیر اثر نہیں کرتا بلکہ اعصاب کے زیر اثر کرتا ہے۔ میں بھی حیرتوں کی اس دنیا میں دماغ سے کچھ نہیں کر سکتا۔ اب تک جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے، اس کا جواب دماغ نہیں دیتا۔

اب اعصاب کے عمل کا وقت آ گیا ہے۔ میرا دماغ سے رجوع کرنا لاحاصل ہے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ شاید اس کا ارادہ باہر جانے کا تھا کہ اچانک سامنے کا گلابی دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک پری نما عورت باہر آ گئی۔ اس کے ماتھے پر چاند کی بندیا چمک رہی تھی۔ یہ بندیا نہ معلوم کس دھات کی تھی کہ ہر زاویئے سے اس کا رنگ بدل جاتا تھا۔ یہ ایک طویل قامت عورت تھی یا عورت نما لڑکی تھی۔ لمبا قد ہونے کے باوجود وہ بے ڈول نہیں لگتی تھی۔ اس کے اعضاء بڑے تناسب کے تھے۔ رنگ گلابی تھا اور بال بھورے تھے۔ وہ ایک سلیقے سے اس کی کمر پر پڑے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور کچھ ترچھی تھیں اور اس کے حسن میں اضافہ کر رہی تھیں۔

اس کا بھی لباس ایک چولی اور پائجامہ تھا مگر رتبے کے فرق کے لئے اس کا لباس زیادہ قیمتی لگتا تھا۔ وہ خراماں خراماں چلتی ہوئی اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ اختر بھی کھڑا تھا۔ وہ قد میں اختر کے برابر تھی۔

"بیٹھ جاؤ، کھڑے کیوں ہو۔" اس کے ہونٹ ہلے۔ بڑی سریلی آواز اختر کے کانوں میں آئی۔ اختر پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے وہ بھی بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھنے کا انداز اتنا دلکش رہا تھا کہ آدمی بہک جائے۔ اختر نے اس پر سے نظریں ہٹا لیں۔ زندگی میں اتنی حسین عورت اس

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ بھٹکنا نہیں چاہتا تھا۔ عورت کا حسن بڑے بڑے کو پاگل کر دیتا ہے۔ میں تو ایک کمزور سا انسان ہوں۔ مجھے خود پر کنٹرول کرنا ہے۔ اس عورت کا میرے پاس اس طرح آنا، کیا معنی رکھتا ہے۔ یہ تو مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ میرے ساتھ زیادتی نہیں کریں گے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بھٹکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شاید اس میں ہی ان کا فائدہ ہے۔

"تم بہت زیادہ سوچتے ہو، میری طرف دیکھو۔" وہ بولی۔

"میں نے دیکھ لیا ہے۔ پھر بار بار کیا دیکھوں۔ تم نے مجھے کیوں بلایا ہے، یہ بتاؤ۔" اختر نے کہا۔

"خدمت کرنے کو، تم کو آرام پہنچانے کو، تمہاری خدمت ہمارا دھرم ہے۔" وہ بولی۔

"اگر ایسا ہے تو میرا تم لوگ پیچھا نہ کرو، میں کسی محل میں آرام سے نہیں رہ سکتا۔ نہ تم جیسی حسین عورتیں مجھے آرام پہنچا سکتی ہیں۔ میری بیوی جو تم لوگوں کی نذر ہوگئی، میں اس کا آج بھی وفادار ہوں۔ میں تم کو صاف صاف لفظوں میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں عورت کا بھوکا، عیاش مرد نہیں ہوں۔ مجھ پر کچھ پابندیاں میرے مذہب نے لگائی ہیں۔ میں ان کو توڑ نہیں سکتا۔ تم ہزار روپ اختیار کر کے مجھے لبھاؤ، ناز نخرے دکھاؤ، میرا جواب بہت کڑوا ہوگا۔ یہ میری ضد نہیں ہے بلکہ پابندی ہے۔"

"تم مجھے انسان نظر نہیں آتے۔ ہر انسان حسن و جوانی سے متاثر ہوتا ہے۔ تم اس سے کس طرح پہلو بچا رہے ہو، بتاؤ تم کون ہو؟" وہ تعجب سے بولی۔

"میں انسان ہی ہوں۔ تم یہ بتاؤ، تم چاند کے نور نظر کا حکم کیوں مانتی ہو، کیوں اس کو خوش کرنے کو ہر جتن کرتی ہو، اس کی خوشی کی خاطر تم نے مجھے خوش کرنا چاہا ہے۔" اختر نے پوچھا۔

"صدیوں پہلے یہ کتابوں میں لکھا گیا تھا، وہ آئے گا جو کچھ لکھا گیا تھا، وہ ہوا، اس طرح وہ دنیا میں آیا ہے، جب وہ نہیں آیا تھا، جب بھی ہم اس کا حکم مانتے تھے، اب تو وہ آگیا ہے، تم اس کے لانے والے ہو۔ تمہارا ہم پر احسان ہے، ہم اس کی خاطر ہر قربانی دینے کو تیار ہیں۔ وہ ہمارا معبود ہے۔"

اختر زور سے ہنس پڑا اور پھر بولا۔ "تم لوگ صدیوں سے غلطی کر رہے ہو اور مسلسل کرتے جا رہے ہو۔ رب کائنات نے یہ دنیا بنائی ہے۔ یہ کتنی بڑی ہے، اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکا ہے۔ اس میں سیکڑوں سیارے گردش کر رہے ہیں، ہر سیارے کے چاند ہیں اور سورج ہیں۔ ایک کا دوسرے کے درمیان کروڑوں کا فاصلہ رکھا گیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کتنے سیاروں پر زندگی ہے اور اگر زندگی ہے تو وہ کس شکل کی ہے۔ ان کو ہوا پانی کی ضرورت ہے کہ نہیں۔ تم نے اس عظیم ذات کو چھوڑ کر اس کی بنائی ایک ادنیٰ سی چیز کو اپنا معبود بنا لیا۔ ذرا میری بات پر غور کرو جو معبود حقیقی ہے۔ اس کو تم نے چھوڑ دیا۔ ذرا اس کی کریمی اور رحم دلی پر غور کرو کہ وہ پھر بھی تم کو پال رہا ہے۔" اختر نے کہا۔

"تمہاری بات بے وزن نہیں ہے۔ میں تم کو اس کا جواب دے سکتی ہوں مگر نہیں دوں گی اور جواب نہ دینے کی وجہ بھی نہیں بتاؤں گی۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"میں تمہارے جواب کا طالب نہیں ہوں۔" اختر نے کہا۔

"تم نے اب تک گرو سے ملنے کا اشتیاق ظاہر نہیں کیا۔" وہ بولی۔

"وہ میرا گرو نہیں ہے، پھر مجھے اس سے ملنے کا اشتیاق کیوں ہوگا؟" اختر بولا۔

"اگر تم کو اشتیاق نہیں تو پھر ملنا بے کار ہے۔ اگر ملتے تو شاید کچھ رعایت تم کو مل جاتی۔" وہ بولی۔

"مجھے اس کی کسی رعایت کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا اشارہ اگر میری موت کی طرف ہے تو غور سے سن لو کہ میں ہر وقت موت کا سامنا کرنے کو تیار ہوں۔ رہی مدت ختم ہونے کی تو میں تم کو بتا دوں کہ میرے رب نے مجھے جتنی زندگی دی ہے، اس سے پہلے تم یا تمہارا گرو مجھے نہیں مار سکیں گے، میری جو عمر مقرر کر دی گئی ہے جہاں اور جس طرح مقرر

ہے، میں عمر پوری کر کے مروں گا، یہ میرا ایمان ہے، تم لاکھ شعبدے دکھاؤ، مجھ پر اس کا اثر نہیں ہوگا۔" اختر نے کہا۔

"میں مجبور ہوں، تم سے کچھ کہہ نہیں سکتی۔ میرے ہاتھ پیر اور زبان سب باندھے ہوئے ہیں۔ تم کہو، کہاں جانا چاہتے ہو، تمہاری مرضی کے مطابق تم آزاد ہو، ہم تمہاری راہ میں نہیں آئیں گے۔ جب وقت ہوگا تو تم سے ملیں گے۔ بارہ سالوں تک تمہارا خرچ جتنا تم چاہو، تم کو ملتا رہے گا۔" وہ خاموش ہوگئی اور اختر دروازے کی طرف چلا۔ دروازے پر سادھو بینگی لئے کھڑا تھا۔

کچھ ہی دیر میں اختر دلی کی شاہی مسجد کی سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا۔ آخری سیڑھی پر ایک عورت میلی سی چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔ اس نے اختر کو دیکھ کر صدا لگائی۔ "دے اللہ کے نام پر۔"

اختر نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور جو ہاتھ میں آیا، عورت کی جھولی میں ڈال دیا۔ اور آگے بڑھ گیا۔

عورت کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ "ٹھہر جا! یہ کیا دے رہا ہے، اپنی حلال کی کمائی دے، یہ میں نہیں لیتی، یہ تجھے ہی مبارک ہو۔" اختر نے عورت کو غور سے دیکھا اور تعجب سے بولا۔

"مائی تجھے کیا پتہ، یہ پیسے حلال ہیں کہ حرام تیرے لئے تو صرف پیسے ہیں۔"

"مجھے بتاتا ہے، ذرا سی عزت بھیک میں کیا مل گئی، اڑنے لگا، ارے وہ سب دھوکے کی رقم ہے۔ دھوکا ہے، فریب ہے، کیوں امداد پر زندہ ہے تیرے ہاتھ پیر ہیں، چلا کر اور حلال رزق پیٹ میں ڈال۔"

اختر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ شرم سے گردن جھکا کر فقیرنی کے سامنے کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ فقیرنی بولی۔ "اب جا اور رزق حلال پیدا کر۔ راستہ خود بنے گا....."

وہ گردن جھکا کر مسجد کے اندر چلا گیا۔ دو دن وہ مسجد کے گیٹ پر بھی نہیں آیا۔ کھانے کا وقت ہوتا تو اس کو کھانا مل جاتا، مسجد کے صحن میں جھاڑو لگاتا رہتا، وہ بہت سکون محسوس کر رہا تھا۔ دو دن کے بعد اس کے پاس ایک آدمی آیا اور بولا۔

"تمہارا نام اختر ہے۔"

"ہاں میرا یہی نام ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"ایک آدمی تم کو مسجد کی سیڑھیوں پر بلا رہا ہے، کہتا ہے کہ بہت ضروری کام ہے۔" وہ بولا۔

"اختر سیڑھیوں پر آگیا۔ اختر نے پہچان لیا، وہ وہی سادھو تھا۔ سادھو نے کہا۔ "تم تو اندر ہی رہ گئے، باہر کی دنیا دیکھو، مزے کرو۔"

"میں اندر سکون سے ہوں، تم جاؤ، اب نہ آنا۔" اختر نے جواب دیا۔

"ارے اس پاگل عورت کی باتوں میں آگئے، وہ تو سب سے ایسی ہی باتیں کرتی ہے۔" وہ بولا۔

"وہ تم سے زیادہ جانتی ہے، تم میرا پیچھا چھوڑ دو، میں تمہاری امداد بھی نہیں لوں گا اور اگر میری جیب میں ڈال جاؤ گے تو کنویں میں ڈال دوں گا۔ میں اب صرف اپنی کمائی سے حلال کی روٹی کھاؤں گا۔" اختر نے کہا۔

"نانا! اتنا غصہ ٹھیک نہیں ہے، تمہارا تو ہم پر حق ہے، تمہاری خدمت ہم پر فرض ہے۔ پھر اس میں حلال و حرام کہاں سے آگیا۔ میں تو حق دار کو اس کا حق پہنچاتا ہوں۔ محنت مزدوری تمہاری شان کے خلاف ہے، یہ کبھی نہ کرنا، کہو تو تمہارے لئے کوئی بڑھیا سا بنگلہ تیار کروا دوں۔" سادھو بولا۔

"اچھا اب جا زیادہ چاپلوسی کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تیری یا تیری کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔" اور اختر واپس مسجد کے دروازے کے اندر آگیا۔ اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔

فقیرنی کا جملہ اس کے دماغ میں ہر وقت گونجتا رہتا۔ "ہاتھ پیر چلا اور رزق حلال پیٹ میں ڈال۔"

وہ مسجد سے نکل آیا اور کھاری باؤلی کی طرف چلا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا مکان بن رہا تھا۔ مزدور کام کر رہے تھے۔ پہلی منزل تیار تھی۔ دوسری منزل پر چنائی ہو رہی تھی۔ اینٹیں اور مصالحہ اوپر پہنچایا جا رہا تھا۔ ایک آدمی کھڑا کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ وہ اس کے پاس چلا گیا اور بولا۔

"بھائی مجھے مزدوری مل سکتی ہے۔" اس آدمی نے سر

READING CORNER http://readingcornerpk.blogspot.com

سے پیر تک اس کو دیکھا اور بولا۔

"کام ذرا سخت ہے، کرلو گے؟" اختر نے جواب دیا۔ "پیٹ کی خاطر تو کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"چار اینٹیں ایک پھیرے میں اوپر پہنچانا ہیں۔ آٹھ آنے روز ملیں گے، بول کرے گا۔" وہ بولا۔

"کرلوں گا؟" اختر نے جواب دیا۔

"تو پھر ہو جا شروع، تجھے آج کی پوری مزدوری ملے گی۔" وہ بولا۔

اور اختر بھی دوڑ دوڑ کر اوپر اینٹیں پہنچانے لگا۔ شام کو اس کو آٹھ آنے مزدوری مل گئی۔ دو آنے روز پر ایک سرائے میں اس نے چارپائی حاصل کرلی اور عشاء کے وقت وہ مسجد چلا گیا۔ سب خرچ پورے کرنے کے بعد بھی اس کے پاس تین آنے بچے ہوئے تھے۔ آخری سیڑھی پر وہی فقیرنی گردن گھٹنوں میں دیئے بیٹھی تھی۔ وہ اس کے قریب چلا گیا اور اس کے ہاتھ پر وہ تین آنے رکھ دیئے۔ عورت نے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔

"آج تیری محنت کی خوشبو اس میں سے آرہی ہے۔ یہ بہت قیمتی رقم ہے۔" وہ بولی۔

"تین آنے ہی تو ہیں تم نے اس کو رقم بنا ڈالا۔" اختر نے کہا۔

"یہ تیرے ان نوٹوں سے بھاری ہے، ابھی تیری سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی۔" وہ بولی۔

"میں نے ایک چارپائی بھی کرائے پر لے لی ہے۔ اب میں شاید ادھر نہ آپاؤں۔" وہ بولا۔

"پورے شہر میں اور بھی مسجدیں ہیں۔ ہر مسجد میں خدا ملتا ہے، شرط تو یاد کرنے کی ہے۔" وہ بولی۔

"ہاں آپ کی بات درست ہے۔ آپ نے مجھے ایک راستہ بتایا ہے، آپ کا احسان ہے۔" وہ بولا۔

"نہیں یہ احسان نہیں ہے، فرض تھا۔"

ایک سال تک اختر مزدوری کرتا رہا۔ وہ شاہی مسجد بھی جاتا رہا۔ مگر وہ عورت اس کو پھر نہیں ملی، ایک سال کے بعد سادھو پھر اس کے سامنے آ گیا۔

"تو بڑا ضدی ہے۔ ارے کیوں پریشانیوں میں پڑا ہے، تیرے لئے محل تیار ہے، چل میرے ساتھ۔" وہ بولا۔

"ضدی میں نہیں ہوں، تو ہے، بار بار میرے پاس آجاتا ہے، مجھے تیری مدد نہیں چاہئے۔ مجھے کیوں بھٹکانے کی کوشش کرتا ہے۔" اختر نے جواب دیا۔

"ارے عقل کے دشمن، دنیا جس چیز کو ترستی ہے، میں وہ چیز تیرے قدموں میں ڈال رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"اور مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اختر نے کہا۔

"مایا انسان کی بینائی بڑھانے کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ اس کی ایک جھلک دیکھ کر انسان کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔ دل و دماغ دونوں کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

زندگی میں انسان بڑے حسین خواب دیکھتا ہے، ان حسین خوابوں کی تعبیر کے لئے انسان کو دولت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اسی دولت کے بل بوتے پر ایک کمزور آدمی بڑے سے بڑے قوی سے قوی حریف پر قابو پالیتا ہے۔ ذرا میری بات پر غور کر، دولت اس دنیا کی سب سے بڑی طاقت اور ضرورت ہے۔ تجھے اس کی قدر اس لئے نہیں ہو رہی کہ تیرے پاس یہ خود آرہی ہے۔" سادھو نے کہا۔

"تو نے پوری تعریف دولت کی نہیں کی۔ کیا دولت کی خاطر قتل نہیں ہوتے۔ کیا دولت کی خاطر عصمت فروشی نہیں ہوتی۔ دنیا کے جرائم صرف اس کی خاطر نہیں ہوتے۔ کیا اس کی خاطر انسان بھٹک کر شیطان نہیں بن جاتا اور وہ شیطان بن کر کون سے اچھے کام کرتا ہے۔ یہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔

یہی انسانوں میں فرق بنتی ہے۔ غریبی اور امیری پیدا کرتی ہے۔ فرق پیدا کرتی ہے۔ توازن بگاڑتی ہے۔ کسی کو اونچا اور کسی کو نیچے لے جاتی ہے۔ اگر یہ بہت اچھی چیز ہے تو اپنے پاس رکھ۔ مجھے کیوں دیتا ہے، میرے لئے تو آٹھ آنے بہت ہیں۔ اب جا اور اب پھر مجھے بھٹکانے نہ آنا۔" اختر نے غصے سے کہا۔

"آنا تو پڑے گا، تو نے بہت دنیا دیکھی ہے۔ بڑی

رعایت ملی ہے تجھے..... اب شاید گرو تیرے لئے کچھ اور سوچے گا۔ میں پھر کہتا ہوں، کرلے وچار ایک دفعہ اور پھر شاید تیرے پاس وچار کرنے کو وقت نہ ہو، ہم تو آخری وقت تک موقعہ دے رہے ہیں۔ اس کا کارن یہ ہے کہ تو چاند کے نور نظر کا باپ ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تیرے پاس وقت کم ہے۔ اس کم وقت میں تیرے آرام کا خیال رکھنا ضروری ہے مگر لگتا ہے کہ یہ آرام بھی تیرے نصیب میں نہیں ہے۔"

"تو نصیبوں کا مالک نہیں ہے تو نے میرے متعلق جو اندازے لگائے ہیں، وہ سب غلط ہیں۔"

تین دن نہیں گزرے تھے کہ وہ سیڑھیوں پر گر گیا۔ اس پر ایک عجیب قسم کا دورہ پڑ گیا۔ آواز بند ہو گئی اور ہاتھ پیر اکڑ کر لکڑی ہو گئے۔ دوسرے مزدوروں نے اس کو سرائے پہنچا دیا۔

سرائے کا مالک شریف آدمی تھا اور اس کی ایمانداری اور صاف لین دین سے متاثر تھا۔ اس کو اس کی چارپائی پر لٹا دیا۔ شام تک وہ پڑا رہا۔ سورج غروب ہوا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے جسم کی تمام تکلیفیں ختم ہو گئیں۔ اس نے سرائے کے مالک کو آواز دینا چاہی تو آواز نہ نکلی، اس کے کانوں نے بھی کسی آواز کو سننے سے انکار کر دیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سرائے کے مالک کے پاس چلا گیا۔ سرائے کے مالک نے اس کو بھلا چنگا دیکھا تو حیرت سے بولا۔

"ارے واہ اختر میاں! دن میں تو تمہاری حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اب تو ماشاءاللہ! تم ٹھیک لگ رہے ہو۔"

اختر نے اس کا ایک لفظ بھی نہیں سنا اور اشاروں سے بتایا کہ وہ بول نہیں سکتا ہے، نہ سن سکتا ہے۔ سرائے کے مالک کی جب سمجھ میں اس کی بات آئی تو وہ حیرت میں پڑ گیا۔

دوسرے دن سورج نکلتے ہی اختر پر وہی دورہ پڑا اور تکلیف سے ہاتھ پیر مارنے لگا اور سارے دن اس کی یہی کیفیت رہی۔ شام ہونے پر وہ پھر ٹھیک ہو گیا۔ مگر زبان اور کان بند ہی رہے۔

سرائے کا مالک نیک آدمی تھا۔ اختر اپنی روزانہ کی مزدوری اس کے پاس جمع کرا دیا کرتا تھا۔ اس نے اختر کی بیماری کا علاج کرانا چاہا مگر اختر کی بیماری عجیب نوعیت کی تھی۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

دن میں بیماری اپنے عروج پر ہوتی اور رات کو اس کا نام و نشان نہیں ہوتا تھا۔ زبان اور کان ہر چیز اپنی جگہ ٹھیک مگر آواز بند۔ کسی معالج کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ معاملہ کیا ہے؟

اور پھر وہ میرے مطب میں آ گیا۔ اس کو رستم خان نامی آدمی لایا تھا۔ اس نے بتایا کہ میں ایک سرائے کھاری باولی میں چلاتا ہوں۔ یہ آدمی سال سے میرے پاس رہتا ہے۔ نہایت محنتی اور ایماندار آدمی ہے۔ لین دین کا بھی کھرا ہے۔ اس کی کچھ رقم میرے پاس پڑی ہے۔ اگر کچھ کمی بیشی ہوئی تو میں ادا کردوں گا۔ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ وہ مجھے بتا رہا تھا اور مریض تڑپ رہا تھا۔ اس کی تکلیف میری بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میری زندگی کا یہ انوکھا کیس تھا۔ مریض کی تکلیف کی نوعیت پتہ نہیں چل رہی تھی۔

جسم کے کس حصے میں تکلیف تھی۔ اس کا اندازہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ ہاتھ پیر لکڑی ہو رہے تھے۔ چہرہ لال بھبوکا تھا۔ آنکھیں اوپر چڑھی ہوئی تھیں مگر منہ سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی اور منہ کے اندر پانی تک نہیں جا رہا تھا۔ مجھے اس وقت رولو کا یاد کرنا ضروری تھا۔ کچھ ہی دیر میں رولو کا آ گیا۔

میں مریض کے سرہانے کھڑا تھا۔ رولو کا بھی میرے قریب کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

"معاملہ بہت بگڑا ہوا لگتا ہے۔"

"میری تو سمجھ میں اس کی تکلیف نہیں آئی، کچھ تم ہی بتاؤ۔"

"میں کچھ کرتا ہوں۔" وہ خاموش کھڑا اس کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"سورج غروب ہو گا تو ٹھیک ہو گا۔"

"سورج سے اس کی بیماری کا کچھ تعلق ہے۔" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہ کچھ ضرور ہے۔ ابھی پوری بات بتا نہیں

READING CORNER
http://readingscornerblogspot.com/

سکتا۔ سورج غروب ہونے کا انتظار کرنا ہوگا۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔" میں نے کہا۔

رولوکا نے اس کے بعد کوئی بات نہیں کی۔ وہ خاموش اس کے سرہانے کھڑا ہوگیا اور کچھ اشارے اپنے اطراف میں کرتا رہا۔ سورج غروب ہوتے ہی مریض ساکن ہوگیا اور اس نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رولوکا اس کے بیٹھتے ہی زور سے بولا۔

"باہر مت جانا، مارا جائے گا۔" میں نے حیرت سے کہا۔ "کون جارہا ہے باہر؟"

"وہی جو اندر کارروائی کررہا تھا۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"کہاں ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"وہ سامنے کھڑا ہے؟" رولوکا نے جواب دیا۔ "مگر مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔"

"تو جو بھی ہے سامنے آجا، کیونکہ کسی بھی روپ میں تو باہر تو جا نہیں سکتا۔" رولوکا نے کہا۔

اور پھر میں نے دیکھا کہ ایک سادھو میرے سامنے کھڑا تھا۔ مریض نے اس کو دیکھا تو چونک پڑا مگر آواز نہ نکلی، اس کا مطلب تھا کہ مریض اس کو جانتا تھا۔

"تو کون ہے اور اس کو کیوں تکلیف پہنچا رہا ہے۔" رولوکا نے پوچھا۔

"اس کو چھوڑ، تو کون سورما ہے کہ میرے کام میں دخل دے رہا ہے۔" وہ بولا۔

"یہ میرا مریض ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک انسان ہے۔ میں اسی ناطے اس کی مدد کررہا ہوں۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دے، اس کی جو سزا مقرر ہے، وہ بھوگنا ہوگی، کوئی اس سزا سے اس کو بچا نہیں سکتا۔" سادھو بولا۔

"اور تجھے میرے ہاتھ سے کوئی نہیں بچا سکتا۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"تجھے اندازہ نہیں ہے، میں کون ہوں۔" سادھو بولا۔

"تجھے بڑی خوش فہمی ہے، تو نہیں جانتا، اس دنیا میں کیا کیا طلسمات بھرے پڑے ہیں۔ ہر کوئی خود کو بڑی توپ چیز سمجھتا ہے۔ تو بھی سمجھ رہا ہے، تو نے اب تک اس کے جسم میں رہ کر خوب دکھ دیئے ہیں مگر اب تو ایسا نہیں کرسکے گا۔ دوسرے تو میری مرضی کے بغیر جا بھی نہیں سکے گا۔ اگر یقین نہیں ہے تو کوشش کرلے۔" رولوکا نے کہا۔

"میری شکتی چاند دیوتا کی شکتی ہے۔" وہ غرور سے بولا۔

"چاند کی شکتی چاندنی راتوں میں کام کرتی ہے۔ اندھیری راتوں میں تم مردہ مینڈک کی طرح ہو، میں سمجھ گیا، اب دیکھ یہ مریض تیرے سامنے بات کرے گا، تیرا گرو اور تو دیکھے گا، کچھ نہیں کرسکے گا، اس لئے کہ چاند رات ابھی دور ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"یہ مر کر بھی نہیں بول سکتا، اس کی زبان اور کانوں پر گرو نے مہر لگادی ہے۔" وہ بولا۔

رولوکا مریض کے سرہانے گیا اور اس کے بال دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ میں نے تعجب سے دیکھا کہ مریض کے کچھ بال اکھڑ کر رولوکا کے ہاتھ میں آگئے اور وہ درد سے چیخ پڑا مگر پھر اپنی آواز سن کر حیرت سے بولا۔ "میری آواز آگئی، میں بول سکتا ہوں، سن بھی رہا ہوں۔"

رولوکا نے سادھو کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "تم اس کو جانتے ہو؟"

اختر نے جواب دیا۔ "خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"ماجرہ کیا ہے، مجھے بتاؤ۔" رولوکا نے پوچھا۔

اور اختر نے اپنی کہانی شروع سے بیان کرنا شروع کردی۔ بات بڑی لمبی تھی مگر میں نے اور رولوکا نے بڑے دھیان سے سنی، سننے کے بعد رولوکا نے سادھو سے پوچھا۔

"اب بول یہ کہانی درست ہے، جھوٹ بولے گا تو پکڑا جائے گا۔ سچ بتا اس نے جو کچھ کہا، وہ کچھ ہوا ہے۔"

سادھو نے جواب دیا۔ "ہاں وہی ہوا ہے۔"

"تم نے اس کی اولاد کو چاند کا بیٹا بتا کر ہتھیا لیا۔ اس کی بیوی کو مار دیا۔ تمہاری ضعیف الاعتقادی نے اس کی

زندگی کو جہنم بنادیا۔ تم موت کے وقت مقرر کرنے لگے۔ تم دنیا کے مالک بن گئے۔" رولوکا غصے سے بولا۔

"تو ہمارے درمیان نہ آ۔ ارے آدم زاد! تجھے پتہ نہیں کہ میں کس قوم سے ہوں۔ ہم برف پوش پہاڑوں اور جنگلات کے باسی ہیں۔ ہم آدم زاد سے دور رہتے ہیں۔ ہمارے معمولات بہت الگ ہیں۔ ہماری طاقت سب سے الگ ہے۔" سادھو بولا۔

"پھر بھی تم کو آدم زاد کے بیٹے کی ضرورت ہے۔ وہی تمہارا حاکم بنے گا۔ تم اس کے آگے سر جھکاؤ گے، تم تو بڑے طاقتور ہو۔ پھر آدم کے بیٹے کے آگے سر کیوں جھکاؤ گے، تمہارے سب سے بڑے گرو نے بھی نے تو سر نہیں جھکایا تھا، تم کیوں جھکاتے ہو، بولو۔"

"ہمارے قبیلے کی یہ ہزاروں سال پرانی رسم ہے۔ ہماری قدیم کتابوں میں جو لکھا تھا وہ بچہ عین اسی ساعت میں پیدا ہوا۔ اس کے وہی سب آثار تھے جو لکھا تھا۔ ہر نشانی اس میں پائی گئی۔ اب آخری نشانی رہ گئی ہے کہ وہ بارہ سال کا ہوگا تو اس وقت اس کا باپ مرجائے گا۔

یہ آدمی اس کا باپ ہے۔ ہم نے بارہ سال اس کو دیکھنا ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد ہی وہ ہمارا دیوتا بنے گا۔ ہم نے اس کو عیش سے رکھنا چاہا مگر یہ اپنی چلانے لگا۔ اس نے ہماری نہ مانی تو سختی کرنا پڑی۔ ہمارا مقصد اس کو مارنا نہیں تھا، اس کو بارہ سال پورے ہونے پر قدرتی موت مرنا ہے۔ اگر یہ نہ مرا تو وہ بچہ چاند دیوتا نہیں بنے گا اور ہمارا پھر نئے دیوتا کے لئے انتظار شروع ہوجائے گا۔ پتہ نہیں، کتنے ہزار سال یہ انتظار کرنا پڑے۔" سادھو نے کہا۔

"تم پھر بھی آدم زاد سے نفرت کرتے ہو۔" رولوکا نے کہا۔

"نفرت کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہمارا دیوتا آدم زاد کو بنایا گیا ہے۔ قدیم سے قدیم لکھے کو مٹایا بھی نہیں جاسکتا۔" سادھو نے کہا۔

"تم نے آدم زاد کی طاقت دیکھی، تم نے یا تمہارے گرو نے مہر لگائی اور میں نے اس مہر کو توڑ دیا۔ تم میرے پاس قید ہو، اس کمرے میں اور اس کی بابت کسی کو پتہ نہیں ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"یہ تمہارا خیال ہے۔ وہ سب جانتا ہے کہ وہ کروڑوں من برف کے اندر بھی ہماری پوری خبر رکھتا ہے۔ وہ سب دیکھ رہا ہے۔ سن رہا ہے۔ تمہاری بندش اور پہرے مجھے روک نہیں سکیں گے۔" سادھو بولا۔

"کچھ باتیں عمر اور تجربہ نہیں سکھاتا، اس کے لئے محنت درکار ہوتی ہے۔ تو اپنی عمر کے تجربے کا رعب مجھ پر مت ڈال۔ اپنے پر غور کر تو اپنی اوقات سے تجاوز نہیں کررہا ہے۔" رولوکا سنجیدگی سے بولا۔

"تو یہ بات اس لئے کررہا ہے کہ تو نے مجھے روک لیا ہے مگر یہ کامیابی صرف وقتی ہے۔ تو مجھے زیادہ دیر تک نہیں روک سکتا۔" سادھو نے چاروں طرف نگاہیں گھما کر کہا۔

"دیکھ لے اچھی طرح دیکھ لے، کوئی سوراخ تلاش

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

کرلے بھاگنے کو۔" رولوکا نے کہا۔

"تو غلط سوچ رہا ہے، اے آدم زاد، تجھے نہیں پتہ کہ طاغوتی طاقتیں کیا کر سکتی ہیں۔" سادھو بولا۔

"مجھے ناپنے کی کوشش مت کر، میرا ارادہ تجھے باندھنے کا نہیں تھا مگر تو نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں بتاؤں تجھے کہ انسان کیا چیز ہے۔" پھر رولوکا نے ایک اشارہ کیا۔ اس کے سامنے پنجرہ آ گیا۔ نہ معلوم کہ یہ کس دھات کا تھا کہ اس کی ہر تیلی چمک رہی تھی۔ اس کا ایک دروازہ بھی تھا۔ پنجرہ دیکھ کر سادھو پریشان ہو گیا۔

رولوکا نے کہا۔ "تیرا تجربہ اور طاقت صرف اتنی ہے کہ اس پنجرے میں داخل ہو جائے اس کے بعد تو سمندر کی تہہ میں چلا جائے گا۔ تیرا گرو اگر دیکھ رہا ہے تو تجھے بچائے تیری موت کا ذمہ دار میں نہیں، تیری حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خود اعتمادی تیری موت کا سبب بنی ہے۔" اور رولوکا نے پنجرے کا دروازہ کھول کر سادھو کو اس کے اندر کر دیا۔ سب نے حیرت سے دیکھا کہ چھ فٹ کا آدمی بڑی آسانی سے اس پنجرے میں سما گیا اور پھر پنجرہ ہوا میں اڑتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"اس کو کہاں روانہ کر دیا۔" میں نے پوچھا۔

"اس کو سمندر کے سب سے زیادہ گہرے حصے میں دفن کیا جائے گا۔ یہ دنیا کے لئے بہت بڑا فتنہ بننے والا تھا۔" رولوکا بولا۔ "اور یہ اختر میاں کا کیا بنے گا؟" میں نے پوچھا۔

"ان کو بیرونی خطروں سے بارہ سال بچانا ہوگا۔ جب بارہ سال گزر جائیں گے تو پھر اس کے بچے کی تلاش کرنا ہوگی۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"یہ تو بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے والی بات ہوئی۔" میں نے کہا۔

"بات آپ کی درست ہے مگر یہ کرنا ہوگا۔ بارہ سال تک گرو اپنے چیلے کو تلاش کرے گا اور اختر پر نظر رکھے گا۔ وہ اختر کی موت کا انتظار ضرور کرے گا۔ اس کام سے زیادہ ضروری کوئی کام نہیں ہے۔ وہ میری طرف دھیان بارہ سال کے بعد کرے گا۔ اس کا ایک بازو ٹوٹ گیا ہے۔ بارہ سال میں، میں اس کا ایک بازو اور بیکار کرنے کی کوشش کروں گا۔ دشمن پر اس وقت وار کاری پڑتا ہے جب وہ بے خبر ہو۔ مجھے پتہ ہے اب تک اس کو سمجھ میں کھیل نہیں آیا ہے۔ کیونکہ سادھو کی طاقت پر اس کو بہت بھروسہ تھا اور سادھو بھی اسی گھمنڈ میں پھنس گیا تھا۔ میں آپ کو بتاؤں کہ یہ جنات کا وہ گروہ ہے جو چاند کی پوجا کرتے ہیں۔

یہ پہاڑوں اور گھنے جنگلات میں رہتے ہیں۔ ان پر سردی اور گرمی دونوں اثر نہیں کرتیں۔ یہ لوگ انسانوں سے سخت نفرت کرتے ہیں مگر مجھے یہ نئی بات پتہ چلی کہ یہ کسی انسان کو ہی چاند کا بیٹا بنا کر اس کو دیوتا سمجھ کر پوجتے ہیں۔ یہ ایک عجب گورکھ دھندہ ہے۔ شیطان نے آدم کو سجدہ نہیں کیا۔ اس کو افضل نہیں مانا، پھر ان میں سے ہی ایک قبیلہ کیوں ایسا کر رہا ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"بات تو غور طلب ہے....." میں نے کہا۔

"یہ دنیا ہے حکیم صاحب ..... یہاں پر بڑے نرالے کھیل تماشے ہوتے ہیں، ابھی اور نہ جانے کتنے کھیل ہیں جو ہم نے اب تک نہیں دیکھے۔" رولوکا بولا۔

"اختر کو کہاں رکھا جائے۔" میں نے پوچھا۔

"آپ کا دواخانہ بہت بڑا ہے۔ کہیں پر رکھ لیں۔ یہ یہاں پر محفوظ رہے گا۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"کیوں اختر! یہاں رہیں گے۔" میں نے اختر سے پوچھا۔

"میں تو آپ کا غلام ہوں۔ آپ نے مجھے نئی زندگی دی ہے جو حکم ہوگا، بجا لاؤں گا۔" اختر نے جواب دیا۔

دوسرے روز رولوکا نے کہا۔ "حکیم صاحب! میں نے یہاں پر اختر کی حفاظت کا پورا انتظام کر دیا ہے۔ میں کچھ عرصہ یہاں نہیں رہوں گا۔ ویسے ابھی اختر کی زندگی کو کوئی خطرہ بھی نہیں ہوگا۔ وہ لوگ صرف سادھو کو تلاش کریں گے۔" رولوکا کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔ "تم کہاں رہو گے۔"

"میرا سفر بہت لمبا ہے مگر میں آپ سے رابطہ کرتا رہوں گا۔ ابھی کچھ بتانے کو میرے پاس نہیں۔ جنگ

سے پہلے ضروری ہے کہ اپنے دشمن کی طاقت کا اندازہ کر لیا جائے اور اپنی کمزوریوں کو دور کر لیا جائے۔" رولوکا نے کہا۔

"تم جو کچھ کرو گے وہ ٹھیک ہی ہوگا۔" میں نے جواب دیا۔

اور رولوکا روانہ ہو گیا اور مسلسل ایک سال وہ دلی سے دور رہا مگر ہر دوسرے دن اس نے میرے دماغ میں اپنی خیریت بتائی۔ اختر دواخانے میں کام کرتا رہا۔ اس کو دلی سے باہر جانے پر پابندی سی۔ ایک سال کے بعد اچانک رولوکا آ گیا۔ تو میں نے تفصیل پوچھی۔

"میرا ایک بہت پرانا دوست ہے، وہ ملاگاسی ہے۔ یہ ایک نیم وحشی قبیلہ کا فرد ہے۔ اس قبیلے کے لوگ بہت ہی عجیب و غریب ہیں۔ یہ نیم وحشی اور نیم پولی نیشی ہیں۔ بہت صدیاں گزریں۔ ان لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے ملایا اور لنکا کے راستے سے سفر کیا تھا اور جنوبی سمندروں کے علاقے میں اپنا وطن مشرقی افریقہ کے ساحل پر جا بسے تھے۔ یہ بات یوں تو ناقابل یقین سی لگتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں نے اپنی خود ساختہ کمزور کشتیوں پر پندرہ ہزار میل کا فاصلہ کھلے سمندر میں کیا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ مڈغا سکر میں آباد ہو گئے تھے۔ وہاں پر انہوں نے قدیم باشندوں سے راہ و رسم بڑھائی اور ان سے شادیاں کر لیں۔ اس طرح ایک نئی نسل تیار ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے اکثر لوگوں میں دونوں نسل کی بدترین خصوصیات پیدا ہو گئیں۔ مڈغاسکر قدیم زمانے میں جادو کا گھر رہا ہے۔ میرا دوست اسی بدترین نسل کا ایک نمائندہ ہے۔ میں اس کو دوست صرف اس لئے کہتا ہوں کہ یہ میرے خلاف کبھی کچھ نہیں کرتا اور کہیں کہیں یہ میری راہ نمائی کر دیتا ہے۔"

"تم اختر والے معاملے میں اس کے پاس گئے تھے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں سادھو ایک بہت بڑا ساحر تھا۔ میں نے اندازہ یہ لگایا ہے کہ اس کا گرو بھی یہی ہوگا۔ ایک تو جنات کی فطرتی طاقت اوپر سے جادوگر تو مقابلہ آسان نہیں ہوگا۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"اگر جنات کا یہ گروہ ان توہمات پر یقین کرتا ہے اور جادوگری بھی کرتا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ یہ کافر جن ہیں۔" میں نے کہا تو رولوکا نے جواب دیا۔

"آپ کا خیال درست ہے۔ جس طرح انسانوں میں بھانت بھانت کے عقیدے موجود ہیں۔ اسی طرح ان میں بھی ہیں۔ انسانوں میں جس طرح نیک اور ہمدرد انسان ہیں، اسی طرح ان میں بھی ہیں۔ ہم سب کو خراب نہیں کہہ سکتے۔ یہ بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ ان کا بھی ایک طرز زندگی اور مخصوص غذا ہے۔ بلاوجہ یہ ہم سے متصادم نہیں ہیں۔"

رولوکا بار بار جاتا رہا۔ واپس آتا رہا۔ اس طرح دس سال گزر گئے۔ ان دس سالوں میں اختر کے ساتھ کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ اختر نے دلی میں شادی کر لی تھی۔ وہ کام مطب میں کرتا تھا اور رہتا الگ مکان میں تھا۔

میرے بچے اب جوان ہو گئے۔ وہ دونوں بھی مطب میں بیٹھا کرتے تھے۔ رولوکا کو وہ چچا کہتے تھے۔

رولوکا کون تھا، کیا تھا، وہ صرف میں جانتا تھا اور پھر دو سال اور گزر گئے۔ اختر کو رولوکا نے روک لیا تھا۔ وہ رولوکا کے پاس ہی رہتا تھا۔ اختر جانتا تھا کہ اس کو کیوں روکا جا رہا ہے۔

اور اختر ٹھیک رہا، پورے سال گزرنے کے بعد بھی ایک سال اوپر ہو گیا۔ اصل خطرہ اب شروع ہوا۔ یہ مطب تھا یہاں پر نئے نئے لوگ آتے جاتے تھے۔ اختر وہیں موجود تھا اور پھر ایک دن ایک بہت بوڑھا آدمی آ کر اختر کا پوچھنے لگا۔ اختر کی بجائے رولوکا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تو وہ بولا۔

"مجھے اختر سے ملنا ہے، تم کون ہو؟" وہ بولا۔

"میں اختر ہوں۔" رولوکا نے جواب دیا۔

بوڑھے نے غور سے رولوکا کو دیکھا اور غصے سے بولا۔ "مجھے اندھا سمجھتے ہو، اختر کو بلاؤ۔"

"اگر آنکھ والے ہو تو پہچان لو کہ میں کون ہوں؟" رولوکا نے جواب دیا۔

"تو ہی دیوار لگتا ہے، میری آنکھوں پر پردہ ڈال رہا ہے، اختر تو مر گیا ہے۔" وہ بولا۔

http://readingcorner.blogspot.com/

''تم زندہ اختر کی تلاش میں آئے ہو یا مردہ کی تلاش ہے۔ اگر مردہ کی تلاش ہے تو پھر تم ناامید ہو جاؤ لیکن اختر زندہ ہے اور اسی چھت کے نیچے موجود ہے۔ دیکھنا چاہتے ہو تو حاضر کردوں مگر ایک بات یاد رکھنا، یہ تمہاری برف پوش پہاڑی نہیں ہے۔ یہ دلی شہر ہے، اس شہر میں ہزاروں نیک لوگ زندہ ہیں اور مدفن بھی ہیں۔ کسی شعبدے کو دکھانے کی کوشش نہ کرنا، تمہاری قدیم پوتھیوں میں جو لکھا ہے، اس پر اختر کا بچہ پورا نہیں اترا ہے۔ اب وہ تمہارے لئے بے کار ہے۔ وہ چاند کا بیٹا نہیں ہے۔ اس لئے اختر کو اس کا بیٹا واپس کردو، ہمارا تمہارا کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔''

''تم اختر کو پیش کرو تو میں فیصلہ کروں گا۔'' وہ بولا۔

رولوکا نے اختر کو آواز دی تو میں بھی اس کے ساتھ ہی آگیا۔ بوڑھے نے سرسری نظروں سے دیکھ کر اختر پر نظریں گاڑ دیں۔ دس پندرہ منٹ تک وہ تکتا رہا۔ پھر وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کو سخت صدمہ ہوا ہے۔ پھر بڑی دردناک آواز اس کے منہ سے نکلی۔ ''آہ! پھر انتظار، کتنے ہزار سال انتظار کروں؟ کیا میری زندگی صرف انتظار کی نظر ہو جائے گی؟'' وہ تھکے تھکے انداز میں کھڑا ہو گیا اور کمزور آواز میں بولا۔

''تم جیت گئے آدم زاد، میں پھر ہار گیا۔ بچہ تم کو مل جائے گا مگر اس بچے کو دھیان سے رکھنا، وہ ہمارا بھی لاڈلا رہا ہے۔ ہم نے بھی اس سے پیار کیا ہے۔'' اور پھر ناامیدی کی تصویر بنا، دروازے سے باہر چلا گیا۔ اختر خوشی سے رولوکا سے لپٹ گیا۔

رولوکا نے اس کا کاندھا پکڑ کر اس کو الگ کیا اور کہا۔

''تم خوش نصیب ہو کہ یہ معاملہ اتنی آسانی سے ختم ہوا، میرا خیال تھا کہ اس دفعہ معرکہ بڑا سخت ہوگا۔ مگر خیر! اس بہانے میں نے اپنے کچھ پرانے سبق یاد کر لئے۔''

دوسرے دن ایک آدمی ایک بارہ سالہ بچے کو لے کر آگیا۔ بچہ بڑا خوبصورت تھا۔ اختر کے چہرے کے نقوش اس سے ملتے تھے۔ اختر نے فوراً پہچان لیا کہ وہ اسی کا بچہ ہے۔

☆......☆......☆

ہر زمانے میں انسان موت سے ڈرتا آیا ہے۔ اس نے موت پر قابو پانے کا ہر جتن کر لیا مگر موت سے نہ بچ سکا۔ دنیا میں بڑے قابل لوگ پیدا ہوئے اور پھر پیوست زمین ہو گئے۔ دنیا کے لئے وہ بے وقت مرے لیکن خالق کائنات نے جو وقت مقرر کر دیا تھا، وہی درست تھا۔ کیونکہ اس کے بعد کے حالات نے یہ ثابت کیا کہ ان کا مرنا ٹھیک تھا۔ موت پر قابو پانے کے لئے ماضی میں مصریوں نے بہت کام کیا ہے۔ کیونکہ مصر کے فرعون فنا ہونے سے بہت ڈرتے تھے ان کے ذہن میں یہ بات تھی کہ انسان مرنے کے بعد بھی اس وقت تک زندہ رہتا ہے، جب تک اس کا جسم رہتا ہے اور روح دنیا میں اس کے اردگرد رہتی ہے اور وہ روح پلٹ کر کسی بھی وقت جسم کی طرف آسکتی ہے۔ اگر جسم باقی ہے تو، اگر جسم فنا ہو گیا تو روح نہیں آئے گی۔ کیونکہ روح کا لباس جسم ہے۔ اسی فارمولے کو سامنے رکھ کر فرعونوں نے مرنے کے بعد اپنے جسموں کی ممیاں بنوائی تھیں اور ہراموں کے اندر دفن ہونے سے پہلے ضرورت کی ہر چیز ساتھ رکھوائی تھی۔ ان کے خیال میں انہوں نے اس طرح موت پر قابو پالیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح روح کو جسم کا تابعدار بنایا جاسکتا ہے۔ روح جسم چھوڑنے کے بعد بھی دوبارہ اسی جسم میں آئے۔ اس لئے جسم کو باقی رکھنا ضروری ہے۔ مگر وقت نے ثابت کر دیا کہ ان کا نظریہ غلط تھا۔ ہزاروں سال گزرنے پر بھی فرعون کی کسی ممی میں جان نہ پڑ سکی۔ رب کائنات کے کچھ راز ہیں، جن تک انسانی عقل کی رسائی نہیں ہو سکتی ہے۔ کچھ مقامات پر آگے جانے سے روکا بھی گیا ہے۔ مگر انسان ضدی ہے۔ اس کو جس کام سے روکا جائے، وہ اس کی طرف زیادہ رجوع ہوتا ہے اور کبھی کبھی اسی ضد کی وجہ سے بہت زیادہ خسارے میں چلا جاتا ہے۔ واپسی کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔

انسان پر ماحول کے اثرات بہت گہرے پڑتے ہیں۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ ایک کورا کاغذ ہوتا ہے۔ وہ جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے، اس کے اثرات اس کے دماغ میں بیٹھنا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ دیکھتا ہے، ماں صبح سویرے

اٹھتی ہے، باپ کو اٹھاتی ہے، دونوں اگر مسلمان ہیں تو نماز کی تیاری کرتے ہیں۔ کس طرح کرتے ہیں، بچہ دیکھتا ہے، یہ سب اس کے دماغ میں فیڈ ہوتا رہتا ہے۔ ہندو ہیں تو کس طرح تیاری کرتے ہیں، بھگوان کو یاد کرنے کا کیا طریقہ کرتے ہیں۔ بچہ نہ مسلمان ہے، نہ ہندو ہے، وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے، وہ بن رہا ہے۔ بڑا ہو کر وہ خود بخود مسلمان بن جاتا ہے اور ہندو بھی بن جاتا ہے۔ جو ماحول اس نے اپنے بچپن میں دیکھا ہوتا ہے، اس کو وہ پوری زندگی یاد رکھتا ہے، کبھی نہیں بھولتا۔ یہ بات دوسری ہے کہ عقل و شعور کی بیداری کے بعد وہ اپنے بارے میں فیصلہ کرے کہ اس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی، وہ غلط تھا یا صحیح تھا۔

رتنا گری بنگال کا ایک بہت مشہور ساحر گزرا ہے۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ پورے بنگال میں موجود رہتا تھا۔ جہاں کسی نے یاد کیا اور وہ وہیں پہنچ گیا۔ وہ بہت بے حس اور ظالم آدمی تھا۔ معافی اور درگزر کو وہ نہیں جانتا تھا۔ اس کی سزائیں بھی بڑی بھیانک ہوتی تھیں۔

اس کا نام سننا بھی لوگ پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کی ظالمانہ کارروائیاں جب حد سے زیادہ بڑھ گئیں تو ایک مرد خدا درویش بنگال میں وارد ہوا اور اس کا ٹکراؤ، رتنا گری سے ہو گیا۔

''تو نے اب تک جو کچھ کیا، تجھے اس کا تو حساب دینا ہی ہوگا۔'' درویش نے کہا۔

رتنا اپنی جادوئی طاقت کے نشے میں مدہوش تھا، اس نے درویش کی بات کو اہمیت ہی نہیں دی اور بولا۔

''کیوں موت کو پکارتا ہے، میں اتنا گری ہوں یہاں پر میری حکومت ہے۔'' وہ بولا۔

درویش نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''جب انسان زمین پر خدا بن جاتا ہے تو بھول جاتا ہے کہ اس کو کس نے پیدا کیا ہے۔ اس دنیا کا مالک اس کو دیکھ رہا ہے اور جب وہ سزا کے چکر میں پھنس جاتا ہے تو پھر اس کو کوئی نہیں بچا سکتا۔''

رتنا نے جواب دیا۔ ''تو اور تیرا خدا میرا کچھ نہیں کر سکتا۔''

یہ سن کر درویش کو جلال آگیا اور رتنا گری پر درویش نے ایک قہر کی نظر ڈالی تو رتنا گری وہیں کھڑے کھڑے راکھ ہو گیا۔ لوگوں نے سکھ کا سانس لیا مگر درویش بھی وہاں سے اس طرح غائب ہوا کہ پھر کسی نے نہیں دیکھا۔ اس واقعہ کو گزرے چالیس سال گزر گئے مگر پرانے لوگوں کو یہ واقعہ یاد تھا۔ جب اندھیرا زیادہ ہو جاتا ہے تو روشنی کی کرن بھی ہوتی ہے۔ ایک روشنی کی کرن گھپ اندھیرے کو ختم کر دیتی ہے۔ آج پھر ایک رتنا گری بنگال میں پیدا ہو گیا ہے۔ وہ خود کو رتنا گری کا بیٹا کہتا ہے، وہ بھی انسانوں سے نفرت کرتا ہے، اس کے نزدیک انسان کھلونے ہیں۔ وہ ان سے زندگی اور موت کے کھیل کھیلتا ہے۔ وہ سب سے بڑا ساحر ہے۔ بنگال کی سرزمین میں اس کا جادو خوب کام کرتا ہے۔ سیٹھ لالو مل اور جمیل خان پرانے دوست اور کاروباری شراکت دار تھے۔ لالو مل پٹنہ میں رہتے تھے اور جمیل خان مراد آباد میں رہتے تھے۔ جمیل خان مراد آباد میں برتنوں کا کارخانہ چلاتے تھے اور لالو مل ان کے بنائے مال کو پورے بھارت میں فروخت کرتے تھے۔ ان سے پہلے ان دونوں کے بزرگ یہی کرتے تھے۔ پرانے وضعدار لوگ تھے۔ کبھی آپس میں اختلاف نہیں ہوتا تھا اور اگر کبھی کچھ ہوا بھی تو ایک دوسرے کے جذبات کا خیال کرتے تھے اور دل صاف ہو جایا کرتے تھے۔ مگر نئی پیڑھی کے آگے لالو مل اور جمیل خان ان روایات کو قائم نہ رکھ سکے اور لین دین پر جھگڑا کھڑا ہو گیا۔

لالو مل کا کہنا تھا کہ جمیل پر اس کی رقم نکلتی ہے اور جمیل کا کہنا تھا کہ حساب صاف ہے۔ یہ بات اتنی بڑھی کہ دونوں کے آپس کے کاروبار بند ہو گئے۔ اس سے دونوں کو بھاری نقصان تو ہوا ہی، ساتھ ساتھ مارکیٹ میں دونوں کی ساکھ بھی خراب ہوئی۔ پہلے جمیل کے برتن پوری مارکیٹ پر چھائے رہتے تھے مگر اب سپلائی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی جگہ دوسروں نے لے لی۔ جمیل کو نئے سرے سے مارکیٹ میں جمانا پڑا اگر لالو مل نے دوسرے کارخانوں کا مال تیزی سے پہنچانا شروع کر دیا اور دام بھی گرا دیا۔ جمیل خان مراد آباد

READINGCORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

میں رہ گئے مگر جدوجہد جاری رکھی۔

لالو مل جمیل کو پوری طرح برباد کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اس کے خلاف مراد آباد میں بھی مہم شروع کر دی۔ جمیل خان کا کاروبار مراد آباد اور دلی تک ہی رہ گیا تھا۔ وہاں پر بھی لالو مل آ گیا۔ چونکہ دولت میں وہ زیادہ تھا، اس لئے ضد میں اپنا نقصان بھی کر رہا تھا۔

وہ نقصان کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ وہ جمیل سے کم قیمت پر مال سپلائی کر رہا تھا۔ جمیل کا مال کوئی دوکاندار اٹھانے پر راضی نہیں تھا۔ جب مال کی سپلائی بند ہوئی تو کارخانہ بند ہو گیا اور جمیل خان پرانے مال کو اونے پونے فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بات یہاں تک ہی رہتی تو بھی غنیمت تھا مگر ہوا یہ کہ مراد آباد میں جمیل خان کا باپ دادا کے زمانے کا جما جمایا کارخانہ تھا۔ اس میں ایک رات آگ بھڑک اٹھی اور پورا کارخانہ جل کر کوئلہ ہو گیا اور جمیل خان پوری طرح برباد ہو گئے۔ اب نہ ان کے پاس روپیہ تھا اور نہ کارخانہ۔ مراد آباد میں عزت دار کہلاتے تھے مگر اب ان کے پاس نہ عزت تھی نہ دولت، جو لوگ ان کو دیکھ کر سلام کیا کرتے تھے، وہ کنی کترانے لگے۔ ان کے ملازم تک ان کو نہیں پہچانتے تھے۔ یہ صدمہ ان کے لئے بڑا جانکاہ تھا۔ انہوں نے مراد آباد چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور وہ اپنے دو بچوں اور بیوی کو ساتھ لے کر دلی آ گئے اور لال کنویں کے علاقے میں ایک مکان کرائے پر حاصل کیا اور ایک دوکان کریانہ کی حاصل کر کے خاموشی سے گمنامی کی زندگی بسر کرنے لگے۔

ابھی دو تین ماہ ہی گزرے تھے کہ ایک آدمی ان کی دوکان پر آیا۔ وہ کوئی ہندو تھا، دھوتی کرتا اور واسکٹ میں ملبوس سر سے گنجا تھا، اس کی عمر کا اندازہ پینتالیس پچاس کا ہو گا۔ جمیل نے اس کو غور سے دیکھا اور غور کیا۔ اس کی مسکراہٹ کچھ چبھتی سی معلوم ہوئی۔ آنکھوں میں حقارت کا انداز تھا۔ جمیل نے کچھ کہنے سے پہلے پلکیں جھپکائی ہی تھیں کہ جمیل کو ایسا لگا کہ وہ کہہ رہا ہو، چپ رہو، جمیل بولتے بولتے چپ ہو گیا اور جمیل کی متحیر نظریں اس ادھیڑ عمر ہندو پر جم گئیں۔

"سیٹھ جمیل خان مراد آبادی اور ان حالوں میں چھی

چھی۔" وہ بولا۔

جمیل نے اس کے اس چبھتے تیر کو برداشت کیا کیونکہ وہ کچھ اور تو کر نہیں سکتے تھے۔ وہ پھر بولا۔ "اگر اب بھی عقل نہ آئی تو پاتال میں چلا جائے گا۔"

جمیل نے بڑی مشکلوں سے اپنے اوسان بحال کئے اور بولے۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ تم کون ہو اور مجھے کیوں دھمکا رہے ہو؟"

"تیرے دماغ میں اگر بھوسا بھرا ہے، تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ دیکھتے آئے تھے، جا رہے ہیں، پھر آئیں گے۔" اور وہ چلا گیا۔

جمیل خان کی کیفیت بڑی عجیب ہو رہی تھی۔ خوف حیرت اور پریشانی کا ملا جلا سا غبار ان کے وجود کو گھیرے ہوئے تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون تھا، مجھ سے کیا چاہتا تھا۔ میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا، اس نے ان کے اعصاب کو بری طرح کمزور کر دیا تھا۔ ان کو اپنی فکر کم اور بیوی بچوں کی زیادہ تھی۔ وہ عالیشان مکان سے اٹھ کر ایک نہایت چھوٹے گھر میں اور بڑے کاروبار سے ایک چھوٹی سی دوکان میں آ گئے تھے۔ ان کو جو ذہنی اور مالی جھٹکا لگا تھا، اس سے وہ ابھی ٹھیک نہیں ہوئے تھے کہ یہ نہ معلوم کون تھا۔ آ گیا اور پاتال میں پہنچانے کی بات کر گیا۔ ان کے دماغ میں خیالات کے میلے لگے ہوئے تھے۔ ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ انہوں نے دوکان بند کر دی اور گھر آ گئے۔ ان کی پریشانی ان کے چہرے پر لکھی تھی۔ بیوی نے بہت پوچھا مگر وہ کیا بتاتا۔ ان کی تو خود سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ وقت نے گزشتہ واقعہ کو ذرا ہی دھکا تھا کہ وہ پھر آ گیا۔

آتے ہی بولا۔ "بڑے چین کی بنسی بجا رہا ہے۔ ارے تجھے فکر نہیں کہ تجھ پر کسی کا ادھار باقی ہے۔"

"مجھ پر ادھار کس کا ادھار ہے۔" جمیل نے پوچھا۔

"سیٹھ لالو مل کا اور کس کا یہ تو دینا ہی ہو گا تجھے۔" وہ حقیرانہ انداز میں بولا۔

"نہیں یہ غلط ہے۔ لالو مل میرا حصہ دار تھا مگر ہمارا

حساب ہر مہینہ ہوا کرتا تھا۔ میری طرف اس کا کچھ نہیں ہے۔" جمیل نے جواب دیا۔

"تیرے کہنے سے نہیں ہے، کھاتے تو بتاتے ہیں۔" وہ بولا۔

"کھاتے ان کے اپنے ہیں۔ ان سے میرا کیا واسطہ۔" جمیل نے جواب دیا۔

"تیری ہر بات غلط ہے۔ پیسے کا بندوبست کر لے نہیں کرے گا تو بہت نقصان ہو گا۔" وہ بولا۔

"اب میرے پاس کیا ہے جو کچھ تھا۔ وہ لالو نے اپنی چالبازیوں سے مارکیٹ میں ڈبوا دیا۔ میرا لاکھوں روپیہ دوکانداروں پر نکلتا ہے مگر کوئی نہیں دیتا۔ میں تو قلاش ہو گیا ہوں۔"

"تم اپنی کمزوریوں کا الزام لالو مل پر نہ لگاؤ، تمہاری طرف ایک لاکھ بیس ہزار کی رقم نکلتی ہے۔ یہ رقم تم کو ادا کرنی ہے۔ وقت بتاؤ کب دو گے، اگر بھاگنے کی کوشش کرو گے تو پورے بھارت میں بھاگ کر دیکھ لو۔ میں ہر جگہ آ جاؤں گا۔ میرا نام رتنا گری ہے۔ تم کو مہلت دے رہا ہوں، یہ میری عادت نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"تم میری حالت تو دیکھو، میرے پاس تو روٹی کے پیسے نہیں ہیں۔ میں دوں گا کہاں سے؟" جمیل نے گڑگڑا کر کہا۔

"یہ میری دردسری نہیں ہے، ٹھیک ایک مہینہ کے بعد آؤں گا۔ اگر روپیہ نہ ملا تو تجھے نقصان اٹھانا ہو گا۔"

اب جمیل کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ یہ لالو مل کا آدمی تھا اور ایک لاکھ بیس ہزار روپے بلاوجہ ہی مانگ رہا ہے۔ جمیل کی پریشانیاں اپنے عروج پر تھیں۔ دماغ میں ایک بھونچال آیا ہوا تھا۔ ان کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ نہ معلوم، کتنی مشکل سے گھر پہنچے اور جاتے ہی گر پڑے اور ان کی حالت انتہائی خراب ہو گئی۔

میں نے مریض کا معائنہ کیا۔ وہ بے ہوش تھا۔ اس کے دماغ پر بہت زیادہ بوجھ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ضروری دوائیں اس کو دیں تو وہ شام کو ہوش میں آ گیا۔ مگر اس کی دماغی کیفیت ایسی تھی کہ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ رات کو وہ سکون سے سویا اور سویرے وہ بہتر تھا۔ میں نے پوچھا۔

"تم نے اپنے دل و دماغ کو ضرورت سے زیادہ کام کروایا ہے۔ انسان کے ہر عضو کی کام کرنے کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس حد سے زیادہ بوجھ نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ تم نے ایسا کیوں کیا۔ اگر کچھ پریشانی ہے تو بتاؤ، شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔"

اس نے ملتجیانہ سی آواز میں کہا۔ "حکیم صاحب میں سخت پریشان ہوں۔"

"تم اپنی پریشانی بتاؤ تو شاید اس کا حل میرے پاس ہو۔" میں نے کہا۔

"میرا نام جمیل خان ہے۔" وہ بولا اور اس نے اپنی مراد آباد سے دلی تک کی کہانی بیان کر دی۔ میں نے ساری روداد سننے کے بعد کہا۔

"کوئی فکر نہ کرو۔ جمیل یہ زندگی کے کھیل ہیں۔ یہ دھوپ اور چھاؤں کے کھیل ہیں۔ اچھا وقت نہیں رہتا تو کوئی برا بھی نہیں رہتا۔ تمہاری سچائی ضرور رنگ لائے گی۔ تم اپنا مکان یہاں میرے قریب لے لو۔ میں تم کو کرائے پر دلا دیتا ہوں۔ یہیں پر کاروبار کرو، وہ ایک ماہ کے بعد آئے گا، پھر بات کریں گے۔"

جمیل نے میرے کہنے پر عمل کیا اور مطب کے قریب ہی میں نے ان کو کرائے پر مکان دلا دیا اور جمیل ایک چھوٹی سی دوکان لے کر بیٹھ گیا۔

وہ روز نہ سہی، دوکان بند کر کے میرے پاس آ جاتا تھا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا مگر بچپن سے کاروبار کرتا چلا آیا تھا اور اچھے کھاتے پیتے خاندان کا فرد تھا۔ اس میں پھکو پن نہیں تھا اور بات کرنے کا ڈھنگ بھی جانتا تھا۔ میں نے رولو کا کو ان کے تمام حالات بتائے تو رولو کا نے کہا۔ "رتنا گری کا میں نے بنگال میں نام سنا تھا مگر اس کو تو کسی درویش نے جلا کر خاک کر دیا تھا۔ اب یہ کون سا رتنا گری آ گیا۔"

"سنا ہے کہ یہ خود کو اس کا بیٹا کہتا ہے۔" میں نے کہا۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

"یہ بھی غلط ہے۔ رتنا گری نے شادی ہی نہیں کی تھی۔ پھر بیٹا کہاں سے آ گیا؟" رولو کا نے کہا۔

"ارے بیٹے کا کیا ہے، شادی کرنا ضروری ہے کیا۔" میں نے کہا۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے، ایسے لوگوں کے لئے تو واقعی ضروری نہیں ہے۔" رولو کا نے تسلیم کیا۔

"ایسا لگتا ہے کہ لالول نے رتنا گری کو جمیل کے پیچھے لگایا ہے۔" میں نے رائے دی۔

"رتنا گری کا جمیل سے کیا واسطہ، رتنا گری کو لالول نے ہی لگایا ہے۔" رولو کا بولا۔

"جمیل ہر طرف سے مارے گئے، ان کا آبائی شہر چھوٹا کارخانہ گیا، کاروبار گیا، وہ جان بچا کر یہاں آ گئے تو یہاں پر بھی ان کو چین سے نہیں رہنے دیا جا رہا۔" میں نے کہا۔

"اب رتنا گری کب آئے گا؟" رولو کا نے پوچھا۔

"پندرہ دن کے بعد آئے گا۔" میں نے کہا۔

"تو پھر ایسا کرتا ہوں کہ لالول نے جو داؤ جمیل پر مارا ہے، وہی پلٹا دیتا ہوں۔" رولو کا بولا۔

"میں نہیں سمجھا تم کیا کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کو آنے کے بعد بتاؤں گا۔" اور رولو کا پٹنہ روانہ ہو گیا۔ پٹنہ ایک کاروباری شہر ہے۔ سیٹھ لالول یہاں پر بڑا نام ہے۔ اس کے کئی کاروبار ہیں۔ ایک کاروبار اس کا یہ بھی ہے کہ وہ ہر صوبے سے مال خریدتا ہے اور اپنے نام سے پورے ہندوستان میں سپلائی کرتا ہے۔ رولو کا نے لالول سے ملاقات کی اور خود کو بنارس کا بیوپاری بتایا اور اپنا نام سلیمان بتایا۔

لالول نے کہا۔ "تم کرتے کیا ہو، کس قسم کا کام ہے تمہارا۔"

"ہم بنارسی ساڑھیاں بناتے ہیں۔" رولو کا نے جواب دیا۔

"کتنا مال مہینہ بھر میں سپلائی کر سکو گے۔" وہ بولا۔

"یہ تو آپ کے آرڈر پر ہے۔" رولو کا نے کہا۔

"اگر میں کہوں کہ ایک ہزار ساڑھی بڑھیا والی سپلائی کر دو تو کیا تم سپلائی کر دو گے۔" لالو بولا۔

"ہو تو سکتی ہے مگر رقم نقد ادا کرنا ہوگی۔" رولو کا نے کہا۔

"یہاں کچھ قاعدہ قانون بھی ہوتا ہے۔ کاروبار میں ایک مہینہ کا ادھار تو نقد کہلاتا ہے۔ بولو کیا خیال ہے؟"

"مگر ہمارے یہاں اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے کو نقد کہا جاتا ہے۔"

"تم کپڑے کے کاروبار میں نئے آئے ہو، ایسا لگتا ہے۔" لالو نے کہا۔

"ہاں جی بات یہی ہے۔ مگر میں ادھار کاروبار نہیں کرتا۔" رولو کا نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"میری بات پر غور کرنا، نقد ادھار ہر کاروبار میں کرنا پڑتا ہے۔" وہ بولا۔

"مگر ہر آدمی سے ادھار نہیں ہوتا، آدمی آدمی دیکھ کر بات ہوتی ہے۔" رولو کا نے کہا۔

"مجھ میں تم نے کیا خرابی پائی مارکیٹ میں میری ایک ساکھ ہے۔" وہ بولا۔

"اور اسی ساکھ کے بل پر آپ بہت کچھ کر جاتے ہیں اور کم زور بیچارہ مارا جاتا ہے۔"

"میاں زبان سنبھال کر بات کرو، تم میری ذات پر حملہ کر رہے ہو۔" وہ غصے سے بولا۔

"ابھی حملہ کہاں، سیٹھ لالول ابھی تو میں تم سے صرف ملاقات کرنے آیا ہوں۔" رولو کا بولا۔

"اچھا اس کے بعد حملہ بھی کرو گے۔ ہوش کے ناخن لو، بنارس سے بھاگتے پھرو گے اور پورے ہندوستان میں چھپنے کو جگہ نہیں ملے گی۔ تم نے میرے متعلق غلط اندازے قائم کئے ہیں۔ درست کر لو تو اچھا ہے۔" لالول نے غرور سے کہا۔

"اور تم بھی اپنی اوچھی حرکتوں سے باز آ جاؤ، کسی کو بلاوجہ پریشان نہ کرو۔ اگر تم رتنا گری پر بھروسہ کرتے ہو تو سن لو جس کو تم رتنا گری کہتے ہو، وہ رتنا گری نہیں ہے۔ رتنا گری کو تو ایک مرد خدا نے جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ یہ کوئی جعلی آدمی

ہے۔" رولو کا نے کہا۔

"تم کیا جانو، وہ کیا ہے مگر تم مجھے نقلی لگتے ہو۔ تم وہ نہیں جو بتاتے ہو۔ رتنا گری کا نام سن کر لوگ تھرا جاتے ہیں۔ تم جس طرح اس کا نام لے رہو ہے۔ اگر وہ سامنے آ جائے گا تو پائجامہ خراب ہو جائے گا، میاں جی کا۔" لالول حقارت سے بولا۔

"یہ تو بعد کی بات ہے۔ ابھی کے لئے ایک سبق چھوڑے جا رہا ہوں۔" اور رولو کا باہر آ گیا۔

باہر آتے ہی میں روپوشی کی حالت میں ہو گیا۔ میرے باہر آتے ہی کئی آدمی باہر دوڑے مگر مجھے نہ پا کر پھر اندر چلے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ اندر چلا گیا۔

لالول نے پوچھا۔ "پکڑ لیا اس کو؟"

"نہیں سرکار وہ تو دروازے سے نکلتے ہی غائب ہو گیا۔ پکڑتے کس کو؟" ایک بولا۔

"تم لوگ سب ناکارہ ہو۔ ارے ایک آدمی کو قابو نہیں کر سکے۔" اور اس نے ایک بازاری گالی دے دی۔ اتنا سننا تھا کہ ان میں جو سب سے تگڑا تھا اور ان کا سرغنہ لگتا تھا، وہ آگے بڑھا، اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے خالی تھا وہ لالول کے قریب گیا اور لالول کے گال پر اتنی زور سے چانٹا مارا کہ اس کی آواز دور دور تک گئی۔ لالول کے گمان میں یہ بات کبھی آ ہی نہیں سکتی تھی کہ اس کا ملازم اس پر ہاتھ اٹھائے گا۔ دوسرے یہ عمل اتنی تیزی سے ہوا کہ کسی کی کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ ہوا کیا۔ ابھی وہ پوری طرح سنبھل نہیں پایا تھا کیونکہ چانٹا اتنا کرارہ تھا کہ اس کو دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔ دوسرا آدمی پہلے والے کی جگہ آ گیا اور ایک بہت ہی بڑھیا قسم کا چانٹا اس کے دوسرے گال پر جڑ دیا۔ یہ سب پانچ آدمی تھے۔ سب نے اپنا اپنا صرف ایک ایک چانٹا لالول کو عنایت کر دیا۔

لالول کی حالت خراب ہو گئی۔ وہ سب واپس چلے گئے میں بھی ایک لمحے کو باہر آیا اور پھر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ابھی وہ اس صدمے سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ اس نے مجھے پھر کھڑا دیکھا تو حیرت سے بولا۔

"ارے تو کون ہے، کیا چاہتا ہے؟"

"تو کمزوروں پر ظلم کرتا ہے۔ بدمعاش پالتا ہے۔ جادوگر پالتا ہے۔ تو کتنا بے وقوف ہے۔ تو نے دیکھا کہ تیرے آدمی تجھے مار گئے تو ان کا کچھ نہیں کر سکا۔" میں نے کہا۔

"میں ان کا بہت برا حشر کروں گا۔ وہ زندگی بھر اپنی غلطی پر پچھتاتے رہیں گے۔" وہ غصے سے بولا۔

"ان کا حشر تو بعد میں خراب کرنا، پہلے اپنے اناج کے گودام کی فکر کر....." میں نے کہا۔

"میرے آدمی وہاں پر ہیں، میں کیا فکر کروں۔" وہ بولا۔

"وہ تیرا آدمی ہرنام سنگھ اس نے گودام میں آگ لگا دی ہے۔ وہ تیرا بہت وفادار آدمی ہے نا اور جو تجھے مار کر گئے ہیں وہ بھی تو تیرے وفادار تھے۔" میں نے کہا۔

"ارے کیا بکواس کئے جا رہا ہے، کوئی ہے؟" وہ دہاڑا۔

"کوئی نہیں آئے گا، یہ ہماری تمہاری پریم کہانی ہے جب ختم ہو گی تو کوئی آئے گا۔" میں نے طنز کیا اور باہر نکل گیا۔ پٹنہ شہر میں لالول کے کئی گودام تھے، کئی ٹھکانے تھے۔ رولو کا نے شام تک ان سب کو نشانہ بنا لیا۔ یہ کام اس کے اپنے آدمیوں نے کیا۔ اس کے پرانے وفاداروں نے لالول کے لاکھوں روپے کا نقصان کیا۔ میں نے یہ کام اتنی جلدی اس لئے کیا کہ رتنا گری کے آنے کے بعد شاید میں اس کی طرف لگ جاؤں اور نقصان کا مزا لالول نہ اٹھا سکے۔ جمیل کے ساتھ اس نے جو کیا تھا، اس کا جواب تو دینا ہی تھا۔

اب میں روپوشی کی حالت میں تھا اور لالول کے بہت قریب تھا۔ اس کے پاس پورے پٹنہ سے خبریں آ رہی تھیں اور وہ بے تاب اپنے کمرے میں دوڑ لگا رہا تھا۔

رات گیارہ بجے رتنا گری آ گیا۔

وہ ایک پستہ قد اور نہایت کمزور سا آدمی لگتا تھا۔ چہرہ ستا ہوا آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہوئیں مگر ان آنکھوں میں چمک بہت زیادہ تھی۔ جسم چہرہ جس قدر کمزور نظر آتے تھے۔ آنکھیں اسی قدر طاقت ور لگتی تھیں۔ وہ بڑا گرگ

READING CORNER http://readingcornerpk.blogspot.com/

جہاندیدہ لگتا تھا۔ اس نے آتے ہی چاروں طرف نظریں گھمائیں ۔ وہ موقع کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ دن بھر کے حالات اس کے روبرو تھے ۔ لالومل اس کے قدموں میں گر پڑا اور رو کر بولا۔

''میں برباد ہو گیا۔ گرو میرا سب کچھ برباد ہو گیا۔''

میں نے اس کے غرور کے شیشے کو یوں چکنا چور ہوتے، دیکھا تو مجھے ذرا سکون ہوا۔ میں نے صرف احساس دلانے کو یہ کیا تھا۔ اب شاید جمیل کے نقصان کا اس کو احساس ہو گیا ہو گا۔

''میں سمجھ رہا ہوں، یہ کوئی بہت بڑی چال ہے۔ یہ سب کس نے کیا ہے؟'' رتنا گری بولا۔

''ارے گرو جی! یہ سب میرے اپنے آدمیوں نے کیا ہے۔ مجھے مارا تک ہے، میری تو زندگی پر لعنت ہے۔ اب صرف تمہارا ہی آسرا ہے، کچھ کرو نہ معلوم آگے کیا ہونے والا ہے۔'' وہ بولا۔

''تو فکر نہ کر، میں آ گیا ہوں۔ مجھے اس کو پکڑنا ہے جو یہ کر رہا ہے۔ تیرے سارے آدمی ایک دم سے باغی تو نہیں ہو سکتے۔ کوئی تو ہے جو ڈوری ہلا رہا ہے، میں دیکھتا ہے وہ کون ہے؟'' رتنا گری بولا۔

''جو کرنا ہے کرو جلدی کرو۔'' لالومل نے جلدی سے کہا۔

''تیرے پاس کوئی آیا تھا۔'' رتنا گری نے پوچھا۔

''بنارس سے ایک آدمی آیا تھا۔ مال فروخت کرتا تھا اس کو، نقد ادھار پر ذرا سی تکرار ہو گئی۔ وہ باہر چلا گیا۔ مجھے غصہ آ گیا کہ میں نے اس کے پیچھے آدمی دوڑائے وہ غائب ہو گیا۔ پھر میرے آدمی واپس آ گئے۔ میں نے ان کو برا بھلا کہا اور گالی بھی دی۔ بس پھر وہ مجھے مارنے لگے اور مار کر چلے گئے۔ وہ پھر آ گیا اور اس نے بتایا کہ اناج کے گودام میں آگ لگ گئی ہے اور ہرنام نے آگ لگائی ہے۔ ہرنام تو میرا آدمی تھا، اس کے بعد ہر جگہ سے ایسی ہی خبریں آ گئیں۔ سب جگہ میرے آدمیوں نے مجھے تباہ کیا۔''

رتنا گری نے بڑی توجہ سے بات سنی اور بولا۔

''وہ آدمی تمہارے پاس تھا اور اناج کے گودام میں آگ ہرنام نے لگائی۔ یہ بہت بڑا کھیل ہے۔ یہ کام ایک آدمی کا نہیں ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔ میں کہاں کہاں جاؤں گا۔ تم بہت بڑے چکر میں پھنس گئے ہو۔'' وہ خاموش ہوا تو لالومل اس کے قدموں میں گر پڑا اور بولا۔

''مجھے بچا لو گرو، میں تو تم پر غرور کرتا ہوں، تم تو میرا ساتھ نہ چھوڑو۔''

''میں ساتھ نہیں چھوڑ رہا ہوں۔ حالات اتنے خراب ایک دن میں تو نہیں ہوتے، تمہارا دشمن نہ جانے کب سے تیاریوں میں تھا، تم بے فکر بیٹھے رہے۔ مجھے حالات کو سمجھنے کی مہلت تو ملے۔ ہر کام قاعدے سے ہوتا ہے۔ دشمن کا سراغ ملے تو دو دو ہاتھ کروں۔ ابھی تک تو میں اندھیرے میں ہوں۔'' رتنا گری بولا۔

''اب اور نقصان نہ ہو، اس کی روک تھام تو کرو گرو۔'' وہ بولا۔

''ہاں یہ کروں گا، اپنے بیر ہر جگہ لگا دوں گا۔ اب تیرا اور نقصان نہیں ہو گا۔'' رتنا گری بولا۔

رتنا گری ٹھیک رات ایک بجے باہر آ گیا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ مگر اس کو اس کا ذرا احساس نہیں تھا۔ یہ نقلی رتنا گری اتنا بڑا ساحر نہیں تھا۔ کھانے کمانے کے شعبدے کیری کرتا تھا اور نام رتنا گری کا استعمال کرتا تھا۔ میں نے اس کا پورا وزن کر لیا تھا۔ روپ بہروپ خوب بدلتا تھا۔ وہ سفلی کا ماہر تھا اور سارے بیر گندے اس کے پاس تھے۔

وہ ایک اندھیری اور سنسان سڑک پر جا رہا تھا۔ اسی اندھیری سڑک پر ایک اکیلا چھوٹا سا مکان بنا ہوا تھا۔ وہ اس کے دروازے پر رک گیا اور دروازے پر دستک دی۔ دو تین دستک کے بعد اندر سے کسی کے بولنے کی آواز آئی۔

''آ گئے جب دل کرا مر گئے۔ ارے دن میں مر جایا کرو، کروان کا کریا کرم ہو گئی کالی رات۔ ارے کالی ناتھ تیری تو زندگی ہی بے کار ہے۔ ارتھی جلاتے جلاتے تو بھی جل جائے گا ایک دن۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ

کھولا تو رتنا گری کو دیکھ کر گڑبڑا گیا۔ ''ارے گرو! تم ہو میں سمجھا کوئی ارتھی آ گئی بے وقت۔''

''ہوش میں آ جا کالی ناتھ! تو نے نام تو کالی ناتھ رکھ لیا ہے مگر کالی کا داس اب تک نہیں بن سکا۔''

''کیا بتائیں گرو جی، نصیب کے ہیٹے ہیں۔ بھاگ میں تو باولے بننا لکھا تھا، سو بن گئے۔'' وہ بولا۔

''سب کچھ نصیب کے کھاتے میں ڈال کے اپنی جان چھڑا لے، اب اتنی کھوپڑی اور یہ کڑیل شریر لے کر بھی تو نرا گدھا ہے۔ ارے بے وقوف زندگی اتنی بے رحم نہیں ہے کہ انسان آرزوئیں لے کر پیدا ہو اور مایوسیوں میں زندہ رہے اور مر جائے تو نے کون سی زندگی بنانے کو محنت کی ہے۔ خود رو پودے کی طرح پیدا ہوا ہے۔ ارے کسی کو گرو مانتا، اس کی خدمت کرتا تو کچھ ہنر تیرے پاس ہوتا، یوں اس اندھیرے گھر میں پڑا مردوں کا انتظار نہ کرتا۔ زندہ رہنے کو بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ بڑی کھٹنائیاں بھوگنی پڑتی ہیں۔ تب جا کے آدمی کچھ بنتا ہے۔ تو کیا بنا، ذرا سوچ اور میرا ایک کام کر، کل شام تک مجھے ایک شریر چاہیے۔ پورا کا پورا میں کل رات ٹھیک بارہ بجے آؤں گا۔ شریر مرد کا ہو تو اچھا ہے۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔''

''گرو بات تو سنو، اگر کوئی ارتھی نہ آئی تو میں کیا کروں۔'' کالی ناتھ بولا۔

''تو پھر تجھے مرنا ہو گا، تجھے کل رات مجھے شریر دینا ہے۔'' وہ سفاکی سے بولا۔

اور اتنا گری پلٹ گیا، کالی ناتھ دروازے پر حیران و پریشان کھڑا رہا۔ اب اس کا رخ پٹنہ کے اس بازار کی طرف تھا۔ جہاں راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں۔ یہ جگہ درمیان شہر ہے۔ بازار میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ پھول گجرے کی دوکانیں پان سگریٹ کی دوکانیں اور شراب کی سب دوکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ خرید و فروخت بھی ہو رہی تھی۔ کوٹھوں کے اوپر حسین پھولوں کے گلدستے اشاروں کی زبان میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ کچھ اوپر سے نیچے آ رہے، کچھ اوپر جا رہے تھے، کچھ جانے کو پر تول رہے تھے۔ اس بازار کی یہی رونق تھی۔ گناہوں کی اس بستی کے طور نرالے تھے۔ دن میں شریف نظر آنے والے دل پھینک اپنی بیویوں سے بیزار مرد خاموشی سے یہاں آتے ہیں...... اپنے اعمالوں پر کالک پوت کر خاموشی سے چلے جاتے ہیں۔

مجھے پتہ ہے کہ گندہ عمل کرنے والا جتنا گندہ ہو گا، عمل اتنا ہی اچھا ہو گا۔ گندے کام کرنے والے ہر طرح سے خود کو پلید کرتے ہیں۔ ان کی غذا پلید ان کے عمل پلید، ان کی زبان زیادہ گندی، یہ ان کی مجبوری ہے۔ یہ شیطانی عمل کرتے ہیں اور شیطان جن چیزوں سے خوش ہوتا ہے۔ وہ ان کو کرنا ہوتا ہے۔ اگر نہ کریں تو ان کے عمل میں تاثیر نہیں ہوتی۔ رتنا گری جو کر رہا تھا۔ اس پر مجھے ذرا حیرت نہیں تھی۔ میں صرف اس کی ناپ تول کر رہا تھا۔

میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ کون سا عمل کل رات کرے گا۔ میں اس کو اس کے حال پر چھوڑ کر لالومل کے پاس آ گیا۔ وہ گھر پر اپنے بستر پر چت لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ نگاہیں چھت کو تک رہی تھیں۔ میں پہلے والے حلیے میں اس کے سامنے مجسم کھڑا تھا۔ پھر میں نے آواز دی۔

''کیا سوچ رہا ہے لالومل۔'' وہ میری آواز سن کر چونک پڑا اور اٹھ کر بیٹھ گیا مگر آواز اس کے منہ سے کچھ نہ نکلی تو میں نے پھر کہا۔

''کیا تیری آواز گرو نے بند کر دی ہے۔''

''تو کیسے آیا، دروازہ تو بند ہے۔'' وہ دروازے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''دروازے سے تیرا گرو آتا ہے وہ کسی ویشیا کے ساتھ پڑا ہے تو کس پر بھروسہ کر رہا ہے۔ ارے نادان! وہ تیرا کیا ساتھ دے گا۔'' میں نے کہا۔

''وہ بہت شکتی والا ہے۔ ضرور ساتھ دے گا۔'' وہ بولا۔

''اب تک اس نے کیا کیا ہے۔ اس کی تو سمجھ میں خود کچھ نہیں آ رہا۔ وہ کرے گا کیا؟'' میں نے کہا۔

''تو میں کیا کروں، میں تو برباد ہو رہا ہوں۔'' وہ

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com

بولا۔
"تو نے جمیل خان کو برباد کیا تھا۔" میں نے پوچھا۔
وہ خاموش رہا۔ تو میں نے پھر سوال دہرایا۔
"ہاں میں قبول کرتا ہوں مجھ سے، یہ بھول ہوگئی ہے۔" وہ گردن جھکا کر بولا۔
"میں جانتا ہوں تیرا نقصان جمیل کے نقصان سے زیادہ ہو چکا ہے۔ مگر تیرے پاس اب بھی اتنا ہے کہ تو پھر کھڑا ہو سکتا ہے مگر جمیل کے پاس کچھ نہیں ہے تو اس کا نقصان پورا کر سکتا ہے۔ اگر پورا کر دے تو تیری جان چھوٹ سکتی ہے۔ اگر تو اپنے گرو پر اعتبار کرتا ہے تو بول۔" میں نے کہا۔
"گرو نے میرا بہت مال کھایا ہے۔" وہ بولا۔
میں نے اپنے کارندے کو اشارہ کیا اور وہ چلا گیا تو میں نے کہا۔ "تیرا گرو ابھی آتا ہے۔ اپنا حساب کر لینا میری بات کا جواب دے۔"
"میں جمیل کا نقصان بھرنے کو تیار ہوں۔" وہ بولا۔
"اور آئندہ اس کے ساتھ یا کسی کے ساتھ بے ایمانی نہیں کرو گے اور کرو گے تو پھر سزا کو تیار رہنا۔ میں نے کہا۔
دروازہ کھلا اور گرو مادرزاد ننگا کمرے میں موجود تھا۔ حیران حیران نظروں سے، ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا ۔"کیا دیکھ رہا ہے، نقلی رتنا گری۔ تو نے بڑے نام کا سہارا پکڑا تھا مگر کام صرف مداریوں والے۔ کھیل تماشے دکھا کر تو مہان شکتی دان تو نہیں بن گیا۔
کالی ناتھ جیسے لوگوں پر تیرا رعب چل سکتا ہے۔ تیرے اندر تو کچھ نہیں، تو نے جو ڈھونگ رچایا تھا۔ وہ کمزور اور نادان لوگوں پر چلتا تھا تو تو یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ تو یہاں کیسے آ گیا۔"
وہ خاموش کھڑا تھا۔ زبان پر تالے پڑے تھے۔ اس کی قلعی کھل گئی تھی۔ اب تک غرور اور طاقت کا جو کلف چڑھا تھا، اتر چکا تھا۔ وہ بولتا تو کیا بولتا۔ میں نے پھر کہا۔
"تو نے جو گندگی اپنے شریر میں اتاری ہے وہ تجھے چین سے نہیں رہنے دے گی۔ تو پھر وہی کرے گا جو تجھے شیطان کہے گا۔ تم جیسے لوگ گندگی کے ڈھیر ہوتے ہو، یہ گندگی بہت اندر تک پہنچ گئی ہے۔ اس کو صاف کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے اس گندگی کے ڈھیر کو آگ لگانا پڑتی ہے۔"
میری زبان سے یہ نکلنا تھا کہ میرے کارندے نے عمل درآمد کر دیا اور وہ اس طرح جلنے لگا جیسے کاغذ اور چند منٹ کے بعد زمین پر تھوڑی سی راکھ پڑی تھی مگر لاوبل یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے علاوہ کچھ نہیں جلا اور پھر راکھ بھی ہوا لے اڑی۔
"تیرا گرو تو گیا۔ تو نے جو وعدہ کیا ہے اس کو پورا کر، تیرے پاس جمیل آئے تو اس سے وہی سلوک کرنا، جیسا پہلے کرتا تھا اور اسی میں تیری بھلائی ہے۔
منیر خان اور وزیر خان دو بھائی، دونوں کی رہائش آگرہ شہر کے گاؤں رتنونی، میں بڑے بھائی وزیر خان کی سائیکل کی دوکان مین روڈ پر لب سڑک تھی اور خوب چلتی تھی وجہ یہ تھی کہ دور دور کوئی دکان نہ تھی پنچر تک لگوانے دور دور سے لوگ آتے تھے۔ وزیر خان بڑے چرب زبان آدمی تھے ان کی دکان میں ایک دفعہ اگر کوئی کسی کام سے آ گیا تو سمجھ لو پکا گاہک بن گیا۔ اطراف کے دیہات اور شہر میں دودھ پہنچانے والے گوالے تو ان کے یوں سمجھ لو کہ ان کے مرید تھے وزیر خان کے ہی ہاتھ سے کام کرواتے تھے سستا زمانہ تھا ایک روپے کا سولہ سیر گندم ملتا تھا۔ اس زمانے میں وزیر خان کی آمدنی دو اور ڈیڑھ روپے روزانہ ہو جایا کرتی تھی بڑے ٹھاٹ تھے برادری میں بڑا نام تھا۔
وزیرا خان نے آگرہ میں بھی مکان خرید لیا تھا، اس مکان پر تین سو روپے مرمت میں خرچ کر دیا تھا۔ بہت بڑا مکان تھا اور محلے کے لب سڑک تھا۔ بیوی نے ہر چند کہ بہت زور لگایا کہ وزیر خان اس مکان میں آ جائیں اور اس میں دکان کر لیں، مگر وزیر خان پکے لکیر کے فقیر آدمی تھے انہوں نے اپنی بیوی اور اپنے سسرالیوں کی ایک نہ سنی اور آگرہ شفٹ نہ ہوئے۔ مگر مکان کو تو آباد کرنا تھا ان کا چھوٹا بھائی منیر خان گاؤں میں کھیتی باڑی کرتا تھا۔ اس کا زیادہ بڑا کنبہ نہ تھا دو لڑکیاں تھیں لڑکا کوئی ہوا نہیں۔

وزیر خان نے اسی کو اس مکان میں رکھ دیا۔ اور چونکہ یہ مکان لب سڑک تھا اس لیے ایک بڑی سی دکان بھی بنا کر دے دی۔ کچھ ٹوٹی پھوٹی سائیکلوں کے پرزے اور دیگر سامان بھی بھر دیا اور منیر خان نے بھی سائیکل مرمت اور کرائے کی سائیکل چلانا شروع کر دی، کام میں تو اتنے ماہر نہ تھے مگر بڑے بھائی نے ضروری ضروری کام سب بتا دیئے تھے۔ پنچر لگانا اور ہوا بھرنا کون سا مشکل کام ہے۔ آہستہ آہستہ یہ بھی کام سیکھتے گئے اور دکان بھی کھڑی ہونے لگی۔
دو سال میں ان کا کاروبار وزیر خان سے آگے نکل گیا۔ پوری سائیکل کا نیا سامان ان کے گھر میں بھرا رہتا تھا کرائے پر الگ الگ بیس سائیکلیں چلتی تھیں۔ کام کرنے کو دو ملازم تھے، وہ تو گدی پر بیٹھ کر صرف گلے میں روپے ڈالتے رہتے۔
کاروبار بڑھا تو ان کی رہائش اور اخراجات میں بھی فرق پڑا۔ مولوی صاحب گھر آ کر لڑکیوں کو پڑھانے لگے۔ بیگم کے بھی چلن میں فرق پڑا۔ شلوار سے غرارہ ہو گیا۔ اور گھر پر بھی کام کرنے والی آ گئی۔ گاؤں کے منیر خان اور شہر کے منیر خان میں بڑا فرق پڑ گیا۔ وزیر خان کا کاروبار جہاں تھا وہیں رہا کیونکہ وہ ایک محدود جگہ تھے، ان کے گاہک وہی تھے جو سالہا سال سے ان کے پاس آتے تھے اور کام کا جو ریٹ مقرر کر دیا تھا دے رہے تھے، اس لیے وزیر خان کی آمدنی ایک مقام پر کھڑی تھی۔ حالانکہ یہ آمدنی ان کے اخراجات سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ مگر منیر خان کے گاہک نئے ہوتے تھے، اس سے وہ اپنی مرضی کے ریٹ وصول کرتے تھے۔
نیا سامان اور پرزے جات بھی ان کے پاس تھا، اس میں بھی کماتے تھے۔ کرائے پر جو سائیکلیں چلتی تھیں وہی دکان اور گھر کا خرچ پورا کر دیتی تھیں۔ منیر خان جو وزیر خان سے کمزور تھے، چند سالوں میں ہی وزیر خان کو میلوں پیچھے چھوڑ گئے۔
اب وزیر خان کو احساس ہوا کہ وہ کتنی بڑی غلطی کر چکے ہیں۔ انہوں نے بیوی کی بات نہ مان کر اپنے حق میں کتنا برا کیا ہے۔
"تم نے میری نہ مانی پڑے رہے رتنونی کے بجریا میں اور دیکھ لو تم نے جس کی مدد کری گھر دیا دکان دی اس نے دوسری حویلی کھڑی کر لی، اسی دکان سے کمائی کر کے، تم ہو کہ ابھی تک پنچر جوڑ رہے ہو اور وہ گدی پر سیٹھ بنا بیٹھا ہے۔" ایک دن وزیر خان کی بیوی حکمت بیگم نے وزیر خان کو سنا ڈالی۔
"یہ تو نصیب کی بات ہے میں اگر اس کی جگہ ہوتا تو ضروری تو نہیں تھا کہ دکان اتنی ہی چلتی اس کی قسمت چمکنے کا یہ تو بہانہ تھا۔ اس میں چلنے کا کیا مطلب ہم اپنے نصیب کا کماتے ہیں، وہ اپنے نصیب کا اور پھر وہ کون غیر ہے میرا بھائی ہی تو ہے اگر کبھی مجھے ضرورت پڑی تو کیا وہ میرا ساتھ نہ دے گا۔" وزیر خان بولے۔
"ہاں دے گا ساتھ خوب دے گا۔ میاں تم یہ بھول جاؤ، دنیا کا چلن بدل رہا ہے، سب اپنی اپنی دیکھ رہے ہیں، تم بھی دنیا کے ساتھ چلو آخر ہم بھی بال بچے دار ہیں۔" حکمت بیگم نے کہا۔
"تو پھر میں کیا کروں۔" وزیر خان نے کہا۔
"ارے لو مجھ سے پوچھ رہے ہو، ارے تم کو نظر نہیں آیا۔ مکان تمہارا دکان تمہاری، کراؤ ان سے خالی۔" حکمت نے کہا۔
"یہ بہت مشکل کام ہے، دنیا کیا کہے گی، بھائی کو گھر سے نکال دیا۔" وزیر خان بولے۔
تو پھر ایسا کرو اس مکان کی قیمت ان سے وصول کرو آج کے حساب سے۔" حکمت نے مشورہ دیا۔
"اگر اس نے منع کیا تو اس کے ساتھ لڑوں، جھگڑا کروں، اری نیک بخت وہ میرا بھائی ہے۔
میں بڑا ہوں اگر وہ میرا مال کھا گیا تو کیا ہوا، بھائی نے کھایا ہے، تو سن لے کان کھول کے، تو جو کہہ رہی ہے وہ مجھ سے نہیں ہونے کا۔" وزیر خان بولے۔
"اچھا تم کچھ نہ کرو میں بات کروں گی۔" حکمت بیگم نے کہا۔
"ہاں تو کر لے بات مگر انسانیت سے بات کرنا کوئی

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

جھگڑا ٹنٹانہ کھڑا کر لینا۔" وزیر خان بولے۔

"نہیں کروں گی جھگڑا قاعدے کی بات کروں گی، تم کو بچے نظر نہیں آتے مجھے تو نظر آ رہے ہیں۔ آخر ان سب کی شادی بیاہ بھی کرنی ہے، لڑکوں کو بسانا ہے اور اب میں گاؤں میں نہیں رہوں گی، وہاں پر میرے بچے رہے تو کنویں کے مینڈک بن جائیں گے۔ مجھے شہر میں رہنا ہے۔ تم اگر نہ رہو تو بھی رتونی میں پنچر لگاتے رہو میں آگرہ میں رہوں گی" حکمت بیگم نے فیصلہ سنا دیا۔ اور ایک مکان کرائے پر لے کر وہ آگرہ کے غالب پورہ محلے میں آ گئی۔

آنے کے دو چار دن کے بعد وہ منیر خان کے مکان پر جو کہ نائی کی منڈی میں تھا۔ چلی گئی۔ منیر خان بہت خوش ہوا۔

میں اس لیے آئی ہوں بھیا کہ اب ہم نے گاؤں چھوڑ دیا ہے۔ تمہارے بھیا بھی جلدی آ جائیں گے۔ اب وہاں پر رہنا بے کار ہے۔ مہنگائی دن بہ دن بڑھ رہی ہے اور ان کی آدمی اپنی جگہ رکی کھڑی ہے۔"

"اب تم اپنا کوئی بندوبست کر لو اور یہ مکان خالی کر دو۔ میں غالب پورہ میں کرائے کے مکان میں پڑی ہوں۔" حکمت بیگم نے کہا۔

"بھابی اس مکان میں میرا بہت سامان بھرا پڑا ہے۔ دکان بھی ہے میں اس کو خالی تو نہیں کر سکتا، مجھے پتہ ہے بھیا نے یہ مکان ڈھائی سو میں لیا تھا ٹوٹا پھوٹا تھا۔ بھیا نے اس کی مرمت پر تین ساڑھے تین سو روپے خرچ کیے تھے۔ ان سب کا میں پابند ہوں، تم ایسا کرو کوئی اپنے مطلب کا مکان دیکھ لو میں اس کا سودا کر کے تم کو دے دوں گا۔"

"تم نے مجھے مکان دیا، اس کے بدلے میں تم کو دے دیتا ہوں۔ کم زیادہ کی فکر مت کرنا۔ اگر مکان مہنگا بھی ہوا تو بھی میں تم سے کچھ طلب نہیں کروں گا۔" منیر خان نے کہا۔

"نہیں بھیا یہ نہیں ہوگا۔ مکان تو میں اپنا ہی لوں گی۔" حکمت بولی۔

"تو پھر بھابی میری بھی سن لو، میں نے تم سے مکان نہیں لیا تھا، میں جانو، اور بھیا جانیں تم ہمارے درمیان نہ آنا۔ بھیا جو کہیں گے میں مان لوں گا۔"

"حکمت بیگم واپس چلی گئی اور سیدھی گاؤں گئی۔

"آخر ہو گیا نا بے ایمان میں نا کہتی تھی۔" وہ سر پر ہاتھ مار کر بولی۔

"درمیان سے بات شروع کرتی ہو پوری بات بتاؤ ہوا کیا ہے۔"

"تمہارے بھائی نے صاف انکار کر دیا، مکان دینے سے ہم کرائے کے مکان میں کب تک پڑے رہیں گے آخر۔"

"پوری بات نہ بتانا۔" وزیر خان بولے۔

"پوری بات یہ کہ وہ کہتا ہے دوسرا مکان پسند کر لو میں خرید دوں گا۔ کم زیادہ بھی دے دوں گا، مگر اس مکان کو نہیں چھوڑوں گا۔ بھیا نے سات آٹھ سو میں یہ مکان خریدا تھا۔ اس میں میرا مال بھرا ہوا ہے۔ تم مروت کرتے رہو۔ اپنے بچوں کا حق مارتے رہو، تمہارا بھائی تم پر رحم نہیں کرے گا۔" حکمت بیگم نے کہا۔

"دوسرا مکان خرید کر دے تو رہا ہے اور تم کو کیا چاہیے۔" وزیر خان بولے۔

"ارے تمہاری عقل تو گھاس چرنے گئی ہے، مجھے تو وہی مکان چاہیے بس۔" بیگم نے کہا۔

"کیوں وہی کیوں چاہیے۔" وزیر خان نے پوچھا۔

"وہ مکان بڑی برکت والا ہے، اس مکان میں آتے ہی منیرہ کے حالات بدل گے۔"

"دکان چل نکلی۔ ہزاروں کا کاروبار ہو گیا۔ چلتی ہوئی دکان ہے۔"

"وہی دکان تم کرو گے تو تم کماؤ گے۔ ذرا سوچو تو۔" حکمت بیگم نے کہا۔

"تم نے جو پروگرام بنایا ہے کیا ایسا ہی ہوگا۔ ارے اللہ کی بندی، بندہ اپنے نصیب کا کھاتا ہے کماتا ہے۔ جس گھر سے اور دکان سے اس نے کمایا ہے ضروری نہیں کہ میں

بھی کما لوں گا۔ مجھے میرے نصیب کا ملتا ہے عزت کی روٹی کھاتے ہیں۔ یہی بہت میرے مولا کا کرم ہے۔" وزیر خان بولے۔

مگر حکمت ان کی بات سے ذرا بھی قائل نہ ہوئی۔ اس کی کھوپڑی میں بس ایک بات بیٹھ گئی تھی اور وہ اس مکان کو ہر حالت میں حاصل کرنا چاہتی تھی۔

"تم پر تو ایسا لگتا ہے کہ الو کی لکڑی پھیر دی ہے، بھیا کی محبت میں اپنی اولاد کو بھی بھول گئے ہو مگر میں نہیں بھولی۔ وہ مکان میرے بچوں کا مستقبل ہے میں اس کو خالی کروا کر رہوں گی۔ تم میرے اور منیرہ کے درمیان نہ آنا بس میں نے کہہ دیا ہے۔"

منیر خان کو بھابی کی باتوں سے حسد کی بو آ گئی تھی۔ اس نے چوراہے پر اس سے بہتر پوزیشن پر ایک دھوبی کے مکان کا سودا خاموشی سے کر لیا اور اس کو گرا کر نیچے بڑا سا گودام اور دکان بنانے کا کام شروع کر دیا۔

بھابی دو چار دفعہ آئی گئی بھیا نے ایک دفعہ بھی مکان کی بات نہیں کی۔

"دیکھو بھابی میں نے مکان بھیا سے لیا تھا۔ لیا بھی کیا تھا انہوں نے خود دیا تھا۔ تمہارا تو کوئی دخل نہ تھا، میں مانتا ہوں کہ یہ مکان بھائی کا ہے میں دینے سے انکاری بھی نہیں ہوں۔ بھیا مکان مانگیں گے میں دے دوں گا۔ اب تم مکان کی بابت نہ آنا۔

حکمت کو تو یہ سن کر پتنگے لگ گئے۔ اب تو وہ مکان اس کی ضد بن گیا۔

"ارے میں کہتی ہوں آخر تم گونگے کیوں بن گئے ہو آخر کب مکان خالی کرنے کو کہو گے۔"

حکمت، وزیر خان کی خاموشی سے چڑتی۔

"مجھے لگتا ہے تو جھگڑا کروائے گی۔" وزیر خان بولے۔

"اس میں جھگڑے کی کیا بات ہے تمہاری چیز ہے تم واپس مانگ رہے ہو۔" حکمت نے کہا۔

"یہ بات تیری کھوپڑی میں نہیں آ رہی۔ اری نیک بخت اس نے اس جگہ اپنا کاروبار جمایا ہے۔ پھر وہ اتنی آسانی سے وہ جما جمایا کاروبار کس طرح ختم کر دے گا۔" وزیر خان بولے۔

"مکان اس کا نہیں ہے۔ اس کو ختم کرنا پڑے گا۔ چار آدمی تمہاری طرف داری کریں گے۔ اس کی کوئی نہیں کرے گا۔" حکمت بیگم نے کہا۔

"اچھا اتوار کو جاؤں گا۔ پھر بات کروں گا۔"

"اتوار دور ہے جمعہ کو تم دکان نماز کے بعد بند کرتے ہی ہو جمعہ کو بات کر لو۔" حکمت نے کہا۔

"چلو جمعہ کو چلا جاؤں گا۔" وزیر خان بولے۔

"میں ساتھ چلوں گی تم سے بات کرنا تو آتا نہیں، بھیا کو دیکھ کر نہال ہو جاؤ گے۔" حکمت نے کہا۔

"میں تیرے ساتھ تو جانے کا نہیں۔" وزیر خان بولے۔

"کیوں میں کیوں نہ جاؤں۔" حکمت نے کہا۔

"جہاں لڑائی نہ ہوتی ہو کرا دے گی، میں کر لوں گا سب بات اور اگر تو گئی تو پھر تو ہی بات کرے گی۔ میں کچھ نہیں بولوں گا۔ کان کھول کر سن لے۔" وزیر خان نے کہا۔

"اے میرے اللہ کیسے آدمی سے پالا پڑا ہے، الٹی سیدھی کچھ سمجھتا ہی نہیں۔" حکمت نے کہا۔

"تو ہی حکیم لقمان کی چیلی ہے سب کچھ سمجھتی ہے، میرے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔" حکمت بیگم کا منہ بگڑ گیا مگر بولی کچھ نہیں۔

جمعہ کو نماز کے بعد منیر خان بھی دکان بند کرتے تھے گھر پر ہی تھے، بڑے بھائی کو دیکھا تو کھل اٹھے۔ "آؤ بھیا۔ بہت دن میں شہر آئے۔" منیر خان خوش ہو کر بولے۔

"ارے میاں آئے کیا ہیں۔ بھیجے گئے ہیں، میں تو آنا نہیں چاہتا تھا مگر عورت ذات بڑی بدذات ہوتی ہے۔ اس کی کھوپڑی میں جو بات گھس جائے پھر باہر نہیں آتی۔" وزیر خان بولے۔

"میں سمجھ گیا بھیا میں نے بھابی کو کہہ دیا تھا کہ مکان میرے بھائی کا ہے میں ہر وقت مطالبے پر واپس کرنے کا

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com

پابند ہوں مگر وہ اتنی بے چین تھیں کہ کیا بتاؤں تو میں نے کہہ دیا تھا کہ بھائی نے دیا ہے، بھائی بولیں گے تو واپس کروں گا تم نہ آنا اس سلسلے میں۔" منیر خان بولے۔

"عورت ذات کو صبر کہاں۔ بات یہی ہے جو تم نے کہا ہے۔ مجھے جلدی نہیں ہے تم اپنا آرام سے انتظام کرلو پھر بتا دینا۔" وزیر خان بولے۔

"کم از کم ایک مہینہ تو لگ جائے گا۔" منیر خان بولے۔

"کوئی فکر کی ضرورت نہیں اس سے زیادہ بھی لگ جائے تو بھی کوئی بات نہیں، اپنی بھابی کی بات کا برا نہ ماننا۔ میں عورت کے کہنے پر اپنے بھائی سے جھگڑا تو نہیں کروں گا۔" وزیر خان بولے۔

منیر خاں کا چوراہے والا مکان تیار تھا، رنگ سفیدی چونا ہو رہا تھا۔ مگر منیر خان نے نئی دکان کے بارے میں گاہکوں کو بتانا شروع کردیا۔ زیادہ دور چوراہا نہ تھا اور کاروباری نقطہ نگاہ سے نئی دکان زیادہ مناسب جگہ پر تھی۔ اس نے ایک ماہ سے بھی کم وقت لیا اور دو دکان کو نئے اور جدید طرز پر سجانا شروع کردیا۔ بڑی بڑی کانچ کی الماریاں اور شوکیس بنوائے گئے۔

نچلی منزل پر رہنے کا اس کا پروگرام نہ تھا، اس لیے بہت بڑے بڑے گودام نکل آئے تھے۔ اوپر جانے کا زینہ گلی کی طرف تھا۔

پھر اس نے اردو اور ہندی میں دکان کے اوپر بڑا سا بورڈ بھی لگوا دیا تھا۔ ایک پرانی سائیکل کو رنگ روغن کر کے باہر اسٹینڈ پر لٹکا دیا تھا۔ اب اس کی دکان پنچر لگانے اور مرمت کا کام کرنے کی دوکان نہ تھی وہ مارکیٹ سے پوری نئی سائکلیں اور پرزے خرید لایا تھا۔ مگر ایک کنارے اس نے ایک مستری بھی رکھ دیا تھا۔ تاکہ چلتا ہوا کام بھی واپس نہ جائے۔ اس کے ریٹ بھی بہت مناسب تھے۔ اس کی ساکھ بھی تھی۔ پرائی دکان سے یہاں پر شفٹ ہونے میں اس کو کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی اور اس کی دکانداری پر اثر بھی نہیں پڑا۔ نئے سامان کی فروخت البتہ بڑھ گئی۔ منیر خان نے مکان بھی خالی کردیا اور دکان کے اوپر مکان میں شفٹ ہوگیا۔

اس کے کاروبار میں فرق نہ آیا، اخلاق اچھا تھا اور شرح منافع بھی نہایت مناسب تھا۔ دور دور کے گاہک اس کے پاس آتے تھے۔

وزیر خان نے اپنی گاؤں کی دکان بند کردی اور منیر خان والی دکان میں بیٹھ گئے۔ مگر منیر خان والی بات پیدا نہ ہوسکی، مرمت کا کام اور چھوٹا موٹا کام البتہ آتا رہا گھر کا گزارہ ہونے لگا۔ وزیر خان کے بچے بھی زیادہ تھے اور اخراجات منیر خان کے مقابلے میں زیادہ تھے۔ ان کے دو لڑکے بھی دکان پر کام کرنے لگے تھے۔ مگر منیر خان نے زیادہ سرمایہ سے کاروبار شروع کیا تھا، دوسرے ان کی دکان چوراہے پر تھی، ہر طرف کا آدمی ٹکراتا تھا، تانگوں کا اڈا بھی تھا ہر وقت بھیڑ بھاڑ رہتی تھی۔

وزیر خان تو خوش تھے کہ میرے بھائی کا کاروبار پھیل رہا تھا، وہ خوب کما رہا ہے، مگر حکمت بیگم کے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ اس کو یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ منیر خان اب بھی ہم سے زیادہ کیوں کما رہا ہے۔

حکمت بیگم کے ہاتھ وہ دولت آتے آتے رہ گئی جو منیر خان کما رہے تھے۔ وہی دکان وہی گھر اور منیر خان سے زیادہ تجربہ مگر پھر بھی وزیر خان پیچھے، حکمت بیگم اپنی جھنجلاہٹ وزیر خان پر ہی اتارتی۔

"میں کہتی ہوں کیا فائدہ ہوا۔ ہم تو وہیں کھڑے ہیں۔ ارے میں تو کہتی ہوں تم ہی نکھٹو نا کارہ ہوگئے ہو ارے اب تو وہ اور زیادہ کما رہا ہے، لڑکے بتا رہے ہیں تین تین ملازم دکان پر ہیں، ہر وقت بھیڑ لگی رہتی ہے، نئی نئی گاڑیاں جوڑ کر بیچ رہا ہے اور ایک تم ہو کہ اب تک پنچر ہی لگا رہے ہو۔" حکمت بیگم نے ناک سکوڑ کر کہا۔

وزیر خان نے غصے سے بیوی کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تو جل جل کر مر جائے گی۔ یاد رکھ تو جتنی اس کو دیکھ دیکھ کر جلے گی وہ اتنا ہی ترقی کرتا جائے گا۔ تیری روز روز

کی بک بک میں نے بہت برداشت کرلی۔ تیرے پاس رہوں گا تو تو باز نہیں آئے گی، اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں واپس گاؤں جا رہا ہوں۔ تو نے مارے حسد کے مجھے یہاں پر بلا لیا تھا، مگر نادان عورت تو نہیں جانتی کہ تقدیر سب کی الگ الگ ہوتی ہے۔ میں منیر کی تقدیر کا نہیں لے سکتا۔ دکان کھلی ہے دونوں لڑکے اس کو چلائیں گے میں اپنی پرانی دکان پر جا رہا ہوں اور کان کھول کے سن لے میرے پاس تو نہ آنا اور آئے تو واپسی کا ہرگز نہ کہنا۔" وزیر خان نے ایک سانس میں سارا غبار نکال دیا۔

"ہائے ہائے تم یہ کیا کہہ رہے ہو، میں اکیلی پڑی رہوں گی یہاں پر۔" وہ بولی۔

"تجھے شہر میں رہنے کا بڑا شوق ہے۔ دوسروں کو دیکھ کر جلتی رہ، میں تیرے ساتھ نہیں رہ سکتا، اچھی بھلی آمدنی تھی۔ چین سے گزارہ ہو رہا تھا مگر تیرے پیٹ میں تو منیر کو دیکھ دیکھ کر مروڑ ہو رہی تھی۔ دیکھ لیا مکان اور دوکان لے کر کیا ہوا، آج بھی وہ آگے ہے۔"

"دیکھو شکور کے ابا تم ہار گئے مگر میں نہیں ہاری۔ تم گاؤں نہ جاؤ بس خاموش تماشہ دیکھتے رہو۔" حکمت نے کہا۔

"اب آگے تو کیا کرے گی یہ تو بتا ذرا۔" وزیر خان بولے۔

"جو کروں گی تمہارے سامنے کروں گی۔ تسلی رکھو۔" حکمت بیگم نے کہا۔

"مجھے اب تک عقل نہیں آئی۔" وزیر خاں نے کہا۔

"ارے میاں اب تو آئی ہے عقل اب تک تو میں تمہاری عقل پر چلتی رہی ہوں۔" حکمت نے کہا۔

"ضرور کوئی نئی چال ہوگی، میں تیری کسی چال میں ساتھ نہیں ہوں، اس لیے گاؤں جا رہا ہوں، تاکہ اگر کچھ بھلائی نیک نامی ہو تو میرا تو کوئی نام نہ لے۔" وزیر خان بولے۔

"دیکھو شکور کے ابا، تم نے زندگی میں صرف اتنا کمایا کہ پیٹ بھر گیا۔ میں اچھے دنوں کے انتظار میں ادھیڑ ہوگئی۔ مگر تمہاری پرانی عادت پھر نہ گئی۔" حکمت نے کہا۔

"اری ناشکری اللہ نے پیٹ بھر دیا کیا یہ کم ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اللہ نے بھوکے پیٹ اٹھایا مگر سلایا نہیں۔" وزیر خاں بولے۔

"مگر میرے لیے یہ کافی نہیں ہے، تمہارے ساتھ کے لوگ کہاں سے کہاں تک پہنچ گئے۔" حکمت نے کہا۔

"میں کتنی بار تجھے بتاؤں کہ ہر آدمی اپنی قسمت ساتھ لاتا ہے۔" وزیر خان بولے۔

"انسان کو تدبیر بھی کرنا پڑتی ہے، پھر تقدیر بدلتی ہے۔" حکمت بیگم نے کہا۔

"تو تدبیر کر میں گاؤں جا رہا ہوں، میں تیرے کرتوت کی جواب دہی کے لیے تیار نہیں ہوں۔ جو کچھ تو کرے گی خود ذمہ دار بھی ہوگی۔"

اور وزیر خان نے گاؤں کی پرانی دکان پھر کھول لی۔

حکمت بیگم اکیلی رہ گئی، لڑکے زیادہ بڑے نہ تھے، شکور پندرہ سال کا اور ظہور بارہ سال کا تھا۔ مگر دونوں نے دکان بند نہ کی۔

حکمت بیگم نے پینترا بدل لیا۔ منیر خان سے جیتنا بہت مشکل تھا۔ دوسرا اس کا شوہر ہی اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا، اس کے اندر تو حسد اور جلن کی بھٹی جل رہی تھی۔ منیر خان کے ٹھاٹ دیکھ دیکھ کر اس کے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔

اب اس نے منیر خان کی بیوی الماس بیگم کے پاس جانے کا سلسلہ شروع کردیا۔ گاؤں میں اور اس کے بعد بھی اس نے کبھی الماس کو اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ اس سے ملتی مگر اب جنگ کسی اور طریقہ پر لڑی جا رہی تھی۔

الماس بیگم کو ذرا اس کے آنے کا تعجب تو ہوا مگر اس نے ظاہر نہیں کیا۔

"اے بہن پانی پر لاٹھی مارو تو کیا پانی جدا ہوتا ہے۔ بس بہت دنوں سے آنے کا سوچ رہی تھی، اب جا کے موقع ملا، تم جانو گھر کے بکھیڑوں سے فرصت کب ملتی ہے، حکمت ہنس کر بولی۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

"بات تو ٹھیک ہے، مگر بلاوجہ تو کوئی نہیں آتا۔" الماس نے کہا۔

"دیورانی اور جٹھانی کا ملنا بلاوجہ بھی ہوسکتا ہے، بس یاد آ گئی اور میں آ گئی۔"

"آپا اتنے دنوں کے بعد آپ کو میرا خیال آ گیا۔ یہ بھی غنیمت ہے۔" الماس نے مسکرا کر کہا۔

"اری بہن اپنے پھر اپنے ہوتے ہیں، لاکھ نہ ملیں دور رہیں مگر رشتہ داری تو قائم رہتی ہے۔ محبت بھی دل کے اندر ضرور رہتی ہے۔" حکمت نے کہا۔

"پتہ نہیں آپا آپ سچ کہہ رہی ہیں کہ میرا دل رکھنے کو کہہ رہی ہیں۔ میں گاؤں میں تھی تمہارے دیور کھیت میں کام کرتے تھے، اس وقت میرے پاس نہ شہر سے نہ گاؤں سے کوئی نہیں آتا تھا۔ کسی کو یاد نہیں تھا کہ الماس بھی کوئی ہے۔ جب سے شہر آئی ہوں اور انکا کاروبار چمکا ہے بہت رشتہ دار خود بخود پیدا ہو گئے ہیں، خیر خیریت پتہ کرنے روز آ رہے ہیں۔"

الماس نے ایک تیز نشتر حکمت کو چبھو دیا۔

حکمت نے الماس کی بات سنی وہ کٹ کر رہ گئی مگر عورت تھی اور کسی مطلب کو ذہن میں رکھ کر آئی تھی، اگر کوئی اور موقعہ ہوتا تو الماس کی چٹیا اس کے ہاتھ میں ہوتی۔ اس نے مسکرا کر الماس کا نشتر برداشت کیا اور بولی۔

"بہن یہ وقت وقت کی بات ہے۔ تم مانو نہ مانو مگر اپنوں کا ایک مقام ہوتا ہے۔"

"ضرور ہوتا ہے آپ کا بھی ہماری نظر میں ایک مقام ہے۔" الماس نے پھر تیر چلایا۔

الماس کے تیر حکمت کے سینے کے آر پار ہو رہے تھے۔ مگر وہ برداشت کر رہی تھی۔

"یہ تمہاری لڑکیاں نظر نہیں آ رہی ہیں۔" حکمت نے سمت بدلی۔

"پڑھنے گئی ہیں دونوں۔" الماس نے کہا۔

"اے ہے کیا اسکول میں ڈال دیا ہے۔" حکمت حیرت سے بولی۔

"ہاں تمہارے دیور نے داخل کرا دیا ہے۔" الماس بولی۔

"لو یہ تو نئی بات ہوگئی، لڑکیاں پڑھنے جانے لگیں ہیں۔" حکمت نے حسب عادت جلدی سے کہا۔

"کیوں اس میں کیا خرابی ہے، تم نے تو اپنے لڑکوں کو بھی نہیں پڑھایا۔ اپنی طرح ہی رکھا میری لڑکیاں میری طرح نہ رہیں، اس لیے میں نے ان کو اسکول بھیجا ہے۔" الماس بولی۔

"اچھا ہے چلو خاندان میں کوئی تو پڑھا لکھا ہو۔" حکمت نے پھر پلٹا کھایا۔

اب حکمت ہر دوسرے روز آنے لگی۔ دن میں آتی تو رات تک کھانا کھا کے جاتی، دن بھر پان دان سامنے رکھ کر پان چباتی رہتی۔ "الماس مروت میں اس کی خاطر کرتی اور وہ موقع کی تلاش میں رہتی۔

حکمت نو لکھا بازار بھی روز جاتی وہاں پر ایک بوا عصمت تھیں ان پر سواری آتی تھی۔

بوا عصمت کا کمرہ اگربتیوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا، بوا ایک چوکی پر سر کھول کر بیٹھی تھیں، ان کے چاروں طرف عورتیں بیٹھی تھیں، بوا کے سر کے بال کھلے تھے اور ان کا چہرہ ان میں چھپا ہوا تھا بوا جوان عورت تھیں، مگر سب ادب سے ان کو بوا کہتے تھے۔ سب عورتیں ایک ایک کر کے بوا کے پاس جا رہی تھیں، بوا کے کان میں اپنا مطلب بیان کر رہی تھیں اور بوا ان کی مشکل کا حل ان کو بتا رہی تھیں۔ پورے دو گھنٹے کے بعد حکمت بیگم کا بھی نمبر آ گیا۔

حکمت نے بوا کے کان کے پاس منہ لے جا کر کچھ کہا۔

بوا نے جلالی آواز میں کہا۔

"تو نے شوہر کو بھگا دیا۔ اکیلی کچھ نہیں کر سکتی، پہلے اپنا گھر تو دیکھ پھر دوسرے کام ہوں گے۔"

"تو بوا شوہر کو کس طرح لاؤں۔" حکمت نے پوچھا۔

"ارے تو عورت کیسی ہے، میاں کو نہیں منا سکتی۔"

بوا نے کہا۔

"کوئی ترکیب تو بتاؤ۔" حکمت نے کہا۔

"بہت طریقے ہیں ذرا غور کر شوہر کس بات سے خوش ہوتا ہے یاد کر تو اس کو خوش کرے گی تو وہ تیری خوشی کی خاطر سب کچھ کرے گا۔ پھر تیری دلی مراد پوری ہوگی۔" بوا نے کہا۔ اور حکمت وزیر خان کے پاس گاؤں روانہ ہوگئی۔

وزیر خان نے دیکھا تو ذرا حیران ہوئے۔

"آج کیسے یاد آ گئی۔" وہ بولے۔

"تم بھول گئے تو کیا میں بھی بھول جاتی۔" حکمت ہنس کر بولی۔

"تعجب کی بات ہے۔" وزیر خان بولے۔

"تم مجھے اب تک نہیں سمجھ سکے۔" حکمت بولی۔

"شاید تم نے ٹھیک کہا ہے۔" وزیر خان بولے۔

"بیوی کیسی بھی ہو اس کی زبان کتنی ہی تلخ ہو اندر سے میاں کو چاہتی ہی ہے تم بھی مجھے اوپر اوپر سے دیکھتے رہے ہو، کبھی اندر بھی جھانک لیا ہوتا۔ پھر شکایت نہ کرتے۔" وہ ہنس کر بولی۔

وزیر خان کے لیے یہ نئی بات تھی حکمت بیگم اور ایسی خوبصورت باتیں ان کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

"تم واقعی وہی ہو یا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔" وزیر خان بولے۔

"میں حکمت ہوں! اپنی زبان اور ہٹ دھرمی پر شرمندہ ہوں، اب تم میرے ساتھ چلو۔ دیکھو انکار نہ کرنا ورنہ میں رو دوں گی۔" حکمت ناز سے بولی۔

اور پھر شعلے نے ایک آہ بھری اور آدم کے بیٹے کو پھر چکر میں ڈال دیا۔ اور وزیر خاں پھر بیگم کے ساتھ واپس آ گئے۔

اور دکان پر کام کرنے لگے۔ دوسرے ہی دن حکمت نے رشتہ پر میاں سے بولی۔

"میں منیرہ اور الماس کی طرف جا رہی ہوں۔ شام تک آؤں گی۔"

وزیر خان نے حیرت سے سنا اور بولے۔

"میں نے جو سنا ہے وہی تم نے کہا ہے کہ کچھ اور کہا ہے۔ ذرا دوبارہ تو کہنا۔"

"ہاں جی میں منیرہ اور الماس کے پاس جا رہی ہوں، حیرت کیوں ہو رہی ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"یہ تو پتھر میں جونک لگ گئی، ایسا لگتا ہے۔" وزیر خان بولے۔

"اب تو لگ ہی گئی ہے۔ اپنوں سے کون جدا ہوتا ہے۔" حکمت نے کہا۔

"تم تو ان دونوں کا نام سننے کی روادار نہ تھیں، پھر ایک دم پلٹا کیسے کھا لیا، میرے لیے بات حیرت کی تو ہے وہ جو کسی نے کہا ہے بیٹھا رہ نمازی اس میں بھی جعلسازی۔" وزیر خان بولے۔

"تم بے شک جو دل کرے کہو، آخر کہیں نا کہیں تو جھکنا پڑتا ہے۔ ہر جگہ تو سوکھی لکڑی نہیں بنا جاتا، میں کس سے ملوں میرے میکے والے ہزاروں کوس دور ہیں۔" حکمت بولی۔

"ارے تو بس اس بات پر ناخوش تھوڑی ہوں، میں تو بہت خوش ہوں۔"

"حیرت اس لئے ہو رہی تھی کہ تم نے دیر میں سوچا مگر ٹھیک سوچا۔" وزیر خان بولے۔

"اور ہاں تم بھی وقت نکال کے منیرہ سے مل لیا کرو۔ آخر تو وہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔ تم اس کے بزرگ ہو۔" حکمت نے کہا۔

"آج چاند اور سورج دن میں نظر آ رہے ہیں اور قسم سے پہلے سے زیادہ اچھی نظر آ رہی ہو۔" وزیر خان زور سے ہنس کر بولے۔

"اچھا اب بند کرو یہ چونچلے اب ہماری عمر ان کاموں کی رہی نہیں۔" حکمت کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"کہتے ہیں گھوڑا اور مرد بوڑھا نہیں ہوتا۔" وزیر خان بولے۔

"مگر عورت تو ہوتی ہے بوڑھی۔" حکمت بولی۔

"اگر تعریف کا چارہ اس کو ملتا رہے تو ساٹھ سال کی

READING CORNER
http://readingcorner.blogspot.com/

بھی جوان بننے کی کوشش ضرور کرتی ہے۔" وزیر خان زور سے ہنس کر بولے۔

"ارے کچھ تو خیال کرو۔ آج تم کو ہوا کیا ہے۔" حکمت نے کہا۔

"کچھ نہیں ہوا تم نے بہت دن کے بعد بڑی معقول اور عقل مندی کی بات کی ہے، اس لیے پیار آرہا ہے۔" وزیر خان کھڑے ہو کر بولے۔

حکمت بیگم نے اپنی کامیابی پر زور کا قہقہہ لگایا اور بولی۔ "اب ہٹو بھی۔"

☆.....☆.....☆

بوا کا کمرہ بھرا ہوا تھا۔ ایک ایک کر کے عورتیں ان کے قریب جا رہی تھیں۔ اور اپنی اپنی مشکلات بیان کر رہی تھیں۔ بوا کبھی زور سے کبھی کان میں ان کے مشکلات کا حل بتا رہی تھیں، بوا کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ کمرے میں لوبان کی خوشبو بھری ہوئی حکمت اپنی باری کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

ایک جوان لڑکی بوا کے قریب تھی، بوا نے اس لڑکی کی بات سننے کے بعد زور سے کہا۔

میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ "نہیں ہوگی نہیں ہوگی ضد کرے گی تو نقصان تیرا ہی ہوگا۔"

لڑکی نے بوا کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "بوا تم میری مدد کرو تو ہو جائے گی۔"

"ہاں ہو تو جائے گی مگر وہ سخت ناکارہ ہے تجھے زندگی بھر رلائے گا، تجھے جو نظر نہیں آرہا مجھے تو نظر آرہا ہے، میں تیرے بھلے کو کہہ رہی ہوں کہ اماں باوا کا کہا مان لے کوئی جھگڑا ٹنٹا مت کھڑا کر بہت بدنامی ہوگی اور تیرا بھلا پھر بھی نہیں ہوگا۔ جا اب اس سے زیادہ اور کیا بتاؤں۔" لڑکی سر جھکا کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

پھر ایک عورت نے بوا کے کان میں کچھ کہا تو بوا نے جواب دیا۔

"تیرا مرد اتنا برا نہیں ہے۔ اس سے محبت سے پیش آیا کر ٹھیک ہو جائے گا اب جا۔"

عورتیں آتی رہیں جاتی رہیں بوا ان کو مشورے دیتی رہیں۔ عورتیں ان کے ڈبے میں کچھ نہ کچھ ڈالتی رہیں اور پھر حکمت بیگم کا نمبر آیا۔

"تیرا مرد تجھ سے راضی ہو گیا۔" بوا نے پوچھا۔

"ہاں بوا اب تو خوش ہے۔" حکمت نے کہا۔

"اب تو کیا چاہتی ہے۔" بوا نے پوچھا۔

"بوا میرے حالات منیر خان میرے دیور سے زیادہ خراب ہیں وہ ہزاروں کما رہا ہے میرا میاں بس دال روٹی کماتا ہے، میرے دن بھی پھیر دے۔" حکمت نے کہا۔

"تو بڑی بے وقوف عورت ہے ارے اس کے نصیب اس کے ساتھ اور تیرے تیرے ساتھ ہیں۔ انتظار کر آگے اچھے دن ضرور آئیں گے۔" بوا نے کہا۔

"تو پھر میں جلتی کڑھتی رہوں گی تم کچھ تو کرو۔" حکمت نے کہا۔

بوا نے لال لال آنکھیں اس کی طرف کیں اور بولی۔

"کسی کا برا کرنا میرا کام نہیں ہے تم تو اپنی فطرت کو بدلنے کی کوشش کر، کسی کو دیکھ کر حسد نہ کر، خود کو راہ راست پر رکھ تو بے صبری عورت ہے، میرے پاس تیرے لئے کچھ نہیں ہے۔ جا بھاگ جا اب دوبارہ کبھی نہ آنا۔"

حکمت گردن جھکا کر کمرے سے نکل آئی۔ یہ بہت بڑی ناکامی تھی۔ اب میں کیا کروں ایک آسرا نظر آرہا تھا یہ بوا تو کچھ اور ہی نکلی۔

غالب پورے میں اس کی ایک پڑوسن تھی دوسرے روز وہ اس کے پاس چلی گئی۔

"ارے آؤ آؤ حکمت بہت دن کے بعد آئیں۔" مریم نے کہا۔

"اری بہن کیا بتاؤں گھر کے بکھیڑے کب آنے دیتے ہیں۔" حکمت نے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" مریم نے کہا۔ "کہو کیسے آنا ہوا۔"

"ارے وہ نولکھا والی بوا کے چکر لگا رہی تھی آخر میں انہوں نے دھتا بتا دی۔" حکمت نے کہا۔

"ارے تو کام کیا تھا یہ تو پتہ چلے۔" مریم نے پوچھا۔

"میرے میاں کا کاروبار دیور سے بڑھائے میں دیورانی کے سے ٹھاٹ کروں یہ تمنا ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو دیور بھی میری طرح ہو جائے۔" حکمت نے کہا۔

"بڑی خطرناک خواہش ہے تیری۔" مریم نے کہا۔

"اب کیا کروں یہ تو ہے، تیرے پاس آئی ہوں۔ تو ہی بتا کوئی ایسا ہے جو یہ کام کر دے۔" حکمت نے کہا۔

"تو بوا کو نہیں جانتی وہ اوپر سے جیسی باتیں کرتی ہے ویسی نہیں ہے۔ اس کے دو روپ ہیں دن کا روپ الگ اور رات کا الگ مگر یہ کسی کو پتہ ہے تو میرے ساتھ رات کو اس کے پاس چل۔ پھر تو بوا کا اصل روپ دیکھ سکے گی۔ تو نے جو روپ دیکھا ہے وہ اصل نہیں ہے۔"

"لے تو نے تو نئی چھوڑ دی۔" حکمت نے کہا۔

"اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی پھر تو میری بات کا یقین کرے گی۔" مریم نے کہا۔

"ٹھیک ہے چل کب چلے گی۔" حکمت نے پوچھا۔

"آج تو میں نہیں جاؤں گی۔ تو ایسا کرنا کہ کل رات کو مغرب کے بعد آجا مگر عشاء سے پہلے اور سن کسی کو پتہ نہ چلے کہ تو کہاں جا رہی ہے۔"

دوسرے دن مغرب کے ختم ہوتے ہی حکمت مریم کے گھر تھی مریم اس کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ مریم نے جلدی سے برقعہ اوڑھا اور اپنی لڑکی کو بولی۔

"میں ذرا منڈی جا رہی ہوں گھر کا خیال رکھیو، تیرا ابا آجائے تو کھانا دیدیجیو اور پوچھے تو بتلا بھی دیجیو۔"

اور دونوں دروازے سے باہر آگئیں اور تانگا پکڑ کے بوا کے گھر کی طرف روانہ ہوئیں، بوا کا آستانہ رات کو بند ہوتا تھا۔ مریم نے دروازہ بجایا تو ایک عورت نے دروازہ کھولا پوچھا کس سے ملنا ہے۔

مریم نے کہا۔ "بوا سے ملنا ہے۔"

عورت بولی۔ "صبح آنا وہ رات کو نہیں ملتیں۔"

"تم ان کو کہو مریم نولکھا والی آئی ہے، ضروری کام ہے۔"

عورت نے کہا۔ "اچھا آپ ذرا ٹھہرو میں بتاتی ہوں۔"

چند منٹ کے بعد وہ واپس آگئی اور بولی۔ "آجاؤ بلاتی ہیں۔"

"اندر گھر بہت بڑا تھا صحن کے بعد کئی کمرے نظر آرہے تھے۔ نہایت صاف ستھرے کمرے عورت ایک دروازے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ "وہاں ہیں چلی جاؤ۔"

مریم نے دروازے پر پہنچ کر کہا۔ "آجاؤں بوا۔"

اندر سے آواز آئی "آجاؤ۔"

دونوں اندر چلی گئیں کمرے میں دو بڑے بڑے لیمپ روشن تھے۔

ایک بہت بڑا پلنگ ایک طرف پڑا تھا اس پر ایک سفید رنگ کی چادر پڑی تھی، بڑے بڑے دو تکیے رکھے تھے اور ایک عورت ایک کرسی پر بیٹھی سنگار کر رہی تھی، اس کے سامنے بہت بڑا آئینہ رکھا۔ اور بڑے قیمتی زیورات رکھے تھے۔ حکمت نے نہیں پہچانا کہ یہ کون ہے۔ مگر مریم اس کے سامنے ادب سے کھڑی ہو گئی۔

"تجھے رات کو کیا ضرورت پڑ گئی مریم۔" بوا نے کہا۔

"بس کیا بتاؤں جہانی بیگم، کام ہے تو آئی ہوں۔" مریم نے کہا۔

"ابھی تو میں جہانی ہوں پھر بھی بتاؤ۔" جہانی نے کہا۔

"یہ عورت آئی تھی بوا کے پاس انہوں نے حسب دستور ان کو مشورہ دیا تھا مگر ان کا کام تو نہیں ہوا۔"

"تم کو پتہ ہے بوا کا تو یہی دستور ہے۔"

"آپ کا کہیں جانے کا پروگرام ہے کیا۔" مریم نے پوچھا۔

"نہیں تو جاؤں گی کہاں۔ بوا کا استقبال کرنے کی تیاری ہے یہ تو۔" جہانی نے کہا۔

"بوا کا استقبال اس طرح۔" مریم حیرت سے

READING CORNER http://readingcorner.blogspot.com

بولی۔

ہاں بوا کوئی عورت نہیں ہے وہ میرا مرد بھی ہے۔ مگر تم کسی کو نہ بتانا ورنہ تمہارا گھر تک اکھاڑ کر پھینک دے گا وہ۔"

"تعجب کی بات ہے ہم سب تو زنانی سمجھتے تھے۔" مریم نے کہا۔

"تم اب بھی یہی سمجھ لو۔ زبان پر بات آئی کہ تم پر تباہی آ ہی۔ میری زبان سے نکل گیا ہے۔ تو سزا بھی مجھے ملے گی، مگر میں تو اب عادی سی ہو گئی ہوں تم اپنی فکر کرو۔"

"نہیں نہیں میری زبان پر تو تالے ہیں اور تم بھی سن لو حکمت بیگم جہانی نے جو کہا ہے اس کو یاد رکھنا اب تم ہی اپنا دکھڑا بیان کرو۔" مریم نے کہا۔

اور حکمت نے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

"اچھا اب تم جاؤ میں بوا سے کہہ دوں گی تم کل رات نو بجے آ جانا جواب مل جائے گا۔" جہانی نے کہا۔

"کام ہو تو جائے گا۔" حکمت نے پوچھا۔

"ارے وہ تو ان کاموں کا ہی بنا ہوا ہے، اس کے لیے کون سا مشکل ہے۔ فکر نہ کرو جاؤ۔"

"باہر آ کر حکمت نے کہا۔ "جہانی تو بڑی خوبصورت عورت ہے دن میں تو ایسی نظر نہیں آتی۔ اس کا چہرہ تو بالوں میں چھپا رہتا ہے، نظر کب آتا ہے۔" مریم نے کہا۔

"یہ بوا آخر کون ہے۔" حکمت نے آہستہ سے پوچھا۔

مریم نے منہ حکمت کے کانوں کے پاس کیا اور بولی۔ "یہ جہانی بیگم کا عاشق جن ہے۔ تو نے دیکھا نہیں کہ کیسی تیاری کر رہی تھی اس کے استقبال کی۔

"اور کیسے خوبصورت اور قیمتی زیورات اس کے سامنے پڑے تھے۔" حکمت نے کہا۔

"یہ سب وہی لا کر دیتا ہے، مگر ہمت ہے جہانی بیگم کی۔" "یہ تو کہنا پڑے گا۔" مریم نے کہا۔

"کل تو ایسا کرنا میرے پاس آٹھ بجے آ جانا تانگہ کر کے آنا میں اس میں تیرے ساتھ آ جاؤں گی اور دعا کرنا وہ تیار ہو جائے۔"

جہانی کے دروازے پر رات نو بجے دونوں موجود تھیں۔ کمرے میں جہانی دلہن بنی موجود تھی، وہ دونوں اس کے سامنے پہنچیں تو جہانی نے مردانی آواز میں کہا۔

"اب بول حکمت بیگم کیا معاملہ ہے۔"

"حکمت نے سب بتا دیا تو جہانی نے کہا۔

"ٹھیک ہے کام کر دوں گا مگر مجھے کیا ملے گا اس کام کے بدلے۔"

"آپ کو کیا چاہیے آپ بتائیں۔"

"اچھا میں پھر بھی بتاؤں گا مگر تم کو میرا کام پورا کرنا ہوگا، اگر نہ کیا تو تمہارا حشر اور زیادہ خراب ہوگا، سوچ لو یہ اندھا سودا ہے۔" جہانی نے کہا۔

"تم جو مانگو گے میں دے دوں گی، مگر میرا کام کر دو۔" حکمت نے کہا۔

"ٹھیک ہے اپنی بات پر قائم رہنا کل سے تیرے کام کی ابتدا کرتا ہوں۔" جہانی نے کہا۔

آج حکمت کی خوشی کا دن تھا۔ وہ بہت خوش خوش گھر آ گئی۔

دوسرے دن پتہ چلا کہ منیر خان کا ملازم جو دن بھر کی بکری کی رقم رکھتا تھا سب مال لے کر بھاگ گیا ہے۔ اب اس طرح کے نقصانات روز ہونے لگے۔ گھر میں آگ لگ گئی۔ گودام میں چوری ہو گئی۔

ہر روز کچھ نہ کچھ ہونے لگا اور پھر ایک لڑکی پر دورے پڑنے لگے۔ بیوی بیمار ہو گئی۔

اور منیر خان کا شیرازہ بکھرنے لگا ایک طرف کاروبار کی بربادی دوسری طرف گھر کی تباہی، منیر خان ذہنی اور مالی مشکلات میں مبتلا ہو گئے۔

ایک سال کے اندر اندر ان کی حالت اتنی خراب ہو گئی کہ وہ آگرہ چھوڑ کر جانے پر تیار ہو گئے۔

اور دلی جانے کے بارے میں سوچنے لگے۔ مگر جانے سے پہلے وہ دلی کے حالات دیکھنے دلی آئے اور میری ملاقات جمعہ کی نماز کے بعد ان سے ہوئی۔

منیر خان نے اچانک ان کے کاروبار اور گھریلو حالات بگڑنے کی داستان سنائی۔

بات تھی بھی حیرت کی لاکھوں کا کاروبار ایک سال میں برباد ہو گیا۔ زندگی بھر کی محنت برباد ہو گئی اولاد کی طرف سے الگ فکر لگی ہوئی تھی۔

میں ان کو لے کر اپنے مطب میں آ گیا۔ یہاں پر رولوکا موجود تھا۔

میں نے سارے حالات رولوکا کو بتائے تو رولوکا نے کہا۔

"اگر یہ بربادی قدرت کی طرف سے ہے تو آپ کہیں بھی جائیں حالات درست نہیں ہوں گے اور اگر کسی نے شرارت کی ہے تو اس کو وہیں پر دیکھا جا سکتا ہے۔ آپ اپنا ٹھکانہ کیوں چھوڑتے ہو۔"

"میرا خیال ہے حکیم صاحب کہ ساری گڑبڑ کرائی گئی ہے۔ مگر کون ایسا کرے گا۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ یہ ساری مصیبت اچانک آئی ہے اور متواتر آ رہی ہے۔"

"اگر میں وہاں رہا تو ڈر ہے کہ اب مجھ پر میری اولاد پر بیوی پر آئے گی۔ کیونکہ مالی طور پر تو مجھ کو برباد کر دیا گیا ہے۔ اب ہماری زندگیوں کی باری ہے۔"

"آپ کا خیال درست ہو سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا مگر آپ فکر نہ کریں، ہر مرض کا علاج ہے آپ بے فکر ہو کر جائیں، مجھے پتہ دے دیں میں بہت جلد آپ کے پاس آؤں گا آپ میرا انتظار کریں اور کوئی قدم پہلے سے نہ اٹھائیں۔" رولوکا نے کہا۔

اور منیر خان واپس آگرہ آ گئے۔

اب کیا ارادہ ہے ان کی بیوی الماس نے پوچھا۔

"ایک صاحب آنے والے ہیں ان کے آنے کے بعد فیصلہ کروں گا۔" منیر خان بولے۔

"اور ان کے آنے تک میری بچی کو کچھ ہو گیا تو۔" وہ بولی۔

"اللہ پر بھروسہ کر نیک بخت سب ٹھیک ہو جائے گا، اچھے دن نہ رہے تو برے بھی نہیں رہیں گے۔"

منیر خان نے جواب دیا۔

"تمہاری بات تو ٹھیک ہے مگر بڑی کی حالت گرتی ہی جا رہی ہے۔ اچانک پاگلوں کی سی حرکتیں کرنے لگتی ہے۔" الماس نے بتایا۔

"اب ذرا صبر کرو وہ بہت بڑے حکیم ہیں کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔"

دو روز کے بعد رولوکا آگرہ آ گیا۔ اس نے آتے ہی لڑکی کا معائنہ کیا اور کچھ دوائیں دے دیں۔

میں نے لڑکی کو دیکھا تو کچھ بیمار نظر نہ آئی۔ مجھے اس وقت شک ہو گیا کہ معاملہ کچھ اور ہے میں نے دکان اور گھر پر پہرے لگائے اور رات کا انتظار کرنے لگا۔ رات میں کچھ نہ ہوا پھر پورا دن بھی گزر گیا۔ میرے ہرکارے نے بتایا کہ ایک جن گھر میں آنے کی کوشش میں تھا مگر پھر واپس چلا گیا میں اس کے ساتھ لگ گیا وہ ایک گھر میں چلا گیا اور پھر واپس نہ آیا۔

دوسرے دن رولوکا بوا کے آستانے پر موجود تھا۔ اس کے دو پہرے دار اس کے ساتھ تھے، آستانے کے باہر موجود رہے۔ رولوکا روپوشی کی حالت میں آستانے کے اندر چلا گیا۔ ایک عورت جس کے بال اس کے چہرے پر پڑے تھے وہ عورتوں سے باتیں کر رہی تھی۔ اور ان کو بظاہر بڑے نیک اور اچھے مشورے دے رہی تھی۔

عورتیں سب چلی گئیں تو وہ عورت گھر میں چلی گئی۔ رولوکا اس کے ساتھ روپوشی میں تھا اس نے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور کپڑے بدلنے لگی۔

اور پھر رات کی تیاری کرنے لگی۔ رولوکا نے اس کے کسی کام میں مداخلت نہیں کی۔ رات بارہ بجے ایک جوان اس کے پاس آ گیا اور بولا۔

"میرا خیال ہے تم تھک گئی ہو ایسا کرو یہ آستانہ بند کر دو۔ مجھے کچھ خطرے کی بو آ رہی ہے۔ میرا تو کچھ نہیں ہوگا تم کسی مصیبت میں نہ پڑ جاؤ۔"

"تم سے بھی بڑا کوئی خطرہ ہو سکتا ہے تم تو پورے کے پورے خطرہ ہی ہو۔" عورت نے کہا۔

READING CORNER http://readingcornerpk.blogspot.com/

"دیکھو جہانی ایک سے بڑھ کر ایک پڑا ہے میں نے منیرہ خان والا کام کر کے محسوس کیا ہے کہ خطرہ میرے بھی قریب آ رہا ہے۔ اس لیے کہتا ہوں آستانہ بند کر دو اور آگرہ سے جانے کی تیاری کرو۔" بوا نے کہا۔

"دیکھو بوا تم جاتے ہو تو جاؤ جب تمہارے لئے خطرہ نہ ہو آ جانا میں تمہاری خدمت کو حاضر ہوں گی۔ مگر آگرہ چھوڑ کر میں نہیں جاؤں گی۔" جہانی نے جواب دیا۔

"مجھ سے بے وفائی کرو گی۔" بوا نے پوچھا۔

"نہیں تم سے بے وفائی کا میں سوچ نہیں سکتی۔ تم ایسا خیال بھی دل میں نہ لانا۔" جہانی بیگم نے کہا۔

"پھر تم کو مجھ پر بھروسہ نہیں کیوں میرا ساتھ چھوڑ رہی ہو۔" بوا نے پوچھا۔

"میں کہاں ساتھ چھوڑ رہی ہوں تم رہو میرے ساتھ میں حاضر ہوں خدمت کو۔" جہانی نے کہا۔

"مگر میرے لیے یہاں کے حالات بگڑتے نظر آ رہے ہیں۔" بوا نے کہا۔

"تمہیں وہم ہو گیا ہے تم کو کون چھیڑے گا تم تو خود بہت بڑی آفت ہو۔" جہانی نے کہا۔

"تم کو پتہ نہیں ہے میں دو تین روز سے اپنے اردگرد کچھ محسوس کر رہا ہوں مگر مجھے کچھ اندازہ نہیں ہے کہ وہ کیا شے ہے میں جب یہ نہیں جانتا کہ وہ کیا چیز ہے تو بتاؤ اس کا کیا مقابلہ کروں گا۔" بوا نے کہا۔

"تو پھر اپنے کسی بڑے سے ملاقات کر لو۔ ان کو اپنی مدد کو بلا لو تم تو بہت ہو۔" جہانی نے کہا۔

"آج کے دور میں سب اپنے اپنے کاموں میں لگے ہیں، دوسری بات میرے بڑوں کو میرا تم سے ملنا سخت ناپسند ہے، وہ میری کوئی مدد کرنے کی بجائے خوش ہوں گے۔

میرے پاس سوائے فرار کے کوئی راستہ نہیں ہے، میں تمہارے بغیر کہیں نہیں رہ سکتا، اس لیے تم کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"زبردستی کرو گے، اپنی محبت پر زبردستی تم کر لو گے۔" جہانی نے پوچھا۔

"تم کو میں نہیں چھوڑ سکتا۔" بوا نے جواب دیا۔

"اچھا ٹھیک ہے میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔" جہانی نے کہا۔

"میں جانتا تھا تم کو بھی میری عادت پڑ چکی ہے تم میرا ساتھ نہیں چھوڑو گی۔" بوا نے جواب دیا۔

"بولو کہاں کا ارادہ ہے۔" جہانی بیگم نے پوچھا۔

"باہر تو آؤ پھر بتاتا ہوں۔" بوا نے خوش ہو کر کہا۔

جہانی اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں دروازے کی طرف چلے۔ مگر دروازے پر جا کر بوا کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔ "یہ تو بند ہے۔" وہ کھڑکی پر گیا اور پلٹ کر آ گیا جہانی نے پوچھا۔ "کیا ہوا۔"

"سب راستوں پر سخت پہرہ ہے اور پہرے دار بھی نئے نظر آتے ہیں۔" بوا نے کہا۔

"تو پھر اب کیسے نکلیں گے۔" جہانی نے پوچھا۔

"اب تو قید میں ہیں باہر جانا مشکل ہوگا۔" بوا نے کہا۔

"تم تو خود اتنی بڑی طاقت کے مالک ہو کچھ تو کرو۔" جہانی نے کہا۔

"میں کس کے خلاف کروں کوئی نظر آئے تو کروں اس نے تو اپنا کام کر دیا ہے میں اندر قید ہوں اگر کوئی سامنے آئے تو بات ہو۔"

رولو کا نے پہرے داروں کو ہوشیار رہنے کا اشارہ کیا اور منیر خان کے پاس آ گیا۔

تین دن متواتر وہ جہانی کے گھر نہیں گیا۔ بوا کا آستانہ بند ہو گیا۔

بوا اور جہانی ایک کمرے میں قید تھے، ان کے پاس نہ غذا تھی نہ پانی تین دن کے بعد رولو کا اس کمرے میں موجود تھا۔ جہانی کا چہرہ فق تھا۔ ہونٹوں پر پپڑی جمی تھی۔ بھوک اور پیاس کی شدت سے اس قدر کمزوری تھی کہ کھڑا تک نہیں ہوا جا رہا تھا۔

پھر ایک سراحی پانی اس کے سامنے اچانک آ گیا اور

وہ لپک کر اس کی طرف بڑھی اور اٹھا کر منہ سے سراحی کو لگا لیا۔ پانی ٹھنڈا تھا پی کر اس کو بڑا سکون ملا۔ وہی سراحی اس نے بوا کی طرف بڑھا دی۔

بوا نے سراحی ہاتھ میں پکڑی اور کہا۔ "کون ہے تو۔"

کوئی آواز نہ آئی تو وہ پھر بولا۔ "میں مانتا ہوں تو بڑی طاقت والا ہے پر تو کون ہے۔"

رولو کا اس کے قریب کھڑا مسکراتا رہا۔ وہ سراحی سے سوالات کرتا رہا۔ اور پھر دیوانوں کی طرح کمرے میں چکر لگانے لگا۔

جہانی کے سامنے ایک ناشتہ دان آ گیا، اس نے حیرت سے اس کو دیکھا اور دوڑ کر اس کو اٹھا لیا اور کھول کر کھانے لگی، اس نے بوا کو بھی نہیں پوچھا۔

بھوک بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ انسان کو صرف اپنا خالی پیٹ نظر آتا ہے۔

جب پیٹ میں اناج کا دانہ آ جاتا ہے تو اس کی آنکھیں کھلتی ہیں اور حواس کام کرتے ہیں۔ بھوک بری شے ہے جہانی کا پیٹ بھر گیا تو اس نے باقی کھانا بوا کی طرف بڑھا دیا۔

"تیرا پیٹ بھر گیا تو تجھے میرا خیال آیا۔" بوا نے پوچھا۔

"تین دن کی بھوک تھی مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔" جہانی نے جواب دیا۔

"محبت اسی کا نام ہے۔" بوا نے پوچھا۔

"محبت کا پتہ نہیں مگر پیٹ میں روٹی نہ ہو تو انسان کو کچھ نظر نہیں آتا۔" جہانی نے کہا۔

"انسان کی کمزوری روٹی ہے، میری کمزوری نہیں ہے میں سمجھ چکا ہوں کہ تو میری وفادار نہیں ہے۔ تو روٹی کی وفادار ہے۔" بوا نے کہا۔

"میں انسان ہوں بوا۔ ذرا یہ تو خیال کر۔" جہانی نے کہا۔

"اب تیرا اور میرا راستہ الگ الگ ہے میں موقع ملتے ہی چلا جاؤں گا۔" بوا نے کہا۔

اور پھر ایک آواز کمرے میں آئی یہ آواز کس طرف سے آئی، کس کی آئی دونوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔

"تو کبھی رہا نہیں ہوگا۔ تیرے کرتوت نے تجھے قیدی بنایا ہے۔"

"تو کون ہے ذرا سامنے تو آ۔" بوا نے کہا۔

"میں سامنے اپنے جیسوں کے آتا ہوں تجھ جیسے بدکاروں کے سامنے نہیں آتا۔" آواز آئی۔

"میں مانتا ہوں میں نے اب تک کوئی اچھا کام نہیں کیا ہے۔ مجھے معاف کر دے۔"

معافی اپنے پیدا کرنے والے سے مانگ، معافی اس سے مانگ جس نے تجھے طاقت دی۔ زندگی دی، اس کے بدلے میں تو نے اس کو کیا دیا۔ ذرا غور کر، تو اس کمرے میں قید رہے گا اور شاید پوری زندگی باہر نہ آ سکے گا۔" آواز بند ہو گئی۔

میں وعدہ کرتا ہوں آئندہ ایسا کوئی کام نہیں کروں گا۔ جس سے مخلوق خدا کو تکلیف پہنچے۔ مجھے ایک موقع میرے گناہوں کے کفارے کو عطا کر دے۔"

آواز پھر آئی۔ "مگر یاد رکھ یہ آخری موقع ہوگا اس کے بعد کوئی موقع نہیں ملے گا۔"

"میں توبہ کرتا ہوں۔ میں انسانوں کو کھلونے سمجھتا تھا، یہ میری بھول تھی۔"

"میں تجھے آزادی دے سکتا ہوں مگر تجھے کچھ کام کرنے ہوں گے اور زندگی بھر کرنا ہوں گے۔ اگر تو نے ان کاموں میں کوتاہی کی تو یہ نہ سمجھنا کہ تجھے کوئی نہیں دیکھ رہا۔ اس کوتاہی کی بڑی بھیانک سزا ہو سکتی ہے۔" آواز آئی۔

"میں ہرگز کوتاہی نہیں کروں گا میرا وعدہ ہے۔" بوا نے کہا۔

اور آواز نے بتا دیا کہ کیا کیا کام کرنے ہیں۔ یہ کام تین دن میں پورا کرنا ہے۔ بول کر سکتا ہے۔" آواز بند ہو گئی۔

"میں ضرور کروں گا۔" بوا نے جلدی سے کہا۔

آواز بند ہوتے ہی بوا تیزی سے دروازے کے باہر

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

چلا گیا۔ اس نے جہانی کی طرف دیکھا بھی نہیں، اس کے جانے کے بعد آواز آئی۔

"تو بھی اب انسانوں سے دل لگا تیرا جوڑا صرف انسانوں سے ہے، سارے کھیل تماشے بند کردے۔ یاد رکھ بھوک بہت بری چیز ہے، تو نے ذرا سا بھوک کا مزا چکھا ہے موقعہ بار بار نہیں ملتا تیرے لیے بھی یہ آخری موقع ہے۔ اور میں اس کمرے سے باہر آ گیا۔" رولو کا نے پوری روداد سنا ڈالی۔

"تو بوا کے دل میں حسرت ہی رہی تمہارے دیدار کی۔" میں نے کہا۔

"میں اس کے سامنے آ سکتا تھا مگر میں نے اندازہ کرلیا تھا کہ یہ صرف شوباز جن ہے۔ کھیل تماشے کرنے والا جم کر لڑنے والا نہیں ہے۔ اسکے لیے اتنا ہی کافی ہوگا۔"

پھر دوبارہ وہ ایسی حرکت نہ کرے، اس کے لیے میں نے اس کو ایک کام میں مصروف کردیا۔ اور تم نے کام بھی ایسا دیا کہ دن رات فرصت ہی نہ ملے۔ میں نے بات کاٹ کر کہا۔

رولو کا زور سے ہنس پڑا۔

منیر خان نے از سر نو پھر زندگی شروع کردی اور بہت جلد ان کی دکان پھر سے اسی طرح چلنے لگی۔ وزیر خان کو بھائی کی بربادی کا اتنا صدمہ ہوا کہ وہ بیمار ہو کر مر گئے۔ ان کی بیوہ ایک یکے سے گر کر اپنی ایک ٹانگ سے محروم ہوگئیں۔

لڑکوں نے شادیاں کرلیں اور ان کی بیویوں نے ساس کو بھکارن بنا دیا۔

یہ قدرتی سزائیں ہیں کسی کی آہ کبھی نہ کبھی اثر ضرور کرتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انسان اپنے کیے گئے گناہوں کو بھول جاتا ہے۔ مگر اوپر جو رجسٹر ہے اس کا لکھا نہیں مٹایا جاسکتا۔

☆.....☆.....☆

آدمی آلام و مصائب کا مقابلہ کرتا ہے اور کر بھی کیا سکتا ہے، مگر مقابلہ اس صورت میں کرسکتا ہے کہ اس کو تمام صورت حال کا علم ہو اگر اس کی کیفیت بے یقینی والی ہو تو اس پر گھبراہٹ سوار ہو جاتی ہے۔ اور وہ دلدل میں پھنسے آدمی کی طرح ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ اور زیادہ دلدل کے اندر دھنس جاتا ہے۔ میں بھی اپنے بچاؤ کی خاطر ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں، مگر مجھے لگتا ہے کہ ڈوبنا میرا مقدر ہوگیا ہے۔ وہ اداسی سے بولے۔

میرے سامنے ایک بیس بائیس سال کا جوان بیٹھا تھا، اس کے چہرے پر زردی اور نگاہوں میں ناامیدی صاف نظر آتی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"آپ اپنی روداد پوری سنائیں تاکہ پورا کیس ہمارے سامنے آجائے۔"

رولو کا نے کہا۔ "ہمارا طریقہ کار ذرا الگ سا ہے ہم ساری بات سننے کے بعد علاج کرتے ہیں۔

"ٹھیک ہے میں سنانے کو تیار ہوں۔" وہ بولا۔

"میرا نام م مراری ہے، میں شیام کمار زمیندار کا ناجائز بیٹا ہوں۔

شیام کمار کی زمینداری اودھے پور کے آگے ہے۔ یہ ان کی خاندانی جاگیر ہے۔ یہ جاگیر ان کے بڑوں کو اکبر بادشاہ نے ان کی بہادری اور وفاداری کے بدلے دی تھی۔ پورے سات گاؤں کی زمینداری تھی اور اب تک ہے، شیام کمار کے دو لڑکے ہوئے۔ بڑے کا نام منوہر کمار اور چھوٹے کا نام شنکر کمار ہے۔ اور میں بھی ان کا بیٹا ہوں۔

شیام کمار بڑے اصولوں کے آدمی تھے۔ انہوں نے منوہر اور شنکر دونوں کو کہہ دیا تھا کہ مراری اور اس کی ماں کو کبھی کوئی پریشانی نہ ہونے دینا میں دونوں سے بہت چھوٹا تھا ان دونوں نے باپ کا کہا پورا کیا۔

ہم لوگ بہت دور کے گاؤں میں رہتے تھے۔ شیام کمار نے تسلیم کرلیا تھا کہ میں ان کا بیٹا ہوں، مگر ان کی پتنی ماں کی کٹر دشمن تھی، اگر شیام کمار نہ ہوتے تو وہ شاید ہم دونوں کو مروا ہی دیتی۔

منوہر کو پڑھنے کا شوق تھا اور وہ دلی میں پڑھتا تھا، وہاں سے آتا تھا تو بھی اس کے سامان میں کتابیں زیادہ ہوتی تھیں۔ اس کے مقابلے میں شنکر کھیل کود کی طرف زیادہ

دھیان دیتا تھا۔ گھڑ سواری اور تیراکی اس کے پسندیدہ کھیل تھے۔ شکار کا بہت شوقین تھا۔

اپنی کم عمری کے باوجود وہ بہت اچھی صحت کا مالک تھا اور اس کی اٹھان بتاتی تھی کہ وہ بڑا کڑیل جوان بنے گا۔ وہ منوہر سے پانچ سال چھوٹا تھا، مگر قد میں منوہر کے برابر آ گیا تھا۔ وہ سارے دن اپنے گھوڑے پر دوڑتا رہتا تھا۔ اس کو ساتوں گاؤں والے جانتے تھے۔ منوہر بڑا تھا، مگر اس کو کم لوگ جانتے تھے۔ وہ تعلیم کے سلسلے میں گھر پر کم رہا کرتا تھا۔ شنکر پڑھتا تھا مگر اس کا ایک وقت مقرر تھا۔ باپ کا اور ماں کا لاڈلا بھی تھا۔

مگر اس نے کبھی کسی کو ناجائز تنگ نہیں کیا تھا۔ سب لوگ اس کو چاہتے تھے۔ میری ماں تو اس کو بہت پیار کرتی تھی۔

"ارے بھیا کیا تم دن بھر کمرے میں پڑے رہتے ہو کبھی تازہ ہوا بھی لے لیا کرو۔" شنکر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"پڑا کہاں پڑھ رہا ہوں۔" منوہر نے جواب دیا۔

"اب اور کتنا پڑھو گے بھیا وکالت کر چکے ذرا گھومو پھرو۔ یہ بھی تو ضروری ہے۔" شنکر بولا۔ جو جو ضروری ہے اس سب کی لسٹ بنا کر مجھے دے دے منوہر ہنس کر بولا۔

"بھیا بہت لمبی لسٹ ہو جائے گی۔" شنکر بولا۔

"اچھا تو پھر جو خاص ضروری ہو وہ لسٹ بنا دے۔" منوہر نے کہا۔

"ایک ضروری بات تو ابھی لسٹ کے بغیر بھی بتا سکتا ہوں۔" شنکر نے کہا۔

"اچھا آپ کو یاد ہے بتایئے۔" منوہر نے کہا۔

"بھیا آپ شادی کرلیں یہ گھر گرہستی کے لیے ضروری ہے۔ آپ کی شادی ہوگی کتنا مزا آئے گا۔ بھابی آئے گی حویلی میں رونق بڑھے گی اور جب کوئی بچا کہنے والا آئے گا تو میرا تو سر اونچا ہو جائے گا۔" شنکر اکڑ کر بولا۔

"واہ واہ سپنے تم دن میں بھی دیکھنے لگے ہو۔" منوہر نے کہا۔

"مگر بھیا یہ سپنا نہیں ہے یہ سب ہونے والا ہے۔" شنکر نے کہا۔

"اچھا یہ سب چھوڑ، تو گاؤں گیا تھا۔" منوہر نے پوچھا۔

"ہر دوسرے دن جاتا ہوں کیوں۔" شنکر بولا۔

"مراری کیسا ہے۔" منوہر نے پوچھا۔

"ارے اب تو بڑا شرارتی ہوگیا ہے۔ مجھ سے لپٹ جاتا ہے کہتا ہے حویلی لے چلو۔" شنکر نے کہا۔

"اس کا حق ہے کہ وہ حویلی میں رہے مگر ماتا جی کو کون سمجھائے وہ تو اس کا نام سننا بھی گوارہ نہیں کرتیں، پتا جی کہہ چکے ہیں کہ وہ ان کا بیٹا ہے تو پھر باقی کیا رہا۔" منوہر نے کہا۔

"آپ نے ٹھیک کہا بھیا مگر ہم ماتا جی کا سامنا بھی نہیں کرسکتے۔" شنکر نے کہا۔

"مجھے ایسا لگتا ہے ماتا جی اپنی زندگی میں تو اس کو حویلی کے اندر نہیں آنے دیں گی۔" منوہر بولا۔

"لگتا تو یہی ہے مگر کیا پتا آگے کیا حالات ہوں۔" شنکر بولا۔

"اچھا اب کے تو جائے تو بتانا میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔" منوہر نے کہا۔

"پرسوں سویرے چلتے ہیں، ایک گھنٹہ کا سفر ہے۔" شنکر نے کہا۔

دونوں بھائی اپنے سوتیلے بھائی کے پاس جا رہے تھے۔ شیام کمار نے اس کو ایک گاؤں میں رکھا ہوا تھا۔ مراری کی ماں ان کی بیوی نہیں تھی۔ اس حساب سے اس کی اولاد کسی طرح شیام کی جائیداد پر حق نہیں رکھتی تھی، مگر یہ شیام کی شرافت تھی کہ اسنے اپنی زندگی میں ہی مراری کو اپنا بیٹا کہہ دیا تھا، اس نے بڑی دور اندیشی سے یہ اعلان کیا تھا، اس کے دونوں قانونی بیٹے اس کے فیصلے کو قبول کر چکے تھے اور دلی طور پر مراری کو اپنا بھائی سمجھتے تھے۔

حالانکہ ان کی ماں نے ان کو اپنے خیالات پر چلانے کی کوشش ضرور کی مگر ان کا آئیڈیل انکا باپ

READING CORNER
http://readingcorner.blogspot.com/

تھا۔ مراری کی ماں کو گاؤں میں شیام نے بہت اچھا مکان بنا کر دیا تھا۔ ضرورت کی ہر چیز اس میں موجود تھی کئی ملازم اور جانور بھی تھے۔

مراری کی ماں اسی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ ایک رات شیام کو اس گاؤں میں رہنا پڑ گیا اور اسی مکان میں شیام کار کنا ہوا۔ کھانے کے بعد رات کا دودھ بستر پر دینے ایک نوجوان لڑکی آئی۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں شیام نے دیکھا اس کے جسم کے مناسب اور دلکش نشیب و فراز اور چہرے کے تیکھے نقوش جلد کی کھلتی ہوئی سفیدی مائل رنگت گداز بدن کو ساڑھی میں چھپانے کا انداز بڑا دلنواز تھا۔ وہ مرد کی تنہائی میں اور مرد بھی ایسا جو اس گاؤں کا مالک مختار تھا۔ وہ خود کو نہ بچا سکی۔

"اب میرا کیا ہوگا زمیندار جی، تم تو چلے جاؤ گے مجھے یہ گاؤں والے کب جینے دیں گے۔ مجھے بھی ساتھ لے چلو، وہ جال میں پھنسی ہرنی کی طرح بولی۔

"میرے ہوتے ہوئے تجھے کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ میں آتا رہوں گا۔ تیری حفاظت کو آدمی رکھ دوں گا۔"

اور شیام نے جو کہا تھا وہ کر دیا اور نو ماہ کے بعد مراری پیدا ہوا۔

شیام نے منوہر سے کہا۔ "بیٹا آدمی بڑا ڈھیٹ جانور ہے۔ اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتا۔

اور اگر تسلیم کر بھی لے تو اس غلطی کی توجیہات پیش کرتا ہے اور خود کو حق پر ثابت کرنے کو ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔ مگر میں دنیا کے اور تمہارے سامنے کوئی توجیہہ پیش نہیں کروں گا۔ انسان کو زندگی میں بعض اوقات بڑے سخت مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور اس وقت میں بھی ایسے ہی مرحلے پر ہوں تم میری اولاد ہو میں اپنی غلطی تمہارے سامنے قبول کر رہا ہوں، میں نے غلطی کی ہے۔ مراری کی ماں اور مراری بے قصور ہیں، میرے بعد بھی تم میری غلطی کی حفاظت کرنا، میں نے کسی بدنامی رسوائی کی پرواہ نہیں کی، اپنی زمینداری کی شان اور بیوی کی ناراضگی کسی کی پرواہ نہیں کی اور اپنی غلطی مان لی ہے۔ اب تم میری لاج رکھنا۔ کیونکہ میرے بعد تم ہی ہو، تم کو پورے حالات پتہ ہیں، مراری اور اس کی ماتا کو کوئی تکلیف ہوئی تو میری آتما کو چین نہیں ملے گا۔ شنکر کو بھی تم میری مجبوری اور حالات ضرور بتاؤ گے۔"

منوہر نے باپ کی مجبوری اور غلطی دونوں پر خوب غور کیا۔ مرد کہاں کس مقام پر مجبور ہوتا ہے۔ بارود کو تیلی سے دور رکھتے ہیں، اگر دونوں اتفاق سے قریب آ جائیں تو دھماکے ضرور ہوتے ہیں۔ جذبات طوفان کی شکل اختیار کر لیں تو پھر پاپ و پن کے بکھیڑوں میں کون پڑتا ہے۔ منوہر نے باپ کی مجبوری کو سمجھ لیا تھا۔ اور خود سے معاف بھی کر دیا تھا۔ شنکر کو اس نے پوری طرح اپنی طرف کر لیا تھا، دونوں مراری کو اپنا بھائی سمجھتے تھے۔ اور اس سے ملنے گاؤں بھی جاتے تھے۔ شیام خوش تھا کہ اس کے بیٹے اس کی بات سمجھ گئے ہیں۔ مراری کی ماتا کو وہ بھی ماتا جی کہتے تھے۔ اس کا احترام کرتے تھے۔ اور کبھی خالی ہاتھ ان کے سامنے نہیں جاتے تھے۔

ان کو دیکھ کر مراری اور اس کی ماتا شانتی بہت خوش ہوتے تھے۔

مگر شیام کی دھرم پتنی منوہر اور شنکر کی ماں کو یہ سب سخت ناپسند تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ مراری اور شانتی کو گاؤں سے نکال باہر کرتی، مگر اس کے اختیارات حویلی کے باہر نہیں چلتے تھے۔ اس کے لیے سب سے زیادہ بری بات یہ تھی کہ اس کے بچے بھی اس کی طرف نہیں تھے۔ وہ بھی شانتی اور مراری کا دم بھرتے تھے۔

"ماتا جی آپ کی شادی کی تیاری کر رہی ہیں۔" شنکر نے منوہر کو بتایا۔

"تم کو کیسے پتہ چلا۔" منوہر نے پوچھا۔

"ارے وہ جمنا پار کے ماما جی آئے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا تھا وہ بتا رہے تھے۔" شنکر بولا۔

"کیا بتا رہے تھے یہ تو بتا۔" منوہر نے پوچھا۔

"کہہ رہے تھے تیری بھابی کا بندوبست کر رہا ہوں۔" شنکر بولا۔

"یہ جمنا پار کے ماما جی وہی ہیں نا جن کی بہت سی لڑکیاں ہیں اور لڑکا کوئی نہیں۔" منوہر نے پوچھا۔

"وہی ہیں اور مجھے لگتا ہے اپنی ہی کسی لڑکی کو حویلی لانے کے چکر میں، چکر لگا رہے ہیں۔" شنکر نے کہا۔

"میں ان گنواروں میں ہرگز شادی نہیں کروں گا۔" منوہر بولا۔

"مگر ماتا جی ان کو لانا چاہ رہی ہیں پھر۔" شنکر نے کہا۔

"ماتا جی کے خاندان والے سب گاؤں کے لوگ ہیں تعلیم نام کی چیز تو وہ جانتے ہی نہیں تو پھر ان کی لڑکیاں بھی ایسی ہی ہوں گی تم بتاؤ میں ان کے ساتھ گزارہ کر سکوں گا۔" منوہر بولا۔

"میرا تو خیال ہے آپ کا گزارہ کسی گاؤں کی لڑکی کے ساتھ نہیں ہوگا۔ آپ شہر کے تعلیم یافتہ وکیل ہیں، آپ تو کسی شہر کی پڑھی لکھی نازک سی لڑکی سے شادی کرنا۔" شنکر نے کہا۔

"میرا ارادہ بھی یہی ہے۔" منوہر نے کہا۔

"مگر وکیل صاحب یہ جو ماما آ رہے ہیں ماتا جی کے چرن چھو رہے ہیں۔ یہ کچھ نہ کچھ تو رنگ لائے گا۔ پھر آپ کیا کریں گے۔" شنکر نے کہا۔

"میں صاف انکار کر دوں گا۔" منوہر نے کہا۔

"وکیل صاحب یہ اتنا آسان کام نہیں ہوگا۔" شنکر نے کہا۔

"آسان ہو یا مشکل میں یہی کروں گا اور تم میرا ساتھ دو گے۔" منوہر نے کہا۔

"میں تو ہر وقت آپ کے ساتھ ہوں پتا جی کا ووٹ بھی آپ کو دلوا دوں گا۔ مگر یہ ماما جی بس کیا کہوں۔" شنکر بولا۔

"تم کچھ نہ کہو، میں پتا جی سے بات کر لوں گا۔" منوہر نے کہا۔

مگر اس کے بات کرنے سے ہی پہلے شیام نے ایک دن منوہر سے کہا۔

"بیٹا اب تم تعلیم سے فارغ ہو، عمر بھی شادی کی ہے اور رشتہ بھی موجود ہے، بتاؤ کیا کہتے ہو۔"

"پتا جی آپ جو کریں گے وہ مجھے منظور ہے، مگر میں ماتا جی کے خاندان کی کسی لڑکی سے شادی ہرگز ہرگز نہیں کروں گا۔" منوہر نے فیصلہ سنا دیا۔

منوہر کا فیصلہ ماتا جی تک پہنچ گیا۔ وہ غصے میں اس کے پاس پہنچیں اور بولیں۔

"آخر میرے خاندان میں کیا کیڑے پڑ گئے ہیں تم نے کیوں انکار کیا۔"

ماں کو دیکھ کر منوہر ادب سے کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"ماتا جی آپ نے مجھے شہر میں پڑھایا وکیل بنایا۔ میرے خیالات اور طرز زندگی میں اور گاؤں کے طرز زندگی اور یہاں کے لوگوں کے خیالات میں بہت فرق آ چکا ہے۔ آپ دیکھتی ہیں کہ شنکر دن بھر گھومتا پھرتا رہتا ہے۔ مگر میں گھر کے اندر ہی رہتا ہوں کیونکہ میرے مزاج کا یہاں پر مجھے آدمی نہیں ملتا۔ میرا دم یہاں پر گھٹتا ہے۔ میں شہر میں رہنا چاہتا ہوں اور وہیں کی تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ آپ بے شک ناراض ہو جائیں مگر میرا یہ آخری فیصلہ ہے۔"

"مگر میں تیرے ماما کو زبان دے چکی ہوں۔" ماتا جی نے کہا۔

"آپ نے زبان مجھ سے پوچھ کر نہیں دی۔" منوہر نے جواب دیا۔

"مگر اس بھروسے پر دی ہے کہ تم میری اولاد ہو میرا کہا ٹھکراؤ گے نہیں۔" ماتا جی نے کہا۔

"ماتا جی شادی زندگی بھر کا ساتھ ہے مجھے اتنا تو اختیار دیں گی کہ میں اپنا اچھا برا سوچ سکوں۔" انہوں نے کہا۔

"میں نے تمہارا اچھا ہی سوچا ہے۔ ماما جی کی دوسری لڑکی کرن بہت گھڑ لڑکی ہے۔ پاٹ شالہ سے ہندی پڑھی ہے، رامائن اور بھگوت گیتا خوب پڑھتی ہے روز مندر جاتی ہے میرا جی کے بھجن بھی اس کو یاد ہیں، تمہارے من کو بڑا

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

شانت کردے گی۔" ماتا جی نے کہا۔

"میرے لئے اتنا کافی نہیں ہے ماتا جی وہ اتنی اچھی ہے تو اس کو اور بھی اچھے برمل جائیں گے۔ آپ ماما جی کو منع کردیں۔" منوہر نے کہا۔

"ذرا ہوش کر منوہر میرے دل کو تیرے باپ نے کم جلایا ہے کہ تو بھی جلانے لگا۔"

"آپ پتا جی کو درمیان میں نہ لائیں، میری بات کریں۔" منوہر نے کہا۔

"تو نے میرے خاندان کو رد کردیا، ذرا اپنے باپ کے خاندان کی طرف بھی دھیان کرنا وہاں پر بھی ایک سے ایک بڑا پاپی تجھے نظر آئے گا۔"

"سوپ تو سوپ چھلنی بھی بولی جس میں ہزاروں چھید (سوراخ) میرے خاندان کو کبھی برا نہ کہنا کرلے تو شادی شہر میں مگر یاد رکھ، اپنے پتا کے خاندان میں بھی شادی تو نہیں کرے گا۔ اور اگر کرے گا تو دکھ اٹھائے گا۔" ماتا جی سخت غصے میں چلی گئیں، ماتا جی کو ناراض کر کے منوہر بھی اداس ہوگیا۔

شام کو شنکر اس کے پاس آ گیا اور بولا۔ "گھر پر بڑی اداسی چھائی ہے کیا بات ہے آج میرے پاس ماتا جی آئیں تھیں۔" منوہر نے کہا۔

"اس میں اداسی کی کیا بات ہوئی۔" شنکر نے ہنس کر کہا۔

"تم جوان ہو رہے ہو مگر ابھی تک بچے بنے ہوئے ہو، ارے انہوں نے شادی کی بات کی تھی۔ میں نے انکار کردیا۔ اور وہ ناراض ہو کر چلی گئیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔" منوہر نے کہا۔

"بس اتنی سی بات نہیں ہے بھیا۔" شنکر نے کہا۔

"تو تم بتاؤ کتنی سی ہے۔" منوہر نے کہا۔

"اب ماتا جی کا سارا غصہ پتا جی پر اترے گا دونوں میں مہابھارت ہوگی۔" شنکر نے کہا۔

"تو پھر میں کیا کروں کرلوں ماما جی کی پاٹ شالہ پاس لڑکی سے شادی۔" منوہر بولا۔

"میں نے یہ کب کہا مگر اس نئی مہابھارت کے کارن آپ ضرور بن گئے۔" شنکر بولا۔

"شنکر انسانی زندگی میں شادی بار بار نہیں کرتا۔ یہ زندگی بھر کا ساتھ ہوتا ہے۔ اگر قدم غلط پڑ جائے تو زندگی بھر لڑکھڑاتا رہتا ہے۔ ہمارے سامنے پتا جی کی مثال سامنے ہے۔ ان کے مزاج میں اور ماتا جی کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اگر ان کے مزاج ایک طرح کے ہوتے تو پتا جی سے کبھی وہ غلطی نہ ہوتی جو ہوگئی ہے۔ ماتا جی نے ان کی اس غلطی کو ان کی کمزوری بنالیا ہے۔ وہ تو شکر ہے بھگوان کا کہ مراری کی ماں گاؤں میں رہتی ہے۔ اگر ہمارے قریب رہتی ہوتی تو زمیندار صاحب کی عزت ہر وقت سولی پر لٹکتی رہتی۔ یہ صورت حال کس نے پیدا کی ہے۔" منوہر نے کہا۔

"ماتا جی نے تو خود کو مظلوم بنا کر لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹ لی ہیں۔" شنکر نے کہا۔

"میں بھی کہتا ہوں کہ وہ ایک طرح سے مظلوم ہیں، مگر دوسری طرف دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ ماتا جی نے پتا جی کو اگر بھرپور محبت دی ہوتی، ان کو اپنی طرف متوجہ رکھا ہوتا تو شاید وہ غلطی کرتے ہی نہیں۔" منوہر نے جواب دیا۔

"ان کی تو گزر گئی تم اپنی بتاؤ کیا کرو گے۔" شنکر نے کہا۔

"میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔" منوہر نے کہا۔

"بات یہ ہے بھیا کہ ماتا جی کو ناراض کر کے ہم لوگ خوش تو نہیں ہو سکتے کوئی ایسا طریقہ نکالو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی یعنی آپ بھی سلامت رہو۔" شنکر نے کہا۔

"تم مجھے قربانی کا بکرا بنانا چاہتے ہو۔" منوہر نے پوچھا۔

"ارے آپ کے چار پیر کہاں ہیں آپ بکرا نہیں بن سکتے۔" شنکر نے ہنس کر کہا۔

"بات میری زندگی کی ہے تم مذاق کر رہے ہو۔" منوہر نے کہا۔

"زندگی اگر مذاق مذاق میں گزرے تو اس کی سختیاں پتہ نہیں چلتیں۔" شنکر نے جواب دیا۔

"مذاق اس کے ساتھ اچھا لگتا ہے جو ہم مزاج ہو، مذاق کو سمجھتا ہو۔" منوہر نے کہا۔

"آپ کی بات میری سمجھ میں آ رہی ہے اب آپ یہ بھی بتا دیں کہ وہ آپ کی ہم مزاج صاحبہ کون ہیں۔ تاکہ میں بھی ان کے درشن کرلوں۔" شنکر نے پوچھا۔

"تم بہت ہوشیار ہو گئے ہو تم نے آخر بوجھ ہی لیا۔" منوہر نے کہا۔

"بھیا میں رہتا گاؤں میں ہوں مگر آپ کے ساتھ رہتا ہوں، پھرتا سارے علاقے میں ہوں، بھانت بھانت کے لوگوں سے ملتا ہوں، بھانت بھانت کے پھل کھاتا ہوں ورزش کرتا ہوں، گھوڑی سواری کرتا ہوں، زیادہ نہیں مگر کچھ تو پڑھا لکھا ہوں آخر آپکا بھائی ہوں۔" شنکر سینہ تان کر بولا۔

"واہ بھئی واہ میں تو تم کو گاؤں کا ایک بے وقوف سا لڑکا سمجھتا تھا تم میں تو بڑی خوبیاں ہیں اور یاد کرلو۔" منوہر نے پوچھا۔

"بھائی یاد نہیں پھر بتادوں گا اس وقت تو میں اپنی سندری بھابی کے خیال میں ہوں۔ آپ بات کو اڑائیں نہیں، میں بھگوان کی سوگند کسی کو نہیں بتاؤں گا۔" شنکر نے پوچھا۔

"میں وقت سے پہلے بتانا نہیں چاہتا تھا۔" منوہر نے کہا۔

"مجھے بتا دیں میں تو آپ کا رائٹ ہینڈ ہوں۔ آپ کو فائدہ ہی ہوگا۔" شنکر نے کہا۔

"وہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی رہی ہے۔" منوہر نے کہا۔

"کیسی ہے، آپ سے تو اچھی ہوگی۔" شنکر نے پوچھا۔

"منوہر نے چھت کی طرف نظریں کیں اور بولا۔" صبح کی سفیدی، شام کی شفق، برسات کی دھنک کو اگر انسانی پیکر میں لایا جائے تو کاجل بنتی ہے۔" منوہر نے کہا۔

"کاجل نام تو کالا ہے بھیا۔" شنکر نے کہا۔

"ارے اس کا نام کاجول ہے مگر سب کاجل اس لیے کہتے ہیں کہ اس کو نظر نہ لگے۔" منوہر نے جواب دیا۔

"آپ مجھے بھابی سے ملوائیں۔" شنکر نے کہا۔

"میں اس لئے نہیں بتا رہا تھا کہ تو پھیل جائے گا۔" منوہر بولا۔

"ارے بھیا آپ کے کام ہی آؤں گا، کبھی کوئی کام پڑ گیا، کوئی پیغام پہنچانا ہوا۔" شنکر بولا۔

"تم کو پتہ ہے کہ میری زیادہ تر تعلیم بنارس میں ہوئی ہے۔ میں اور کاجول نے تین سال ایک ساتھ گزارے ہیں، وہ اودھے پور کی رہنے والی ہے اور اس کے پتا اودھے پور کے بڑے مشہور وکیل ہیں، ان کا نام گوپی چند ہے۔ میں کاجول کے ساتھ اودھے پور اس کے گھر بھی جا چکا ہوں، گوپی چند اس کے پتا بہت اچھے آدمی ہیں۔ کاجول نے ان کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ ان کا رویہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کو کاجول کی پسند پر اعتراض نہیں ہے۔ ہم دونوں نے شادی کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اب تم بتاؤ ماما جی کی پاٹ شالہ پاس لڑکی جس کو میں نے کبھی دیکھا نہیں، میں اس سے شادی کس طرح کر سکتا ہوں، اگر ماتا جی پر پتا جی نے کوئی ظلم کیا ہے تو وہ مجھ پر کیوں ظلم کرنا چاہتی ہیں، میں کیوں ان کا ایسا حکم مانوں جو میری زندگی کے رخ کو ایک دم بدل دے، میں نے اپنی آئندہ زندگی کے لیے ایک پلان بنایا ہے میں گاؤں میں رہنا ہی نہیں چاہتا۔ یہ باپ دادا کی زمینداری تم کرو گے، میرا مزاج ہی زمینداروں والا نہیں ہے۔ پھر میں یہاں پر رہ کر کیا کروں گا۔" منوہر نے کہا۔

"نہیں بھیا آپ شادی جہاں کرو مگر رہنا میرے پاس، آپ بڑے ہو آپ پہلے، میں بعد میں، یہ تو بھگوان نے بھی میرا نمبر آپ کے بعد رکھا ہے۔" شنکر نے کہا۔

"شنکر میری بات یاد رکھنا۔ تو ہی پتا جی کا جانشین ہوگا، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

READING CORNER
http://readingcornerurdu.blogspot.com/

"مگر مجھے یہ منظور نہیں، یہ آپ کا حق ہے۔" شنکر نے کہا۔

"ارے تو کیا پاگل آدمی ہے۔ دولت کی خاطر لوگ نہ جانے کیا کیا کرتے ہیں میں تو خوشی سے تجھے سب کچھ سونپ رہا ہوں اور تو انکار کر رہا ہے۔" منوہر نے کہا۔

"میری محبت میں بھیا کوئی ایسا فیصلہ نہ کریں جس پر آپ کو بعد میں پچھتانا پڑے۔" شنکر بولا۔

"تو نے بڑی دور کی بات کی ہے مگر میرا جو فیصلہ آج ہے وہی زندگی بھر رہے گا۔" منوہر نے کہا۔

"میں آپ کے فیصلے کا پابند نہیں ہوں قانون پابند نہیں ہے۔" شکر نے کہا۔

"وکیل ہوں میں اور قانون تو مجھے پڑھائے گا۔" منوہر ہنس کر بولا۔

"میں آپ کو کیا پڑھاؤں گا سوچتا ہوں ایک آپ ہی تھے جن کے پاس آ کر مجھے کچھ سکون ملتا تھا۔

ماتا جی کے پاس جاؤ تو ان کا موڈ خراب رہتا ہے۔ پتا جی گھر میں ہوتے نہیں۔ آپ بھی چلے گئے تو میں کس کے پاس جاؤں گا۔" شنکر اداسی سے بولا۔

"ارے تو میں ابھی کہاں جا رہا ہوں تو تو ابھی سے سوگ منانے لگا۔" منوہر نے کہا۔

"اودھے پور سے ایک گھنٹہ گھوڑے پر لگتا ہے میں روز سویرے تمہارے پاس آؤں گا۔" شنکر بولا۔

"ضرور آنا۔ مگر ابھی میں نہیں جا رہا، سوچتا ہوں پتا جی سے موقعہ دیکھ کر بات کر لوں۔ تاکہ اپنے ماما جی سے جان تو چھوٹے۔" منوہر نے کہا۔

"موقع کا کیا ہے میں ان کو لے کر تمہارے پاس آ جاتا ہوں۔" شنکر بولا۔

"مگر ذرا ان کا موڈ دیکھ لینا۔" منوہر بولا۔

"ارے تم فکر ہی نہ کرو، ایسا موڈ بنا کر لاؤں گا کہ انکار تو وہ کریں گے ہی نہیں۔" شنکر نے کہا۔ کھانے کے بعد رات کو شنکر نے پتا جی سے کہا۔

"پتا جی آپ سے کچھ کام ہے۔"

"کام بتاؤ! کیا کام ہے۔ میں سن رہا ہوں۔" شیام نے کہا۔

"میرے ساتھ آئیں۔" شنکر نے کہا۔

"کہاں چلنا ہوگا بہت تھکا ہوا ہوں میں۔" شیام نے کہا۔

"گھر سے باہر نہیں لے جاؤں گا۔" شنکر بولا۔

"پھر ٹھیک ہے۔" شیام نے کہا۔

منوہر نے کمرے کے باہر ہی پتا جی کا استقبال کیا۔

"آیئے پتا جی۔ کچھ کام ہے مجھے۔" منوہر بولا۔

"ارے مجھے کیا پتا، یہ لایا ہے مجھے تو۔" شیام نے کہا۔

"ہاں بھیا میں لایا ہوں اندر تو آیئے۔" اور سب کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔

"ہاں شنکر بول کیا بات ہے۔" شیام نے کہا۔

"بات یہ ہے پتا جی کہ مجھے بھابی کی سخت ضرورت ہے، بھیا بھی راضی ہو گئے ہیں، بس آپ کی رضامندی چاہئے۔" شنکر نے کہا۔

"بہت خوب! تو تم وکیل صاحب کے وکیل ہو۔" شیام نے ہنس کر کہا۔

"پتا جی آخر وکیل کو بھی تو وکیل کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔" شنکر نے کہا۔

"تو تم اپنے ماما جی کی لڑکی سے شادی کرنے پر راضی ہو۔" شیام نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔" شنکر بولا۔

"میں نے منوہر سے پوچھا ہے۔" شیام نے کہا۔

"میں ان کا وکیل ہوں جواب دے سکتا ہوں۔" شنکر نے کہا۔

"تو پھر شادی کس سے کرو گے۔" شیام نے کہا۔

"بھیا کے ساتھ کالج میں ایک لڑکی پڑھتی رہی ہے اس کا نام کاجول ہے۔ اور وہ اودھے پور کے وکیل گوپی چند کی لڑکی ہے۔ اندازہ ہے کہ گوپی چند جی کو ان کی شادی پر اعتراض نہیں ہے، اس سلسلے کو آگے بڑھانے کی درخواست

کی جاتی ہے۔" شنکر نے کہا۔

"ارے ارے تم ہی بولے جاؤ گے منوہر کو تو بولنے دو۔" شیام نے کہا۔

"پتا جی میں وکیل صاحب کا وکیل ہوں مجھے انہوں نے بولنے کا اختیار دیا ہے، اس لیے بول رہا ہوں۔" شنکر نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے میں نے گوپی چند کا نام سنا ہے میں ان سے ملاقات کر لوں گا۔" شیام نے کہا۔

"یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اچھا ہے، بھابی کی ضرورت سخت ہے۔" شنکر ہنس کر بولا۔

"منوہر تو نے اپنا وکیل بڑا انگڑا کیا ہے۔" شیام نے زور سے ہنس کر کہا اور کمرے سے نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد منوہر شنکر سے لپٹ گیا اور بولا۔

"تو نے تو کمال کر دیا۔ میں بھی شاید اتنی آسانی سے یہ سب نہ کہہ پاتا۔"

"اسی لیے تو کہتے ہیں وکیل تگڑا ہو تو مقدمہ جیتا جاتا ہے۔" شنکر نے کہا۔

دوسرے ہی روز شیام اودھے پور کے وکیل گوپی چند کے سامنے بیٹھے تھے۔

گوپی چند نے پوچھا۔ "کیسے آنا ہوا شیام جی۔"

"میں منوہر کا باپ ہوں۔ آپ نے پہچانا نہیں۔" منوہر گوپی چند نے ذہن پر زور دے کر کہا۔ "اچھا کاجول کے کلاس فیلو کے پتا۔"

"جی ہاں وہی ہوں۔" شیام نے کہا۔

گوپی چند نے اٹھ کر ایک دفعہ اور ہاتھ ملایا اور بولا۔ "معاف کرنا میں اب سمجھا۔"

"بات یہ ہے گوپی چند جی کے جب معاملہ لڑکا لڑکی کے درمیان خود طے پایا جائے تو ہمارا کردار صرف یہ رہ جاتا ہے کہ ان کی خوشیوں میں شریک ہو جائیں۔" شیام نے کہا۔

"میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔" گوپی چند نے کہا۔

"تو پھر پنڈت سے شبھ گھڑی نکلوا لیں۔" شیام نے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ میرے بارے میں پتہ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ میں خاندانی کھرا راجپوت ہوں۔"

"آپ کے بارے میں سب جانتے ہیں۔" گوپی چند نے کہا۔

"اگر ایسا بھی نہ ہوتا تو بھی میں اعتراض نہ کرتا، کیونکہ معاملہ لڑکے کی پسند کا تھا۔" شیام نے کہا۔

"بہت خوب آپ کے خیالات نئے زمانے کے ہیں۔" گوپی چند بولا۔

"وکیل صاحب ہمارا زمانہ ختم ہو رہا ہے، اب اس نئی نسل کا ہی دور آ رہا ہے تو پھر ہم کو ان کی پسند کا خیال تو رکھنا ہی ہوگا۔ ورنہ یہ لوگ ہمیں اچھے ناموں سے یاد نہیں کریں گے۔" شیام نے کہا۔

"بے شک آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" گوپی چند بولے۔

شادی کا اعلان ہوتے ہی حویلی میں ایک بھونچال آ گیا۔

ماما جی کی آمد و رفت میں اضافہ ہو گیا۔ منوہر کی ماتا جی نے منوہر کو طلب کر لیا۔

"آخر تم نے اپنے من کی کر لی۔ میری بات نہیں مانی۔"

"میں پہلے ہی انکار کر چکا تھا۔"

"تم نے اپنے باپ کا کہا مانا اور میرا نہیں مانا۔"

"میں نے صرف اپنے من کا کہا مانا ہے۔"

"آخر تیری پتنی کو اس حویلی میں رہنا ہے۔"

"نہیں وہ اس حویلی میں نہیں آئے گی۔"

"اسکو آنا ہوگا۔ یہی پرکھوں سے ہوتا آیا ہے۔"

"مگر اب نہیں ہوگا۔ میری شادی شہر میں ہوگی اور میں وہیں پر رہوں گا۔"

"تو ایک عورت کے لیے اپنے پریوار کو چھوڑ رہا ہے۔"

"نہیں میں کسی کو نہیں چھوڑ رہا۔ اپنا پریوار بنا رہا

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

ہوں۔"

ماتا جی نے غصے سے کہا۔ "کبھی اپنی پتنی کو لے کر حویلی مت آنا میں مرجاؤں تو بھی نہ آنا، اگر وہ اس حویلی میں آئی تو میری آتما اس کا راستہ روکے گی۔" منوہر نے کچھ جواب نہیں دیا۔

اودھے پور میں شیام نے اس کے لیے ایک بنگلہ خریدا اور بارات اسی بنگلے سے گئی، اور دلہن وداع ہو کر اس بنگلے میں آ گئی۔

ماما جی اور ماتا جی اس شادی میں شریک نہیں ہوئے۔ ان کے علاوہ تمام لوگ شریک تھے۔ سب سے زیادہ خوش شنکر تھا۔

"بھابی میں آپ کا اکلوتا دیور ہوں۔ یوں تو ایک دیور آپ کا اور بھی ہے مگر ابھی میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ نہ جانے کیا کیا بکتا رہا اور کاجل خاموشی سے سنتی رہی۔ منوہر نے کہا۔ "تم اس کی باتوں پر زیادہ غور نہ کرنا یہ بہت بڑا وکیل ہے، میرا اور تمہارا مقدمہ اس نے ہی لڑ کر جیتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ فری کا وکیل ہے۔"

کاجل نے آہستہ سے پوچھا۔

"کیوں دیور جی یہ بات ٹھیک ہے۔"

"بھیا نے کہا ہے تو ٹھیک ہی کہا ہوگا۔" شنکر بولا۔

"تمہارے بھیا کیا سب ٹھیک کہتے ہیں۔" کاجل بولی۔

"ہاں ٹھیک کہتے ہیں۔" شنکر بولا۔

"تم میرے پاس شہر میں رہو گے۔" کاجل بولی۔

"بھیا شہر آ گئے تو مجھے گاؤں میں رہنا ضروری ہو گیا ہے۔" شنکر نے کہا۔

"ہاں کاجل یہ آتے وقت کا زمیندار ہے اس کو وہیں رہنا ہوگا۔" منوہر نے کہا۔

"مجھے زمینداری نہیں کرنا تھی اس لیے پڑھ لیا ہے۔ مگر کسی کو پتا جی کی گدی پر بیٹھنا بھی تو ہے۔ اور میں نے وہ گدی اپنی خوشی سے شنکر کو دے دی ہے۔" منوہر نے کہا۔

"واہ بھیا کتنی آسانی سے آپ نے میرے سر پر سارا بوجھ ڈال دیا ہے۔" شنکر بولا۔

"ارے باؤلہ ہوا ہے زمین کی خاطر لوگ نہ جانے کیا کیا کرتے ہیں تجھے تو میں خوشی سے دے رہا ہوں۔" منوہر نے کہا۔

"اور میں نہیں لے رہا بھابی یہ گاؤں میں رہیں نہ رہیں زمیندار تو یہی رہیں گے۔ میں ان کا کارندہ رہوں گا۔ وہ بھی ماتا جی کی زندگی تک کیونکہ انہوں نے آپ کو گاؤں آنے سے منع کیا ہے، اس کے بعد آپ کو آنا ہوگا۔" شنکر نے کہا۔

"اور ان کی آتما جو میرا اور تیری بھابی کا راستہ روکے گی جیسا کہ انہوں نے کہا ہے۔" منوہر بولا۔

"آتما نے کس کا راستہ روکا ہے۔ اور اگر روکے گی تو آپ چنتا نہ کریں میں اس آتما کی بنتی کر لوں گا۔" شنکر نے جواب دیا۔

منوہر کے جاتے ہی ماما جی کی توجہ شنکر کی طرف ہو گئی۔

شیام کمار نے کبھی ماما جی کو منہ نہیں لگایا تھا۔ کیونکہ وہ ان کی فطرت کو جانتے تھے۔ ماما جی سخت قسم کے لالچی آدمی تھے۔ بہن کے پاس آتے تھے خالی ہاتھ، اور جاتے وقت ان کی گھوڑی لدی ہوتی تھی۔ شیام کمار کو سب پتہ تھا مگر انہوں نے پتنی کو کبھی کچھ نہیں کہا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے کہنے سے کچھ نہیں ہوگا لاجونتی اپنے بھیا کا گھر بھرتی رہے گی، باز نہیں آئے گی۔ اس لیے انہوں نے نشی کو کہہ دیا تھا کہ "روپیہ اور اناج میری اجازت کے بغیر کسی کو نہ دیا جائے۔ چاہے وہ کوئی ہو۔"

ماما جی آتے تو پہلے منوہر کا پوچھتے تھے۔ اب شنکر کا پوچھنے لگے۔

شنکر ان کو مل جاتا تو گلے لگا لیتے اور کہتے۔

"ارے اب تو ہی تو رہ گیا ہے۔ تیرے کارن تو میں اتنا کشٹ اٹھا کر آتا ہوں۔"

"اور گھوڑی دونوں طرف سے ماری جاتی ہے"

آتے ہو تو کشٹ اس پر لاد لاتے ہو اور جاتے ہو تو سامان لاد دیتے ہو۔ ارے ماما کچھ جانور کا خیال کرو۔" شنکر ہنس کر کہتا تو ماما کھسیا جاتے مگر ڈھیٹ پن سے باز نہ آتے، کہتے۔

"ارے تیری ماہتاری باز نہیں آتی، بچوں کو کچھ دے دیتی ہے تو کیا منع کر دوں۔"

"ارے ماما آتا ہوا مال کون چھوڑتا ہے۔ بہنوئی سے بنتی نہیں تمہاری تو فقط بہن سے بنتی ہے۔" شنکر نے کہا تو برا تو اس کو بہت لگا مگر بولے کچھ نہیں کیونکہ وہ تو کچھ اور ہی پروگرام دل میں بنائے ہوئے تھے۔ اتنا سننے پر بھی ان کے چہرے پر مسکراہٹ بچی ہوئی تھی۔ بولے۔

"بہت شرارتی ہو گیا ہے باتیں خوب کرتا ہے۔"

"وہ تو ہے ماما جی۔" شنکر نے کہا۔

"ارے کبھی ہمارے گھر بھی آ جایا کر۔" ماما نے کہا۔

"وہاں کیا کروں آ کر میرے ساتھ کون کھیلے گا سب تو لڑکیاں ہیں۔" شنکر نے کہا۔

"ارے تو کیا ہوا لڑکیاں ہی تو ہیں کوئی بھوتنی تو نہیں ہیں سب یاد کرتی ہیں۔" ماما بولے۔

"پتا جی سے پوچھوں گا پھر آؤں گا۔" شنکر بولا۔

"ارے تو کیا تو سب کام ان سے پوچھ کر کرتا ہے۔" ماما بولے۔

"مگر کچھ کام ضرور ان سے پوچھ کر کرتا ہوں۔" شنکر نے جواب دیا۔

"اچھا کل دوپہر کو آ جا بڑی بڑھیاں کھیر ملے گی۔" ماما نے کہا۔

"ماما میں کھیر نہیں کھاتا۔" شنکر نے کہا۔

"مجھے پتہ ہے خوب کھاتا ہے۔ اچھا کل آئے گا نا۔" شنکر نے جان چھڑانے کو کہہ دیا آؤں گا۔ اور ماما بہن کے پاس چلے گئے، جاتے ہی بولے۔

"جی جی یہ شنکر تو ہاتھ نہیں رکھنے دیتا۔ لگتا ہے جیجا جی کے کہنے میں ہے۔" ماما بولے۔

"تم بھگوت رام اتنے ہوشیار بنتے ہو ذرا پریم سے اپنی طرف کر و باپ کا اثر تو اس پر ہے مگر تم بھی تو کچھ کرتب دکھاؤ۔" لاجونتی نے کہا۔

"اچھا شنکر کی عمر کیا ہو گئی ہے۔" ماما بولے۔

"سترہ پورے کر کے اٹھارہ میں لگ گیا ہے۔" لاجونتی نے کہا۔

"واہ لگتا تو بھرپور جوان ہے۔" ماما بولے۔

"ارے تو کا لگے گا نہیں۔" لاجونتی نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ منوہر کے مقابلے میں شنکر بہت بڑھیاں جوان ہے۔" ماما نے کہا۔

"اس کو تو پڑھائی نے داب لیا تھا۔" لاجونتی نے جواب دیا۔

"تم بھی کبھی میرے ہاں آتے جاتے رہو، اس کو کہہ دیا کرو آئے گا جائے گا تو کچھ اس کے رجحان کا پتہ چلے گا۔" ماما بولے۔

"تمہارا ارادہ کیا ہے تمہاری بڑی تو اس سے کئی سال بڑی ہے اس سے تو تم بھول جاؤ۔ اور اگر کسی کے ساتھ راضی ہوتا ہے تو دیکھا جائے گا۔" لاجونتی نے کہا۔

"جی جی میری بڑی تمنا ہے کہ میری ایک تو حویلی میں آئے۔" ماما بولے۔

"میرے تو دو ہی لڑکے ہیں ایک تو کنڈلی سے باہر نکل گیا، ایک بچا ہے میں ایک ہی لا سکتی ہوں۔ اور تم نے تو پوری سات لڑکیاں جمع کر لیں ہیں میں تمہاری کیا مدد کروں گی۔" لاجونتی بولی۔

"ارے تم ایک ہی لے لو باقی سب کا راستہ بھی بنا لوں گا۔" ماما نے کہا۔

شنکر ماما کے گھر نہیں جاتا تھا۔ مگر اب ماں کا زور بھی اس پر پڑا اور وہ دوپہر کو ماما کے گھر چلا گیا۔

دلاری، ماما کی بڑی لڑکی دوڑ کر اس کے پاس آ گئی اور بولی۔ "او ہو آج کدھر چاند نکل آیا۔"

"دن میں چاند نہیں سورج نکلتا ہے۔" شنکر نے جواب دیا۔

"تو سورج دیوتا پرستارو، داسی خدمت گزاری کے لئے حاضر ہے۔" دلاری بولی۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

"اس کی ضرورت نہیں ہے میں انسان ہوں انسان ہی رہنے دو۔" شنکر گھوڑے سے اتر آیا۔

"آج میری یاد کیسے آ گئی۔" دلاری اٹھ کر بولی۔

"تمہاری یاد نہیں آئی ماما جی ہمیشہ شکایت کرتے تھے ماتا جی بھی کہتی ہیں اس کارن آنا پڑ گیا ہے۔" شنکر بولا۔

"اچھا میں سمجھی تم کو میری یاد آ گئی تھی۔" دلاری مایوسی سے بولی۔

"تمہاری اکیلی کی یاد کیوں آتی ارے آتی تو ساتوں کی آتی۔" شنکر نے کہا۔

"آؤ اندر تو آؤ۔" وہ شنکر کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"اندر آتے ہی شور مچ گیا شنکر آیا ہے۔ ارے چھوری نئی دری تو نکال کھاٹ پر ڈال دے جا تو دوڑ کے موئے میں پانی لے آ، اری تو کیا کھڑی منہ دیکھ رہی ہے جا کے گرم گرم دال کے منگوڑے (پکوڑے) بنا لے اور دودھ گرم کر کے چاول ڈال دے۔ لڑکیاں دوڑ دوڑ کر کام کرنے لگیں اور مامی اس کے قریب بیٹھ گئی اور بولی۔

"کہو بھیا ٹھیک تو آ گئے۔"

"ہاں مامی پورا آ گیا ہوں۔" وہ حسب عادت بولا۔

"جیسا سنا تھا ویسا ہی شرارتی ہے۔" مامی نے کہا۔

"مامی تم نے سب کو کاموں میں لگا دیا۔" شنکر بولا۔

"وہ دیکھ پانی لائی ہے منہ ہاتھ دھو لے سفر سے آیا ہے۔" مامی نے کہا۔

"اچھا رکھ دے میں دھو لوں گا۔" شنکر بولا۔

میں ذرا کھیر دیکھ لوں مامی اٹھ کر چلی گئی۔

دلاری سے چھوٹی کرن اس کے پیروں میں بیٹھ کر اس کے پیر دھلانے لگی۔

"ارے تم کیا کر رہی ہو، میں دھو لوں گا۔" وہ بولا۔

مگر اس نے پنڈلیوں تک اس کے پیر دھلائے۔ شنکر کے بدن میں سرسری سی ہوئی وہ پیر دھلا کر اس سے لگ کر بیٹھ گئی، اس کے جوان بدن کی خوشبو، شنکر کے نتھنوں میں جانے لگی۔ ایک نئے مزے کا احساس اس کو ہوا پھر وہ بولی۔

"تم تھک گئے ہو گے میں تمہارے کاندھے دبا دوں بڑا آرام ملے گا۔" آرام کا اندازہ شنکر کو ہو چکا تھا وہ کچھ نہ بولا۔ اور کرن نے کھڑے ہو کر اس کے کاندھے دبانا شروع کر دیئے۔

اس کا سارا وزن پیٹھ پر آ گیا اور شنکر ایک انجانے مزے سے روشناس ہوا۔

شنکر کو وقت کا سیلاب خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔ کرن کے آتے ہی کمرے میں کوئی اندر نہ آیا، کرن نے کب دروازہ بند کر دیا۔ اس کو پتہ نہ چلا۔ کرن نے اس کو ایک ایسے سمندر میں ڈبو دیا جس میں وہ کبھی نہیں اترا تھا۔ اس نے بہت ہاتھ پیر مارے مگر طوفان اتنا شدید تھا کہ اس کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ کوشش کے بعد بھی سنبھل نہ سکا۔

اس کے سر پر محبت کا بھوت سوار تھا، وہ جو کچھ کہہ رہی تھی وہ ہاں ہاں کرتا جا رہا تھا۔ اس نے کتنے وچن لئے، شنکر کو پتہ نہ تھا۔ وہ دونوں دیوانہ وار ایک دوسرے سے لپٹے پڑے تھے۔ کرن بھی شباب کی بھرپور عمر میں تھی۔ اور شنکر جذبات کے اندھے کنوئیں میں اتر چکا تھا۔

یہ کھیل پورے پروگرام سے ہوا۔ ماموں ممانی نے خود یہ کھیل رچایا تھا۔ انسان دولت کی خاطر کیا کیا کر گزرتا ہے۔ بھگوت رام ماما کی نظر جیجا جی کی پوری زمینداری پر تھی اندر اندر اس نے بہن سے جوڑ توڑ کر رکھا تھا۔

کھیل ختم ہوا تو کرن جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چیخ کر بولی۔

"ہائے رام، تم نے کیا کر دیا۔ تم نے میری عزت لوٹ لی۔"

شنکر گھبرا گیا بولا۔ "میں نے کیا کیا تم خود ہی تو مجھ پر گری تھیں۔

اس موقع پر ممانی کی انٹری تھی اس کو شور کرنا تھا، مگر ایسا شور جس کی آواز گھر سے باہر نہ جائے، اس کے بعد ماما جی کی انٹری تھی اور شنکر کو دبانا تھا۔ سارا ڈرامہ پہلے سے تیار تھا۔

ایک کردار کے بعد دوسرا کردار آتا رہا اور شنکر جو بڑا منہ پھٹ اور حاضر جواب تھا دبتا چلا گیا اور آخر اس کو اتنا

دبا دیا کہ وہ کرن سے شادی کرنے پر راضی ہو گیا۔ کرن بھی اس سے دو سال بڑی تھی ماما جی نے گویا اس پر احسان کیا تھا کہ رنگے ہاتھوں پکڑ کر چھوڑ دیا تھا۔

دوسرے ہی دن وہ بہن کے پاس پہنچ گیا اور بولا۔

"دیدی کام ہو گیا۔ شادی کی تیاری کرو۔"

"ارے کس کی شادی کروا رہے ہو۔" لاجونتی نے پوچھا۔

"کرن اور شنکر کی اور کس کی۔" بھگوت نے کہا۔

"شنکر مان گیا ہے۔" لاجونتی نے پوچھا۔

"بڑی خوشی سے مان گیا ہے۔ ارے دیدی دونوں ایک دوسرے کو من ہی من میں پریم کرتے ہیں، مگر تم جانو پریم کہیں چھپا ہے۔ دونوں بہت خوش ہیں، بس اب تم تیاری کرو۔" بھگوت نے اصل بات نہیں بتائی۔

"چلو اچھا ہوا۔ تم تیاری کرو، کچھ ہے تمہارے پاس۔" لاجونتی نے پوچھا۔

"تم زمیندارنی ہو میں تو معمولی آدمی ہوں، جو کچھ ہو گا کر دوں گا۔" بھگوت بولا۔

"اچھا تم تیاری کرو جو ضرورت ہو مانگ لینا۔"

"شیام کمار کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی، شنکر جو ماما کا مذاق اڑاتا تھا ان کے گھر نہیں جاتا تھا ایک دم سے ان کی لڑکی سے شادی کرنے پر راضی ہو گیا۔

"تم یہ بتاؤ اپنی خوشی سے شادی کر رہے ہو کہ تمہاری ماں نے تم پر زور ڈالا ہے۔ اگر کسی کے دباؤ میں کر رہے ہو تو مجھے بتاؤ۔" شیام کمار نے شنکر سے پوچھا۔

شنکر نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ارے زبان کھولو یہ زندگی بھر کا معاملہ ہے۔" شیام کمار نے پوچھا۔

"میں خوشی سے کر رہا ہوں۔" شنکر آہستہ سے بولا۔

"تم کو پتہ ہے کرن تم سے عمر میں بڑی ہے۔ عورت بڑی ہو تو کچھ دن کے بعد مہتاری بن جاتی ہے۔"

شنکر خاموش رہا۔ کوئی جواب اس کے پاس نہ تھا وہ اندر کے چور سے ڈرتا تھا۔

"ٹھیک ہے شنکر تیری مرضی ہے تو ٹھیک ہے، میں بھگوت کی لڑکی اس حویلی میں لانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر تیری وجہ سے مجبور ہوں۔"

اور بڑی دھوم دھام سے کرن دلہن بن کر حویلی آ گئی بھگوت نے جو خرچ کیا وہ دیدی سے وصول کر لیا۔ گویا میاں کا جوتا میاں کے ہی سر مار دیا۔

اب اثر رسوخ اور بڑھ گیا۔ بھگوت پہلے ذرا ڈرتے ڈرتے آتے تھے اب آزادی سے آنے لگے۔ داماد کو مشورے بھی دینے لگے۔ زمینداری کے قاعدے سختی، نرمی کے اصول بھی بتانے لگے۔ کرن کے ہاتھ پیر بھی پھیلنے لگے۔

دلاری کرن کے ساتھ ملی ہوئی تھی، کرن نے جو ڈرامہ کیا تھا اس کے بارے میں دلاری سب جانتی تھی۔ وہ ڈرامہ دلاری کو کرنا تھا، مگر کسی مجبوری کی وجہ سے وہ نہ کر سکی تھی۔ اور وہ پارٹ کرن کو دے دیا گیا اور وہ حویلی میں آ گئی مگر دلاری نے اس کو چھوڑا نہیں وہ بھی بہن کے قریب لگی رہی۔

کرن دلاری کو جانتی تھی کہ یہ جان نہیں چھوڑے گی۔ دونوں نے ایک گھر میں ایک ساتھ زندگی گزاری تھی۔ دلاری بڑی ضدی اور پیٹ کی پکی تھی۔ اپنی چیز کسی کو نہیں دیتی تھی اور خود سب کی کھاتی تھی۔ ہاتھ پیر کی بھی سب سے زیادہ تگڑی تھی، سب کو دبا لیتی تھی۔ کرن اس سے ڈرتی تھی۔ کرن کے دل میں بھی چور تھا۔ وہ اس کو اپنے گھر آنے سے کیسے منع کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ شنکر اس سے محبت نہیں کرتا، شنکر کا شادی کا فیصلہ ایک جذباتی اور ڈر کا نتیجہ تھا۔ دلاری بڑی تھی مگر شکل و صورت اور صحت میں وہ کرن سے کئی گناہ اچھی تھی۔ کرن شنکر کی بیوی ضرور بن گئی تھی مگر اس کے سر پر دلاری کی تلوار لٹک رہی تھی۔ کسی وقت بھی وہ تلوار اس کے سر پر گر سکتی تھی۔ دلاری سے ایک نہ ایک دن فیصلہ تو کرنا تھا۔ اس کو کسی کھونٹے سے تو باندھنا تھا۔ اس کے لیے اس نے اپنی ماں سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"اماں اب دلاری کی فکر کرو۔" اس نے اپنی ماں سے ایک دن جا کر کہہ دیا۔

"کیا فکر کروں ری۔" اماں بولی۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

''کیا اس کی شادی بیاہ نہیں ہوگی، مجھ سے بڑی ہے وہ۔''

''ارے وہ اب نہیں کرے گی۔'' اماں بولی۔

''وہ کہتی ہے کرن نے اس کا حق مار لیا ہے۔'' اماں بولی۔

''میں نے کیا حق مارا ہے اس کا۔'' کرن نے پوچھا۔

''تو نے جو اس دن اس کی خدمت کی وہ دلاری کو کرنا تھی تو وہ تیری جگہ ہوتی۔'' اماں بولی۔

''تو میں نے اس کو روکا تھا کیا کہ تو خدمت مت کر تم نے اور باپو نے مجھے کہا تو میں نے کیا۔ اس میں میرا کیا دوش ہے میرے مقدر کا مجھے ملا میں کیا کروں۔'' کرن نے جواب دیا۔

''بات تیری بھی ٹھیک ہے، مگر اس کے من میں تو گانٹھ بیٹھ گئی ہے کہ تو نے اس کا حق مارا ہے۔''

''اب تم اس کو کہہ دو کہ ڈرامہ ختم ہوا۔ اب میری جان چھوڑ دے۔'' کرن بولی۔

''کہہ دوں گی مگر مجھے لگتا نہیں کہ وہ اتنی آسانی سے مان جائے گی، بڑی ہٹ دھرم ہے۔''

بات بننے سے زیادہ بگڑ گئی۔ دلاری کو ماں کی بات سخت ناگوار گزری۔ دلاری نے اپنے ہتھیاروں کا از سر نو جائزہ لیا۔ نئی نئی کمانیں اور تیر بنائے اور شکار کی تلاش میں حویلی آ گئی۔ شیام کمار رات گئے تک حویلی سے باہر رہتے تھے۔ پتنی سے ان کی بنتی نہیں تھی۔ وہ مراری کے گاؤں میں رہتے تھے مگر رات کو آتے ضرور تھے۔ لاجونتی حویلی کے آخری سرے پر رہتی تھی۔ اس کے بعد کرن کے کمرے تھے مردانے کے ساتھ ہی ایک کمرہ دلاری نے لے رکھا تھا یا قبضہ کر رکھا۔

شنکر رات نو دس بجے آتا تھا۔ کرن کے کمرے میں جانے کے لیے اس کو دلاری کے کمرے کے سامنے سے گزرنا پڑتا تھا۔ دلاری کے تن بدن میں جوالا مکھی بھڑک رہا تھا۔ وہ بڑی خاموشی سے شنکر کا انتظار کر رہی تھی اور پھر رات دس بجے شنکر آ گیا۔ پوری حویلی پر سناٹے کا راج تھا۔ شنکر جیسے ہی اس کے کمرے کے سامنے آیا وہ تیزی سے دروازہ کھول کر اس کے سامنے آئی اور شنکر کو کمرے کے اندر لے گئی اور دروازہ بند کر دیا۔

شنکر بولا۔ ''ارے کیا کر رہی ہو۔ کیوں بدنام کرواؤ گی۔''

مگر دلاری اس کو لئے ہوئے پلنگ پر پہنچ گئی اور بولی۔ ''یہاں بیٹھ کر بات کرو۔''

''کرن انتظار کر رہی ہوگی۔ مجھے جانے دو۔'' شنکر نے کہا۔

''میں جو ایک عرصے سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔'' دلاری بولی۔

''تم کیوں میرا انتظار کر رہی ہو۔'' شنکر نے پوچھا۔

''کرن کیوں کر رہی ہے۔'' دلاری بولی۔

''وہ تو میری دھرم پتنی ہے۔'' شنکر نے کہا۔

''وہ عورت ہے میں عورت نہیں ہوں۔ تم میرے پتی بننے والے تھے پر اس کے نصیب اچھے تھے کہ اس دن وہ تمہارے ساتھ ہو گئی اور پتنی بن گئی۔ مگر میرے من میں تو تم آ کر بیٹھ گئے، میں کیا کروں۔ میری طرف دیکھو کیا میں کرن سے کم ہوں۔'' شنکر نے اس کی طرف دیکھا اور پھر ایک دھماکہ ہوا اور پھر بات شنکر کے دماغ میں آ گئی۔ عورت پھر جیت گئی اور مرد پھر عورت کے چکر میں پھنس گیا۔

☆.....☆.....☆

شیام کمار زمیندار روز ہی رات گئے آتے تھے، ایک رات اندھیرے میں کئی ڈاکوؤں نے ان پر حملہ کر دیا اور شیام کمار مارے گئے۔

بھگوت نے ان کے مرنے پر بڑا سوگ منایا۔ منوہر نے سارے اختیارات شنکر کو دے دیئے۔ ایک طرح سے پوری زمینداری اپنے بھائی کو دے دی اور پٹنہ چلا گیا۔

اب پوری حویلی اور زمینوں پر بھگوت کا راج تھا۔ سارے ہاری اور کسان بھگوت کے غلام ہو گئے۔

شیام کمار نے کبھی کسی ہاری کو تنگ نہیں کیا تھا۔ ان

کی ضرورت کا خیال رکھا تھا۔

مگر اب بھگوت زمینداری کر رہا تھا، شنکر پر اس کی دونوں لڑکیاں اس طرح پر پھیلا کر بیٹھی تھیں کہ وہ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ دونوں میں آپس میں کشمکش تھی مگر پھر بھی دونوں مل بانٹ کر کام کر رہی تھیں کیونکہ ان کے درمیان ان کا کھرانٹ باپ آ گیا تھا۔ ''لڑو مت سب تمہارا ہے ذرا سکون سے رہو اور جتنی جلدی ہو اس کو ٹھکانے لگاؤ۔ ذرا سی فرصت مت دو دھندوں میں لگائے رکھو ارے زمینداری ہاتھ آتے ہی میں تمہارے لئے بڑے بڑے بڑھیاں لڑکے تلاش کر دوں گا۔'' باپ کا پلان سن کر دونوں ذرا شانت ہو گئی تھیں، شنکر کے لئے ان کے دل میں کوئی ہمدری یا محبت نہ تھی۔ پھوپی بھی ان کے لئے بے کار شے تھی۔ اور ایک دن وہ بھی پرلوک سدھار گئی۔

اب حویلی پر پورا راج بھگوت اور اس کی لڑکیوں کا تھا، شنکر کا کانٹا نکالنے کو اس نے ہر لڑکی کو آزادی دے دی تھی۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی شنکر کے لپٹے رہتی تھی۔ اس سے بھگوت کو دو فائدے تھے ایک تو شنکر کو زمینداری کی طرف دھیان کرنے کی فرصت نہیں ملتی تھی دوسرے وہ شمشان گھاٹ کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

مگر اس نے ایک کام یہ ضرور کیا کہ مراری کے نام سارے کاغذات بنوا کر رجسٹری کرا لئے اور ان کاغذات کو مراری کے حوالے کر دیا مراری چھوٹا تھا مگر اس کی ماں نے وہ کاغذات حفاظت سے رکھ دیئے۔ بھگوت خوش تھا کہ سارا کام اس کے پلان کے مطابق ہو رہا تھا۔

وہ سات گاؤں کا مالک بننے والا تھا۔ شنکر کے بعد اس کی بیوی ہی مالک تھی کیونکہ اولاد تو اس نے ہونے ہی نہیں دی تھی۔ کرن نے بہت زور بھی لگایا تھا۔

اور پھر دیئے کا تیل ختم ہوا اور وہ بھڑک کر بجھ گیا۔ زمیندار شنکر جوانی میں مر گیا۔ منوہر دوڑا آیا۔ اس نے حویلی کے حالات دیکھے وہ سمجھ گیا کہ کیا کھیل کھیلا گیا ہے۔ عملی طور پر بھگوت زمیندار تھا۔

''ماما تم نے آخر مراد پا لی۔ اس مراد کے پانے میں تم نے اپنی لڑکیوں تک کی بلی چڑھا دی۔ اپنے بہنوئی کو مار ڈالا۔ بہن کو ختم کر دیا اور اب اپنے داماد کو بھی مار کر تم زمیندار بن گئے۔ مگر یہ زمینداری تم کو راس نہیں آئے گی۔ بڑی کٹھنائیوں سے گزرنا ہوگا۔ مجھے تو خیر زمینداری سے لگاؤ نہیں ہے مگر یاد رکھنا ایک اور ہے جس کو پتا جی اپنا بیٹا مان چکے ہیں اور ہم دونوں نے اس کو اپنا بھائی تسلیم کر لیا تھا۔'' منوہر واپس پٹنہ چلا گیا۔

بھگوت مراری کے بارے میں جانتا تھا، مگر اس کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہ تھی، ایک تو وہ حویلی سے دور تھا دوسرے سب تو اس کو نہیں جانتے تھے۔ اس کے خیال میں قانونی طور پر زمیندار شنکر کی تمام دولت اور زمینوں کی مالک اس کی بیوی تھی۔

پندرہ سال گزر گئے۔ بھگوت زمینداری کرتا رہا۔

سب لڑکیوں کی شادی ہو گئی مگر دلاری اور کرن نے شادی نہیں کی۔ کرن کی تو بھگوت نے نہیں ہونے دی اور دلاری نے خود نہیں کی۔ حویلی میں جو عیش اس کو حاصل تھے وہ اس کو کہاں ملتے۔ دلاری نے کچھ ایسے لوگوں سے رابطے کر لئے تھے جو کہ بھگوت کو بھی ڈرا دیتے تھے۔

پندرہ سال کے بعد زمینداری کا دعویٰ دار سامنے آ گیا اور وہ تھا مراری۔ اس نے سرکاری سطح پر دعویٰ کیا تھا۔ بھگوت ذرا حیران تو ہوا۔ مگر پھر مقابلے پر ڈٹ گیا۔ اور مقدمہ چلنے لگا مراری اس کے مقابلے میں کمزور پڑنے لگا ایک تو وہ روپے پیسے میں کمزور تھا۔ دوسرے اس کے پاس جو گواہیاں تھیں وہ نہ معلوم کس طرح ٹوٹ رہی تھیں، کوئی گواہ عدالت نہیں جاتا تھا اور پھر وہ مقدمہ ہار گیا اور کرن مقدمہ جیت گئی اور بھگوت نے ایک بہت بڑا جشن منایا۔ اور مراری کو اس کے گاؤں سے بیدخل کر دیا۔ اور وہ نہ معلوم کس طرح دلی آ گیا اور پھر ہمارے سامنے تھا۔

ہر وہ داستان جس میں محبت کی چاشنی بھی تھی نفرت، لالچ سب کچھ تھا رولوکا نے کہا۔ ''اب حویلی کے کیا حالات ہیں۔''

مراری نے کہا۔ ''بھگوت کی دونوں لڑکیوں کے

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

چاہنے والے ہر وقت آتے جاتے رہتے ہیں۔ان کے چاہنے والوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو جادو سحر کرتے ہیں۔ میرے خلاف انہوں نے مقدمہ جیت تو لیا ہے میں صرف اس بات پر حیران ہوں میرے حق میں جتنے گواہ تھے کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا۔اور میں مقدمہ ہار گیا۔"

"تم دلی میں رہو تمہارا کیس میں لڑوں گا۔پٹنہ میں منوہر وکیل کو اطلاع کر دو کہ تم یہاں پر ہو۔اور وہ تم کو یہاں پر آ کر ملاقات کر لے۔"

ایک ہفتہ میں منوہر مراری کے پاس آ گیا۔رولوکا نے کہا۔"وکیل صاحب مراری کے پاس جو کاغذات ہیں وہ کیا کہتے ہیں۔"

شنکر نے ساری زمین اور حویلی مراری کے نام کر دی ہے۔گواہیاں بھی لکھی ہیں۔ان کاغذات کو شنکر نے شادی کے بعد تیار کروایا تھا۔اس میں اس نے ماما کے کردار کو ناقابل بھروسہ قرار دیا ہے۔بیوی کو ماما کا آلہ کار بتایا ہے۔ میرے اور شنکر نے خود کے بعد مراری کو حق دار بتایا ہے۔کچھ ایسے گواہ بھی لکھے ہیں جن کے سامنے پتاجی نے مراری کو بیٹا مانا ہے۔میں تو شنکر کو لکھ کر دے چکا تھا کہ وہی میرے حصے کا مالک و مختار ہے، اس کا بھی حوالہ دیا ہے، اتنا صاف کیس مراری ہار گیا، اس میں بھی ضروری کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔" منوہر نے کہا۔

"آپ ایسا کریں پھر سے یہ کیس دائر کر دیں۔" رولوکا نے کہا۔

"کیس تو میں دائر کر دوں گا، مگر جو امکانات ہیں ان پر پہلے سے غور کر لیا جائے تو بہتر ہے۔ماما بھگوت کا اثر رسوخ پندرہ سال میں بہت بڑھ گیا ہوگا۔"

اس کے خلاف ہم کسی گاؤں سے گواہی حاصل نہیں کر سکیں گے۔پندرہ سالوں میں بہت کچھ بدل گیا ہوگا۔کچھ لوگ مر چکے ہوں گے اور نئے لوگ تو بھگوت کو ہی زمیندار مانیں گے۔ بہت سی پریشانیاں آئیں گی درمیان میں۔" منوہر نے کہا۔

"سب تو اپنی جگہ ہے مگر ہمارے ساتھ سچائی کی طاقت ہے، جھوٹ ہمیشہ نہیں جیتتا۔ایک نہ ایک دن اس کو ہارنا پڑتا ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"بے شک آپ نے درست کہا ہے۔" منوہر نے کہا۔

"مقدمہ یہاں پر دلی کی عدالت میں کریں تو کیسا رہے گا۔" رولوکا نے پوچھا۔

"میرے خیال میں اودھے پور بہتر رہے گا، کیونکہ گواہوں کے آنے میں وہاں پر آسانی ہوگی، گاؤں کے لوگ لمبے سفر کرنے سے کتراتے ہیں۔" منوہر نے رائے دی۔

"آپ نے درست کہا تو پھر مقدمہ اودھے پور میں دائر کریں۔"

میں تیاری کرتا ہوں۔پندرہ بیس دن تو تیاری میں لگ جائیں گے۔" منوہر نے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ تیاری کریں میں اودھے پور وہاں کے حالات جا کر دیکھتا ہوں۔اور مراری تم دلی میں آرام کرو۔"

رولوکا اودھے پور روانہ ہو گیا۔

اودھے پور آتے ہی اس نے ایک نوجوان دیہاتی کا روپ دھار لیا۔اور کام کی تلاش میں بھگوت کے پاس چلا گیا۔

بھگوت نے اس کو سر سے پیر تک دیکھا اور پھر بولا۔

"کہاں کا ہے رے تو اور کیوں آیا ہے۔"

"مزدوری کو آیا ہوں سرکار ہاکم گاؤں کا ہوں۔"

"ڈھور ڈنگر دیکھ لے گا ان کا دودھ نکال لے گا۔" بھگوت نے پوچھا۔

"ہاں یہی کیا ہے اب تک۔" وہ بولا۔

"تیرا نام کیا ہے۔" بھگوت نے پوچھا۔

"نام تو بابو ناتھ ہے، مگر اب صرف بابورہ گیا ہے۔" رولوکا بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے جو رہ گیا ہے اس پر ہی گزارہ کر لیں گے۔" پھر اس نے کسی کو آواز دی۔

"ارے او سولنکی ادھر تو آ۔"

ایک بوڑھا آدمی اس کے پاس آ گیا اور بولا حکم کر و سرکار۔

"روز مرے تھا کہ کام بہت ہے، لے یہ جوان رکھ اپنے پاس سب کام کر لے گا۔تیرے اور ذرا دھیان رکھنا نیا آدمی ہے۔سمجھ گیا نا۔" بھگوت بولا۔

"خوب سمجھ گیا سرکار۔" بوڑھا بولا۔اور بھگوت چلا گیا۔

بوڑھے سولنکی نے رولوکا کو دیکھ کر اور بولا کہ تیرا نام کیا ہے۔" رولوکا بولا "بابو ہے میرا نام۔"

"تو سن بھئی بابو تیرا کام تو بہت ہے یہ ساری بھینس گائے نظر آ رہی ہیں ان کا دودھ نکالنا اور پھر وہ دودھ حویلی کے دروازے پر پہنچانا۔وہاں پر شہر کی گاڑی آوے ہے پھر یہ دودھ شہر چلا جاتا ہے۔اس کے بعد یہاں کی صفائی کرنا ہے۔چارہ پانی گوبندی کرتا ہے۔گوبر بوجی لے جاتی ہے۔" بوڑھا بولا۔

"اور تم کیا کرتے ہو چاچا۔" رولوکا نے پوچھا۔

"ارے اب میں کس قابل ہوں کہ کروں۔" بوڑھا بولا۔

"منشی کو ہاتھ پیر ایک دم نہیں ڈال دینے چاہئے چاچا۔" رولوکا نے کہا۔

"تیری بات ٹھیک ہے کرنا تو پڑتا ہے کچھ نہ کچھ یہ وہ زمیندار نہیں جو بغیر کئے کا ایک نوالہ بھی منہ میں ڈال دے۔ زمیندار تو شنکر تھا اس کا باپ تھا۔کبھی کسی کو ستایا نہیں اور کسی کا حق رکھا نہیں۔سب کو پیٹ بھر کر دیا، آڑے وقت میں کام بھی آیا، ارے اب کیا رکھا ہے۔بیگار ہے جو ہم سب کر رہے ہیں، نہ کریں تو بھی مارے جائیں۔" بوڑھا بولا۔

"مارے جائیں یہ کیا بات ہوئی کام کریں گے مزدوری لیں گے، نہیں کریں گے تو گھر جائیں گے۔" رولوکا بولا۔

"یہاں یہ بات نہیں ہے تم لگ گئے کام پر بس اب کرتے رہو جانے کا نام نہ لینا، اگر گیا تو ہاتھ پیر چھوڑ کے جانا ہوگا۔" بوڑھا سولنکی آہستہ سے بولا۔

"ارے چاچا تم نے کیا سنائی مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔" رولوکا بولا۔

"بات یہ ہے بابو کہ یہ جو بھگوت ہے نا بہت خطرناک آدمی ہے۔اس سے زیادہ خطرناک اس کی دو چھوری ہیں، وہ دونوں حویلی میں رہیں ہیں ان کے پاس بڑے خطرناک آدمی آوے ہیں وہ آدمی کا ناش مار دیتے ہیں۔" بوڑھا بولا۔

"کیا بہت بدمعاش ڈاکو ہیں وہ۔" رولوکا بولا۔

"ارے نہیں سفلی اور کالا جادو کریں ہیں۔بھگوان ان سے بچائے۔" بوڑھا بولا۔

"چاچا سولنکی میں تو برا پھنس گیا اب میں کیا کروں۔" رولوکا بولا۔

"تو اب کام کر، جانے کی مت سوچنا، تیرا نام لکھ لیا گیا ہے زیادہ دور نہیں جا پائے گا۔"

رولوکا زور سے خود سے بولا۔"لے بابو تیرا تو ہو گیا کام۔"

"مگر تو فکر نہ کر اگر میرے پاس رہے گا تو آرام سے رہے گا۔" سولنکی نے کہا۔

"اور اب کہاں جاؤں گا، اب تو آ پھنسے کی رام رام ہے۔" رولوکا نے جواب دیا۔

دن بھر رولوکا کام کرتا رہا، رات کو اپنی کوٹھری میں چلا گیا اور اندر سے کنڈی لگالی اور روپوشی کی حالت میں باہر آ گیا حویلی کی طرف چلا، دروازے پر ایک لٹھ بند سر سے اونچا لٹھ لئے ٹہل رہا تھا بڑا دروازہ بند تھا اور چھوٹا دروازہ کھلا تھا، رولوکا اس کے سامنے سے گزر کر حویلی کے اندر چلا گیا۔ حویلی میں روشنی نظر آ رہی تھی۔مگر اتنی کم کے دور کا آدمی نظر نہیں آتا تھا۔رولوکا نے جس جس کمرے میں روشنی تھی ان کو چیک کرنا شروع کر دیا۔

ایک بڑے کمرے میں بھگوت بیٹھا تھا اس کے سامنے ایک جوان عورت بیٹھی تھی۔

ظاہر ہے یہ اس کی بیوی نہیں تھی۔ بھگوت کے

READING CORNER
http://readingcornerbank.blogspot.com/

سامنے دو گلاس رکھے تھے اور دونوں شراب سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک بوتل بھی رکھی تھی۔

بھگوت اس عورت کے قریب چلا گیا اور بولا۔

"اب زیادہ نخرہ نہ کر۔ بہت دن کے بعد آئی ہے۔"

عورت نے چاروں طرف نظریں گھما کر کہا۔

"میں کیسے تیرے پاس آ گئی میں تو اپنے گھر بیٹھی تھی۔"

"اب آ گئی ہے تو مزے کر لے۔ میں ہوں زمیندار بھگوت موج کرے گی موج۔"

"مجھے گھر جانے دے میں بال بچے دار عورت ہوں۔" عورت نے کہا۔

"چلی جانا روک کون رہا ہے، مگر کچھ ہمارا بھی خیال کر لے، چنتامت کر تیرے خصم کو ذرا کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ وہ سویرے تک سوتا رہے گا۔" بھگوت نے کہا۔

"میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے میری عزت کیوں خراب کر رہا ہے تو۔" عورت بولی۔

"خراب کہاں کر رہا ہوں، قدر کر رہا ہوں، تو خالی ہاتھ نہیں جائے گی کچھ لے کر ہی جائے گی۔ اب زیادہ دیر نہ کر تجھے کوئی بچانے آئے گا یہ تو بھول جا۔ آجا اب آجا۔"

عورت کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو بھرے تھے، اس کے ہاتھ پیروں میں لرزا طاری تھا اور ہونٹ کپ کپا رہے تھے۔

بھگوت اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ عورت کو پکڑے مگر درمیان میں رولوکا آ گیا۔ اس نے عورت کو پوری طرح اپنی آڑ میں کر لیا اور ایک بھیانک شکل بھگوت کے سامنے آ گئی۔ اتنی بھیانک کہ بھگوت اس کو دیکھ کر چیخ پڑا اور ہائے رام کہہ کر زمین پر گر پڑا رولوکا نے عورت کا ہاتھ پکڑا اور حویلی کے باہر آ گیا۔ عورت حویلی کے باہر آتے ہی ایک طرف دوڑ گئی اور رولوکا پھر حویلی کے اندر تھا۔

بھگوت کی آواز سن کر کئی آدمی اس کے کمرے کی طرف دوڑے، بھگوت زمین پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ شراب کے دونوں گلاس پورے پڑے تھے۔ بوتل البتہ الٹ گئی اور شراب فرش پر بہہ رہی تھی۔

ان آدمیوں نے بھگوت کو اٹھا کر بڑے سے پلنگ پر ڈال دیا اور ایک نے صراحی سے پانی بھر کر بھگوت کے منہ پر چھینٹے مارے، کچھ ہی دیر میں بھگوت ہوش میں آ گیا۔

ہوش میں آتے ہی بولا۔

"وہ کون تھا۔ چلا گیا کیا۔"

"یہاں تو کوئی نہیں ہے سرکار۔" ایک آدمی نے جواب دیا۔

"ارے کیسا تھا وہ ایسا بھیانک تو میں نے کبھی دیکھا نہیں۔"

"یہاں تو کوئی نہیں ہے سرکار، آپ نے سپنا دیکھا ہوگا۔" ایک نے کہا۔

"مجھے جھوٹا بناتا ہے پاکھنڈی۔" بھگوت غصے سے بولا۔

سب نوکر خاموش ہو گئے۔ بھگوت نے ایک گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا دو چار گھونٹ لیکر بولا۔

"وہ حرام زادی کہاں گئی۔"

سب خاموش رہے تو وہ دہاڑ کر بولا۔ "ابے کیا گونگے ہو گئے ہو جواب دو کہاں گئی۔"

"ہم جب اندر آئے تو ہم نے کسی کو نہیں دیکھا، آپ زمین پر پڑے تھے اور کمرہ خالی تھا۔" ایک آدمی ڈرتے ڈرتے بولا۔

"تو کیا وہ ہوا میں اڑ گئی۔ ارے کوئی چڑیا تھی، عورت تھی اس کا نام جانکی تھا۔ گولو کی گھر والی، جاؤ دوڑ کے اور چٹیا سے پکڑ کر لے آؤ۔" بھگوت بولا۔

تینوں دروازے کی طرف دوڑے مگر حویلی کا دروازہ باہر سے بند تھا موٹی لکڑی کا بنا ہوا بھاری دروازہ۔ دروازے کے باہر کا پہرے دار زمین پر خراٹے لے رہا تھا۔ اندر کے کسی شور کا اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔ پھر انہوں نے بڑا بھاری دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ مگر وہ بھی باہر سے کندہ لگا ہوا تھا۔ صبح تک کوئی اندر کا آدمی باہر نہ آ سکا۔ بھگوت تلملاتا رہا۔

رولوکا اس کے قریب ہی رہا۔

دوپہر بارہ بجے اس کے پاس ایک آدمی آیا۔

اس آدمی کے کالے کپڑے تھے۔ سر گنجا تھا۔ جسم دبلا پتلا تھا، مگر آنکھیں بڑی چمکدار اور سرخ تھیں۔ وہ آتے ہی بولا۔

"ڈر گئے کیا رات کو، ارے ہمارے ہوتے ڈر گئے۔ ہم تو خود سو بلاؤں کے بلا ہیں۔"

"سو تو ٹھیک ہے مگر وہ کون تھا کیا بتائیں اس کا چہرہ کتنا ڈراؤنا تھا۔"

"میرا تو خیال ہے تمہارے خیال میں ضرور کوئی چہرہ ہوگا وہی تمہارے ذہن سے نکل کر سامنے آ گیا اور تمہاری گھگی بندھ گئی۔"

"ارے نہیں سوکی مہاراج ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ ہمارے ساتھ تو ایک بڑی بڑھیاں سندری تھی۔ ارے وہی جانکی گولو کی عورت، ہم اس کی طرف بڑھے ہی تھے کہ اس کی جگہ وہ شکل آ گئی اور ہم ہو گئے انا غنیل۔" بھگوت نے کہا۔

"اچھا تم آرام کرو میں دیکھتا ہوں اگر کوئی ہے تو سمجھ لو پھنس گیا اور سوکی مہاراج کمرے سے باہر آ گیا۔" رولوکا اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

سوکی ایک کمرے میں بغیر آواز دیئے اندر چلا گیا۔

اندر پلنگ پر ایک جوان عورت بیٹھی تھی۔ مگر اس کے چہرے پر خرانٹ پن صاف ظاہر ہوتا تھا۔ سوکی مہاراج اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

"دلاری جی ہم آپ کے پاس کب سے آ رہے ہیں۔ ذرا بتلاؤ تو۔"

"اس کی ضرورت کیوں پڑ گئی مہاراج۔" دلاری نے اٹھ کر کہا۔

"اس لئے پڑ گئی کہ ایک نئی بات سامنے آ گئی۔ حویلی میں ہمارے علاوہ بھی کوئی شکتی ضرور ہے۔ مگر خیر دیکھ لیں گے، تو جو بھی ہے سن رکھ غور سے۔"

سوکی مہاراج کے چہرے پر خباثت پوری طرح مساوی تھی۔ آنکھوں میں مکاری، شیطانی عروج پر تھی۔

مگر یہ کیفیت صرف چند منٹ رہی، پھر حیرت انگیز طور پر وہ پرسکون ہو گیا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ عورت نے اس کا سر اپنی زانوں پر رکھ لیا اور گنجی ٹانٹ پر آہستہ آہستہ انگلیاں پھیرنے لگی۔

چند منٹ کے بعد سوکی مہاراج نے آنکھیں کھولیں اور اطمینان سے کہا۔

"تو نے ہماری بڑی خدمت کر لی ہے ہم تیرے ساتھ کیا کریں۔"

"کوئی چنتا کی بات ہے۔" دلاری نے کہا۔

"ہے تو پر ایسی بھی نہیں کہ تم کو بیاکل کر کے اپنا مزا خراب کروں۔" مہاراج بولے۔

"آج دن میں کیسے آنا ہوا۔"

"بلائے گئے ہیں، تیرے پتا نے بلایا تھا۔" مہاراج دلاری کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔

مگر دلاری کا ہاتھ اتنا بھاری اتنا سخت مہاراج نے ہاتھ چھوڑ دیا اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"تم ہاتھ دکھاؤ۔" وہ بولے۔ دلاری نے ہاتھ آگے کر دیا۔

"یہ وہ ہاتھ نہیں ہے جو ابھی میرے ہاتھ میں تھا۔ وہ کس کا ہاتھ تھا۔"

"تو کون ہے سامنے تو آ پھر تجھے بتاؤں۔" اور رولوکا خاموشی سے کمرے سے باہر آ گیا تھا۔ رولوکا کا مقصد اس کو ذہنی خلفشار میں مبتلا کرنا تھا۔ وہ اس نے کر دیا تھا۔

اب وہ کرن کے کمرے میں تھا۔ کرن اب کرسی پر بیٹھی تھی وہ دلاری سے عمر میں چھوٹی تھی۔ مگر جسمانی ساخت کے اعتبار سے وہ دلاری سے بڑی لگتی تھی۔ دلاری بڑی ہوشیار عورت تھی۔ اس نے خود کو کم سے کم خرچ کیا اور کرن کو سب کے سامنے آگے رکھا۔ اس کی خاندانی ریشہ دوانیوں نے اس کو بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ بھگوت کمار بے ایمانیاں اور زمینداری پر قبضہ کرنے کے طریقہ کار نے بھگوت کی عزت اور خاندان کی عزت اس کی نظر میں کوڑی کی کر دی تھی۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

وہ جانتی تھی کہ اب اگر کچھ عزت قائم رہ سکتی ہے تو دولت اور اقتدار سے ہی رہ سکتی ہے۔ اس کو قائم رکھنے کو ہر جتن وہ کر رہی تھی، کرن اس کے سامنے دوسرے درجے پر تھی، حالانکہ زمینداری اس کے نام تھی، مگر عملی طور پر دلاری ہی حاکم تھی، بھگوت بھی اس کی مرضی کا غلام تھا۔

کیونکہ اس پر سوکی مہاراج کا ہاتھ تھا۔

رولوکا کرن کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ کرن کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور اس کا جسم بھدا اور بے حساب پھیلا ہوا تھا۔ اس کی جوانی کتنی تیزی سے اس سے بھاگ رہی تھی دلاری کے مقابلے میں یہ جلدی بوڑھی ہو رہی تھی۔ انسان کتنا بے وقوف ہے اقتدار کی ہوس انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ اس عورت نے کیا کھویا اور کیا پایا۔ رولوکا نے سوچا۔

اور وہ اس کے کمرے سے باہر آ گیا۔ دلاری کا کمرہ بند تھا مہاراج سوکی اندر سو رہا تھا۔

رولوکا دلاری کے کمرے کے اندر چلا گیا۔ دلاری جاگ رہی تھی۔ رولوکا نے اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر آہستہ سے کہا۔

"تیرے ساتھ دھوکا ہو رہا ہے۔" دلاری نے چونک کر چاروں طرف دیکھا کہ آواز کہاں سے آئی۔ مگر کچھ نظر نہ آیا کمرہ روشن تھا، دن کا وقت تھا۔

رولوکا نے پھر کہا۔ "تیرا باپ بھگوت سب ہڑپ کرنے کے چکر میں ہے۔

وہ پھر گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی اور چاہتی تھی کہ سوکی مہاراج کو اٹھائے کہ وہ پھر بولا۔ اس کو نہ بتانا یہ بھی اس سے ملا ہوا ہے۔" اور رولوکا یہ کہہ کر کمرے سے باہر آ گیا۔

رات کے بھوجن کے بعد بھگوت نے پوچھا۔

"مہاراج کچھ پتہ چلا کیا گڑبڑ ہے۔"

"تو یہ بتا تو نے کوئی نیا نوکر حویلی میں تو نہیں رکھا۔" سوکی نے پوچھا۔

"نیا نوکر ہاں ایک گوالہ رکھا تو ہے۔" بھگوت نے کہا۔

"تو اس کا مطلب ہے وہی نیا آدمی آیا ہے۔" سوکی نے کہا۔ "ذرا اس کو بلا کے تو لا۔"

"ابھی بلائے دیتا ہوں۔" اور اس نے رولوکا کو بلانے آدمی دوڑا دیا۔

رولوکا کوٹھری میں تھا وہ باہر نکلا اور بولا۔ "کیا بات ہے کیوں بلا رہے ہو۔"

"تیرا نام بابو ہے۔" وہ بولا۔

"ہاں ہم ہی بابو ہیں اب آگے بول۔" رولوکا نے کہا۔

"زمیندار جی بلا رہے ہیں جلدی چل۔" وہ بولا۔

"ارے کام تو ہم سب کئے ہیں پھر کاہے ضرورت پڑ گئی۔" وہ بولا۔

"کچھ گڑبڑ ہے مہاراج بھی ان کے ساتھ ہیں۔" آدمی بولا۔

"مارے گئے بابو اب کیا کریں۔" رولوکا بولا۔

"ارے جلدی کر تیرے ساتھ ہم بھی مارے جائیں گے۔" وہ بولا۔

اور دونوں تیز تیز قدموں سے اندر آ گئے۔ بابو بھگوت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "یہ ہے مہاراج۔" بھگوت نے کہا۔

مہاراج نے اپنی تیز اور چمکیلی نگاہوں سے رولوکا کا جائزہ لیا اور ایک زور کی ہوں کی اور بولا۔ "تو یہ سب تو کر رہا ہے۔"

"میں کیا کر رہا ہوں میں تو مزدوری کر رہا ہوں سرکار۔" رولوکا بولا۔

"ارے تو میری نظر سے نہیں چھپے گا۔ پاتال تک دیکھتا ہوں میں۔" مہاراج بولا۔

رولوکا کو اندازہ ہوا کہ دشمن کو کچھ نہ کچھ اس پر شک ضرور ہو گیا ہے۔ وہ گڑگڑا کر بولا۔ "میں نے کیا کیا ہے سرکار کیوں ناراض ہو۔"

"ارے تو نے اب تک جو کرتب دکھلائے ہیں ذرا میرے سامنے تو دکھا پھر جانوں۔" مہاراج نے کہا۔ رولوکا اس کے پاس بیٹھ گیا اور رونے لگا، مر گئے بابو ناتھ آج بے

موت مارے گئے۔"

"ارے میں کہتا ہوں کچھ تو کر تیرے کس بل میں بھی تو دیکھوں۔" مہاراج بولے۔

"ہم تو نوکر ہیں تمہارے ہمارے کس بل کیا ہیں۔" وہ بولے۔

"اچھا رک ابھی پتہ کرتے ہیں، تیرے اندر کیا ہے۔"

"کچھ دیر خاموشی رہی پھر مہاراج بولا..... ارے یہ تو خالی ڈبہ ہے۔ چل اٹھ بھاگ جا۔

بابو پھرتی سے اٹھا اور کمرے سے نکل گیا اور ایک لمحے کے بعد وہ روپوشی میں کمرے کے اندر تھا۔ بھگوت نے پوچھا۔ کیا ہوا مہاراج۔

"تیرا نوکر تو وہ نہیں ہے جو ہم سمجھ رہے تھے۔ کوئی اور ہے۔"

"تو اس کا کچھ پائے تو کرو نہیں تو روز روز وہ کچھ کرتا رہے گا۔" بھگوت نے کہا۔

"کرتے ہیں مرا کیوں جا رہا ہے۔" مہاراج نے کہا اور دلاری کے کمرے میں آ گئے۔" دلاری بولی کچھ پتہ چلا کون ہے۔

"تو بھی مری جا رہی ہے تیرا پتا بھی مرا جا رہا ہے۔ یہ کام اتنا ہی آسان ہوتا تو سب نہ کر لیتے بڑی جلدی ہے تم سب کو۔ مہاراج غصے سے بولا۔

"جلدی نہیں ہے مہاراج ڈر لگ رہا ہے۔ پتہ نہیں کون سی شکتی ہے۔" دلاری نے کہا۔

"کوئی ہو ذرا بھنک لگ جائے پھر تو ہم اس کا نام مٹا دیں گے۔" مہاراج بولے۔

رولوکا باہر آ گیا اور اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔

دوسرے دن وہ سوکی سے بولا۔

"چاچا حویلی میں کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے تم کو پتہ ہے۔"

"نا ہی مجھے تو پتہ نہیں ارے ہاں یاد آیا تجھے مہاراج نے بلایا تھا کیا بات تھی۔" سوکی نے پوچھا۔

"ہم تو سمجھے بابو ناتھ تم گئے کام سے پر بھگوان کی کرپا ہو گئی پتہ ہے وہ ہم سے کیا کیا پوچھتے رہے ہم بھلا کیا جانیں، خاموش ہی رہے۔" رولوکا نے کہا۔

"چل تیری جان بچ گئی یہ مہاراج بڑا ہی خراب آدمی ہے اور یہ زمیندار تو پورا دلدل ہے دلال۔

ارے بے خبر اتنا ہے کہ اس کی چھوریوں کے ساتھ وہ مہاراج موج کرے ہے اور یہ دیکھتا رہتا ہے نہ تو چھوریوں کو روکے ہے نہ مہاراج کو۔" سوکی بولا۔

"ہم تو برے پھنس گئے پتہ ہوتا تو کیوں آتے اس آفت میں۔" رولوکا نے کہا۔

"ارے تو فکر مت کر آرام سے رہ یہ نوکر ہیں بس تماشہ دیکھیں گے۔ اپنی ٹانگ نہ پھنسائیں گے۔" سوکی نے کہا۔

رات کو رولوکا دلاری کے کمرے میں گیا، وہ بیٹھی بناؤ سنگار کر رہی تھی۔ وہ باہر آ گیا اور بھگوت کے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں بھگوت موجود تھا اور اس کے سامنے ایک عورت بیٹھی تھی۔ اور وہ عورت گولو کی بیوی جانکی تھی۔ آج وہ بناؤ سنگار کر کے آئی تھی۔ اس کے سامنے شراب کا بھرا گلاس رکھا ایک گلاس بھگوت کے سامنے بھرا رکھا تھا۔

"پیو میری جان آج تو تم چمک رہی ہو۔" بھگوت نے کہا۔

رولوکا کو فوراً اندازہ ہو گیا کہ عورت کسی کے اثر میں ہے، اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ اس کو جو کرنے کا کہا جا رہا ہے وہ کر رہی ہے۔ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر رہی۔

رولوکا نے اس کے منہ کے سامنے اپنا ہاتھ لہرایا۔ عورت ایک دم اثر سے باہر آ گئی اور چونک کر اس نے چاروں طرف دیکھا اور حیرت سے بولی۔

"میں کہاں ہوں تو زمیندار ہے ارے تو کیوں میری عزت کا دشمن ہوا ہے ناش پیٹے کیوں بار بار مجھے بلاوے ہے۔"

بھگوت جو ذرا پہلے بڑا خوش تھا ایک دم غصے میں آ گیا اور زور سے بولا۔ "ارے تیری اور تیری عزت کی ایسی

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

تیمی کروں۔" اور جھپٹ کر عورت کی طرف بڑھا۔ مگر درمیان میں رولوکا موجود تھا اور ایک بار پھر وہ خوفناک چہرہ اس کے سامنے تھا۔ بھگوت کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ ہائے رام کہہ کر دھڑام سے گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ عورت نے دروازہ کھولا اور باہر آ گئی۔ حویلی کا باہر کا دروازہ رولوکا پہلے ہی کھول چکا تھا۔ وہ حویلی کے باہر چلی گئی۔

مہاراج دلاری کے کمرے میں پڑے رہے اور ان کے کسی بیر نے ان کو کیا ہوا نہیں بتایا۔ سویرے ان کو سارے حالات بھگوت نے بتائے تو وہ بولے۔

"میں نے جانگی پر ایک بیر لگا دیا تھا وہ اس کے دماغ کو قابو کئے تھا، تم نے دیکھا وہ خود چل کر تمہارے پاس آ گئی تھی۔ یہاں آ کر میرا بیر اس کو چھوڑ کر کیوں بھاگا یہ سمجھ نہیں آ رہا۔ بیر کے بھاگتے ہی وہ ہوش میں آ گئی اور نکل گئی۔" مہاراج نے کہا۔

"اور وہ میرے اور اس کے بیچ ایک بھیانک صورت آ رہی ہے وہ کون ہے۔ حویلی کا دروازہ بند تھا، اس پر پہرے دار تھا وہ کس نے کھولا اور پہرے دار بے ہوش پڑا رہا۔

"مہاراج کھوپڑی کام نہیں کر رہی تم کچھ سوچو۔" بھگوت نے کہا۔

"میں بے فکر نہیں ہوں میرے سارے بیر کام کر رہے ہیں، مگر کسی کو اب تک کچھ نظر نہیں آیا۔ کریں تو کس کے خلاف کریں۔ کس کو پکڑیں کوئی تو سامنے ہو۔" مہاراج بولے۔

"لو بتاؤ تم جیسے شکتی والے ایسی بات کریں، تعجب کی بات ہے۔" بھگوت بولا۔

"تم نہیں جانتے شکتی شکتی میں فرق ہوتا ہے۔ میں نے زندگی میں ایسی شکتی نہیں دیکھی۔ جیسی یہ ہے۔

ہمارے سامنے ہے اور ہم دیکھ نہیں پا رہے، میرے سارے بیر مجبور ہیں۔ میری کوئی نہیں چل رہی، مگر میں ہار نہیں مانوں گا یہ ضرور کروں گا۔"

دس، ان تک رولوکا نے ان کو اسی طرح ذہنی پریشانی میں مبتلا رکھا اس سے رولوکا کا مقصد کیس پر اپنی گرفت مضبوط کرنا تھا۔ ابھی بھگوت اس ذہنی خلفشار سے باہر نہیں آیا تھا کہ عدالت کا نوٹس اس کو ملا۔ اور وہ دوڑا دوڑا مہاراج کے پاس پہنچا اور بولا۔

"مہاراج یہ نئی مصیبت آ گئی۔"

مہاراج نے پوچھا "اب کیوں مرا جا رہا ہے۔"

"مہاراج عدالت کا نوٹس آیا ہے۔"

"عدالت کا نوٹس کس بات کا۔" مہاراج نے پوچھا۔

"وہ دوکوڑے کے مراری نے پھر دوبارہ دعویٰ کر دیا ہے۔" بھگوت بولا۔

"وہ قصہ تو پندرہ سال پہلے میں نے ختم کرا دیا تھا۔" مہاراج نے کہا۔

"پھر کچھ جمع کر لیا ہوگا عدالت اور وکیلوں پر خرچ کرے گا تو چین سے بیٹھ جائے گا۔ مگر مہاراج اب کے کچھ ایسا کرو کہ اس کا مٹنا ہی ختم ہو جائے۔" بھگوت بولا۔

"ہو جاوے گا تو فکر نہ کر آنے دے نوٹس، تو اپنی تیاری کر، کرن کی شادی کے سب گواہوں اور کرن کو تیار رکھ عدالت تو اس کو بھی جانا ہوگا۔

رولوکا سمجھ گیا کہ منوہر نے کارروائی شروع کر دی ہے۔ وہ فوراً مراری کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھا۔

"تمہارے پاس ایسے گواہ ہیں جن کے سامنے شام کمار نے تم کو اپنا بیٹا مانا تھا۔"

"گواہ تو ہے مگر اس نے پہلے بھی گواہی نہیں دی تھی۔" مراری نے کہا۔

"مجھے اس کے پاس لے چلو وہ گواہی دے گا۔" رولوکا نے کہا۔

"تم کو پتا ہے کہ شنکر نے ساری زمین اور حویلی مراری کے نام کی تھی اس کے کاغذات کس وکیل نے تیار کیے تھے اور رجسٹریشن کرائی تھی۔ اس کو بھی گواہوں میں شامل کروان کاغذات پر گواہوں کے دستخط بھی ہوں گے ان کے گھر میں مجھے لے چلو۔ تم فکر نہ کرو وہ سب گواہی دیں گے اگر ان میں سے کوئی مر گیا ہے تو بھی اس کا نام تو

رہے گا۔"

منوہر نے تاریخ پر گواہوں کو لانے کی تاکید کر دی تھی اور رولوکا اس کام پر لگ گیا تھا۔

بھگوت کے سارے گواہ موجود تھے۔ اور تاریخ پر آنے کو راضی تھے بھگوت نے ان کے منہ روپوں سے بند کر دیئے تھے۔

پہلے بھگوت کے گواہوں کے بیانات ہونا تھے دس بجے عدالت کی کارروائی شروع ہوگئی مگر عین وقت پر پہلے گواہ کے گلے میں خراش پڑ گئی اور چند منٹ میں ہی اس کی آواز بند ہوگئی۔ اور وہ گواہی نہ دے سکا۔

اس کے بعد اس پنڈت نے بیان دیا جس نے کرن اور شنکر کے پھیرے کرائے تھے۔ بظاہر بھگوت کا کیس پھر مضبوط نظر آتا تھا مگر اب مراری کے گواہوں کی باری تھی۔ منوہر نے اس وکیل کو بھی پیش کر دیا جس نے تمام کاغذات تیار کیے تھے ساری زمینداری مراری کو دے دی تھی اس پر منوہر کے بھی دستخط تھے۔ اس کے بعد پیشی پڑ گئی باقی گواہ اگلی پیشی پر بیانات دیں گے۔

"ارے مہاراج یہ کیا ہو رہا ہے نیا ڈولتی نظر آ رہی ہے۔ بھگوت نے کہا۔

"تو بڑا کمزور دل کا ہے ارے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دوں گا فکر ہی نہ کر۔" مہاراج نے کہا۔

"مہاراج تم یہی کہتے رہو گے اور میں ڈوب جاؤں گا۔" بھگوت بولا۔

"تیرے باپ کی یہ زمینداری بے جائے گی تو تیرا کیا جاوے گا۔ تو نے تو پندرہ سال عیش کرے اب اور کیا کرے گا مفت کا زمیندار بنا بیٹھا رہا۔" مہاراج نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو مہاراج میں نے تم پر بڑا مان کیا ہے۔ تم کو کتنی عزت دی اور تم.....!

"بس کر بھگوت! مہاراج بات کاٹ کر بولے۔

"تو نے سب اپنے بھلے کو کیا تو نے کسی کی بھلائی نہیں کی تو دولت اور زمینداری کی خاطر اپنی اولاد کی بلی چڑھا دی۔ اپنے بہنوئی کو مروا دیا بہن کو زہر دے دیا۔ تو کس کا ہے تو کسی کا نہیں ہے تو تیرا کون ہوگا۔" مہاراج نے کہا۔

"مہاراج میں نے یہ سب تمہارے مشورے سے تو کیا تھا۔" بھگوت نے کہا۔

"میں جو مشورہ کسی کو دیتا ہوں اس میں اپنا فائدہ دیکھتا ہوں مجھے تیری دونوں چھوریاں نظر آ رہی تھیں میں تیرے ساتھ لگ گیا۔"

"اب تو تم ہی سہارا ہو۔ کچھ تو کرو۔ عدالت نے فیصلہ مراری کے حق میں دے دیا تو ہم سب کا کیا ہوگا۔ یہ تو سوچو۔" بھگوت بولا۔

"ابھی تک تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اگر عدالت نے تیرے خلاف فیصلہ دے دیا تو بتا تو کہاں جائے گا۔" مہاراج نے کہا۔

"میں جمنا میں ڈوب مروں گا مارے شرم کے۔" بھگوت بولا۔

"تو اتنا شرم دار کب سے ہوگیا۔" مہاراج بولے۔

"اس کے سوا میرے پاس کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔" بھگوت بولا۔

"تو مراری کے پیروں میں گر پڑنا۔ شاید وہ معاف کر دے۔" مہاراج بولے۔

"میں تو سب کچھ کروں گا مہاراج تم اتنی شکتی کے مالک ہو بڑی بڑی تمہاری باتیں تھیں اب کہاں گئی تمہاری شکتی۔ کچھ تو چمتکار دکھاؤ۔ وکیلوں کے دماغ گھماؤ، گواہوں کی آواز دباؤ۔ ارے ہمارا گواہ گونگا ہوگیا تم دیکھتے رہے کس کام کی تمہاری شکتی۔" بھگوت جھنجھلا کر بولا۔

"تجھ جیسے بے وقوف دنیا میں بہت ہیں اور ہمارے لئے عیش کے سامان بھی بہت ہیں۔ رہی ہماری شکتی تو وہ اپنی جگہ ہے۔" مہاراج نے کہا۔

"تو پھر اس کو وہیں پر دھری رہنے دو حرام کا مال تم نے میرا کھایا ور....." بھگوت رک گیا۔

"کہہ دے زبان پر آئی بات اندر مت لے جا۔" مہاراج نے کہا۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

"میں نہیں کہہ سکتا۔ میں نے تم کو سمجھا نہیں۔ یہ میری غلطی ہے۔" بھگوت بولا۔

"دولت کی خاطر کیا کیا کھیل رچائے پر....." مہاراج بولے۔

"تو نے بھی تو عورت کی خاطر اور دولت کی خاطر میرا ساتھ دیا۔ یہ بھی تو کہہ۔" بھگوت بولا۔

'میرا تو یہ کام ہی ہے میرے پاس کیا ہے ذرا سی شعبدے بازی ہے۔ مگر تیرے جیسے مجھے ملتے رہتے ہیں اور زندگی عیش سے گزر رہی ہے۔" مہاراج بولے۔

"تو تیرے پاس شکتی نہیں ہے۔" بھگوت بولا۔

"ہے تجھ جیسوں کو بے وقوف بنانے کی شکتی ہے۔" مہاراج بولا۔

"تیرا انجام بھی اچھا نہیں ہوگا۔" بھگوت بولا۔

دوسری پیشی پر بھگوت کی ساری قلعی کھل گئی۔ جس زمین پر وہ زمینداری کرتا رہا اس کو مرنے سے پہلے شنکر مراری کے نام کر چکا تھا اور حویلی بھی مراری کے نام تھی۔

عدالت کا فیصلہ آنے کے بعد منوہر نے بھگوت کو کہا۔

ماما تم نے پندرہ سال زمینداری کر لی۔ تمہارے نصیب میں اتنی ہی لکھی تھی۔ اب عزت سے حویلی خالی کر دو اور جمنا پار چلے جاؤ۔

"تو بھی میرا دشمن ہو گیا۔ بھگوان برا وقت کسی پر نہ ڈالے۔ اپنے پرائے جو جاتے ہیں۔ ارے تم میرے بھانجے ہو اور تم بھی میرے دشمن ہو گئے۔" بھگوت نے اداکاری کی۔

مراری بولا۔ "اب بس کرو ماما بھیا نے جو کہا ہے اس پر عمل کرو۔"

"ارے میں تم سب کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گا، ایک کونے میں پڑا رہوں گا۔" بھگوت بے حیائی سے بولا۔

"اور اس کونے میں سازش کے جراثیم پیدا کرتا رہوں گا۔" منوہر نے کہا۔

"کچھ نہیں کروں گا غلامی کروں گا تمہاری۔" بھگوت بولا۔

"اور تیرا گورو بھاگ گیا کہ ہے۔" مراری نے پوچھا۔

"مجھے پتہ نہیں وہ میرا گورو نہیں ہے۔ بھگوت بولا۔

"رولو کا ایک آدمی کے ساتھ اندر آ گیا اور بولا۔" یہی ہے نا بھگوت تیرا گورو۔" بھگوت نے کہا۔ "یہی ہے وہ بدمعاش اس نے ہی مجھے سب غلط راستے بتائے تھے۔" بھگوت بولا۔

"اور تم اتنے سیدھے تھے کہ اسکے بتائے راستوں پر چل پڑے۔ رولو کا نے کہا۔ دونوں خاموش رہے تو رولو کا بولا۔

"میں جانتا ہوں تم دونوں اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے۔ تم دونوں نے بہت بڑے گناہ کئے ہیں۔ انسانوں کو مارا ہے۔ ان کو ذہنی طور پر پریشان کیا ہے۔ تم کو سزا تو ملے گی۔ تو بتاؤ اتنے بڑے گناہوں کی کم سے کم سزا کیا ہو سکتی ہے۔" دونوں خاموش تھے۔

"تم دونوں سڑکوں پر بھیک مانگو گے۔ کیونکہ تم دونوں اندھے ہو۔" پھر لوگوں نے دیکھا کہ ایک تیز ہوا کا ریلہ آیا اور دونوں زمین پر گر گئے اور تڑپنے لگے۔ دونوں کی آنکھیں پانی بن کر بہہ چکی تھیں۔

"مراری تم کو مبارک ہو..... تم ایک کام یہ ضرور کرنا کہ دلاری اور کرن کی شادی کسی سے کرا دو۔ اور مجھے اب اجازت دو....."

انسان ہر کام اپنی مرضی سے نہیں کرتا، وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے نہیں کر پاتا اور حالات اس کو کسی ایسے کام پر لگا دیتے ہیں کہ وہ ان سے بچنا بھی چاہے تو نہیں بچ پاتا۔ ہر انسان کے دل میں دولت اور شہرت کی آرزو ہوتی ہے، ہر آدمی اپنی طرف دیکھتا ہے۔ اس کی نظر صرف اپنی طرف ہوتی ہے اور جب وہ صاحب اولاد ہو جاتا ہے تو وہ اپنی ناتمام آرزوؤں اور خواہشات کو اولاد کے ذریعہ پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بعض اوقات عجیب و غریب طریقوں پر

چل پڑتا ہے۔

قدیر خان میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ ان کا مکان محلہ شکلہ پٹی میں تھا۔ ان کا مکان کیا تھا باپ دادا کے زمانے کا مکان تھا۔ قدیر خان بڑے فخر سے بتاتے تھے کہ ان کے دادا کے دادا اس فوج میں شامل تھے جس نے 1857ء میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی تھی اور ان کو دلی میں پھانسی دی گئی تھی۔ اس کے بعد اس خاندان کا زوال شروع ہو گیا اور انگریزوں نے اس خاندان کو بہت نقصانات پہنچائے۔

قدیر خان کی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ بڑی لڑکی کا نام نادیہ اور اس سے چھوٹی کا نام فائزہ تھا۔ لڑکا دونوں سے چھوٹا تھا اس کا نام شبیر خان تھا۔ قدیر خان لوہار کا کام کرتے تھے، ان کے بگڑے حالات اور انگریز دشمنی نے ان کو کسی قابل نہیں چھوڑا تھا وہ گھر میں ہی بھٹی پر دن بھر آگ کے سامنے جلتے رہتے اور شام تک جو کچھ بنا پاتے دکاندار کو دے آتے، اس کے بدلے ان کو جو کچھ ملتا وہ بھی پانچ جانوں کے لئے ناکافی ہوتا تھا، مگر کرتے تو کیا کرتے، دوسرا کوئی ہنر ان کو آتا نہیں تھا۔ لڑکا چھوٹا تھا۔ لڑکیوں سے محنت مزدوری تو کروا نہیں سکتے تھے۔

دونوں لڑکیاں بارہ سال پار کر چکی تھیں اور جوانی کی سرحد میں قدم رکھ چکی تھیں۔ جوانی امیری غریبی نہیں دیکھتی جب آتی ہے تو نہ صرف جسمانی طور پر تبدیلیاں لاتی ہے بلکہ ذہنی طور پر بھی انسان میں تبدیلی آ جاتی ہے، جوان ہوتے انسان کو بڑے سہانے خواب آنے لگتے ہیں، روکھی سوکھی کھا کر بھی وہ مست ہو کر سوتا ہے اور خوابوں کی دنیا میں رہنا چاہتا ہے۔ یہ عمر کے تقاضے ہوتے ہیں۔ نوجوانی کا دور بڑا حسین دور ہوتا ہے۔ امنگوں بھرا، ہر وقت ہنسنے کا دور، اس دور میں آئندہ زندگی کی بنیاد رکھی جاتی ہے اسی بنیاد پر پوری زندگی کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

قدیر خان دن بھر سخت محنت کرتے تھے۔ بھٹی پر لوہا گرم کر کے سرخ کرنا اور پھر اس کو کسی اوزار کی شکل دینا آسان کام نہیں ہے، یہ کام وہ اکیلے تو نہیں کر سکتے تھے اگر گھن مارنے کو آدمی رکھیں تو اس کو مزدوری دینا پڑتی، لڑکا بھی گھن اٹھانے کے قابل نہیں تھا۔ لڑکیاں بھی چھوٹی تھیں تو پھر رہ گئی بیوی۔ وہی بیچاری قدیر خان کے ساتھ لگی رہتی اگر وہ قدیر خان کا ساتھ نہ دیتی تو قدیر خان ایک چھری تک نہ بنا پاتے۔ دونوں میاں بیوی کی برابر کی محنت تھی۔

نادیہ چودہ سال کی ہوئی تو وہ ماں کی مدد کرنے لگی، دونوں ماں بیٹی باری باری گھن چلاتی رہتیں اور قدیر خان اوزار بناتے رہتے۔

شام تک ان تینوں کو فرصت نہ ہوتی۔ قدیر خان شام کو کام بند کر دیتے اور اوزاروں پر جہاں جہاں پالش کی ضرورت ہوتی خود کرتے رہتے اور سب سامان ایک طرف کرتے اور بنا ہوا مال ایک بوری میں ڈال کر بنئے کی دکان پر لے جاتے اور دے کر پیسے لیتے اور کوئلے خریدتے ہوئے گھر آ جاتے۔ گھر آ کر نہاتے اور پھر جو بیوی پکاتی کھاتے اور پھر قریب کے قبرستان میں تولے شاہ کے مزار پر چلے جاتے۔ تولے شاہ کے مزار پر ہر روز قوالیاں ہوتی تھیں۔ پورے شہر کے قوال یہاں آتے تھے پورے میرٹھ والوں کو پتہ تھا مگر سوائے جمعرات کے، قوالیاں رات بارہ بجے ختم کر دی جاتی تھیں۔ تولے شاہ کون تھے کہاں کے تھے کسی کو پتہ نہیں تھا۔ ان کا مزار کچا تھا، اس مزار کے چاروں طرف دو تین فٹ کی دیوار تھی، قبر پر ہرے رنگ کی چادر پڑی رہتی تھی اور اس چادر پر پھول پڑے ہوتے تھے۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک بہت پرانا نیم کا درخت تھا اور اس درخت کا پورا سایہ مزار پر رہتا تھا۔

یہ مزار قبرستان کے ایک کنارے پر تھا رات بارہ بجے تک یہاں پر رونق رہتی تھی۔ دو چار دکانیں بھی لگ جاتی تھیں، رات میں صرف مردوں کو یہاں آنے کی اجازت تھی، کوئی عورت رات میں مزار کے پاس نہیں جا سکتی تھی۔ دن میں عورتیں آتی رہتی تھیں، مسلمان عورتوں کے علاوہ ہندو عورتیں بھی عقیدت سے آتی تھیں۔ مگر سب مزار کی چار دیواری کے باہر ہی رہتی تھیں۔ اس مزار کی دیکھ بھال گورکن کا خاندان کرتا تھا، یہ خاندان بھی بہت قدیم تھا۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

جلو بھائی بہت بوڑھے ہو گئے تھے، وہی مزار کے مجاور تھے، سارے چڑھاوے وہی وصول کرتے تھے۔ دن بھر میں ایک دو روپے کے چڑھاوے تو آ ہی جاتے تھے۔ جلو بھائی گورکن کا کام نہیں کرتے تھے ان کے لڑکے اور پوتے کرتے تھے ان کا مکان قبرستان کے کنارے پر بنا ہوا تھا۔ ان کے بچے قبروں پر کھیل کر جوان ہوئے اور پھر قبریں کھودنے لگے۔ لوگ قبرستان سے ڈرتے ہیں مگر جلو کے بچے قبرستان میں آنکھ مچولی کھیلتے تھے اور راتوں کو قبروں کے اندر چھپ جاتے تھے۔ قبرستان ان کے گھر جیسا تھا۔

جلو بھائی تولے شاہ کے بارے میں بتاتے ہیں کہ ان کے دادا کے زمانے میں تولے شاہ زندہ تھے، کہاں کے تھے کسی کو پتہ نہیں، وہ میرٹھ میں اس قبرستان میں نیم کے پیڑ کے نیچے پڑ گئے۔ لوگ ان کے پاس آتے، وہ ان کے لئے دعا کرتے، جہاں پر ان کا مزار ہے اسی جگہ سوتے تھے، وہ کسی کا دیا نہیں کھاتے تھے، کیا کھاتے تھے کسی کو پتہ نہ تھا اور رفع حاجت کب کرتے، کوئی نہیں جانتا، انہوں نے ایک لال اینٹوں کا چبوترا بنا لیا تھا اس پر وہ نماز پڑھتے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی سے کچھ نہیں لیا اور اسی قبرستان میں پردہ کر لیا اور میرے دادا کو یہ جگہ بتا دی کہ یہاں پر میری کچی قبر بنا دی جائے۔ جلو کی بات کتنی درست تھی کتنی جھوٹ کیا پتہ۔

قدیر خان اور ان جیسے بہت سوں کی تفریح یہاں ہو جایا کرتی تھی۔ دن بھر سخت محنت کرنے والے لوگ اس مزار پر آ جاتے تھے۔ عشاء کے بعد محفل شروع ہو جاتی تھی۔ قوال کے چاروں طرف دائرے کی شکل میں لوگ بیٹھ جاتے تھے ان کے بیٹھنے کا انتظام جلو اور اس کے بچے کرتے تھے، انہوں نے پانی چھڑک کر محفل سماع والے مقام کو پختہ کر دیا تھا لوگ اس پر بڑے آرام سے بیٹھ جاتے تھے اور رات بارہ بجے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تھے، جلو بھائی بھی گھر آ جاتے تھے اور قبرستان پر سناٹا چھا جاتا تھا۔ بتیاں بند کر دی جاتی تھیں اور مزار پر جلتی اگر بتیاں رات کے اندھیرے میں ضرور نظر آتی رہتی تھیں۔

❁……❁……❁

نادیہ بھرپور جوان ہو گئی تھی۔ دن بھر گھن چلا چلا کر اس کے بازو اور خدوخال بڑے نمایاں ہو گئے تھے، اس کا قد بھی ماں سے اونچا ہو گیا تھا۔ جوانی کے دلکش آثار اس کے چہرے پر نمایاں تھے۔ گھن چلاتے وقت اس کا چہرہ سرخ ہو جایا کرتا تھا۔ قدیر خان گھر کے اندر کام کرتے تھے اگر کسی دکان یا کھلی جگہ کام کرتے ہوتے تو شاید وہ کام نہ کر پاتے کیوں کہ نادیہ کو دیکھنے والوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ نادیہ کی ماں کو اندازہ تھا اس لئے وہ چھوٹی کو بھی باپ کے ساتھ گھن چلانے پر لگا دیا کرتی تھی۔ مگر فائزہ بھی بہن کے نقش قدم پر جوانی کی سڑک پر بہت تیزی سے دوڑ رہی تھی اور بہن سے صرف چند قدم ہی دور تھی۔ ان دونوں کے مقابلے میں لڑکا دن بدن سکڑتا ہی جا رہا تھا۔

گھن تو دونوں میں سے کسی کو چلانا ہی تھا۔ دونوں اس کام سے خوش نہ تھیں۔ غربت ہو تو پھر کوئی قریب نہیں آتا۔ اپنے، پرائے ہو جاتے ہیں، غربت سب عزیزوں کو دور بھگا دیتی ہے۔

قدیر خان کے عزیز تو ہوں گے مگر نہ کسی نے ان سے ملنے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی انہوں نے کسی کے پاس جانے کی کوشش کی۔ اس طرح یہ اور ان کے بچے اکیلے تھے سب کچھ خود کرنا تھا۔

قدیر خان کی زندگی بڑی کٹھن تھی۔ محنت کرنے پر بھی وہ پیٹ بھر روٹی اپنے خاندان کو نہیں کھلا سکتے تھے۔ بیوی بھی محنتی تھی ان کے ساتھ برابر محنت کرتی تھی۔ لڑکیاں بھی کرتی تھیں مگر لڑکیوں کا اس طرح کام کرنا قدیر کو ذرا اچھا نہیں لگتا تھا مگر مجبوری تھی گھن کے بغیر لوہا سیدھا نہیں ہوتا اس پر چوٹ ضروری ہے۔ نادیہ اور فائزہ کی گھن کی چوٹ سے سرخ لوہا دب جاتا تھا اس کے ساتھ ساتھ قدیر خان کے دل پر ایک نشان بھی چھوڑ جاتا تھا۔

جمعرات کو مزار پر ذرا زیادہ رش ہوا کرتا تھا۔ قوال بھی زیادہ آ جاتے تھے کیونکہ اس دن پروگرام لمبا ہوتا تھا۔ جلو بھائی کا کام بھی زیادہ ہوتا تھا اور چڑھاوے بھی زیادہ ہوتے تھے۔ محلے کے علاوہ دور دور سے بھی لوگ آ جاتے تھے۔ کچھ پیر فقیر بھی مزار کے اردگرد نظر آ جاتے تھے۔ ایک دو دکانیں بھی اور لگ جاتی تھیں۔ بیڑی سگریٹ پان کے خوانچے بتاشے ریوڑی کے ٹھیلے بھی آ جاتے تھے ہار پھول بیچنے والے بھی آوازیں لگانے لگتے تھے۔

عشاء کی اذان ہو چکی تھی۔ قدیر خان قبرستان کے ساتھ لگی مسجد کے دروازے پر کھڑے تھے۔

"کب تک جلے گا……" ان کے کانوں میں یہ آواز قریب سے آئی۔

قدیر نے آواز کی سمت نظریں اٹھا کر دیکھا تو ایک فقیر کھڑا تھا۔ قدیر نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو فقیر کی تیز آواز پھر آئی۔ "کب تک جلے گا۔"

اب قدیر خان کو جواب دینا پڑ گیا بولے۔ "جب تک میرے نصیب میں جلنا ہے میں خود سے تو نہیں جلتا میرے حالات جلا رہے ہیں۔"

"تیرے برے دن زیادہ نہیں۔ مگر تجھے عقل سے کام لینا ہے۔" فقیر بولا۔

"میری عقل بھٹی کے سامنے کام کرنے سے جل گئی ہے تم ہی کوئی راستہ بتاؤ۔" قدیر نے کہا۔

"تیرے گھر تولے شاہ آنے والے ہیں۔" فقیر نے کہا۔

"تولے شاہ اور میرے گھر کیوں آئیں گے؟" قدیر نے تعجب سے پوچھا۔

"ارے بے وقوف! ان کو تم پر رحم آ گیا ہے۔ ان کی سواری تیری بستی پر آئے گی مگر پہلے تو مجھے اپنی بیٹی سے بات کروا تاکہ میں سمجھ سکوں کیونکہ کچھ پابندیاں لڑکی پر ہوں گی۔ اگر وہ پابندی برداشت کر سکتی ہے تو تولے شاہ اس پر مہربان ہو جائیں گے اور تیری مشکلات کے دن ختم ہو جائیں گے، تیری عورت اور لڑکیاں گھن چلانے سے بچ جائیں گی۔" فقیر نے کہا۔

"آپ کو کس طرح پتہ چلا کہ میری لڑکیاں گھن چلاتی ہیں۔" قدیر نے پوچھا۔

"سب پتہ چل جاتا ہے تو مت پوچھ ہم کسی طرف قدم بڑھاتے ہیں تو کچھ ذرائع بھی رکھتے ہیں، تو آم کھا پیڑوں کی گنتی مت کر۔" فقیر بولا۔

وہ فقیر کو لے کر گھر آ گیا اور نادیہ کو فقیر کے سامنے کر دیا۔ فقیر نے سر سے پیر تک اس کو دیکھا اور بولا۔ "تولے شاہ کی سواری تجھ پر آنے والی ہے۔ تجھے جو کرنا ہے میں تجھے بتائے دیتا ہوں، تیری ماں پورے محلے میں بتائے گی اور میں پورے میرٹھ کو بتاؤں گا، تیرے پاس عورت مرد آئیں گے، تو ان کی بات سنے گی اور بھاری آواز میں بات کرے گی۔"

تین دن تک وہ فقیر قدیر خان کے ساتھ آتا رہا اور نادیہ جو بھٹی کی گرمی اور گھن چلانے کی محنت سے بیزار تھی اس آسان کام پر راضی ہو گئی۔ تولے شاہ تو پہلے ہی مشہور تھے۔ اب ان کی سواری نادیہ پر آنے لگی اور وہ لوگوں کو ان کی مشکلات کے حل بتانے لگی۔ شروع شروع میں کم لوگ آئے مگر پھر آہستہ آہستہ تعداد بڑھتی گئی اور تولے شاہ کا آستانہ آباد ہوتا گیا۔ فقیر نے پورے میرٹھ میں نادیہ کو مشہور کر دیا ہر روز تولے شاہ کے مزار پر لوگ نادیہ کا ذکر کرنے لگے اور آستانے پر آنے لگے…… جلو بھائی کی آمدنی میں بھی کچھ اضافہ ہوا۔

آستانہ کی آمدنی پوری قدیر خان کی نہیں تھی، فقیر کا حصہ الگ کیا جاتا تھا۔ قدیر خان کی جان بھٹی اور لوہے سے چھوٹ گئی۔ گھر میں پہلے روز دال چٹنی ہوتی تھی۔ اب گوشت پکنے لگا۔ قدیر خان آستانے پر لوگوں کی خاطریں کرتے نظر آتے، بیوی عورتوں کو ایک بعد ایک تولے شاہ کے روبرو پیش کرتی رہتی۔ قدیر خان کے حالات بہتر ہونے لگے۔

چہرے پر کچھ تازگی نظر آنے لگی۔ بیوی کے کپڑے بھی صاف نظر آنے لگے اور گھر میں بھی بہتری ہونے لگی۔ فائزہ بھی بہن کے ساتھ لگی رہتی اور بہن کے طور طریقے دیکھتی رہتی۔ نادیہ پہلے ذرا نروس اور گھبرائی سی لگتی تھی مگر پھر

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com

اس میں پختگی آتی گئی اور وہ مکمل تو لے شاہ بن گئی۔

جو لوگ تو لے شاہ کے مزار کو جانتے تھے وہ تو لے شاہ سے ملاقات کو، نادیہ کے پاس آنے لگے اور قدیر خان کی آمدنی میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔

آستانے کا ماحول فقیر نے ایسا بنا دیا تھا کہ ہر آنے والا متاثر ہوتا تھا۔

نادیہ کا چہرہ چھپا رہتا تھا وہ کسی مرد عورت کے سامنے نہیں آتی تھی اس کی آواز ہی ان تک آتی تھی۔ کمرے میں اتنی روشنی ہوتی تھی کہ اندھیرا نہ لگے۔ نادیہ جس جگہ ہوتی تھی اس کے پیچھے دیوار پر کالے کپڑے کا پردہ پڑا رہتا تھا اور روشنی پورے کمرے کے مقابلے میں قدرے کم تھی اس لئے کسی نے نادیہ کی شکل نہیں دیکھی تھی۔

کسی کی مراد پوری نہ ہوتی تو وہ بھی شکایت کا لفظ زبان پر نہیں لاتا تھا اور جس کی پوری ہوتی وہ لوگوں سے تو لے شاہ کی تعریف کرتا۔

جس دن سے آستانہ پر تو لے شاہ کی آمد شروع ہوئی تھی کبھی ناغہ نہیں ہوا۔ بارش ہو طوفان آئے آستانہ ہر روز وقت پر کھلتا تھا۔

فائزہ بھی پوری طرح کاروبار کو سمجھ چکی تھی۔ ڈیل ڈول میں وہ نادیہ کی طرح ہی تھی۔

کسی نے نادیہ کا چہرہ روشنی میں نہیں دیکھا تھا۔ کبھی کبھار بڑی آسانی سے وہ نادیہ کی گدی پر بیٹھ کر تو لے شاہ کا پارٹ ادا کر دیا کرتی تھی۔

گھر کے حالات اب بہت بہتر تھے۔ گھر کو مرمت بھی کرا لیا گیا تھا۔ چونا سفیدی جو ایک زمانے سے نہیں ہوا تھا وہ بھی کرا لیا گیا تھا۔ اب قدیر خان کے چہرے پر بھی رونق نظر آنے لگی تھی کچھ اور قریب کے رشتہ دار بھی پیدا ہو گئے تھے۔

قدیر خان اور بیوی دونوں خوش تھے۔ خوش حالی انسان کی شکلیں بدل دیتی ہے۔

فقیر نے اپنا چولا بدل لیا تھا۔ سارا پلان اور طریقہ کار تو دین محمد کا ہی تھا۔ فقیر کا نام دین محمد تھا۔ آدھی آمدنی قدیر خان اس کو دے رہے تھے۔

دینو بڑا ہوشیار تھا ہر چیز پر نظر رکھتا تھا اور ساتھ ساتھ اس کی نظر دونوں لڑکیوں پر بھی تھی۔ مگر قدیر خان بے خبر تھے وہ تو روز نوٹ گنتی کرتے تھے اور بیوی کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ ان کے دل میں دونوں کی شادی کا خیال بھی نہیں آ رہا تھا۔ دونوں لڑکیاں بھرپور جوان تھیں ان کی شادی ہو جانی چاہئے تھی مگر ماں باپ نوٹ گن رہے تھے۔

دینو نے ایک دن قدیر خان سے پوچھا۔

"اب بولو کیا چاہتے ہو میں نے تمہاری جان بھٹی سے چھڑا دی۔"

"ہاں تم نے میرے ساتھ نیکی ہے۔" قدیر خان بولے۔

"تو پھر تم بھی ایک نیک کام کرو کیونکہ نیکی کو آگے بڑھانا چاہئے۔" دین محمد بولا۔

"میں کیا کروں تم بتاؤ۔" قدیر نے کہا۔

"نادیہ کی شادی کر دو۔" دین محمد نے کہا۔

"شادی کر دوں تو آستانہ بند ہو جائے گا۔" قدیر نے کہا۔

"آستانہ فائزہ چلائے گی۔ بند نہیں ہوگا۔" دین محمد نے کہا۔

"ٹھیک ہے ایسا لڑکا تلاش کرنا پڑے گا۔" قدیر نے کہا۔

"تلاش کی ضرورت نہیں ہے میں حاضر ہوں۔" دین محمد بولا۔

"تم عمر میں بہت بڑے ہو۔" قدیر نے کہا۔

"مگر میں نے اب تک مجرد زندگی گزاری ہے کوچہ کوچہ پھرتا رہا ہوں اب ذرا سکون ملا ہے۔ میں اپنی گرہستی بنانا چاہتا ہوں۔" دین محمد بولا۔

"ٹھیک ہے تم اصرار کرتے ہو تو میں تم کو منع نہیں کر سکتا کیونکہ تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔"

"کہو کب نکاح کرو گے۔" قدیر نے پوچھا۔

"جمعہ کو تیاری کر لو۔ میں نکاح کر دوں گا۔" دین

محمد بولا۔

اور فقیر دین محمد کا نکاح نادیہ سے ہو گیا اور نادیہ دین محمد کے ساتھ چلی گئی۔ مگر یہ بات صرف گھر کے افراد کو ہی پتہ تھی۔ آستانہ آباد تھا فائزہ اسی طرح آستانے پر موجود تھی اور آمدنی برابر ہو رہی تھی۔

انسان اپنے ماحول کا اسیر ہوتا ہے۔ وہ جس ماحول میں رہتا ہے وہی اس کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ قدیر نے جو ماحول دیکھا تھا وہی اس کی پسند بن گیا تھا۔ غلط صحیح کے چکر میں وہ نہیں تھا۔ بہت سے پیشوں کی طرح پیسہ کمانے کا یہ بھی ایک پیشہ تھا۔

❁.....❁.....❁

دین محمد میرٹھ سے چل کر علی گڑھ آ گیا۔ اور ایک مکان کرائے پر لے کر رہنے لگا۔ نادیہ نے ایک دن دینو سے کہا۔

"گھر میں دن بھر کیا کرتے رہتے ہو، کچھ کام دھندہ کرو، آخر ہماری پونجی کتنے دن اور چلے گی۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" دینو نے جواب دیا۔

"ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا اب اور کتنا سوچ بچار کرو گے۔" نادیہ نے پوچھا۔

"سوچ رہا ہوں تم نے بھٹی کے سامنے گھن چلایا مگر دو وقت کی روٹی نصیب نہ ہو سکی۔ میں نے کسی اور کی زمین پر تیز دھوپ میں ہل چلایا مگر پیٹ نہ بھر سکا ہر طریقہ اختیار کیا مگر کچھ نہ ہوا میرے حالات نہ بدلے، یہی حال تمہارے باپ کا ہوا، پھر میں گوالیار سے نکل گیا اور شہروں شہروں پھرنے لگا اور میرا روپ خود بخود ایک فقیر کا ہو گیا۔ وقت کے تیز دھکوں نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا۔ دنیا میں زندہ رہنے کو جو دوسرے کر رہے ہیں وہی کرنا ضروری ہے۔ جو نہیں کرتا وہ میری طرح رہتا ہے، محنت کرتا مگر اس کی محنت اس کا پیٹ نہیں بھرتی، اس کا فائدہ کوئی اور اٹھاتا ہے۔ میں کسی کی زمین پر محنت کرتا تھا مگر اس کا پھل اس کو ملتا تھا مجھے تو میرے اگائے پھل بھی نہیں ملتے تھے۔

تو اور تیرا باپ آگ کی بھٹی کے سامنے دن بھر جلتے تھے تو لڑکی ہو کر گھن چلاتی تھی۔ اگر دو چار سال اور گھن چلا لیتی تو کوئلہ ہو جاتی اور کوئلہ ایک نہ ایک دن راکھ ہو جاتا ہے اور راکھ زمین کی مٹی میں مل جاتی ہے۔ میرٹھ میں، میں نے تجھے دیکھا تیرے باپ کو دیکھا اور میں تیرے باپ کا پیچھا کرتے کرتے تو لے شاہ کے مزار تک چلا گیا اور پھر میں نے اپنے بہروپ سے فائدہ اٹھایا۔ میرے استاد نے یہی سبق پڑھایا تھا کہ جو حالات ہوں اس کے مطابق کام کرو، یہ دنیا مکر و فریب کی دنیا ہے۔ جو جتنا بڑا بے ایمان ہے اتنا ہی بڑا آدمی ہے۔ جھوٹ اتنی شدت سے بولو کہ وہ سچ بن جائے یہ دنیا جھوٹ اور فریب کی دنیا ہے کون ہے جو سچائی سے کام کر رہا ہے۔ ڈاکٹر، حکیم، وکیل سب نے جھوٹ کا سہارا لیا ہوا ہے، سرکاری ادارے رشوت کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔ غریب انصاف حاصل نہیں کر سکتا۔ میں نے اس دنیا کے اسکول میں جو پڑھا ہے وہی کروں گا تو میں نے درویشی بھی کی اور عیاری بھی کی۔ دوستی بھی کی اور دغابازی سے بھی باز نہیں آیا اور میرے ذہن میں ایک طریقہ آیا اور میں نے تیرے باپ کی مدد سے اس پر عمل کر ڈالا اور کامیاب ہو گیا قدیر خان کے حالات میں بھی سدھار آ گیا اور میری جیب میں بھی کچھ آیا اور اس کے ساتھ ساتھ تو میرے حصے میں آ گئی۔"

"میں تیرا مطلب سمجھ رہی ہوں دینو مگر ایک شے ہوتی ہے ایمان، انسان کتنا ہی گیا گزرا ہو مگر اس کو چاہئے کہ اپنے ایمان کو داغ دار نہ کرے، کسی مجبور کی آہ نہ لے، کسی مجبور کی مجبوری کا فائدہ نہ اٹھائے، دینو میں نے گھن چلایا، محنت کی مگر میرے دل میں کبھی کسی اور طرح پیسہ کمانے کا دھیان نہیں آیا، مجھے پتہ نہیں تھا کہ میں آستانے پر بیٹھ کر مکر و فریب کی دکان کھول رہی ہوں۔ اگر مجھے پتہ ہو بھی جاتا تو بھی میں شاید انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی میں تم کو مورد الزام نہیں ٹھہراتی میرے حالات ہی ایسے تھے میرے خاندان پر انگریزوں نے بڑے ظلم کئے تھے ان کو اقتصادی طور پر اس قدر مار دیا

READING CORNER http://readingcornerpk.blogspot.com/

تھا کہ وہ بھیک تک کو آ پہنچے تھے۔ میرے باپ نے تیرا کہا مان لیا، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ مگر وہ تنکا کشتی بن گیا، تیرا بھی فائدہ ہوا اور میرے باپ کے بھی حالات بدلے۔ مگر میرا ضمیر مجھے روکتا ہے اب تم مجھے اس طرف مت لے جاؤ۔" نادیہ نے کہا۔

"تو نے اب تک اس ضمیر کو پالا ہوا ہے۔ یہی ہے ساری خرابیوں کی جڑ۔ کچھ نہیں کرنے دیتا یہ، اس کی طرف دھیان مت دے بھوکا مار دے گا۔ بھیک منگوا دے گا یہ۔ اس دنیا میں اگر زندہ رہنا ہے تو اس کے کسی مشورے پر عمل مت کرنا۔ میں نے بہت پرکھا ہے اس کو کچھ نہیں ملا۔ میں گرتا ہی گیا اور اگر کچھ روز اور اس کی بات سنتا تو مر گیا ہوتا۔"

"تم اتنی آسانی سے نہیں مرو گے دینو، ہماری دو جان ہیں گزارہ کرلیں گے۔" نادیہ نے کہا۔

"میری نظریں کل پر ہیں تم آج کی بات کرتی ہو۔ کیا ہم دو ہی رہیں گے۔ ہماری اولاد نہیں ہوگی۔ آج کسی طرح گزارہ کرلوگی کل کیا ہوگا اس سے بہتر یہ نہیں کہ آج کل کے لئے انتظام کرلیا جائے۔ میں نے دنیا کے بازار میں جو سیکھا ہے اس کا فائدہ میری آنے والی نسل کو ہو۔" دینو نے کہا۔

"تم کیا چاہتے ہو بتاؤ۔" نادیہ نے کہا۔

"وہ تو میں بتادوں گا، تم یہ بتاؤ تمہارے پاس کتنا سرمایہ ہے۔" دینو نے پوچھا۔

"اتنا ہے کہ تم کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرسکتے ہو۔" نادیہ بولی۔

"ٹھیک ہے پہلے ایک مکان خریدتے ہیں پھر کاروبار کریں گے۔" دینو نے کہا۔

"مکان خریدنے کے بعد کیا بچے گا کہ کاروبار کرسکو گے۔" نادیہ بولی۔

"تم دیکھتی جاؤ میں کیا کرتا ہوں۔"

اور دینو نے خواجہ روڈ پر ایک بڑا سا مکان خرید لیا۔ مکان ادھورا بنا ہوا تھا۔ اس لئے کم دام میں مل گیا۔ دینو نے اس کو اپنے قابل بنالیا اور عین روڈ کے کنارے ایک بڑا سا کمرہ بنالیا اور اس کو اپنے مطلب کا سجادیا اور اس پر ایک بورڈ لگوادیا۔ "آستانہ تولے شاہ میرٹھ والے" اور ایک بار پھر نادیہ پر تولے شاہ کی سواری آنے لگی۔ دینو تو ان کاموں کا ماہر تھا۔ اس نے کچھ عورتیں رکھ لیں اور وہ گھر گھر تولے شاہ کی تعریفیں کرنے لگیں اور عورتیں آستانے پر آنے لگیں۔ مگر یہاں پر دینو نے ایک وقت مقرر کردیا تھا دن دس بجے سے ایک بجے تک اس کے بعد تولے شاہ نہیں ملتے تھے۔ آہستہ آہستہ آنے والوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ دینو نے ایک پیٹی کمرے میں رکھ دی تھی، کسی سے کچھ مانگا نہیں جاتا تھا اپنی مرضی سے نذر نیاز کو اس پیٹی میں عورتیں مرد ڈال دیا کرتے تھے۔ آنے والوں کی شربت، چائے سے مہمان نوازی کی جاتی تھی ایک دو ملازم عورتیں بھی تھیں۔

میرٹھ کے آستانے پر جو نہ تھا وہ دینو نے یہاں پر کیا تھا۔ آستانے کی شہرت بڑھ رہی تھی۔ تولے شاہ مشہور ہورہے تھے۔ نادیہ کا انداز وہی میرٹھ والا تھا۔ اس کو کسی نے نہیں دیکھا۔ اس کے انداز میں بھی مہارت آگئی تھی۔ آمدنی خوب ہورہی تھی، اس کے ساتھ ساتھ اس کے ہاں نئے مہمان کی آمد بھی تھی۔ دینو بہت خوش تھا۔ اس نے اعلان کردیا تھا کہ آستانہ ولادت کے بعد چالیس دن بند رہے گا۔

آستانہ تولے شاہ پورے علی گڑھ میں مشہور ہوگیا تھا۔ عورتوں کے علاوہ مرد بھی آنے لگے تھے۔ خواجہ اور بلند شہر سے بھی عورتیں آرہی تھیں۔ نادیہ کے دن قریب آگئے اور پھر آستانہ بند ہوگیا۔ نادیہ کے ہاں ایک لڑکے کی ولادت ہوگئی۔ دین محمد کو مبارک بادیں آنے لگیں۔

چالیس دن کے بعد دوبارہ آستانہ کھل گیا اور کھلتے ہی ضرورت مندوں کی بھیڑ لگ گئی اور صندوق میں نوٹ بھرنے لگے۔

اس طرح تین دفعہ آستانہ بند ہوا اور نادیہ دو لڑکوں اور ایک لڑکی کی ماں بن گئی۔ اور وقت کا پہیہ سات سال آگے بڑھ گیا۔ دینو میں یہ تبدیلی آئی کہ وہ نماز روزے کا پابند ہوگیا۔ مگر اس کا کاروبار وہی رہا۔ اس نے لوگوں کو

متاثر کرنے کو اپنا بہروپ بدل لیا وہ بڑا ہوشیار تھا اس کا دماغ مکر و فریب کے کاموں میں خوب چلتا تھا۔ اس نے آستانے پر عرس کروانے کا سلسلہ شروع کردیا اور بڑے دھوم دھام سے تولے شاہ میرٹھ والے کا عرس وہ کرتا اور سارے دن راہ گیروں کو لنگر کھلاتا تولے شاہ میرٹھ سے زیادہ یہاں پر مشہور ہوگئے۔

دینو کا مکان بن گیا۔ ایک بہت بڑی بیٹھک بنا کر یہاں پر آستانہ بنادیا گیا۔ آنے والوں کے لئے آرام کا کمرہ الگ بنادیا گیا۔ دوسرے شہروں سے آنے والوں کا بھی الگ کمرہ بنادیا۔ دینو نے ایک ماہر کی طرح ہر کام کیا۔

نادیہ نے کئی دفعہ کوشش کی کہ وہ اب یہ کام نہ کرے مگر دین محمد نہ مانا۔ ایک دن نادیہ نے کہا۔ "اب تمہارے پاس اتنی دولت ہے کہ تم کوئی بھی کاروبار کرسکتے ہو۔"

"کاروبار ہی تو کررہا ہوں۔" دینو نے جواب دیا۔

"دینو! یہ کاروبار نہیں ہے ریاکاری ہے فریب کاری ہے۔" نادیہ بولی۔

"دنیا میں اور کیا ہے تم یہ بتاؤ۔ سب یہی کررہے ہیں۔ کون سچائی سے اپنا پیشہ کررہا ہے۔ آدمی وہی کام تو کرے گا جس کا وہ ماہر ہوگا۔ میں بھی وہی کررہا ہوں۔" دینو نے کہا۔ ہر بار دینو نے نادیہ کو قائل کرلیا اور وہ آستانہ آباد کرنے پر مجبور ہوگئی۔

❁......❁......❁

پنڈت کیدارناتھ علی گڑھ کے پرانے رہائشی تھے اور چونا منڈی میں ان کے بزرگوں کا بنایا ہوا بھوانی دیوی کا بہت بڑا مندر تھا۔ پیڑی در پیڑی ان کے خاندان میں سے اس مندر کے پجاری ہوتے آئے تھے۔ اس مندر کی آمدنی اتنی تھی کہ ان کے پورے خاندان کا گزارہ بڑی آسانی سے ہوجایا کرتا تھا۔ ہندو عورتیں دیوی کے درشن کے علاوہ اپنے مسائل پجاری کے روبرو بھی بیان کرتی تھیں پجاری ان کی مشکلات سن کر جھاڑ پھونک کردیا کرتا تھا اس کے بدلے اس کو دان دکھشنا مل جاتی تھی۔

کیدارناتھ جی بھوانی کے بھگت تھے اس کے نام پر ہی ان کا کاروبار چلتا تھا۔ ان کے پاس کوئی بڑی ودیا نہیں تھی۔ اس کی ضرورت ان کو اس لئے نہیں پڑی تھی کہ مندر ان کے پرکھوں نے بنایا تھا ذات کے برہمن تھے اور اپنے اصولوں پر سختی سے کاربند تھے۔ کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتے تھے اور نہ کسی کی دخل اندازی ان کو پسند تھی۔

ان کا کنبہ بڑا تھا۔ لڑکے نئی روشنی کی پیداوار تھے۔ مندر کی طرف آتے بھی نہیں تھے۔ مگر اخراجات ان کے بہت تھے اور وہ اخراجات ماں سے وصول کرتے تھے۔ مندر کی آمدنی اور پنڈت کی جھاڑ پھونک کی کل آمدنی بھی اب کم ہورہی تھی۔ بیوی سے روز روز نوک جھونک ہوتی تھی۔ بیوی کہتی۔

"میں کہوں تم کچھ اور کرو اب مندر میں کیا رکھا ہے۔"

"اری بھاگوان کیسی بات کرے ہے کیا ناستک ہوگئی ہے۔" پنڈت کہتا۔

"ارے تو اور کیا کہوں...... اب تو خرچ تک پورا نہیں ہورہا۔" بیوی کہتی۔

"اب اتنی بھی کم آمدنی نہیں کہ گھر نہ چلے۔ مگر تیری اولاد کے خرچ بڑھ گئے ہیں۔ پرکھوں کے کام بھول رہے ہیں کم ذاتوں کے ساتھ پھرت ہیں۔ ارے میری گدی کیا خاک سنبھالیں گے میرے بعد مندر بند ہوجاوے گا۔ پرکھوں کی آتما اور میری آتما دکھی ہوگی کہ نہیں۔" پنڈت جل کر کہتا۔

"میری سمجھ میں تو ایک بات آئی ہے۔" بیوی بولی۔

"جو سمجھ میں آئے کہتی رہ......" پنڈت کیدارناتھ نے جواب دیا۔

"مندر میں تو صرف ہندو عورتیں مرد تمہارے پاس پرارتھنا کرانے آتے ہوں گے۔" بیوی بولی۔

"اری عقل مند اور کون آوے گا مسلمان تو آنے سے رہا۔" پنڈت بولا۔

"تو پھر یہ بتاؤ ہندو کیوں مسلمان کے پاس جاوے ہے پرارتھنا کو۔" بیوی بولی۔

پنڈت یہ سن کر دھک سے رہ گیا۔ یہ صدمہ اس کے

READING CORNER
http://readingscornerpk.blogspot.com

لئے بڑا تھا کہ اس کے گاہک مسلمان کے پاس جا رہے تھے اور وہ بھی اس مکار اور فریبی کے پاس۔ بیوی کے ذرا سے اشارے نے اس کی آنکھیں کھول دیں، پنڈت کی ودیا کم تھی وہ صرف خاندانی پنڈت تھا۔ مگر جتنی بھی ودیا اس کے پاس تھی اس سے اس کو پوری طرح اندازہ تھا کہ تولے شاہ ایک فرضی کردار ہے اور دینو کے پاس کچھ نہیں ہے مگر آدمی شاطر ہے اپنی چالاکی سے کما رہا ہے۔

پیشہ ورانہ رقابت پنڈت کے دل میں پیدا ہو گئی کیونکہ دونوں ایک ہی سطح کے تھے۔ دونوں کے کمانے کے انداز ایک تھے دونوں لوگوں کی کمزوریوں سے مالی فائدہ حاصل کرتے تھے۔ مگر اس کے لئے یہ بڑی دکھ کی بات تھی کہ ہندو عورتیں بھی اس کے آستانے پر جا رہی تھیں۔

ان کو روکنا ہو گا پنڈت نے فیصلہ کیا۔ مگر کس طرح ان کو روکا جائے کہ وہ آستانے پر جانے کے بجائے مندر میں آ جائیں۔ بہت غور کیا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو وہ اپنے ایک پرانے دوست کے پاس بلند شہر چلا گیا۔

"کیسے آ گیا رے اپنی دکان بند کر کے۔" پنڈت کاشی ناتھ نے سوال کیا۔

"تو بڑا بدھی مان ہے اس لئے آیا ہوں۔" کیدار ناتھ نے جواب دیا۔

"کم تو تو بھی نہیں پر بول کیا بات ہے۔" کاشی ناتھ نے پوچھا۔

"مندر کی آمدنی کم ہو رہی ہے، گزارہ کرنا بھاری پڑ رہا ہے، اوپر سے اولاد نکمی ہے، مندر سے دور دور رہے ہیں اور خرچ ان کے پورے ہیں۔" کیدار ناتھ بولا۔

"کا علی گڑھ کے لوگ کہیں اور کسی مندر میں جانے لگے ہیں۔" کاشی ناتھ نے پوچھا۔

"پوجا پاٹ کو جو آدمی ہیں وہ تو پورے ہیں پر اصل آمدنی تو جھاڑ پھونک کی ہے۔ وہ کم ہو رہی ہے۔" کیدار ناتھ نے جواب دیا۔

"تو کارن کیا ہے۔" کاشی ناتھ نے پوچھا۔

"کارن ہے ایک آستانہ ارے ہندو عورت بھی وہاں جا رہی ہے۔" کیدار ناتھ بولا۔

"ضرور کوئی چمتکار ہو گا۔" کاشی ناتھ کے لب ہلے۔

"ارے پورا ڈھونگی ہے۔ تولے شاہ کوئی نہیں ہے۔ مگر آدمی بڑا ہوشیار ہے۔ اس نے ایسا ڈرامہ کیا ہے کہ پورے علی گڑھ میں گھر گھر مشہور ہو گیا ہے۔ مسلمان تو مسلمان ہندو عورتیں بھی اپنے کاموں کو آستانے پر جا رہی ہیں۔ تولے شاہ کی سواری اس کی جورو پر آتی ہے اور وہ ہی عورتوں سے بات کرتی ہے۔" کیدار ناتھ بولا۔

"اور اس کا مرد کیا کرتا ہے۔" کاشی نے پوچھا۔

"وہ دیکھ بھال کرتا ہے آستانے کی، وہ تو سامنے آتا ہی نہیں، سامنے اس کی عورت بھی نہیں آتی۔ سنا ہے جہاں وہ بیٹھتی ہے وہاں اندھیرا ہوتا ہے کسی کو وہ نظر نہیں آتی۔ کسی کے آنے پر پابندی نہیں ہے کوئی ذات ہو سب آ دے ہیں اور کسی سے کچھ نہیں لیا جاتا ہے۔ اپنی خوشی سے صندوق میں ڈال دو چاہے نہ ڈالو۔" کیدار ناتھ نے بتایا۔

"آدمی ایک نمبر کا چنٹ لگتا ہے۔" کاشی نے کہا۔

"تو ذرا اس کے اندر باہر تو دیکھ کچھ شکتی ہے کہ نہیں۔" کیدار ناتھ نے کہا۔

"جیسا تو ہے خاندانی پنڈت ایسا ہی میں ہوں بھجن کیرتن کر کے دان دکھشنا کمانے والا میں کیسے پتہ کروں گا۔" کاشی نے جواب دیا۔

"ارے یار کسی کو پکڑ جو خرچ ہو گا اس کا جو سمھم میں اٹھا لوں گا۔" کیدار ناتھ نے کہا۔

"پتہ تو کرنا ہی ہو گا کیوں کہ ہم سمجھ رہے ہیں کہ تولے شاہ صرف نام ہے اور اگر صرف نام نہ ہوا واقعی ہوا تو پھر ہمارا کیا ہو گا مارے نہیں جائیں گے۔ باندی کوئی جانا ہو گا۔ وہاں پر ایک آدمی ہے۔ مگر سنا ہے بڑا لالچی آدمی ہے پہلے لینے دینے کی بات کرتا ہے۔" کاشی نے جواب دیا۔

"میں نے کہا نا کہ میں خرچ کروں گا پہلے کاروبار میں لگانا پڑتا ہے۔" کیدار ناتھ نے کہا۔

"ابے تو پنڈت سے بنیا بن گیا۔ کاروبار کرے گا۔" کاشی ناتھ ہنس کر بولا۔

"اب اور کیا کریں گے ہمارے کام کوئی اور کرے گا ہم بھی تو کچھ کریں گے۔" کیدار ناتھ نے جواب دیا۔

"تو پھر نکال سو روپے کل ہی باندی کوٹی جاتا ہوں۔" کاشی ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔

"سو روپے کچھ زیادہ نہیں ہیں۔"

"زیادہ ہیں تو نہ دے میرا دھندہ تو تجھ سے بھی گیا گزرا ہے میں تو خرچ کر نہیں سکتا۔" کاشی ناتھ نے کہا۔

"ارے یار تو ناراض نہ ہو۔" اور دھوتی کے بل میں سے سو روپے دے دیئے اور بولا۔

"ذرا دھیان سے خرچ کرنا..... پتی سے بچ بچا کر جوڑے ہیں۔"

"اور بھی جوڑنا تیرے کام آئیں گے۔" کاشی نے ہنس کر جواب دیا۔

"اچھا تو تم خود علی گڑھ آ کر خوش خبری دو گے۔" کیدار ناتھ نے پوچھا۔

"ہاں میں آؤں گا۔ ضرورت پڑی تو دونوں آ دیں گے۔" کاشی ناتھ بولا۔

اور کیدار ناتھ علی گڑھ واپس آ گیا۔

پندرہ دن کے بعد کاشی ناتھ علی گڑھ آ گیا اور بولا۔

"ارے بڑا اڑیل آدمی ہے بھئی۔"

"کیا منع کر دیا؟" کیدار ناتھ نے ڈر کر پوچھا۔

"منع تو نہیں کیا، پر وہ کم ذات آدمی ہے۔ نخرے تو کرے گا۔" کاشی نے جواب دیا۔

"کہتا کیا ہے کچھ بتاؤ تو؟" کیدار ناتھ نے بے تابی سے پوچھا۔

"کہے گا کیا، میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا لالچی ہے۔ کہتا ہے علی گڑھ آؤں گا تو پورا خرچ تمہارا ہو گا، میری محنت کے پیسے الگ ہوں گے، سوچ لو خرچ زیادہ ہو جائے گا۔" کاشی نے جواب دیا۔

"ارے تو آخر کتنا مانگتا ہے۔ پتہ تو چلے۔"

"سب ملا کے پانچ سو کے لگ بھگ خرچ ہو جائے گا۔" کاشی ناتھ نے کہا۔

"ارے باپ رے، یہ تو بہت بڑی رقم ہے اور سو روپے جو دیئے تھے کیا سب خرچ ہو گئے۔" کیدار نے پوچھا۔

"ارے وہ تو چورن بن گئے ایک خرچ ہو تو بتاؤں اب تم بتاؤ کیا کروں منع کر دوں سوچ لو آستانے کا معاملہ ہے بہت خاموشی سے کام کرنا ہے، علی گڑھ میں مسلمان زور پر ہیں۔ ذرا بھنک لگ گئی کہ تم آستانے کے خلاف کچھ کر رہے ہو تو یاد رکھو تمہاری دیوی بھی تم کو نہیں بچائے گی معاملہ بڑا خراب ہو جائے گا۔" کاشی رازداری سے بولا۔

"ان باتوں کا تو مجھے اندازہ ہے، پتی سے کچھ پکڑ لوں گا کچھ ادھار کر لوں گا اور پورا کر دوں گا۔ وہ کب آئے گا۔" کیدار نے جواب دیا۔

"وہ تو کل ہی آ جاوے گا اور ہاں ذرا عزت سے بات کرنا، کم ذات تو ہے مگر شکتی تو ہے اس کے پاس کچھ دیر کو مطلب نکالنے کو مونچھ نیچے کر لیں گے تو ہمارا کیا جائے گا۔" کاشی ناتھ بولا۔

"نام کیا ہے اس کا؟" کیدار ناتھ نے پوچھا۔

"اس کا نام جانکی داس ہے بڑا ماہر ہے کالے کا، بہت بیر ہیں قابو میں۔" کاشی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے بات پکی، میں پورے پانچ سو دوں گا، وہ تولے شاہ کا آستانہ بند کروا دے بس۔" کیدار ناتھ نے دونوں ہتھیلیاں مل کر کہا۔

"تو فکر ہی نہ کر بس سمجھ لے کہ تولے شاہ واپس میرٹھ بھاگے۔" کاشی ناتھ نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا یہ جانکی داس کہاں رہے گا۔ علی گڑھ میں۔"

"ارے تیرے مندر میں تو رہنے سے رہا کرلے گا بندوبست اپنی ذات برادری میں تو اس کی فکر نہ کر، میں نے بات کر لی ہے، تیرا اور مندر کا نام تک نہیں آئے گا۔ دھرم کی عزت کا ہم سب کو خیال رکھنا ہو گا۔ دوسرے یہ کام مسلمانوں کے خلاف ہے ذرا بھنک ان کو مل گئی تو تیرا علی گڑھ میں رہنا مشکل ہو جاوے گا مجھے ان سب باتوں کا احساس ہے، اس لئے میں پہلے ہی جانکی داس سے بات

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

کر چکا ہوں کہ کام اس طرح کرے کہ کوئی سمجھ نہ سکے، کیا ہو رہا ہے، دینو کچھ سمجھ نہ سکے اور اس کا آستانہ اجڑ جائے۔" کاشی ناتھ نے کہا۔

"ارے بس اس سے آگے کچھ نہ کرے، دینو رہے اس کی گھر والی رہے بچے رہیں مگر تو لے شاہ نہ آئیں۔ بس اتنا کام کرو۔" کیدار ناتھ بولا۔

"تو پکی بات کل شام جانکی داس آ جائیں گے اور آتے ہی ان کو لکشمی کے درشن کرانا ہوں گے۔ اگر درشن نہ ہوئے تو آدمی الٹی کھوپڑی کا ہے۔ ارے سسرے کی کھوپڑی کیا الٹی ہے۔ کم ذات ہے تم جانو کم ذات تو اپنا رنگ دکھلاوے ہے اوپر سے اس کے پاس کچھ شکتی بھی ہے، وہ نہیں اکڑے گا تو کون اکڑے گا، اس لیے اس کے کہنے سے پہلے ہی اس کا کہا پورا کر دیں گے تم پورے پانچ سو کا بندوبست رکھنا۔" کاشی ناتھ بولا۔

"ارے وہ تو کر لوں گا مگر اس کو مندر میں نہ لے آنا۔"

"ایسا پاگل نہیں ہوں میں تیرے پاس اکیلا آؤں گا۔ پیسے لینے، ایک دو دن جتنے دن اس کو رکھنا ہوگا وہ انتظام خود کرے گا اور میں تیرے پاس رہوں گا۔" کاشی بولا۔

دوسرے دن جانکی داس آ گیا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا وہ اور اس کے خاندان والے جوتے بنانے کا کام کرتے تھے۔ مگر چار چھ سال سے اس نے یہ کام چھوڑ دیا تھا اور وہ ویرانوں میں در بدر پھرتا رہتا تھا سفلی اور کالے جادو گروں سے اس کے رابطے تھے۔ وہ پیسے کی خاطر کچھ بھی کام کرنے پر راضی ہو جایا کرتا تھا۔

آستانہ تو لے شاہ کے گرداس نے ایک چکر لگایا اور بولا۔ "بول کاشی ناتھ اس کا کیا کرنا ہے، اندر تو کچھ نہیں، خالی ڈبے ہیں۔"

"مہاراج کسی کو مارنا نہیں ہے بس اتنا کرنا ہے کہ یہ اجڑ جائے کوئی عورت مرد اس طرف نہ آئے۔"

"ٹھیک ہے کل سے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔" جانکی داس نے کہا۔

دوسرے دن دینو نے حسب دستور آستانہ کھول دیا۔ عورت مرد آنے لگے۔ دس بجے تک چار چھ مرد عورت آ جاتے تھے آج بھی آ گئے۔ مگر وقت مقررہ پر نادیہ اپنی جگہ نہ آ سکی۔

عین وقت پر اس کے پیٹ میں سخت تکلیف ہو گئی اور وہ درد سے بے کل ہو گئی اور سب سائلوں کو نامراد واپس جانا پڑا، شام کو اچانک نادیہ ٹھیک ہو گئی۔

"یہ کیسی تکلیف تھی کہ اچانک شروع ہوئی اور اچانک ختم ہو گئی۔" نادیہ نے کہا۔

"ہاں میں خود حیران ہوں بچے بھی پریشان ہو گئے تھے۔" دینو نے کہا۔

دوسرے روز پھر ایسا ہوا اور پھر روز ایسا ہوتا رہا۔

"میرا خیال ہے یہ کوئی اور چکر ہے۔ تم ہر وقت ٹھیک رہتی ہو آستانے میں جاتے ہی تمہاری حالت بگڑ جاتی ہے۔" دینو نے کہا۔

"میرا تو خیال ہے اب آستانہ بند ہی کر دیں تو اچھا ہے۔" نادیہ نے کہا۔

"مگر اس طرح تو ڈر کر بند کرنا ہوگا۔" دینو بولا۔

"تم میں کچھ ہے تو کرو کچھ۔" نادیہ نے کہا۔

"مجھے لگتا ہے کسی نے تم پر کچھ کر دیا ہے۔ ہمارے سب تو دوست نہیں ہیں۔" دینو نے کہا۔

"ہم نے کسی کے خلاف کچھ کیا بھی نہیں ہے آس امید ہی دلاتے ہیں اس کے بدلے کچھ مانگا بھی نہیں ہے۔ اگر کسی نے اپنی مرضی سے دیا تو لیا ہے۔" نادیہ نے کہا۔

"تیری بات درست ہے مگر حاسد بھی ہیں۔ کیا پتہ کون ہے۔" دینو نے کہا۔

"کوئی بھی ہو، میں تو کہتی ہوں آستانہ بند ہی کر دو، یہ کام تھا تو مکر و فریب کا۔ دھوکا تو ہم دے رہے تھے اس دھوکے کی روٹی کھا رہے تھے۔ مجبوری کی حد تک تو ٹھیک تھا مگر اب تو مجبوری نہیں ہے بند کر دو اور اعلان کر دو کہ تو لے شاہ نے اب آنا بند کر دیا ہے کیونکہ میری زوجہ کی صحت خراب ہے۔ بورڈ بھی اتار دو اور کوئی ڈھنگ کا کام تلاش کرو۔"

"نادیہ تم کہتی ہو تو اب میں تمہارا ہی کہنا مانوں گا وہی کروں گا جو تم نے حکم دیا ہے مگر میرا دل کرتا ہے کہ میں اپنے اس دشمن کا دیدار تو کروں جس نے بے وجہ یہ کیا ہے۔" دینو نے کہا۔

"دنیا میں دل کی ہر خواہش پوری نہیں ہوتی کچھ اندر ہی رہ جاتی ہیں۔ تم بھی سوچ لو کہ یہ ایسی ہی خواہش ہے کوئی آستانہ بند کرانا چاہتا تھا بند کر دیا بات ختم ہو گئی۔" نادیہ نے کہا۔

"میں نے تمہاری بات مان لی ہے۔" دینو نے کہا۔

"تم نے اپنے آپ میں جو تبدیلی کی ہے اس کو برقرار رکھو تم مسلمان ہو اور صاحب اولاد بھی ہو گئے ہو تم جو کرو گے اس کا اثر بچوں پر پڑے گا۔ اب تم صرف یہ کرو کہ اپنے گناہوں کی اللہ سے معافی طلب کرو اور حلال روزی پیدا کرنے کی کوشش کرو۔" نادیہ نے کہا۔

"میں نے اپنی لگام تمہارے ہاتھ میں دے دی ہے۔" دینو نے کہا۔

❄.....❄.....❄

تو لے شاہ میرٹھ والے کا آستانہ بند ہو گیا۔ جانکی داس کے مقابلے پر کوئی نہیں تھا بڑی آسانی سے کام ختم ہوا۔ جانکی داس واپس باندی کوٹی چلا گیا۔ آستانہ بند ہونے کے بعد بھی کیدار ناتھ کی آمدنی میں کوئی خاص فرق نہ پڑا سات سو روپے الگ انٹے سے نکل گئے، یہ صدمہ الگ اٹھانا پڑا۔ اب کیا کریں وہ جانتا تھا کہ کاشی ناتھ اس کا دوست ہے مگر پورے تو اس نے جانکی داس کو نہیں دیئے ہوں گے اپنا خرچ بھی نکالا ہوگا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ بیوی پر اس کو غصہ تو تھا آستانے کو بند کرنے کا مشورہ بیوی نے ہی دیا تھا۔

ایک دن سخت طیش میں بیوی سے بولا۔ "اب بول بند ہو گیا آستانہ مگر میرے پاس اس کے بند ہونے سے کچھ اثر نہیں پڑا۔"

"ارے ذرا صبر کرو پڑے گا اثر بھی۔" بیوی بولی۔

"عورت کے کہنے پر چلنے والوں کا یہی حشر ہوتا ہے جو میرا ہوا۔ بلاوجہ خطرہ مول لیا گانٹھ کا پیسہ خرچ کیا اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔" کیدار ناتھ غصے سے بولا۔

"تم لوگوں کی آنکھوں میں پسی ہوئی مرچیں ڈال دو اور لوٹ لو۔ تم سے صبر نہیں ہوتا ذرا تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو، مرے جا رہے ہو سات سو کیا گئے تم تو ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھے۔" بیوی بولی۔

"چل آخری دفعہ تیری یہ بات مانے لیتا ہوں تیل کو خوب دیکھتا ہوں اور اس کی دھار کو بھی دیکھتا ہوں۔" کیدار ناتھ جل کر بولا۔

"صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔" بیوی بولی۔

"مگر یہ تو بتا دے کہ صبر کا پھل کتنے دن کے بعد میٹھا ہوتا ہے کیدار ناتھ نے منہ بنا کر کہا۔

"اب جلے پھپھولے پھوڑ رہے ہو، ارے ہمت کرو نقصان ہوا ہے تو فائدہ بھی ہو جاوے گا۔" بیوی نے تسلی دی۔

"تیرے مشورے سے کسی فائدے کی امید ہرگز نہیں ہے مجھے۔" اور کیدار ناتھ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ اور اس کا کہنا درست ثابت ہوا۔ اس کی آمدنی نہیں بڑھی۔ اس کے اخراجات تو اس کی بیوی اور بچوں نے اس قدر بڑھائے تھے کہ اس کے سر پر قرض کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ لڑکے نئے زمانے کی باتیں کرتے تھے دان دکھشنا لینا ان کو گوارہ نہ تھا جو کماتے تھے وہ ان کی جیب خرچ پر اڑ جاتا تھا۔

گھر کا خرچ پورا پورا تھا لوگوں نے مندر میں آنا کم کر دیا تھا۔ قریب قریب کئی اور مندر کھڑے کر لئے تھے مندر بنا کر آمدنی حاصل کرنے کا کاروبار بہت سے لوگ سمجھ چکے تھے۔

جب کچھ سمجھ نہ آیا تو کیدار ناتھ باندی کوٹی جانکی داس کے پاس چلا گیا۔

بڈھا جانکی داس بھی اپنے دھندے میں بہت تیز تھا۔ فوراً سمجھ گیا کہ برہمن کی انگلی دبی ہوئی ہے۔ اسی کارن بھاگا ہوا آیا ہے۔ بولا۔ "کیا بات ہے پنڈت تیرا کام تو میں نے کر دیا تھا۔ پھر کیوں کشٹ اٹھایا۔"

READING CORNER http://readingcorner.blogspot.com/

پنڈت کو اس کا انداز گفتگو اچھا تو نہیں لگا اس کو تو اپنی بڑی ذات کا گھمنڈ تھا اگر کوئی اور وقت ہوتا تو اس چمار کے دس جوتے لگوا دیتا مگر اس وقت موقعہ محل کے اعتبار سے اس کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ آ گئی اور وہ بولا۔

"کیا بتاؤں مہاراج آپ نے تو کام چوکھا کر دیا تھا مگر آستانہ بند ہونے کے بعد بھی میرا مندر تو سونا ہی رہا، میرے دھندے میں ذرا فرق نہ پڑا، میں تو دونوں طرف سے مارا گیا، رقم بھی گئی اور کچھ نہ ہوا۔"

"تو میں کیا کروں، میں نے اپنا کام تو کر دیا تھا۔" جانکی داس بولا۔

"ارے تو میں تم کو دوش نہیں دے رہا ہوں۔" پنڈت جلدی سے بولا۔

"تو پھر اب کیوں آیا ہے۔ رقم تو تیری گئی۔" جانکی داس نے کہا۔

"رقم کا کیا ہے مہاراج آتی جاتی ہے۔ اب کے کچھ بھاری کام ہے۔ مگر ہے ذرا خفیہ۔ بس تم اور میں جانوں کیونکہ معاملہ ذرا جوکھم کا ہے۔" پنڈت آہستہ سے بولا۔

"پوری بات بتا پھر میں فیصلہ کروں گا کہ میں کروں کہ نہیں۔" جانکی داس بولا۔

"جس گھر میں آستانہ تھا وہ گھر بڑے موقعہ کا ہے اور ہے بھی بڑا بھاگوان کچھ ہی دنوں میں آستانہ چمک گیا تھا، میں چاہتا ہوں دینو اور اس کا پریوار وہ گھر چھوڑ جائے اور میں اس میں پھر سے آستانہ بنالوں۔" پنڈت نے کہا۔

جانکی داس زور سے ہنس پڑا اور بولا۔

"ارے کیا پاگل ہوا ہے پنڈت، تو مندر کا آدمی، آستانہ کیا بنائے گا۔ تجھے کیا پتہ آستانہ کیا ہوتا ہے اور پھر مسلمان تیری ٹانٹ پر اتنے جوتے لگائیں گے کہ مندر میں تیری دیوی بھی ناراض ہو جائے گی۔ تو کس ہوا میں ہے پنڈت۔ تو تو مارا ہی جائے گا۔ تیرے ساتھ میری بھی خیر نہیں ہوگی۔" جانکی داس نے کہا۔

"میں اتنا بڑا گدھا نہیں ہوں کہ کچا کام کروں۔"

پنڈت بولا۔

"تو پھر بتاؤ تم کتنے بڑے گدھے ہو۔" جانکی داس بولا۔

یہ سن کر پنڈت تلملا گیا مگر انگلی دبی ہوئی تھی پی گیا غصہ کو، ہونٹوں پر ایک لفظ نہ لایا۔ جیسے اس نے جانکی داس کی بات سنی ہی نہیں۔ مسکرا کر بولا۔

"میں اور تم دونوں کسی حالت میں سامنے نہیں ہوں گے تم بھی چھپ کر وار کرو گے اور میں تو تمہارے اور دینو کے قریب بھی نہیں آؤں گا۔ جب وہ ڈر کر بھاگ جائے گا تو پھر اس گھر کو خریدوں گا اور کسی مسلمان کو ٹھیکے پر دے دوں گا وہ آستانہ بنائے گا اور مجھے ادا کرے گا میں تو کبھی ادھر جاؤں گا بھی نہیں۔" پنڈت نے پلان بتایا۔

"دینو نے اس مکان پر بہت خرچ کیا ہے بڑے ڈھنگ کا اس نے بنایا تھا۔ مہنگا ملے گا۔ تیرے پاس اتنی رقم ہے کہ خرید لے۔" جانکی داس نے پوچھا۔

"مہاراج کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو نہیں بیٹھے رہیں گے۔" پنڈت بولا۔

"میرا کیا حصہ ہوگا۔ آمدنی میں۔" جانکی داس بولا۔

"حصہ! تم تو اپنی محنت کے پیسے لے ہی لو گے پھر حصہ کیسا۔" پنڈت بولا۔

"کانٹے میں کاٹوں اور بیر تو کھائے۔ بہت بڑھیا پنڈت۔" جانکی داس بولا۔

"تو پھر تم جو کرو گے اس کا کچھ نہیں ملے گا۔ دونی تمہارا حصہ دینے کو تیار ہوں۔" پنڈت بولا۔

"دونی دے کر بھی کیا کرو گے پورا مال ہضم کر لو۔ دونوں ہاتھ میں لڈو بڑے ہوشیار ہو پنڈت اور ہم تو ہیں پرلے درجے کے بے وقوف۔" جانکی داس بولا۔

"کم ہے تو چونی دے سکتا ہوں۔" پنڈت بولا۔

"اور اس کے ساتھ ہزار روپے الگ سے لوں گا کام کرنے کے منظور ہے بول نہیں تو جا۔" جانکی داس بولا۔

"تو کب کام شروع کرو گے۔" پنڈت نے پوچھا۔

"یہ تو تم پر ہے تم رقم ابھی ادا کر دو اور جو بات ہوئی ہے لکھ کر دے دو کل سے کام شروع کر دوں گا۔" جانکی داس بولا۔

"تم کام شروع کرو تمہاری رقم گلے گلے پانی میں بھی دوں گا اور رہی تمہاری ہماری بات تو میں نے تم پر بھروسہ کیا ہے تم مجھ پر بھروسہ کرو۔ پھروں گا نہیں۔" پنڈت بولا۔

"تم پر بھروسہ میں نہیں کرتا۔ بات صاف ہے۔ پیسہ دو کام ہوگا نہیں دو گے نہیں ہوگا۔ چونی حصہ بھی تم کو لکھ کر دینا ہوگا۔" جانکی داس بولا۔

پنڈت کی ہوشیاری دھری رہ گئی۔ ذرا ذلت کا احساس بھی ہوا۔ یہ چمار بار بار بے عزتی کر رہا تھا اور اس کو برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ مگر کیا کرتا۔

"ابھی میری انٹی میں ہزار نہیں ہیں کل دے جاؤں گا اور کاغذ بھی لکھ دوں گا پھر تو کام ہوگا۔" پنڈت کے منہ سے بڑی مشکل سے یہ نکلا۔

"جب رقم پہنچا دو تو پھر کام شروع کر دوں گا۔ پنڈت برا نہ ماننا کوئی اور ہوتا تو شاید میں رقم لئے بغیر بھی کام شروع کر دیتا مگر تم پنڈت ہو اور پجاری ہو مندر کے، تم لوگ صرف لینا جانتے ہو۔ تم کسی کو کچھ دے نہیں سکتے اس لئے پہلے لے رہا ہوں، کیا پتہ بعد میں کیا حالات ہوں۔" جانکی بولا۔

"تم جو دل کرے کہو مہاراج بلی جب بھیگ جاتی ہے تو چوہے موچھوں پر تاؤ دیتے ہیں اور اکڑتے ہیں یہ تمہاری بات نہیں پرکھوں کی کہاوت ہے۔" پنڈت نے کہا۔

دوسرے دن پنڈت نے سینے پر پتھر باندھ کر ہمت کی اور جانکی داس کو ہزار روپے دے آیا اور کاغذ بھی لکھ دیا۔

پھر جانکی داس نے مونا چماری کی ایک بیر کو دینو کے گھر پہنچا دیا۔ اس کا کام صرف یہ تھا کہ وہ اس کے گھر کو گندہ کرے اور بیماریاں پھیلائے۔

پہلے دینو کے بچے بیمار ہوئے وہ ان کے علاج میں لگا تو بیوی بیمار ہوگئی۔ دینو سب کی دیکھ بھال کرتا رہا دوا دارو کرتا رہا۔ مگر کسی دوا نے اثر نہیں کیا۔ گھر میں گندگی کے ڈھیر نظر آنے لگے۔ بدبو اس قدر ہوگئی کہ دینو پریشان ہوگیا۔ تینوں بچے بیمار بیوی بیمار، سخت الجھن اور پریشانیوں میں گھر گیا۔

گھر میں ڈراؤنی آوازیں آنے لگیں، رات ہوتے ہی عجیب عجیب قسم کے جانوروں کی آوازیں ڈر کے مارے پورے گھر کا برا حال ہوگیا۔ بیوی کی حالت گرتی ہی گئی۔ بچے بھی لب دم ہوگئے۔ پھر ایک آدمی اس کے پاس آیا اور بولا۔

"ارے کیا سب کو مار ڈالے گا۔"

دینو حیران ہو کر بولا۔ "تم کون ہو؟"

"ہم جو بھی ہیں تیرے ہمدرد ہیں، اس مکان کو چھوڑ دے نہیں تو سب مارے جاؤ گے۔" اجنبی نے کہا۔

"میں کہاں جاؤں گا پھر۔" دینو نے پوچھا۔

"دوسرا مکان کرائے پر لے لے، یہاں سے جلدی چلا جا اب تیرے پاس وقت کم ہے یاد رکھ ابھی تو بیمار ہیں مرے نہیں ہیں اگر تو نے مکان فوراً نہ چھوڑا تو مر جائیں گے، تین دن کا وقت ہے تیرے پاس ہم تیرے ہمدرد ہیں، بتا دیا ہے مان نہ مان تیری مرضی اب چلتے ہیں۔" اور اجنبی چلا گیا۔

❀.....❀.....❀

دینو نے زندگی بڑی بے قدری سے گزاری تھی۔ مگر نادیہ سے نکاح کرنے کے بعد اور پھر بچوں کی پیدائش کے بعد اس کو زندگی سے پیار ہوگیا تھا۔ وہ اپنے بچوں کی خاطر زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اس بے نکیل کے اونٹ کو نادیہ نے ایسے غیر محسوس انداز میں نکیل ڈالی تھی کہ وہ نادیہ کی نظر نہ آنے والی ڈوری سے بندھ گیا تھا۔

اس نے دوسرے ہی روز ایک مکان کرائے پر حاصل کیا اور اس میں چلا گیا۔ وہاں جاتے ہی اجنبی کا کہا پورا ہوگیا اور بیوی بچے تندرست ہوگئے۔

دو دن کے بعد اس کے پاس وہی اجنبی پھر آ گیا اور بولا۔

"اب بول اس مکان کا کیا کرے گا تیرے لئے تو وہ منحوس ہے تو اس گھر میں گیا اور آئی مصیبت تیرے لئے بہتر یہ ہے کہ اس سے اپنی جان چھڑا لے۔ بیچ دے فوراً اس کو میں تو تیرا ہمدرد ہوں اس لئے بتا رہا ہوں۔" اجنبی نے کہا۔

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

"آپ کون ہیں۔ یہ تو بتائیں۔" دینو نے کہا۔

"یہ مت پوچھ بتانے کی اجازت نہیں ہے بتائیں گے تو تیرا نقصان ہو جائے گا۔" اجنبی بولا۔

"میں اس مکان کو فروخت نہیں کر سکتا۔" دینو نے کہا۔

"فروخت نہیں کر سکتا اس کی وجہ سے کیا ہے؟" اجنبی بولا۔

"وجہ بتانے کی ضرورت نہیں میرا دل نہیں کرتا بس۔" دینو نے کہا۔

"تو اس کو آباد نہیں کر سکتا۔" اجنبی نے کہا۔

"نہ کروں مگر تم کیوں اس کی فروخت پر اصرار کرتے ہو۔" دینو نے کہا۔

"اس مکان پر بہت بڑا اثر ہے میں اس کو آباد کروں گا اور اس اثر کا مقابلہ کروں گا۔" اجنبی نے کہا۔

"میں تم کو کرائے پر دے سکتا ہوں۔" دینو نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے کرائے پر دے دو۔" اجنبی نے کہا۔

اور دینو نے مکان کرائے پر دے دیا۔

کرایہ دار نے مکان کو از سر نو سفیدی چونا کر دیا اور رہائش اختیار کر لی دو چار روز کے بعد آستانہ جہاں تھا وہیں پر ایک بورڈ لگ گیا۔ "آستانہ تو لے شاہ میر ٹھ والے۔"

دینو نے بورڈ دیکھا تو اس کی سمجھ میں پورا ڈرامہ آنے لگا۔ وہ کڑیوں سے کڑیاں ملاتا چلا گیا اور بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آ گئی۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ آستانہ تو اس کے ہاتھ سے نکل ہی چکا تھا۔ دوسرے وہ بے علم آدمی تھا اس کے سامنے علم والا تھا اس نے دینو کو ڈرا کر خوف زدہ کر کے مکان حاصل کر لیا تھا اور خود آستانہ کھول لیا تھا۔ آستانہ تو پہلے ہی مشہور تھا صرف یہ بتانا تھا کہ دوبارہ آستانہ کھل گیا ہے لوگ آنا شروع ہو گئے تھے اور آہستہ آہستہ آمدن بڑھ رہی تھی۔ لیاقت کی بیوی پر تو لے شاہ میر ٹھ والے کی سواری آتی تھی اور وہ خود لوگوں کے دکھ پریشانی بیان کر دیتی تھی۔ اس کے لئے اس نے کچھ ذرائع رکھے تھے، کچھ تو جانکی داس مدد کرتا تھا اور کچھ اس نے اس قسم کی عورتیں رکھی تھیں جو سب حالات مسائل سے پہلے ہی پتہ کر لیتی تھیں اور وہی حالات لیاقت کی بیوی بتول بیان کر دیا کرتی تھی اور سب حیران ہو جاتے تھے۔ اس نے مکر و فریب کو اور زیادہ جدید انداز میں پیش کر دیا تھا اور سائل تو لے شاہ کی کرامات کا قائل ہو جاتا تھا۔

پنڈت کیدار ناتھ نے لیاقت اور اس کی بیوی کو چونی کا حصہ دار بنایا تھا۔

اس طرح جانکی داس اور لیاقت کو دینے کے بعد بھی وہ آدھے کا مالک تھا۔ وہ خود آستانے میں نہیں آتا تھا اس کا ایک آدمی صندوق کھولتا تھا اور سب کا حصہ الگ الگ کر دیا کرتا تھا۔ جانکی داس بھی کبھی آستانے پر نہیں گیا تھا۔ آستانے کا ماحول وہی رکھا تھا جو پہلے تھا۔ کسی کو ذرا شک نہیں تھا کہ انتظامیہ بدل چکی ہے۔

آستانے پر پھر عورتوں اور مردوں کی بھیڑ ہونے لگی۔ صندوق میں کھٹا کھٹ روپے گرنے لگے اور دینو کے دل پر چوٹ پڑنے لگی۔ جس ڈرامے کا وہ رائٹر ڈائریکٹر تھا اس ڈرامے کو کوئی اور اسٹیج پر پیش کر رہا تھا اور نہایت کامیاب تھا۔

دینو نے تین مہینے بڑا صبر کیا اور پھر لیاقت کو مکان خالی کرنے کا نوٹس دے دیا۔ لیاقت تو صرف ایک چہرہ تھا دماغ تو پنڈت کیدار ناتھ اور جانکی داس کے تھے۔ دونوں سر جوڑ کر بیٹھے اور مشورہ کرنے لگے۔ پنڈت نے کہا۔

"لو پھر اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہی ہے۔"

"تو کیا ہوا۔ اب مکان ہمارا ہے اس کے اچھے بھی مکان خالی نہیں کرا سکتے۔" جانکی داس بولا۔

"مہاراج قانونی طریقہ پر تو وہی مالک ہے۔" پنڈت نے کہا۔

"ہوگا مالک مگر اس کو وہ مکان ملے گا نہیں۔" جانکی داس بولا۔

"تو پھر تم ایسا کچھ کرو کہ وہ سر ہی نہ اٹھائے۔" پنڈت نے کہا۔

"تو فکر نہ کر کر دیں گے اس کا پورا پورا بندوبست۔"

جانکی داس بولا۔

"مکان خالی نہیں ہوا تو پھر....."

دینو لیاقت کے پاس گیا اور بولا۔ "میں نے کچھ کہا تھا تم نے اپنا بندوبست کر لیا۔"

"مجھے خالی کرنا ہوتا تو بندوبست کرتا۔" لیاقت بولا۔

"مکان کی ضرورت ہے۔" دینو نے کہا۔

"تو اور خرید لو۔ میں تو اسی میں رہوں گا۔" لیاقت بولا۔

"دیکھو لیاقت تم نے مکان رہنے کو لیا تھا۔ مگر تم نے آستانہ بنا لیا اور اسی نام سے بنایا جس سے میرا آستانہ تھا یہ تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔" دینو بولا۔

"پہلی بات تو یہ کہ میں تم کو کرایہ دیتا ہوں آستانہ بناؤں یا بکریاں پالوں تم منع نہیں کر سکتے، دوسری بات یہ کہ تو لے شاہ کی سواری صرف تمہاری بیوی پر کیوں آئے کسی پر بھی آ سکتی ہے، تم نے جھوٹ اور فریب کا کھیل کھیلا تھا، خوب کما لیا اب میری باری ہے، تم نے اگر میرے کام میں کسی قسم کی رکاوٹ ڈالی تو یاد رکھو بیماریاں پھر تمہارا گھر دیکھ لیں گی۔ تم لاکھ علاج کرنا فائدہ نہیں ہوگا اور مجھے تم اکیلا نہ جاننا، میرے سر پر بڑے بڑوں کا ہاتھ ہے۔ تم پھر کوئی غلط قدم اٹھاؤ اس سے پہلے میں نے تم کو بتا دیا ہے۔" لیاقت بولا۔

"اچھا میں کچھ نہیں کرتا تم یہ تو بتا دو کہ تمہارے سر پر کس کا ہاتھ ہے۔" دینو نے کہا۔

"میں یہ نہیں بتاتا۔ صرف تم کو یہ بتا سکتا ہوں کہ تم اب کبھی اس مکان کی ملکیت کے بارے میں کچھ نہ کہنا ورنہ تو جو ملتا ہے وہ بھی بند ہو جائے گا اور تو کچھ نہیں کر سکے گا۔" لیاقت بولا۔

"یہ تو وہی بات ہوئی جبر مارے اور رونے بھی نہ دے۔" دینو بولا۔

"ہاں یہی بات ہے اب تو جا کرایہ میں پہنچا دوں گا تیرے گھر۔" لیاقت بولا۔

اور دینو ناامیدی کی کیفیت میں گھر آ گیا۔ اس کی بیوی نادیہ نے اس کا اترا چہرہ دیکھا تو بولی۔

"کیا بات ہے کچھ پریشان ہو۔"

"کچھ کیا بہت پریشان ہوں۔" دینو بولا۔

"بتاؤ تو....." نادیہ نے پوچھا۔

"زندگی میں ایک مکان بنایا تھا کہ بچوں کو کچھ تو دوں میں نے تو زندگی خانہ بدوش کی مانند گزار دی ان کو تو ایک ٹھکانہ میسر آ جائے مگر لگتا ایسا ہے کہ وہ مکان گیا ہاتھ سے تو لے شاہ کا آستانہ وہاں پر زور و شور سے چل رہا ہے اور سواری بھی آ رہی ہے۔ کسی کو پتہ نہیں کہ وہاں پر کچھ تبدیلی آئی ہے۔ مرد عورت اسی طرح آ رہے ہیں اور صندوق میں بڑی رقم آ رہی ہے۔ درخت ہم نے لگایا پھل کوئی اور کھا رہا ہے۔ میں دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر بھسم ہو رہا ہوں۔" دینو بولا۔

"بے شک تم نے درخت لگایا تھا مگر تمہارے نصیب میں پھل نہیں تھے یہ تو تقدیر کے کھیل ہیں تم صبر کرو اور بھول جاؤ آستانے کو۔" نادیہ نے کہا۔

"اس کو بھولنا بہت مشکل ہے۔" دینو بولا۔

"تو کیا ان سے لڑو گے۔ جھگڑا کرو گے۔" نادیہ نے پوچھا۔

"میں وہ بھی نہیں کر سکتا اکیلا ہوتا تو بھڑ جاتا مگر بچوں اور تمہاری وجہ سے میں کمزور ہوں میں نے ذرا بھی ان کے خلاف کچھ کرنے کی کوشش کی تو پھر بیماریاں آن دبوچیں گی میں بچوں کو تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ مگر آستانے کو ان کے حوالے کرنا بھی نہیں چاہوں گا۔" دینو نے کہا۔

"تو پھر ایسا کرو علی گڑھ سے چلو کسی اور شہر میں رہیں گے نہ تمہارے سامنے آستانہ ہوگا اور نہ تمہارا خون کھولے گا دیکھ دیکھ کر۔" نادیہ نے کہا۔

"میں اس پر غور کروں گا۔" دینو نے کہا۔

❁.....❁.....❁

دینو کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ تو وہ دلی روانہ ہو گیا۔ اور اس نے اپنی مشکل کسی کو بتائی اور وہ دلی کا باشندہ اس کو لے کر میرے مطب میں آ گیا۔ رولو کا کی موجودگی میں دین محمد عرف دینو کی ساری روداد میں نے سنی پھر میں نے کہا۔

READING CORNER http://readingcornerpk.blogspot.com/

"میاں تم نے جس بے ایمانی سے فریب کا درخت لگایا تھا اس کا پھل تم نے خوب کھایا۔ پھر تم سے بھی بڑے تمہارے جیسے نے وہ درخت تم سے حاصل کرلیا اور اب اس کے پھل کھا رہا ہے تو کھانے دو۔"

"بات آپ کی درست ہے غلط کام کی ابتدا میں نے کی مگر اب میں نہیں کروں گا میرا مکان مجھے مل جائے میں آستانہ بند کردوں گا۔" دینو نے کہا۔

"تو پھر کیا کرو گے۔" میں نے پوچھا۔

میں اسی مکان میں کوئی چھوٹا موٹا کام کرلوں گا۔ آستانہ ہرگز نہیں بناؤں گا۔" دینو بولا۔

"اچھا یہ بتاؤ تو کہ یہ تولے شاہ میرٹھ میں کوئی ہیں۔" میں نے کہا۔

"بات یہ ہے کہ میرٹھ کے قدیم قبرستان میں ایک کچا مزار تو ہے کسی نے اس کا نام تولے شاہ رکھ دیا۔ تولے شاہ کون تھے کیا کرتے تھے ان کا کیا مقام تھا کسی کو پتہ نہیں مجھے تو یہ نام ہی فرضی لگتا ہے۔ میں جب علی گڑھ آیا تو یہ نام میرے ذہن میں تھا کارنامے میرے بھی اچھے نہیں۔ میں نے آمدنی کا ایک ذریعہ بنایا اور آستانہ بنا ڈالا اور تولے شاہ کی سواری آنے لگی کسی نے مجھ سے کچھ سوال نہ کیا سب نے مان لیا اور آمدنی ہونے لگی۔" دینو بولا۔

"یہ کمزوری علم والوں کی ہے جاہل کو تو کچھ کہنا ہی بے کار ہے۔ اگر تم سے آستانہ قائم کرنے ہی میں باز پرس کرلی جاتی تو تم اس مکروفریب کے گناہ سے بچ جاتے۔" میں نے کہا۔

"غریب آدمی روزی روٹی کی تلاش میں رہتا ہے اس کو پوری طرح علم نہیں ہوتا کہ کیا غلط ہے اور کیا صحیح ہے وہ کچھ بھی کرنے لگتا ہے میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ میں غلط کر رہا ہوں۔

میری بیوی نے البتہ کبھی کبھی مجھے روکا تھا مگر میں اس کی بات نہیں سمجھ سکا یا روپے کے لالچ نے مجھے نہیں سوچنے دیا، میں تو جاہل آدمی ہوں، میری نظروں کے سامنے میرے مسائل تھے اور ضرورت تھی اور ایک آسان روپیہ کمانے کا ذریعہ تھا میں نے وہ راستہ اختیار کرلیا۔ بے شک میں نے گناہ کیا ہے میں اقرار کرتا ہوں مگر اب نہیں کروں گا۔" دینو نے کہا۔

"تم نے اقرار کرلیا اور اپنی غلطی کا احساس کرلیا ہے، یہ بہت اچھی بات ہے۔ مگر آنے والے وقت میں تم جیسے اور لوگ ہوں گے جو یہی کریں گے اور عوام ان کے آستانوں پر جائے گی۔ ان کو روکنا اور عوام کو تسلیم کرنا جن لوگوں کا کام ہے وہ کیوں خاموش ہیں۔" میں نے کہا۔

"حکیم صاحب آپ اور میں اگر یہ سوال اٹھائیں گے تو بات دور تک چلی جائے گی ہر شخص اپنی طرف دیکھ رہا ہے وہ چاہے پنڈت ہو، مولوی ہو، ڈاکٹر ہو، وکیل ہو یا حکیم ہو۔"

"یہ شخص اگر آئندہ اس قسم کی خرافات میں نہیں پڑتا تو میں اس کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔" رولوکا نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔

"میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں محنت کروں گا اور حلال روزی پیدا کروں گا میں یہ آپ کے پاس آنے سے پہلے ہی طے کرچکا تھا آپ میری مدد نہ بھی کریں تو بھی میں یہی کروں گا مکان ملے نہ ملے۔" دینو نے کہا۔

"شاباش اپنے عہد پر قائم رہنا جو لوگ نیکی کی طرف ایک قدم بڑھاتے ہیں نیکی ان کی طرف کئی قدم بڑھاتی ہے۔ انسان اگر سیدھی سادی زندگی گزارنا چاہیے تو بڑی آسانی سے کسی بھی الجھن کے بغیر گزار سکتا ہے مگر انسان لالچ اور حسد میں پھنس جاتا ہے دوسروں کو دیکھ کر خود بھی ایسا بننا چاہتا ہے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ جس کو دیکھ کر وہ اس کی برابری کرنا چاہتا ہے وہ کون ہے اس کے وسائل کتنے ہیں وہ کیا قابلیت رکھتا ہے اگر ناجائز طریقہ پر دولت کما رہا ہے تو اس سے دوری اچھی ہے اگر جائز طریقہ پر دولت کما رہا ہے تو ضرور اس میں کوئی ہنر ہوگا۔ علم و ہنر میں اس کی برابری وہ لالچی آدمی نہیں کرتا اور غلط انداز اپنا لیتا ہے تم نے بھی یہی کیا ہے مگر تم کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔" رولوکا نے کہا۔

"تو دین محمد تم اپنا پتہ دے دو۔ ہم تمہارے پاس خود آجائیں گے۔" میں نے کہا۔

اور دینو واپس علی گڑھ آ گیا۔

تین دن کے بعد رولوکا اور میں دونوں علی گڑھ روانہ ہوگئے۔ دلی سے چار پانچ گھنٹے کا سفر ہے اسٹیشن سے تانگا پکڑا اور دینو کے مکان پر پہنچے تو دینو بہت خوش ہوا۔

اس نے ہمارے قیام کے لئے پہلے ہی ایک کمرہ تیار کرلیا تھا۔ شام ہوگئی تھی اس دن تو کچھ نہیں ہوسکتا تھا مگر رولوکا وقت برباد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب ہم کمرے میں سونے آگئے تو رولوکا نے کہا۔ "حکیم صاحب آپ آرام کریں، میں ذرا علی گڑھ کی سیر کر آؤں۔"

میں سمجھ گیا رولوکا ڈیوٹی پر ہے اور رولوکا روانہ ہوگیا۔

☆......☆......☆

زیادہ رات نہیں ہوئی تھی آستانہ پر اس وقت بھی چند عورتیں اور مرد موجود اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ رولوکا روپوشی کی حالت میں نہیں بلکہ وہ ایک ضرورت مند کے بھیس میں تھا اس کا نمبر آخری تھا۔ ایک ایک کرکے مرد عورتیں اندر جاتی رہیں اور ایک گھنٹے کے بعد اس کا نمبر آ گیا۔ وہ بھی ایک اندھیرے کمرے میں داخل ہوگیا۔ کمراہ بڑا تھا مگر صرف ایک لالٹین روشن تھی اور ایک عورت تخت پر بیٹھی تھی اس کے دونوں طرف لوبان جل رہا تھا۔ عورت کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا اس کے دائیں طرف ایک مرد کھڑا مور چھل کا پنکھا کر رہا تھا۔ رولوکا نے کمرے کا جائزہ ایک منٹ میں لے لیا، کمرے میں کوئی خاص بات نہیں تھی عورت اور مرد عام سے تھے ان کے اندر اور باہر کچھ نہیں تھا۔

رولوکا عورت کے سامنے جاکر بیٹھ گیا تو عورت نے پوچھا۔ "کیا ضرورت ہے بے کیوں آیا ہے؟"

"مجھے جو ضرورت ہے تو خود پتہ کرلے مجھ سے مت پوچھ۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"کرلوں گا پتہ تو خود بتا دے تو اور اچھا ہے۔" عورت نے کہا۔

"تولے شاہ تمہارا مزار میرٹھ میں ہے اور تم روز اتنی دور آتے ہو کیا تمہارے پاس کوئی اور کام نہیں ہے کیا؟ میرٹھ کے لوگوں کے مسائل نہیں ہیں اور اگر ہیں تو پہلے ان کا حق ہے کہ آپ ان کے کام آئیں مگر آپ میرٹھ چھوڑ کر علی گڑھ دوڑے آتے ہو یہ کیا بات ہے۔"

"یہ میرا مسئلہ ہے، تجھے اس سے کیا غرض تو اپنی بات کر نہیں کرتا تو جا پھر میرے پاس نہ آنا کبھی۔" عورت نے ناراضگی سے کہا۔

"تولے شاہ میں جاؤں گا اور تم بھی جاؤ گے میرٹھ۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"تیری قسمت خراب ہوتی نظر آرہی ہے۔" عورت بولی۔

"تجھے تو میری مشکل بھی نظر نہیں آرہی تو کیا دیکھے گا۔" رولوکا نے کہا۔

"تو کیوں اپنی زندگی کا دشمن بنا ہوا ہے، تولے شاہ کو تو نہیں جانتا ہم جہاں بگڑی بناتے ہیں تو بگاڑ بھی سکتے ہیں ڈر اس وقت سے جب ہم کو جلال آجائے۔" عورت اچھی اداکاری کر رہی تھی۔

"تولے شاہ تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ جا رہا ہوں مگر پھر ضرور آؤں گا۔" اور رولوکا باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی اس نے روپوشی اختیار کرلی اور پھر اندر چلا گیا۔

"یہ کون آ گیا تھا آج میں تو گھبرا ہی گئی تھی۔" عورت نے لیاقت سے کہا۔

"مگر تو نے تو کمال کردیا میں تو حیران ہو رہا تھا۔" لیاقت بولا۔

"یہ پھر آئے اس کو روکنا ہوگا ورنہ تولے شاہ مارے جائیں گے۔" عورت نے کہا۔

"تو فکر مت کریں میں صبح ہی جانکی داس اور پنڈت کیدار ناتھ کے پاس جاؤں گا اور اس کا پورا پورا بندوبست کرادوں گا۔" لیاقت نے کہا۔

رولوکا کو اب وہاں کوئی کام نہ تھا اس ڈرامے کے اصل کرتا دھرتا کا اس کو پتہ چل گیا تھا۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد میں نے رات کی روداد

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com

رولوکا سے پوچھی تو وہ بولا۔ ”کوئی جانکی داس اور پنڈت کیدار ناتھ ہیں وہ دونوں آستانے کے سرپرست ہیں مگر پردے میں ہیں اور ان کی شہ پر ہی یہ آستانہ چل رہا ہے مجھے لگتا ہے لیاقت اور اس کی بیوی صرف چہرے ہیں جو لوگوں کے سامنے ہیں۔“ رولوکا نے کہا۔

”مجھے تمہارا اندازہ درست لگتا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”آج لیاقت، جانکی داس اور پنڈت کے پاس جائے گا۔“ رولوکا نے کہا۔

”پھر تمہارا کیا ارادہ ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”مجھے جانکی داس اور پنڈت کا پتہ چاہئے میں اپنے طریقہ پر پتہ تو چلا لوں گا مگر اس سے کچھ وقت برباد ہو جائے گا دینو کو دونوں کا پتہ ضرور ہوگا۔“ رولوکا نے کہا۔

میں نے دینو کو بلایا اور اس نے دونوں کا پتہ بتا دیا۔ رولو کا روانہ ہو گیا۔ پہلے رولو کا پنڈت کے مندر میں گیا آج وہ روپوشی میں تھا دس بجے کا وقت تھا مندر میں کوئی نہیں تھا۔ مندر کے پیچھے ہی پنڈت کی رہائش تھی۔ وہ وہاں چلا گیا۔

لیاقت اس سے پہلے ہی پہنچا ہوا تھا۔ پنڈت کہہ رہا تھا۔ ”دیکھ بھال کے آیا ہے نا، کسی نے اندر آتے دیکھا تو نہیں۔“

”پنڈت جی ایسا بے وقوف بھی نہیں ہوں آخر اتنے دنوں سے آستانہ چلا رہا ہوں بتاؤ ذرا کسی کو شک ہوا۔“ لیاقت نے کہا۔

”سوتو ہے تم آدمی سمجھ دار ہو بولو کیوں آئے ہو۔“

”کل ایک آدمی آستانے پر آیا تھا اس نے تولے شاہ کے بارے میں بڑے ٹیڑھے سوال کئے۔ نظر تو بے وقوف سا آتا تھا مگر باتیں بڑی خطرناک کر رہا تھا۔“ لیاقت بولا۔

”کیا کہتا تھا آخر.....“ پنڈت نے پوچھا۔

”کہتا تھا تولے شاہ تم کو میرٹھ جانا پڑے گا۔ تم روز کیوں آتے ہو میرٹھ کے مسائل حل کرو، علی گڑھ کیوں آتے ہو۔ بس اسی قسم کی باتیں۔“ لیاقت بولا۔

”ارے ہوگا کوئی خدائی فوجدار بننے کا شوقین تو فکر نہ کر اپنا کام کرتا رہ میں جاتا ہوں جانکی داس کے پاس تو اب جا اب نہ آنا آئے تو ذرا خیال رکھنا اور دن میں ہرگز نہ آنا۔“ پنڈت بولا۔

لیاقت چلا گیا اس کے جانے کے بعد پنڈت جانکی داس کے پاس روانہ ہوا اور رولوکا اس کے ساتھ تھا۔ جانکی داس پنڈت کو دیکھ کر بولا۔

”پتھار و پنڈت..... ضرور کوئی ضرورت میری پڑ گئی ہے۔“

”ہاں ضرورت تو ہے آخر تم بھی تو چونی کے حصہ دار ہو۔“ پنڈت نے کہا۔

”یہ بتانا ضروری تھا کیا۔“ جانکی داس بولا۔

”ذمہ داری تو برابر ہے اگر آستانہ بند ہوا تو سب کا نقصان ہوگا۔“ پنڈت نے کہا۔

”ارے کون ہے سور ما جو آستانہ بند کرائے گا۔“ جانکی داس بولا۔

”ایک سر پھرا آیا تھا وہ لیاقت کو دھمکا کر گیا ہے کہتا تھا تولے شاہ میرٹھ جاؤ وہاں کے کام کرو یہاں کیوں آتے ہو، لو بھلا آتے ہیں تو اس کو کیا کہتے ہیں، وہ کون ہے روکنے والا تولے شاہ کیوں میرٹھ چلے جائیں۔“ پنڈت نے کہا۔

”ارے ہوگا کوئی ڈھونگی، تو فکر نہ کر دو ڑا دوں گا منٹ بھر میں۔“ جانکی داس بولا۔

”وہ پھر آنے کا کہہ گیا ہے جانے کب آ جائے۔“ پنڈت بولا۔

”ارے تو کیوں مرا جا رہا ہے، لگا دیتے ہیں پہرہ، وہ آوے گا تو دبوچ لیا جائے گا۔“ جانکی داس بولا۔

اور پنڈت بے فکر ہو کر واپس چل دیا۔ مگر رولوکا جانکی داس کے قریب ہی رہا اور اس کی ناپ تول کرتا رہا۔ اچھی طرح ناپ تول کے بعد وہ واپس آ گیا۔

شام کو چار بجے سے آستانہ کھل جاتا تھا۔ رولوکا اس کے کھلنے سے بھی پہلے وہاں پر تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ ایک سفلی کا گندہ بیر دروازے پر کھڑا تھا مگر رولوکا کو وہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

رولوکا اس کے قریب گیا اور اس کے منہ پر ایک زور دار تھپڑ دے مارا اس نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا مگر کچھ نہیں دیکھ سکا۔ رولوکا نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ زور کرنے لگا اور چھوٹا ہونے لگا۔

اور پھر وہ اتنا رہ گیا کہ اس کو جیب میں رکھا جا سکے۔ رولوکا نے اس کو جیب میں ڈال لیا اور آستانے کے کمرے میں چلا گیا۔ لیاقت کی بیوی گدی پر آ گئی تھی ایک عورت اپنا دکھڑا بیان کر رہی تھی۔ اس کا بیان ختم ہونے پر لیاقت کی بیوی کو بولنا تھا مگر وہ کوشش کے بعد بھی ایک لفظ زبان سے نہ نکال سکی۔ لیاقت قریب کھڑا تھا اس کے اشارہ کرنے پر اس کی بیوی نے اشارے سے بتایا کہ اس کی آواز بند ہے۔ وہ بول نہیں سکتی۔ یہ سن کر تو لیاقت کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

اس نے کوشش کرنے کا اشارہ کیا مگر اس کی بیوی کو ناکامی ہوئی اور وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ لیاقت نے اعلان کر دیا کہ تولے شاہ واپس چلے گئے ہیں سب لوگ جائیں اب کل ملاقات کریں۔ سب سائل مایوسی کے عالم میں واپس چلے گئے اور لیاقت اندر بیوی کے پاس دوڑا۔

اندر جاتے ہی بولا۔ ”اری نیک بخت کیا ہوا تھا بولتی کیوں نہ تھی۔“

”میں کیا کرتی جب کوشش کرتی تھی تو لگتا تھا کوئی میرا گلہ دبائے ہوئے ہے۔“ بیوی بولی۔

”اور اب کیسا لگتا ہے۔“ لیاقت نے پوچھا۔

”اب ٹھیک ہوں۔“ بیوی نے جواب دیا۔

مگر آستانہ بند ہو چکا تھا اور سب عورت مرد جا چکے تھے۔ اب لیاقت کیا کرتا اس کی دوڑ تو پنڈت کیدار ناتھ تک ہی تھی وہ دوڑا مگر راستے میں خیال آیا دن میں آنے کو پنڈت نے منع کیا تھا اب کیا کرے ملنا بھی ضروری تھا۔ رات کو ملنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ کل بھی آستانہ بند کرنا پڑے گا وہ پھر گھر آ گیا اور ایک پھٹی پرانی چادر پڑی تھی، پاجامہ اتار کر اس کو باندھ لیا اور پرانا سا کرتہ پہن لیا اور ایک رومال لے کر چلا مندر کی طرف، مندر کے قریب آنے پر اس نے رومال سر پر اس طرح ڈال لیا کہ اس کا چہرہ بھی اس میں چھپ گیا۔

مندر میں پوجا پاٹ کو اکا دکا آدمی آ رہے تھے اور کیدار ناتھ مورتی کے سامنے بیٹھا تھا۔ کیدار ناتھ کے قریب جب کوئی نہ رہا تو اس نے منہ سے کپڑا ہٹا دیا۔ ”پنڈت تعجب سے بولا۔ ”ارے تو کیسے آیا اس وقت۔“

”پنڈت جی بات بڑھ گئی ہے۔ اس لئے چھپ کر بھاگا بھاگا آ رہا ہوں۔“

”بتا تو کیا ہوا۔“ پنڈت نے پوچھا۔

”سویرے آستانہ کھولا تھا سائل بھی بہت تھے۔ مگر پھر بند کرنا پڑا۔“ لیاقت نے بتایا۔

”ارے کیوں بند کرنا پڑا۔ یہ مت بتانا۔“ پنڈت ناک سکوڑ کر بولا۔

”وہی تو بتا رہا ہوں پہلی ایک عورت تھی اس نے اپنا کام بتایا۔ میری بیوی سب سنتی رہی اس کے بعد اس کو عورت سے کچھ کہنا تھا مگر اس کی آواز بند ہو گئی اس نے کوشش کی مگر ایسا لگتا تھا جیسے اس کا گلہ کسی نے دبوچ رکھا ہے، اب میں کیا کرتا آستانہ بند کر دیا اور اعلان کر دیا کہ تولے شاہ چلے گئے کل ملاقات کریں گے۔ میں آستانہ بند کر کے اندر گیا تو دیکھا بیوی ٹھیک تھی اور آواز بھی کھل چکی تھی۔ بھلا بتاؤ حیرت کی بات ہے کہ نہیں۔“ لیاقت نے اپنی بات ختم کی۔

”میرا خیال ہے تیری جورو کے گلے میں کوئی پھندہ وندہ پڑ گیا ہوگا وہ گھبرا گئی اور تو نے بڑی عقل مندی یہ کی کہ تولے شاہ کی واپسی کا اعلان کر دیا اور آج کی آمدنی ماری گئی۔“ پنڈت بولا۔

”یہ پھندہ نہیں تھا۔ پنڈت جی یہ ضرور کوئی چکر ہے۔ ارے ایسا پھندہ کہ اندر جاتے ہی گلا کھل گیا۔“ لیاقت نے حیرت سے کہا۔

”تیری جورو کو وہم ہو گیا ہوگا۔ اب ذرا سی بات کو لے کر میں پھر جانکی داس کے پاس جاؤں۔“ پنڈت بولا۔

”پنڈت جی آپ سمجھ نہیں رہے، بات چھوٹی نہیں

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/

ہے ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔" لیاقت بولا۔

"چل ٹھیک ہے میں ذرا مندر سے فارغ ہولوں تو جاتا ہوں جانکی داس کے پاس مگر تو اب حرام خوری مت کر شام کو آستانہ کھول لینا۔" پنڈت نے کہا۔

لیاقت واپس آ گیا مگر رولو کا مندر میں پنڈت کے ساتھ لگا رہا۔ پنڈت نے پوجا کے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور مندر سے باہر آ گیا اور گھر کی طرف چلا اور اندر چلا گیا، رولو کا بھی اس کے ساتھ تھا پنڈت کی بیوی نے پنڈت کو دیکھ کر کہا۔ "کیا بات ہے آج جلدی اٹھ گئے۔"

"کیا بتاؤں میری جان کو تو سو فکریں ہیں۔" پنڈت بولا۔

"اب کیا فکر پڑ گئی۔" عورت بولی۔

"ارے آستانے والا لیاقت آیا تھا کہتا تھا۔ اس کی عورت کی آواز بند ہو گئی اور آستانہ بند کرنا پڑا۔ مجھے تو لگتا ہے حرام خوری پر اتر آیا ہے....." پنڈت نے کہا۔

"تم کیا کرو گے اب....." عورت نے پوچھا۔

"جاتا ہوں جانکی داس کے پاس، اس سے کچھ مشورہ کروں گا آخر کو وہ بھی تو چوٹی کا حصہ دار ہے وہ بھی تو کچھ کرے۔" پنڈت نے جواب دیا اور گھر سے باہر آ گیا۔

جانکی دروازے پر ہی کھڑا تھا کہیں جانے کی تیاری میں تھا، پنڈت کو دیکھ کر بولا۔ "پھر کوئی الجھن لے کر آئے ہو گے بولو کیا بات ہے زیادہ سے میرے پاس نہیں ہے، جانا ہے ایک جگہ....."

"تم خوب گھومو پھرو موج کرو اور سارے دکھڑے میرے حصہ میں ڈال دو۔" پنڈت بولا۔

"پوری بات تو بتاؤ تم تو ہری مرچ کھا کے آئے ہو شاید۔" جانکی داس بولا۔

"آستانہ میں مشکل ہو رہا ہے اب۔" پنڈت بولا۔

"اب کیا مشکل آ گئی۔" جانکی داس بولا۔

"لیاقت کی بیوی کی آواز آستانے میں آتے ہی بند ہو گئی اور گھر میں جاتے ہی کھل گئی۔ ارے گھر میں بند ہو جاتی اور آستانے میں کھلی رہتی تو نقصان تو نہ ہوتا۔" پنڈت نے کہا۔

"میں نے تو ایک بڑا شکتی والا پہرے دار وہاں چھوڑ دیا تھا۔" جانکی داس بولا۔

"مجھے بہلاوے کی بات تو تم کرو نہیں میں نہیں مانتا۔" پنڈت نے جواب دیا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں پنڈت میری بات کا یقین کرو۔" جانکی داس بولا۔

"تو پھر بیر، ایسا لگتا ہے نشے کا عادی ہو گا پی کے پڑا ہو گا کسی نالی میں۔" پنڈت نے جواب دیا۔

"دیکھو پنڈت مجھے غصہ نہ دلاؤ میں بہت برا آدمی ہوں اپنی پر آ جاؤں تو تمہیں بھاگنے کو راستہ نہیں ملے گا۔ مگر میں تمہاری بات کی کھوج کروں گا آخر میرا بیر کہاں گیا۔" جانکی داس بولا۔

"میں بھی تو یہی کہتا ہوں۔" پنڈت نرم لہجے میں بولا۔

"تم جاؤ میں بھی اب جہاں جا رہا تھا نہیں جاتا پہلے مجھے اپنا بیر تلاش کرنا ہے۔" جانکی داس بولا۔

پنڈت واپس روانہ ہو گیا اور جانکی داس گھر کے اندر چلا گیا۔ اندر جا کر اس نے ایک تھیلا اٹھایا اور گھر سے باہر آ گیا۔ اور ایک طرف پیدل ہی چل پڑا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ایک غیر مرئی طاقت ایک دکھائی نہ دینے والا وجود اس کے ساتھ ساتھ تھا، جانکی داس شہر کی حدود سے باہر آ گیا تھا اس کی چال اتنی تیز تھی کہ عام آدمی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اب اس کا رخ دریا کی طرف تھا شام کے سائے آنے لگے تھے۔

سورج کا سفر تمام ہونے کو تھا۔ ہر طرف تنہائی تھی دور دور کوئی آدمی یا جانور نظر نہیں آتا تھا اب اس کا رخ مرگھٹ کی طرف تھا مرگھٹ میں چاروں طرف سکوت نے ڈیرہ ڈالا ہوا تھا۔ ہر طرف ہیبت طاری تھی پانی کے بہنے کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔

مرگھٹ میں جگہ جگہ مگر دور دور چبوترے بنے ہوئے تھے۔ ان چبوتروں پر لاشیں جلائی جاتی تھیں۔ جانکی داس

ایک چبوترے پر چڑھ گیا۔ تھیلے میں سے اس نے ایک موٹی سی ایک فٹ کی ہڈی نکالی اور ایک گول کنڈل بنا لیا اور اس میں آسن لگا کر بیٹھ گیا۔

مرگھٹ پر ویرانی اور نحوست برس رہی تھی۔ رولو کا نے اس کے کسی کام میں رکاوٹ نہیں ڈالی تھی۔ جانکی داس نے کچھ بدبدانا شروع کر دیا اور رولو کا کی جیب میں پڑا اس کا بیر بے چین ہونے لگا۔

رولو کا کو اندازہ ہو گیا کہ وہ پھر بڑا ہو رہا ہے اس نے اس کو نکال کر زمین پر ڈال دیا اور تماشہ دیکھنے لگا کچھ ہی دیر میں وہ بیر اپنی اصلی حالت میں آ گیا اور جانکی داس کے سامنے ڈنڈوت بجا لایا۔

"تو کہاں مر گیا تھا۔" جانکی داس نے پوچھا۔

"گرو میں کیا کرتا میں تو پکڑا گیا تھا مجھے کیا خبر میں تو ہوش میں کب تھا۔" بیر بولا۔

"تیری شکتی کیا ہوئی۔" جانکی داس بولا۔

"گرو شکتی تو تب آزماؤں جب کوئی میرے سامنے ہو، میرے منہ پر ایک تھپڑ پڑا اور کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بس اب ہوش آیا ہے۔" وہ بولا۔

"اچھا اب جاؤ ہیں پر اور دیکھو عورت کی آواز کیوں بند ہو گئی تھی۔" جانکی داس بولا۔

بیر اٹھ کھڑا ہو گیا۔ مگر کھڑا کا کھڑا رہ گیا اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ جانکی داس غصے سے بولا۔ "جاتا کیوں نہیں..... مورکھ....."

بیر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "میں اپنی جگہ بندھا پڑا ہوں ہل نہیں سکتا جاؤں کیسے....."

"کیا بکواس کرتا ہے۔" جانکی داس غصے سے بولا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں گرو۔" وہ بے بسی سے بولا۔

"نظر تو کچھ نہیں آ رہا۔" پھر جانکی داس پورا حلق پھاڑ کر زور سے بولا۔ "کون ہے تو سامنے تو آ۔"

اس کی آواز پورے مرگھٹ میں رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی دور دور پھیل گئی۔ اور پھر رولو کا نے دیکھا کہ اس کے چاروں طرف سائے آنے لگے۔ یہ گندی روحیں تھیں جو کہ جانکی داس کی آواز پر مرگھٹ کے کونوں کھدروں سے نکل کر آ رہی تھیں۔ رولو کا جانتا تھا کہ یہ سب صرف انسان کو ڈرا تو سکتی ہیں مگر اس کے آگے ان کا بس نہیں ہے۔

کنڈل کے چاروں طرف بھانت بھانت کے چہرے نظر آ رہے تھے۔ جانکی داس نے زور کی آواز میں ان کو حکم دیا۔ "بتاؤ مرگھٹ میں کون ہے۔" اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی کمانڈر اپنی فوج کو حکم دیتا ہے۔

اس کا حکم سن کر ساری آتمائیں مرگھٹ میں بکھر گئیں رولو کا اپنی جگہ ستون کی طرح کھڑا رہا۔

جانکی داس کے چہرے کے رنگ بدلتے رہے اس کی بے چینی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ساری آتمائیں ناکام واپس آ گئیں ان کے انداز سے ناکامی کا پتہ چلتا تھا۔ جانکی داس نے ان سب کو جانے کا اشارہ کیا اور اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔

"مجھے پتہ ہے تو میرے بہت قریب ہے تیری شکتی کیا ہے میں سمجھ نہیں سکا۔"

رولو کا نمودار ہو گیا۔ جانکی داس نے رولو کا کو دیکھا اور دیر تک دیکھتا رہا۔ اس کی گول گول آنکھیں رولو کا پر گڑی رہیں رات کے اندھیرے میں بھی وہ دن کی روشنی کی مانند رولو کا کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "تو کیا چاہتا ہے؟"

"پہلے تو اس کنڈل سے باہر آ اور پھر بات کر۔" رولو کا نے کہا۔

"کنڈل سے ڈر رہا ہے کیا؟" جانکی داس نے طنزیہ کہا۔

"نہیں اس میں تیرا فائدہ ہے اگر میں توڑ کر تجھے باہر لاؤں گا تو تیرا بیر تیرا دشمن ہو جائے گا یہ تو تجھے ہی پتہ ہو گا۔ تو نے بھیرو کا کنڈل بنایا ہے تو بھیرو کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

"تجھے یہ سب کیسے پتہ چلا.....؟" وہ حیرت سے بولا۔

"تو بے وقوف ہے دشمن کی طاقت کا اندازہ کئے بغیر لڑائی کرنے چلا ہے اور میں نے تیری پوری طاقت کو کنٹرول کر لیا ہے تیرے سب کبوتر میرے کابک میں بند ہیں۔

READING CORNER http://readingcornerblogspot.com

تیری چھتری سونی پڑی ہے، ذرا ان کو بلانے کی کوشش تو کر، تجھے خود اندازہ ہو جائے گا۔" رولوکا اطمینان سے بولا۔ جانکی داس کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور وہ فوراً کنڈل کے باہر آ گیا اور چبوترے سے نیچے اتر آیا۔ نیچے آتے ہی اس کے پیروں میں نظر نہ آنے والی رسی لپٹ گئی اور اس کے پیر بندھ گئے۔ پہلے تو اس نے کوشش کی کہ اس بندھن کو توڑ لے مگر ناکام ہوا تو گڑگڑا کر بولا۔

"معاف کر دو گرو، میں پہچان نہ سکا۔"

"تم نے مجھے کب دیکھا تھا کہ پہچان لیتے۔" رولوکا نے جواب دیا۔

"میں مانتا ہوں اپنی شکتی کے بھروسے میں مارا گیا۔" جانکی داس بولا۔

"میں جانتا ہوں تو کیا ہے اور تیرے پاس کتنی شکتی ہے۔ تو معصوم لوگوں کو تنگ کر سکتا ہے ان کو بیمار کر سکتا ہے مگر بیمار کو اچھا نہیں کر سکتا اس لئے کہ تیرے گرو شیطان کو یہ سخت ناپسند ہے۔ مگر تیرے بیمار کو میں ٹھیک کرتا ہوں میرے گورو کو یہ پسند ہے۔

دنیا میں تیری موجودگی انسان کے حق میں ایک زہر آلود چشم سے کم نہیں۔ تو مجسم بدی ہے۔ تیرے وجود کی قربت سے انسان ہمیشہ نقصان اٹھائے گا۔ میں جانتا ہوں تو اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا۔ تیرا گرو تجھے باز نہیں آنے دے گا۔ دیکھ لے تیرا گورو تجھے مصیبت میں دیکھ کر بھی تیری مدد کو نہیں آ رہا تو نے اس کی پوجا کی جو تیرا نہیں تھا اور نہ آگے تیرا ہوگا۔" رولوکا نے کہا۔

"میں توبہ کرتا ہوں تیری بات مانوں گا۔" جانکی داس رو کر بولا۔

"میں جانتا ہوں جانکی داس یہ سبق بھی تیرے گورو کا ہے مگر فریب تمہارا ابتدائی سبق ہوتا ہے۔ مگر جن کو یہ سب پتہ ہے تم ان کو فریب نہیں دے سکتے۔ اب رات ختم ہونے والی ہے۔ تمہاری زندگی کا سفر بھی ختم ہونے کو ہے کل کا دن تمہارے ناپاک وجود سے پاک ہوگا۔"

اور پھر رسیاں اس کو دریا کے اندر لے جانے لگیں، جانکی داس زور زور سے رونے لگا اور اس کے ساتھ مرگھٹ کی سینکڑوں روحیں آہ وزاری کرنے لگیں۔ آسمان پر بجلی کوندتی رہی مگر زمین پر کچھ نہ ہوا اور جانکی داس پانی کی تہہ میں بیٹھتا چلا گیا۔ آتماؤں کی آوازیں آہستہ ہوتی گئیں اور پھر سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی دن کا اجالا پھیل گیا۔

رولوکا واپس روانہ ہوا اور پنڈت کیدار ناتھ کے پاس پہنچ گیا۔ پنڈت پوجا کے کمرے میں تھا۔ رولوکا اس کے قریب جا کھڑا ہوا اور اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔

"جانکی داس مر گیا۔ اب تیری باری ہے۔"

پنڈت نے چونک کر پیچھے دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا وہ حیرانی سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"تجھے کچھ نظر نہیں آئے گا۔ جانکی داس کو بھی نظر نہیں آیا تھا۔ جانکی داس کو اس کی شکتی کے غرور نے دریا میں بھسم کر دیا اور تجھے تیرا لالچ ڈبوئے گا۔" رولوکا نے کہا۔

"مجھے معاف کر دو میں کوئی لالچ نہیں کروں گا۔" پنڈت بولا۔

"دینو کا مکان کب خالی کرے گا۔ بول۔" رولوکا نے پوچھا۔

"کل ہی کر دوں گا۔" پنڈت جلدی سے بولا۔

رولوکا دینو کے پاس آ گیا اور حکیم کے بہروپ میں بولا۔ "تمہارا مکان کل خالی ہو جائے گا تم وہاں جا سکتے ہو مگر تم کو وعدہ کرنا ہوگا کہ تم وہاں پر مکر و فریب کا کوئی کاروبار نہیں کرو گے۔"

"میں دل و جان سے وعدہ کرتا ہوں، میں محنت کروں گا اور حق حلال کی روزی پیدا کروں گا۔" اور رولوکا اور میں واپس روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

رولوکا نمبر 3

قیمت:-/150 روپے

READING CORNER
http://readingcornerpk.blogspot.com/